ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	جنوری ۱۹۳۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

سنہ ۱۹۳۸ء

دلچسپی ہے۔ ان کا دل اس ہیبتناک المیہ سے بے حد متاثر ہوا ہے جو جاپان چین کے اسٹیج پر ہاوٹزر مشینوں اور توپوں کی دھلانے والی گونج کے ساتھ کھیل رہا ہے۔۔۔ چین۔ بدنصیب چین اپنے ادبی۔ آرٹ کے خزانوں کو یوں چھپائے چھپائے لئے پھرتا ہے جیسے کہ ننھی چڑیا اپنے بچوں کو دونوں پروں کے نیچے۔ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چمٹا لیتی ہے اور ہوا میں عقاب کی برق صفت تیزی ماں اور بچے دونوں کو اچک لینے کے لئے تیار ہے۔ اس معاہدہ کا یہی مقصد ہے کہ اس قسم کے شاہکار جو نسل انسانی کے لئے ازلی مسرت کا خزینہ ہیں کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائیں اب تک ۲۱ ممالک ۔ بہت سی انجمنیں اور سوسائٹیاں اور دو بین الاقوامی کانگریسیں اس عہد نامہ پر صاد کر چکی ہیں۔

ڈانزیو ڈانزیو (D'Annunzio)۔ اٹلی کا مشہور معروف ڈراما نویس۔ ناولسٹ شاعر۔ لیڈر۔ سپاہی ایک لحاظ سے فاشزم کا موجد ہے۔ اس کے اصول۔ اس کا تخیل اس کا نعرہ۔ اس کے امتیازات۔ اس کا سلام مسولینی کے ہتھوڑے کی چوٹ سے نہیں نکلے۔ بلکہ ایک شاعر کے دل اور ایک شاعر کے رنگین تخیل سے۔ ایک موسیقی کے ساز سے جس کی دھڑکتی ہوئی رگیں کلینشو شیبر فرانس' اور لارڈ جارج' ویلز کے جادوگر نے بے طرح چھیڑ دی تھیں

ڈانزیو ایک تخیل پسند ادیب تھا مگر اس کا دل ہمیشہ "سپے خوبتر نگار سے" تڑپتا تھا جنگ عظیم سے پہلے اس کا نام شہرت کے آسمان پر چاندنی کر چمک اٹھا تھا۔ مگر اس کے دل میں طاقت اور قوت کی ایک بے پناہ خواہش موجود تھی۔ اور جب اُس نے فیوم (   ) پر اپنا رومانی مارچ کر کے قبضہ کر لیا تو اس کا مقصد اپنے زندگی میں ایک نیا باب کھولنے کا تھا فیوم میں ہی اس نے اپنا رومن سلام ایجاد کیا۔ وہی طریقہ جسے پہلے مسولینی اور پھر ہٹلر نے اختیار کیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ یہ سلام اس نے شاید کسی پرانے مجسمے یا دیواروں کے نقوش سے نقل کر لیا تھا رومن لوگوں کا یہ طریقہ نہ تھا سلطنت روما کے زمانے میں آزاد شہری ملاقات کے وقت ہاتھ ملاتے تھے اور محض غلام لوگ اس طرح ہاتھ اٹھاتے تھے جو نازی یا فاشسٹ طبقے کا طریقہ ہے۔

دانزیو نے ہی وہ دلچسپ اور مؤثر طریق گفتگو ایجاد کیا جسے مسولینی نے   خوبصورتی سے اپنا لیا۔ آج مسولینی بھی (پیازا ڈی وینیزیا) کے چھجے پر کھڑا ہو کر فولادی لہجے میں ویسے ہی پکارتا ہے جیسے دی نزیو نے فیوم میں ایکٹ کیا تھا۔

دی نزیو چھجے سے پکار کر کہتا تھا۔ فیوم کس کا ہے"؟

سینے سے اس کے رضا کار سپاہی ہم آہنگی سے جواب دیتے "ہمارا"

"دوبارہ فیوم کا شاعر ڈکٹیٹر اور اٹلی کس کا ہے؟"

جواب میں مجمع چلاتا "ہمارا" "ہمارا"

اس ہمارا کی لفظی ترکیب نے اس مجمع میں اور وہاں سے پھیل کر کل اٹلی میں ایک قومی عصبیت۔ جارحانہ اقدامات۔ ایک خطرناک جذبۂ خودی کا مرض پیدا کر دیا۔ اور وہی قوم جو میزینی اور گیری بالڈی کی تیادت میں قربانی اور جذبۂ ایثار کا نمونہ تھی اب بہیمیت اور درندگی کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔

مسز پرل بک ۱۹۳۸ء سال ادب کا نوبل انعام مسز پرل بک (Mrs Pearl Buck) کو ملا ہے جو ایک مشہور مستورات امریکی ناول نویس ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ امریکی کی صفت ان کے نام کے ساتھ آج کل کی قومی عصبیت کا تحفہ ہے۔ مسز بک اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی تصانیف کے ماحول۔ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کے لحاظ سے خالصتہً چینی ہیں! ایک مسلمان کے لئے یہ امر کوئی تعجب کی چیز نہیں۔ بقول ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست۔ اس کی علمی۔ سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جغرافی حدود۔ رنگ اور قوم کی تمیز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

مسز بک کے والد عیسائی مبلغ تھے اور ان کی پیدائش چین کے پرانے شہر (یو چو) میں ہوئی ان کا بچپن شہر چیانگ کیانگ کے ایک بنگلے میں گذرا جو ایک پہاڑی پر واقع تھا اور جہاں سے ایک گنجان آباد شہر اور ایک بہتے دریا کی آوازیں فاصلے کے مدھم کر دینے والے اثر کی وجہ سے عجب دلفریبی لئے ہوئے پہنچی تھیں۔ ان کی دایہ ایک چینی بڑھیا تھی جو ان کے خاندان کے ہمراہ ۱۸ سال تک رہی۔ چین میں جب ننھی پرل اس کے گھٹنے سے سر ٹیک کر بیٹھ جاتی تو وہ اسے تائی پینگ بغاوت کے ہولناک قصے سناتی۔ بچوں میں جنگ اور خونریزی۔ بہادری اور جانفروشی کے واقعات سے نفسیاتی دلچسپی ہوتی ہے اور بچپن کے وہی تاثرات مسز بک کی مشہور تصانیف (The Good Earth) میں ظاہر ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر تک انھوں نے چین میں ہی تعلیم پائی اور اس کے بعد امریکہ کے ایک کالج میں داخل ہو گئیں سند حاصل کرنے کے بعد وہ پھر چین میں واپس آگئیں اور دو سال کے بعد انھوں نے ایک امریکی مبلغ جان بک سے شادی کر لی اور ان کے ساتھ وہ شمالی چین میں چلی گئیں۔ وہاں کا پانچ سالہ قیام ان کے اپنے الفاظ میں ان

سنہ ۱۹۳۸ء

ممالکِ غیر

زمانے کی رفتار مہینے اور سال کی پابند نہیں، اور انسانی زندگی کی تحریکوں اور انقلابوں میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک سال دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہو، خصوصاً جب وہ گذر جائے، اور ہم اس سے اتنی دور ہو جائیں کہ ان واقعات کا صحیح مطالعہ کر سکیں جو کہ اس میں پیش آئے اور اگلے پچھلے کا رشتہ جوڑ سکیں ۱۹۳۸ میں بہت کچھ ہوا جس کا ہمیں ایک سال پہلے گمان بھی نہ تھا، لیکن اس وقت غور کیجئے تو جو کچھ ہوا اس کا ہونا لازمی تھا، اور ہمیں کافی علم ہوتا تو شاید ہم ستاروں کے دیکھے بغیر بتا سکتے کہ یہ ہونے والا ہے۔

یورپی سیاست میں اس سال جرمنی کا آسٹریا پر اور اس کے سات مہینے بعد چکوسلواکیا کے جرمن علاقوں پر قبضہ اور اس قبضے کے لئے جو تیاریاں کی گئیں اور چالیں چلی گئیں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، لیکن یہ سب کچھ علامت ہے ایک کہیں زیادہ ہنگامہ خیز تحریک کی جو سنہ ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی تھی اور اس سال تکمیل کو پہنچی۔ یہ تحریک ہے ان قوموں کی جنھیں صلح نامہ ورسائی کی دفعات میں گرفتار کیا گیا تھا آہستہ آہستہ اپنے بندھنوں کو توڑنا اور "اجتماعی تحفظ" کے اس گھروندے کو ڈھا دینا جسے انگریزی اور فرانسیسی سیاست نے سنہ ۱۹۱۹ء میں بنا کر کھڑا کیا تھا اور بین الاقوامی اتحاد کا نام دیا تھا۔

اصل میں تو یہ بہت پہلے ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ اتحاد محض انگلستان اور فرانس کے اتحاد کا بڑا نام ہے اور ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بے آبرو اور بے مصرف ہو جانے سے دنیا کے لئے کوئی خاص خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جنگ کے جو امکانات اب ہیں وہ پہلے بھی تھے، اس لئے کہ بین الاقوامی اتحاد کبھی کمزور کو زبردست کے پنجے سے بچا نہیں سکا، اور اگر فرانس اور انگلستان کا اتحاد عمل یورپ کی ڈگمگاتی ناؤ کے لئے سہارا تھا

تو وہ اب بھی موجود ہے۔ جنگ کی جو خاص تیاری اس سال دیکھی گئی ہے اس کا ارادہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا، اس لئے کہ لوگ کچھ اسی سال منطق کے اس پھیر میں نہیں پڑ گئے ہیں کہ جنگ سے بچنے کے لئے لڑنے کی طاقت چاہیئے، ایسی طاقت کہ جسے دیکھ کر دوسرا ہم سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکے مگر ہم اسے ہر وقت مار مٹنے کی دھمکی دے سکیں اور مجبور ہو جائیں تو ایسا کر کے بھی دکھا دیں۔ جنگ کی تیاریوں کے باوجود ۱۹۳۸ء میں اگر کوئی بات ثابت ہوگئی ہے تو یہ کہ یورپ کی کوئی قوم لڑنا نہیں چاہتی، اور جب تک کہ نہ لڑنے میں کسی ایسے نقصان کا اندیشہ نہ ہو کہ جس پر جنگ کی تباہی اور بربادی کو ترجیح دی جا سکے اس وقت تک لڑائی چھڑنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ انگلستان اپنی آبرو، فرانس کی آبرو اور سیاسی تعلقات دونوں اس کی خاطر قربان کر چکا ہے اور ابھی بہت سی قربانیوں کی گنجائش باقی ہے۔

جرمنی | صلح نامہ ورسائی میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی نے اٹھایا تھا اور اس کی تلافی کا مطالبہ کرنے کا حق سب سے زیادہ اسی کو ہے۔ اسی وجہ سے وہ ۱۹۱۸ء کی سیاسی تعمیرات کو مسمار کرنے اور تازہ عمارتوں کی بنیاد رکھنے میں سب سے آگے آگے ہے۔ اس نے اب یہ اصول منوالیا ہے کہ وسطی یورپ کی سیاسی تنظیم میں اس کی خواہش اور ارادے کا خیال کیا جائے گا نہ کہ انگلستان کے معاہدوں اور فرانس کے رسمی تعلقات کا، اور آسٹریا کے پورے ملک اور چکوسلواکیہ کے سڈٹین علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کر کے اس نے بڑی حد تک اپنی قوم کی ایک پرانی خواہش پوری بھی کر لی ہے کہ یورپ میں جتنے جرمن نسل اور جرمن زبان بولنے والے ہوں وہ سب ایک سیاسی نظام کے ماتحت ہوں۔ ابھی مشرقی فرانس، جنوبی ڈنمارک، شمالی اور مغربی پولینڈ، ہنگری، سوئسستان اور شمالی اٹلی میں جرمن زبان بولنے والے موجود ہیں جو جرمن قوم میں شامل ہونے اور نازی حکومت کی رعایا بننے کا شرف حاصل نہیں کر سکے ہیں، لیکن جہاں کہیں موقع ہے اس کی تحریک ابھی سے شروع کر دی گئی ہے، اور نازی سیاست جدھر بھی سینگ سمائے گھس جانے پر تیار بیٹھی ہے۔ ڈنمارک میں سازشیں ہو رہی ہیں، میمل غالباً ۱۹۳۹ء کے شروع میں جرمنی سے ملحق ہو جائے گا، پولینڈ نے جرمنی کی مخالفت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے مغربی علاقوں کا چھن جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہنگری کے جرمن بڑی تیزی کے ساتھ نازی اصولوں کے معتقد اور اس کے طرز عمل کے پیرو بن رہے ہیں، اور مسولینی رات کو کبھی سوچتا ہوگا کہ

جرمنی کے سیاسی فلسفے کی زد میں اٹلی کے چند شمالی ضلع بھی آجاتے ہیں تو اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہوگی۔ سوئستان ابھی خاص خطرے میں نہیں ہے، اور فرانس سے جرمنی نے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی سرحد کو تقدیر کا لکھا سمجھے گا۔ لیکن یہ وعدہ سیاسی وعدہ ہے، اور یہ تقدیر سیاسی مصلحت اور تدبیر۔

معاشیات کے ماہر کچھ کھسیانے پن اور کچھ اعتراض کے شوق میں ہر ہٹلر کی ہر کامیابی کو ایک مغالطہ ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آسٹریا کے شامل ہو جانے سے جرمنی کی تجارتی اور صنعتی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اور اسے کوئی مالی یا صنعتی فائدہ نہیں ہوا۔ سوا اس کے کہ لکڑی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ سڈٹین علاقوں پر قبضہ ہو جانے سے اگرچہ چکوسلواکیا کہیں کا نہیں رہ گیا لیکن جرمنی کو ایسے صنعتی کارخانے اور ذخیرے ملے جن کی خود جرمنی میں افراط ہے اور وہ کانیں اور زرخیز زمینیں جن کی اسے سخت ضرورت ہے چکوسلواکیا کے پاس ہی رہیں۔ یہی اعداد و شمار کے ماہر نقشے بنا کر اور حساب لگا کر دکھا دیتے ہیں کہ جرمنی کی بہت کم ضروریات ہیں جو بلقان میں مہیا ہو سکتی ہیں، لیکن جرمنی کی بلقان کے ملکوں سے تجارت برابر بڑھ رہی ہے، اور ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس کے مجموعی لین دین کا تہائی سے کم حصہ جرمنی سے ہو۔ اس سلسلے میں آخری معاہدہ جرمنی اور رومانیہ کے درمیان وسط دسمبر میں ہوا جس کی رو سے رومانیہ کی درآمد میں جرمنی کا حصہ پچاس فی صدی اور برآمد میں تینتیس فی صدی ہوگا۔ جرمنی اور بلقان کے تعلقات کو ماہروں کی متعصب نظروں سے نہیں بلکہ صاف صاف دیکھیے تو یقین ہو جاتا ہے کہ جرمنی کا بلقان پر تسلط ہو گیا ہے اور بلقان والے چاہیں بھی تو جرمنی سے اپنا تجارتی رشتہ توڑ نہیں سکتے۔ اس کے برعکس ان کی ہر ایسی کوشش انھیں زیادہ الجھا دیتی ہے۔ فرانس اور فرانس سے بھی زیادہ انگلستان کے سرمایہ دار تجارت کو سیاست پر قربان کر کے بلقان میں اپنا سرمایہ لگائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انھیں ایسا مال خریدنا ہوگا جس کی انھیں ضرورت نہیں، اور برطانیہ سے تو اس کی ساری نوآبادیاں بگڑ جائیں گی، اس لئے کہ بلقان میں وہی قدرتی پیداوار حاصل ہوگی جسے برطانیہ نوآبادیوں سے خریدنے کا معاہدہ کر چکا ہے۔

اب سمجھ لینا چاہئے بلقان میں جرمنی کے لئے میدان صاف ہو گیا ہے، دریائے ڈینیوب کی آمد و رفت پر اسے پورا اختیار ہے اور ادھر مغرب میں ٹریسٹ کی بندرگاہ اور جبر اینڈریاٹک کے ذریعے اسے بحر روم میں

پہنچنے کا ایسا راستہ مل گیا ہے جو اس کے تجارتی تسلط کو بہت ہی پائدار کر دے گا ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مشرق قریب میں کیا کرتا ہے ۔ ترک ابھی تک اس کے لین دین کے جال میں اس طرح نہیں پھنسے ہیں جیسے کہ بلقان کے ملک ، لیکن انگریزی سرمایہ داروں کی بے پروائی یا کوتاہ اندیشی کا یہی حال رہا جو کہ اب تک ہے تو ترک کو جرمنی سے تعلقات بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا ۔ اس سال کئی مہینوں کی کوشش کے بعد انگلستان کے تجارتی بورڈ نے انھیں ۳ لاکھ پاؤنڈ کا تجارتی قرضہ دینا منظور کیا ہے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ ترک اتنے کا مال تجارتی بورڈ کی ضمانت پر خرید سکتے ہیں ، لیکن ترکوں نے اسی کے ساتھ جرمنی سے بھی معاہدہ کیا ہے ، اور ان کے یہاں کی پیداوار اور قدرتی ذخیروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا جرمنی کے سوا کوئی خریدار نہیں ۔ جرمنی نے ایران سے بھی لین دین شروع کیا ہے ، ایران سے جرمنی جانے والی آمد دو فیصدی سے بڑھ کر گذشتہ سال میں بارہ فی صدی ہو گئی تھی اور جرمنی سے جانے والا مال چھ سے بڑھ کر چودہ فی صدی ۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں ۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہر ہٹلر نے رضا شاہ کو جرمنی آنے کی دعوت دی ہے اور شاید وہ اس دعوت کو منظور بھی کر لیں ۔

تو اس سال تک سمجھنا چاہئے کہ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کو پوری طرح نیست و نابود کر دیا ہے ، اور اسی سلسلے میں تجارت کو بلقان اور مغربی ایشیا کی طرف بڑھانے کے لئے رستہ بالکل صاف کر لیا ہے ، سیاست میں اب وہ ٹٹول رہا ہے کہ کدھر بڑھنے میں سب سے کم رکاوٹیں ہوں گی ۔ نوآبادیوں کی واپسی کا معاملہ برطانیہ کی وزارت خارجہ تک نہیں پہنچا ہے تو برطانیہ کے ایوان عام میں اور ساری دنیا کے اخباروں میں تو اس کا چرچا ہو ہی گیا ہے ، اور اب روس کے جنوب مغربی صوبہ یوکرائن پر جرمنی کے قبضہ کرنے کا ذکر بھی چھڑ گیا ہے ۔ آخر ستمبر کی میونخ کانفرنس کے بعد جو امید تھی کہ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان دوستی کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اس کا امکان ہو گیا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی صلح پسندی ہر ہٹلر کے جوش کو تھوڑا بہت ٹھنڈا کر سکے گی اس کا بھی مغالطہ نہیں رہا ۔ جرمن اخبار برطانیہ کو ایسی الٹی سیدھی سنا رہے ہیں کہ برطانیہ کانوں میں روئی ڈالے بغیر صلح پسندی کے موجودہ مسلک پر قائم نہیں رہ سکتا ۔

اٹلی | یورپ کی سیاست کا محور اٹلی اور جرمنی کا اتحاد ہے ، لیکن اب آثار اس کے نظر آ رہے ہیں کہ جرمنی

کی حکمت عملی اس کا محور ہوگی اور اٹلی کی سیاست بس اس پر بس کرے گی کبھی اسے فولادی اور کبھی لکڑی کا نظر ہوا ظاہر کرتی رہے گی۔ روم برلن کا محور ۱۹۳۶ء میں قائم ہوا اور دیکھنے میں اب بھی بہت مضبوط ہے لیکن اس میں اٹلی کو برابر نقصان ہوتا رہا ہے اور اب بھی کسی طرح کے فائدے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مسولینی شروع میں جرمنی اور آسٹریا کے مل جانے کا مخالف تھا، اور ۱۹۳۴ء میں جب اس کا اندیشہ ہوا تو اس نے فوراً انگلستان اور فرانس سے وہ اتحاد کیا جو سٹریزا کا محاذ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد جرمنی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو دبانا تھا۔ حبش کی جنگ ہوئی اور اٹلی کی برطانیہ اور فرانس سے بگڑ گئی تو ہٹلر نے مسولینی کا ساتھ دیا۔ مگر اس دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کو آسٹریا ہٹلر کے حوالہ کرنا پڑا، چکوسلواکیہ کا معاملہ بھی اسی کے حق میں طے کرانا پڑا اور اب بحر ایڈریاٹک، بلقان اور مجموعی حیثیت سے مشرقی بحر روم جرمنی کے لئے خالی کرنا پڑا ہے۔ مسولینی کا جو اندازہ تھا کہ وہ جرمنی کی ہمدردی اور مدد حاصل کرکے ہسپانیہ اور مغربی بحر روم کی سیاست اور تجارت پر قبضہ کر سکے گا وہ اگر غلط نہیں تو صحیح بھی نہیں نکلا ہے۔ جرمنی کو ہسپانیہ کے معاملات سے جو دلچسپی تھی وہ اس سال کے اندر ختم ہوگئی ہے اور اب اٹلی کو وہی مل سکے گا جو وہ اپنے زور بازو سے حاصل کرے۔

دراصل اٹلی کا مفاد نہ جرمنی سے بالکل مل جانے میں ہے نہ برطانیہ اور فرانس سے۔ اس کا مفاد دونوں فریق سے سودا کرنے اور اپنے جغرافی مقام سے فائدہ اٹھانے میں ہے۔ یعنی اس کا کام صرف دغابازی اور دھونس سے چل سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست جرمنی سے ڈرتا ہے، برطانیہ سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہے اور اس سال اپریل میں کیا بھی ہے، لیکن سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا، اور ابھی اس نے فرانس سے نوآبادیوں کے مسئلے پر جھگڑا شروع کیا ہے جس میں کوئی تعجب نہیں اگر اس کی نیت فرانس سے دوستی کرنا ہو۔ جرمنی نے نوآبادیوں کے معاملے میں اٹلی کا ساتھ نہیں دیا ہے، مگر فرانس کی حالت ایسی نازک ہے کہ اگر اٹلی اپنے ہی بل بوتے پر فرانس سے جبر دبانے کی ٹھان لے تو بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔

فرانس فرانس میں ۱۹۳۶ء میں قومی محاذ کی یعنی سوشلسٹ پارٹیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ انتہا پسندی کا عروج تھا، اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ اعتدال پسندی کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ فرانس کے

ایوان عام میں بہت سی چھوٹی بڑی پارٹیاں ہیں جن کے اصول مبہم ہیں اور نام غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ سوشلسٹ انتہا پسندی کا ردعمل یہ نہیں ہوا کہ نری سرمایہ داروں کی وزارت بنے، بلکہ جب کبھی ایک وزارت ٹوٹی اور دوسری بنی تو اس میں اعتدال پسند وزیروں کی تعداد بڑھ گئی، اور اس سال کے دوران میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ وزارت سے بالکل خارج کر دئے گئے ہیں۔ قومی محاذ کی وزارتیں اس سبب سے ناکامیاب ہوئیں کہ سرکاری بنک نے ان کی مخالفت کی اور ایوان نے مالی معاملات میں انھیں ضروری اختیارات دینے سے انکار کر دیا۔ اس سال اعتدال پسند وزارتوں کے لئے یہ دشواری رہی کہ مزدوران کی مخالفت کرتے رہے، اور اس وقت بھی اس سے باز نہ آئے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ ظاہر ہے اس کا فرانس کی خارجی سیاست پر بہت برا اثر پڑا، اور جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد اور چکوسلواکیا کی تقسیم کے موقعوں پر ملک کی حالت ایسی تھی کہ برطانیہ کی خوشامد کرنے، جرمنی کا غصہ اتارنے کے لئے پرانی سیاست کو بغیر ماتم کئے دفن کرنے اور دوستوں کے ساتھ دشمنوں کی طرح پیش آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فرانس کی سیاسی حیثیت اب دوسرے درجے کی ریاستوں کی سی ہوگئی ہے، حیثیت کے ساتھ اس کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی ہے، اور اگر اس سال کی کارگذاری اور کیفیت معیار مانی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب فرانس میں دم نہیں رہا ہے۔

برطانیہ | نقصان برطانیہ نے بھی بہت اٹھایا ہے، مگر آبرو نہیں کھوئی ہے۔ برطانیہ نے ایک طرف مزدوروں میں دل کھول کر گذارے تقسیم کر کے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کر کے ملک کو بے چینی اور فساد سے محفوظ کر لیا ہے اور وہاں کوئی اندرونی مخالفتیں نہیں ہیں کہ جنھیں دیکھ کر غیر لوگ برطانیہ کو کمزور سمجھ بیٹھیں۔ برطانیہ کی دشواری ایک تو سرکاری ملازموں کی بے پروائی، ٹھیکیداروں کی بے ایمانی اور کارخانوں کی سستی ہے، اور دوسرے مسٹر چیمبرلین کا بڑھاپا اور ان کی یہ عادت کہ وہ اپنے ارادوں کو راز بنا کر دل میں رکھتے ہیں اور کسی کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس سے پوری بات کہیں۔ سرکاری ملازموں کی بے پروائی اور ٹھیکیداروں کی بے ایمانی کی قلعی اس وقت کھلی جب زہریلی گیس سے بچانے والے توپڑوں کے کارآمد ہونے پر بحث چھڑی، اور پھر پچھلے ستمبر میں جب جرمنی کا ہوائی حملے کرنے کا خطرہ بہت قریب نظر آرہا تھا

اور یہ راز فاش ہو گیا کہ اگر جرمنی نے حملے کر دئے تو لندن کو بمباری سے بچانے کا کوئی انتظام نہ کیا جاسکے گا لیکن جمہوری حکومتیں اور خاص طور سے برطانوی حکومت خطروں کی پیش بندی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے، اور یہ کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ کارخانوں کا ناکافی اور سست ہونا، جس کا ثبوت اس سے ملا کہ برطانیہ نے پانچ سو ہوائی جہاز بنانے کا ٹھیکہ امریکہ کی ایک کمپنی کو دیا ذرا تعجب کی بات ہے، اور اس سے اس عام خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابھی تک انگریز یہی نہیں کہ لڑنا نہیں چاہتے بلکہ چاہیں بھی تو لڑ نہیں سکتے۔

یہ بھی کچھ ناممکن نہیں کہ حکومت کے کارکنوں اور سامان جنگ کے کارخانوں کی سستی برطانوی وزارت کی روح رواں مسٹر چیمبرلین کی پالیسی کا عکس ہو۔ مسٹر چیمبرلین کا خیال ہے کہ اس وقت یورپ کی جو قومیں روٹھی ہیں ان کو منانا چاہئے، اور جنگ کی تیاری کا چرچا اس خیال سے نہیں کیا جارہا ہے کہ برطانیہ جلد سے جلد لڑنے کے لئے تیار ہو جائے بلکہ وہ نتیجہ ہے سرمایہ داروں کو روپیہ، مزدوروں کو کام اور شہریوں کو اطمینان دلانے کی خواہش کا، تاکہ مسٹر چیمبرلین فراغت کے ساتھ روٹھی قوموں کو منانے کی مناسب تدبیریں کرسکیں۔ ابھی تک اس سلسلے میں اتنا کیا جاسکا ہے کہ جرمنی کو مارچ میں آسٹریا اور اکتوبر میں سڈیٹن علاقے دلوائے گئے اور اٹلی سے اپریل میں سمجھوتا کر لیا گیا۔ مسٹر چیمبرلین کو پورا یقین ہے کہ جرمنی لڑائی نہیں چاہتا، صلح و آشتی سے پنچوں کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کر کے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ چکوسلواکیا کے جھگڑے میں پنچ بنے، ہر ہٹلر سے دو مرتبہ روبرو گفتگو کرنے کے لئے جرمنی پہنچے اور اگلے سال کے شروع میں مسولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روم جانے والے ہیں۔ مسولینی نے اب تک جب کبھی برطانیہ سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تو تھوڑے ہی دنوں کے اندر گالیاں بھی دیں، جرمن اخبار میونچ کانفرنس کے بعد سے برطانیہ کی عیب جوئی کر رہے ہیں اور کبھی کبھی بے تکلف گالیاں بھی دیتے ہیں لیکن مسٹر چیمبرلین کے نزدیک اس سے صرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر دونوں مزاج کے ذرا تیز ہیں، مگر دل سے صلح کے خواہشمند ہیں اور ان کے ساتھ سلیقے اور صبر سے بات کی گئی تو دونوں راہ پر آجائیں گے۔

معلوم نہیں مسٹر چیمبرلین سلیقے سے بات کرنے کے کیسے موقعے نکالنے کی فکر میں ہیں، بظاہر تو انکی

پالیسی اب تک "عزت کے ساتھ پسپائی" کی صورت اختیار کرتی رہی ہے۔ اور اگر ان کا یہ خیال صحیح ہو کہ جرمنی اور اٹلی لڑنا نہیں چاہتے تب بھی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دونوں کا فائدہ جنگ کی دھمکیاں دینے میں ہے، اور وہ یہ دھمکیاں اس خلوص کے ساتھ دیتے ہیں کہ نہ جانے کب ان کا جوش بے قابو ہو جائے اور وہ ایسا کچھ کر گذریں کہ پھر لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ بے شک مسٹر چیمبرلین نے پچھلے ستمبر میں یورپ کو ایک جنگ عظیم کے خطرے سے بچایا، لیکن انھوں نے ہٹلر اور مسولینی دونوں کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ جتنا بھی مانگیں انھیں مل جائے گا اگر وہ مسٹر چیمبرلین کے یہ ذہن نشین کر سکے کہ ان کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو جنگ چھڑ جائیگی۔ مسٹر چیمبرلین فرانس کی سرحد کو برطانیہ کی سرحد مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے پیر و مرشد مسٹر بولڈون کہہ گئے ہیں کہ برطانیہ کی سرحد دریائے رائن پر ہے، مگر وہ یورپ کی کسی اور ریاست کو سلامت رکھنے کی خاطر اپنی نیند خراب کرنا نہیں چاہتے۔ جرمنی مشرقی یوستان، شمالی اٹلی، شمالی اور مغربی پولینڈ اور جنوب مغربی روس پر قبضہ کر لے تو ان کی بلا سے، جنوبی افریقہ کو جرمنی کی جو نوآبادیاں جنگ عظیم کے بعد ملی تھیں وہ بھی شاید مسٹر چیمبرلین جرمنی کو دلوا دیں۔ مگر ہٹلر کی ہوس اس سے بھی پوری نہ ہوئی تو پھر؟ اور اٹلی نے مغربی بحر روم اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں مانگیں تب؟ انگلستان کی طاقت بڑی ہے تو اس کی سرحد بھی ہزاروں میل لمبی ہے، اور روٹھی ہوئی قوموں کو منانے کی پالیسی مورچے کا کام نہیں دے سکتی۔

فلسطین | برطانوی سیاست کا بھانڈا شاید کبھی اس طرح سے نہ پھوٹا ہوگا جیسے کہ فلسطین میں۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے جو متضاد وعدے برطانوی مدبروں نے لڑائی کے زمانہ میں کئے تھے ان کا اب یہ نتیجہ نکلا ہے کہ فلسطین میں کسی فریق سے پوری بات نہیں کہی جا سکتی، اور یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی ہے کہ اصول اور وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر اور جو کچھ ہو چکا تھا، یعنی فلسطین میں جتنے یہودی آباد ہو چکے تھے اور ملک پر حقدار ہونے کا جو خیال دنیا بھر کے یہودیوں میں پھیل چکا تھا اسے صحیح اور ضروری تسلیم کرکے سرکاری کمیشنوں کے ذریعے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جائے اور ایک عقلاً درست نظام قائم کیا جائے جسے دونوں فریق منظور کر لیں یا منظور کرنے پر مجبور کئے جا سکیں۔ اس سال جو کمیشن بھیجا گیا تھا اس نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کو رد کر دیا ہے اور اب برطانیہ کا ارادہ ہے کہ ایک گول میز کانفرنس کرکے عربوں اور یہودیوں کو اس نئے

کوئی فیصلہ جو فلسطین کے عربوں کو انصاف کے خلاف معلوم ہوا اس پر یہ سب بھی احتجاج کریں گے۔ اب دیکھنا ہے کہ گول میز کانفرنس کس طرح اس مسئلے کو حل کرتی ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی | ہسپانیہ کی خانہ جنگی سال بھر جاری رہی اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ہسپانی حکومت "اب آخری مورچے پر لڑ رہی ہے"، جسے "باغی" کسی طرح فتح نہیں کر پاتے۔ اب تک عدم مداخلت کی جو تشریح کی گئی، اس سے حکومت کے لئے بڑی دشواریاں پیدا ہوئیں اور جنرل فرینکو کو ہر طرح سے مدد پہنچتی رہی۔ لیکن اب جنرل فرینکو کے خیر خواہ باقوتوں کی مدد کرتے کرتے تھک گئے ہیں یا جس امید میں انھوں نے مدد کی تھی وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فون ربن ٹروپ نے فرانس کے وزیر خارجہ کو یقین دلایا ہے کہ ہسپانیہ میں چار ہزار سے زیادہ جرمن سپاہی نہیں، اور وہ بھی لڑتے نہیں ہیں بلکہ پیچھے سے سہارا دے رہے ہیں۔ مسولینی نے برطانیہ کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لئے دس ہزار سے اوپر اٹیلین سپاہی واپس بلا لئے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اب بھی بہت سے اٹیلین سپاہی جنگ میں شریک ہیں اور فرینکو کے پاس سامان بھی بہت بھیجا جا رہا ہے۔ سامان تو بہت کارآمد ہے، جس کا ثبوت ان بم کے گولوں سے ملتا ہے جو بارسلونا کے شہر میں گرتے ہیں اور معصوموں کا خون کرتے ہیں لیکن سنا گیا ہے کہ جب کبھی اٹلی کی طرف سے فرینکو پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ کر کے نہیں دکھاتے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کا سبب اٹیلین سپاہیوں کا نکما پن ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ ابھی تک اٹیلین سپاہیوں کی تعریف کسی نے نہیں کی ہے۔

ہسپانیوں کی طبیعت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ ان کی غیروں سے کبھی نبھی نہیں، اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر وہ افواہیں جو بہت دنوں سے پھیل رہی ہیں کہ قومی مزاج کی بدولت اٹلی اور فرینکو کا اتحاد پھیکا ہوتا چلا جاتا ہے صحیح ہوں، اور مسولینی کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہو کہ فرینکو اٹیلین سپاہیوں کے بل پر لڑائی جیتے گا اور پھر اٹلی کا جس طرح کہ چاہئے احسان ماننے سے انکار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑائی ختم ہونے پر فرینکو کی سیاست پلٹا کھائے گی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہسپانیہ میں اتنی غرضیں اٹکی ہیں کہ وہ اسے بہت کچھ خوشی سے دینے پر تیار ہو جائیں گے، مسولینی جو کچھ دینا تھا دے چکا ہے اور اب اس کے مانگنے کی باری آئی ہے۔ غالباً اس کے مطالبے ایسے ہوں گے جنھیں منظور کرنے میں فرینکو تامل کرے گا اور

برطانیہ اور فرانس پورا زور لگائیں گے کہ وہ انھیں منظور نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسولینی نے اتنا سب داؤں لگانے کے بعد بھی انگریزوں سے سمجھوتا کیا ہے، اور ان کے ذریعے سے ہی اپنا حق محفوظ کرانے کی گنجائش رکھی ہے، برطانیہ جس بات پر راضی ہو جائے اس کے خلاف فرانس کی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔

چین اور جاپان کی جنگ | ہسپانیہ کی طرح چین پر بھی سیاست کے گدھ منڈلا رہے ہیں اور نہ جانے کب تک منڈلاتے رہیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی ہر فریق کا اندازہ غلط ثابت ہو رہا ہے اور دونوں کی ضد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ جاپان نے یہ جنگ اس یقین کے ساتھ شروع کی تھی کہ چینی حکومت میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے فوجیں تیار نہ کر سکے گی۔ چین کے سرمایہ دار، زمیں دار اور ان سے بھی زیادہ وہ لوگ جو اطمینان سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جاپانی حکومت کا خیر مقدم کریں گے اور یہی زبردستی اور بے جا دخل اس کی ہر مشکل آسان کر دے گا۔ لیکن چینیوں نے بہت جم کر مقابلہ کیا، متواتر شکستیں کھانے کے باوجود چینی حکومت کا قوم میں اثر و اقتدار بڑھتا رہا، سرمایہ دار جاپانیوں کی ہوس، زمیندار دہقانوں کے غصے اور عدم رفو مزدوروں کے انتقام سے ڈر کر بڑی حد تک جاپانی حکومت سے الگ رہے ہیں اور چینی فوجوں نے قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کر کے جاپانیوں کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس وسیع علاقے کو جو انھوں نے فتح کر لیا ہے اپنا کہہ سکیں۔ لیکن دوسرے پہلو سے دیکھئے تو جاپانی فوج نے ہر سرحد فتح کیا ہے، آہستہ آہستہ چینی حکومت اور فوج کو جنوب مغرب کی پہاڑوں میں بند کر دیا ہے اور انھیں وہاں اتنے دنوں تک بند رکھ سکتی ہے کہ اخلاقی اطمینان اور قومیت کے جوش کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ رہ جائے۔ جاپانی قوم کی تنظیم ایسی ہے اور اس میں اتنی قوت کا مادہ اس افراط سے ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئی جو یہ کہتے تھے کہ جاپان کا دیوالہ نکل جائے گا یقیناً غلط ثابت ہوگی۔ جاپانیوں کا عزم اور استقلال بھوکے پیٹ سے ڈرنے والا نہیں۔

لیکن چین بھی بالکل بے بس یا لاوارث نہیں۔ چینی حکومت کو اس کی امید نہ تھی کہ جاپان کا میدان جنگ میں مقابلہ کیا جاسکے گا، اور چینیوں میں قومیت کا جذبہ اس طرح بیدار ہو گیا ہے کہ جنگ کے نتیجے کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب چین کے تمام بڑے شہر، آباد علاقے جاپانیوں کے قبضے میں ہیں اور سوا اس کے کہ دیہات میں جاپانی حکومت کا نہ اثر پھیلا ہے اور نہ زور چلتا ہے، چینی اپنی شکست سے انکار نہیں کر سکتے۔

لیکن جاپان کسی کو دوست بنانا جانتے ہی نہیں، اور ان کی سب سے ذرا ذرا سی بات پر غرانے اور دانت دکھانے لگتی ہے۔ اس لئے چینیوں کی یہ عداوت بہت دنوں تک قائم رہے گی، اور اگر [illegible] چینی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تب بھی جاپانیوں کو سارے ملک میں فوج رکھنا اور اس پر اتنا روپیہ خرچ کرنا ہوگا جو ان کی آمدنی کو کھا جائیگا اور غالباً سرمایہ دار بھی اتنے مطمئن نہ ہو سکیں گے کہ چین میں [illegible] سرمایہ لگائیں۔ [illegible] چینی حکومت کا خاتمہ بھی جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اب روس [illegible] یورپ [illegible] ہے کہ اس کی مدد کرے [illegible] دوسری قومیں بھی جاپانیوں کی کوشش دیکھ کر اسی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تجارت کا اصول یہ ہے کہ [illegible] فائدے کی توقع [illegible] اسی سبب سے انگریز اور امریکن جن کا کروڑوں کا سرمایہ چین میں لگا ہے اپنے کارخانوں اور کاروبار کو جہاں تک ممکن تھا چلاتے رہے اور جنگ کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے [illegible] لیکن [illegible] جیت جاتا ہے، اور اب تک کوئی چینی حکومت ملک میں اتنا [illegible] نہ پیدا کر سکی ہے کہ [illegible] چینیوں سے ایسا کام کر سکے۔ اس لئے انگریز اور امریکی سرمایہ داروں نے اپنی ہمدردی جتائی [illegible] کرنے کے [illegible] جاپان [illegible] بنے رکھنے کی کوشش کرتے رہتے۔ لیکن جاپان نے اب صاف کہہ دیا ہے کہ [illegible] کا دروازہ بین الاقوامی تجارت کے لئے کھلا رکھنے پر راضی نہیں، اور جاپانی [illegible] اور [illegible] کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ چین میں جاپانی حکومت قائم ہو گئی تو یقینی نہیں کہ آزاد تجارتی مقابلے کی ذرہ بھی گنجائش نہ رہے گی بلکہ ہر طرح سے جاپانی تجارت کو فائدہ اور باقی تمام قوموں کو نقصان پہنچانے کی منظم کوشش کی جائے گی، یہاں تک کہ اور تمام قوموں کی تجارت چین کو چھوڑ جائے۔ یہ صورت حال دیکھ کر برطانیہ اور امریکہ اب نئے سرے سے اپنے نفع نقصان کا حساب لگا رہے ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر چین کی مدد کرنے میں انھیں اپنا نقصان پورا کرنے کی کوئی تدبیر سوجھے۔

انگلستان کے لئے یہ بات خاص طور سے خطرناک ہے کہ جاپان اس کے نفع نقصان کا ساتھ نہیں لگاتی، ضد کرتی ہے اور اپنی قوم کے مطالبے سے بالکل نہیں ڈرتی۔ انگلستان نے منچوکو پر جاپان کا قبضہ ہو جانے دیا۔ اس امید سے کہ کچھ دنوں کے لئے جاپان کا پیٹ بھر جائے گا۔ لیکن جاپان سیر نہ ہوا

اور چین پر منہ مارا۔ اس پر بھی انگلستان نے چوں نہیں کی۔ مگر جاپان کی ہوس کا وہی عالم ہے۔ اب انگلستان کو ایک تو اس کی شکایت ہے کہ چین میں اس کا جو کاروبار تھا وہ ختم کیا جا رہا ہے اور دوسرے اس کا خوف کہ جاپان نے چین کو بالکل فتح کر لیا تو وہ اور پاؤں پھیلائے گا۔ اور پھیلائے گا تو کدھر؟ آسٹریلیا کی طرف، ایشیا کے جنوب مشرقی جزیروں کی طرف، ہند چینی کی طرف، یا پھر برما، جس کی سرحد چین سے ملی ہوئی ہے اور جو خام مال اور قدرتی ذخیروں کا ایک بے مثل خزانہ ہے۔ اب انگریز جاپانیوں کو ڈانٹ، نصیحت نہ کریں تو کیا کریں۔ زبردست ظالم کی سیاست اسی طرح اپنی جڑ کاٹتی ہے۔ جاپان کی ہوس حد سے گزر نہ جاتی تو مانچوکو کی طرح چین بھی اس کا تھا اور مشرقی ایشیا کی فرماں روائی بھی۔ اسی معاملے کو مگر دوسرے پہلو سے دیکھیے تو قدرت اپنا کام بنا رہی ہے۔ اعتدال کی مصلحت ظلم کی سمجھ میں آ جائے تو دنیا میں انصاف کا نام تک باقی نہ رہیگا۔

ہندوستان

صوبائی خود مختاری

ہندوستان کے تمام خود مختار صوبوں کے لئے ۱۹۳۸ء کا سال تعمیری کاموں اور اصلاحی کوششوں کا سال تھا۔ لیکن کانگریسی صوبوں میں خصوصیت کے ساتھ کام کو زیادہ یکسوئی، اطمینان اور حوصلہ مندی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی تھی اور باقی صوبوں میں پنجاب کو چھوڑ کر کانگریس کی حیثیت ایسی تھی کہ اتحادی حکومت کے بنانے کا اسے موقع تھا۔ چنانچہ بعد میں آسام میں مکمل طور پر اور سندھ میں نامکمل طور پر کانگریسی حکومت بنا بھی لی گئی۔ بنگال کی غیر کانگریسی اتحادی وزارت کو کئی موقعوں پر نازک دوروں سے گذرنا پڑا اور اب بھی اس کا امکان ہے کہ وہاں کانگریس کی اتحادی حکومت قائم ہو جائے۔ ہندوستان کے اتنے صوبوں میں اپنی پارٹی کی طاقت کو دیکھ کر قدرتی طور پر اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت اور بھی زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم تھی۔ کانگریس کے جتنے کارکن اور رہنما اسمبلیوں کے اندر کام کر رہے تھے ان سے زیادہ قابل، زیادہ منضبط، زیادہ مخلص، زیادہ آزمودہ، زیادہ معرکہ پسند اور زیادہ ٹھوس کام کرنے والے کارکن اور رہنما اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے۔ درحقیقت کانگریس کی اصلی قوت اسمبلیوں سے باہر تھی اور اسمبلیاں صرف اس باہر کی قوت کو مضبوط بنانے کے لئے اور اس کے اغراض اور احکام کی پورے طور پر پابند اور مطیع ہو کر کام کر رہی تھی۔ کانگریسی حکومتیں صرف اس لئے بنائی گئی تھیں تاکہ باہر کا کام اچھی طرح کیا جا سکے اور اس میں حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔

چنانچہ کانگریس نے اس زمانے میں ہر ضلع، ہر تحصیل اور بہت سے گاؤں میں اپنے نہایت مخلص، معتمد اور ایثار پیشہ کارکنوں کا جال پھیلا دیا۔ کانگریس نے دراصل دو متوازی مشینوں کے ذریعہ سے اپنے تعمیری کام

کو چلایا۔ ان میں سے ایک مشین کے کل پرزے اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے جن پر اسے مکمل اور آخری اختیار حاصل تھا اور جن پر وہ پورے طور پر اعتماد کر سکتی تھی اور دوسری مشین کے کل پرزے وہ تھے جو حکومت برطانیہ کی طرف سے اسے دئے گئے تھے۔ جو ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی دفعات کے اندر رہ کر تو کانگریسی وزراء کی اطاعت کر سکتے تھے لیکن اس سے باہر ان کی وفاداریاں بھروسہ کے لائق نہیں تھیں۔ اس لئے جہاں تک اپنے تعمیری کام اور عوام میں اپنا رسوخ بڑھانے کے سلسلہ میں، کانگریسی حکومت، اس دوسری جماعت سے مدد لے سکتی تھی وہاں تک تو اس نے ان کی مدد لی۔ لیکن اس سے زیادہ پروپیگنڈا کرنے اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کانگریس نے اپنی نجی مشین کے کل پرزوں کو استعمال کیا اور دیہاتوں میں جا کر ضلع اور صوبہ کی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں لاکھوں کی تعداد میں کسان شریک ہوئے اور جن کی اہمیت اور اثر صوبہ کے وزیروں کی شرکت کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔

پھر زمینداروں اور مل کے مالکوں کے خلاف جن میں سے اکثر کانگریس کی مخالفت کرتے رہے تھے زبردست مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں لیکن اس سلسلے میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کو کانگریس نے بالکل مایوس نہیں کیا بلکہ تھوڑا سا پریشان کر کے تحفظ کا اطمینان دلادیا تاکہ وہ بالکل بددل ہو کر پورے طور پر برطانیہ کے طرف دار نہ بن جائیں۔

ملک کی دیسی زبانوں اور انگریزی کے اخباروں کی بھی سرپرستی کی گئی۔ ان میں سے بہت سے اخبار تو پہلے سے ہی کانگریس کے حامی تھے اور بہت سے اس زمانے میں حامی بن گئے باہر کے ملکوں میں بھی خصوصاً برطانیہ میں پروپیگنڈے کا معقول انتظام کیا گیا۔

ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا ایک بڑا گروہ چونکہ کانگریس کے ساتھ ابتدا سے رہا ہے اور ملک کی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ جس کی کانگریس زبردست حامی ہے اپنے مفاد کو وابستہ سمجھتا ہے اس لئے کانگریس کو مالی دشواریوں کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا۔ پھر اس زمانے میں تو کانگریس کو صوبوں کی آمدنی کے وسائل پر بھی پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس لئے مالی وسائل کی طرف سے کانگریس کو پورے طور پر بے فکری رہی۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی صورت حال کی نزاکت اور حکومت برطانیہ کی پریشانیاں بھی کانگریسی

حکومت کے لئے ایک برکت ثابت ہوئیں جنگ کا خطرہ برابر قائم رہا اور برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو مطمئن پر امن اور دوست رکھنے کی پالیسی پر پوری طرح عمل ہوتا رہا اس زمانے میں برطانیہ کی برابر یہ خواہش رہی کہ ہندوستان میں ایک ایسی طاقتور جماعت بر سر اقتدار رہے جس سے ضرورت کے وقت سمجھوتہ کیا جا سکے تاکہ سمجھوتہ کے بعد ہر طرح کے خطروں اور اندیشوں کی طرف سے اس کے اشتراک عمل کی وجہ سے اطمینان ہو جائے۔

یہ تمام وجوہ ایسے تھے جن کی بنا پر کانگریسی حکومتیں بہت سے ان کاموں کو جرأت اور حوصلہ کے ساتھ کر سکیں جن کو کرنے میں دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو کانگریس کی رہنمائی کے بغیر یا تو پس و پیش ہوا یا اگر ہمت کر کے شروع کیا تو بعد میں سخت مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

صوبوں کی حکومتوں کی کچھ کارگذاریاں تو ایسی ہیں جن کی نوعیت منفی ہے ؎

مرا بہ خیر تو امید نیست بد مرساں

اور کچھ ایسی جن کی نوعیت اثباتی ہے پہلی کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو نہیں ہونے دیا جن سے صوبوں کی خود مختاری کم یا ختم ہو سکتی تھی اور دوسری کا یہ کہ انھوں نے ایسے کام کئے جن سے واقعی رعایا کی حالت میں پہلے کے مقابلہ میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔

منفی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ان حکومتوں نے ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی ان دفعات کو جن کا تعلق "تحفظات" سے تھا عملاً بے کار کر دیا۔ پندرہ سولہ مہینہ میں ایک مرتبہ بھی گورنر کو اپنے "خاص اختیارات" یا "اختیار تمیزی" کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ تو اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلہ میں نہ انڈین سول سروس یا کسی دوسری سروس کے کسی ممبر کے لئے۔ قانون اور امن کی حفاظت اور فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام بھی وزیروں نے خود ہی کر لی اور اس کام کے لئے ان اختیارات کے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جو ان سے پہلے برطانوی حکومت خود ان کے خلاف استعمال کیا کرتی تھی۔ اس پر کانگریس کا انتہا پسند طبقہ کانگریسی وزیروں اور کانگریس کے برسر اقتدار رہنماؤں سے جنھوں نے ان کی تائید کی سخت ناراض بھی ہو گیا ہے۔ لیکن گورنر کو بہرحال اپنے اس تحفظی اختیار کو استعمال

کرنے سے محروم رکھا گیا۔ ممکن ہے گورنر اپنی جگہ پر خوش ہو کہ اس ناخوش گوار کام سے مجھے نجات ملی اور جس کام کو مجھے بہ اکراہ کرنا پڑتا وہ ان لوگوں نے اپنی خوشی سے کر دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر محرومی کا یہ سلسلہ اسی طرح کچھ سالوں تک اور چلتا رہا تو یہ روایت قائم ہو جائے گی کہ گورنر کو جو اختیارات دئے گئے ہیں وہ استعمال کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ محض نمائشی ہیں جیسے ہاتھی کے دانت ہوتے ہیں۔ جو یہ ظاہر تو بہت بڑے اور خوف ناک معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سے کاٹنے اور چبانے کا کام کبھی نہیں لیا جاتا۔ یہ تو وزارتوں کا منفی کارنامہ ہوا۔

اثباتی کارناموں کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۳۵ء کے دستوری قانون کے ماتحت صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ مالیات کو مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومت کے درمیان اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اس کا توازن قائم نہیں رہا ہے۔ آمدنی کے ترقی کرنے والے ذرائع مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں جو ملک کی آمدنی کے ایک بڑے حصہ کو صرف فوجوں پر اور سرکاری قرضوں کے سود کی ادائگی پر صرف کر دیتی ہے جس کی وجہ سے قومی تعمیر کے تمام شعبے پیاسے رہ جاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ کانگریسی حکومتیں شراب نوشی کو بند کرنے کا عہد کر چکی ہیں اور لگان کے اس غیر معمولی بوجھ کو بھی ہلکا کرنا چاہتی ہیں جو چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کو پیسے ڈال رہا ہے۔ ان کے اختیارات کے محدود ہونے کا اندازہ صوبہ مدراس کی مثال کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس صوبہ کی کل آمدنی سترہ کروڑ ہے اس میں سے ۴½ کروڑ روپیہ نشہ کی چیزوں کی فروخت سے اور ۶ کروڑ زمین کی مال گزاری سے وصول ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مصارف کو وسیع کرنے کی گنجائش جس قدر کم ہے وہ ظاہر ہے۔ صوبہ کی حکومتیں اپنے کاموں کو نئے ٹیکس لگا کر ہی چلا سکتی ہیں لیکن جب تک ملک کی پوری مالی اور معاشی عمارت کو نئے سرے سے تعمیر نہ کیا جائے۔ امیروں پر غریبوں سے نسبتاً زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے، تباہ کن فوجی اخراجات کو گھٹا کر نصف نہ کیا جائے اور سول ملازموں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور غیر دولت آفرین قرضوں کے سود کو کم نہ کیا جائے، اس وقت تک قومی تعمیر کے محکموں کی ترقی اور توسیع کا امکان بہت کم ہے۔

لیکن ان محدود اختیارات کے باوجود صوبہ کی وزارتیں جو کچھ کر سکتی تھیں اس کے لئے پوری کوشش کر رہی ہیں۔ سب صوبوں میں زمین کے لگان اور مالگذاری کو کم کرنے اور کسانوں کو زیادہ حقوق دینے کے

لئے قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ یو.پی۔ اور صوبہ بہار کے لئے یہ مسئلے خاص طور پر بہت اہم بن گئے تھے۔ صوبہ بہار میں تو زمینداروں اور کسانوں میں اس معاملہ میں ایک سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ یو۔ پی۔ میں بھی اس قسم کے سمجھوتہ کی کوشش کی گئی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسی طرح کسانوں کو قرضہ کے بوجھ سے نجات دلانے، کم شرح سود پر روپیہ حاصل کرنے، مال کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے اور دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ پنجاب میں ان قوانین کا بڑا چرچا رہا۔ حکومت کے مخالفوں نے ان کو "کالے قوانین" اور حکومت کے حامیوں نے "سنہرے قوانین" کے نام سے موسوم کیا۔ اصلاح دیہات کی طرف بھی توجہ کو بڑھا دیا گیا ہے۔ دیہی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی اور امداد کے کام سے بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مل کے مزدوروں کے فائدہ کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ مزدوروں کی انجمن کی طرف سے بمبئی کے تجارتی تنازعات کے قانون کی بڑی مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ اس میں مل کے مالکوں کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف ایک اسٹرائک کرنا چاہا جس کی کانگریسی حکومت نے سخت مخالفت کی۔ بڑی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی ایک صنعتی تنظیم کمیٹی کا کانگریس کی طرف سے تقرر کیا گیا ہے جس کے جواہر لال جی چیرمین ہیں۔ اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ ملک میں جو چند بڑی صنعتیں قائم ہو چکی ہیں مثلاً پارچہ بافی، شکرسازی، جوٹ، لوہا اور فولاد اور قوت محرکہ پیدا کرنے والی صنعتیں ان کو پوری ترقی دی جائے اور دوسری طرف ایسی صنعتیں جیسے موٹر کار، وزنی مشینری اور وزنی کیمیاوی صنعتیں وغیرہ ان کو شروع کیا جائے۔ بنیادی صنعتوں کی طرف بھی جن پر تمام بڑی، درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کا انحصار ہوتا ہے خاص طور پر توجہ کی جائے۔

اس کے علاوہ تعلیم کی اصلاح کی کوشش کو بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں ذاکر حسین کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق بہت سے صوبوں میں ٹریننگ اسکول اور تجربے کے مدرسے قائم کر دئے گئے ہیں بالغوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم کی نئی تنظیم کے لئے بھی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ لیکن وسائل کی کمی کی بنا پر ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

کانگریسی صوبوں میں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں اور موجودہ حالات

میں کسی بڑی اصلاح کا کرنا ممکن نہیں ہے خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر ان ہی کاموں کی طرف توجہ کی جائے جن سے پرانے ساتھیوں کی رفاقت اور وفاداری کو مضبوط کیا جا سکے اور نئے لوگوں کو زیادہ تعداد میں اپنا طرفدار بنایا جا سکے اور یہ سب اس لئے کیا گیا تاکہ جب نئے انتخابات ہوں یا حکومت سے جنگ کرنا پڑے تو زیادہ لوگوں کی ہمدردی اور امداد حاصل ہو سکے۔ سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا، بہت سی کتابوں سے امتناعی احکام اٹھا لئے گئے ہیں، ضبط شدہ جائدادوں کی واپسی کا مسئلہ بھی زیر غور رہا۔ سیاسی فضا میں بہت زیادہ آزادی محسوس کی جانے لگی۔ کانگریسی جماعت کا ہر فرد محسوس کرنے لگا کہ حکومت میری ہے۔ ہم چشموں میں اعزاز اور مالی فائدہ بھی حاصل ہوا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے کانگریس کو اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعض صوبوں میں مثلاً سی۔ پی۔ میں کانگریسی کارکنوں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے کانگریس کے بعض پرانے اور نہایت مخلص کارکن اس سے علیحدہ بھی ہو گئے لیکن ان کی مخالفت کو بہت کم اہمیت حاصل ہوئی۔

اگر برطانوی سیاست والوں کا کانگریس کو عہدے دینے سے مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے لوگوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ذاتی خودغرضیاں ترقی پا جائیں گی تو ان کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ خودغرضی کی چند مثالوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بصورت مجموعی کانگریس کا ڈسپلن نہایت قابل تعریف نظر آئے گا۔ حکومت اور اقتدار کی حالت میں ان کی یکجہتی اور وفاداری کسی اعتبار سے بھی جنگ اور آزمائش کے زمانہ سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ ڈسپلن کی گرفت اس زمانہ میں اتنی سخت ہو گئی کہ جس سے مخالفوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کا ہے۔ کانگریس کی ہائی کمانڈ صوبوں کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کرتی ہے اور وزیروں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ وزارتوں کو صرف اپنی اسمبلی کے ممبروں اور اپنے منتخب کرنے والوں کو جواب دہ ہونا چاہیئے اور ان پر کسی دوسرے شخص یا جماعت کا کوئی خارجی دباؤ نہ پڑنا چاہیئے۔ وزارتیں اپنے صوبہ کی رہنما خود ہیں ان کی رہنمائی یا نگرانی کرنے کا حق، صوبوں کی کسی جماعت مثلاً صوبہ کانگریس کمیٹی یا باہر کی کسی جماعت یعنی آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی یا پارلیمنٹری بورڈ کو نہیں پہنچتا۔ اس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہماری

جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ہم پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم اتحاد و یک جہتی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم اسمبلیوں میں کام کرنے کے لئے نہیں گئے ہیں بلکہ اسمبلیوں کو ایک محاذ جنگ بنانے کے لئے گئے ہیں۔ ہمارا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا ہے اور ہمارے تمام کام اسی اعلیٰ مقصد کے پابند ہیں اور اس اعلیٰ تر مقصد کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا فیصلہ وہی لوگ بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں جو اسمبلیوں سے باہر تمام ہندوستان کو آزاد کرانے کی تجویزوں اور منصوبوں پر غور کر رہے ہیں اور جن کو پوری قوم کا اعتماد اور اعتبار حاصل ہے۔

فیڈریشن ۱۹۳۵ء کے دستور کے مرکزی حصہ یعنی وفاقی حصہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس سال بھی برابر جاری رہی ریاستوں کے حکمرانوں سے حکومت ہند مشورے کرتی رہی۔ گاندھی جی کی لارڈ لنلتھگو وائسرائے اور میور ہیڈ وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وائسرائے کئی مہینہ تک انگلستان میں بھی رہے۔

کانگریس بھی اس طرف سے غافل نہیں رہی۔ تجویزیں اور منصوبے بناتی رہی۔ بیانات اور قرار دادیں شائع کرتی رہی۔ بھولا بھائی اور جواہر لال صورت حال کا مطالعہ کرنے کے لئے انگلستان بھی گئے۔ مسٹر ستیہ مورتی نے بھی اپنی پرانی عادت کے مطابق اعتدال پسند لوگوں کے نقطہ نگاہ کی وضاحت کر دی۔ سوبھاش چندر بوس صدر کانگریس نے اعتدال پسندی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے ساتھ کانگریس نے اخلاقی ہمدردی کا اظہار کیا اور بالواسطہ امداد بھی کی جس سے بہت سی ریاستوں میں ان تحریکوں نے بڑی قوت اختیار کر لی۔ گولیاں چلیں جانیں گئیں، بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں۔ تحریک کو دبانے کے لئے اور مختلف کارروائیاں اختیار کی گئیں۔ لیکن یہاں بھی کانگریس نے وہی رویہ اختیار کیا جو اس نے صوبوں میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ رعایا کو کچھ حقوق دلا کر حکمرانوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے کہ اگر وہ ذمہ دار حکومت قائم کر کے اپنی ریاستوں میں کانگریسی یا قومی خیال کی وزارت کے قائم ہونے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے تو ان کے حکمرانی کے حق کا کانگریس تحفظ کرے گی۔ وائسرائے نے اپنی کلکتہ کی تقریر میں فیڈریشن کو بلا کسی ترمیم کے جلد نافذ کرنے کی طرف اشارہ کیا جس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے تری پورہ کانگریس کے بعد سول نافرمانی شروع کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کانگریس اور لیگ کے تعلقات اس پورے زمانہ میں نہایت ناخوشگوار رہے ہیں۔ ابتدا میں الزامی شکایتوں اور گفتگوئے مصالحت کا وہی غیر نتیجہ خیز سلسلہ جاری رہا جو اس سے پہلے کے دو سالوں میں جاری رہ چکا تھا۔ پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے جناح نہرو خط کتابت کو کسی شخص نے اڑا کر شائع کر دیا۔ اس کا کچھ دنوں تک چرچا رہا۔ پھر دوبارہ گفتگوئے مصالحت شروع ہوئی جس میں مہاتما گاندھی اور سوبھاش چندر بوس نے مسٹر جناح سے گفتگو کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے کانگریس کی زیادتیوں، بدعنوانیوں اور بدنیتیوں کے خلاف احتجاج ہوتے رہے۔ پھر بھی لوگوں کو یہ امید رہی کہ ممکن ہے لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن سال کے اخیر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اور اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لیگ کی معرفت نہیں بلکہ براہ راست مسلم عوام سے رابطہ پیدا کرے گی اور اس کے لئے زیادہ منظم طور پر کوشش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

لیگ کی مقبولیت اس زمانہ میں مسلم عوام میں بڑھتی رہی۔ جہاں کہیں لیگ کے جلسے ہوئے یا جلوس نکالے گئے بہت بڑی تعداد میں لوگ ان میں شریک ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود سندھ میں لیگ کی وزارت قائم کرنے میں مسٹر جناح کو ناکامی ہوئی۔ اسی طرح آسام میں سر سعد اللہ کی لیگی وزارت جسے دراصل یورپین اور مسلمانوں کی اتحادی وزارت کہنا چاہیئے (کچھ مسلمانوں کے کانگریسی پارٹی میں مل جانے کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ بنگال کی لیگی اتحادی وزارت کے بارے میں بھی جو یورپینوں کے اتحاد کی وجہ سے قائم ہے کئی دفعہ ٹوٹنے کی افواہیں مشہور کی گئیں لیکن ابھی تک تو وہ سخت جان ثابت ہوئی ہے اگرچہ ایک دفعہ ٹوٹ کر دوبارہ بن چکی ہے اور اس کے کچھ مسلمان ممبر کانگریس کی پارٹی سے جا ملے ہیں۔ اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کا سندھ، آسام اور بنگال میں اس طرح مسلم لیگ سے علیحدہ ہو جانا لیگ کی مضبوطی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے نظام کی اندرونی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ لیگ (جو اپنے آپ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کہتی ہے) کانگریس کے خلاف ہے پھر بھی مسلمان، کانگریس کے ساتھ معاملہ اور ساز باز کرتے رہے خصوصاً سندھ جیسے صوبہ میں جہاں مسلمان ۷۱ فی صدی کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے اندر مسلم لیگ کے لئے بہت بڑی دعوت فکر و عمل موجود ہے۔

صنعتوں کے لئے تنظیمی کمیٹی | اکثر وہ چیزیں جو قریب ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بہت بڑی نظر آتی ہیں جب دور ہٹ جاتی ہیں تو زیادہ بڑی نہیں رہتیں۔ یہی حال واقعات کا بھی ہے۔ ہندو مسلم اختلاف کے واقعات جن سے آج کل اخباروں کے صفحے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں یا کسانوں اور زمینداروں مل کے مالکوں اور مزدوروں اور کابینہ کے وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے وہ جھگڑے جنہیں بہت نمایاں جگہ دی جاتی ہے ہوسکتا ہے کہ بجائے خود آئندہ کے مورخ کو دریا کے سطح کی محض ہلکی لہریں نظر آئیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں اور گہری اور تختہ الٹ دینے والی موجیں وہ ثابت ہوں جو اس وقت نگاہ سے چھپی ہوئی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ گذشتہ سال کے واقعات میں صنعتی تنظیمی کمیٹی کے تقرر کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے۔ اس کمیٹی کی کوششوں کے زیر اثر ہندوستان کی زندگی میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی ان کا اثر ان تبدیلیوں سے کئی گنا زیادہ بڑا ہوگا جو کسانوں کے لئے قوانین بنا کر اس وقت کی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے حقیقی مسئلہ کا تعلق تقسیم دولت سے اتنا نہیں ہے جتنا پیدائش دولت سے ہے۔ کسانوں کے لئے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان سے زمینداروں کا ممکن ہے بہت کچھ نقصان ہوجائے لیکن ان سے کسانوں کے پلہ کچھ زیادہ نہیں پڑے گا۔

گذشتہ اکتوبر میں دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس کے ختم ہوجانے کے بعد مسٹر گیری وزیر صنعت مدراس کی دعوت پر تمام کانگریسی صوبوں کے صنعتی وزرا کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کے سامنے سوال یہ رکھا گیا تھا کہ آیا مختلف صوبوں میں بڑے پیمانہ کی نئی صنعتوں مثلاً موٹر سازی کی صنعت وغیرہ کو حکومتوں کی مربیانہ سرپرستی میں فوراً شروع کرا دیا جائے یا صوبوں کے باہمی مقابلہ اور ملک کے سرمایہ کے مسرفانہ استعمال کا سد باب کرنے کے لئے ایک مناسب منصوبہ پہلے سے بنا لیا جائے تبادلہ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ معاملات اتنے سادہ اور سہل نہیں ہیں کہ ان کا فیصلہ ایک دو جلسوں کی عام گفتگو سے ہوجائے اس کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی بنانے کی ضرورت ہے جس میں فنی اور مالی ماہروں کا شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ اور اس کمیٹی کا پہلا جلسہ گذشتہ دسمبر میں جواہر لال جی کی صدارت میں بمبئی میں ہوا۔ اور اب اس کی طرف سے ایک ہمہ گیر سوال نامہ شایع کیا گیا ہے۔

صدمات | گذشتہ سال چار عزیز ہستیوں کی موت کے صدمات کو ہمیں برداشت کرنا پڑا یعنی ڈاکٹر اقبال مرحوم غازی

مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور بیگم انصاری مرحومہ۔

ڈاکٹر اقبال | ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا دنیائے اسلام اور انسانیت پر جو بیش بہا احسان ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے کبھی بھی بھلایا جا سکے۔ نئی نسلیں آتی رہیں گی اور اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتی رہیں گی اور اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتی رہیں گی۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ فوت ہو گئے غلطی ہے۔ وہ مرے نہیں بلکہ دائمی زندگی انھوں نے حاصل کرلی۔ ہم سب کے دل پہلے کی طرح اب بھی ان کے کلام کی لطافتوں اور بلندیوں سے معمور ہیں اور ہم میں سے ہر شخص حسب استعداد و حیثیت ان سے لطف اور فیض حاصل کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

غازی کمال پاشا | غازی کمال پاشا ہرچند ہندوستانی نہیں تھے اور ہندوستان کے واقعات میں ان کی وفات کا تذکرہ بعض لوگوں کو شاید عجیب معلوم ہوگا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خلافت کی تحریک کے زمانہ میں ترکی کی مملکت صوبہ مدراس سے بھی زیادہ قریب رہ چکی ہے اور ترکی کی سیاست ہندوستان کی سیاست سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ترکی کے ہیرو مصطفےٰ کمال کو ہندوستان کا ہیرو کہنا غلط نہیں ہے۔ چنانچہ جس طرح ہندوستان کے طول و عرض میں غازی مصطفےٰ کمال کے انتقال کا ماتم کیا گیا ہے اس سے اس بات کا پورا ثبوت بھی ملتا ہے ترکی کی مملکت کو زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی اور استقلال کی راہ پر لگانے میں مصطفےٰ کمال کا جو حصہ ہے وہ اتنا مشہور ہے کہ اس کے لئے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مملکت ترکی اسلامی دنیا اور انسانیت اپنے اس محسن کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

مولانا شوکت علی | مولانا شوکت علی کی موت ایک نہایت قریب ترین عزیز کی موت ہے مسلم عوام کے دل جس طرح علی برادران کی طرف کھنچتے تھے ویسے کسی دوسرے رہنما کے لئے کبھی نہیں کھنچے۔ علی برادران کی پرانی ہر دلعزیزی خلافت تحریک کے بعد بہت کچھ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود آج بھی مسلم لیگ کے لئے مولانا شوکت علی ایک نہایت زبردست ستون تھے اور کانگریسی امیدواروں کے خلاف مسلم لیگ کو جو کامیابیاں ضمنی انتخاب میں ہوئی ہیں ان کا سہرا بہت بڑی حد تک مولانا شوکت علی مرحوم کے سر ہے۔ مولانا شوکت علی نے اپنی پوری زندگی ایک وسیع القلب انسان کی حیثیت سے گذاری۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں سے تھے۔ اولڈ بائے کی حیثیت سے علی گڑھ سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ ترکی پر جب

جنگ بلقان اور طرابلس کے سلسلہ میں مصیبت نازل ہوئی تو بے چین ہو گئے اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ اس ہمدردی کی وجہ سے چھند واڑہ میں نظر بند کر دئے گئے۔ جنگ عظیم کی شکست کے بعد جب ترکی کے حصہ بخرے کئے گئے اور مقامات مقدسہ پر غیر مسلموں کا اثر بڑھنا شروع ہوا تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ خلافت تحریک کو شروع کیا اور جس بڑے پیمانہ پر چلایا وہ ان ہی جیسے عظیم الجثہ اور عظیم المرتبت شخص کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی اسلامی ممالک کی سیاسیات اور ان کی فلاح وبہبود سے ان کی دلچسپی آخری دم تک قائم رہی۔ مرحوم صاف دل اور صاف گو آدمی تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے لیکن زمانہ ایسا ناساز گار رہا کہ ان کی یہ دلی تمنا ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔

بیگم انصاری | بیگم انصاری مرحومہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی رفیقہ حیات ہونے کی وجہ سے قوم کی عزت ومحبت کا مسکن تھیں مرحومہ کے دل میں بھی قوم، ملت اسلامی اور انسانیت کی محبت اتنی ہی زیادہ تھی جتنی ڈاکٹر انصاری مرحوم میں تھی۔ مرحومہ نے ڈاکٹر انصاری کی غیر طبی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ جامعہ ملیہ کو عطا فرمایا تھا اور چین کو جو طبی مشن روانہ کیا گیا ہے اسے ڈاکٹر انصاری کے آپریشن کے اوزار عنایت فرمائے تھے۔

خدا ان مرحوموں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

(از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن))

تہذیب کا لفظ ہمارے زمانے کی عجائبات میں سے ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مہذب ہونے کا یقین رکھتا ہے، ہر قوم اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنی تہذیب کی قدر کرے اور دنیا سے اس کی قدر کرائے۔ لیکن تہذیب کے معنی پوچھئے تو ہر شخص اس کی ایسی تشریح کرتا ہے کہ جس سے اس کا اپنا مذاق، اپنے خیالات، اپنا رہن سہن تہذیب کا لب لباب معلوم ہوتا ہے، اور قومیں اپنی تہذیب کے گن گاتی ہیں تو اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور سیاست اور جنگ میں جتنی ان کو کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تہذیب پھیلی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو تہذیب کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی صحیح تعریف ممکن نہیں، اور یا اتنا تنگ کہ اس کے وجود ہی کا یقین نہیں رہتا۔

اسلامی تہذیب کی تعریف کرنا اور بھی مشکل ہے، کہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں، اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا اتنا ہی دشوار جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے۔ اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں، زور باندھا ہے، وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے، اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا تو کبھی سیاست کا، کبھی دوسروں کے اثر کو جسے جان کر مٹایا، کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، کبھی انا ولا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل گئی، فضا کی ایک کیفیت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئی، دن کا اجالا اور رات کا سکون بن کر زندگی میں گم ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا اتار چڑھاؤ ایسا رہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ مذہب اور تہذیب کے مفہوم پر غور کرتے رہے ہیں،

اس وقت اگر ہم بیٹھ کر سوچیں تو ہم بھی اسلامی تہذیب کا ایک خاکہ تیار کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے بناتے بناتے ہم ایسا کچھ بنا لیں کہ جو چاہے زبان سے بیان نہ ہو سکے، دل میں گھر ضرور کر لیگا۔

ایک بات کا خیال ہم کو خاص طور پر رکھنا ہوگا، اور وہ یہ کہ اسلامی تہذیب نے کبھی اپنے اور غیر کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی، مسلمانوں کو کبھی نرالے اور انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا، اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جن پر فوراً نظر پڑتی، اور جو آسانی سے بیان کر دی جائیں۔ اس کے برعکس ہماری تہذیب کا میلان ہمیشہ پھیلنے، دوسری تہذیبوں سے اثر لینے اور ان پر اپنا اثر ڈالنے کی طرف تھا، اور اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح، اچھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم نے کتنا دیا اور کتنا لیا۔ ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہ لگائی بلکہ ایسی طرح ملے جیسے کہ شکر اور پانی۔ یورپ والے اب صدیوں کی حجت کے بعد ماننے لگے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے علم کو بہت بڑھایا اور پھیلایا۔ لیکن یہ دعویٰ اب بھی شاید ہی کوئی تسلیم کرے کہ بول چال کی زبانوں کو ادبی زبانیں بنا نا مسلمانوں کی ایک خاص خدمت تھی۔ ہماری تہذیب کا اثر روحانی، ذہنی اور جسمانی تندرستی کی طرح تھا جو کہ خود محسوس نہیں ہوتی، جس کی کیفیت بیان کیجئے تو خود ستائی معلوم ہوتی ہے، اور جس کے موجود نہ ہونے یا ضایع ہو جانے کا غم بھی اکثر نہیں کیا جاتا، اس لئے کہ خود فریبی انسانیت کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

اسلامی تہذیب میں نمایاں ظاہری علامتیں خاص طور پر اس وجہ سے پیدا نہیں ہو سکیں کہ مذہب اسے ہمیشہ ہموار کرتا رہا، اسلام، بجائے اس کے کہ تہذیب کی خلعت پہن کر الگ عزت کے مقام پر بیٹھ جائے، خود تہذیب کے مقام کو بدلتا اور اس کی حیثیت کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کبھی تہذیب کے ہم معنی، یعنی تہذیب میں گرفتار نہ ہوا، مسلمان کبھی اتنے مہذب نہ ہو سکے کہ اسلام سے غافل ہو جائیں، ان کا دین ان کی دنیا کو جھنجھوڑتا رہا، جیسے کوئی استاد نیند کے ماتے شاگرد کو۔ اس وقت بھی اگر آپ دیکھئے تو تہذیب ابھی انگریزی حکومت کا سہارا لیکر اور مغرب کی علمی ترقیوں کی قسمیں

کھاکر۔ مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کرچکی ہے اور کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ہم دوسری قوموں کی طرح مذہب کو چھوڑ کر تہذیب کو پکڑ نہیں سکتے، اس وجہ سے ہم دوسروں سے کم سمجھے جاتے ہیں اور ہماری ہنسی بھی اڑائی جاتی ہے۔ لیکن تہذیب کے ناعاقبت اندیش فدائیوں کی ضد میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم صرف مذہب کو جانتے ہیں تہذیب کو نہیں جانتے، اس لئے کہ پھر ہمیں ہر موجودہ تہذیب سے قطع تعلق کرکے بالکل صحیح قرآنی تعلیم کی بنیاد پر ایک نئی اور سب سے الگ زندگی کی طرح ڈالنا ہوگی۔ یہ ممکن تو بیشک ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ہماری زندگی میں آگے چل کر ایسا کوئی انقلاب ہو جو موجودہ تہذیب کی عمارت کو ڈھا کر کوئی نئی عمارت اس کی جگہ پر کھڑی کرے۔ لیکن ایسا انقلاب پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے ہمارے واسطے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم مذہب اور تہذیب کو الگ سمجھیں، مذہب کو تہذیب کی روح اور عمل کا معیار بنائیں اور اس کی آرزو دل میں رکھیں کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ اس لئے اگر میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کرتے وقت عقیدوں کا ذکر جتنا کہ آپ کے خیال میں ہونا چاہیئے نہ کروں تو اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں عقیدے کی اہمیت کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ یہاں بحث صرف تہذیب سے ہے، مذہب سے نہیں، اور جو عقیدے مشترک ہیں یعنی تہذیب میں قریب قریب اسی شکل میں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مذہب میں، انھیں میں نے تہذیب میں شامل سمجھا ہے۔

تہذیب کے مفہوم اور عالم اسلام کی وسعت اور رنگارنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب کی چھ سات خصوصیتیں سب سے پہلے میرے خیال میں آتی ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ انسانیت کے اس تصور کا ہے جو اس تہذیب کی جان ہے، وہ تصور کہ جس نے انسانیت کے امتیازات کو نسل، مذہب اور مقام کا پابند نہیں رکھا، جس نے مسلمان کو آزادی دیدی کہ جس ملک کو چاہے اپنا وطن بنائے، جو زبان چاہے بولے، اور ہر نسل اور مذہب کے آدمیوں کے لئے اس کی صورت نکالی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ مسلمانوں میں آپس کی عداوتیں تھیں، لیکن یہ یا تو سیاسی تھیں یا مذہبی، تہذیبی نہیں تھیں اور انھوں نے کسی کو انسانیت سے محروم نہیں کیا۔ ہماری تہذیب کی اس خصوصیت کی سب سے اچھی مثال وہ رویہ ہے جو ہم نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا، جنھیں کسی نسل اور کسی مذہب کے لوگ

اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور جن سے اب تک ایسی نفرت برتی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کے سائے میں رہے طبیعت اور اخلاق کے لحاظ سے یورپ کے یہودیوں سے مختلف یا بہتر نہیں تھے، لیکن انھیں ہمارے دین نے اہل کتاب کی حیثیت دیکر سچی رواداری کا مستحق بنایا، اور ہماری تہذیب نے انکو خدمت اور ترقی میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا۔ یہودی تو خیر سامی نسل کے اور ایک خدا کو ماننے والے تھے، اسلامی تہذیب نے بت پرستوں کو بھی انسانیت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا اور ان کی گمراہی کو انھیں حقیر یا ذلیل سمجھنے کا بہانہ نہیں بنایا۔

انسانیت کے بعد اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت عقلیت ہے، یعنی وہ جگہ جو اس کے معیار زندگی میں عقل سلیم کو دی گئی۔ جس طرح ہم ہر آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی مانتے رہے ویسے ہی ہمارا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کو اپنی طبیعت اور اپنے عمل میں توازن قائم رکھنا چاہیے، ایسا توازن کہ جو ایمان کو قائم اور مضبوط رکھے مگر انسان کو ضعیف الاعتقاد اور اوہام پرست نہ بننے دے، جو شوق اور مہارت کی سچی اور پوری قدر کرے مگر ضبط بے اعتدالی اور انتہا پسندی کو فوراً پہچان لے، جو انسانی زندگی کو عقیدے اور عقل کا پابند رکھے مگر رسم اور عادت کا غلام نہ ہو جانے دے۔ تہذیب کی اس خصوصیت نے مسلمانوں کو جہاں تک کہ اخلاقاً صحیح ہے آزاد کر دیا، ان کی آمد و رفت اور میل جول پر کوئی قید نہیں لگائی، جب کبھی وہ رسم رواج میں گرفتار اور عادت سے مجبور ہونے لگے تو ان کے سامنے رہائی کی ایک تدبیر پیش کر دی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور ذہن میں ایک لوچ پیدا کر دی کہ جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ کر سکتے تھے۔ اسی عقلیت نے مسلمانوں کے دل میں تجربے اور احساسات کی اتنی وسعت رکھی کہ وہ منطق کے پھیر میں نہیں آئے، اور اگر کبھی آئے بھی تو بہت جلد اس سے نکل بھی گئے۔ اسی نے دینداری کو ریاضت سے روکا، دنیاداری کو بے لگامی سے، اور نعمت کی قدر اور عذاب کے خوف کے دو رنگ ملا کر نہ جانے کیسی کیسی دلکش تصویریں بنائیں۔

مسلمانوں میں عقلیت پیدا نہ ہوتی اور قائم نہ رہتی اگر اسلام نے بہت بیّن طور پر میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم نہ دی ہوتی۔ لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ دیکھیے تو علم اور عقیدے کے میدان میں عقلیت ان

لوگوں نے نہیں برتی جو کہ دینی علوم کے حامل تھے بلکہ ان لوگوں نے جنہیں خالص علمی شوق تھا یا وہ جن پر سیاسی ذمہ داریاں تھیں۔ اس کے برخلاف ہماری تہذیب کی تیسری خصوصیت، مساوات، ہرگز قائم نہ رہتی اگر وہ ہمارے دین میں شامل نہ ہوتی، اور اسے برتے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا۔ مساوات کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے سیاست اور دولت دونوں ہمیشہ بیزار رہی ہیں اور انھوں نے اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی مگر اتنی کامیاب نہ ہوئیں کہ مساوات کے خلاف کوئی نظیر یا سند قائم ہو جائے۔ ابھی مساوات کا بھروسا صرف مذہب پر ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ مذہب کا حکم بہت صاف اور واضح ہے، اور اسی کے ساتھ انسانیت کی قدر بھی اس طرح ہماری تہذیب میں شامل ہو گئی ہے کہ سیاست اور دولت چاہے جیسا نشہ پلا دیں، جذبۂ دینی کا ایک گھونٹ اس کا توڑ کر دیتا ہے، یا انسانیت کی قدر نشے کو آہستہ آہستہ اتار دیتی ہے۔

اسلام نے آدمیت کو معیار مانا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملت اور جماعت کے احساس کو بھی لازمی ٹھیرایا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طرح کا تضاد ہے، لیکن اگر آپ یہ یاد رکھئے کہ انسانیت محض ایک تصور ہے اور حقیقت میں انسانی آبادی جماعتوں پر مشتمل ہے، اور ابھی تک زبان، خیالات، معاشرت اور ماحول میں ایسی یکسانی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے کہ جو دنیا کی تمام قومی حد بندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک جماعت بنا دے، تو یہ سمجھ جانا کچھ دشوار نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ملت بنے رہنے کی تاکید کیوں کی گئی۔ اسلامی تہذیب کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ملت کے احساس کو خاص تقویت پہنچائی، اور سیاست تو مساوات کی طرح ملت کے تصور کو بھی ہمیشہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی رہی۔ لیکن سیاست کا کچھ بس نہ چلا، اور تہذیب کو اس پر مطمئن ہونا پڑا کہ ملت اور انسانیت کے درمیان صلح قائم رکھے، جو کہ بذات خود ایک بڑی مشکل خدمت تھی اور بہت خوبی سے انجام دی گئی۔

اسلامی تہذیب کی جو خصوصیتیں میں نے اب تک بیان کی ہیں ان میں عقلیت مسلمانوں میں کمیاب ہو گئی ہے، اس لئے کہ مسلمان کئی سو برس سے اس کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اگر وہ کسی حد تک موجود ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے دشمن اسے اسلام سے خارج نہیں کر سکے ہیں۔ اسلامی

تہذیب کی دو اور خصوصیتیں ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں نہیں ملتیں، بلکہ یورپ میں اور ان کا ذکر میں صرف اس سبب سے کر رہا ہوں کہ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کو رونق انھیں سے تھی اور ہم اب بھی چاہیں تو یورپ کی تقلید کئے بغیر اپنی تہذیب کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو جلا کر اپنی محفل کو روشن کر سکتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی ان خصوصیتوں میں سے پہلی یہ تھی کہ علم حاصل کرنا انسانیت کا فرض ٹھہرایا گیا، اور اس کا یقین دلایا گیا کہ علم کی بدولت ہر طرح کی ترقی ممکن ہے، انسان ترقی کرتا رہا ہے اور آئندہ ترقی کرتا رہے گا۔ یہ دعویٰ اس زمانے میں بڑا انقلاب انگیز تھا جب ساری دنیا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کامل علم اور کامل معصومیت کی حالت سے آہستہ آہستہ گرتا رہا ہے اور عیبوں کی تاریکی میں گھرتا رہا ہے۔ اب یورپی قوموں کے علمی کرشموں کو دیکھتے ہوئے اس دعوی میں کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جماعت میں اب بھی وہ انقلاب انگیز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اب سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن کو وہ غلاف میں بند رکھتے ہیں۔

علم کے لئے جستجو، شک، تجربہ لازمی ہے، اور جس زمانے میں علم کی مشعل اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں تھی، اس نے علم کو ہر طرح کی آزادی دی، اور علم کے شیدائیوں نے ایسی رواداری برتی اور ایسے صدمے بھی اٹھائے کہ جس کی مثال صرف یورپ کے دورِ جدید کی ابتدا میں ملتی ہے۔ یورپ میں اب علم اصولاً بالکل آزاد ہے، لیکن وہ سیاسی اور تہذیبی تعصبات سے خالی نہیں، اور اس نے دین سے ایسی سرد مہری اور عداوت برتی ہے کہ جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچا ہے اور خود علم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں دینی علوم کے نمائندے خالص علم کے نمائندوں سے جھگڑتے اور ان سے اور کسی طرح بس نہ چلا تو مار پیٹ کر کے اپنی برتری تسلیم کراتے۔ یہ سمجھئے انسانی کمزوری تھی، ورنہ جس علوم کی پرورش اسلامی تہذیب کی گود میں ہوئی وہ خود سر اور انتشار انگیز نہ تھے، انھوں نے نہ عقیدے کی جڑ کاٹی نہ حق بات کہنے سے جھجکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی قائم رہی، اور انسان کی صحیح نشو و نما اور ترقی کے لئے دونوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی۔

آخر میں آپ اجازت دیں تو میں اسلامی تہذیب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کر دوں جس کا یقین

کرنا اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل ہے ۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی غیر تہذیبوں کی پرورش کی ، صرف اس سیاسی مصلحت کے اشارے پر نہیں جو دنیا کو کاٹ کر مسلم اور غیر مسلم کے دو حصوں میں تقسیم کرنا اپنے لئے مفید سمجھتی تھی ، بلکہ تہذیبی باغبانی کے ایسے شوق میں کہ جس نے نفع نقصان کا حساب رکھنا اپنی توہین سمجھا ، اور صرف اپنے چمن کی رنگا رنگی کو دیکھتا رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محقق جنھیں اسلامی تہذیب کی خوبیاں تسلیم کرنا منظور نہیں ، یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے فروغ کا زمانہ مسلمانوں کے سوا اور ہر تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا ، اور اسلامی تہذیب مختلف قومی اور مقامی تہذیبوں کا ایک مجموعی نام ہے ۔

اسلامی تہذیب ان تمام خصوصیات کو جو میں نے بیان کی ہیں ساتھ لیکر ہندستان آئی ۔ وہ ہاتھ میں تلوار لیکر نہیں آئی ، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے ، بلکہ تجارت کا مال یا سیاحت کا شوق یا خدمت کے حوصلے لیکر آئی ۔ اس کا پہلا مرکز جنوبی ہندستان کی بندرگاہیں تھیں ، جہاں سے وہ آہستہ آہستہ ملک کے اندر پھیلی ۔ شمالی ہندستان میں وہ شمال مغرب کی تجارتی شاہ راہ سے آئی ، مگر پھر امیر محمود غزنوی کے حملوں کی گرد و غبار میں وہ اسی طرح غائب ہو گئی جیسے کہ خوشبو کسی آندھی میں ۔ لیکن امیر محمود کے ساتھ استاد البیرونی کا بھی ہندستان میں آنا ہوا ، اور غالباً تہذیب کے کسی سچے قدرداں کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ ان کی کتاب الہند تہذیب کی ایسی خدمت ہے کہ جو سلطان محمود کی پیدا کی ہوئی عداوتوں کی تلافی کر سکتی ہے ۔ بہر حال عداوتیں اور لڑائیاں تاریخ ہی میں زندہ رہیں ، نسل انسانی انھیں بہت جلد بھول گئی ، اور ہندستان کا قریب کے ملکوں سے تعلق بڑھتا ہی رہا ۔ بارہویں صدی کے آخر میں ، جب محمد غوری کی فتوحات نے شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے لئے میدان صاف کر دیا تو شیخ معین الدین چشتی بھی ہندستان تشریف لائے اور انھوں نے خدمت اور تبلیغ کا کام اسی شہر سے شروع کیا جو کہ سب سے ممتاز راجپوت سلطنت کا مرکز تھا ، اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے ہندو مسلمان دونوں اپنا خون بہا چکے تھے ۔

مسلمان جب ہندستان میں آئے تو ہندستانیوں میں سیاسی حس بہت کم تھا ، مگر مذہبی حس بہت قوی تھا اور اسی وجہ سے ہم اسلام کا ردعمل سب سے پہلے ہندستان کی مذہبی زندگی میں دیکھتے ہیں ۔ آٹھویں اور نویں صدی میں شری شنکر آچاریہ کی اصلاحی تحریک نے مقدس کتابوں کو وہی رتبہ دیا جو کہ ہم قرآن کو دیتے ہیں ، یعنی

ان کو الہامی مانا، اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔
اسی تحریک نے بدھ متیوں، جینیوں جوگیوں اور برہمنوں کی تعلیمات کو چھ درشن، یعنی حقیقت سے روشناس ہونے کے چھ مختلف مگر برابر کی قدر رکھنے والے طریقے ٹھہرا کر عقائد کے اس انتشار کو دور کیا جواب تک پایا جاتا تھا، اور دینی تعلیم میں جو یک جہتی اس طرح سے پیدا کی گئی تھی اسے بدھ متیوں سے جاترا، یعنی زیارت کا رواج اور جینیوں سے اہمسا کا عقیدہ لیکر اور مضبوط کیا۔ امیر محمود نے جب ہندستان پر حملے کئے تو میدان جنگ میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت آزمانے کے لئے ہندو دھرم اور ہندو جاتی، یعنی ملت موجود تھی، اور بعد کو جو تحریکیں اٹھیں وہ انھیں کی کشمکش کا نتیجہ تھیں۔
میں یہاں پر ان اثرات پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا جو اسلامی تہذیب نے ہندستانیوں کی ذہنیت پر ڈالے، لیکن یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ انسانیت اور مساوات کے جو پختہ عقیدے وہ اپنے ساتھ لائی تھی انھوں نے ذات کے اس تصور کو جو یہاں ایک اٹل قانون بن گیا تھا فلسفے اور مذہب سے نکال باہر کیا، اگرچہ رواج کو بدل نہ سکی، اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد عمل کی صورت پیدا کی، جسے دونوں کے مذہب نہیں تو مذہبی منطق گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھگتی کے طریقوں کو، اپنشدوں کے فلسفے کو، ہندستان کی موسیقی اور فنون لطیفہ کو ایسا سراہا، صنعتوں کی اس طرح دل کھول کر سرپرستی کی اور ہندو معاشرت میں جو کچھ ضروری معلوم ہوا اس کو ایسی خوشی سے اختیار کیا کہ اسلامی تہذیب بہت جلد ہندستانی تہذیب بن گئی۔
ہندستان میں رواج کی اتنی قدر ہے کہ اسلامی تہذیب نے بہت کیا اگر معقولیت کے تصور کو قائم رکھا، اور زندگی اور معاشرت میں نمایاں طور پر نہیں تو کم از کم شاعری میں اسے ہر اور مسلک پر بھاری کر دیا۔ دنیاوی علوم کا نہ یہاں شوق پھیلا نہ انھیں کوئی ترقی دی جا سکی، لیکن تعلیم کا ایک نصاب اور شائستگی کا ایک ایسا معیار عام کر دیا گیا کہ جس نے تہذیب کو زوال سے بچایا اور ہر علم، فن اور ہنر کی قدر قائم رکھی۔
لیکن ہندستان کی اسلامی تہذیب کے ماننے والوں میں سے تمام ہندو اور بہت سے مسلمان اس کی شکایت کرتے رہے کہ اس تہذیب نے ہندستان میں گھر تو بنا لیا ہے مگر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز مٹانے اور اسلام سے اپنا رشتہ توڑنے پر تیار نہیں، معمولاً پوری رواداری برتتی ہے مگر کبھی کبھی اسلام کو حقیقت کا

واحد منظہر کہہ کر ہر غیر فلسفے اور عقیدے سے منہ پھیر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کے کلام میں یہ شکایت اکثر ملتی ہے، اور غالباً وہی اکیلے نہیں بلکہ اور جتنے غیر مسلم مصلح ہندستان میں پیدا ہوئے وہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے اگر مسلمانوں نے انسانیت اور مساوات سے عقیدت رکھنے کے باوجود مومن اور مشرک کے فرق پر زور نہ دیا ہوتا اور اگر وہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے۔ لیکن اسلام مومن اور مشرک کے فرق کو نظر انداز کرکے پھیلایا جاتا تو یقیناً اس کی کایا پلٹ ہو جاتی، وہ یہاں کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا، علم، معقولیت اور فطرت کا سکھایا ہوا مذہب نہ رہتا بلکہ رسم رواج اور قدامت پرستی پر بھروسا کرتا، مسلمانوں کے سامنے کوئی معیار نہ رہتا اور ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ اس میں نقصان صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا بلکہ ہندستان کا بھی ہوتا، اس لئے کہ انسانیت، عقلیت، مساوات ایسے تصور نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ دل میں سما جائیں تو پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ تنگ نظری، جہالت، اوہام پرستی، بزرگوں کی پوجا، دولت کی پوجا، اصل میں تو یہ ہیں جو انسان کی طبیعت کو روگ کی طرح لگ جاتے ہیں یا گرد کی طرح دل کے آئینے پر جم جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ ملت اسلامی کو غیر مسلموں سے الگ رکھنے، مومن اور مشرک کے فرق کو ضد کرکے قائم رکھنے اور شرعی قانون کو برابر حکومت کے اختیار اور رسم رواج کے اثر سے باہر اور بالاتر قرار دینے کے باوجود بھی آپ دیکھئے تو ہماری معاشرت اسلامی قانون سے بہت منحرف ہو گئی ہے، ہم نے عورتوں کے سارے حق مار لئے ہیں، برادری اور ذات کو دیکھ کر شادی بیاہ کرتے ہیں، نوکروں کو اپنے ساتھ کھلاتے نہیں، اپنا سا پہناتے نہیں، اپنے برتنوں میں پانی نہیں پینے دیتے۔ اخلاق کو اور جو نقصان ہوا ہے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہماری معاشرت ہندو معاشرت کے رنگ میں رنگ گئی تھی، لیکن قرآن کی تعلیم کا معیار موجود تھا۔ انگریزی حکومت اور اس سے بھی زیادہ انگریزی تعلیم نے ہم کو ایک ایسے پھیر میں ڈال دیا ہے کہ جس سے نکل جائیں تو سمجھئے جان بچی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی دو بڑی خصوصیتیں، عقلیت اور علم کی پیاس ہمیں ورثے میں نہیں ملیں بلکہ یورپی قوموں کو، اور اسی ورثے کی بدولت انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ساری دنیا ان کی ہو گئی ہے۔ اب یورپی

تہذیب کے سب سے کارگر ہتھیار یہی ہیں، اور ہم اسلامی تہذیب کو بچا نہیں سکتے جب تک کہ ہم اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پھر سے پیدا نہ کریں۔ ہمارے دیس کے بھائیوں نے، جنھوں نے اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول نہیں کئے تھے اور جواب اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا ہندستان کی مشترک تہذیب میں کوئی حصہ تھا، یورپی تہذیب کو اپنا کر بظاہر ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان میں آزاد خیالی ہے جو موجودہ معیار کے لحاظ سے ہر مہذب آدمی میں ہونا چاہئے مگر مسلمانوں میں عام طور پر نہیں ہے، وہ ملت اور ملت کے قانون کو چھوڑ کر جمہور بن گئے ہیں اور جمہوری طریقے پر معاشرتی قانون بناتے ہیں اور بنائے رہنا چاہتے ہیں، ہم نہ اپنے دین کو چھوڑتے ہیں نہ اپنے شرعی قانون کو، نہ ملت کے خیال کو اور نہ اسلامی تہذیب کی محبت کو۔ اگر ہم نے یہ مسلک خالی ضد میں اختیار کیا ہوتا تو معاملہ بہت آسان ہوتا۔ اور ہمارے لئے اس کی کوشش کرنا کہ تعلیم جلد پھیلے اور جہالت دور ہو کافی ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ دنیا میں اور ملک میں ہماری حیثیت کچھ بھی ہو ہماری کوئی سنے یا نہ سنے، بات ہمیں ٹھیک کہتے ہیں، کہ تہذیب اور معاشرت کو مذہب کا سہارا چاہئے، علم کو راہ پر رکھنے کے لئے عقیدہ چاہئے، سیاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ملت کا احساس، انسانیت کا معیار اور اخلاق اور مذہب کی فرماں روائی چاہئے۔ ہم عقلیت کے نام سے عقل کی پرستش نہیں کرنا چاہتے، بندر سے رشتہ جوڑنے کی خاطر خدا سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتے، آدمی بننا چاہتے ہیں مگر ایسی تہذیب نہیں چاہتے کہ جس کا دیوتا نفس پرستی ہو۔ ہماری مشکل وہی ہے کہ جو ہمیشہ سے آدمیت کی مشکل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کا معیار میانہ روی اور اعتدال ہے، اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے اگر میں عرض کروں کہ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اپنے دل سے ضد اور غصہ بالکل نکال دیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ ہندستان میں اسلامی تہذیب کو سلامت رکھنے کے لئے ہم کو کیا ہونا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے اسلامی تہذیب کی بقا کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کے صحیح اور اچھے ہونے کا پورا یقین ہو، ہم دل سے مانتے ہوں کہ انسانیت قوم اور نسل پرستی پر غالب آئے گی، معقولیت اور اعتدال پسندی کا مسلک ایک نہ ایک دن ہمیں اوہام پرستی اور جہالت اور انتہا پسندی کی بھول بھلیوں کے

باہر پہنچا دے گا، علم ایک طرف انسانی زندگی کو آسان کرتا اور دوسری طرف نجات کی راہ کو صاف دکھاتا رہیگا لیکن یہ تو اسلامی تہذیب کا نصب العین ہے، اسے بغیر سمجھے مان لینے اور زبانی عقیدت سے ہم حاصل نہیں کرسکتے۔ ہم کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کن اجزا سے بنا ہے، اور پھر انھیں کو اپنے عمل میں یکجا کرکے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ اس لئے آپ اجازت دیں تو میں اس وقت کے چند عام رجحانات پر بحث کرکے اپنا مطلب صاف کردوں۔

میں اسے بالکل صحیح اور بہت اچھا سمجھتا ہوں کہ مسلمان اس وقت اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ وہ ایک ملت اور ایک تہذیبی جماعت ہیں، کیونکہ یہ دینی اور تہذیبی آئین کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی ہے لیکن مجھے کسی طرف اسلامی ملت اور تہذیب کے تصور کو غیر مسلموں کیا خود مسلمانوں کے لئے مفید اور ان کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی۔ ملت کا احساس سمجھئے چند دنوں کا مہمان ہے اگر وہ ملت کے افراد میں سچی محبت، خدمت کا شوق اور خدمت کی استعداد پیدا نہ کرے بلکہ افراد کی خود غرضیوں کے لئے ایک آڑ یا ان کے نکمے پن کے لئے بہانہ بنا رہے۔ انسانیت کے جس معیار کو ہم مانتے ہیں وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنوں کی ہر ضرورت پوری کرکے دوسروں پر احسان کرنے کے موقع نکالیں؛ ہماری ملت کے افراد اپنا حق وصول کرکے اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ دوسری جماعتیں ہماری اجتماعی اغراض پر بھی ذاتی اغراض کا شبہ کرتی ہیں، اور ہم اپنی ملت کا الگ وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے آداب برتنے سے انکار کرتے ہیں۔

حقیقت میں ہم جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نہ ہمیں کوئی دے سکتا ہے نہ ہم سے لے سکتا ہے ہم اگر خدمت کا وہ حق ادا کریں جسے ہمارے دین نے عبادت کا مرتبہ دیا ہے، علم حاصل کرنے اور پھیلانے کا فرض جیسا کہ چاہئے انجام دیں تو ہماری ملت خود بخود بنی رہے گی، اور اس کے خادموں کے سامنے ہمارا دینی اور تہذیبی نصب العین بھی رہے گا، جس کی قدر دراصل تجربہ اور انسانی طبیعت اور زندگی کی اونچ نیچ سے واقفیت پیدا کرتی ہے۔ اس زمانے میں جب کہ جہالت اور اوہام پرستی ہم کو گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں

ڈر تھا کہ ہم اس میں گم ہو جائیں گے، مومن اور مشرک کے فرق کو نظروں کے سامنے رکھنا ضروری تھا، اس وقت جبکہ غیر مسلموں میں تعلیم پھیل رہی ہے، وہ رسمیں توڑی جا رہی ہیں جنھوں نے زندگی کو جکڑ لیا تھا اور عقل کی اتنی قدر بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہیں رہا ہے تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے۔ ہماری تہذیب کی قابل قدر خصوصیات بڑی حد تک عام تہذیب میں شامل ہو گئی ہیں، اب ہماری ملت صرف اس طرح ملت بنی رہ سکتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی زندگی اور عمل میں وہ فضیلت ظاہر کرے جو اسے اسلام کی بدولت حاصل ہے۔

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال کی جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے لئے مصلحت اندیش ہونا لازمی کردیتی ہے۔ ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی بھلائی کی فکر کریں، ہمارے ذمے تو اسلام کی تبلیغ کرکے، یعنی اس کی تعلیم کو ہر تعلیم سے زیادہ موثر اور مفید ثابت کرکے دنیا کو نجات کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ مقصد بغض، حسد، کینے اور ضد سے حاصل نہیں ہو سکتا، تنگ نظری، خودغرضی اور خوف آپ اپنے پیر پر کلھاڑی مارتا رہتا ہے۔ ہم میں تو نوع انسانی کی ایسی سچی خیرخواہی ہونا چاہیئے کہ جو دھوکا کھائے اور باز نہ آئے، جو صدمے اٹھانے سے اور پختہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کم از کم اپنوں پر اعتبار ہونا چاہیئے، اور ہر شخص کو جو بظاہر خلوص کے ساتھ خدمت کا ارادہ رکھتا ہو سہارا دینا چاہیئے۔ وہ جہاد جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی آخری تدبیر تھی اس وقت لڑ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت کا صحیح جہاد تو ایسی مصلحت اندیشی ہے جو افراد کی استعداد کو ملت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنائے، اور قوم کی خدمت کو ملت کے الگ وجود کا سہارا۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے بہت ہیں، لیکن اسلامی تہذیب تو خطروں میں پلی ہے۔ اور اس کا کیا علاج ہے کہ مشیت ایزدی نے قدر اسی چیز کی بڑھائی ہے جو مشکل سے ہاتھ آئے اور آسانی سے ضائع ہو جائے۔ اسلامی تہذیب کی بقا کا مصلحت اندیشی پر منحصر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جب قدرت کو موتی جیسی دولت رکھنے کے لئے سیپ کے نازک سینے کے سوا کچھ نہ ملا ہو۔

مُسلم لیگ اور ملّت کی تنظیم

(ذیل کے مضمون کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کسی بزرگ کو ان سے اختلاف ہو یا موضوع کے کسی اور دوسرے پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہوں تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ ان کے خیالات کو اپنے رسالہ میں شائع کریں گے۔)

مسلمانوں کے انتشار کی موجودہ حالت میں ان مسلمانوں کو بہت زیادہ قابل الزام سمجھا جاتا ہے جو مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کی طاقت کو نہیں بڑھاتے یہانتک کہ لیگ کے بعض انتہا پسند حامی انھیں غدّار کے نام سے موسوم کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے لیکن غدار کون ہے؟ آیا وہ غدّار ہیں جو مسلمانوں کی جماعت، مسلم لیگ کو چھوڑ کر، ہندوؤں کی جماعت، کانگریس سے مل گئے ہیں یا وہ ہیں جو لیگ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو یورپینوں کا غلام رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا سہل نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر ممکن ہے بہت سے وہ لوگ جو لیگ سے باہر ہو گئے ہیں یا باہر رہنا پسند کرتے ہیں آخر میں اتنے زیادہ غدار ثابت نہ ہوں جتنے وہ لوگ جو لیگ میں شامل ہیں مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ لیگ میں بہت سے نہایت مخلص اور ایثار پسند لوگ بھی شامل ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لیگ پر ایسے لوگوں کو پورے طور پر اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ان کے دست و بازو ان کے قابو سے باہر ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور پیرووں کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے انگریز آقاؤں کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلام کو بھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے ؎

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کیا مسلمانوں کی اپنی سیاست کوئی نہیں ہے؟ کیا وہ دوسروں کی سیاست کے پابند ہو کر ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے کے لئے مجبور ہیں؟ کیا مسلمانوں کی زندگی محض اس لئے ہے کہ وہ کبھی انگریز، کبھی ہندو

فرقہ پرست اور کبھی دیسی ریاستوں کے آلہ کار بنتے رہے ۔ کیا ان کا کوئی واضح سیاسی نصب العین ایسا نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی پارٹی اور اپنی وزارتیں بنا سکیں اور جب اپنے اس مقصد کو حاصل ہوتا نہ دیکھیں تو نہ یورپینوں کی امداد سے اپنی وزارت بنائیں نہ ہندوؤں کی امداد سے ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصد محض وزارت بنانا نہ ہو بلکہ کام کرنا ہو اور جب کام کرنے کا موقع نہ دیکھیں تو وزارت سے بھی کنارہ کش رہیں ۔ اگر جاہ طلبی اور نفع اندوزی زندگی کا واحد نصب العین نہیں ہے تو کیوں ایسی مفاہمتیں کی جاتی ہیں جن سے اپنی اور قوم کی آبروریزی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ بات کرنے تک کے روادار نہیں ہوتے ۔

مضبوط سیاسی پارٹیاں سال دو سال کی ہنگامہ خیزیوں میں نہیں بنتیں محض زوردار تقریروں اور تحریروں اور بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں سے کھڑی نہیں ہو جاتیں ۔ ان کے حضور میں قوم کے عزیز ترین افراد کو اپنے جان و مال کی گرانبہا قربانیاں پیش کرنا ہوتی ہیں ۔ ان کو برسوں تک مسلسل خاموشی، سچائی اور استقامت کے ساتھ پسینہ اور خون سے سینچنا پڑتا ہے ۔ اپنا عیش و آرام، اپنی دولت اور عزت سب کو محفوظ بھی رکھا جائے اور پائدار اور ذی اثر سیاسی پارٹی بھی بنا لی جائے ۔ دوسرے ملکوں میں جہاں آزادی حاصل کی جا چکی ہے ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہو ۔ ہندوستان میں بھی ممکن ہے ایسی پارٹیاں اپنی طرح کی دوسری پارٹیوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوں لیکن کانگریس کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا ؂

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ سب کچھ میں کانگریس کی حمایت کے سلسلہ میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس ہمدردی کی بنا پر لکھ رہا ہوں جو مسلم لیگ کے ساتھ مجھے لفظ "مسلم" کے لگے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہے اور جس کی بنا پر اس کی ہر ناکامی سے میرے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے ؂

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہماری ہمسایہ ہندو قوم اپنے لئے ایک نصب العین کو طے کر چکی ہے ۔ وہ نصب العین ہے ہندوستانی

قوم کی آزادی جس کا مفہوم ان کے نزدیک تمدنی نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ اکثریت کے تمدن کا یعنی ہندوؤں کے تمدن کا جو اتفاق سے ملکی تمدن بھی ہے اقتدار قائم کیا جائے۔ اس میں مسلمانوں کے کسی جداگانہ تمدن کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ جماعت کی شکل میں کہیں نمایندگی نہیں دی جاسکتی۔ انفرادی طور پر البتہ ہندو تمدن کی ہمہ گیریوں میں ان کے لئے جگہ نکالی جاسکتی ہے اور انھیں جذب کیا جاسکتا ہے۔ انھیں ودیامندر نام کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا چاہیئے۔ انھیں سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر قبول کرنا چاہیئے۔ انھیں بندے ماترم کے فرقہ وارانہ گیت کو قومی گیت بنانا چاہیئے۔ انھیں وشنو نگر نام کے عارضی شہروں کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کرنی چاہیئے انھیں پوتر وشنو بھوجن کو کانگریس کے بھوجن بھنڈار میں کھانا چاہیئے غرضکہ ہر جگہ انھیں ہندو تمدن کی برتری کے آگے سر جھکانا چاہیئے اور یہ اس لئے کہ ہندوستان کی سلطنت کی وارث انگریزوں کے بعد ہندو قوم بننے والی ہر ہندو قوم ہی انگریزوں سے لڑ کر ان کی حکومت کو چھین رہی ہے۔ وہی آہستہ آہستہ ملک کی تمام طاقت کی جگھوں پر قبضہ کرتی جا رہی ہے اور اس کا کوئی دوسرا مقابل اور حریف نہیں ہے۔ ملکی آزادی اور ہندو تمدن کے اقتدار کے معاملہ میں ہندوؤں کے درمیان کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں کمیونسٹ، تشدد پسند اور دہشت انگیز غیر کانگریسی، او، کانگریسی سوشلسٹ۔ آئینی کانگریسی اور غیر آئینی کانگریسی، نیشلسٹ کانگریسی اور لبرل، مہا سبھائی اور آریہ سماجی، سکھ، بودھ، جین، سناتن دہرم والے سب شامل ہیں۔

ملکی اور تمدنی آزادی کے اس مقصد العین کو حاصل کرنے کے لئے ہندو قوم نے کئی مورچے تیار کئے ہیں۔ ان میں ایک مورچے سے دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے اور ان سب مورچوں میں کانگریسی مورچہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اگر آج کانگریس اور حکومت برطانیہ سے فیڈریشن کے معاملہ پر جنگ شروع ہو جائے تو پہلا مورچہ جس پر حکومت برطانیہ کو فوراً قبضہ کرنا ہو گا وہ کمیونسٹوں، تشدد پسندوں اور دہشت انگیز دل کا مورچہ ہو گا۔ آزادی کی لڑائی کے یہ لوگ ہراول ہیں۔ ان میں سے کمیونسٹوں کو جو سرے سے کسی مذہب کو ہی نہیں مانتے مسلمانوں کے تمدنی نصب العین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ لوگ ہندوازم سے تو تھوڑی بہت مفاہمت کر بھی سکتے ہیں اس لئے کہ ہندوازم اتنا مذہب نہیں ہے جتنا رہنے سہنے کا ایک طریقہ ہے اور اس میں ملحد اور خدا پرست سب کی

کھپت ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام سے وہ کسی طرح بھی مفاہمت نہیں کر سکتے۔ رہے تشدد پسند اور دہشت انگیز یہ لوگ کالی دیوی کی پوجا کرنے والے کٹر مذہبی دیوانے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد دوسرا مورچہ جب پر برطانوی حکومت کو حملہ کرنا ہوگا وہ کانگریسی سوشلسٹوں کانگریس کے نوجوان انتہا پسندوں، کسان سبھاؤں، اور مزدور سبھاؤں کا ہوگا کیونکہ ان کو اگر آزاد رکھا گیا تو یہ واقعی نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مورچہ اسمبلیوں کا ہوگا۔ کیونکہ گورنر کی مندرجہ بالا تشدد کی پالیسی سے وزرا اور اسمبلی کے ممبران اختلاف کریں گے اور مستعفی ہو جائیں گے۔ اس سے ایک زبردست کھلبلی اور ابتری پیدا ہو جائے گی۔ قومی زندگی میں اول درجہ کی بحرانی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور مجموعی طور پر یہ بڑا انقلاب انگیز واقعہ ہوگا۔

اس کے بعد چوتھا مورچہ سب سے زبردست اور طاقتور مورچہ ہوگا۔ دیہات کی، ضلع کی، صوبہ کی کانگریس کمیٹیاں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، رضا کاروں کی انجمنیں، سیوادل سب حکومت کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گی اور سب کو غیر قانونی قرار دینا ہوگا۔ اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرنا ہوں گی چھاپہ خانوں کی نگرانی کرنی ہوگی۔ ریلوں۔ لاریوں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ سول نافرمانی شروع ہوگی۔ گرفتاریوں کی بھرمار ہوگی۔ لاٹھی چارج ہوگا۔ گولی چلے گی چند روز تک بڑا ہنگامہ رہنے کے بعد تمام ایسے لوگ جو تحریک میں براہ راست شرکت کریں گے سرکاری قید خانوں میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

اب اس کے بعد ایسے مورچے ہوں گے جن پر ہاتھ ڈالنے میں حکومت کو تامل ہوگا کیونکہ یہ براہ راست لڑنے والے لوگ نہیں ہوں گے۔ مثلاً آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن۔ آل انڈیا ولیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن آل انڈیا ہریجن سیوک سنگھ، ہندی پرچارنی سبھائیں، ودیا مندر، اور واردھا اسکیم کے ماتحت پرائمری اسکول، گرام سدھار کی سبھائیں ——— یہ بالکل تعمیری کام کرتی ہیں جو قانون کی زد میں نہیں آتے۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں وہ پکے کانگریسی عقائد رکھتے ہیں۔ فرض کیجئے، ان پر بھی برطانوی حکومت اپنی نگرانی قائم کر دیتی ہے۔

اب اس کے بعد ان لوگوں کا نمبر آئے گا جو زمانہ ساز، منافق، عیار۔ اور چالاک ہیں۔ حکومت سے بھی بگاڑنا نہیں چاہتے۔ جان اور مال کی بھی کوئی قربانی کرنا نہیں چاہتے۔ کسی قسم کا کوئی اور دوسرا ایثار کرنا بھی نہیں چاہتے

عوام سے رابطہ اور ان کی پرخلوص خدمت کرکے اپنے اس دعوے کو تسلیم کرانا ہوگا۔ میں کانگریس کے کارکنوں کے رویہ کو نہایت معقول اور مناسب سمجھتا ہوں اور مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا جو فیصلہ انھوں نے کیا ہے اسے بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں۔ مسلم لیگ اگر مسلمانوں کی سچی اور پرخلوص خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو اسے اس بات سے ناراض نہ ہونا چاہیئے بلکہ خدمت اور ایثار کے میدان میں کانگریس کا مقابلہ کرکے یہ دکھانا چاہیئے کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حقیقی ہمی خواہ وہی ہے اسے مسلمانوں کے درمیان کام کرنے میں کانگریس پر ہر قسم کی فوقیت حاصل ہے۔ اگر اس کے باوجود کانگریس اس پہ بازی لے جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو پھر حقیقتاً کانگریس کو ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا، لیگ کو نہیں۔ میں کانگریس کے کارکنوں کو ان کے فیصلہ پر صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور انھیں خوش آمدید کہتا ہوں اور مسلم لیگ والوں سے میری یہ خواہش ہے کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ لیکن ان کے سب طریقے خلوص اور خدمت پر مبنی ہونے چاہیئں۔ اشتعال انگیزی، منافرت خیزی، فتنہ پروری اور سازش سے انھیں پرہیز کرنا چاہیئے کیوں کہ ان باتوں سے ممکن ہے وقتی کامیابی ہو جائے لیکن مسلم عوام کو وہ زیادہ دن تک دھوکے میں نہ رکھ سکیں گے۔ صحیح راستہ کٹھن اور دشوار گذار ضرور ہے لیکن کامیابی کا سیدھا راستہ وہی ہے ؎

تو آگ میں جل اور خاک میں مل جب خشت بنے تب کام چلے

ان خام دلوں کے عنصر پر، بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

ساتھ دیتے رہنے سے ہندوؤں میں خود اپنی مقبولیت بھی ختم ہو جائے گی۔ تو چپکے سے ان سے علیحدہ ہو گئے۔

علی برادران کو قدرتی طور پر گاندھی جی سے بڑی شکایتیں پیدا ہوئیں ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" کے پرانے فایل اٹھا کر دیکھیے تو مولٰنا محمد علی کی تلخ تحریروں سے ان کی شکایتوں اور مایوسیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے انھوں نے گاندھی جی سے جب دوستی کی تو اپنے پاس کچھ نہیں رکھا جو کچھ تھا سب ان کے حوالہ کر دیا لیکن گاندھی جی نے بہت کچھ محفوظ رکھ کر علی برادران سے دوستی کی نتیجہ یہ ہوا کہ علی برادران بدنام اور رسوا ہو کر ختم ہو گئے۔ گاندھی جی کا اقتدار بڑھتا رہا اور آج انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد بھی بڑھ رہا ہے۔

عدم تعاون کی تحریک کے زمانہ میں جس طرح ہندو استادوں اور طالب علموں نے سرکاری تعلیم کا مقاطعہ کیا تھا ایسے ہی مسلمان اساتذہ اور طلبہ نے بھی کیا تھا جس طرح ہندوؤں کے لئے آزاد مدرسے کھولے گئے تھے ویسے ہی مسلم آزاد مدرسے بھی کھولے گئے تھے جس طرح ہندو کارکن تبلیغی اور تعمیری کام کرنے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیے گئے تھے اسی طرح مسلم کارکن بھی پھیلائے گئے تھے۔ بلکہ ۱۹۲۰ء کی تحریک میں چونکہ خلافت کا بہت زیادہ زور تھا اس لئے مسلمانوں کا کام نہایت بڑے پیمانہ پر اور نہایت منظم طریقہ سے ہو رہا تھا۔ انھوں نے واقعی حکومت کے مقابلہ میں اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر دی تھی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ملک کے کونہ کونہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے وردی پوش چست اور قواعد کرنے والے رضاکار سرکاری پولس کا مقابلہ کرتے تھے اور اسے نیچا دکھلاتے تھے۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہی تنظیم تھی جسے دیکھ کر مالویہ جی مہاراج ہراساں اور پریشان ہو گئے تھے اور گاندھی جی پر مختلف طریقوں سے اثرات ڈال کر انھیں یہ باور کرایا تھا کہ اگر یہ تحریک اسی طرح جاری رہی تو مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اور بھی زیادہ بڑھ جائے گا پھر اگر صلح کی کوئی گفتگو برطانیہ سے ہوئی اور اس میں ہندوستانیوں کو حقوق دئے گئے تو اس میں مسلمانوں کو بہت بڑا حصہ ملے گا اور ہندو مغلوب اور محکوم ہو جائیں گے۔ بہر حال ان طبعزاد خیال آرائیوں سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری (یا مذہبی جوش؟) ہندو کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھا لیکن خلافت کمیٹی اپنے اس کاروبار کو زیادہ دن نہیں چلا سکی۔ چند مسلم سیٹھوں کے (جنھوں نے خلافت کا روپیہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے کاروبار میں لگا دیا تھا) دیوالے نکلے۔ دولتمند ہمدردوں کی تعداد پہلے سے ہی کم تھی۔ دیوالے کی بدنامی نے (جس کی دشمنوں نے حاشیہ چڑھا چڑھا کر خوب تشہیر کی) جہاں

کے اثر سے سرکار برطانیہ کے رعب کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور عوام کو بیدار کر کے کانگریس کی انقلابی تحریک میں شامل کر دیا۔ لیکن علی برادران سخت انتہا پسند تھے وہ آندھی کی طرح اٹھتے تھے اور بگولہ کی طرح اڑ جاتے تھے۔ وہ اپنی فتوحات کی تنظیم کرنے کے صبر آزما کام سے ناواقف تھے۔ وہ جو کام کرتے تھے نہایت بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور دوربینی اور عاقبت اندیشی کو کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ جب وہ آگے بڑھتے تھے تو واپسی کی راہوں کو مسمار کرتے جاتے تھے وہ فتح کرنے یا اس کوشش میں مرجانے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ زبردست حملہ آور تھے لیکن مدبر اور قوم کے معمار نہیں تھے۔ ناکامی اور پسپائی یا ادنیٰ تر مقصد کے قبول کرنے کے خیال ان کے ذہن میں کبھی نہیں آتے تھے۔ مفاہمت اور مصالحت سے وہ ناواقف تھے ان کے حوصلے ہمیشہ نہایت بلند رہتے تھے۔ ناممکن کا لفظ ان کی لغت میں موجود نہیں تھا۔ وہ سکندر، نپولین اور الور بے جیسے تھے۔ اور جیسا تاریخ کے ان نامور لوگوں کا انجام ہوا ویسا ہی علی برادران کا بھی انجام ہوا۔

اس کے برعکس ان کے رفیق گاندھی جی بنیے کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ حساب کتاب اور مول تول کرنا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ نفع نقصان کے خمیر سے ان کا گوشت پوست بنا تھا۔ بیوپار کرتے رہنا، موقع اور مصلحت کو دیکھ کر قیمت کو گھٹانا بڑھانا لیکن ناپ تول میں اس کی کسر نکال لینا ان کی خاندانی عادت تھی۔ یہ کبھی بھی اتنے آگے نہیں بڑھے جہاں سے واپس آنا ممکن نہ ہو۔ انھوں نے کبھی کسی سے دشمنی مول نہیں لی۔ سب کو اپنا دوست کہا۔ جس کی جڑ کاٹنا چاہتے تھے اس سے بھی ہمیشہ یہی کہا کہ میں تو تمہارا دوست ہوں۔ تمہاری جڑ نہیں کاٹ رہا ہوں بلکہ تمہارے ساتھ جو برائی خواہ مخواہ لگ گئی ہے اسے دور کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میری اس کوشش سے تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تم ختم بھی ہو جاؤ تو تمہیں شکایت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ دنیا سے شیطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس طرح کی متضاد طبیعتیں رکھنے والے لوگوں کا میل کس طرح ہوا اور کس طرح اتنے دنوں تک قائم رہا یہ نفسیات کا ایک پیچیدہ معمہ ہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس میں بھی گاندھی جی کے بنیاپن کو بڑا دخل تھا۔ وہ علی برادران کی تمام انتہا پسندیوں کے ساتھ اس وقت تک نباہ کرتے رہے جب تک انھیں اپنے سیاسی آلہ کے طور پر استعمال کرنے کا امکان باقی رہا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ علی برادران اپنا رسوخ اور اثر کھو چکے ہیں اور ان کا

ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں علم، فنی مہارت، تنظیم اور دولت کے وسائل زیادہ تھے۔ پھر دوسری قوموں سے معاہدے کئے جاتے ہیں، حملہ اور مدافعت کی صورت میں امداد کے وعدے لئے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی طاقت کو بڑھایا اور حریف کی طاقت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ سوئیڈیٹن جرمنوں کو چیکوسلوویکیا میں اس لئے کامیابی ہوئی کہ ان کی پشت پناہی کے لئے نازی جرمنی کی پوری مسلح اور منظم طاقت موجود تھی۔ کیا لیگ نے بھی جنگ کا اعلان کرنے سے پہلے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے اسی طرح تیار کرلیا ہے یا ہماری حالت دیکھ کر لوگوں کا دل یہ کہنے کو چاہتا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک کے زمانہ میں مسلمانوں نے جو ایثار کئے تھے اس کا قصہ آج کل اکثر دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک فاضل اور مخلص اہل قلم جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح ۱۹۲۰ء کی جنگ میں سیاسی فضا پر مسلمان پورے طور پر چھائے ہوئے تھے اور نصب العین کے لئے قربانیاں کرنے میں زیادہ پیش پیش تھے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے اور "ہسٹری آف دی کانگریس" کے مصنف نے اس حقیقت کو چاہے کتنا ہی نظر انداز کیوں نہ کیا ہو لیکن تاریخ کے اس کھلے ہوئے کارنامہ پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس کے بعد آزادی کی دوسری تحریک میں بھی مسلمانوں کی قربانیاں کچھ کم نہیں رہی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب سیاست کی رہنمائی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی تو کانگریس کے سیاسی پلیٹ فارم سے یہ لوگ کس طرح خارج کردئے گئے اور اغیار کا اس پر کس طرح قبضہ ہو گیا۔ ان کی سب قربانیاں کس طرح پانی پر بنائی ہوئی نقش کی طرح مٹ گئیں اور برادران وطن نے کیوں کر تمام سیاسی زندگی پر اپنا اجارہ قائم کر لیا اور تمام کارگذاری کے دعویدار خود بن بیٹھے۔

یہ مسلمانوں کی بدنصیبی کی وہ داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے اس زمانہ میں واقعی مولانا شوکت علی مرحوم گاندھی جی کو اپنی جیب میں ڈالے ملک کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک گھوما کرتے تھے "گاندھی جی کی جے" علی برادران نے بلوائی۔ علی برادران نے اپنی مردانہ جرأت اور بے خوفی اور مسحور کرنے والی شخصیت

تو ہماری غیرت اور حمیت اسے کیسے قبول کرنا گوارا کر سکتی ہے۔

مسلم لیگ کی طرف سے جو شکایتیں کانگریس سے کی جاتی ہیں وہ دراصل خود اپنی ذات سے کرنا چاہیں اور کانگریس سے محاسبہ کرنے کی جگہ خود اپنے نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے۔ جب ہم یہ کرنا شروع کر دیں گے تو ہم کو نہ تحفظات کی ضرورت ہوگی نہ اپنے مطالبوں کو قبول کرانے کے لیۓ درخواستیں دینے کی۔ نہ صلح کی گفتگو کے موقع ڈھونڈنے کی اور نہ سول نافرمانی اور جنگوں کے اعلانات کرنے کی۔

مسلم لیگ اگر ہندوؤں سے جنگ کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے اپنی طاقت اور اپنے دشمن کی طاقت کا پورا پورا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ نہ تو دشمن کو حقیر اور بے چارہ سمجھنا چاہیئے نہ خود اپنی طاقت کا بے جا گھمنڈ کرنا چاہیۓ جنگیں چاہے وہ پر امن اور آئینی ہوں چاہے خونی اور انقلابی ـــ ذرائع اور وسائل کا مطالبہ کرتی ہیں اور سرمایہ داری کے موجودہ دور میں جس کے پاس جتنے زیادہ وسائل ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ اگر پہلے حملہ کو جھیل لیا جائے تو پھر معاملہ دم کا اور مقابل حریف کو تھکا کر زیر کرنے کا رہ جاتا ہے کون سا حریف میدان میں زیادہ دیر تک ٹھیر سکتا ہے۔ کون جنگ کے نقشہ کو بہتر طریقہ پر ترتیب دے سکتا ہے کس میں پیش بینی، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی زیادہ ہے۔ کون حملے اور پسپائی کے اوقات کو بہتر سمجھتا ہے کون کمزور جگہ کو پہچان کر حملہ کر سکتا ہے کس کی نظر بنیادوں پر ہے اور کس کی فروعات پر ـــ یہ تمام عناصر ہیں جو جنگ کی کامیابی اور ناکامی پر اثر ڈالتے ہیں۔ قومیں جنگوں کے لیۓ خاموشی کے ساتھ، برسوں تک تیاری کرتی ہیں۔ تیار نہیں ہوتیں تو بہت سی توہینوں، ذلتوں اور نقصانوں کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ رضا کاروں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ ان میں جفاکشی اور اطاعت شعاری پیدا کی جاتی ہے۔ آلات حرب اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال کی مشق کرائی جاتی ہے۔ فوجی افسروں کی تربیت کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا ہے۔ جنگ کا ایک پورا فن اور علم ہوتا ہے اور اس سے پوری طرح وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کے وسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں محض جسمانی طاقت اور بے خوفی کام نہیں دیتی بلکہ دولت علم اور عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ابی سینا کے مقابلہ میں اٹلی، سرحد کے مقابلہ میں برطانیہ، چین کے مقابلہ میں جاپان اپنی تعداد کی کثرت یا اپنی جسمانی طاقت اور بے خوفی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ اس لیے کامیاب

سے کسی قسم کا کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ وہ اس کی پابندی کریں گے اور اس کے پورا کرنے میں کسی قربانی کے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ کیا اس نے بھی اپنے نوجوان کارکنوں میں استقلال جفاکشی، سادگی اور احتیاجات کی کمی کی وہی اعلیٰ صفات پیدا کردی ہیں جو کانگریس کے کارکنوں کی ایک عام خصوصیت ہیں۔ کیا اس نے بھی ایسے ہی تعمیری کام شروع کر رکھے ہیں جیسے کہ کانگریس نے اور ہندوؤں کے دوسرے مذہبی اور تمدنی اداروں نے عام طور پر شروع کر رکھے ہیں۔ کیا اس کی قوم میں بھی مخیر اور باہمت دولتمندوں کی ایسی ہی کثرت ہے۔ کیا اس کو بھی سرمایہ داروں کی ایسی ہی مالی امداد اور سرپرستی حاصل ہے جیسی ہندوؤں کے ہر ادارے کو ملی ہوئی ہے۔ کیا اس کے رضاکاروں کی فوج بھی ایسی ہی تربیت یافتہ اور منظم ہے جیسی کانگریس کی ہے۔ کیا اس کے یہاں بھی عورتوں میں اتنی ہی بیداری پھیل چکی ہے کیا وہ بھی مردوں کے ساتھ اسی طرح دوش بدوش قومی تحریک کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں جیسی ہندوؤں میں۔ کیا مسلمانوں کے یہاں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ایسے ہی نہایت اچھے قومی مدرسے، کلب، انجمنیں، اکھاڑے، ورزشی تنظیم گاہیں وغیرہ ہیں جیسی کہ ہندوؤں کے یہاں پائی جاتی ہیں کیا مسلمانوں نے بھی کئی نسلوں کے ایثار، دور اندیشی، کفایت شعاری اور خوش انتظامی سے وہ جائدادیں، ملیں، کارخانے اور کاروبار شروع کئے ہیں جو ہندوؤں نے کر رکھے ہیں۔ کیا انھیں بھی نئی نسل کی فلاح و بہتری کی اتنی ہی فکر ہے جتنی ہندوؤں کو ہے۔ کیا ان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی جاہل عوام سے رابطہ اور میل اتنا ہی بڑھا لیا ہے، ان کے دکھ درد میں اتنے ہی شریک ہونے لگے ہیں جتنے ہندو ہوتے ہیں۔

جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر کس بل بوتہ پر اپنا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی منظوری کی توقع قائم کی جاتی ہے؟

چاہتے سب ہی کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

جس وقت ہم داد عیش و عشرت دیتے رہے دوسرے محنت اور تکلیف اٹھا کر اور عاقبت اندیشی اور اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے میں مصروف رہے جیسا آدمی بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ جو چیز ہمیں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا چاہیئے وہ کوئی دوسرا شخص ہم کو کیسے عطا کر سکتا ہے اور بفرض محال اگر عطا بھی کرے

خصوصاً دشمن ملکوں سے ہوں تو خوف و ہراس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کوئی آدمی بھروسہ کے لائق نظر نہیں آتا۔

غرضکہ جنگ کا یہ نقشہ ہے جس کو نظر کے سامنے رکھ کر کانگریس اپنی سیاسی اور تمدنی آزادی کے مطالبوں کو برطانیہ کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرتی ہے۔ اور ان نتائج اور عواقب کا ڈر ہے جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ، کانگریس سے لڑائی مول لینے سے ہچکچاتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے کانگریس کے مطالبوں کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیتی ہے۔

خصوصاً اب جب کہ آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئی ہیں، کانگریس سے جنگ کرنے میں حکومت برطانیہ کو اور بھی زیادہ پس و پیش ہوگا۔ اب حکومت برطانیہ اپنے سول، پولس اور فوج کے ملازموں اور وفادار "جی حضوریوں" پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتی جتنا پہلے کیا کرتی تھی۔ پہلے ان کے تصور میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کانگریسی خیال کے لوگ حکومت کی گدی کے بھی مالک بن سکتے ہیں لیکن اب تو وہ اپنی آنکھوں سے کلکٹر اور پولس کپتان کو کانگریسی وزیروں کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا دیکھ چکے ہیں اور اب ان کے لئے یہ خیال کرنا بالکل قدرتی بات ہے کہ کل پھر کانگریس والے برسر اقتدار ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ جو زیادتیاں کی جائیں گی ان کا دل کھول کر بدلہ لے سکیں گے۔ اس لئے سرکار برطانیہ اور کانگریس کی اس لڑائی میں وہ غیر جانب دار رہنے کو ہی بہتر اور افضل سمجھیں گے اور اگر خیر خواہی دکھانا ضروری ہی سمجھیں گے تو عاقبت اندیشی کا یہ تقاضا ہوگا کہ آنے والی حکومت کے ساتھ خیر خواہی کریں تاکہ پوری زندگی امن چین سے بسر ہو اور ملک کے لوگوں میں بھی غدار اور وطن فروش نہ کہلائیں۔

یہ تو کانگریس کی طاقت کا حال ہوا لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس اپنے مطالبوں کے منوانے کے لئے کون سی طاقت ہے۔ آیا اس کے قومی مطالبہ میں بھی اسی طرح کی کوئی ہمہ گیری اور یک جہتی پائی جاتی ہے اور پوری مسلم قوم اس کے ساتھ بھی اسی طرح شریک ہے جیسی کانگریس کے ساتھ ہے۔ اس کے پاس بھی لڑنے کے لئے اتنے ہی جنگ کے محاذ موجود ہیں جتنے کانگریس کے پاس ہیں۔ اس کے یہاں بھی مخلص ایثار پسند، ذی علم، معاملہ فہم اور عوام کو منظم کرنے والے رہنماؤں کی اتنی ہی کثرت ہے کہ وہ گاؤں گاؤں میں ان کو بکھیر دے اور ان کی وفاداری، انضباط پسندی اور اطاعت شعاری پر پوری طرح بھروسہ کر سکے کہ جب کبھی مرکز

انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ فتح گڈھ میں منظور کی انجمن نے نئی تعلیم کا پرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا اور اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی طرف سے بنیادی حرفتوں کے لئے ایک منضبط نصاب تیار کرے گی۔ اس کام کے لئے پانچ اساتذہ نے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں۔

اردو ہندی | ۱۸ دسمبر کو اردو ڈے ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا۔ الہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو نے صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے زبان کے جھگڑے کا بہت دکھ بھرے دل کے ساتھ تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اردو کے متعلق تین چار سال سے جو رویہ لوگوں نے اختیار کر لیا ہے اس سے مجھے انتہائی تکلیف اور رنج ہے ہندوؤں کا اردو کی اٹھان میں بڑا حصہ ہے۔ اردو ایک غیر منقسمہ جائداد ہے اور اگر ہندو اردو کو تباہ کر رہے ہیں تو وہ اپنی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں آخر میں انھوں نے تنبیہ کی کہ زبان کے جھگڑے کی وجہ سے قومیں اور سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔ قوم کا سب سے گرانقدر ورثہ اس کی زبان اور تمدن ہے اگر زبان تباہ ہو گئی تو قومی زندگی سے بھی ہاتھ دھو لینا چاہئے۔

اردو ہندی کی بحث میں ریورنڈ سی ایف اینڈریوز نے ایک نیا شاخسانہ اٹھایا ہے اور وہ جنوبی ہند کی زبانوں کا ہے جو دراوڑی اصل سے ہیں۔ الہ آباد میں تقریر فرماتے ہوئے آپ نے کہا ہندوستان کی عام زبان ٹکسالی سکہ ہونا چاہیئے جس سے بوقت ضرورت ہر جگہ کام لیا جا سکے یہ ہر جگہ روزمرہ استعمال کی چیز نہیں ہو سکتی جنوبی ہند میں ہندوستان کے خلاف جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ اس لئے شمالی ہند کو چاہیئے کہ ہندوستانی لغت کی تدوین میں جنوبی زبانوں کا خاص لحاظ رکھے اور بعض عام الفاظ ان زبانوں سے بھی اس کی لغت میں شامل ہونا چاہئیں۔

ہندی کانفرنس راجی نے تجویز منظور کی ہے کہ تمام ہندی بولنے والے صوبوں کو ایک کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں پر سیاسی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارا تنفس ایک زہریلی تعصب کی فضا میں جاری ہے۔ اور ہمارے کانوں میں سیاسی نعروں کے سوا عقل و انصاف کی مدھم مگر صاف آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

دیہی علاقوں میں یونیورسٹی کی نو آبادیاں |
مسٹر محمد امام صاحب نے میسور یونیورسٹی کی سینیٹ میں ایک تجویز پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ یونیورسٹی کی طرف سے

خطرہ سے خالی اور صاف نظر آتا ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ فلسطین کو بجائے سیاسی امیدوں کا آماجگاہ بنانے کے اپنا مقدس مذہبی مرکز بنائیں جیسا کہ وہ اسے صدیوں سے سمجھتے آئے ہیں۔ اب رہی وہ بڑی آبادی جو بعض ملکوں میں صدیوں سے ظلم وستم کا شکار ہو رہی ہے اور آج بھی حقارت کی نگہ سے دیکھی جاتی ہے اس کو چاہیئے کہ اقوام متعلقہ کے مشورہ سے ان ملکوں سے اٹھا کر دوسرے ملکوں میں بانٹ دیا جائے جہاں کہ وہ جاں نثار باشندوں کی حیثیت سے رہیں اور دوسرے یہودیوں سے جو چیز ان کا رشتہ قائم کرنے والی ہو وہ سیاسی غرض نہ ہو بلکہ مذہب ہو جس کو آج تک انھوں نے اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے۔

لیبر پارٹی کے لیڈر عربوں کے سخت مخالف (ــــــــــــــ) میجر اٹلی سمجھتے نہیں اچھا کو عربوں افراد بیشتر کے ہیں لیکن باوجود اس کے برطانیہ نے کوئی فیصلہ کن پالیسی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ یہودیوں کو بھی رکھنا چاہتی ہے اور عربوں کو بھی خفا کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے اس نے یہودیوں کے "قومی وطن" کے قیام میں کافی پابندیاں عائد کیں، ان کے داخلہ کی تعداد معین کر دی، اس کے بعد تقسیم ملکی کے ذریعہ ان کی جائے سکونت کو محدود کرنا چاہا۔ لیکن عربوں کی مخالفت بدستور جاری رہی۔ اور وہ اعلان بلفور کی منسوخی پر تلے رہے۔ آخر کار ۱۰ نومبر کو پارلیمان برطانیہ نے اسے مسترد کر دیا اور وڈ ہیڈ کمیشن کی سفارشات کو منظور کر لیا گیا لیکن لندن کانفرنس جو حال میں منعقد ہونے والی ہے اس کی کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہا جاتا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ہنوز طے ہونے کے لئے باقی ہے۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے ان کے قومی وطن کا تخیل اگر بروئے کار آ بھی جائے تو ان کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جگہ کی تنگی کا سوال بدستور باقی رہتا ہے پھر یہ کچھ معقول بات نہیں معلوم ہوتی کہ تمام یہودیوں کو ان ملکوں سے کھدیڑ کر جہاں کہ وہ برسوں سے وفاشعاری کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ فلسطین میں بھر دیا جائے اور تمام دنیا کے دروازے ان کے اوپر بند کر دئے جائیں۔

اسٹریا کے وہ یہودی جن کو آمر جرمنی نے ان کی آن میں نکال باہر کیا، ان کی آہ و بکا ڈینوب کے ساحل پر ایک عالم نے سنی لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اقوام یورپ ایک عرصہ سے یہودیوں کے مسئلہ پر غور کر رہی تھیں لیکن (EVIAN) کانفرنس کا بھی نشستند گفتند و برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ زبانی جمع خرچ اور "ریزولیوشن فرمائی" ایک عرصہ سے جاری ہے اور اب ساتھ کے قتل کے جرم میں جو وحشیانہ سلوک یہودیوں کے ساتھ برتا گیا ہے اس کے اوپر رزو ولٹ (ــــــــــــــ) سے لیکر زیلینڈ تک ہر شخص آتش بدامن نظر آتا ہے لیکن اس سے ہٹلر کے طرز عمل میں ذرہ برابر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ گھے کا جواب گھے سے دینے کے لئے آمادہ ہے اور نازی پریس اس کی ہمنوائی کے لئے موجود ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ممالک اگر یہودیوں کے ساتھ رحم کر سکتے ہیں تو کریں اور انھیں بھر لیں ورنہ یوں ہی رہنے دیں، یورپ کے ممالک ان مظلومین سے اظہار ہمدردی تو کرتے ہیں لیکن ان بے روزگاروں کو اپنے ملک

جو قانون کے مطابق نہوں۔

یہ قوانین جن مقاصد کو پیش نظر رکھکر وضع کئے گئے ہیں اور ان سے جن خرابیوں کا انسداد اور جن فوائد کی توقع ہے انکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، حکومت حیدرآباد تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے زرعی اصلاح کے لئے ایک منظم قدم اٹھایا مگر کسی خرابی کے متعلق قانون بناکر یہ سمجھ لینا کہ کلیتہً اسکا انسداد ہوگیا صحیح نہیں ہوسکتا، دنیا اس معیاری اخلاق سے ابھی بہت دور ہے، حقائق و مشاہدات کو نظر انداز کردینا ایک نقاد کا کام نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا مقصد کاشتکاروں کی امداد اور ان کو ساہوکاروں کے ظلم و ستم سے بچانا ہے، مگر جب تک کاشتکاروں کی حالت سقیم ہے اور ساہوکاروں کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے اس وقت تک نہ تو قرضہ لینے سے روکا جاسکتا ہے اور نہ ساہوکار کی من مانی شرائط کا انسداد کیا جاسکتا ہے، ساہوکار قانونی گرفت سے بچنے کے لئے مختلف ترکیبیں ڈھونڈ سکتے ہیں، اور کاشتکار اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر ان کو تسلیم کرسکتے ہیں۔ مثلاً وہ کاشتکار سے وہی قدیم اعلیٰ شرح سود وصول کریں۔ رجسٹر میں سرکاری شرح درج کریں باقی سود زر اصل میں شامل کردیں، یا ایک زمین جس کی مدت رہن ۲۰ سال ہوچکی ہو اسکو ایک نئے رہن نامہ کی صورت میں اپنے کسی عزیز کے نام منتقل کردیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں قانون یا حکومت کچھ نہیں کرسکتی، نیز کسی قانون کی صحیح خامیوں کا اندازہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کو نافذ ہوتے کچھ عرصہ نہ گذر گیا ہو، اس لئے اب جبکہ قوانین کو نافذ ہوئے چھ ماہ کے قریب ہورہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ حکومت کی جانب سے ایسی تحقیقات عمل میں لائی جائیں جن سے معلوم ہوسکے کہ کاشتکاروں کو ان سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے، اور حکومت کا حقیقی منشا کس حد تک پورا ہورہا ہے۔

انتقال اراضی کے دستورالعمل کا مقصد کاشتکاروں کی زمینوں کو ساہوکاروں کے قبضے اور ملکیت میں جانے سے روکنا ہے، ۳۱۲ مواضعات میں کتنی زمین گمفوں اور منتقل ہو چکی ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس قانون کی رو سے وہ تمام قومیں جو بالعموم زراعت کرتی ہیں "محفوظہ اقوام زراعت پیشہ" کی تعریف میں داخل کی گئیں ہیں۔ قانون میں تشریح کی گئی ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں، آدمی ہندوؤں، اقوام وحشی، اور انڈین دیسی عیسائیوں میں کون کون سی ذاتیں یا فرقے اقوام محفوظہ میں شامل ہوں گے۔ مگر یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ان اقوام کے صرف وہی لوگ محفوظ متصور ہوں گے جو بحیثیت پٹہ دار شکمی دار یا قابض اراضی یا مالکانہ ایسی زمین پر کاشت کرتے یا قابض ہوں جس کی مالگذاری ۵۰۰ روپیہ سال سے زائد نہو، جو لوگ اس سے زائد مالگذاری ادا کرتے ہیں محفوظ نہیں ہیں، البتہ اگر کسی وجہ سے ان کے محاصل میں کمی ہو کر اس مقدار میں آجائے تو وہ بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ اس قانون کی رو سے حسب ذیل پابندیاں لگائی گئیں ہیں۔

۱۔ کسی محفوظہ اقوام کے کسی فرد کی اراضی کا دوامی انتقال کسی غیر محفوظہ گروہ کے فرد کو تعلقہ دار ضلع کی منظوری کے بغیر نہو سکے گا۔

۲۔ جو اراضی رہن کی جائیگی اس کی مدت ہر صورت میں مع توسیعات ۲۰ سال سے زائد نہوگی۔

۳۔ جبتک اراضی مرتہن کے قبضہ میں ہو اور وہ زر لگان وصول کرتا رہے زر رہن پر کوئی سود واجب الادا نہوگا۔

۴۔ راہن مدت رہن کے اندر ہر وقت زر رہن ادا کرکے فک رہن کرا سکے گا۔

۵۔ محفوظہ اقوام کا کوئی شخص اپنی زمین "قول" (کاشت کیلئے دوسرے کو دینا) پر دینا چاہے تو اسکی مدت ۲۰ سال سے زائد نہوگی۔

۶۔ محفوظہ اقوام کے کسی رکن کی اراضی ڈگری، یا حکم عدالت دیوانی، یا سررشتہ مال کی تعمیل میں فروخت نہ کی جاسکے گی اور ۲۰ سال سے زائد مدت پر قول کیلئے دی جاسکے گی۔

آئندہ سے رہن بالوفا کی شرط کالعدم قرار دی گئی، نیز اگر کوئی ایسا دوامی انتقال بلا منظوری کیا جائے جس کے لئے منظوری حاصل کرنا لازمی ہو، تو اس کی شکل رہن بالقبض کی ہوتی جس کی مدت ۲۰ سال سے زائد نہوگی اس قانون کی رو سے تعلقدار کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ ایسے رہن ناموں میں ترمیم کرسکے

درخواست پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں، درخواست کنندوں کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے یا اس کا قرض وصول نہیں ہو رہا ہے نیز قرضہ کی تاریخ، اصل، شرح سود، اپنے اثاثوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات بھی درج کرنا ہوگی، مصالحت قرضہ کی درخواست صرف ایسے کاشتکار دے سکیں گے جن کی سالانہ مالگذاری ۵۰۰ روپیہ یا اس سے کم ہو، کمیٹی فریقین کی شہادتیں سننے کے بعد اس رقم کا تعین کرے گی جو قرضدار کو ادا کرنا ہے، نیز دوران ادائی میں شرح سود کا بھی تعین کرے گی۔ اگر کوئی کاشتکار تصفیہ شدہ قرضہ کو ادا کرنے میں تساہل سے کام لے تو رقم مذکور اس سے مالگذاری کی باقیات کی صورت میں وصول کی جائے گی۔

قرض دہندگان کا دستور العمل صوبہ مدراس، اور برار و متوسط کے قوانین کو پیش نظر رکھکر بنایا گیا ہے سنہ ۴۳ف میں یہ قانون بطور امتحان اضلاع اورنگ آباد و عثمان آباد میں نافذ کیا گیا، وہاں اس کے نتائج بڑے اچھے رہے، اور اب اس کو پوری ریاست میں نافذ کر دیا گیا ہے۔

اس قانون کی رو سے ساہوکاروں پر حسب ذیل پابندیاں عاید کی گئیں ہیں۔

(۱) ساہوکاروں کے لئے رجسٹری کرانا اور اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۲) عطا شدہ اجازت نامہ صرف ایک ضلع کے لئے کارآمد ہوگا، اگر کاروبار کئی اضلاع میں ہو تو ہر ضلع کے لئے علیحدہ علیحدہ اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کی فیس ۸ روپیہ ہوگی، ۲ سال کے بعد اس کی تجدید لازمی ہے۔

(۳) حسابات کے اندراجات میں وہی ہندسے استعمال کئے جائیں جو استعمال کردہ زبان میں معمولی طور پر مستعمل ہوں۔

(۴) صحیح شرح سود کا اندراج۔

(۵) قرضہ کی ادائی جو بشکل جنس ہوتی ہو اس کی قیمت، نیز زر اصل، سود، محسوب کردہ رقم کی مقدار الگ الگ بتانا پڑے گی۔

(۶) ہر سال فرد حساب وقت ذیل کے ایک ماہ کے اندر اندر قرض دار کے پاس بھیج دی جائیگی۔

اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ان کا انسداد کیا جائے۔

اصلاح کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو مروجہ طریقہ کو اڑا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا نیا طریقہ رائج کیا جائے جس میں یہ خرابیاں نہوں، یا پھر موجودہ طریقہ میں کچھ اصلاح کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ ساہوکاری طریق کو گوناگوں خرابیوں کے باوجود بالکل اڑایا نہیں جاسکتا، کیونکہ زراعت اس کے بل بوتے پر چل رہی ہے، کاشتکار بھینس ہے اور ساہوکار جونک، بھینس جانتی ہے کہ تالاب میں جونکیں ہیں جو پانی میں داخل ہوتے ہی لپٹ کر خون پینا شروع کردیں گی مگر وہ تالاب کو چھوڑ نہیں سکتی اور جونکیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ اگر بھینس کو جونکوں سے محفوظ رکھنا ہے تو ایسے پختہ حوضوں کی تعمیر ضروری ہے جن میں جونکیں نہوں، یا اگر یہ ممکن نہو تو کم از کم ایسی دوائیں یا طریقے استعمال کئے جائیں جن کی وجہ سے جونکیں سست اور کمزور ہوجائیں تاکہ بھینسوں کو کم نقصان پہنچا سکیں، کاشتکار ساہوکاروں کی مکاریوں اور چالاکیوں سے واقف ہے مگر وہ مجبور ہے، اور کوئی ذریعہ اس کے سامنے نہیں اس لئے وہ ان ہی سے امداد حاصل کرتا ہے اگر اس کو ساہوکاروں کے پھندے سے نکالنا ہے تو ایسے اداروں کا قیام بہت ضروری ہے جو صحیح اصولوں پر ان کی مدد کرسکیں۔ مگر ملک میں جس پیمانہ پر ان نئے اداروں کی ضرورت ہے ان کا قیام فی الوقت ممکن معلوم نہیں ہوتا، اب دوسری صورت یہی رہجاتی ہے کہ مروجہ طریقہ کے نقائص اور خرابیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کی جائے، ریاست حیدرآباد کے پیش نظر پہلی صورت ہے، دوسری صورت کو وہ اختیار کرچکی ہے۔ ۶؍ جون ۳۸ء کو تین دستورالعمل یعنی مصالحت قرضہ، قرض دہندگان اور انتقال اراضی نافذ ہوچکے ہیں۔

دستورالعمل مصالحت قرضہ کا مقصد کاشتکاروں کو موروثی اور قدیم قرضہ سے نجات دلانا ہے، کیونکہ اس کا بار اتنا سخت ہے کہ موجودہ حالات میں اس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اور تاوقتیکہ یہ بار کم نہو آئندہ ترقی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ اس قانون کی رو سے ایسی کمیٹیوں کی تشکیل ہوگی جو قرضہ کی مصالحت کرائینگی ان کا صدر سرکاری آدمی ہوگا اور اسکے علاوہ دو یا زائد نامزد شدہ اشخاص ہوں گے، جو قرضدار یا قرض خواہ اپنے قرضہ کا تصفیہ کرانا چاہے گا اس کو کمیٹی کے سامنے ایک درخواست پیش کرنا ہوگی،

۲۱۲ مواضعات میں تحقیقات کرکے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے تقریباً ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔[۵]

(۸) بعض ساہوکار جو ساہوکارہ کے علاوہ غلہ اور اشیا کا لین دین بھی کرتے ہیں، دو آدمیوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتے ہیں، مثلاً الف کو ب کو کچھ دینا ہے، تو وہ اپنے ساہوکار کو چٹھی لکھ دیتا ہے کہ میرے حساب میں ب کو اتنی رقم ادا کردو، اب ساہوکار ب کو نقد رقم بہت کم دیتا ہے، بلکہ اپنی دوکان کی اشیا اس کو فروخت کرتا ہے، اس طرح ایک جانب اعلیٰ شرح سود ملتی ہے دوسری جانب مال گراں قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

(۹) دوکان داری کرنے والے ساہوکار غلے کے معاوضہ میں بھی اشیا فروخت کرتے ہیں، ساہوکار غلہ کو تولنے کے لئے غلط اوزان استعمال کرتے ہیں، نیز غلہ لانے والے ادنیٰ ذاتوں کے مزدور ہوتے ہیں اس لئے غلہ کچھ صاف نہیں ہوتا، اور ساہوکار مٹی، بھوسہ، اور کنکر کے نام سے کچھ حصہ اور الگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح سیر بھر غلہ خریدنے کے بعد ۹ یا ۱۰ چھٹانک کی قیمت کا گراں مال ان کو دیتے ہیں۔

(۱۰) چھوٹی مقداروں کے تولنے میں ترازو کی ڈنڈی مار کر فروخت کرتے ہیں، ڈنڈی مارنے سے کتنا فرق ہوتا ہے اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے کیونکہ یہ ہاتھ کی صفائی، مشاقی، انگوٹھے کی سختی، اور ترازو کی ڈنڈی کی لنبائی پر منحصر ہے مگر اندازہ ہے کہ سیر بھر میں ۲ چھٹانک سے ۳ چھٹانک تک بل رہتا ہے۔

(۱۱) بڑی مقداروں کے تولنے یا ناپنے میں غلط قسم کے اوزان استعمال کرتے ہیں، اس طرح کافی فرق ہو جاتا ہے۔

(۱۲) ایک چیز کے مختلف بھاؤ رکھتے ہیں، مثلاً نقد اور اُدھار کے بھاؤ میں فرق رہتا ہے، تھوک

---

[۵] "حیدرآباد میں زرعی قرضداری" از ایس ایم بھروچہ، گورنمنٹ سنٹرل پریس، حیدرآباد دکن ۳۷ء صفحہ ۴۳

(۴) مہاجن کو اجارہ حاصل ہے، اجارہ کا لازمی نتیجہ قیمت کی زیادتی ہے، چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کاشتکار اس کے پاس قرض لینے جاتے ہیں تو پہلے وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے، کئی روز مزید اصرار کے بعد رقم کی تعداد پوچھتا ہے، اور تعداد کو زیادہ بتاتا ہے، ۳ - ۴ روز گذرنے کے بعد معاملہ کا تصفیہ ہوتا ہے، در اصل اس ٹال مٹول سے وہ کاشتکار کی ضرورت کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے تاکہ اس لحاظ سے اپنی شرطیں منوا سکے۔

(۵) شرح سود پیشگی وصول کر لیتا ہے، مثلاً اس نے کسی کو ۱۰۰ روپیہ ۶ ماہ کے لئے ۱۸ فیصد پر قرض دیئے لیکن در اصل وہ اس کو ۸۲ روپیہ ادا کرتا ہے اس طرح گویا وہ شرح میں مزید ۳½ فیصد کے قریب اضافہ کر دیتا ہے۔

(۶) ساہوکار کاشتکار سے قرض دیتے وقت یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ وہ فصل پر غلہ اسی کو فروخت کرے گا، اس طریقہ کو "لدونی" کا طریق کہا جاتا ہے، اس سے کاشتکار کو بڑا نقصان ہوتا ہے، فصل کے موقع پر پیداواروں کی قیمت ایک نہیں رہتی، پہلے قیمت زیادہ ہوتی ہے مگر جب فصلیں کٹ کٹ کر بازار میں آنے لگتی ہیں تو ان کی قیمت میں کمی ہونے لگتی ہے اور جب سارا غلہ بازار میں آ جاتا ہے تو قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اب جن کاشتکاروں کی فصل پہلے تیار ہو جائے ان کو بازار میں اچھی قیمت مل سکتی ہے مگر ساہوکار کے یہاں یہ نہیں ہوتا، وہ فصل پر غلے کو تول یا ناپ کر لے لیتا ہے اور حساب ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوتا ہے، ساہوکار موسم کی سب سے کم قیمت پر غلہ خریدتا ہے اور اس قیمت میں سے بھی ۲ سے ایک روپیہ فی من تک "حق ساہوکاری" وضع کرتا ہے۔

(۷) کاشتکار سونے، چاندی کی چیزیں، مویشی، مکان، اور زمین رہن رکھکر بھی قرض لیتے ہیں، زمین کے علاوہ دوسری چیزوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۴۰ یا ۵۰ فیصد قرض ملتا ہے، اور جب اصل وسود شے کی مالیت کے برابر ہو جاتا ہے تو یہ چیز ساہوکار کی ہو جاتی ہے، زمین کی صورت میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر رقم ایک مدت معینہ میں ادا نہ ہو تو زمین ساہوکار کی ہو جائے گی، اس طریق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کاشتکاروں کے قبضہ سے نکل کر ساہوکاروں کے پاس جانے لگتی ہے، "مسٹر جیروجیے نے

ابھی تک اس شعبہ میں اپنا روپیہ لگا رہے ہیں خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حقیر نقصانات ان کے کثیر منافع کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، اور واقعہ بھی یہی ہے ساہوکار اپنی ترکیبوں، چالوں اور چالاکیوں سے مطالبات خطرے سے کہیں زیادہ رقم وصول کرتے ہیں، ان کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے، کاشتکار مجبور ہے کہ وہ ان سے قرض لے کیونکہ اور کوئی ذریعہ موجود نہیں، اس طرح ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور یہ من مانی شرطیں ان سے منوا سکتے ہیں، مختصر یہ کہ ساہوکار کاشتکاروں کا مخفی اور ذہین دونوں طرح استحصال کرتے ہیں۔ ان کے کاروبار میں کیا نقائص ہیں، اور وہ کس طرح کاشتکاروں کا استحصال کرتے ہیں ان کو ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

| مہاجنی کاروبار کے نقائص | (۱) جو رقم قرض دیتے ہیں اس پر بہت اعلیٰ شرح سود وصول کرتے ہیں، مسٹر ایس، ایم بھروچہ جن کو ریاست حیدرآباد میں زرعی قرضہ کی تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا تھا بتلاتے ہیں کہ ریاست میں ۱۵ سے ۲۰ فیصد تک شرح عام ہے، مجھے حال میں ایک موضع کی معاشی تحقیق کا موقع ملا تو موضع کی شرح سود ۱۸ سے ۴۵ فیصد تک معلوم ہوئی، نیز اچھے اور عمدہ ساکھ والے کاشتکاروں کو کم شرح پر قرض دیتے ہیں، معمولی اور غریب کاشتکاروں سے بہت زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔

(۲) اپنی قرض دی ہوئی رقموں پر سود در سود وصول کرتے ہیں، اس طرح رقم بہت آسانی سے دوگنی تگنی ہو جاتی ہے۔ مجھے دوران تحقیقات میں متعدد ایسے واقعات معلوم ہوئے جن میں رقم اصل سے بہت بڑھ گئی تھی مثلاً ایک مسلمان نے ۱۸ فیصد کے حساب سے سو روپیہ قرض لیا، ۵۰ روپیہ ادا کرنے کے بعد وہ مر گیا دس سال کے بعد جب اس کے بیٹے نے پرانا حساب کیا تو رقم ۳۳۳ ہو گئی تھی۔ ساہوکار نے متوفی کے بیٹے کو دو سو روپیہ قرض دیکر ۵۳۳ روپیہ کا کاغذ لکھوا لیا۔

(۳) جنس میں بھی اعلیٰ شرح سود اور سود مرکب کا طریقہ رائج ہے، ساہوکار اپنے موکلوں کو جنس کی شکل میں تخم یا کھانے کے لئے غلہ دیتا ہے، جتنا غلہ دیا جاتا ہے فصل پر اس کا ڈیوڑھا یا دگنا وصول کیا جاتا ہے اسکو "ناگ" کا طریقہ کہتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ معلوم ہوا کہ کاشتکار نے نصف من غلہ قرض لیا، ۵ سال کے عرصہ میں وہ ۵ من غلہ دے چکا ہے مگر ابھی اس کو ۳ من غلہ دینا باقی ہے۔

زراعت میں یہ سہولت بھی نہیں، پھر یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر کسانوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مقبوضہ اراضی کی ضروریات عمدگی سے پوری کر سکیں، اچھی زراعت کے لئے سرمایہ ناگزیر ہے، کیونکہ اگر سرمایہ کی کمی سے آلات وادزار یا مویشی محدود ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کسان اپنی طاقتوں کے بڑے حصہ کو ضائع کر رہے ہیں۔

زراعت میں مختلف کاموں کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ عام طور پر ماہرین زرعی نے قرضہ کی تین صورتیں بتائی ہیں، پہلے قلیل مدت کے قرضے ہیں جن میں روزمرہ کے مصارف یا کسی خاص فصل کے اخراجات شامل ہوں، ان کی مدت ۹ ، ۱۰ ماہ تک ہوتی ہے، دوسرے متوسط مدت کے قرضے، ان کا کسی خاص فصل سے تعلق نہیں ہوتا، ان کی میعاد ایک سال سے تین سال تک ہوتی ہے، تیسرے طویل مدت کے قرضے ہیں، ان کا مقصد مستقل ترقیات و اصلاحات اراضی ہے، مختلف ملکوں میں اپنے مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مدت مختلف ہے، مگر ہندوستان میں ان کی میعاد کا اوسط ۲۰ سال ہے۔

قرض دینے والے ادارے | ہندوستان میں اول تو ویسے ہی بینکوں کی کمی ہے، جو بینک ہیں وہ تجارتی ہیں اور شہروں میں قائم ہیں، اور شہریوں ہی سے تجارتی تعلقات رکھتے ہیں، تجارتی بینکوں کے لئے زراعت پیشہ لوگوں سے کاروبار کرنا مشکل بھی ہے، بینک سے کاروبار کرنے کے لئے تھوڑی بہت واقفیت اور تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے یہاں کم و بیش مفقود ہے، کاشتکار کی ساکھ بہت ہی کم ہے، اس کے پاس ضمانت کے لئے زمین، مویشی اور فصل کے موقع پر پیداوار ہوتی ہے، بینک جن کا یہ اصول ہے کہ اپنے اثاثوں کو بوقت ضرورت زر نقد میں تبدیل کرا سکیں ان چیزوں کی ضمانت پر قرض نہیں دے سکتے، پھر کاشتکار کو چھوٹی چھوٹی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے جو سال بھر تک پھیلی رہتی ہے۔ بینکوں کے لئے ان رقموں کا حساب رکھنا اور انفرادی طور پر کاشتکار سے کاروبار کرنا آسان کام نہیں، جب ان کے سامنے تجارت کے دوسرے آسان راستے کھلے ہوتے ہیں تو ان کو کیا ضرورت کہ خواہ مخواہ خطرہ اور مصیبت کے کاموں میں اپنا روپیہ پھنسائیں، دراصل زرعی اغراض کے لئے قرض دینے والے خاص بینک ہوتے ہیں مگر ملک میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اور چونکہ مزروعہ رقبہ میں اضافہ، آبادی کے اضافہ کے تناسب نہیں ہے اس لئے زراعت پیشہ آبادی کے پاس رقبہ فی کس برابر کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ زرعی رقبہ مقبوضہ کی وسعت کے بارے میں اعداد موجود نہیں ہیں اور اس لئے یہ صحیح صحیح بتانا ممکن نہیں ہے کہ ملک میں غیر فائدہ بخش رقبات مقبوضہ میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ اسی وقت ہم یہ کہ سکیں گے کہ زمین کس حد تک آبادی کے دباؤ کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ لیکن اس بات کا یقین عام طور پر پھیلتا جا رہا ہے کہ زراعت کا کام نفع بخش نہیں رہا ہے اور مقبوضہ رقبے روز بروز غیر فائدہ بخش ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کھیتی کے لئے فراہمی اصل کی جتنی تجویزیں ہیں اور کاشتکار کو قرضے کے بارے نجات دلانے کے جتنے منصوبے ہیں ان کی کامیابی نفع بخش مقبوضہ رقبوں کی موجودگی پر منحصر ہے۔

اس کے بعد میں اس کا تخمینہ کرنا چاہتا ہوں کہ ملک میں کتنا روزگار موجود ہے۔ اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن میں نے حال میں اس قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ میں نے سنہ ۱۹۰۱ء، سنہ ۱۹۱۱ء، سنہ ۱۹۲۱ء، سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے نقشوں سے کچھ اعداد لیے تھے اور ان کو مندرجہ ذیل طریقہ پر بے روزگاری کے دریافت کرنے کے لئے استعمال کیا تھا:۔

مردوں کی مجموعی آبادی میں سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر تک کے مردوں کو منہا کر دیا اس سے روزگار سے لگنے کے قابل مردوں کی تعداد معلوم ہو گئی۔ اس میں سے پھر میں نے ان مردوں کی تعداد کو گھٹا دیا جو دس سے ساٹھ کی عمر کے تو تھے لیکن معذور تھے مثلاً پاگل، اندھے، بہرے، گونگے وغیرہ۔ مردم شماری کے اعداد سے کام نہ کرنے والے مردوں کی تعداد کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر کے لوگوں کو منہا کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے ان مردوں کو بھی منہا کر دیا جن کی عمر تو دس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن جو معذور تھے اس طرح کام نہ کرنے والی تندرست آبادی کے اعداد حاصل ہو گئے۔ دس سے ساٹھ تک کی عمر کے تندرست کام نہ کرنے والے مردوں کا جو تناسب دس سے ساٹھ تک کی عمر کی مجموعی مردوں کی آبادی سے تھا اس سے فی صدی بے روزگاری کا علم حاصل ہو گیا۔ چنانچہ یہ فرض کرنے کے بعد کہ یہ طریقہ قابل اعتماد ہے تمام ہندوستان کے لئے اعداد حسب

اس ضمن میں آبادی اور غذا کی رسد کا جو باہمی تعلق ہے اس کا مطالعہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا ہماری غذا کی رسد آبادی کی ترقی کے ساتھ بڑھ رہی ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا غذا کی جو مقدار موجود ہے وہ ہمارے آدمیوں کے لئے ایک معقول معیار زندگی قائم رکھنے کے لئے کافی ہے یا نہیں ہے۔ دوسرے سوال کے جواب دینے کے لئے تو کافی مواد موجود نہیں ہے اور جو جواب دئے جاتے ہیں ان میں اندازے سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آبادی کو کافی غذا میسر نہیں آتی۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی نے تخمینہ کیا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ہماری غذا کی کمی کی مقدار بحساب ۲ ہزار آٹھ سو کلاری فی آدمی فی یوم اکتالیس ارب نوے کروڑ کلاریز تھی اور ہندوستان میں آج ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ آدمیوں کے لئے غذا موجود نہیں ہے۔

پہلے سوال (یعنی آبادی کے اضافہ اور غذا کی مقدار کے اضافہ کی نسبتی شرح) کا جہاں تک تعلق ہے اعداد و شمار زیادہ موجود ہیں اگرچہ یہ بھی اتنے زیادہ بھروسہ کے لائق اور مکمل نہیں ہیں جیسے مغربی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس بات میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ مجموعی مزروعہ رقبہ یا رقبہ زیر اجناس خوردنی نے آبادی کے اضافہ کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ البتہ پیداوار کی مقدار کے بارے میں یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ زراعت کی مجموعی پیداوار نیز غذا کی پیداوار میں آبادی کے مساوی ترقی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ ترقی جو کچھ ہوئی ہے وہ ادنیٰ قسم کے اناج میں ہوئی ہے اور گیہوں کی پیداوار میں مسلسل کمی نظر آتی ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ گذشتہ بیس سالوں میں پالتو جانوروں کی تعداد میں تقریباً ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوگیا ہے اور ادنیٰ اناج کے کھانے میں پالتو جانور بھی شریک ہوتے ہیں تو اس کے ماننے میں کوئی شبہ کا موقع نہیں رہتا کہ ہماری غذا کی مقدار میں آبادی کے اضافہ کی نسبت سے خاصی بڑی کمی واقع ہوگئی ہے۔

اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ روزگار کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ روزگار کے خاص ذرائع زراعت اور صنعت ہیں۔ صنعت کے ذریعہ سے جن لوگوں کو روزگار ملتا ہے ان کا تناسب مردم شماری میں گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس زراعت پر بسر کرنے والے لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے

ہندوستان میں آبادی کا مسئلہ

(از جناب پی ۔ کے ۔ وٹل صاحب)

ہندوستان کی آبادی کی ترقی کے اعداد و شمار سے ہر شخص واقف ہے۔ ۱۸۸۱ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی تھی اس ملک کی آبادی ۲۵ کڑوڑ چالیس لاکھ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں انفلوئنزا کی وبا کے فوراً بعد آبادی کی تعداد ۳۱ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ہوگئی تھی اور اب اگر صحت عامہ کے کمشنر نے جو تخمینہ کیا ہے اسے صحیح مان لیا جائے تو ہماری آبادی برما کو شامل کرنے کے بعد ۳۸ کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ ۱۹۴۱ء تک جبکہ نئی مردم شماری کی جائے گی توقع ہے کہ آبادی بڑھ کر ۴۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

۱۸۸۱ء سے ۱۹۳۱ء تک یعنی پچاس سال کی مدت میں آبادی کے اضافہ کی شرح اعشاریہ آٹھ سالانہ ہوتی ہے ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ شرح ایک فی صدی سالانہ سے کچھ زائد ہوتی ہے۔ یورپ اور ایشیا کے اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جن کی آبادی کے اضافہ کی شرح اور آبادی فی مربع میل ہندوستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ ان میں جاپان کی مثال خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ دوسری مثال برطانیہ عظمیٰ کی ہے اگرچہ اس کی شرح اضافہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کم ہوگئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس اضافہ کی وجہ سے کون سے فوری مسائل پیدا ہوتے ہیں؟ ہندوستان کے موت وحیات کے اعداد و شمار جو شخص بھی مطالعہ کرتا ہے اسے ملک کے اندر شرح اموات کی کثرت کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ہم انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو پیدا کرتے ہیں جن کی ایک بڑی تعد اد بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتی ہے اور ایسی تعداد جو خاصی بوڑھی عمر تک پہنچتی ہے بہت کم ہوتی ہے۔ پیدا ہونے والے ہر سو اشخاص میں سے ۵۰ پانچ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں صرف چودہ یا پندرہ اشخاص اس طرح مرتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمارا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرح اموات کو کم کیا جائے۔ اس وقت یہ ۲۴

لئے ویسا معمولی کچا مال موجود نہیں ہے جیسا دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے لئے ایسے دوسرے کچے مال ڈھونڈنا ہوں گے جو دوسرے ملکوں کے کچے مال کا بدل بن سکیں گے۔ اس کے لئے بہت زیادہ تحقیقات علمی کی ضرورت ہوگی۔

پہلی قسم کی صنعتوں کے شروع کرنے میں تو کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح دوسری قسم کی صنعتوں کو بھی تھوڑی سی تحقیقات علمی کے بعد شروع کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تیسری قسم کی صنعتوں کے لئے مکمل تحقیقات کی ضرورت ہوگی اور تحقیقات کا کام مختلف صوبوں کی انسٹیٹیوں اور افراد کو سپرد کیا جاسکتا ہے تاکہ اس قومی کمزوری کا ازالہ کیا جاسکے اور ملک کو اس کی تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جاسکے۔

اگر ان تمام چیزوں کا فیصلہ ہوجائے تو ہم اپنے ملک کی صنعتی عمارت کو ٹھوس بنیاد پر تعمیر کرسکتے ہیں۔ اگر ہم ایک معقول پنجسالہ منصوبہ تیار کریں اور اسے پورے جوش کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو درآمد کو ساٹھ یا ستر فی صدی تک کم کیا جاسکتا ہے اور ملک کو تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جاسکتا ہے اس کے علاوہ اس قسم کی صنعتوں کی ترقی سے جیسے کیمیاوی کھاد کی صنعت ہے ہماری زراعتی پیداوار میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور اس پالیسی پر عمل کرنے سے ہوسکتا ہے کہ قومی پیدایش دولت میں آئندہ پانچ سالوں میں تقریباً تین ارب روپیہ کا اضافہ ہوجائے۔ دو ارب روپیہ کا زراعت میں اور ایک ارب روپیہ کا صنعت میں اور یہ کانگریسی حکومتوں کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

ہو توان سے بعض صنعتوں کو ملکی تحفظ کے بجٹ سے امداد دی جا سکتی ہے۔

جن صنعتوں کے لئے ملک میں کافی کچا مال موجود ہے اور مصنوعہ مال کے کافی منڈی ہے ان کی ناکامی کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے یعنی بیرونی اور ملکی مقابلہ۔ بیرونی مقابلہ واقعی ایک سخت خطرہ ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔ اگر اس بیرونی مقابلہ کو روکا جائے تو ان صنعتوں کی کامیابی یقینی ہے۔ اس بیرونی مقابلہ کے روکنے کے سلسلے میں سب سے اہم عنصر ہماری محاصل درآمد کی پالیسی ہے جو فی الحال ہمارے ہاتھ میں مکمل طور پر نہیں ہے فیڈریشن میں جو اختیارات منتقل کئے جا رہے ہیں ان کے بارے میں چاہے جس قدر بھی اختلاف رائے ہو ایک بات بہرحال یقینی ہے کہ اگر تمام صوبوں اور ریاستوں کے نمائندے متفق ہو جائیں اور ان کا متفق ہونا ممکن ہے کیونکہ اس معاملہ میں صوبوں اور ریاستوں کے مفاد یکساں ہیں تو ہم ملک کے محاصل درآمد کی پالیسی پر اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے وزراء کی اس کانفرنس کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہر صوبہ کی حکومت ہر ممکن طریقہ سے جن میں محاصل درآمد کے ذریعہ تامین بھی شامل ہے کم سے کم دس سال تک ان کلیدی صنعتوں کا تحفظ کرے گی۔ اگر تمام صوبوں کی حکومتیں اس محاصل درآمد کی پالیسی کے رشتہ میں اپنے آپ کو منسلک کر لیں گی تو قیمتوں میں اس قدر کمی بیشی کرنا ممکن ہوگا کہ اس کے ذریعہ صنعت کو کامیاب بنایا جا سکیگا صوبوں کے لئے اس قسم کا ارادہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔

جہاں تک اندرونی مقابلہ کا سوال ہے اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ سرمایہ کی اتنی زیادہ ضرورت ہے کہ نجی سرمایہ داروں کے لئے حکومت کی امداد کے بغیر صنعتوں کا شروع کرنا مشکل ہوگا اس کے علاوہ حکومت نہایت آسانی کے ساتھ ملکی قوانین بنا کر ان پر نگرانی رکھ سکتی ہے لیکن ایک اور بھی خطرہ ہے جس سے تحفظ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کہیں غیر ملکی کمپنیاں جن کے پاس سرمایہ بہت زیادہ ہے اپنی بڑی صنعتوں کو اس ملک میں شروع نہ کر دیں اور اندرونی مقابلہ کا سبب بن جائیں۔ اگر موجودہ دستور کے اندر رہتے ہوئے ہم انہیں ان صنعتوں کو شروع کرنے سے باز نہ رکھ سکیں تو ہم یہ کر سکتے ہیں کہ کچے مال کے ذرائع پر اپنا اجارہ قائم کر لیں تاکہ ان غیر ملکی کمپنیوں کے لئے مقابلہ کی صنعتیں کھولنے

پیداواریں قوم کی ترقی کے لئے لازمی ہیں وہ شکر، ربر، کیمیاوی کھاد وغیرہ ہیں (کیمیاوی کھاد کی صنعت کا شمار وزنی
کیمیاوی صنعتوں میں بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اہمیت ہندوستان کے لئے بہت زیادہ ہے
اس لئے اس کو ایک جداگانہ عنوان کے ماتحت درج کرنا بھی ضروری ہے)

ان صنعتوں کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ کئی کروڑ کے لگ بھگ ہوتا ہے اور ان کی
پیداواریں تمام ہندوستان کے فائدہ کے لئے ہیں لیکن چونکہ صنعت کا محکمہ صوبائی اختیار میں ہے اس
لئے اگر انھیں تمام ہندوستان کے مفاد کو سامنے رکھ کر قائم کیا جائے گا تو سب صوبوں میں خوب تعاون
عمل پیدا ہو سکے گا۔ ان صنعتوں کے شروع کرنے کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت ہے وہ اتنا زیادہ ہے
کہ بغیر مناسب تعاون عمل کے ان کا قائم ہونا بہت مشکل ہوگا یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ کانگریس کے ارباب
حل وعقد نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور صنعتی وزیروں کی ایک کانفرنس ان مسائل کو سوچنے
کے لئے عنقریب ہونے والی ہے امید ہے کہ اس کانفرنس سے عملی فائدہ کی کوئی صورت نکل سکے گی۔ اس
کانفرنس کے غور کے لایق جو سوالات ہو سکتے ہیں ان میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کے لئے کلیدی صنعتیں کیا ہیں؟ ملک کے لئے ان کی اہمیت کا سوال۔ ان
کے شروع کرنے کے لئے موزوں ترین جگہ اور ان کی مختلف صوبوں میں تقسیم۔

۲۔ ان بڑی صنعتوں کو جاری کرنے کے لئے جن ابتدائی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے ان کا مسئلہ
اور ان ابتدائی تحقیقاتوں کی مالی امداد کا مسئلہ اور تمام دوسری ابتدائی تفصیلات۔

۳۔ ان صنعتوں کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کا سوال اور ان پر ریاست یا نجی ایجنسیوں یا دونوں کی
نگرانی کا سوال

۴۔ ان صنعتوں میں اندرونی اور بیرونی مقابلہ کا سوال اور اس کو روکنے کے ذرائع اور طریقے
مثلاً محاصل درآمد کی ایک مشترکہ تامینی پالیسی اور دوسری مناسب داخلی نگرانیاں

۵۔ موجودہ بڑی صنعتوں کے تعاون عمل کا سوال اور ان کو امداد دینے کے ذرائع اور طریقے

اگر ان مسائل کا تصفیہ وزرا کی کانفرنس میں ہو جائیگا تو ہمیں امید ہے کہ ہم ایک مستحکم بنیاد پر اپنا کام شروع

کوئی خاص جسمانی نقص نہ ہو تو وہ بیشتر اس لئے گونگا ہوتا ہے کہ وہ کسی شئے اور مقررہ صورت کا تعلق نہیں سمجھتا ہے کیونکہ وہ شئے کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنے طور پر وہ دوسری چیزوں سے ممیز کرتا ہے۔ مثلاً وہ چڑیا اور طوطے میں تمیز کر سکتا ہے مگر وہ چڑیا کے لئے چڑیا کا لفظ اور طوطے کے لئے طوطہ کا لفظ نہیں بول سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان پرندوں کے سلسلے میں ناموں کے سننے پر قدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس اصول کی بنا پر بہرے گونگے بچوں کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں۔ ان میں وہ پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ وہ جس آلے سے اشیاء اور تحریری صورتوں میں تعلق سیکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر پڑھنا سیکھتے ہیں تو ان کا تعلق کرنے یا (سیکھنے) کا آلہ مختلف ہوتا ہے یعنی بجائے وہ کان سے سننے کے آنکھوں سے استاد کے ہونٹوں کی حرکات کو دیکھتا ہے۔ اور ان حرکات کے موافق تختہ سیاہ پر الفاظ کو پہچاننے اور بولنے لگتا ہے۔

انسان اس طرح تحریک (موقع یا ضرورت) اور جوابی عمل سے جو کچھ ربط قائم کرتا ہے یا سیکھتا ہے۔ یہ ربط کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر سیکھنے کے یہ جوڑ الگ الگ مفرد اینٹوں کی حیثیت رکھتے تو ان سے انسان کا علمی قصر ہرگز تعمیر نہ ہو سکتا جس طرح ہم سماج کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک نسل دنیا میں تصرف و تجربہ کر کے فنا ہو جاتی ہے تو دوسری نسل جو اس کی جگہ لیتی ہے وہ کم و بیش گذشتہ نسل کے تجربات کو بنیاد بنا کر ان میں نئے نئے تصرفات کرتی ہے۔ اور اس طرح نئے نئے حقایق کا کھوج لگاتی ہے۔ وہ پھر اپنی جگہ پر نئی نسل کے ان تازہ حقایق کو پرانے نسلی تجربے کے ساتھ ہبیں کرتی ہے اور نئی نسل ان کو سیکھ کر اپنے طور پر اپنے دور میں اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور نسلوں کا یہ تجربی تسلسل تمدن کو مالا مال کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت سے بھی چھوٹے پیمانے پر یہی عمل کرتا ہے۔ وہ رات دن جو کچھ سیکھتا جاتا ہے وہ اس کا جزو علم ہو جاتا ہے انسان کے علاوہ دوسرے جانور بھی چھوٹے پیمانے پر اسی طرح سیکھتے ہیں۔ مگر ان کے عقلی و ذہنی قوا اس قدر تربیت یافتہ نہیں ہوتے کہ کسی چیز کو زیادہ دیر تک یاد رکھ سکیں۔ اور اگر یاد رکھنے کے سلسلے میں بعض جانور مثلاً کتا کوئی غیر معمولی صلاحیت بھی دکھائے تب بھی وہ عقلی طور پر کسی تجربے سے اس طرح پر نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ آئندہ کے لئے کسی نئے تجربے میں ان سے مدد لے سکے۔ اس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدے سے جانتے ہیں۔

کہ بالآخر وہ توازن حاصل کرتا ہے۔ اور بے تکلف تیرنے لگ جاتا ہے یعنی اس طرح تیرنے میں جسم کے
مختلف حصوں کا تعامل سیکھتا ہے۔ اب جب وہ دریا میں کودتا ہے بغیر کسی سابقہ یا ابتدائی تجربے یا اناڑی
پن کے بے تکلف اپنے جسم کو سنبھال لیتا ہے۔ اب یہ اس کا علم یا سیکھنا ہوگیا۔ کیونکہ وہ اس کی جسمانی مہارتوں کا
ایک لازمی حصہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ہمارا علم یا سیکھنا "مہارت" ہے جسے ہم بغیر کسی تکلف کے مناسب
موقع پر برت سکیں۔ بائیسکل چلانا سیکھنے کی صورت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اناڑی جس وقت بائیسکل چلاتا
ہے، وہ چلاتے وقت بہت گھبرایا ہوا ہوتا ہے وہ ایک وقت میں کئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ سڑک پر
چلتا ہے۔ سڑک پر جتنے موقعوں پر خطرے ہوتے ہیں ان سب کے متعلق سوچتا ہے۔ خود پیڈل چلانا
اور ہینڈل کو تھامے رکھنا ان تمام چیزوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ مشق کرتا ہے اس کا کام
آسان ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب پیڈل چلانے اور ہینڈل تھامنے کے خیال سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔
بائیسکل پر سنبھل کر بیٹھنا سیکھتا ہے۔ اب وہ صرف راستے پر چلنے والوں کا خیال رکھتا ہے اور تھوڑی سی
توجہ سے وہ نہایت صفائی اور آسانی سے سائیکل چلانے لگتا ہے۔ غرض ہم جس قدر کسی عمل کو کرتے ہیں
اسی قدر وہ عمل ہمارے لئے آسان اور بے ارادہ ہوجاتا ہے۔ حافظہ کے تعلق سے ہم اس عمل کو اور بھی
صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم بچپن سے زبان اس طرح سیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے جب کوئی چیز پیش کی
جاتی ہے تو اس کا کوئی نام ہوتا ہے یا جو عمل ہوتا ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا ہے۔ اس طرح کسی
شے یا عمل اور اس کے ساتھ کسی نام یا آواز کو متعلق سمجھنے سے ہم زبان سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہم ایک چھوٹا پرندہ
دیکھتے ہیں۔ لوگ اس کو چڑیا کہتے ہیں۔ کئی موقعوں پر ہمارے ذہن میں لفظ چڑیا اور چڑیا (پرندہ) کا ربط قایم
ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی ہم چڑیا کو دیکھیں گے تو خود بخود چڑیا کا لفظ ہمارے ذہن میں دوڑ جائے گا۔
اگر ہم اسے ذہن سے نکالنے کی بھی کوشش کریں تب بھی ہم اس کو نہیں بھول سکیں گے۔ اس صورت میں
چڑیا کی صورت ایک موقع ہے اور اس کے نام کا تصور جوابی عمل ہے۔ اس موقع اور جوابی عمل کا نام سیکھنا
ہے۔ اس کو زیادہ واضح کرنے کے لئے گونگے اور بہروں کی مثال کو لیجئے۔ بالکل بہرہ آدمی کیوں گونگا ہوتا
ہے؟ اس کو ہم موقع یا تحریک اور جوابی عمل سے اس طرح واضح کر سکتے ہیں کہ اگر بہرے آدمی کی زبان میں

لئے علم کو ایک طرفہ معاملہ سمجھ کر بچے پر نسلِ انسانی کے گذشتہ تجربات کا بوجھ برابر لادتے جاتے ہیں۔ علم کو آسان کرنے کے لئے وہ بچوں کے سامنے اِس کے مختلف حصّوں کو منطقی ترتیب کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو بیشتر صورتوں میں بچوں کے لئے صرف بامعنی علامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بچہ نشو ونما کی جس منزل میں ہوتا ہے اس میں وہ مجرّد علامات کے مخفی معنوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اس عمر میں اس طرح چیزوں کو الگ الگ مضامین یا معلومات کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا معلّم یا مربّی اس چکنی مٹی کے مفروضہ کی بنا پر بچے کی نامی شخصیت سے چشم پوشی کرتا ہے اور سماج کی طرف سے ٹھپہ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح بھی ممکن ہو سماجی نقطۂ نظر کو جلد سے جلد بچہ پر تھوپ دیا جائے۔ جب سے مدرسہ اور سماج میں رشتہ ٹوٹ گیا ہے اس وقت سے تو تعلیم اور بھی رسمی ہو گئی۔ اب تو صرف مضامین کو مضامین کی اور کتاب کو کتاب کی حیثیت سے پڑھا دینے کا رواج ہو چلا ہے۔ یہ چیز اگر بڑی عمر کے بچوں کی تعلیم تک مخصوص ہوتی جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ معلومات کو مجرد طور پر سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں) یا مضامین کو الگ الگ پڑھ کر بھی ان کو سمجھنے کی اور زندگی میں برتنے کی صلاحیت رکھ سکتے ہیں تو بھی جواز کی ایک صورت ہوتی۔ مگر یہاں تو بچے اور بڑے میں کوئی امتیاز ہی مدنظر نہیں رکھا جاتا۔

البتہ ماہرینِ تعلیم اس لوچ کی اہمیت کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس کو ارتقائی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسان کا مطالعہ نامی حیثیت سے کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ انسان کا بچہ شروع میں عاجز وناتواں اور اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی دیکھ بھال اور پرورش کا محتاج ہوتا ہے تاہم اس میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت دوسرے جانوروں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی وہ ابتدائی عمر میں اگرچہ بالفعل عاجز وناتواں ہوتا ہے مگر بالقوی وہ اپنے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کے بہت امکانات رکھتا ہے۔ انسان کی ابتدائی عمر کی یہ بےبسی اور خامی اس کو بڑھنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ انسان اپنے جسمانی مشاغل میں اپنے اعصاب اور رگ پٹھوں کے ذریعہ بوجھ اٹھانے والے قلی سے لے کر ایک باکمال مصوّر تک کا کام کر سکتا ہے۔ اعصاب اور رگ پٹھوں کا یہ لوچ انسان کو مختلف قسم کے کام کرنے کے امکانات پر قدرت بخشتا ہے۔ بظاہر یہ خامی اس لوچ اور وسعت پذیری کے ساتھ انسان

میں ان کو بھرتی نہیں کیا جائے گا؟ اگر کیا جائے گا تو کیا اسلامی مقاصد کے پورا کرنے میں غیر مسلم عہدہ داروں اور سپاہیوں پر بھروسہ کیا جاسکے گا۔ اگر بھروسہ نہ کیا گیا تو کیا فوجی خدمت انجام نہ دے سکنے کے معاوضہ میں ان سے کوئی خاص ٹیکس جزیہ کی قسم کا لیا جائے گا۔ اب اگر فرض کیجئے کہ ہم خالص اسلامی حکومت مذہب اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم آبادی مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور اپنی مذہبی غلامی کو خوشی سے گوارا کرے گی۔ کیا ایسی صورت میں وہ پاکستان میں شامل ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کرے گی اور اگر وہ آمادہ نہیں ہوئی تو پھر کیا انہیں زبردستی پاکستان میں شامل کیا جائے گا یا انہیں پاکستان سے نکال باہر کیا جائے گا۔ چار کروڑ کی مجموعی آبادی سے ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کو نکالنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ کس قسم کا دباؤ ڈال کر ان سے اپنے مطالبات منوائے جائیں گے۔ جب تک برطانوی حکومت کو ہماری سیاست میں اقتدار حاصل ہے کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ برطانیہ کی اخلاقی ہمدردی اپنے لئے حاصل کرلی جائے۔ کیا لیگ آف نیشنس اور ایشیا کے اسلامی ممالک کی اخلاقی ہمدردی کا دباؤ ڈالا جائے گا۔ بہرحال یہ سوال سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لائق ہیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں کی آزادی کے معنی یہ ہوئے کہ غیر مسلموں کی آبادی ختم ہو جائے تو اس سے موجودہ معیار اخلاق کے مطابق انسانیت اور انصاف کا خون ہوگا؟ اگر اس کے باوجود ہم کو برطانیہ جمعیت اقوام اور اسلامی ممالک کی ہمدردی حاصل ہو بھی گئی تو بقیہ ہندوستان کے ۲۴ یا ۲۵ کروڑ ہندو تو اپنے ہم مذہبوں کی قربانی کو اطمینان قلب کے ساتھ نہ دیکھ سکیں گے اور وہ یا تو براہ راست اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی، مالی اور مادی مدد کریں گے یا ان کے حق میں اس سے بھی اور زیادہ سخت قسم کی مداخلت کے لئے آمادہ ہوں گے یا اس کا بدلہ دوسری طرح لیں گے یعنی ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں پر جو پنجاب یا بنگال میں نہیں ہیں اور جو ان کی اکثریت کے صوبوں میں محکومانہ زندگی بسر کر رہے ہوں گے ظلم کرنا شروع کریں گے اور انہیں ہندو سوراج کا پوری طرح مزہ چکھائیں گے۔

اس سے اگر قطع نظر بھی کرلی جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ہماری اسلامی حکومت غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے گی۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سارے حقوق دے گی اور ہم آہنگی اور رواداری کے ساتھ زندگی بسر کرے گی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مقصد مشترکہ

فائدہ ہے تو اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ایسی جماعت کیوں نہ بنائی جائے جو مشترکہ فائدہ کے کاموں کو مل جل کر انجام دے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے پاکستان کی اسکیم بناتے وقت شریک ہونے والے صوبوں کے تمام مسلمانوں کے جذبات اور مفاد کو بھی ہم نے اپنی نظر کے سامنے رکھا ہے یا نہیں؟ پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا میں تو بلا شبہ مسلمانوں میں پاکستان کے جذبہ کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ سرحدی صوبہ کے مسلمان خاص طور پر، اور کشمیر، سندھ اور بلوچستان کے مسلمان عام طور پر پنجاب کے ساتھ شریک ہونا پسند کریں گے۔

فرض کیجئے کہ سب کام منصوبہ کے مطابق ہو گیا اور کسی معجزہ کے ذریعہ پاکستان کی ریاست وجود میں آ گئی اور یہاں مسلمانوں کے حسب منشا حکومت بھی قائم ہو گئی لیکن اس سے تو ۹ کروڑ مسلمانوں میں صرف ۲½ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو گا۔ بقیہ ۵½ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں سے پونے تین کروڑ مسلمان بنگال میں ہیں اور بنگال میں ان کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ اگر وہ جنوب مغربی بنگال کے چند اضلاع کو بنگال سے خارج کر دیں تو ان کی اکثریت بھی پاکستان جیسی بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن وہاں بھی ہندوؤں کی اسی مخالفت کا سامنا کرنا ہو گا جس کے اندیشہ کا اظہار پنجاب کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی ایک طویل خانہ جنگی کے شروع ہونے کا خطرہ ہے۔ جس میں بہت سی قیمتی جانوں اور مال کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا لیکن میں ایسی صورت حال کا تصور کر سکتا ہوں جب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہے۔ اور بنگال کے مسلمانوں کو مجبوراً یہ تمام طریقے اختیار کرنا پڑیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کامیاب ہونے کے بعد مسلمان طاقت کے نشہ میں مست نہ ہوں بلکہ انصاف اور رواداری کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ کر سکیں۔ لیکن ہمیں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا میں غیر ضروری فتنہ و شر سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا جرم نہیں ہے۔ ہمیں امن کے تمام وسائل اور ذرائع کا پورے طور پر پہلے جائزہ لینا چاہیئے اور جب تک ہم کو اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ صلح کا کوئی دروازہ ہمارے لئے کھلا ہوا نہیں ہے ہمیں لڑائی اور جنگ کی طرف ہرگز قدم نہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اپنی طاقت کا بھی ہمیں صحیح اندازہ اور احساس ہونا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہم اپنے حریف کو کمزور سمجھ کر نقصان پہنچانے کا حوصلہ کریں اور اس کو نقصان پہنچانے کی جگہ الٹا خود اپنا نقصان کریں۔

بہر حال اگر ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد ہم نے بنگال اور پاکستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا

سے بھی۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو میں آپ کو مبارک باد دوں گا اور مرحبا کہوں گا لیکن پھر بھی میرا آپ کو مشورہ یہی ہوگا کہ ملک کی تعمیری کاموں میں اس ہمت اور طاقت کو صرف کیجئے۔ بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خون اور اس کی خرابی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے ان تعمیری کاموں سے آپ پنجاب کشمیر سرحدی صوبہ بلوچستان اور سندھ ہی کو نہیں سارے ہندوستان کو پاکستان بنا لیں گے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو میں یہی کہوں گا کہ اگر آسمان تک اڑنے کی طاقت نہیں ہے تو جہاں تک آپ کی رسائی ہو سکے وہاں تک اڑ ئیے۔

غرضکہ ان تمام مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں پاکستان کی تحریک کو ایک مایوسی کے علاج سے تعبیر کرتا ہوں اگر سمجھوتہ اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہے تب تو بجبوراً مسلمان اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور اس کے لئے جتنی بھی قربانیاں کرنا پڑیں ان کو انہیں گوارا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر سمجھوتہ کی ذرا سی بھی امید انہیں کہیں نظر آئے تو انہیں امن اور محبت کی راہ کو چھوڑ کر فتنہ و فساد کی راہ کو اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر سمجھوتہ سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ موجودہ خراب فضا کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو گئے ہوں ان کو بھی میرا مشورہ یہی ہوگا کہ پاکستان کی پرخطر راہ کو اختیار کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ اپنا اطمینان کر لیں کہ آیا واقعی صلح اور امن کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ خصوصاً مسلم نوجوانوں کو میرا مشورہ یہی ہوگا کہ وہ اپنی زبان سے جذباتی میں کوئی ایسی بات نہ نکالیں جس سے ہندوستان کی موجودہ خراب فضا میں اور زیادہ تکدر اور ناگواری پیدا ہو۔ ہمیں جیکوسلوویکیہ کی حالت سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اور اقلیتوں کو چاہے ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو چاہے ہندوؤں اور سکھوں سے حقیر اور بے ضرر نہ سمجھنا چاہیئے۔ ہر قوم پر مشکل اور مصیبت کے وقت آتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے لئے جس نے ابھی اپنی آزادی کی ابتدائی منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں اس قسم کی مشکلوں کے بہت سے وقت آئیں گے اور اقلیتوں کو خوش رکھنے کی پالیسی طویل مدت کے مصالح کو اگر سامنے رکھا جائے آخر میں سب کے لئے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان ایک عرصہ سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ بھائیوں میں اب نفاق نہ پیدا ہونا چاہیئے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کو مجبور نہ کرنا چاہیئے کہ وہ روٹھ کر اپنا گھر الگ بسانے کی فکر کرے۔

مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی
آبادی کا تناسب
پنجاب
۵۶۱۵ فیصدی
۹۱ فیصدی
سندھ
صوبجات متحدہ
۱۵ فیصدی
بہار
بنگال
۵۵ فیصدی
آسام
بمبئی
مدراس

نقشہ پاکستان
افغانستان
پشاور
سری نگر
کشمیر
تبت
لاہور
پنجاب
دہلی
ہندوستان
ایران
بلوچستان
سندھ
کراچی
بحیرۂ عرب

بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا مسئلہ

(از جناب طفیل احمد صاحب متعلم جامعہ)

ہندوستان میں غیر مسلموں کی تعداد بحیثیت مجموعی اکثریت میں ہے اور مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں لیکن اگر ہندوستان کی صوبائی تقسیم کو فرداً فرداً دیکھا جائے تو ہم کو بعض صوبے ایسے بھی ملیں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیسے صوبہ بنگال۔ پنجاب۔ سرحد اور سندھ اس وقت میں آپ حضرات کے سامنے صرف صوبہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا کچھ حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں پر مسلمانوں کی اکثریت تو ضرور ہے لیکن بہت ہی معمولی۔

ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت نے نہ صرف بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو کشمکش و پیچ میں ڈال رکھا ہے۔

اس مسئلہ کے پہلو تو بہت سے ہو سکتے ہیں مثلاً معاشی پہلو۔ مذہبی پہلو وغیرہ۔ لیکن یہاں جس پہلو سے میں خاص طور پر بحث کرونگا وہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا اور ان کی نشستوں کا سوال ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے اور تمام مسائل کا بھی حل ہو سکے گا۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے ان کی نمائندگی یا نشستوں کا ذکر کروں وہاں کی آبادی آپ کے سامنے ہونی ضروری ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

بنگال | بنگال میں برطانوی علاقہ کی آبادی چار کروڑ چھیاسٹھ لاکھ پچانوے ہزار پانسو چھتیس ہے جس کی فرقہ وارانہ تفصیل یہ ہے۔

(۱)	مسلمان	۲,۵۲,۱۰,۸۰۲	۵۴ فی صدی
(۲)	ہندو	۲,۰۲,۰۳,۵۲۷	۴۳٫۳ ″
(۳)	دیگر	۱۲,۸۱,۳۰۷	۲٫۷ ″

دیگر میں عیسائی اور دیگر قبائلی لوگ شامل ہیں۔

بنگال میں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۵۴ فی صدی کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت تمام صوبہ میں برابر برابر تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

بنگال میں کل ۲۸ اضلاع ہیں جن میں سے مشرقی بنگال کے ۱۴ اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور چار اضلاع ایسے ہیں جہاں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے لیکن ان میں سے ۳ اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت ہیں اور باقی دس اضلاع ایسے ہیں جن میں غیر مسلموں کا غلبہ ہے۔ اور یہ بیشتر مغربی بنگال میں پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ بنگال)

پنجاب | پنجاب کی آبادی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کل آبادی	۲,۰۶,۸۵:۲۴	
مسلمان	۱,۱۴۵۴,۲۲۱	۵۵:۳ فیصدی
ہندو	۶۵,۷۹,۲۶۰	۳۱،۸ "
سکھ	۲۲,۹۴,۲۰۶	۱۱،۱ "
دیگر (خصوصاً عیسائی)	۳,۷۶,۲۳۴	۱،۸ "

یہاں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۵۵ فی صدی اور کچھ کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت بنگال کی طرح تمام صوبہ میں برابر برابر منقسم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

پنجاب میں کل ۲۹ اضلاع ہیں ان میں ۱۵ اضلاع ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور دو اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ تین اضلاع ایسے ہیں جن میں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے۔ لیکن مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت ہے۔ بقیہ صرف ۹ اضلاع ہیں جو سب پنجاب کے مشرق اور جنوب مشرق میں پائے جاتے ہیں" جہاں ہندوؤں کا غلبہ ہے (ملاحظہ ہو نقشہ پنجاب)

بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کی اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ شرائط موجود ہوں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ تو ان دونوں صوبوں میں اپنی اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو نہ تو جداگانہ حلقۂ انتخاب کی ضرورت ہے اور نہ نشستوں کے تحفظ کی یہی نہیں بلکہ ان دونوں کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے سم قاتل صفت رساں

ہے۔ کیونکہ جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے محفوظ ہونے کی صورت میں وہ صرف مقررہ نشستوں پر قبضہ کرسکتے ہیں۔ حالانکہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب اور عدم تعین نشست کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستوں پر قبضہ کریں۔ چنانچہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں قابل وثوق اعداد و شمار پیش کرکے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان پنجاب میں ۶۰ فی صدی تک اور بنگال میں ۵۶ فی صدی تک نشستوں پر قبضہ کرسکتے ہیں۔

پھر اگر حقیقت یہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیوں ان تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور کیوں اپنی اکثریت کو جو زیادہ ہوسکتی ہے معرض خطر میں ڈال کر کم رکھنے پر مصر ہیں اس سوال کا جواب دینے کے لئے ان شرطوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے جن کی موجودگی میں یہ صورت ممکن ہوسکتی ہے۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی شرط تو یہ ہے کہ علاقہ وار نمائندگی ہو۔ اور ہر بالغ مرد و عورت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو اور جائداد اور تعلیم پر ووٹ کے حق کو منحصر نہ کیا جائے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی بالغ آبادی کا تناسب دوسرے فرقوں کی بالغ آبادی سے کم نہ ہو۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے افلاس یا قرض کی وجہ سے کسی غیر مسلم کے ناجائز اثر میں دبے ہوئے نہ ہوں۔ اور اپنی رائے کو آزادانہ طور پر استعمال کرسکیں۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری۔ معاملہ فہمی۔ ہوشیاری اور چالاکی اتنی ہو کہ جتنی غیر مسلموں میں ہے۔ تاکہ وہ اپنی رائے کے حق کو صحیح طور پر اپنے فائدے کے واسطے استعمال کرسکیں اور دوسروں کے دھوکہ اور فریب میں نہ آئیں۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہب کا رشتہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ دوسرے تمام ایسے جذبوں اغراض اور مفاد پر غالب ہوسکے جو غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کے محرک بن سکتے ہیں۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی عورتوں میں بھی اسی قدر آزادی، بیداری اور تعلیم پائی جائے جتنی غیر مسلم عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ بھی اپنی حق رائے دہندگی سے مساوی طور پر فائدہ اٹھاسکیں۔

مذکورہ بالا چند شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ شرطیں فی الحال پوری نہیں ہوتیں۔ اس لئے بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ اگر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب نہ رکھے گئے اور مسلمانوں

کے واسطے نشستیں مخصوص نہ کی گئیں تو مسلمان ووٹروں پر ساہوکار اور زمیندار اپنا ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو لالچ اور دھوکہ دے کر ان کے ووٹوں کو بے اثر کر کے اور مسلمان عورتوں کے پردے اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم امیدوار کو منتخب کرالیں گے۔ اور ان صوبوں میں مسلمان اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی، مالی اور معاشرتی حالت نہایت ردی اور ابتر ہے۔ مذہبی احساس کی بھی ان میں بہت زیادہ کمی ہے یہ لوگ بہت بھولے، سیدھے اور سادے ہیں۔ ان کو اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے چالاک اور مکار ساہوکار اور زمیندار جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

اس لئے ان صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معنی یہ ہیں کہ ایک جاہل مفلس اور بیوقوف آبادی کو مکار اور دولت مند لوگوں کے ناپاک مقاصد کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے اور ان کو اپنی ذاتی اور انفرادی ترقی اور فلاح و بہبود کا موقع دیا جائے۔

اگر اس اصول کو مشعل ہدایت بنا لیا جائے تو پھر ان دونوں صوبوں کے بے بس مسلمانوں کو خود اپنے ہم مذہب مسلمانوں سے بھی بچانا ضروری ہوگا۔ جو ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں اور جو اتنے ہی دلیر اور بے باک ہیں جتنے کہ خود غیر مسلم ہیں۔

اسی طرح بہت سے غیر مسلم بھی ہمیں ملیں گے جو اپنے غیر مسلم ہم مذہبوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کا ایسا ہی شکار بنے ہوئے ہیں جیسے مسلمان ان کا شکار ہیں۔ اس واسطے آخر میں اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنا پڑیگا۔ جب مسئلہ کو اس روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان صوبوں میں دراصل معاشی مسائل کو ہی اہمیت حاصل ہے اور حقوق کا مسئلہ دراصل معاشی بنیاد پر طے کرنا ہی زیادہ پسندیدہ اور مناسب صورت ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مطالبوں سے جو فوائد حاصل ہوں گے ان سے تمام عوام یکساں طور پر مستفید ہو سکیں گے اور چونکہ مسلمان عوام کی ان صوبوں میں اکثریت ہے اس واسطے ان کا فائدہ اور اقتدار قدرتی طور پر ان صوبوں میں زیادہ ہو جائے گا۔ اور ساہوکار اور زمیندار جن میں سے بیشتر غیر مسلم ہیں وہ نقصان میں رہیں گے۔

پنجاب اور مسلمانوں کا مسئلہ
وہ علاقہ جہیں مسلم اکثریت ہے
وہ علاقہ جہیں ہندو اکثریت ہے
غیر جانبدار علاقہ
مسلمانوں کی بھاری اکثریت
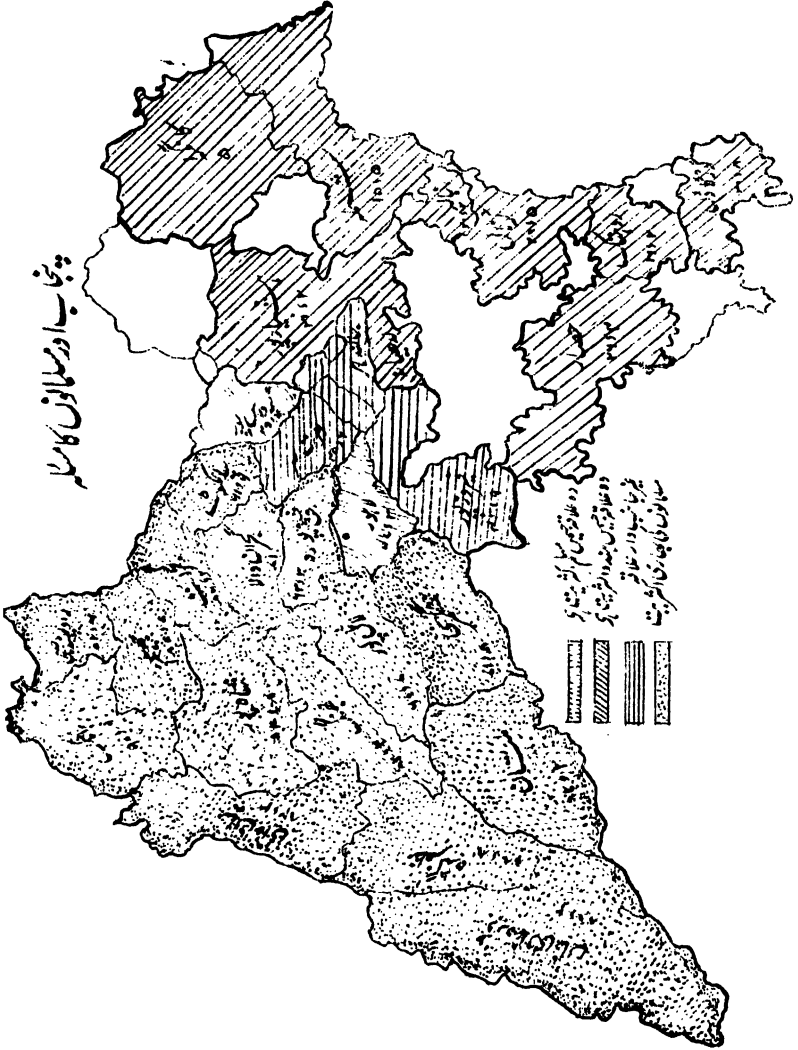
بنگال اور مسلمانوں کا مسئلہ
وہ علاقہ جس میں ہندو اکثریت ہے
وہ علاقہ جس میں مسلمان چھائے ہوئے ہیں
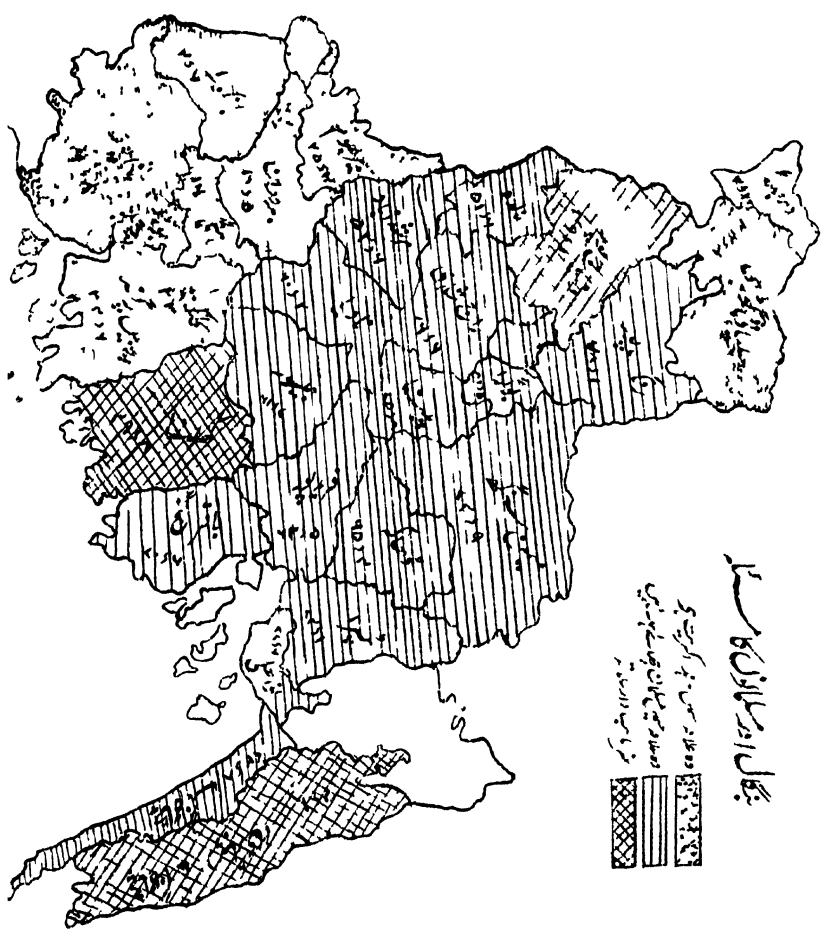
ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین

(ذیل کے مضمون میں جس کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نئے سیاسی نصب العین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضمونوں ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک اپنے سیاسی مقصد کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔ یا ان تیزگام محل تک پہنچ گئے ہیں اور لیلائے مقصود کو حاصل کر چکے ہیں لیکن ہم صحرا کی ویرانیوں میں حیران و سرگشتہ کھڑے ہوئے راستہ کو ڈھونڈ رہے ہیں)

تحریک ترک موالات کی ناکامی اور خصوصاً نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہی مسلمانوں میں جو کچھ بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے وہ سمجھ چکے تھے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ کانگریس کی قومیت پرستی کے پیچھے کون جذبہ کارفرما ہے۔ ان میں سے بہتوں نے کانگریس سے کھلم کھلا علیحدگی اختیار کر لی اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی طرف اپنی کوشش کو پھیر دیا لیکن وقت کی فضا ناموافق تھی۔ مسلمانوں میں ابھی تک نہ تو صحیح سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اور نہ مسلمان عوام ان خطرات سے آگاہ ہوئے تھے۔ جو اس نام دنہاد قومی ادارے کی پالیسی میں مضمر تھے۔ اس لئے ان رہنماؤں کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کا انتشار علیٰ حالہ قائم رہا اور دوسری طرف کانگریس نے حکومت کے سامنے اپنی زبردست تنظیم اور پیہم ایثار و عمل کا ایسا ناقابل انکار ثبوت پیش کیا کہ برطانوی حکومت کو سمجھ لینا پڑا کہ بغیر اس جماعت کو ساتھ لئے ہندوستان میں حکومت کی مشین کو چلانا ناممکن ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حکومت کو اپنے اختیارات کا ایک حصہ صوبہ جاتی خودمختاری کی صورت میں عوام کے نمایندوں کے حوالے کرنا پڑا۔ حالات نے رخ بدلا اور وہی سیاسی جماعت جو اس وقت تک حکومت سے برسرِ پیکار تھی اب اقتدار و طاقت کی مالک بن بیٹھی۔ کانگریس کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ برطانوی حکومت سے زیادہ بگاڑ نہ ہو اور اختیارات کی جو قسط مل رہی تھی اس کو لے کر مزید قوت و تصرف کے لئے راہ نکالے۔ چنانچہ انتخابات کے بعد ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں ابھی تک

مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ کانگریس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ قومی حکومت کے تحت مسلمانوں کو اپنی حالت کے سدھارنے کا موقع ملے گا لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کانگریس کی پالیسی اپنی اصلی شکل وصورت میں ظاہر ہونے لگی۔ اب تو مسلمان چونکے ہوئے اور ان کی جو توقعات کانگریسی حکومتوں سے وابستہ تھیں ان پر پانی پھر گیا انھوں نے پہلی بار اپنے سیاسی انتشار اور جماعتی تنظیم کے فقدان کا نتیجہ دیکھ لیا۔ ان حالات کا اثر بھلا کہاں تک نہ ہوتا۔ مسلم لیگ جو اس وقت تک گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی پھر زندہ کی گئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت اس کے حلقہ اثر میں آگئی۔ فی زمانہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اسی کی عملی جدوجہد پر مسلمانوں کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بحیثیت مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے سامنے اس وقت کیا نصب العین ہے اور ہمارے قومی حوصلوں کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ بظاہر لیگ کے سامنے بجز اس کے اور کوئی نصب العین نہیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ یہاں مفاد کا لفظ صرف مادی فوائد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہو یا ممکن ہو تو اور زیادہ۔ اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمان کافی تعداد میں موجود ہوں۔ ان کی زبان اور رسم الخط کانگریسی حکومتوں کے دستبرد سے محفوظ رہے۔ ان کے تمدنی مظاہر جوں کے توں برقرار رہیں اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم ہو جائیں۔ لیکن کیا ان مقاصد کا حصول بجائے خود مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دے گا۔ اور ان کا کھویا ہوا وقار اور ان کی گئی ہوئی عظمت انھیں پھر دلا دے گا۔ اگر نہیں اور اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے تو کیا مسلمانوں کو بس اس سے زیادہ کچھ مطلوب نہیں ہے کہ انھیں چند عہدے حاصل ہو جائیں اور اسمبلی میں ان کی نشستیں محفوظ ہو جائیں بے شک مسلمانوں کی اکثریت کا رجحان دیکھتے ہوئے تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اس سے زیادہ اور کسی چیز کے طلبگار نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی معاشی پستی دور ہو گئی اور اقتدار و حکومت کے خزانے میں سے انھیں کچھ حصہ مل گیا تو بس ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا لیکن درحقیقت وہ ایک سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں ان کی نظروں کے سامنے زندگی کا وہ نظریہ ہے جس میں صرف مادی قدریں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم

کی ترقی صرف معاشی فلاح اور استحکام سے عبارت ہے۔ انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشی حیثیت سے ترقی کر جائیں۔ اقتدار و اختیارات کے خزانے میں حصہ دار ہو جائیں لیکن ان کی ہیئت قومی تبدیل ہو جائے ان کے افکار و نظریات غیر اسلامی ہو جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر وہ متحدہ ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں ان کی معاشی ترقی اور سیاسی اقتدار کیا کام آئے گا۔ ہمارے لئے تو سیاسی اقتدار اور معاشی استحکام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو یہ چیزیں صرف اس لئے درکار ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو غیر اسلامی تصورات کی آمیزش سے بچا سکیں۔ ہمارا انتہائی مقصد تو یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خالص اسلامی ماحول پیدا کر سکیں۔ دولت و ثروت کے وسائل اور اقتدار حکومت کی باگ ہمیں اس عظیم مقصد کے لئے مطلوب ہے اور اگر ہمیں یہ وسائل حاصل بھی ہو جائیں لیکن ہماری اصلی غرض و غایت پوری نہ ہو تو ہمارے لئے یہ سب کچھ محض بیکار ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کا یہ نصب العین رکھنا کہ بس ہمیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملک کے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ مل جائے یا جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں مسلمان وزارتیں قائم ہو جائیں در اصل ایک بڑی غلطی ہے جس سے کوئی بھی صحیح الخیال مسلمان متفق نہیں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہمارے مقاصد میں یہ بھی تو شامل ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط اور ہماری تمدنی آزادی برقرار رہے لیکن عرض یہ ہے کہ تمدنی آزادی کا جو تخیل ہمارے مدبرین اور سیاست داں حضرات کے نظروں کے سامنے ہے ہم کو اس سے اختلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تمدن نام ہے طرز زندگی، طریق معاشرت، زبان اور آداب و رسوم کا حالانکہ یہ سب تمدن کے مظاہر ہیں نہ کہ اس کی حقیقی روح۔ اسلامی تمدن تو در اصل ایک خاص ذہنیت اور زندگی کے ایک خاص زاویہ نگاہ کا نام ہے یہ ممکن ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط محفوظ رہے۔ ہمارے رسم و رواج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ ہماری مسجدیں اور خانقاہیں آراستہ و پیراستہ رہیں لیکن ان مختلف تمدنی مظاہر کے پیچھے جو روح کار فرما ہے جن نظریات و افکار نے اس مخصوص تمدن کی تشکیل کی ہے جس طریق فکر اور نظریہ حیات پر اس تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے وہی بدل جائے۔ اس کو مٹا دیا جائے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بدلنے کے بعد ہماری تہذیب و معاشرت ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط ہر چیز خود بخود بغیر کسی خارجی کوشش کے بدل جائے گی۔ کیونکہ جب وہ ذہن باقی نہیں رہا جس نے تمدن کی اس عمارت کو بنایا تھا تو ضرور ہے کہ عمارت کا نقشہ بھی بدل جائے گا۔ پھر اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے

کہ یہ تمدنی روح، یہ نظریات و افکار، یہ طریق فکر اور مخصوص ذہنیت محسوسات میں سے نہیں ہیں جن کا بدلنا اور مٹنا ہی ہماری آنکھیں دیکھ سکیں گی۔ یہ چیزیں تو بتدریج غیر محسوس طریقہ سے بدلتی ہیں اور جب ان میں کامل تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تب جا کر کہیں ان کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک نصب العین ہونا چاہیئے اور یہ وہ کہ ہمارا مستقل قومی وجود جن معنوی خصوصیات سے عبارت ہے وہ نہ صرف باقی رہیں بلکہ انہیں نشوو ارتقا کی راہ پر لگایا جائے۔ بالفاظ دیگر ہمارے ذہن اسلامی ذہن ہوں، ہمارے افکار و نظریات کی بنیاد مذہبی ہو اور ہماری قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے۔

یہ تو ہمارا اصلی مقصد ہماری زندگی کی غرض و غایت اور ہماری اجتماعی کوششوں کا محور ہوا لیکن اب سوال یہ ہے کہ سیاسیات میں ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیئے اور حصول مقصد کے لئے بحیثیت ایک مستقل جماعت کے مسلمانوں کے کیا مطالبات ہونے چاہئیں۔ آج تک ہمارے مطالبات جیسا میں عرض کر چکا ہوں، اس حد سے آگے نہیں بڑھے کہ آبادی کے تناسب سے ہماری نشستیں اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں برقرار رہیں اور ہماری زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے۔ لیکن جیسا ثابت کیا جا چکا ہے یہ ہماری اجتماعی بقا کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کامل تہذیبی خود مختاری (Cultural autonomy) حاصل ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہم اپنا علیحدہ ملی وطن قائم کریں جہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکومت کریں۔ کلچرل اٹانومی یا تہذیبی خود مختاری کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی اسمبلی اور صوبہ جاتی اسمبلی کے متوازی مسلمانوں کی علیحدہ اسمبلیاں ہوں۔ جنہیں ان تمام امور میں قانون سازی کے کامل اختیارات دئے جائیں جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اسی طرح معاشرت اور معیشت کے مختلف دائروں میں جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ان کے فیصلہ کے لئے مسلمانوں کی علیحدہ عدالتیں قائم ہوں اور ان معاملات میں جن کا تعلق ہمارے تمدن یا معاشرت سے ہے ہمیں کسی دوسری عدالت کے سامنے جانا نہ پڑے۔ ہمارے مدارس علیحدہ ہوں اور تعلیم پر جس قدر روپیہ حکومت خرچ کرے آبادی کے تناسب سے اس کا ایک جزو مسلمانوں کے لئے وقف ہو جس کو مسلمانوں کے نمائندے جس طرح چاہیں صرف میں لائیں۔ بظاہر ان دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی کلچرل اٹانومی زیادہ آسان اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں بعض ایسے نقائص ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کو دشواریاں

پیش آئیں گی بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام بھی اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گی۔

اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ تہذیبی خود مختاری یا کلچرل آٹانومی کے حق دار صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ یہ حق تو ہر قوم کا ہے کہ وہ اپنی تہذیب معاشرت اپنی زبان اور اپنی قومی ہیئت کو دوسری قوموں میں ختم ہونے سے بچائے اس لئے جب مسلمان اس کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو کیا وجہ عیسائی پارسی سکھ اور دیگر اقوام اس حق سے محروم رہیں۔ کیونکہ کلچرل آٹانومی کی اساس تو اس عقیدہ پر ہے کہ ہر قوم جو ایک مخصوص تہذیب و تمدن رکھتی ہے اس کا حق رکھتی ہے کہ اپنی بقاء و حفاظت کے لئے ضروری اختیارات حاصل کرے۔

دوسری دشواری یہ ہے کہ کلچرل آٹانومی کے حصول کے بعد مسلمانوں اور ہندوستان کی دیگر اقوام میں باہمی تعاون اور یکجہتی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھوں میں ہوگی تو ضرور ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت ایک خاص ڈھانچہ میں ڈھل جائے۔ ہم جس غرض کے لئے کلچرل آٹانومی کے طالب ہیں وہ یہی ہے کہ ہمارے افراد قوم اپنے افکار و اعمال، اپنے ذہن و دماغ اور کردار و سیرت کے لحاظ سے سچے مسلمان ہو جائیں۔ ظاہر حالت میں مسلمانوں کی ذہنیت اور ہندوستان کی دوسری قوموں کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ہمارے اصول تمدن کچھ اور ہوں گے ان کے کچھ اور ہمارے تصورات و افکار اور ان کے نظریات متضاد نہ سہی مختلف تو ضرور ہوں گے۔ ہم جس راہ پر چلنا چاہیں گے ان کو اس سے گریز ہوگا حکومت و سیاست کی جو شکل ہمیں پسند ہوگی ضروری نہیں کہ انھیں بھی قبول ہو۔ غرضکہ جب صورت حال یہ ہو تو ہم میں اور ان میں عملی اور فکری تصادم ناگزیر ہوگا۔ کیا ان حالات میں ہم اور وہ کامل اتفاق و یکجہتی سے حکومت کی مشینری چلا سکیں گے۔ اس کے لئے بڑے وسیع ظرف اور بڑی بے مثال رواداری کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ہماری راہ اسلام کی راہ ہوگی جو دنیا کی تمام راہوں سے جدا اور مختلف ہے۔

ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ کلچرل آٹانومی کے حصول کے بعد اپنے اندرونی معاملات کی حد تک تو ہم آزاد و خود مختار ہوں گے لیکن خارجی پالیسی کی تشکیل میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ کیا مسلمان اس کو پسند کریں گے کہ ہندوستان کی خارجی پالیسی میں ان کے رجحانات اور ان کی مرضی کو کوئی دخل نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان پر حصول آزادی کے بعد سامراجی ذہنیت چھا جائے اور یہ کوئی تعجب خیز چیز نہ ہوگی کیونکہ قومیت کا عروج اپنی

انتہا پر سامراج کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہندوستان جیسے ملک میں تو اس کا امکان اور زیادہ قوی ہے جہاں آبادی کی اس قدر کثرت ہے اور پیدائش دولت کے وسائل اس قدر وافر ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا مسلمان اس کو گوارا کر لیں گے کہ ان کا ملک قریب کی اسلامی سلطنتوں کے خلاف صف آرا ہو یا اسلامی سلطنتوں کے خلاف نہ سہی دنیا کے کسی اور ملک کے خلاف ظلم اور ناانصافی کی جنگ پر ہماری حکومت آمادہ ہو تو کیا مسلمان خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت کر لیں گے۔

ان تمام مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے میری حقیر رائے میں مسلم وفاق کا نظریہ بہت زیادہ آسان اور قابل قبول ہے۔ کیونکہ مسلم وفاق کے قیام سے آئے دن کے ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا ہر قوم اپنی اپنی حکومت کے تحت بالکل آزاد ہوگی مسلمانوں کا وجود ہندوستانی قومیت کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرے گا۔ پھر ہندو مسلمان اپنے اپنے تخیلات کے مطابق بغیر کسی دشواری یا تصادم کے زندگی بسر کر سکیں گے ہندوؤں کے تمام قومی حوصلے اور آرزوئیں جو اب محض مسلمانوں کی وجہ سے تشنہ ہیں اس وقت اپنی تکمیل کے لئے کوئی رکاوٹ نہ پائیں گی۔ ہندو آزاد ہوں گے کہ پراچین بھارت میں رامائن اور مہابھارت کا زمانہ پھر زندہ کر دیں اور مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ایک بار پھر خیر القرون کا منظر عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں اس لئے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد ہونا چاہیئے کہ ان کے تین ٹکڑے علیحدہ کر دئے جائیں۔ شمال مغرب میں پنجاب کشمیر، سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان، مشرق میں بنگال اور آسام۔ جنوب میں ریاست حیدر آباد۔ مگر یہ چیزیں یوں حاصل ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں جان و مال کی قربانی کرنا پڑے گی اس کے لئے صبر و استقلال عزم راسخ اور بڑا ایثار درکار ہے۔ ہمیں اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنا ہوں گی۔ افتراق و انتشار دور کرنا ہوگا اور سب سے بڑا کام یہ کرنا ہوگا کہ قریب کی اسلامی سلطنتوں کی ہمدردی حاصل کریں۔

ہندوستان کے تہذیبی منطقے
مسلم منطقہ
ہندو منطقہ
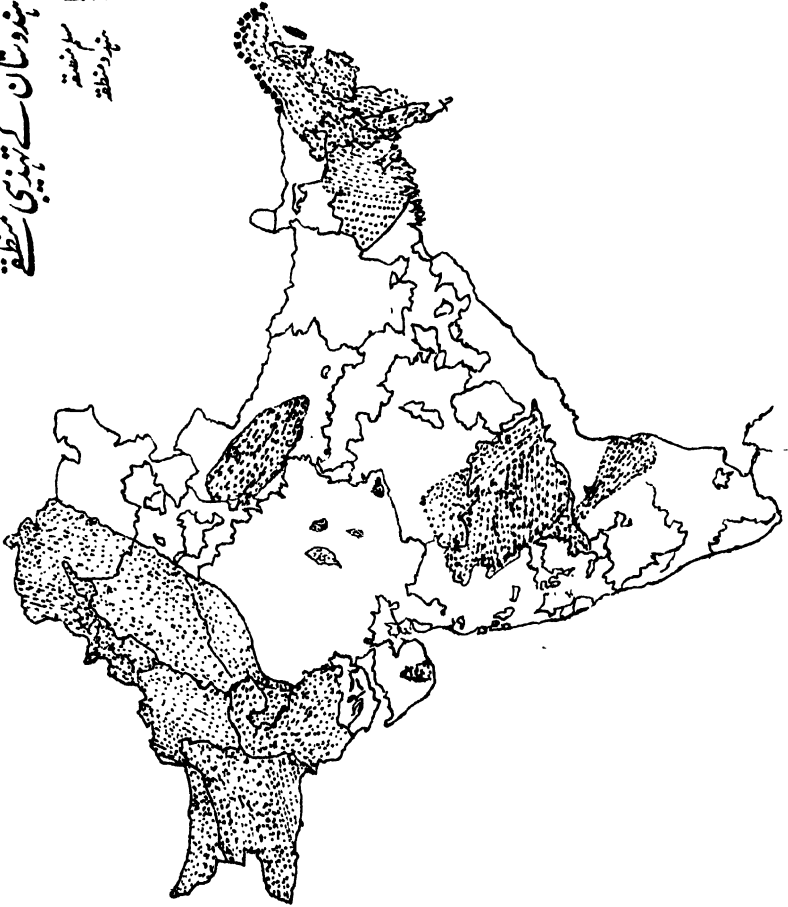
تعلیم سے کیا مراد ہے

(از جناب عبد الغفور صاحب استاد، استادوں کا مدرسہ جامعہ)

اگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو تعلیم اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں جو زندگی کا عمل ہے وہی تعلیم کا عمل ہے۔ زندگی کا ارتقاء اور تعلیمی ارتقاء دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی تعلیم شروع کر دیتا ہے وہ اپنے جسم اور اپنے گرد وپیش کی اشیاء سے قوت آزمائی شروع کرتا ہے۔ نئے نئے تجربے حاصل کرتا ہے۔ نئی نئی باتیں سیکھتا ہے، وہ بغیر کسی تعلیم کے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی چیختا ہے اور اپنے نئے ماحول کے اندر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اس کا اظہار وہ زبانِ حال سے کرتا ہے۔ جب بچہ کو بھوک لگتی ہے تو وہ اپنے جسم کو اینٹھنے لگتا ہے۔ اگر اس پر ماں کی توجہ نہیں ہوتی ہے تو پھر کروٹیں بدلتا ہے اور طرح طرح سے بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر اس سے بھی کام نہیں چلتا ہے تو پھر روتا ہے اور اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی نہ کسی کیفیت کو ماں سمجھ جاتی ہے اور بچہ کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ بچہ کی طرف سے یہ ضرورت قدرتی ہوتی ہے اس لئے اس کو پورا کرائے بغیر اس کو چین نہیں پڑتا۔ جب ایک مرتبہ وہ رونے سے اپنی بھوک کی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر جب بھی اسے بھوک لگتی ہے وہ کم و بیش اسی عمل کو دہراتا ہے۔ عدم توازن کی یہ منزل جو اس چھوٹے بچے کو پیش آئی وہ مختلف نوعیتوں کے ساتھ زندگی میں ہر آدمی کو برابر پیش آتی رہتی ہے۔ مثال کے طور کوئی آدمی جو تیرنا نہ جانتا ہو۔ یکایک دریا میں ڈال دیا جائے تو اس کی پریشانی اور بدحواسی آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ پرانے ماحول میں جس طرح اس آدمی کو ہاتھ پیر چلا کر توازن قائم رکھنے میں سہارا ملتا تھا اب نئے ماحول دریائی میں وہ پرانا توازن کام نہیں دے سکتا۔ اس نئے ماحول میں زندہ رہنے اور پہنچنے کے لئے اسے ہاتھ، پیر، دھڑ، اور سر کو خاص طور سے سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اسے نئے ماحول کے ساتھ نیا تطابق حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی نئے تطابق کا نام سیکھنا یا علم حاصل کرنا ہے۔ اس کو اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نام ہے نئے ماحول اور نئے جوابی عمل میں ہم آہنگی یا انطباق کا۔ یہ عمل صرف انسانوں ہی تک محدود

کی زندگی کا سب سے معنی خیز اور سخت ترین دور ہے اور یہاں انھیں چینی زندگی اور رسم و رواج مطالعہ کرنے کا سب سے اچھا موقعہ ملا۔

ناول نویسی شروع کرنے سے پہلے انھوں نے ایک تجربی دور گذارا۔ انھوں نے سب چینی ناول پڑھ ڈالے اور چین کے قدیم ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ مگر ان کا سب سے دلچسپ اور بارآور مطالعہ خود چینی زندگی تھی۔ جو اپنے تنوع، خاموش حسن اور انتہائی غربت میں ان کے دروازے کے باہر پھیلی ہوئی تھی وہ زندگی جس میں ہر مصیبت کے لئے ایک معنی خیز تبسم ہے جس میں ہر سیاہ گھٹا کے لئے ایک منور کرنے والی بجلی موجود ہے۔ وہ زندگی جس کا سب سے مجلّے آئینہ اس کا اپنا ادب ہے اور جس کا ایک ہمدردانہ عکس مسز بک کے ناول ہیں۔

ادارۂ معارف اسلامیہ اس مرتبہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا سالانہ جلسہ عربک کالج دہلی میں منعقد ہوا استقبالیہ کمیٹی کے صدر سر عبدالرحمٰن سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں نظام حیدرآباد کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے مالی امداد دے سے ادارے کی علمی سرگرمیوں کی قدر فرمائی ہے اس کے بعد سر شاہ سلیمان وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے ایک بلیغ خطبے میں اسلامی علوم وفنون کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کا تخیل بلند، ان کا نقطۂ نگاہ محققانہ ان کا طریقہ سائنٹفک تھا ان کے لئے علم کا مقصد خدمت تھا اور آج ہلاکت ہے۔ اختتام پر انھوں نے ادارے کی توجہ دو اہم مقاصد کی طرف مبذول کی۔ پہلا مقصد تو موجودہ مغربی علوم و فنون کو اپنی زبان میں ڈھالنا اور دوسرے انگریزی ترجموں کے ذریعے دنیا کو فنون اسلامی کے بیش بہا خزینے سے روشناس کرانا۔ آخر میں علمی اور فنون لطیفہ کے نوادر کی نمائش کا افتتاح کیا گیا۔

ہمیں امید ہے کہ ادارہ اپنی مفید علمی اور ادبی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھے گا۔ ہندوستان میں اسلامی تمدن کو روشناس کرانے کی جتنی آج ضرورت ہے شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی اور اگر مسلمان اس مسئلہ پر غور کریں کہ انھوں نے عالم اسلامی کیا مجض ہندوستان کے اسلامی تمدن کو دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے لیے کیا کچھ کیا ہے تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔ امید ہے ادارہ معارف اسلامیہ اپنی سرگرمیوں کو محض علمی تحقیقات اور اہل علم کی دلچسپیوں تک ہی محدود نہیں رکھے گا بلکہ عوام کے لئے بھی اس قسم کا ادب مہیا کر سکے گا۔ جو ہر مسلمان کے دل میں ایک جائز جذبۂ افتخار پیدا کرے اور دوسری اقوام کے دلوں میں شاندار تمدن سے ایک جذبۂ عزت۔

مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند)

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عار	۱۲عہ	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سہ	عجار
القول الاظہر	عہ	۸ر	؍؍ ؍؍ ؍؍ دوم	عہ	عار
رہنمایان ہند	عار	ہہ	تاریخ یونان قدیم	عار	•
امرائے ہنود	ہے	سے	نکات الشعرا	عہ	۱۲عہ
النقد	عمر		وضع اصطلاحات	۱۲سے	ہے
تاریخ تمدن حصہ اول	عار	عہ	بجلی کے کرشمے	۱۲عہ	عہ
؍؍ دوم	عار	ہہ	تاریخ ملل قدیمہ	۱۲عہ	•
فلسفۂ جذبات	عجر	عا	محاسن کلام غالب	عہ	۱۰ر
البیرونی	عار	عہ	قواعد اردو	عجر	عار
دریائے لطافت	ہے	عا	تذکرۂ شعرائے اردو	۱۲عہ	عہ
طبقات الارض	عجر	عار	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق	سے	عجار
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	للعہ	سے	تاریخ ہند ہاشمی	•	آر
؍؍ ؍؍ دوم	سے	عجر	مثنوی خواب وخیال	عہ	عمر
اسباق النحو حصہ اول	•	۶ر	کلیات ولی	صہ	للعہ
؍؍ ؍؍ دوم	•	۶ر	چمنستان شعرا	صہ	للعہ
علم المعیشت	صہ	صہ	ذکر میر	•	عار

المشتہر: مظفر حسین شمیم انجمن ترقی اردو (ہند) والقریش نئی دہلی

طاقت اور جوانی قائم رکھنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا
اوکاسا
اوکاسا کی گولیاں
معدہ میں پہونچ کر فوراً حل ہو جاتی ہیں
اور ان کے اجزا خون میں مل کر جسم
کے تمام حصوں میں (جیسا کہ دونوں تصویروں
میں دکھایا گیا ہے) اپنا اثر کرتے ہیں
(۲) اس تصویر میں مرد کے جسم کے
وہ مقامات بتلائے گئے ہیں جہاں
جہاں اوکاسا اپنا اثر کرتا ہے
(۱) اس تصویر میں عورت کے جسم کے
وہ تمام مقامات بتلائے گئے ہیں
جہاں جہاں اوکاسا اپنا اثر کرتا ہے

"آبِ کوثر" اور "موجِ کوثر"

یعنی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ

شیخ محمد اکرام ایم اے۔ آئی سی ایس۔ مصنف غالب نامہ

نئی نسل کی نسبت عام شکایت ہے کہ انھیں یورپ اور امریکہ کے فلسفیوں اور مصنفوں سے تو خوب واقفیت ہے لیکن وہ شاہ ولی اللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دوسری اسلامی شخصیتوں کے کارناموں سے بے خبر ہیں۔ شاید اس کمزوری کی ایک اصولی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے حالات یکجا نہیں ملتے اور جو علیحدہ تذکرے ملتے ہیں ان میں ان کے حالات اور تصانیف کا ذکر اس قدر الجھا ہوا اور مشکوک و غیر ضروری باتوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

مصنف نے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور دو جلدوں میں قوم کی مفصل مذہبی اور روحانی تاریخ عام فہم زبان میں قوم کے سامنے پیش کر دی ہے۔

آبِ کوثر میں دورِ قدیم یعنی آغازِ اسلام سے اٹھارویں صدی کے اخیر تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کن بزرگوں کی بدولت ہوئی ہے۔ یہاں کون کونسی مذہبی تحریکیں مختلف وقتوں پر جاری ہوئیں۔ اسلامی طریقہ تعلیم میں کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں؟ اسلام نے ہندوستان کے لئے کیا کیا؟ یہ حالات تاریخی ترتیب سے درج ہیں اور ساتھ تمام مشہور مشائخ کبار اور علما و فضلا کے حالات اور ان کے کارناموں اور انکی تصانیف پر تبصرہ ہے۔ چشتی۔ قادری سہروردی اور دوسرے صوفیہ سلسلوں کے بزرگوں کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ عبد الحقؒ اورنگ زیب عالمگیرؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حالات خاص تفصیل سے دئے ہیں موخر الذکر کی تصانیف پر قریباً ساٹھ صفحے کا مفصل تبصرہ ہے۔

موجِ کوثر میں دورِ جدید کا ذکر ہے۔ شروع میں حضرت سید احمد بریلوی۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے خلفا کی اصلاحی کوششوں اور تحریکِ جہاد کے حالات دئے ہیں۔ تیسرے باب میں علیگڈھ تحریک کی مفصل تاریخ ہے۔ چوتھے میں کتب پر تبصرہ، پانچویں میں دیوبند کی تاریخ اور آخر میں علامہ اقبال کے فلسفہ اسلامی کا خلاصہ ہے۔ ہر جلد کا حجم تقریباً تین سو صفحات۔ قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ: مینجر مسلم گجرات پریس سورت۔ صوبہ بمبئی

مطبوعاتِ امتِ مسلمہ امرتسر

سہولت تبلیغ کی وجہ سے قیمت کم کر دی گئی

مطالعہ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں | ایک ممتاز گریجوایٹ نے برسوں حدیث کا مطالعہ کر کے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اس قابل قدر کتاب سے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے صفحات ۵۰۰ کے قریب۔ قیمت ۱۲؍

برہان القرآن | یہ کتاب ان تحریری مباحث پر مشتمل ہے جو مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب مدیر "اہلحدیث" اور حضرت خواجہ احمد دین صاحب کے درمیان ہوئے۔ اس میں اہلحدیث پر ابد تک کے لئے اتمام حجت کر دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بے غلط مطاع نہیں اور قرآن کے سوا کوئی غیر فانی وحی نہیں قیمت ۴؍

ریحان القرآن | مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کے رسالہ "نصرت اہلحدیث" مولوی قاسمی کے "عقاید کفریہ" اور مولوی عبد اللہ کے عقاید بے حدیثیہ وغیرہ کا مکمل جواب قیمت ۴؍

قرآنِ مجید و رسول حمید | حضرت رسالتمآب کے مقدس سوانح از روئے قرآن مجید قیمت ۲؍

اسلام اور حریت و مساوات | اس موضوع پر جناب خواجہ ضیاء اللہ صاحب اختر بی۔ اے اور جناب مرزا بشیر الدین محمود صاحب قادیانی کے مابین دلچسپ مناظرہ۔ قابل مطالعہ اور ناول سے زیادہ دلچسپ کتاب ہے قیمت ۸؍

تعلیماتِ قرآن | مرتبہ جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاذ تاریخ جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ کتاب اس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے کہ قرآن کریم مکمل کتاب اور اپنی شرح آپ ہے کسی خارجی شئے کا اپنی تفسیر میں محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب اس نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ آج تک کسی زبان میں قرآن کریم کی تشریح پر اس قسم کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت ۱۲؍

قول احسن | اس میں از روئے قرآن حکیم ثابت کیا گیا ہے کہ ہمارا نام صرف مسلم ہے باقی تمام نام شیعہ سنی اہل القرآن، اہلحدیث وغیرہ بدعتی ہیں جن کی وجہ سے امت کو نقصان عظیم پہنچ رہا ہے قیمت ۲؍

خدا کی محبت قیمت ۴؍ — **خون کے آنسو**۔ قابل دید کتاب قیمت ۴؍

ملنے کا پتہ:- **مینیجر بلاغ امرتسر**

رجسٹرڈ ڈیل نمبر ۱۰۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرماکر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر: - پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱- سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲- مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳- ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴- جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	مارچ ۱۹۳۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ	پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن محبوب المطابع برقی پریس دہلی	فی پرچہ ۸/

ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ اور فیڈریشن

(ذیل کے مضمون میں دیسی ریاستوں اور فیڈریشن کے مسئلہ سے متعلق واقعات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ . . . . تنقید اور تعمیری تجاویز کو کسی اور صحبت کے لئے ملتوی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح وفاقی مالیات کی مبسوط بحث کو بھی کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے)

ہندوستان کے مسئلہ کا کوئی بیان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس میں ہندوستانی ریاستوں کا حال بھی شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان کے مجموعی رقبہ میں تقریباً، لاکھ مربع میل یعنی کل رقبہ کے ایک تہائی سے زیادہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں شامل ہے۔ یہ ریاستیں برطانیہ کے زیر حکومت نہیں ہیں بلکہ برطانیہ کی باجگزار ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے اور ان میں ہر قسم کی ریاستیں شامل ہیں — ایک طرف اگر حیدرآباد اور کشمیر کی بڑی ریاستیں ہیں (جن میں سے ہر ایک انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ سے زیادہ بڑی ہے) تو دوسری طرف ایسی ریاستیں بھی ہیں جن کا رقبہ صرف چند ایکڑ ہے اور ان کے مالک یا حصہ دار ایسے چھوٹے چھوٹے سردار ہیں جن کو عدالت کا حق بھی نہیں دیا گیا ہے۔ مگر بصورت مجموعی ریاستوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کی کمیٹی نے جس کا تقرر دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی ریاستوں اور حکومت بالادست کے تعلقات کی تحقیقات کرے اور برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے مالی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے ۱۹۲۷ء میں اپنی رپورٹ تیار کی اور یہاں جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان سے زیادہ کے مطالعہ کے لئے اسی رپورٹ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

کمیٹی نے ہندوستانی ریاستوں کو جس حالت میں وہ آج موجود ہیں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم کیا ہے :-

ریاست کی نوعیت	تعداد	رقبہ مربع میلوں میں	آبادی	آمدنی
۱- ایسی ریاستیں جن کے حکمراں اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان راجگان کی رکن ہیں	۱۰۸	۵ لاکھ ۱۴ ہزار ۸۸۶	۵ کروڑ ۸۰ لاکھ ۴۷ ہزار ۱۸۶	۴۲ کروڑ ۱۷ لاکھ
۲- ایسی ریاستیں جن کی نمائندگی ایوان راجگان میں انھیں کے زمرہ کے ۱۲ رکن کرتے ہیں	۱۲۷	۷۶ ہزار ۸۴۶	۸۰ لاکھ ۴ ہزار ۱۱۴	۲ کروڑ ۸۹ لاکھ
۳- چھوٹی ریاستیں جاگیریں وغیرہ	۳۲۷	۶ ہزار ۴۰۶	۸ لاکھ ایک ہزار ۶۰۴	۴۷ لاکھ

حیدرآباد کا رقبہ ۸۲ ہزار ۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ہے یعنی تقریباً برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے اور پرتگال یا آسٹریا کے مقابلہ میں اس کی آبادی دوگنی ہے۔ حیدرآباد ریاست کی آمدنی تقریباً ۸½ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ انتہائی شمال میں کشمیر کی ریاست کا رقبہ حیدرآباد کے برابر ہے اور اس کی آبادی ۳۶ لاکھ ہے۔ جنوب میں میسور کی آبادی ۶۶ لاکھ ہے اور رقبہ ۳۰ ہزار مربع میل سے کچھ کم ہے گویا یہ آئرش فری اسٹیٹ سے رقبہ میں بڑی اور آبادی میں دوگنی ہے۔ اور زیادہ جنوب میں ٹراونکور اور کوچین کی بہت زیادہ آباد ریاستیں ہیں جن میں علی الترتیب ۵۱ لاکھ اور ۱۲ لاکھ کی آبادی ہے۔ بڑودہ کے گائکوار کا علاقہ بمبئی کے شمال میں کئی منتشر علاقوں پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی ۲۴ لاکھ ہے۔ ہندوستان کے نقشوں میں جو زرد رنگ نظر آتا ہے (یعنی کل رقبہ کا ⅖ حصہ) وہ برطانوی علاقہ نہیں ہے بلکہ وہ ریاستوں کا علاقہ ہے۔ نگاہ کو سب سے بڑا مسلسل غیر برطانوی علاقہ راجپوتانہ کا نظر آتا ہے لیکن راجپوتانہ بھی میں بہت سی جدا جدا ریاستیں شامل ہیں۔ ان میں حروف تہجی کی ترتیب سے چند قابل ذکر ریاستیں یہ ہیں۔ الور، اودے پور، بندی، بیکانیر، ٹونک، جودھ پور، جے پور، کوٹہ اور زیادہ مشرق میں گوالیار ہے

جس کی آبادی پینتیس ۳۵ لاکھ ہے۔ سنٹرل انڈیا ایجنسی میں بھوپال، اندور، اورچھا اور ریوا مانوس نام ہیں۔ راجپوتانہ کے جنوب مغرب میں اور ساحل کے حاشیہ پر بہت بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اجتماع نظر آتا ہے سو سب ویسٹرن اسٹیس ایجنسی (کچھ اور کاٹھیاواڑ) میں شامل ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور بہاؤنگر، کچھ جونا گڑھ اور ناوانگر کی ریاستیں ہیں۔ ۵۶۲ ریاستوں کی میزان میں ۲۰۲ سے زاید کاٹھیاوار اور گجرات میں ہیں۔ پنجاب میں پٹیالہ سکھوں کی خاص ریاست ہے جو ہمالیہ کے دامن سے شروع ہو کر شملہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ آگے مغرب میں بھاول پور کی مسلمان ریاست ہے۔ بلوچستان میں خان قلات کی ریاست ہے جو کل صوبہ کے ⅘ حصہ پر حاوی ہے۔ بمبئی میں کولھاپور کی بڑی مرہٹہ ریاست ہے۔ یو۔پی میں رام پور اور بنارس کی بڑی ریاستیں ہیں جن میں آخر الذکر کو موجودہ شکل ۱۹۱۱ء میں دی گئی ہے۔ بنگال اور آسام میں کوچ بہار، تری پورہ اور منی پور کی ریاستیں ہیں۔

ہم نے اس فہرست میں رقبہ کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور اس میں بہت سی اہم ریاستیں بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو سکے گی کہ ان میں سے خاص خاص ریاستیں تعداد میں کس قدر زیادہ اور مختلف ہیں۔

ہندوستانی ریاستوں کی خصوصیات | ہندوستانی ریاستوں میں جغرافی، معاشی اور سیاسی حالات کا نہایت نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سی ریاستیں برطانوی ہندوستان سے قریبی طور پر وابستہ ہیں۔ وسائل آمد و رفت ریاستوں کی حدود میں سے گذرتے ہیں۔ بمبئی سے دہلی تک کے سفر میں سفر کا بڑا حصہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں صرف ہوتا ہے۔ برطانوی ہندوستان اور ریاست کی حدیں طبعی خصوصیات نہیں رکھتیں۔ ان میں نسل اور زبان کا فرق بھی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً سکھ پنجاب کی ریاستوں سے زیادہ پنجاب کے صوبہ میں پائے جاتے ہیں۔ مرہٹے مرہٹہ راجوں کے مقابلہ میں بمبئی کے صوبہ میں زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس کناری زبان بولنے والی بیشتر آبادی میسور کے مہاراجہ کے ماتحت ہے اور قلیل تر آبادی مدراس اور بمبئی کے احاطوں کے کچھ حصوں میں رہتی ہے۔

ان ریاستوں کی حکومت بھی بہت مختلف ہے۔ ۳۰ ریاستوں میں مجلس قانون ساز ہے جس کا کام محض

مشاورتی ہے۔ ۴۰ میں ہائی کورٹ ہیں۔ ۳۴ نے عدالت کو عاملہ سے جدا کر لیا ہے۔ ریاست کے انتظام کے طریقوں میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ ریاستیں بہت ترقی یافتہ ہیں کچھ بہت پس ماندہ ہیں لیکن ایک بات تمام ریاستوں میں مشترک ہے کہ وہ برطانیہ علاقہ میں شامل نہیں ہیں اور ان کی رعایا برطانوی رعایا نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے جو تعلقات حکومت بالادست سے ہیں، ان کا تعین معاہدہ یا کسی تحریری دستاویز یا رواج اور سمجھوتہ کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان تعلقات کی صورت چاہے جو بھی ہو لیکن خارجی معاملات اور ان کے علاقہ کے تحفظ کی آخری ذمہ داری تاج برطانیہ کی ہی ہے۔ ۴۰ ایسی ریاستیں ہیں اور یہ سب کی سب بڑی اہمیت رکھتی ہیں جن کے تعلقات حکومت بالادست سے باقاعدہ معاہدوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ زیادہ تر ریاستوں کے تعلقات سندوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ سند سے مراد حکومت بالادست کی طرف سے بعض مراعات یا حقوق و اختیارات کا تسلیم کرنا ہے۔ بقیہ جتنی ریاستیں ہیں ان کے مرتبہ کو بھی کسی نہ کسی شکل میں تاج برطانیہ نے تسلیم کر لیا ہے۔

حکومت بالادست سے تعلقات ہر ریاست اپنے اندرونی معاملات کا انتظام خود کرتی ہے، اپنے قوانین خود بناتی ہے اور اپنے محاصل کو خود ہی عاید، وصول اور خرچ کرتی ہے۔ ہر ریاست میں بلا استثناء ایک برطانوی ریذیڈنٹ یا ایجنٹ ہوتا ہے جس کا کام حکمرانوں کو مشورہ دینا اور برطانوی ارباب حل و عقد کو معاملات کی رپورٹ بھیجنا ہوتا ہے۔ تاج برطانیہ کو سخت بد انتظامی کی حالت میں یا ایسے حالات میں جہاں اس کی ضرورت ہو ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ایسی صورتوں میں حکومت بالادست، حکمران کے خاندان کے حقوق، ریاست کے حدود کے تحفظ اور ہندوستان کے امن و امان کو عموماً ملحوظ نظر رکھتی ہے۔ بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندوستان کے راجاؤں کی طرف سے مطالبہ تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ چیزیں من مانی نہ رہیں اور اس پر عملدرآمد کرانے کے لئے ایک باقاعدہ مشینری بنا دی جائے۔ لیکن بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو فارمولا کی شکل میں بیان کرنا ناممکن خیال کیا اور ریاستوں کو مشورہ دیا کہ ان کی عدم وضاحت میں ہی ریاستوں

کا فائدہ ہے۔

ایک دوسرے مسئلہ کے بارے میں بھی بٹلر کمیٹی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ راجاؤں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت بالادست کو جو حقوق معاہدوں کے ذریعہ ملے ہوئے ہیں ان کو ایسے لوگوں کو سپرد نہ کرنا چاہیئے جن پر اس کا کوئی اختیار نہ ہو مثلاً کسی ایسی ہندوستانی حکومت کو جو ہندوستانی مجلس قانون ساز کو جواب دہ ہو۔ ہندوستان میں اگر ڈومنین طرز کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا انحصار نئے اور تحریری دستور پر ہوگا۔ اس لئے راجاؤں کو اس نئی حکومت کی نگرانی میں بغیر ان کی رضامندی حاصل کئے شامل نہ کیا جائے۔

ریاست کی حکومتوں کی طرف سے حکومت بالادست کو خراج وغیرہ

کچھ ریاستیں تاج برطانیہ کو خراج ادا کرتی ہیں جس کی رقم مختلف حالات میں بدلتی رہتی ہے اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ہندوستان کی حکومت کی آمدنی میں شامل کی جاتی ہے۔ یہ خراج بعض صورتوں میں تو علاقہ کے تبادلہ یا واپسی کی شرائط کی وجہ سے پیدا ہوا ہے یا حکومتوں کے مطالبوں کے تصفیہ کی وجہ سے۔ لیکن زیادہ تر صورتوں میں اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ ریاستوں کو پہلے فوج رکھنا پڑتی تھی جس کی ذمہ داری بعد میں انھوں نے ترک کر دی اور اس کے معاوضہ میں روپیہ دینا شروع کر دیا۔ ایسی بھی مثالیں ہیں جن میں ایک ماتحت ریاست ریاست بالادست کو خراج ادا کرتی ہے مثلاً کاٹھیاوار اور گجرات کی بہت سی ریاستیں بڑودہ کو خراج ادا کرتی ہیں اور گوالیار، وسط ہند کی بعض ریاستوں سے خراج وصول کرتی ہے۔

اکثر ریاستیں جو اندرون ملک میں ہیں اپنے حدود پر درآمد برآمد کے محصول لگاتی ہیں البتہ میسور کا شمار اہم مستثنیات میں ہے۔ اکثر ریاستوں میں مال گذاری کے بعد آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ درآمد اور برآمد کے محصول ہوتے ہیں۔ ان درآمد اور برآمد کے محاصل کی میزان بصورت مجموعی ۱۲ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب ہوتی ہے۔ اپنے حدود پر محصول عاید کرنا بادشاہت کی علامت ہے اس لئے اس بات پر ریاستیں زور دینا چاہتی ہیں۔

ریاست کے خارجی معاملات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تمام تر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اس لئے بین الاقوامی معاملات میں ہندوستانی ریاستوں کے علاقہ کی حیثیت بالکل برطانوی علاقہ سے مشابہ ہے اور ان کی رعایا کی وہی حالت ہے جو برطانوی رعایا کی ہے۔ کوئی ہندوستانی ریاست سیاسی یا سرکاری گفت و شنید کسی غیر ملکی حکومت سے نہیں کر سکتی۔ ہندوستان اس میں شک نہیں انجمن اقوام کا رکن ہے اور جنیوا میں اس کی نمایندگی ایک ایسا وفد کرتا ہے جس میں عام طور پر ہندوستانی ریاست کا ایک حکمراں بھی شامل ہوتا ہے۔

کئی وجوہ کی بنا پر برطانوی چھاونیاں ہندوستانی ریاستوں مثلاً سکندرآباد، بنگلور اور مہو میں رکھی گئی ہیں۔

حکومت ہند، ہندوستان کی حفاظت کے سلسلہ میں ریاستوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ جہاں تک ان کی مالی حالت اجازت دے وہ اپنی سرکاری فوجیں رکھیں تاکہ وہ ہندوستان کی فوج کے ساتھ بیرونی حملوں اور اندرونی بلوں کے موقعوں پر اشتراک عمل کر سکیں۔ ان کے معائنہ کرنے والے عملہ کی تنخواہ حکومت ہند ادا کرتی ہے۔

ریاستیں اپنی پولس کے لئے خود ذمہ دار ہیں۔

وقتاً فوقتاً تاج برطانیہ اور ریاستوں کی حکومت کے درمیان، ریاستوں کے علاقوں میں خاص مراعات حاصل کرنے کے لئے معاملات طے پاتے رہتے ہیں۔ مثلاً ریاست کے ان ٹکڑوں میں جہاں سے ہو کر ریل گذرتی ہے حکومت ہند اپنے سول اور فوجداری قانون پر عملدرآمد کرتی ہے۔ مگر کچھ سرکاری ریلیں ایسی ہیں جو اہم راستوں پر نہیں ہیں ان پر ریاستوں کی عملداری کو قائم رہنے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال جودھپور اور بیکانیر کی لائن ہے۔ مندرجہ بالا انتظام کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو برطانوی ہندوستان میں گرفتار کیا جائے اور اس پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے ہندوستانی ریاست میں ریلوے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی بریت کے لئے یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اس نے جرم کا ارتکاب برطانیہ کے علاقہ کے حدود میں نہیں کیا ہے۔ اسی قسم کے سمجھوتے چھاؤنی اور بعض اوقات برطانوی ریذیڈنسی کے بارے میں بھی موجود ہیں حکومت ہند یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ یورپین برٹش رعایا کا مقدمہ ریاستوں کی

عدالتوں میں نہ چلایا جائے۔ ایسے مقدمے یا تو ہندوستانی ریاستوں میں جو برطانوی عدالتیں قائم ہیں ان میں پیش کئے جاتے ہیں یا برطانوی ہندوستان کی عدالتوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

جہاں تک پوسٹ اور ٹیلیگراف کا تعلق ہے، برطانوی ٹیلیگراف کا انتظام ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اکثر ریاستوں میں اسی قسم کے سمجھوتے ڈاک خانوں کے متعلق بھی ہیں لیکن پندرہ ریاستوں کے اپنے علیحدہ ڈاک خانے ہیں اور ان میں سے پانچ نے باقاعدہ معاہدہ کیا ہے جس کے ذریعہ یہ برطانوی محکمہ ڈاک کے ساتھ اشتراک عمل کرتی ہیں۔

صرف آٹھ ایسی ریاستیں ہیں جن کی اپنی جداگانہ ٹکسالیں ہیں جہاں روپیہ سازی کا کام کیا جاتا ہے۔ باقی ریاستوں کی ٹکسالوں میں صرف تانبے کے سکے بنائے جاتے ہیں یا چاندی اور سونے کے سکے خاص خاص تقریبوں کے موقع پر بنائے جاتے ہیں۔

چیمبر آف پرنسس (ایوان راجگان) مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں حکمرانوں کے مشترکہ معاملات کے بارے میں ان کی مشترکہ رائے اور مشورہ کا علم حاصل کرنے کے لئے کئی تجویزیں پیش کی گئی تھیں لیکن رپورٹ کے شائع ہونے سے پہلے اس تخیل کو کوئی عملی اور مستقل جامہ نہیں پہنایا جا سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ایوان راجگان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ دراصل ایکٹ میں ریاستوں کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ دیسی ہندوستان کو برطانوی ہندوستان سے علیحدہ ایک چیز ظاہر کیا گیا تھا۔ ایوان راجگان ۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ایک شاہی اعلان کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ ڈیوک آف کناٹ نے دہلی کے قلعہ میں مغل بادشاہوں کے دیوان عام میں جلسہ کیا اور اس میں ملک معظم کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے راجاؤں کے حقوق اور مراعات کو قائم اور برقرار رکھیں گے۔

ایوان راجگان کی ساخت ایوان راجگان میں سب سے پہلے تو ایسی ۱۰۸ ریاستوں کے حکمراں ہیں جو اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان کے رکن ہیں۔ یہ ایسے راجہ ہیں جن کو گیارہ یا زائد توپوں کی سلامی کا حق خاندانی طور پر ملا ہوا ہے۔ ان میں ایسے راجہ بھی شامل ہیں جنھیں وائسرائے کی رائے میں مکمل یا عملاً مکمل اختیارات

ریاست کے اندرونی انتظام کے ملے ہوئے ہیں۔ ایوان میں اس کے علاوہ بارہ اراکین اور ہوتے ہیں جنھیں ایسی ۱۲۷ ریاستوں کے راجہ چنتے ہیں جو اوپر کی ریاستوں میں شامل نہیں ہیں۔ ان نمائندوں کا انتخاب یہ راجہ یکجا جمع ہوکر کرتے ہیں۔ وئیسرائے اس ایوان کا پریسیڈنٹ ہے، اور اراکین میں ایک چانسلر اور ایک پرو چانسلر کا انتخاب سالانہ ہوتا رہتا ہے۔ ایوان کا ایک نہایت اہم ادارہ اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی یا مجلس انتظامیہ ہے جس کے سات ارکان ہوتے ہیں جس میں چانسلر اور پرو چانسلر شامل ہوتے ہیں۔ اس مجلس انتظامیہ کا کام وئیسرائے کو ایسے مسائل پر مشورہ دینا ہوتا ہے جن کے بارے میں وئیسرائے ان سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ "نیز یہ وئیسرائے کے سامنے ایسے مسائل بھی پیش کرتے ہیں جن کا اثر ہندوستانی ریاستوں پر عام طور پر پڑتا ہے یا بصورت مجموعی تمام ریاستوں پر پڑتا ہے یا برطانوی ہندوستان اور ریاستوں دونوں پر پڑتا ہے۔"

ایوان راجگان کے اختیارات ایوان راجگان ایک غور کرنے والا، مشورہ دینے والا ادارہ ہے اس کو کوئی انتظامی اختیار ملا ہوا نہیں ہے۔ اس کے اجلاس دہلی کے کاونسل ہاؤس کے اس عالیشان ہال میں ہوتے ہیں جو اس کے لئے خاص طور پر تعمیر کرادیا گیا ہے۔ اس کے دستور کا جو اہم حصہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"ریاستوں کے انفرادی معاہدوں اور ان کے اندرونی معاملات مہاراجاؤں اور سرداروں اور ان کی ریاستوں اور ان کے خاندان کے افراد کے انفرادی حقوق، مفادات، اعزازات، اختیارات، مراعات اور شاہانہ حقوق اور حکمرانوں کے انفرادی اعمال وافعال پر ایوان میں کوئی مباحثہ نہیں کیا جائے گا۔

"ایوان کے قیام سے وئیسرائے یا گورنر جنرل کے ساتھ کسی ریاست کے جو تعلقات اور مقررہ روابط ہیں ان کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ایوان کی کسی سفارش پر کسی ریاست کے حقوق یا عمل کی آزادی کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے گا۔"

دستور کی ان دفعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوان راجگان کے قیام سے کسی ریاست کے ساتھ

تاج برطانیہ کے جو انفرادی تعلقات تھے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی کا ویسرائے بذات خود انچارج ہے اور یہی وہ محکمہ ہے جو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی سفارشات کے بموجب اکثر اہم ریاستوں کو مرکزی حکومت سے براہ راست وابستہ کر دیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر صورتوں میں صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات گورنر جنرل کو منتقل ہو گئے ہیں۔ اکثر بڑے راجہ ویسرائے سے براہ راست ملاقات اور خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی میں زیادہ تر برطانوی افسر رکھے جاتے ہیں اور ان کا انتخاب انڈین سول سروس اور ہندوستانی فوج سے کیا جاتا ہے۔ ان سیاسی افسروں کو ریذیڈنٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ایجنسی میں یعنی راجپوتانہ، وسط ہند، ریاست ہائے پنجاب، ریاست ہائے مغربی، ریاست ہائے مدراس اور بلوچستان میں ایک اے۔ جی۔ جی یا ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل ہوتا ہے جس کے ماتحت بہت سے افسر ہوتے ہیں جو اکثر ایک ایک ریاست یا کئی ریاستوں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ محکمہ سیاست کا حاکم پولیٹکل سکریٹری ہوتا ہے جو ریاستوں کے معاملات میں ویسرائے کا مشیر ہوتا ہے۔

ایوان راجگان کی دستوری اہمیت تاج برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات کی تاریخ میں ایوان راجگان کا قیام ایک اہم منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس ابتدائی پالیسی کی تنسیخ ہوتی ہے جس کی رو سے تاج برطانیہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا ہندوستانی ریاستوں کو مشترکہ مشوروں اور مشترکہ عملی کوششوں سے باز رکھا کرتی تھی اور ہر ریاست کے ساتھ انفرادی حیثیت سے تعلقات قائم کرنا پسند کرتی تھی۔ یوں تو ایوان راجگان کے قیام سے پہلے ہی اس اصول کو ترک کرنا شروع کر دیا گیا تھا اور راجگان آپس میں مشورے کرنے لگے تھے۔ لیکن ان مشوروں کو قانونی صورت جواز اس سے پہلے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایوان راجگان کے قیام سے اس چیز کو قانونی اور مستقل شکل مل گئی۔ ایوان کے ذریعہ ایسے اہم معاملات پر جن کا تعلق ریاستوں اور تاج برطانیہ کے تعلقات یا دوسرے برطانوی ہند کے معاملات سے ہوتا ہے ریاستیں باہم آزادی سے تبادلہ

خیال کر سکتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ بعض اہم ریاستیں مثلاً حیدرآباد اور میسور اس سے الگ رہی ہیں پھر بھی سترہ سالوں میں اس کا کام خصوصاً اس کی مجلس منتظمہ کا کام دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں میں اشتراک عمل نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ لیکن سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس ترقی کو اتنا کافی نہیں سمجھا تھا کہ جس کی بنا پر آل انڈیا فیڈریشن کی طرف قدم اٹھایا جا سکے۔ اس سلسلہ میں لارڈ اروِن نے ۱۹۲۹ء میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا:۔

"میری یہ رائے ہے اور میں اسے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ آئندہ کے لئے جو تجاویز بھی بنائی جائیں ان میں پالیسی اور انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہندوستان کے راجگان کی آزادانہ منظوری کا حاصل کرنا لازمی سمجھا جائے۔ ایسی تجویزوں سے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاہدے جن کو راجگان نہایت پختہ سمجھتے آئے ہیں آسانی کے ساتھ توڑے جا سکتے ہیں مسئلہ کا حل قریب نہیں بلکہ دور ہو جائے گا۔"

اوپر درج کئے ہوئے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول گول میز کانفرنس کے منعقد ہونے سے پہلے تک والیان ریاست کا آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونا بہت مشتبہ تھا لیکن پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے والیان ریاست کو بھی دعوت دی گئی اور اس کانفرنس کے دوران میں والیان ریاست کو وزیر اعظم مسٹر ریمزی میکڈانلڈ نے کچھ ایسی باتیں سمجھائیں جن سے وہ آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انھیں غالباً یہ باور کرایا گیا تھا کہ تمہاری اندرونی خود مختاری میں کسی قسم کا فرق نہیں آئے گا البتہ فیڈریشن میں شریک ہو کر تم ایسے مسائل پر جو تمہارے لئے اور برطانوی ہندوستان کے لئے مشترک ہیں اور جن پر اب دبیر لئے کہ اختیارات بالادست حاصل ہیں اپنی مرضی اور رائے کو ایک آل انڈیا کنزرویٹو پارٹی بنا کر موثر طریقہ پر استعمال کر سکو گے والیان ریاست کو ایک عرصہ سے اس بات کی شکایت تھی کہ حکومت بالادست من مانے طریقہ پر ریاست کے معاملات میں اپنے اختیارات بالادست کا استعمال کرتی ہے اور ان کے حقوق کو مسترد کر رہی ہے جو انھیں ان معاہدات اور اعلانات کے ذریعہ حاصل تھے جو ملک معظم کی جانب سے وقتاً فوقتاً کئے گئے تھے۔ انھوں نے بٹلر کمیٹی کے سامنے اپنے اس مطالبہ کو رکھا تھا کہ پیرا مونٹسی

کی مداخلت کی حدبندی اور تعریف وتحدید کردی جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ برطانوی ہندوستان میں پارلیمنٹ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن ان کی سرگرم کوششوں کے باوجود اور قانونی مشورے کے لئے کثیر رقم صرف کرنے کے بعد بھی بٹلر کمیٹی نے انھیں صرف یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کی عدم وضاحت میں ہی ان کا فائدہ زیادہ ہے اس کے خلاف والیان ریاست نے احتجاج کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں انھوں نے اس امید کے ساتھ شرکت کی تھی کہ اپنے اس مطالبہ کو پارلیمنٹ کے سامنے رکھ سکیں گے۔ چنانچہ والیان ریاست نے اس موقع پر جو تقریریں کیں ان سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی چند تقریروں کے اقتباس درج کئے جاتے ہیں:۔

مہاراجہ بیکانیر:۔ ”معاہدات سے روسارہند کے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں ان کی زیادہ وضاحت کے ساتھ تحدید کرنے کی ضرورت ہے۔ روسا اور ریاستیں اس امر کو معلوم کرنے کی فطرتاً خواہش مند ہیں کہ ان کا کیا مقام ہے“........”یہ ایک کھلی ہوئی شکایت ہے کہ ہمارے معاہداتی حقوق پر دست درازیاں ہوئی ہیں“........”وہ زمانہ گزر چکا جب کہ ایسے اہم معاملات کا تصفیہ کوئی ایک حکومت یک طرفہ طور پر کر لی تھی۔ لہذا ہم ایسی عدالت اعلیٰ کے قیام کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں جس کو ان تمام نزاعی امور کی سماعت اور فیصلہ کا اختیار ہو جو معاہدات کے تحت ہمارے حقوق وفرائض کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں“۔

مہاراجہ الور:۔ ”ہم جدید اختیارات کے متلاشی نہیں بلکہ ہم ان معاہدات کی پابندی چاہتے ہیں جن کو ملکہ وکٹوریہ اور انگلستان کے تمام شاہان مابعد اور پارلیمنٹ اور زمانہ حاضر کے دلیسرائے کے متعدد اعلانات اور تقریروں نے قابل احترام بنادیا ہے۔ سیاسی عملدرآمد کے موقع پر ہمارے معاہدات کے مقدس حدود میں مداخلت کی گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ حقوق جو معاہدات سے باہر ہیں اور جو ہماری رضامندی اور بعض وقت ہمارے علم واطلاع کے بغیر حاصل کر لیے گئے ہیں از سر نو معرض بحث میں لائے جائیں اور باہمی رضامندی سے تصفیہ پائیں، ورنہ ہمارے معاہدات بے معنی

سمجھے جائیں گے ۔ ۔۔۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ عملدرآمد کے وقت مقدس معاہدات کی پابندی کی جائے ۔"

مہاراجہ پٹیالہ:۔ "ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سوائے مشترکہ امور کے دیگر معاملات میں ہم اپنی اندرونی خود مختاری کو بحال دبرقرار رکھنا چاہتے ہیں اور برطانوی ہند کی حکومت کی مداخلت لو (عام اس سے کہ برطانوی ہند کا دستور کچھ بھی ہو) روا نہیں رکھیں گے ۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ برطانوی ہند اپنے معاملات میں ہماری مداخلت کی روادار نہیں .... دنیا میں کوئی ایسا وفاق آج تک نہیں بنا جس میں وفاق میں شریک ہونے والی ریاستوں کو ان کے حقوق کا ابتدا ہی میں علم نہ ہو جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے یہ حقوق ابھی تک مشکوک ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے حقوق معاہدات اور سند نامہ جات پر مبنی ہیں اور تاج سے ہمارا تعلق ایک قابل تعین رشتہ ہے جس کے شرائط رضامندی پر مبنی ہیں ۔بٹلر کمیٹی نے ہماری رائے پر اعتراض کیا ہے۔ کیا ہمارے مشیران قانون جو انگلستان کے قابل ترین قانون داں ہیں حق بجانب ہیں یا ارکان بٹلر کمیٹی ۔ تاوقتیکہ ہم واقف نہ ہو جائیں کہ شرکت وفاق سے کیا کیا حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں ہم کیوں کر شریک وفاق ہو سکتے ہیں ؟ پس جب ہم شرکت وفاق پر آمادگی اور رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں تو کیا ہمیں یہ کہنے کا استحقاق نہیں ہے کہ شرکت سے پہلے ہمارے حقوق کا تعین ہو جائے"

نواب صاحب بھوپال:۔" یہ کہا گیا ہے کہ برطانوی ہند کی آزادی کا تخیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ دیسی ریاستیں بھی آزاد نہ ہوں ۔میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں .... ایک آزاد دیسی ریاست کے یہ معنی ہیں کہ پیراماونٹسی کے اس نظریہ کا خاتمہ کر دیا جائے جو ہمارے معاہدات کے خلاف ریاست ہائے ہند اور حکومت برطانیہ کے مابین پیدا کر دیا گیا ہے اور جس کو زمانہ حاضر میں اس قدر رواج دیا گیا ہے .... ایوان روسا نے بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف کھلے الفاظ میں احتجاج کیا ہے ۔ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے وہ دعوے حسن کو رپورٹ مذکور نے مسترد کر دیا ہے تفصیلی تحقیقات کے بعد جس کے

کہ وہ مستحق ہیں یا قاعدہ طور پر فیصل نہ ہوں۔ بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد حکومت ہند نے "ریاستوں سے تعلقات" کے عنوان سے جو یک طرفہ بیان شائع کیا ہے اس سے روسا ہند بے حد غیر مطمئن ہیں ...... ایک ایسی غیر جانبدارانہ عدالت ثالثی کی ضرورت ہے جو ان امور کا فیصلہ کرے جو ریاستوں اور تاج کے عہدہ داروں کے مابین تصفیہ طلب ہوں"

اوپر کے تمام اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیراموئنٹسی اور معاہداتی تعلق وہ حقوق ہیں جن کی طرف سے وفاق میں شریک ہونے سے پہلے ریاستیں مطمئن ہو جانا چاہتی ہیں۔ مسٹر مانٹیگو سابق سکریٹری آف اسٹیٹ کے دورۂ ہند کے بعد سے والیان ریاست نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مسئلہ پیراموئنٹسی کو حل کرنے کی پیہم کوشش کیں۔ برطانوی اور یورپین مقننین سے مشورے حاصل کئے اور ایوان راجگان نے مختلف قراردادوں کے ذریعہ اس خطرہ کو روکنے کی کوشش کی۔ آخر میں گول میز کانفرنس کی ہر سہ میقاتوں میں پر زور مطالبہ کیا کہ تاوقتیکہ اس مسئلہ کا تشفی بخش حل نہ ہو جائے وہ شرکت وفاق سے قاصر رہیں گی۔

ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ نے یہ طے کیا کہ پیراموئنٹسی کا اثر ونفاذ مختلف ریاستوں کے حق میں مختلف حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہر ریاست فرداً فرداً اس مسئلہ کے متعلق حکومت ہند سے گفت و شنید کا آغاز کرے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کا جو قانون ہند بنایا گیا ہے اس میں وفاق کے قیام کو ریاستوں کی اختیاری شرکت کا پابند رکھا گیا ہے اور ہر ریاست کو فرداً فرداً دستاویز شرکت تیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جب ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کریں گی جن کے حکمراں کم سے کم ۵۲ ارکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے منتخب کرنے کے مجاز ہیں اور جن کی مجموعی آبادی تمام ریاستوں کی کل آبادی کی کم سے کم نصف ہے تب ہی آل انڈیا فیڈریشن وجود میں آسکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس اعتبار سے والیان ریاستہائے ہند اپنی مرضی سے ہی وفاق ہند میں شامل ہو سکتے ہیں انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جدید دستور اپنی طرف سے کسی ریاست کو وفاق میں شریک

نہیں کرتا۔ بلکہ اس میں صرف ریاستوں کی شمولیت کا طریق کار، اور اس کے نتائج ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ریاستوں کی مرضی پر ہے کہ چاہیں تو وفاق میں شامل ہوں نہ چاہیں تو نہ ہوں۔

وثیقہ شمولیت میں وہ تمام امور درج کر دیئے جائیں گے جن پر کوئی والیٔ ریاست وفاقی حکومت کا اختیار تسلیم کرنے کے لئے رضامند ہوگا اور اس اختیار پر جو حد بندی وہ قائم کرنا چاہے گا وہ بھی معرض تحریر میں آجائے گی۔

ان وثیقوں کو تاج نامنظور کر دے گا جو اس کی رائے میں وفاق کے اصولوں سے منافی ہوں گے لیکن جب ایک مرتبہ وثیقہ قبول کر لیا جائے گا تو پھر وہ وفاقی حکومت کے عاملانہ اور قانون سازی کے اختیارات کے لئے فیصلہ کن لفظ بن جائے گا۔

وفاقی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جو ریاستیں وفاق میں اس وقت تک شامل نہ ہوئی ہوں گی وہ گورنر جنرل کی وساطت سے ملک معظم کی خدمت میں شمولیت کے لئے درخواستیں پیش کریں گی۔ مگر بیس برس کا عرصہ گذرنے کے بعد ایسی کوئی درخواست نہیں بھیجی جا سکے گی تا وقتیکہ وفاقی ایوان علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے یہ ایڈریشن نہ دیں کہ ملک معظم فلاں ریاست کو وفاق میں شامل کر لیں۔ ملک معظم کے وہ اختیارات جو گورنر جنرل مع کونسل ان کی طرف سے ریاستوں میں استعمال کرتا ہے فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد تاج کو منتقل ہو جائیں گے۔ گویا ایک طرف تو تاج کا تعلق برطانوی ہند اور وفاق سے ہوگا اور دوسری طرف ریاستوں سے۔ پہلے تعلق کے امور گورنر جنرل کے ذمے ہوں گے دوسرے کے نمایندہ ملک معظم کے سپرد ہوں گے۔ ملک معظم ایک ہی شخص سے دونوں کام بھی لے سکتا ہے۔

فیڈریشن کے قیام کے سلسلہ میں قانون حکومت ہند کی چند متعلقہ دفعات کا خلاصہ ذیل میں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دفعہ ۵ (۱) اگر پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ایک ایڈریس اس مضمون کا پیش کریں اور اگر وہ شرط جس کا ابھی ذکر کیا جائے گا پوری ہو جائے تو ملک معظم شاہی اعلان کے ذریعہ اس بات کو ظاہر

کر سکتے ہیں کہ فلاں تاریخ سے تاج برطانیہ کی ماتحتی میں فیڈریشن آف انڈیا کے نام سے مندرجہ ذیل کو متحد کیا جاتا ہے :-

(الف) صوبے جنھیں آئندہ سے گورنروں کے صوبے کہا جائے گا۔

(ب) ہندوستانی ریاستیں جنھوں نے فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کر لیا ہے یا جو بعد میں شامل ہونا قبول کریں گی۔ اور جو فیڈریشن اس طرح قائم ہوگی اس میں وہ صوبے بھی شامل ہوں گے جو آئندہ سے چیف کمشنر کے صوبے کہلائیں گے۔

(۱) جس شرط کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کریں :-

(الف) جن کے حکمراں کم سے کم ۵۲ اراکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے چننے کے مجاز ہوں اور

(ب) جن کی مجموعی آبادی کل ریاستوں کی آبادی کی کم سے کم نصف ہو۔

دفعہ (۶) (۱) جب ملک معظم کسی ریاست کے تیار کئے ہوئے دستاویز شرکت کو قبول کریں گے تو سمجھا جائے گا کہ وہ ریاست فیڈریشن میں شامل ہوگئی ہے۔

ریاست کے لئے فیڈریشن میں شامل ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ :-

(الف) ملک معظم، گورنر جنرل، فیڈرل لیجسلیچر، فیڈرل کورٹ اور دوسرے فیڈرل اداروں کو اپنے علاقہ میں ان فرائض کو پورا کرنے دے گی جنھیں وہ فیڈریشن کے سلسلہ میں اور دستاویز شرکت کے معاہدہ کے مطابق اس کے علاقہ میں انجام دینا چاہیں گے۔

(ب) اس پابندی کو قبول کرے گی کہ دستاویز شرکت کی حد تک قانون حکومت ہند کی دفعات کو اپنے علاقہ میں نافذ کرنے کی ضمانت کرے گی۔

(۲) دستاویز شرکت میں ان امور کو بیان کیا جائے گا جن کے بارے میں والی ریاست اس بات کو قبول کرے گا کہ فیڈرل لیجسلیچر اس کی ریاست کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور اس میں اگر ضرورت

سمجھی جائے گی توان حدود کا بھی ذکر ہوگا جس کی فیڈرل یجیلیچر ریاست کے لئے قوانین بناتے وقت یا اپنے اختیارات عاملہ کو استعمال کرتے وقت پابند ہوگی۔

(۳) (دستاویز شرکت میں ترمیم کے بارے میں)

(۴) اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے، اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ ملک معظم کسی دستاویز شرکت یا اس کی ترمیم کو منظور کرنے کے لئے پابند ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ اس کو قبول کرنا مناسب خیال کریں یا یہ کہ اس دفعہ سے ملک معظم کو اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ وہ کسی ایسی دستاویز شراکت کو منظور کر سکتے ہیں جس کی شرائط اس ایکٹ میں درج کی ہوئی فیڈریشن کی اسکیم کے منافی ہوں۔

لیکن اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ اگر ملک معظم نے کسی دستاویز کی شرائط کو قبول کر لیا ہی تو فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد اس دستاویز کی یا اس کی شرائط کی صحت میں شبہ اور سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور اس ایکٹ پر عمل درآمد اس خاص ریاست کے لئے دستاویز شراکت کی شرائط کے مطابق ہی ہوگا۔

دفعہ (۷) (۱) اس ایکٹ کی شرائط کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ملک معظم کی طرف سے گورنر جنرل براہ راست یا ماتحت افسروں کے ذریعہ انجام دے گا، لیکن اس دفعہ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل یجیلیچر کو ماتحت افسروں کو اختیارات عطا کرنے سے منع کیا گیا ہے نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ ہندوستانی قانون نے جو حق کسی عدالت یا جج یا افسر کو یا کسی مقامی یا کسی دوسرے صاحب اقتدار شخص کو دے رکھا ہے وہ گورنر جنرل کو منتقل ہو جائے گا۔

دفعہ (۸) (۱) اس ایکٹ کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:-

(الف) وہ تمام معاملات جن کے بارے میں فیڈرل یجیلیچر کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہی (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ)

(ب) ملک معظم کی طرف سے بحری، بری اور ہوائی فوجوں کا بھرتی کرنا اور ملک معظم کی ان فوجوں

پر جن کا ہندوستان کی فوجوں میں خود مختار ہے حکومت کرنا۔

(ج) ان حقوق اور اختیارات کا استعمال جن کا قبائلی علاقوں کے لیے استعمال کرنے کا حق ملک معظم کو معاہدہ، عطیہ، رواج، رواداری یا کسی اور دوسرے طریقہ پر ملا ہوا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ

(۱) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو صوبوں کے ان معاملات پر نہیں ہے جن کے بارے میں صوبوں کی مجلس قانون ساز کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے۔

(۱۱) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاستوں کے معاملات پر نہیں ہے اور ان معاملات میں بھی جن کے لئے فیڈرل مجلس قانون ساز کو ریاست کے لئے قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے، اس اختیار کا استعمال ہر ریاست میں ان حدود کا پابند ہوگا جن کا ذکر وثیقہ شمولیت میں ریاست نے کیا ہوگا۔

(۲) اس ایکٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاست کے عاملانہ اختیار ان معاملات میں جن کے قوانین بنانے کا فیڈرل لیجسلیچر کو اختیار ہوگا حسب سابق باقی رہیں گے سوائے ان صورتوں کے جہاں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ایسے ہوں گے کہ وفاقی قانون کے مطابق ان سے ریاست کے حکمران کے اختیارات کا ازالہ ہو جائے گا۔

دفعہ (۹) گورنر جنرل کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے (سوائے ان صورتوں کے کہ جہاں وہ اس ایکٹ کے ماتحت اپنے فرائض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا) وزیروں کی ایک کونسل ہوگی جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے اس کی بنا پر گورنر جنرل کو کسی معاملہ میں جہاں اسے اس ایکٹ کے ماتحت اپنی انفرادی رائے کے استعمال کرنے کا حق دیا گیا ہے، انفرادی

رائے کے استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہوگی۔

دفعہ (۱۰) (۱) وزرا کا انتخاب اور ان کو طلب گورنر جنرل خود ہی کرے گا انھیں قسم بھی وہی دلائے گا اور جب تک اس کی خوشی ہوگی وہ انھیں اپنا وزیر بنائے رکھے گا۔

(۲) جو وزیر چھ مہینے تک مسلسل فیڈرل لیجسلیچر کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کا ممبر نہیں ہوگا وہ جب یہ مدت گذر جائے گی وزیر نہ رہ سکے گا۔

(۳) وزیروں کی تنخواہیں فیڈرل لیجسلیچر وقتاً فوقتاً مقرر کرتی رہے گی اور جب تک فیڈرل لیجسلیچر انھیں مقرر نہ کرے گی یہ کام گورنر جنرل کرتا رہے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ کسی وزیر کی تنخواہ اس کے دوران ملازمت میں بدلی نہیں جا سکتی۔

(۵) وزرا کے انتخاب، طلب اور برطرف کرنے اور ان کی تنخواہ کے مقرر کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی ذمہ داریاں اس کی اختیار تمیزی کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۱۱) اگر جوں کے معاملات، مدافعت اور معاملات خارجہ کے بارے میں (فیڈریشن اور ملک معظم کے ڈومینینس سے باہمی تعلقات کو چھوڑکر) گورنر جنرل اپنے فرایض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے بارے میں بھی وہ اپنے فرائض اور تعلق کو اسی طرح پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۲) (۱) اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی مندرجہ ذیل خاص ذمہ داریاں ہوں گی:-

(الف) ہندوستان کے امن و امان کو برہم کرنے والے خطروں کا تدارک

(ب) فیڈرل گورنمنٹ کے مالی استحکام اور اعتبار کا تحفظ

(ج) اقلیتوں کے جائز مفاد کا تحفظ

(۵) جو لوگ پبلک سروسوں میں ہیں یا رہ چکے ہیں ان کے یا ان کے متعلقین کے ان حقوق کی ضمانت جو اس ایکٹ کے ماتحت انھیں دئے یا ان کے لئے محفوظ کئے گئے ہیں اور ان کے قانونی

مفاد کا تحفظ۔

(ھ) سلطنت متحدہ میں آباد برطانوی رعایا کے خلاف اگر کوئی نقصان رساں امتیازی برتاؤ کیا جائے تو اس کا تدارک عاملانہ اختیارات سے کرنا

(و) سلطنت متحدہ برطانیہ یا برما سے برآمد ہونے والے مال کے خلاف اگر امتیازی یا تعزیری محصول لگائے جائیں تو ان کا تدارک کرنا۔

(ز) ہندوستانی ریاستوں کے حقوق اور ان کے حکمرانوں کے حقوق و اعزازات کا تحفظ کرنا۔

(۲) جہاں کہیں گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کا سوال پیدا ہوگا گورنر جنرل اپنے فرائض کو اپنی انفرادی رائے کے مطابق پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۸) (۱) ایک فیڈرل لیجسلیچر ہوگی جس میں ملک معظم کی نمائندگی گورنر جنرل کریں گے اور دو ایوان ہوں گے جنھیں کونسل آف اسٹیٹ اور فیڈرل اسمبلی کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

(۲) کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہندوستان کے ۱۵۶ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۰۴ نمایندوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہندوستان کے ۲۵۰ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۲۵ سے زیادہ نمایندہ نہیں ہوں گے۔

(۳) برطانوی ہندوستان کے نمایندے کو رائے دینے کی اہلیت رکھنے والے لوگ اس ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ اول کے مطابق منتخب کرکے بھیجیں گے۔ ریاستوں کے نمایندوں کا انتخاب اور تقرر ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ دوم کے مطابق کیا جائے گا۔

دفعہ (۹۹) اس ایکٹ کے اندر رہتے ہوئے فیڈرل لیجسلیچر تمام ہندوستان یا اس کے ایک حصہ یا فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے قانون بناسکتی ہے اور صوبہ کی لیجسلیچر صرف صوبہ یا اس کے ایک حصہ کے لئے بناسکتی ہے۔

دفعہ (۱۰۰) (۱) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا اختیار ان تمام معاملات کے بارے میں ملا ہوا ہے

جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی پہلی فہرست میں کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ ۲۵۰

(۲) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا حق صوبوں کے ساتھ ان مشترکہ معاملات کے بارے میں بھی ملا ہوا ہے جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی تیسری فہرست میں کیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۰۱) | اس ایکٹ کی کسی بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل لیجسلیچر کو فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے وثیقہ شراکت کے علاوہ اور دوسرے معاملات کے لئے بھی قانون بنانے کا حق ملا ہوا ہے۔

دفعہ (۱۲۲) | صوبہ اور فیڈریشن میں عاملانہ اختیارات کو اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ ان سے فیڈرل لیجسلیچر کے قوانین کے لئے ان صوبوں اور ریاستوں میں جن میں یہ نافذ کئے جائیں عزت اور احترام پیدا ہو۔

دفعہ (۱۲۵) | (۱) والیان ریاست یا ان کے افسروں کو فیڈرل لیجسلیچر کے ان قوانین کو جو معاہدے یا ریاست کے وثیقہ شراکت کی رو سے ان کی ریاست کے لئے بنائے جا سکتے ہیں اپنے علاقہ میں نافذ کرنا ہوگا۔

(۲) اس دفعہ کے ماتحت جو معاہدے ہوں گے ان میں گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی دیا جائیگا کہ وہ اپنے اختیار تمیزی سے اس بات کی طرف سے اپنا اطمینان کرتا رہے کہ ریاست میں جس قانون کے نافذ کیے جانے کا معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل درآمد فیڈرل حکومت کی پالیسی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر اسے اطمینان نہ ہو تو اپنے اختیار تمیزی سے کام لیتے ہوئے وہ ایسی ریاست کے نام جن ہدایتوں کو ضروری اور مناسب سمجھے روانہ کر سکتا ہے۔

دفعہ (۱۲۸) | (۱) ہر فیڈریشن میں شریک ریاست اپنے عاملانہ اختیارات کا استعمال اس طرح کرے گی جس سے فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کو جہاں تک وہ فیڈرل لیجسلیچر کے مطابق اس ریاست میں جاری کئے جا سکتے ہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

(۲) اگر گورنر جنرل کو یہ معلوم ہو کہ فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کا رئیس اپنے فرائض کو پورا

نہیں کر رہا ہے تو گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر والی ریاست کی معروضات سننے کے بعد اس کے نام جو مناسب سمجھے ہدایتیں جاری کر سکتا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کا مسئلہ بجائے خود بحث میں آجائے تو اس صورت میں یہ معاملہ فیڈریشن یا والیٔ ریاست کی طرف سے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ (۲۰۵) اس ایکٹ میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کی بنا پر ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کی جو ذمہ داریاں یا حقوق ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آتا البتہ فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے لئے یہ حقوق اور ذمہ داریاں ان ریاستوں کے وثیقہ شرالت کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۲۰۶) (۱) اگر ملک معظم کے نمائندہ کو ریاستوں سے متعلق اپنے فرائض منصبی پورا کرنے کے سلسلہ میں مسلح فوجوں کی امداد کے لئے درخواست کرنا پڑے گی تو گورنر جنرل کا فیڈریشن کے عامل کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں یہ فرض ہوگا کہ اس درخواست کے مطابق مسلح فوجوں کا استعمال کرے۔ لیکن ان فوجوں کو اس طرح استعمال کرنے کے سلسلہ میں جو خالص زاید خرچ ہوگا اسے ملک معظم کا وہ خرچ سمجھا جائے گا جو تاج برطانیہ کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں کیا گیا۔

(۲) گورنر جنرل اس دفعہ کے ماتحت اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے اپنے اختیار تمیزی سے کام لے گا۔

دفعہ (۲۰۷) ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کے جو فرائض ہیں ان کے بارے میں ملک معظم کا نمائندہ یہ انتظام کر سکتا ہے کہ صوبہ کے گورنر اور اس کے وہ افسر جو صرف صوبہ کے معاملات کے سلسلہ میں کام کرتے ہیں تاج برطانیہ کے مندرجہ بالا فرائض کو بھی انجام دینے لگیں۔

ضمیمہ

قانون حکومت ہند کی وفاقی مدات

(۱) ملک معظم کی برّی، بحری اور فضائی افواج جن کے خرچ کا بار ہندوستان کے فوجی محکمہ کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اور ایسی افواج جن کی بھرتی ہندوستان میں کی جائے لیکن اس میں وہ فوجیں جو ہندوستانی ریاستوں یا صوبہ کی حکومتوں کی مسلح پولس کے لئے بھرتی کی جائیں شامل نہ ہوں گی ـــــ اس کے علاوہ تمام ایسی مسلّح افواج جو ملک معظم کی افواج تو نہیں ہیں لیکن جو ملک معظم کی ان بحری، برّی اور فضائی افواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کا خرچ ہندوستان کا فوجی محکمہ برداشت کرتا ہے ـــ مرکزی محکمہ تفتیش۔ مدافعت، معاملات خارجہ یا دیسی ریاستوں کے سلسلہ میں فرائض منصبی کو پورا کرنے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر لوگوں کو حراست میں رکھنا۔

(۲) بحری، بری اور فضائی افواج کے لئے سرکاری تعمیرات ـــ چھاؤنیوں کی لوکل سلف گورنمنٹ (اس میں ہندوستانی ریاستوں کے چھاؤنیوں کے علاقہ شامل نہیں ہیں) ـــ ان علاقوں میں اور برطانوی ہندوستان میں مکانوں کی گنجائش کی نگرانی کرنا اور ان علاقوں کی حدبندی کرنا۔

(۳) خارجی معاملات۔ دوسرے ملکوں سے معاہدے اور سمجھوتے کرنا۔ ملک سے خارج کرنا جس میں ملک معظم کے دوسرے مقبوضات کے مجرموں کا حوالہ کرنا بھی شامل ہے۔

(۴) گرجے کے معاملات جس میں یورپینوں کے قبرستان بھی شامل ہیں۔

(۵) کرنسی، سکہ سازی اور زر قانونی۔

(۶) فیڈریشن کا قرضہ عامہ۔

(۷) ڈاک اور ٹیلیگراف جس میں ٹیلیفون، وائرلیس، براڈ کاسٹنگ اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع رسل ورسائل بھی شامل ہیں۔ ڈاک خانہ کے سیونگس بنگ۔

(۸) فیدریشن کی سرکاری ملازمتیں اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن

(۹) وفاقی پنشنیں یعنی ایسی پنشنیں جو فیڈریشن کی طرف سے واجب الادا ہوں گی یا فیڈریشن کی آمدنی سے ادا کی جائیں گی۔

(۱۰) تعمیرات، زمینیں، مکانات جو ملک معظم کے قبضہ میں فیڈریشن کے سلسلہ میں ہوں گے (یہ بحری، بری، اور ہوائی فوج کی تعمیرات کے علاوہ ہوں گے) لیکن جو جائداد صوبہ میں واقع ہوگی وہ صوبہ کے قانون کی پابند ہوگی سوائے اس صورت کے کہ فیڈریشن اس کے بارے میں اپنا کوئی قانون خاص طور پر بنائے۔ رہیں فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی ایسی جائدادیں جن پر پٹہ یا معاہدہ کی بنا پر قبضہ کیا گیا ہے سو وہ پٹہ یا معاہدہ کی شرائط کی پابند ہوں گی۔

(۱۱) امپیریل لائبریری، انڈین میوزیم، امپیریل جنگی میوزیم۔ وکٹوریہ میموریل یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ جس کی نگرانی اور خرچ فیڈریشن کے ہاتھ میں ہو۔

(۱۲) مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے جو فیڈرل ایجنسیاں اور ادارے قائم کیے جائیں:۔ یعنی تحقیقات علمی، پیشہ اور فن کی تعلیم یا خاص علوم کی ترقی کے لئے۔

(۱۳) بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑہ مسلم یونیورسٹی۔

(۱۴) سروے آف انڈیا۔ جیولوجیکل، بوٹانیکل اور زوآلیجیکل سرویز آف انڈیا۔ فیڈرل میٹی اورولاجیکل محکمے۔

(۱۵) قدیم اور تاریخی آثار۔ آثاری مقامات اور باقیات

(۱۶) مردم شماری

(۱۷) ہندوستان میں داخلہ، ترک سکونت یا اخراج اس میں ان لوگوں کی نقل وحرکت

صوبوں میں پراونشل قانونی فہرست میں شامل کر کے یا دونوں قانونی فہرستوں میں بہ یک وقت شامل کر کے صوبوں کی طرف سے کیا جائے۔

(۳۸) ساہوکارہ یعنی کمپنیوں کی طرف سے جو ساہوکارے کا کاروبار کیا جائے اس سے وہ کمپنیاں مستثنیٰ ہیں جن کی نگرانی یا ملکیت فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو حاصل ہے اور جو صرف ان ریاستوں کی حدود کے اندر ہی اپنا کام کرتی ہیں۔

(۳۹) کسی دوسرے گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ میں برطانوی ہندوستان کے کسی حصہ کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع لیکن اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ کسی ایک حصہ کی پولس دوسرے حصہ میں اس صوبہ کی حکومت یا چیف کمشنر کی مرضی کے بغیر اپنے حدود اور اختیارات کو وسعت دے سکے۔ ایک واحدے کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع ریلوے کے علاقوں کے دوسرے واحدوں تک۔

(۴۰) اس قانون اور اس کے ضمن میں جو دوسرے آرڈران کونسل بنائے جائیں ان کی نگرانی میں وفاقی مجلس قانون ساز کے انتخابات۔

(۴۱) وفاقی وزرا، کونسل آف اسٹیٹ کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، فیڈرل اسمبلی کے اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کی تنخواہیں۔ فیڈرل مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تنخواہیں، بھتے اور حقوق۔ اور جہاں تک اس قانون کا حصہ دوم اجازت دیتا ہے ان اشخاص کو سزا دینا جو مجلس قانون ساز کی کمیٹیوں کے سامنے شہادت دینے یا دستاویزیں پیش کرنے سے انکار کریں۔

(۴۲) اس فہرست میں جو امور درج ہیں ان کی خلاف ورزی کے الزامات

(۴۳) فہرست میں جو امور درج ہیں ان کے سلسلہ میں تحقیقاتیں اور اعداد و شمار

(۴۴) کروڑگیری کے محاصل جس میں برآمد کے محاصل بھی شامل ہیں

(۴۵) تمباکو اور دوسری اشیا پر جو ہندوستان میں بنائی جائیں یا پیدا کی جائیں محاصل اکسائز لیکن ان میں مندرجہ ذیل شامل نہیں ہیں :-

(i) الکوہل کے ایسے مختمر (مخمر) دبات جو انسانی صرف کے لئے تیار کئے جائیں

(ii) افیون، بھنگ اور دوسری نشہ آور دوائیں اور منشیات اور غیر نشہ آور دوائیں

(iii) دوا اور سنگار کے لئے ایسی تیار کی ہوئی چیزیں جن میں الکوہل موجود ہو یا ایسی کوئی چیز ہو جس کا اوپر (ii) میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۴۶) کارپوریشن ٹیکس

(۴۷) نمک

(۴۸) سرکاری لاٹریاں

(۴۹) نیچورالائیزیشن

(۵۰) ہندوستان کے اندر کسی ایک گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ سے دوسرے صوبہ کے لئے نقل سکونت

(۵۱) اوزان کے معیار کا تعین

(۵۲) رانچی کا یوریپینوں کے لئے دماغی ہسپتال

(۵۳) فہرست میں درج کئے ہوئے جملہ امور کے بارے میں وفاقی عدالت کے علاوہ باقی تمام عدالتوں کے حدود اور اختیارات کا تعین اور اس حد تک جس کی قانون کے نویں حصہ میں صراحت کے ساتھ اجازت ہے وفاقی عدالت کے حدود کی توسیع اور اس کو مزید اختیارات کا عطا کرنا۔

(۵۴) زراعتی آمدنی کے علاوہ باقی تمام آمدنیوں پر محصول

(۵۵) زراعتی زمین کو چھوڑ کر افراد اور کمپنیوں کی باقی تمام جایدادوں کی قیمت پر محصول۔ کمپنیوں کے سرمایہ پر محصول۔

(۵۶) زراعتی زمین کے علاوہ باقی سب طرح کے ترکہ اور وراثت پر محصول

(۵۷) ہنڈیوں، چیکوں، پرامیسری نوٹ، بل آف لیڈنگ، اعتبار ناموں، بیمہ کی پالیسیوں، عیوضی

اور رسیدوں پر اسٹامپ کے محاصل کی شرحیں ۔

(۵۸) ریل یا ہوا سے جو مسافر یا مال لے جائے جائیں ان پر ٹرمنل ٹیکس ۔ ریلوے محصولوں اور کرایوں پر محصول ۔

(۵۹) اس فہرست میں درج کئے ہوئے امور پر فیس لیکن اس میں عدالت کی فیس شامل نہیں ہیں ۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا

(از جناب محمد سرور صاحب استاد تاریخ و اسلامیات جامعہ)

(یہ مضمون اس جلسہ میں سنایا گیا تھا جو غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تعزیت کے لئے جامعہ میں منعقد کیا گیا تھا)

پرسوں جمعرات کی صبح کو ایک طویل علالت کے بعد غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے انتقال فرمایا، ان کی موت کا صدمہ کون ہے جس نے محسوس نہ کیا ہو، ان کے عقیدت مند، ان کے بہت سے کاموں کو سراہنے والے اور بعض پر اعتراض کرنے والے ان کے مخالفین اور ان کے سخت دشمن سب کے سب اس حادثہ سے متاثر ہیں، کوئی زیادہ متاثر ہے اور کوئی کم، دنیا کے حالات سے خبر رکھنے والا کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی وفات کی خبر سنی ہو اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب وغریب اور حیرت انگیز شخصیت کا نقشہ نہ کھنچ گیا ہو، مصطفیٰ کمال کو ماننے والے بہت سے تھے اور ان کو ناپسند کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی، لیکن مرحوم کی بڑائی یہ ہے کہ ان کے دوست تو عقیدت کیش تھے ہی ان کے سخت سے سخت دشمن بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں ان کے کام بہت تھے اور بڑے کاموں کا انکار مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ صفت ہے جس کے کمال کا مظہر مصطفیٰ کمال کی ذات ہے۔

مصطفیٰ کمال پیدا ہوئے تو ترکی قوم مر رہی تھی۔ ان کی پرورش کا زمانہ قوم کی زندگی اور موت کی کشمکش میں گذرا جوان ہوئے تو قوم اس جان ہار کشمکش سے نڈھال ہو کر موت کی راہ تک رہی تھی اس نازک وقت میں مصطفیٰ کمال نے قوم کو سنبھالا اس کے مردہ جسم میں نئی روح ڈالی اس کی موت کو زندگی سے بدلا، اور نئی روح کو نیا قالب دیا، وہ بوڑھی قریب المرگ قوم اب جوان ہے اور آج جب وہ مر گئے تو اپنے پیچھے ایک زندہ اور توانا قوم چھوڑ گئے ہیں۔

عثمانی ترک ریوڑ چراتے چراتے بادشاہ بن گئے۔ سلطان سلیم اور سلیمان کا دور ان پر ایسا بھی گزرا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی سات زمین اور سات سمندر ان کے قبضہ میں تھے زمانہ بدلا تو یہ بھی بدل گئے سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی۔ علم و تدبیر کے مالک خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے، عوام بے چارے بے زبان تھے۔ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں تھی ظلم و جبر جس کا شعار تھا اور کمزور یری طرح پیسے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں وطن پروروں کی ایک جماعت نے اپنی قوم کی بری حالت کو درست کرنے کی کوشش کی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کی مساعی کامیاب ہوگئیں، لیکن جب سلطان خلیفہ بنا تو اس نے اپنے ان دوستوں کی قیود کو گراں جانا اور ایک ایک کرکے اصلاح کے سب کام روک دئے اور وطن پروروں کے لیڈر مدحت پاشا کو بری طرح قتل کرا دیا۔ اس کے بعد یہ ظالم سلطان ۳۳ برس تک برسر اقتدار رہا اس طویل زمانہ میں کون ظلم تھا جو اٹھا نہ رکھا گیا ہو، ضمیر و زبان کی آزادی جرم تھی۔ رشوت اور خوشامد حکومت کا دستور تھا نا اہل لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے قتل ہوتے یا جلا وطن۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ آزادی پیدا کرنے والی کتابیں ملک میں نہ آسکتی تھیں۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی اس گری ہوئی حالت کو دیکھ کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے، مصر برطانیہ نے دبا لیا، ٹیونس فرانس نے بلقان کی ریاستیں ایک ایک کرکے آزاد ہوگئیں۔ روس آئے دن قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا تھا۔ خود سلطنت کے اندر جو عیسائی اقلیتیں تھیں وہ یورپی حکومتوں کی شہ پاکر ہر وقت آمادۂ فساد رہتی تھیں۔ سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ قرضے لے لے کر حکومت کا کاروبار چلایا جاتا۔ اور ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سونپ دیا جاتا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو اجنبی آباد تھے وہ ملک کے قوانین سے بالا تھے۔ ان کی سرزوریاں نہ ترکی پولیس روک سکتی تھی، اور نہ ترکی حکومت وہ ٹیکسوں سے محفوظ تھے اور اگر ان میں سے کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچ جاتی تو اس کی حکومت ترکی کو اعلان

جنگ دینے پر اتر آتی۔ استبداد اور ذلت کی اس سے بڑھ کر کونسی حد ہو سکتی ہے۔ سلطان عبدالحمید کے یہ تو مظالم تھے لیکن وہ ظل اللہ کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ محراب منبر سے اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، مذہبی طبقے ان مظالم کی تائید میں تھے اور اطاعتِ خلیفہ کو اطاعت اللہ قرار دیتے تھے۔

اس ظلم و جور ذلت اور بے بسی کی فضا میں مصطفیٰ کمال نے آنکھیں کھولیں باپ کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اٹھ گیا تھا ماں نے مذہبی تعلیم دلوانے کی کوشش کی لیکن مصطفیٰ کمال کی سرکش طبیعت استاد کی سختی کی متحمل نہ ہو سکی چنانچہ وہ بھاگ نکلا کچھ زمانہ ننھیال میں آوارگی میں گذرا پھر ایک فوجی مدرسہ میں داخلہ ہوا اور بھگوڑا طالب علم اس مدرسہ میں آ کر سب سے قابل اور محنتی بن گیا مدرسہ سے فارغ ہو کر مصطفیٰ قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں پہنچا اور اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں میں نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

نوجوان مصطفیٰ نے عجیب طبیعت پائی تھی اپنے ساتھیوں سے بہت کم تعلق رکھتا تھا اکثر خاموش رہتا سرکشی کا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا نہ کسی کو دوست بنانا پسند کرتا اور نہ کسی کا دوست بنتا۔ ریاضی سے بہت لگاؤ تھا زندگی کے ہیجانی لمحوں میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا۔ لیکن واقعیت پسند کو جذبات کی یہ حرکت اچھی نہ لگتی بے چینی کا زمانہ تھا نوجوان کے خیالات میں انقلاب ہو رہے تھے، حکومت کی سختیاں اس انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے کا کام کر رہی تھیں۔ نوجوان گروہ ملک کی تباہی اور قوم کی ذلت سے بیزار اور اصلاحِ حال کے لئے بے قرار تھا باتیں قانون نے بند کر دی تھیں لیکن دلوں پر بہر حال پابندیاں عائد نہ کی جا سکتی تھیں۔ بر ملا بات کہنے کی اجازت نہ تھی لیکن چوری چھپے کی سرگوشیوں کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ جہاں چند پڑھے لکھے جمع ہو جاتے قوم کی بدحالی اور حکومت کے ظلم و جور کا ذکر ہوتا سازشیں کی جاتیں خفیہ جماعتیں بنتیں اور انقلاب ان تمام روگوں کا علاج تجویز کیا جاتا قسطنطنیہ کا فوجی کالج بھی اس رو سے نہ بچ سکا۔

مصطفیٰ کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ان خفیہ جماعتوں سے ہوا وہ اور اس کے ساتھی استادوں کی نظر سے دور انقلاب کے منصوبے سوچتے تجویزیں بناتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی طرحیں ڈالتے

تھے ان کی یہ سرگرمیاں بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکیں اور راز افشا ہو گیا مصطفےٰ اور اس کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ مقدمہ چلا قصور ثابت تھا سلطان نے رحم کھایا کسی سخت سزا دینے کے بجائے اسے وطن سے دور کر دیا۔ فوج میں لفٹننٹ بنا کر دمشق بھیج دیا۔ یہاں آکر اسے اپنی سیاسی جدوجہد کے لئے زیادہ آزادی ملی۔ وطن نامی انجمن بنائی گئی اور فوج کے نوجوان افسروں کو اس میں شریک کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مصطفےٰ سلطنت کے یورپی صوبہ سالونیکا میں گیا حکومت کے جاسوسوں کو بھی اس کی خبر مل گئی اور مصطفےٰ بڑی مشکل سے گرفتار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ بعد یہ دمشق سے تبدیل ہو کر سالونیکا پہنچ گئے جو اس وقت انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا اور مصطفےٰ کمال انجمن اتحاد و ترقی کے سرگرم رکن بن گئے اور انور اور جمال کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی نے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کرے پارلیمنٹ بنائی گئی۔ اور ترکی نے استبداد کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا۔ عبدالحمید نے اپنا اقتدار بحال کرنے کی پھر کوشش کی تو انھیں معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ بوڑھے سیاست داں برطرف ہوئے۔ اور انجمن ترقی و اتحاد کے نوجوان سلطنت کی باگ ڈور کے مالک بنے۔

یہ نیا دور شروع ہی ہوا تھا کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا ترک بے بس تھے فوج کی کوئی کل درست نہ تھی سمندری بیڑہ بھی نہ تھا کہ طرابلس کو مدد بھیجی جا سکتی۔ انور اور مصطفےٰ کسی نہ کسی طرح کرکے طرابلس پہنچے۔ عربوں کی مدد سے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی لیکن یہ جنگ شروع ہی تھی کہ بلقانی ریاستوں نے قسطنطنیہ پر بلہ بول دیا ترک تیار نہ تھے لڑے تو وہ ضرور لیکن ہر محاذ پر شکست کھائی جن پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں سے ترکوں نے ذلتوں پر ذلتیں اٹھائیں ہزاروں گھر تباہ ہوئے ترک آبادی تلوار اور آگ کی مدد سے بلقان سے ختم کی گئی انور اور مصطفےٰ طرابلس سے واپس وطن پہنچے اور ترکی کے تاریخی شہر ایڈریانوپل کی شکست سے جو دھبہ لگا تھا کم سے کم ان دونوں کی ہمتوں کو اس کی کالک کو دور کرنے میں بڑا کام کیا آخر بڑی مشکلوں کے بعد جنگ کی آگ بجھائی۔ اب سلطنت کی سیاہ وسپید کے مالک انور طلعت اور جمال تھے نام کو پارلیمنٹ تھی لیکن دراصل سلطنت

کے یہ تینوں گرتا دھرتا ہے انھوں نے مصطفےٰ کمال سے بیان بوجھ کر اعراض برتا اور اسے صوفیا کی ترکی سفارت کے ساتھ ملحق کر دیا۔ مصطفےٰ جیسی سرکش طبیعت اس حق تلفی کو کیوں محسوس نہ کرتی۔ لیکن ملک میں انور طلعت اور جمال کی ہوا بندھ گئی تھی اور قوم ان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ سرکش طالب علم جو تلاکی نختی سے بھاگا تھا جس کو سلطان عبدالحمید کے مظالم نے کالج ہی میں باغی بنا دیا تھا اور جس نے فوجی افسر ہونے کے بعد اس انقلابی تحریک کو اپنی جان پر کھیل کر منظم کیا تھا اور پھر طرابلس اور بلقان میں بہت سے معرکے سر کئے تھے اب اپاہج بنا کر صوفیہ میں ڈال دیا گیا۔ سرکشی۔ بغاوت، بے چینی اقدام ہمت اور ولولوں کے جذبات کی تسکین سے محروم ہو کر معلوم نہیں مصطفےٰ کمال کے دل میں ان تینوں کے خلاف نفرت اور بغض کی آگ کتنی سخت بھڑکی ہوگی پنجرہ میں بند شیر غصہ میں اکر کیا کچھ نہیں کرتا۔ مصطفےٰ کمال کو دل کی یہ آگ کسی نہ کسی طرح سے ٹھنڈی کرنی ہی پڑی۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا مصطفےٰ کمال انور سے خفا تھے جرمنوں سے انھیں نفرت تھی۔ جنگ زوروں پر ہو رہی تھی اور مصطفےٰ کمال تھے کہ بے بس دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ حکومت کو انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور دوستوں سے بھی کہلوایا۔ لیکن انور جو اب وزیر جنگ تھے انھیں صوفیہ ہی میں رکھنے پر مصر رہے ۱۹۱۵ء میں مصطفےٰ کمال سخت بیمار ہوئے، موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار قسطنطنیہ پہنچے بیماری وہی تھی جس نے آج ۲۳ برس کے بعد ان کی جان لے کر چھوڑی قسمت اچھی تھی موت کے منہ سے بچ نکلے اور صحت یاب ہوئے تو انھیں درہ دانیال کی حفاظت پر معین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں اور اگر ان کا یہ حملہ کامیاب ہوتا تو جنگ ۱۹۱۵ء ہی میں ختم ہو جاتی۔ ترکی کے راستے روس کو اپنے حلیفوں سے مدد مل جاتی تو وہ یوں اتنی آسانی سے جرمنی کے ہاتھوں نہ مرتا ادھر فرانس کے محاذ پر جرمن فوجوں کا زور کم ہو جاتا اور لڑائی ۱۹۱۸ء تک طول نہ کھینچتی مصطفےٰ کمال کی بے نظیر شجاعت اور مہارت کیا تھی ایک معجزہ تھا کہ ترکوں کی بے بس اور تھکی ہوئی قوم نے دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کو شکست دی اور انگریزوں کو مجبوراً درہ دانیال سے پسپا ہونا پڑا۔ اب ترکی کے بچے بچے کی زبان پر مصطفےٰ کمال کا نام تھا۔ لیکن حکومت کے

مختارِ مطلق اپنے اس حریف کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن اب جرمنوں کے قدم پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ ترک ہر جا پر شکست کھا رہے تھے عربوں نے بغاوت کر دی تھی عراق اور فلسطین کی طرف سے برطانوی فوجیں بڑھی چلی آرہی تھیں انور کے تمام منصوبے ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے مصطفےٰ کمال کو پروانہ ملا کہ فلسطین کے محاذِ جنگ پر روانہ ہو جاؤ۔ یہ سمجھ گئے کہ حریف درہ دانیال کے عظمت کے چاند کو اس شکست سے گھن لگانے کے درپے ہیں فلسطین پہنچے تو حالت دگرگوں ہو چکی تھی دشمن کا روکنا ناممکن ہو گیا تھا انھوں نے ادھر ادھر سے ہٹنا شروع کیا فلسطین چھوڑا دمشق چھوڑا حلب کے ایک دروازے سے نکلے تو دوسرے دروازے سے انگریزی فوجیں اور باغی عرب داخل ہوئے۔ فتح کے نشے میں سرمست ہو کر آگے بڑھ جانا آسان ہے لیکن پے در پے شکستوں اور پیہم پسپائیوں کے بعد فوج کے اوسان بحال رکھنا مصطفےٰ کمال ہی کا کام تھا پیچھے ہٹتے ہٹتے یہ موجودہ ترکی کی سرحد پر پہنچ گئے اس جگہ پہنچ کر انھوں نے کہا کہ اب کوئی قدم پیچھے نہیں اٹھے گا وطن مقدس کی سرزمین دشمنوں کے قدموں سے ناپاک نہیں ہونے دی جائے گی لیکن اس وقت عارضی صلح کا اعلان ہوا جنگ رک گئی اور مصطفےٰ کمال واپس قسطنطنیہ بلا لیے گئے

سلطان وحید الدین نے اپنے بچاؤ کے لیے برطانیہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ دشمنوں کی ظفرمند فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ اور ان کے جنگی جہاز ابنائے باسفورس میں لنگر انداز تھے قوم بلقان کی جنگ سے پہلے ہی بدحال تھی اس چار برس کی مصیبت نے اس کی زندگی کا آخری قطرہ تک بھی ختم کر ڈالا ہر طرف مایوسی تھی بڑے بڑے ہمت ہار چکے تھے انجمن اتحاد و ترقی کا تو کوئی نام لینے والا بھی نہ تھا۔ پرانے عافیت پسند سیاست داں پھر برسرِ اقتدار آئے تھے مصطفےٰ کمال نے سلطان وحید الدین کا دل ٹٹولا لیکن وہ راضی بہ تقدیر ہو چکے تھے پرانے سیاست دانوں کو سمجھایا کہ یوں ہمت ہار دینا ترکی کو دشمنوں کا تر نوالہ بنا دینا ہے عارضی صلح سے مطمئن ہو کر خاموش بیٹھ جانا دشمنوں کو نگل جانے کی دعوت دینا ہے لیکن ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ لیکن نوجوان موجود تھے جن کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا۔ مصطفےٰ نے ان لوگوں کو یک جا کیا۔ ان کی آگ کو ہوا دی یہ نوجوان سر جوڑ کر بیٹھے اور قوم کو موت

سے بچانے کے لئے دار و سوچنے لگے۔ مصطفےٰ کمال کے دل میں تو یہ خیالات تھے لیکن ان کی زبان بالکل
بند تھی سلطان نے ان کی خاموشی سے دھوکا کھایا۔ اور انھیں مشرقی مقبوضات کا قائد اعلیٰ بنا کر انگورہ کی
سمت روانہ کیا تاکہ وہ عارضی صلح کے مطابق فوج کو برخاست کرکے ہتھیار جمع کرلیں مصطفےٰ کمال
کو یہ موقع خدا نے دیا اور انھوں نے فوجوں کو برخاست کرنے کی بجائے ان کو منظم کرنا شروع کردیا۔ اپنے
گرد لوگوں کو جمع کیا انھیں سمجھایا کہ اگر ہم نے اس وقت اپنے آپ کو فاتح دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو ہمارا
حشر بہت برا ہوگا۔ یہ بیدار رہنے کی تاثیر رکھتی تھی تھکے ہارے تازہ دم ہوگئے جن کی ہمتیں بالکل جواب دے چکی
تھیں وہ مرنے مارنے پر تل گئے سلطنت کی ہر سمت سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ فوجی افسر
پرانے سپاہی ماہر اخبار نویس شاعر ادیب جس کو موقعہ ملا مصطفےٰ کی طرف کھنچا چلا آیا۔

سلطان وحید الدین بڑے [illegible] اتحادی گھبرائے لیکن مصطفےٰ کمال ان کے پنجے سے نکل
چکا تھا۔ [illegible] جس شخص کو چھپانا آسان نہ تھا سلطان نے اتحادیوں
کے کہنے میں آکر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا۔ شیخ الاسلام نے انہیں کافر بنایا۔ خلیفہ کے
حامی [illegible] وطنیوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ کئے گئے۔ عین اس
وقت [illegible] اس کی رو سے ترکی کے سب سے اچھے صوبے اس سے چھین
لئے گئے قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا سمرنا کا علاقہ یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کے لق و
دق صحرا تک ترکی قوم کے نذر [illegible] اس خبر نے مصطفےٰ کمال کی قوت کو جو ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہیں سے
کہیں پہنچا دیا۔ ترک قوم زخمی شیر کی طرح جھپٹ پڑی اور مصطفےٰ کمال کی تحریک مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی سوا
س کے مقام پر ترکی اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ کے احکامات کو اس بنا پر ماننے سے انکار کردیا کہ وہ دشمنوں
کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دے چکا ہے۔

یونانی سمرنا پر قابض ہوئے تو اسے تباہ و برباد کردیا۔ وہاں سے یہ لوگ آگے بڑھے۔ برطانیہ
کی شہ تھی۔ یونانی اسپارٹا کے خواب دیکھ رہے تھے بڑھتے بڑھتے اور ترکی فوجوں کو ہٹاتے ہوئے
پایہ تخت انگورہ تک کے سامنے پہنچ گئے سقاریہ کے میدان میں ترک اور یونانی ایک دوسرے کے

مقابل ہوئے ۱۲ دن کی سخت جنگ کے بعد ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ترکوں نے سمرنا تک کا علاقہ ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ اب ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور برطانوی فوجوں کے روبرو ترک سپاہی کھڑے نظر آئے لائڈ جارج برطانیہ کے وزیر اعظم تھے وہ لڑنے کو تیار تھے لیکن قوم نے ساتھ نہیں دیا آخر صلح کی بنیاد ڈالی گئی اور لوزان کے معاہدہ میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔

قسطنطنیہ پر از سر نو پرچم ہلال لہرانے لگا آبنائے باسفورس سے دشمنوں کے جہاز نکل گئے ایشیائے کوچک کا علاقہ ترکوں کے پاس تھا ہی یورپی علاقہ بھی لے کر چھوڑا اجنبی مراعات ختم کی گئیں یورپ کا مرد بیمار تندرست و توانا ہو گیا یہ ایک معجزہ تھا جو بات کسی کے خیال میں بھی نہ آسکتی تھی اسے مصطفےٰ کمال نے واقعہ کر کے دکھایا۔ اور ترکی نے نئی زندگی پائی۔

نئی زندگی نیا جسم چاہتی ہے۔ ترک دشمنوں سے تو بچ نکلے تھے لیکن ان کا جسم قومی انحطا دزوال کے مواد سے بھرا پڑا تھا۔ سالہا سال کی پے در پے جنگوں نے ملک کا برا حال کر ڈالا تھا تجارت او صنعت باہر والوں کے ہاتھ میں تھی۔ زراعت کرنے والے بندوقیں اٹھائے پھرتے تھے امیر طبقے مال مست تھے اور زندگی کی مشکلوں کو داد عیش دے کر بھلایا کرتے تھے حکام طبقوں کو صدیوں کی ظالم حکومت نے بے کار کر دیا تھا تعلیم نام کو بھی علماء ترقی کے دشمن اور ہر پرانی چیز کے شیدا اور اس کو باقی رکھنے کے لئے وطن قوم اور مذہب کو بیچنے کے لئے تیار۔ صوفیا خانقاہوں اور تکیوں میں وظائف کرنا زندگی کا عزیز ترین مشغلہ سمجھتے تھے۔ نئی زندگی جو برسوں کی جان توڑ کوششوں۔ خونریزیوں سازشوں بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کو ملی تھی کس طرح اس قوم کے فرسودہ اور لاغر جسم میں سما سکتی تھی اگر زندگی کی بقا منظور تھی تو جسم کا بدلنا بھی ضروری تھا مصطفےٰ نے جس سنگدلی اور سفاکی سے طرابلس اور بلقان کی جنگیں لڑیں درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سفاریہ میں یونانیوں کو شکست دی وہی روح اب نئے جسم کی تعمیر میں کار فرما تھی۔ قوم کی بے حسی اور بے بسی جب سپاہی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کرے تو اس سے اعتدال پسند مصلح اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے قائد کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔

مصطفےٰ پاشا نے جس سختی کے ساتھ دشمنوں کے سر کچلے اس سختی کو اپنے ان دوستوں کے خلاف استعمال کرنے میں بھی اسے کوئی باک نہ تھا جو اس کے نزدیک وطن کے لئے دشمنوں سے کم خطرناک نہ تھے۔

ترکی قوم کو مصطفےٰ کمال نے نئی زندگی دی اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا اس نے اس نئی زندگی کو نیا قالب بھی دیا۔ جس کے حسن و قبیح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید یہ زیادہ مناسب بھی نہیں ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال یہ نیا قالب ترکی کے لئے تیار کرتا۔ تو قوم کی صدیوں کی فرسودہ روایات، غلط مذہب کی غلط حدود مذہبی طبقوں کی جہالت اور عوام میں ان کی بے دلعزیزی یہ سب چیزیں اس نئی زندگی کو کب کا ختم کر ڈالتیں۔ مصطفےٰ کمال نے اس نئی زندگی کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ وہ ابھری پرانی زنجیروں کو توڑ کر غلط راہ پر چل نکلی لیکن اس بے راہ روی سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ غلط راہ پر چلتے چلتے صحیح راہ پر آجانا کوئی بڑی بات نہیں لیکن جو زمین پر پاؤں نہ ٹکا سکے وہ چلنے کا کیا۔ مصطفےٰ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا۔ یہ لوگ ظل اللہ کے نام سے پکارے جاتے تھے خشکی و تری میں ان کا سکہ چلتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجنبی کے سایہ سے کانپا کرتے اور وقت پر دشمنوں کے ہاتھوں بک جایا کرتے تھے۔

علماء کا زور توڑا جن کی زندگی قوم کے لئے وبال جان بن چکی تھی اور ان کا مذہب ترقی کا دشمن ہو چکا تھا۔ تعویذ دینے والے پیر قبر پرست مجاور زاویہ نشین صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کے خون کو جونک کی طرح چوس رہے تھے ختم ہوئے عوام بے حس اور جاہل تھے ان کو وطنیت کا نشہ اور علم کی روشنی دی خلیفہ اور علماء کا مذہب اسلام تھا لیکن ان کے سب کام غیر اسلامی تھے انھوں نے اس اشتہار کو بے کار سمجھ کر حکومت کو مذہب کے اس منت کے دم چھلے سے نجات دی اور اپنی اس بے دینی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مشنریوں کا سد باب کیا۔ ان کے ابتدائی مدرسے بند گئے اور ان کا تمدنی اقتدار جو قوم کے ضمیر کو برسوں سے خراب کر رہا تھا یوں ختم کیا روس سے قومی پیر چلا آتا تھا اس سے دوستی کی لیکن اس دوستی کے باوجود اس کے اثرات کو ملک

کے حدود میں قدم نہ رکھنے دیا۔ یونان پٹ چکا تھا۔ لیکن اس سے بھی صلح صفائی کرکے راہ ورسم بڑھائی برطانیہ سے اچھے تعلقات قائم کئے فرانس پر زور ڈال کر اپنے مطالبات منظور کرائے ترک زراعت سے غافل تھے انہیں زراعت میں لگایا اور زراعتی تعلیم کو عام کرنے کے لئے نئے طریقے پر زراعت کرنے کا شوق دلایا۔ صنعت وحرفت کا ترکوں میں نام تک نہ تھا قانون کے زور سے انہیں ان کاموں میں لگایا۔ تعلیم کو ترقی دی بچوں اور نوجوانوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا عورتیں زندگی سے دور گھر کی چہار دیواری میں وقت ضائع کرتی تھیں انہیں کاروبار زندگی میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو مقدس سمجھا جاتا تھا ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ ترکی ٹوپی بدلی پردہ رخصت کیا عاجزی اور نیاز مندی کے سلام بدل دئے موسیقی کو جو ردنے دھونے کے جذبات کو ابھارتی تھی زندگی بخش بنا دیا۔

مصطفےٰ کمال سرکش تھے اور بہت سخت قسم کے سرکش ان کے ارادے اٹل تھے اور جو ان کی راہ روکتا ان کا نام ونشان تک آگ کے نذر ہو جاتا۔ وہ باغی تھے بچپن سے جوانی میں حریفوں کی رقابت نے انہیں اور باغی بنا دیا۔ اور جب حقیقی معنوں میں کام کرنے کا وقت آیا تو خلیفہ کی حرکتوں نے بغاوت کی اس آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اگر اس سرکش اور باغی کو صحت بخش مذہبی ماحول ملتا۔ اور اس ماحول میں انہیں اپنی غیر معمولی قوت جرت اور دیگر صلاحیتوں کو برسر کار لانے کے موقعے ملتے رہتے تو یہ باغی اور سرکش مرد مومن بنتا۔ اور ترکی کو نئی روح کے ساتھ ایک ایسا قالب عطا کرتا جو ۱۳۰۰ برس پہلے کی یاد تازہ کر دیتا۔

مصطفےٰ کمال کی بڑائی اس کی اپنی بڑائی ہے اور اس کی کمزوریاں ذلیل اور پست ماحول کا نتیجہ مصطفےٰ کمال اگر اتنا سرکش اتنا باغی اتنا خودسر اور اتنا خوں خوار نہ ہوتا۔ تو یہ صدیوں کے قوم کے پرانے قالب کو جو نفس اور خدائی کا درجہ حاصل کر چکا تھا کبھی نہ بدلنے پاتا۔

اس مرد غازی کی ایک ضرب کلیمی نے ملت اسلامی کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا ہے اور اس کا پیدا کیا ہوا ولولہ آج ہر نوجوان کو اپنے اپنے ماحول میں اس ضرب کلیمی کو آزمانے

کی دعوت دے رہا ہے۔

غازی مصطفےٰ کمال صحیح معنوں میں بڑے آدمی تھے انھوں نے صدیوں کے جمود کو توڑا وہ جمود جس نے اسلام کی اصل روح کو مسخ کر دیا تھا ان کی بغاوت اور ان کے کفر نے آئندہ نسلوں کو کافر ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ اگر یہی حالت رہتی تو نئی نسلوں کا انقلاب ان کی امنگیں ان کی آرزوئیں ان کی بے قراریاں اسلام کے اس فرسودہ اور بے روح قالب کو دیکھ کر کب مطمئن ہوتیں مصطفےٰ کمال کے کفر نے نہ معلوم کتنوں کو مومن بنا دیا اس لئے یہ کافر واقعی مرد مومن تھا۔ جو خود جلا اور اپنی ذات سے افق اسلام کو روشن کر گیا۔

ایران میں ریلوے

(از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

(ماہ گزشتہ وزارت طرق ایران کی مفصل روئداد بابت راہ آہن سرتاسر ایران" موصول ہوئی جو دس جزکی ہے اور بڑی تقطیع پر باتصویر نہایت عمدہ چھاپی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون اسی روئداد کا نہایت مختصر خلاصہ ہے۔ اسلم)

ستر سال سے اہل ایران کی دلی خواہش تھی کہ ان کے ملک میں ریلوے جاری کی جائے۔ جب سے ان کے تعلقات فرنگستان سے قائم ہوئے اور مغربی ممالک کے ساتھ ارتباط میں افزونی ہوئی اسی وقت سے یورپین تمدن کے مظاہر میں سے جو چیز ان کے لئے زیادہ جاذب نظر ہوئی وہ بھی ریلوے تھی۔ ایران کے مفکرین برابر اس بات پر زور دیتے رہے کہ ملک کی ترقی کے لئے موجودہ تمدن کے ضروری عناصر میں سے سب سے مقدم ریلوے کا اجراء ہے۔

مرحوم صنیع الدولہ جو گزشتہ صدی کے ایران کے نامور رجال سیاسی میں سے تھے ملکی ترقی کے وسائل کا محور ریلوے ہی کو سمجھتے تھے۔ اس بارہ میں انھوں نے اپنی تجاویز بھی شائع کی تھیں۔ مشروطیت کے بعد مجلس ملی کے دورۂ چہارم میں ایک نمائندہ نے کہا تھا

"جس دن ایرانیوں کی یہ پرانی آرزو برآئے گی، اور انجنوں کی سیٹی اور ان کے آمد و رفت کے شور وغل کی آواز اہل ملک کے کانوں میں گونجنے لگے گی وہ دن ملت کے لئے سب سے بڑا خوشی کا دن ہوگا۔ اور پھر ہم ایران کی گزشتہ عظمت کے اعادہ کی امید رکھ سکیں گے"

لیکن انتظامی اور اقتصادی بدحالیوں نے ایران کو اس درجہ پر پہنچا رکھا تھا کہ اس کے باشندوں کی یہ آرزو اس بچہ کی خواہش سے زیادہ نہ تھی جو چاہتا تھا کہ ایک بڑے اژدھے کو اپنے کھلونوں کی ڈبیا میں بند کرے۔

ایرانی ریلوے کی تاریخ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا باوجود اس یقین کے کہ ہر قسم کی ملکی ترقیوں کے لئے ریلوے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے اپنی زبون حالی کی وجہ سے ایران اس قابل نہ تھا کہ خود اس کو تعمیر کر سکتا۔ دول مغربیہ جو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں اور اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے کو اپنے استعماری اور نامشروع سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے مفید سمجھتی تھیں اپنے نفوذ اور اثر کو بڑھانے کے لئے اس میں ریلوے نکالنے کے اجارے طلب کرنے لگیں۔ سنہ ۱۸۶۵ء سے یورپ کے لوگ ایران کے ایک ایک حصہ میں اجرائے ریلوے کے لئے درخواستیں لے کر آنے شروع ہوئے جن میں روس۔ انگلستان۔ فرانس اور جرمنی وغیرہ مختلف ممالک کے نمایندے تھے۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں انگریزوں نے یہ تجویز کی کہ بحیرہ روم سے ایک ریلوے لائن نکالیں جس کو وادی فرات و دجلہ سے لا کر ایران کے جنوبی حصے سے گزارتے ہوئے مکران کے راستہ سے ہندوستان تک پہنچا دیں۔ برطانی پارلیمنٹ نے اس کے لئے ایک مخصوص کمیشن متعین کیا جس نے بیرن جولیس رویٹر کی قیادت میں دربار ایران سے اس کو منظور کرایا۔ اس اجارہ میں صرف ریلوے ہی کا اجرا نہ تھا بلکہ ایران کی پوری تجارت بحر قزوین سے خلیج فارس تک کا امتیاز بیرن موصوف کے نام ستر سال کی طویل مدت کے لئے واگذار کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس تجویز سے انگریزوں کا مقصد صرف روسیوں کو دھمکانا تھا۔ جونہی انھوں نے افغانستان کے معاملہ میں سمجھوتہ کر لیا کہ اس میں مداخلت نہیں کریں گے انگریزوں نے بھی اپنی یہ سیاسی نمائش ختم کر دی چنانچہ دوسرے سال یعنی سنہ ۱۸۷۳ء میں یہ اجارہ رسماً باطل ہو گیا۔

سنہ ۱۸۷۴ء میں ایک روسی انجینیر فالکہائن نے جس نے گرجستان میں ریلوے تعمیر کی تھی ایران میں آ کر جلفا سے تبریز تک ریلوے نکالنے کی اجازت چاہی۔ اور اس کے پیچھے اس نے بہت کچھ صرفہ بھی کیا۔ مگر دربار ایران کو معلوم ہو گیا کہ یہ کام وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی حکومت کے لئے لینا چاہتا ہے۔ اس کے پاس جو نقشے تھے ان سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ مقصود یہ ہے کہ جلفا سے تبریز اور وہاں سے بغداد تک ریلوے لائن نکال کر دولت علیہ عثمانیہ پر جارحانہ اقدام میں آسانی پیدا کی جائے۔ اس لئے اس کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں ایک فرانسیسی کمپنی کے منیجر موسیو الیوں نے جو اسلامبول میں سکونت رکھتا تھا رشت سے

تہران تک ریلوے نکالنے کا ٹھیکہ لیا۔ مگر واپس چلا گیا۔ پھر ایک آسٹرین انجینیر ہروان شیروے نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا مگر اس نے بھی کچھ نہ کیا۔

۱۸۷۸ء میں امریکا کے سفیر متعینہ ایران نے امریکن سرمایہ اور انجینیروں سے ریلوے جاری کرنے کے لئے مختلف حصہائے ایران میں ٹھیکے لئے مگر وہ بھی کچھ کر نہ سکا۔

۱۸۸۰ء میں موسیو بوآتال نے جو تہران میں برق کا اجارہ دار تھا رخصت سے تہران تک ریلوے بنانے کی اجازت حاصل کی۔ اور اس کے ساتھ بعض دیگر نقاط کو بھی پیوست کرنے کا اجارہ لیا۔ پانچ لاکھ فرانک کی رقم بھی اس غرض کے لئے بنک میں جمع کی مگر کام نہ ہوا۔

بوآتال مذکور کو اس زمانہ میں مردم شماری کی روئداد سے معلوم ہوا کہ درگاہ حضرت عبد العظیم کی زیارت کے لئے سالانہ کم و بیش تیس لاکھ آدمی جایا کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے تہران سے درگاہ مذکور تک جو چھ میل ہے ریلوے بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ پھر اس کو ایک بیلجین کمپنی کے ہاتھ فروخت کرا دیا۔ اس نے بروکسل سے سامان لاکر یہ لائن تیار کی۔ ایران کی یہی پہلی ریلوے لائن تھی جس کا افتتاح ۱۸۸۸ء میں بڑے تزک و احتشام سے کیا گیا تھا۔ اسی کمپنی نے ایک دوسری ریلوے کا بھی ٹھیکہ لیا مگر نہ بنا سکی۔

اسی زمانہ میں حاجی محمد حسین امین الضرب نے تجارتی آسانی کے لئے دریائے مازندران سے تہران تک ریلوے لائن کا اجارہ حاصل کیا اور اپنے اور دیگر ایرانی تجار کے سرمایہ سے شاہ بندر محمود آباد سے جو بحر خزر کے ساحل پر ہے شہر آمل تک ۱۰ کیلومیٹر ریلوے لائن بنائی۔ صرف ایک انجن تھا اور ۱۲ ڈبے جن پر چھت نہیں تھی۔ ایک ہی انجن ڈرائیور تھا جو جرمن تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ایک حبشی کو لائے جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں انجن اور لائن دونوں کو خراب کر دیا۔ آخر کار ریل کا لوہا اٹھا لیا گیا اور دوسرے کاموں میں لگا یا گیا۔

۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک مختلف کمپنیاں ایران کے مختلف حصوں میں ریلوے کے ٹھیکے لیتی رہیں مگر کسی نے کچھ نہ کیا۔ مسٹر شوسٹر امریکن وزیر خزانہ ایران نے بھی ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ امریکن سرمایہ سے ریلوے لائین تعمیر کرائیں گے مگر ان کے چلے جانے کی وجہ سے یہ تجویز بھی عمل میں نہ آسکی۔

۱۹۱۱ء میں روسی بنک نے تجارتی نہیں بلکہ روس کی فوجی غرض سے جلفا سے تبریز تک اجازت لے کر

ریلوے لائن تعمیر کی جس کا طول ۱۴۰ کیلومیٹر ہے یہ ایران کی تیسری ریلوے لائن تھی سنہ ۱۹۲ء میں جنگ عظیم کے بعد سویٹ روس اور ایرانی معاہدہ کی رو سے جب یہ لائن ایرانی حکومت کے ہاتھ میں آئی اس وقت اس کی گاڑیاں۔ پٹریاں۔ انجن اور اسٹیشن سب از کار رفتہ تھے۔ رضا شاہ نے ہر چیز کو از سر نو درست کرایا۔ اور موجودہ زمانہ کے مروجہ مصالحہ سے اس کو ایسا ٹھیک بنا دیا کہ اب اس کی سالانہ آمدنی تقریباً پچاس لاکھ ریال ہوتی ہے علاوہ بریں تبریز سے ایک شاخ شرف خانہ تک ۵۳ کیلومیٹر کی اور بھی بڑھا دی ہے۔

اسی زمانے میں روسیوں نے اپنے جنگی نظام کے سلسلہ میں قفقاز سے ایک ریلوے لائن نکالی تھی۔ جو ایران کے شمال مغربی حصہ میں سے گزرتی ہوئی ترکی حدود میں پہنچی تھی۔ اس کا تقریباً سو کیلومیٹر حصہ ایرانی سرزمین میں پڑتا تھا جو اب ایران کے قبضہ میں ہے۔ مگر یہ لائن جنگ کے دوران میں اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ اب اس کی پٹریاں اکھاڑ کر ایک جگہ جمع کر کے رکھ دی گئی ہیں۔

مشرق میں انگریزوں نے جو لائن ہندوستان سے دزداب تک نکالی ہے اس کا ایک حصہ جو بولان سے زاہدان تک ہے ایران کے ہاتھ میں ہے ایک دوسری لائن انگریزوں نے سنہ ۱۹۱۹ء میں بوشہر سے برازجان تک بنائی تھی۔ روزانہ ایک ٹرین اس پر آتی جاتی تھی۔ مگر آج کل وہ خراب و خستہ حالت میں معطل پڑی ہے۔

ایران کی ریلوے لائنوں کی یہ مختصر تاریخ ہے جس کو دیکھ کر ناظرین حیران ہوں گے کہ جبکہ ساری دنیا میں ریلوے عام ہو گئی تھی کیا وجوہات تھے کہ ایران جیسے زرخیز ملک میں اس کا اجرا نہ ہو سکا۔ اس کا سبب حقیقت میں خود ایران کی کمزوری اور بے مائگی تھی۔ قاچاری عہد میں ملک کی انتظامی اور اقتصادی حالت اس درجہ گر گئی تھی کہ بیرونی کمپنیاں یہاں اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں اور ان کو مطلق اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ ہم روپیہ اور محنت صرف کر کے کوئی نفع اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ بدنظمی اور غارتگری کا دور دورہ تھا۔ خود حکومت کی آمدنی سالانہ ۱۵ کروڑ سے لے کر ۲۰ کروڑ تومان سے زیادہ نہ تھی۔ ضروری اخراجات کے لئے بھی قرضے لینے پڑتے تھے۔ علاوہ بریں روس اور انگلستان کی باہمی رقابت ایک بڑا سبب تھی جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے کہ ایسا کام کرے جس سے اس کو اس ملک سے خاص فائدہ حاصل ہو یا اس کا نفوذ اور اثر بڑھ جائے۔

اس لئے طبعاً ایک دوسرے کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالتے تھے جن کی وجہ سے کوئی بھی اس کی طرف اقدام نہیں کرتا تھا۔ ان سب پر مزید طبیعی موانع تھے کوہستانی سلسلوں اور سر بفلک پہاڑوں کے سینوں کو چیرنا اور جگروں کو تراشنا آسان نہ تھا۔

ٹرانس پرشین ریلوے

جنگ عظیم کے بعد رضا شاہ پہلوی کی ہمت اور ملت کی کوشش سے جب ایران کا سیاسی اور اجتماعی افق اجنبیوں کے دسائس اور غیروں کی مداخلت سے صاف ہوا ساری قوم میں جوش عمل اور ترقی کا ولولہ موجزن ہوگیا رفتہ رفتہ ملک کی انتظامی حالت اور اقتصادی کیفیت ٹھیک ہوئی اور سالانہ آمدنی ایک ہزار ملین تومان سے آگے نکل گئی اس وقت بلند حوصلہ شاہ نے ملت کی اس اہم اور مفید ترین ضرورت کی طرف توجہ فرمائی اور بحر خزر (قزوین) سے لے کر خلیج فارس تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کا مقصد سامنے رکھا۔

پہلی کدال خود شاہ نے ۱۳۰۶ شمسی (۱۹۲۵ء) میں اپنے ہاتھ سے مار کر اس کام کا آغاز کیا اور پھر آخری پیچ بھی اپنے ہاتھ سے لگا کر ۱۳۱۷ شمسی (۱۹۳۶ء) اس کو مکمل کر دیا۔ اور یہ لائن بارہ سال کی پیہم کوشش اور محنت سے جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے تھے ایران کے جنوبی سرے سے شمالی سرے تک جاری ہوگئی۔ اور اہل ایران کی ہفتاد سالہ آرزو پوری ہوگئی۔ شمال اور جنوب دونوں جانب ان کا سلسلہ تجارت بحر خزر اور خلیج فارس سے مل گیا۔ اور اپنی آزاد بندرگاہوں سے مغربی اور مشرقی ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات وابستہ ہوگئے۔

یہ لائن بحر خزر کے ساحل بندر شاہ سے شروع ہو کر مازندران کے زرخیز میدانوں سے گذرتی، کوہ البرز کے درۂ تنگ تالار پہنچ کر وہاں سے فیروزکوہ کے بلند اور دشوار گزار پہاڑوں کے سیکڑوں ٹنلوں میں سے داخل ہوتی اور نکلتی ہوئی تہران پھر قم کے راستہ سے لرستان کے کوہستانی سلسلہ کو پار کرتی اندیمشک سے خوزستان کے سطح میدانوں میں آتی ہے۔ اور دزفول۔ اہواز اور دریائے کارون کے عظیم الشان پل سے گزرتی بندر شاہپور میں جو خلیج فارس کے ساحل پر ہے پہنچتی ہے۔ یہ کل مسافت ۱۳۹۴ کیلومیٹر ہے جو پہلے بہزار وقت و دشواری کم سے کم چالیس دن میں طے ہوتی تھی اور اب نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ صرف چالیس گھنٹوں میں اس سرے سے اس

سرے تک مال اور مسافر پہونچتے ہیں۔

اس تمام لائن کی تعمیر میں سوائے چند انجینیروں اور نقشہ برداروں کے جو مختلف مغربی ممالک سے بلا کر رکھے گئے تھے ایران ہی کے جملہ کارپرداز اور مہندس تھے۔ اور تیس ملین لیرہ (پاؤنڈ) کے صرفہ سے جس کا بڑا حصہ قند اور چائے پر محصول بڑھا کر وصول کیا گیا تھا حکومت ایران ہی کے سرمایہ سے اس کی تعمیر ہوئی۔ ایک پائی بھی باہر سے قرض نہیں لیا گیا۔

جب سے اس کا اجرا ہوا ہے ملکی تجارت میں وہ فروغ ہوا ہے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ علاوہ تجارت کے انتظامی معاملات میں بھی اس کی بدولت سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ رہزنی اور بدنظمی کا خاتمہ ہو گیا ہے تمام اقطاع میں امن وامان کا دورہ ہے اور کاروباری زندگی اور باشندوں کی معاشی حالت میں نمایاں ترقی ہو گئی ہے۔

یہ لائن موجودہ عہد کے انجینیرنگ کے عظیم الشان کارناموں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ ایسے ایسے سر بفلک پہاڑ راستہ میں پڑتے ہیں جن کے اوپر سے کبھی کوئی پرندہ بھی نہیں گزر سکا ہے۔ جب تک یہ تیار نہیں ہوئی تھی اس وقت تک خود ایران کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی یقین نہیں آتا تھا کہ البرز اور فیروز کوہ کے بلند پہاڑوں اور لرستان کے دشوار گزار کوہساروں سے گزرتی ہوئی ریلوے لائن ان کے ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پار کرے گی۔ اس میں دو سو چوبیس ٹنل بنانے پڑے ہیں جن کا مجموعی طول کل لائن کا ۶ فی صدی ہے۔ ان میں سے بعض بعض دو دو کیلومیٹر سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔ ان ٹنلوں کے علاوہ سینکڑوں پل بھی بنانے پڑے۔ جن میں سے دریائے کاروں۔ رود شور اور آبدیز وغیرہ کے پل بہت بڑے بڑے ہیں۔ شاہ بندر سے بندر شاہپور تک کل اسٹیشنوں کی تعداد ۹۰ ہے۔

یہ ساری لائن۔ اس کے انجن۔ اس کی گاڑیاں اور اسٹیشن یورپ کے جدید سے جدید ریلوے معیار کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ پانچ کارخانے بھی مختلف مقامات میں قائم کئے گئے ہیں جن میں نہ صرف بگڑے ہوئے انجنوں اور دیگیوں کی مرمت کی جاتی ہے بلکہ نئے بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ورکشاپ طہران کا ہے جو درجہ اول کا ہے۔ بقیہ اھواز۔ بندر شاہ۔ اندیمشک اور پل سپید ہیں۔ اراک اور دورود (بجریں) میں بھی دو کارخانے بن رہے ہیں جو عنقریب کام شروع کر دیں گے۔ ان کارخانوں میں ہر قسم کے جدید آلات ،

جرثقیل اور برقی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔

ریلوے کے متعلق ہر قسم کی تعلیم دینے کے لئے متعدد مدارس بھی کھول دئے گئے ہیں جن میں ایرانی طلبا کو تعلیم دے کر تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ملک کی ریلوں کو خود چلا سکیں اور غیر ملکیوں کی حاجت نہ پڑے۔

اس لائن کی تکمیل کے بعد دوسری دو لائنوں کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

(۱) تہران سے تبریز تک

معلوم ہے کہ تبریز سے جلفا تک ریلوے موجود ہے۔ تہران سے تبریز کو ملحق کر دینے کے بعد براہ راست دارالسلطنت کا تعلق قفقاز کے ساتھ ہو جائے گا۔

(۲) گرمسار سے سمنان تک۔

خیال یہ ہے کہ یہ آخری لائن رفتہ رفتہ لاکر زاہدان سے ملا دی جائے گی تاکہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی سلسلہ بڑھے۔

جملہ عالم اسلامی کے لئے مسرت کا مقام ہے کہ ترکی اور ایران ترقی کی شاہراہ میں سرعت کے ساتھ گامزن ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ کاش افغانستان کے متعلق بھی ہمارے کانوں میں دل خوش خبریں پہونچیں جو ہمارا سب سے قریبی پڑوسی ہے اور جس کی ترقی کا بہت کچھ اثر ہمارے اوپر پڑ سکتا ہے۔

اسلم جیراجپوری

ترکستان
دریائی خزر
تبریز
بندرشاہ
طہران
سمنان
افغانستان
اہواز
زاہدان
عراق
خلیج فارس
دریائی عمان
علامات
سرحدی خطوط
تیار ریلوے لائن
زیر تعمیر
سڑکیں
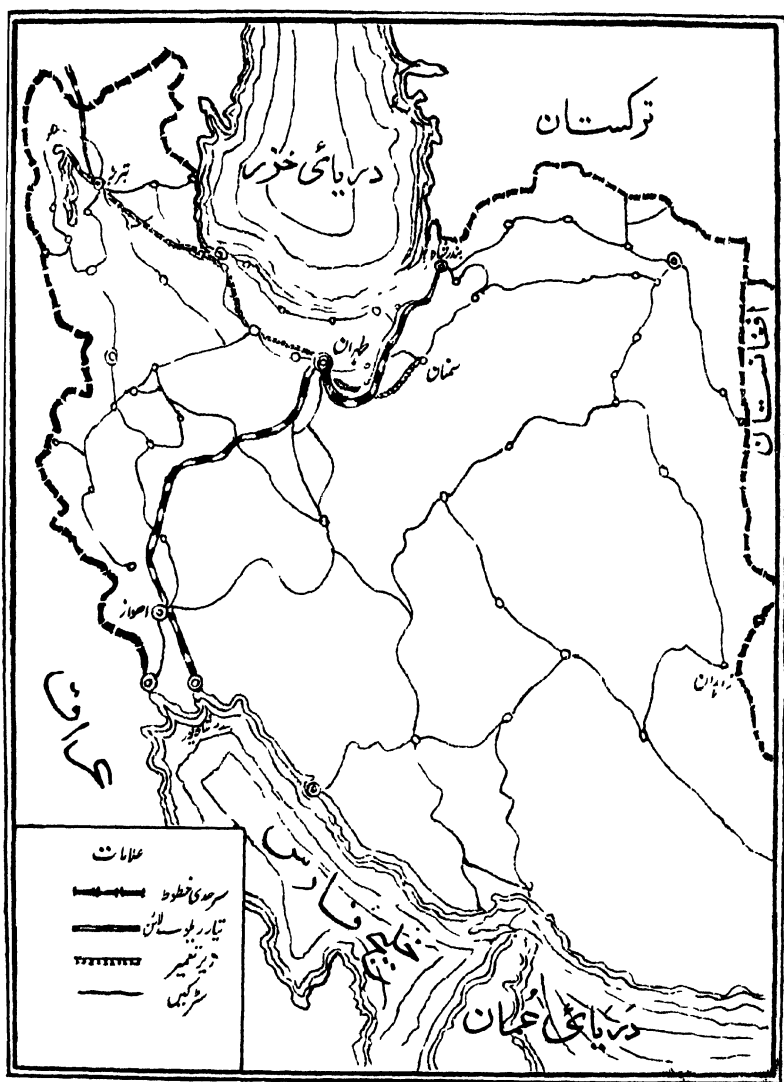
تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں

(از جناب عبدالغفور صاحب - استاد دوں کا مدرسہ جامعہ)

تعلیم کے مفہوم کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف ضرورتوں کی وجہ سے آدمی مختلف جوابی عمل اختیار کرتا ہے۔ اور پھر یہ جوابی عمل نئی ضرورت سے کسی نئے جوابی عمل کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس طرح انسان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے یعنی یہ کہ تعلیم انسان کی انفرادی نشو و نما اور تمدنی ماحول کی باہمی اثراندازی سے فروغ پاتی ہے۔

اب ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ تعلیم کا یہ عمل کیوں جاری رہتا ہے۔ کون سے ایسے عناصر ہیں جو تعلیم کے لئے بنیادی طور پر ضروری ہیں۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے عمل تعلیم کے سلسلہ میں کچھ اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اس کو زیادہ واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔

بچہ ایک نامی شخصیت رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ انفرادی طور پر بڑھنے اور ترقی کرنے کی چند موروثی اور جبلی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف وہ زندگی کی مختلف منزلوں میں ان ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر نسلی و تمدنی سرمایہ سے اپنے تجربہ اور معلومات کو برابر مالا مال کرتا جاتا ہے۔ وہ اپنے طور پر اپنی ان جبلی صلاحیتوں کے ذریعہ یہ تو جان سکتا ہے کہ سورج سے ہمیں گرمی اور روشنی پہنچتی ہے۔ آگ سے حرارت پہنچتی ہے۔ پانی ہماری زندگی کے لئے ایک لازمی چیز ہے۔ مگر وہ اپنے طور پر ان کی ماہیتوں کو نہیں سمجھ سکتا وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سورج ہمیں نہ صرف گرمی اور روشنی پہنچاتا ہے بلکہ وہ ہماری زندگی کے لئے خوراک بھی مہیا کرتا ہے اس میں وہ حیات بخش قوتیں پائی جاتی ہیں کہ اگر دنیا ان سے محروم کر دی جائے تو وہ زندگی کی نعمتوں سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ سورج کے متعلق جدید علمی تحقیقات کو صرف از خود ہرگز نہیں سمجھ سکتا بلکہ ممکن ہے کہ اگر اس کو جاہل رکھا جائے تو وہ سورج کے متعلق وہی توہمات قائم کرے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے اس کے دوسرے بھائی قائم کرتے چلے آئے ہیں اسی قسم کی بہت سی باتیں

ہیں جنھیں آدمی اپنے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ وہ صرف نسلی تجربہ سے ان کے وسیع معنوں کو سمجھ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اپنے طور پر تجربہ کرنے اور سیکھنے کے لئے چند بنیادی محرکات رکھتا ہے مگر سماجی ورثہ ہی کی بدولت ان کی تہذیب و تربیت سے آدمی متمدن انسانوں کی زندگی گزار سکتا ہے اگر تمدنی اثرات سے بچپن ہی سے آدمی کو محروم کر دیا جائے تو وہ اس وحشی انسان سے بہتر زندگی کی اہلیت اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ جو چند بنیادی احتیاجات و محرکات کے اثر سے اپنی جسمانی احتیاجات کو پورا کرتا ہے اور بس۔ انسانی زندگی میں اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

اس قسم کے واقعات سننے میں آئے ہیں کہ کوئی بچہ اتفاق سے جنگل میں رہ گیا۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ جنگل میں انسانی آبادی اور اثر سے دور گزارا۔ اب وہ نہ زبان سمجھتا ہے نہ آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ اور نہ ان کی طرح رہتا سہتا ہے۔ اس میں اور دوسرے جانوروں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ دور کیوں جائیں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے موازنہ سے ہم اس فرق کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں اس کے افراد کے لئے ترقی کرنے اور بڑھنے کے لئے زیادہ مواقع اور سہولتیں ہوتی ہیں مگر غیر متمدن ممالک میں افراد سماجی افلاس کی وجہ سے پسماندہ رہتے ہیں۔

یہاں پر تعلیم و تمدن کے مسئلہ کو چھیڑنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان ارتقا کی ہر ایک منزل میں چند ابتدائی بنیادی صلاحتیں رکھتا ہے اور ان میں ہر وقت ترقی و تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے مگر جیسا ماحول ملتا ہے آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے ویسا ہی کام لیتا ہے۔

اگر ہم نئی پود کے بہی خواہ ہیں، اس کی بڑھتی ہوئی زندگی اور جسمانی و ذہنی نشو و نما سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ بچہ کی صلاحیتوں کا مطالعہ کریں اور ان کی امکانی تربیت پر سوچیں اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر متوسط قابلیت کے انسان میں بہتر سے بہتر زندگی حاصل کرنے کی صلاحیتیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ علم، ترقی، اور تہذیب و تمدن کسی خاص فرد یا جماعت کی امتیازی خصوصیت نہیں ہے بلکہ نسل انسان کے تمام متوسط درجہ کے انسانوں میں بلا کسی نسلی اور ملی تفریق کے تعلیم و تربیت کی صلاحیتیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں تو پھر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان کی صلاحیتوں اور ان کے تربیتی امکانات کو بغور مطالعہ کریں۔ اور ان حالات

کو سمجھنے اور ان کو پیدا کرنے کی کوشش کریں جن کے ذریعہ قوم کا ہر فرد بہتر سے بہتر شہری بننے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم سے اپنے آپ کو اور انسانیت کو فائدہ پہنچائے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ بچہ کی زندگی کی ہر منزل میں ایک نمو پذیر شخصیت تسلیم کریں اور اس نمو پذیر شخصیت کو جس قسم کی ذہنی اور جسمانی خوراک کی ضرورت ہو اس کا مناسب خیال رکھیں اس لحاظ سے اگر بچہ کی زندگی کو ایک ننھے پودے سے تشبیہ دی جائے تو اگرچہ یہ تشبیہ مکمل نہیں کہی جا سکتی پھر بھی ہمیں اس سے بہت کچھ اندازہ بچہ کی بڑھتی ہوئی شخصیت کا ہو جائے گا۔

جس طرح پودا پھلنے پھولنے اور بڑھنے پھیلنے کے لئے اپنے اندر صلاحیتیں رکھتا ہے مگر اس کی قدرتی صلاحیتیں صرف اس وقت معیار ترقی کو پا سکتی ہیں جب اس کو مناسب وقت پر مناسب مقدار میں دھوپ، پانی اور کھاد وغیرہ دیا جائے۔ پودے کے راستہ میں بڑھنے کے لئے جو رکاوٹیں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں ان کو دور کرتے رہیں۔ کم و بیش اسی طرح انسان کے بچہ کا حال ہے۔

تعلیم اور انسان کی نمو پذیری

بچہ کی ابتدائی خامیوں اور ناتوانی کو دیکھ کر تربیت کرنے والوں نے یہ غلط اندازہ لگایا ہے کہ بچہ چکنی مٹی کے مانند ہے۔ اس کو آدمی جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ اس کی ساری زندگی کا دار و مدار معلم یا مربی کے منشا پر ہوتا ہے۔ اور معلم کو اس سے سروکار نہیں کہ بچہ کے اندر بڑھنے کے لئے کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کیا کیا محرکات ہیں۔ کیا وہ اپنے طور پر بھی کبھی تجربے کرنا اور سیکھنا چاہتا ہے؟ کیا وہ بھی اپنی خواہشات کی ایک چھوٹی سی دنیا رکھتا ہے اور ان کو پورا کرنے کی اسے دھن ہے۔ ہمارے معلم نے ابھی تک اس طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ تعلیم کو اس غرض سے نہیں دیکھتا کہ تعلیم بچہ کی زندگی کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کو بچہ اپنے طور پر بھی پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے طور پر بھی سیکھنے کی خواہش رکھتا ہے معلم کا کام یہ ہے کہ وہ بچہ کی اس ضرورت کو سمجھے۔ اس کی حدود کو بھانپ لے اور ان حدود کے اندر اندر بہتر سے بہتر طریقہ پر اس کی مدد کرے۔ وہ بچہ کے چنچل پن، اس کی شوخی، اس کی تیزی، طراری اور چلبلے پن

کو تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں نہ سمجھے۔ وہ اپنے ارادے اور بچہ کے ارادے کو دو متضاد چیزیں خیال نہ کرے۔ بچّہ کی ذاتی اپج اور دلچسپیوں کا لحاظ کرے۔ معلم کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ بچہ بھی اپنی طرف سے سیکھنے اور تجربہ کرنے کا اقدام کر سکتا ہے۔ اس لئے بلا کسی امتیاز کے معلم بچہ کے تمام مشغلوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہ دیکھے تعلیم اور بچہ کے مشاغل دو متضاد چیزیں نہیں ہیں ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ موجودہ تعلیم کی بڑی خرابی تو یہ ہے کہ اس میں بچہ کی زندگی کے دو حصے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو بچہ گھر پر گزارتا ہے۔ ساتھیوں میں کھیلتا ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی علمی دلچسپیاں دکھتا ہے۔ دوسرا رخ اس کی زندگی کا یہ ہے کہ وہ مدرسہ جاتا ہے کتابیں پڑھتا ہے۔ مختلف مضامین سیکھتا ہے۔ اور مروجہ دستور کے مطابق زندگی کی تیاری کرتا ہے۔

بچہ کی شخصیت میں اس قسم کی دوئی ہرگز نہیں پائی جاتی۔ بچہ ایک مجموعی شخصیت رکھتا ہے گھر اور مدرسہ پر وہی شخصیت مجموعی طور پر بڑھتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر اثرات قبول کرتی ہے۔ اس لئے بچہ کے گھر اور مدرسہ میں قریبی تعلق ہونا ضروری ہے۔ بچہ کی تعلیم اس کے قریب ترین ماحول سے شروع ہونی چاہیئے۔ جیسے جیسے ذہنی وسعت پیدا ہوتی جائے گی ماحول کا دائرہ بھی بڑھتا جائے گا اور بچہ کی تعلیمی جولانگاہ بھی وسیع تر ہوگی اس لئے معلم یا مربی کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی ضرورت کو سمجھے، ان کے قریب ترین مشاغل اور ذاتی دلچسپیوں سے واقف ہونے کی کوشش کرے اور ان کی روشنی میں بچہ کی تعلیم و تربیت کا ہر موقع پر اہتمام کرے۔

تعلیم کو ابھی تک بہت تنگ معنوں میں لیا گیا ہے۔ تعلیم کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ آدمی کو شہری زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ بچہ کے سامنے کسی نہ کسی طرح سماج کا نقطۂ نظر پیش کیا جائے چنانچہ اس بنا پر اس کے ساتھ نئے رنگروٹ کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ تمام قواعد اور ریاضتیں کرائی جاتی ہیں جو کسی نئے فوجی کو کرنی ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو شاید تعلیم اس سے بھی زیادہ محدود معنوں میں لی گئی ہے یعنی یہ کہ نوجوانوں کو نوکریوں کے لئے تیار کیا جائے اگر ملک کے کسی مخصوص طبقہ کے لئے فوجی تعلیم کی طرح اس مخصوص قسم کی تعلیم کا انتظام کرایا جاتا تو بھی ایک معنی رکھتا مگر یہاں تو اندھا دھند سارے ملک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اور نہ معلوم کب تک جاری رہے گا۔

اس ناقص نظام تعلیم سے جتنا قومی نقصان ہمارے ملک کو ہوا ہے اس کا اندازہ ہماری قوم کی ذہنی اور علمی کم مائیگی سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ غرض ہماری تعلیم میں کبھی اس قسم کی منظم کوشش نہیں کی گئی کہ تعلیم سماجی مصلحتوں اور انفرادی صلاحیتوں کی بنا پر دی جائے۔

سماجی حیثیت کو پھر بھی تسلیم کیا گیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کا استعمال غلط طریقہ سے ہوا ہے اور اس میں بچہ کی ذات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بچہ کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو سماج کے عام سانچہ میں ڈھال دیا جائے۔ بچہ میں خود سماج سے متاثر ہونے اور اس کا نادیدہ نگاہ سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ مگر جس طریقہ سے سماج کے سرمایہ کو پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل پھیکا اور خشک ہے۔ اس میں بچہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ سماج کے کاموں میں سادہ طور پر شرکت کرے اور اس طرح سماج کی روح کو سمجھے بلکہ غیر فطری دباؤ کے ماتحت سماج کی بعض مسلمہ باتوں کو مجرد شکل میں بچہ پر تھوپ دیا جاتا ہے۔

جس طرح آدمی تیرنا تیرنے سے سیکھتا ہے اسی طرح سماجی زندگی کو سماج کے مشاغل اور اداروں میں براہ راست شرکت کرنے سے سیکھتا ہے۔ اور صرف اسی صورت میں بچہ حقیقی معنوں میں تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ غرض سماجی اداروں کے ذریعہ ہی بچہ کو علمی و تمدنی سرمایہ سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ اس لئے جب مدرسہ میں الگ الگ مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچہ اس میں اپنی کچھ دلچسپی نہیں پاتا تو وہ یا تو پڑھنے سے جی چراتا ہے یا بیگار سمجھ کر استاد کے ڈر سے لگا رہتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو متواتر کئی گھنٹے بے معنی چیزیں رٹائی جائیں اگرچہ بالغ کے لئے یہ بامعنی ہیں لیکن بچوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس کی ضرورت کو نہیں سمجھتے اس لئے جب بچے پڑھنے سے پہلوتہی کرتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں پر شبہ کیا جاتا ہے مگر معلم یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ان کو آزادی دی جائے تو ان میں خود بخود اندرونی ضبط کی تربیت ہوسکتی ہے۔ اس لئے بچہ سے مکمل خاموشی، تابعداری اور فرمانبرداری کی امید اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کی قیمت پر کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی پابندیاں بہت نیک نیتی کی بنا پر کرائی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ یہ خیال

"جو راستاد بہ ز مہر پدر" خلوص نیت سے رکھتے ہیں مگر بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہ نظریہ بچہ کی فطرت اور قدرتی صلاحیتوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم بچہ کی فطری نمو پذیری اور اس کے قوانین سے واقف ہوتے تو ہم تعلیم و تربیت کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو اپنے طرز عمل سے نقصان نہ پنہچاتے احساس کے ارادوں ۔ خواہشوں ۔ فیصلوں، جذبات اور خیالات کا احترام کرتے۔

بچہ اپنی دوڑ دھوپ سے کھیل کود سے، اشیاء کے جوڑ توڑ سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات اور خواہشات رکھتا ہے ۔ ارادے اور مقاصد رکھتا ہے ۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اپنے ماحول میں تصرف کرنا چاہتا ہے اور اس طرح سے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہتا ہے ۔ اس کے اندر مخفی قوتیں ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں اظہار چاہتی ہیں ۔ خارجی افعال کے ذریعہ اپنی تربیت و تکمیل چاہتی ہیں ۔ اور یہ محرکات بچہ کے لئے اس قدر قدرتی ہیں جس طرح بھوک اور پیاس ہیں ۔ یہ وہ محرکات ہیں جن کی تربیت سے آدمی مہذب انسان بن سکتا ہے اور جن کی طرف سے غفلت برتنے سے انسان وحشی سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا ۔ ان کی صحیح تربیت سے انسان میں وہ خوبیاں اور مہارتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو متمدن زندگی کا لازمہ ہیں غرض یہ محرکات اور جبلی صلاحیتیں ابتدائی حالت میں کتنی ہی خام اور ناتمام کیوں نہ ہوں ان میں ترقی اور اصلاح کی اس قدر گنجائش ہے جس کا اندازہ ہم اپنی اور دوسروں کی زندگی کے مشاہدہ سے کر سکتے ہیں آغاز میں دیکھیے تو انسان کا بچہ اپنی زندگی کے لئے دوسروں کا کس قدر محتاج ہوتا ہے مگر وہی عاجز و ناتواں مخلوق تربیت پاکر وہ کچھ کر سکتا ہے جس کا کہ آدمی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ۔ غرض انسان جبلی طور پر بڑھنے ۔ ترقی اور اصلاح کرنے کے لئے چند بنیادی محرکات اور صلاحیتیں رکھتا ہے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدرتی محرکات کیا ہیں جن کو کام میں لاکر بچہ کی تربیت کی جا سکتی ہے ۔

اگر یہ ممکن ہوتا کہ آدمی پیدائشی طور چند محدود محرکات رکھتا جن کے اثر سے انسان کا جوابی عمل متعین ہو جاتا تو انسان کی تعلیم و تربیت کے متعلق چند مخصوص بنیادی محرکات کی روشنی میں آسانی سے پیشبندی کی جا سکتی تھی ۔ مثلاً یہ کہنا آسان ہوتا کہ مخصوص حالات پیدا کرنے سے آدمی مخصوص قسم کا طرز عمل اختیار کرے گا مگر یہ بنیادی تحریکات کوئی ایسی شے نہیں ہیں جن کی طرف ہمیشہ کے لئے انسان کے طرز عمل کو

منسوب کیا جا سکے کیونکہ انسان کے یہ محرکات علم اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دوسری تحریک اپنے اثرات کے اعتبار سے پہلی تحریک سے مختلف ہوتی ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ماخذ ایک ہی ہو۔ مثلاً بچہ میں بھوک کے لئے کھانے کی خواہش ایک بنیادی تحریک ہے مگر وہ شروع میں کھانے کے لئے جن چیزوں کو پسند کرتا ہے بڑھنے پر ان کو چھوڑتا جاتا ہے بچپن میں بچہ کو اگر کریلا دیا جائے تو شاید کڑواہٹ کی وجہ سے اسے تھوک کر منھ سے پھینک دے مگر جیسے جیسے مختلف کھانوں کا اسے موقع ملتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کا ذوق بدلتا جاتا ہے اب یہ سوال نہیں ہوتا کہ آدمی بھوک کی وجہ سے کھانا چاہتا ہے بلکہ وہ خاص قسم کا کھانا کھانا چاہتا ہے۔ مختلف کھانوں میں ایک خاص قسم کا امتزاج چاہتا ہے۔ اس لئے ترقی و تبدیلی کے اعتبار سے انسان بہت سی وسعتوں کا مالک ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے لئے عجیب و غریب صلاحیتیں رکھتا ہے اس لئے چند نفسی سانچوں میں اس کو محدود کرنا مشکل ہے۔ تاہم انسان کے ذاتی رجحانات کا اندازہ کرتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان خاص موقعوں پر خاص محرکات سے غالباً کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرے گا۔

اس سلسلہ میں جس طرز عمل کے متعلق زیادہ صحت و یقین کے ساتھ پیش گوئی کی جا سکتی ہے اس کو فعل اضطراری کہتے ہیں یعنی وہ فعل جو بہت حد تک غیر ارادی ہو گر ہمارے شعور سے خارج نہ ہو۔ ایسی صورتوں میں آدمی کسی خاص ہیجان کے لئے خاص جوابی عمل دینے پر مجبور ہوتا ہے جیسے تیز بجلی چمکنے میں ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں لیکن ایسے اعمال انسان کی زندگی میں بہت تھوڑے ہیں بلکہ وہ بیشتر طور پر اپنے ارادہ سے خاص حالات کے اندر کوئی خاص عمل یا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ اور طرز عمل میں بنیادی محرکات کا اس طرح پابند نہیں ہوتا جیسے بیشتر جانوروں کے معاملہ میں ہم نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شیر یا چیتے کو چھیڑا جائے تو اس کے پہلے محرک یعنی غصہ کا جوابی عمل پنجہ مارنا ہوتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ اس کے بہت مختلف ہوتا ہے اس کا یہ جوابی عمل صرف جبلی تحریک کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس میں عادات اور گزشتہ تجربے کارفرما ہوتے ہیں چنانچہ ابتدا میں بہت کچھ کام بچے اپنے فوری جذبہ کے ماتحت کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض جاہل اور غیر مہذب لوگ بھی اپنے ابتدائی محرکات کے اثر سے بہت جلد کچھ نہ کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔ مگر مہذب

اور تجربہ کار آدمی بہت سے عادات پیدا کرتے ہیں۔ اپنے بہت سے جذبات پر قابو پاتے ہیں بہت سی ناپسند عادتوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کا فیصلہ بیشتر جچا تلا ہوتا ہے۔ بچوں کو زندگی کا تجربہ کم ہوتا ہے۔ ان کی عادتیں ناپختہ ہوتی ہیں اور معلومات محدود اس لئے ان کے کاموں اور مشغلوں میں بے ساختگی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے عادات بھی کوئی مخصوص شکل اختیار کرنے لگتی ہیں وہ اپنے کاموں کو نتائج کی رو سے جانچنے اور عقل کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں مثلاً جب چھوٹے بچے فٹ بال کھیلتے ہیں تو شروع میں گول کرنا اور دوسری جماعت کو ہرانا اپنا مقصد سمجھتے ہیں مگر ذرا سی دیر میں گول کرنے کا مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ گیند مارنا اپنا مقصد سمجھنے لگتے ہیں اپنی مقررہ جگہوں کو چھوڑ چھوڑ کر بال کے ارد گرد جم جاتے ہیں۔ اس مثال میں بچے گول کرنے کے مقصد کو بھول جاتے ہیں بلکہ چونکہ ان میں قوت ہے لہذا قوت کے اظہار سے اس طرح اطمینان حاصل کرتے ہیں کہ لات مارنے سے گیند کتنی دور تک گئی۔ جیسے جیسے ان کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کا خیال کرنے لگتے ہیں۔ منظم طور پر کھیلنے سے انھیں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے وہ کسی مقصد پر دیر تک قائم رہنے کے عادی ہونے لگتے ہیں۔ کسی مشغلہ پر دیر تک سوچ سکتے ہیں۔ اور زیادہ یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ یہ سب رجحانات۔ عادت اور تجربہ سے مناسب عمر میں بچہ میں نشو و نما پاتے ہیں۔

یہ بات کہ ابتدائی محرکات زندگی کے آخری محرکات نہیں ہیں بلکہ یہ چند اساسی رجحانات ہیں جن کی تشکیل آئندہ زندگی کے مواقع اور تجربات پر اپنا دارومدار رکھتی ہے۔ ایک چھوٹے بچہ کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔ بچوں کو ناآشنا چیزوں سے ایک قدرتی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک سمجھ دار دایہ چھوٹے بچہ کی اس خاصیت سے اسی کے نہلانے اور صاف رکھنے میں اس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ دایہ ایک چھوٹے سے ٹب میں پانی ڈالتی ہے اس میں تھوڑا سا صابن گھول لیتی ہے۔ صابن کو گھولنے کے بعد ایک باریک نلکی سے اس میں بلبلے پیدا کرتی ہے۔ بچہ ان بلبلوں کو دیکھتا ہے اور بہت ذوق و شوق سے پانی کی طرف لپکتا ہے پانی کا درجہ حرارت معتدل ہے پانی میں وہ بلبلوں کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے اسے اس تجربہ سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس خوشی میں پانی کا خوف بچہ کے ذہن سے اتر جاتا ہے۔ شروع میں تو بلبلوں

کے لالچ سے بچہ پانی میں ہاتھ پیر مارتا ہے لیکن بعد میں پانی میں ہاتھ پیر مارنے سے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس طرح نہانے سے اسے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے اب وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مقررہ وقت پر نہانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کو صفائی اور غسل کرنے کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اس کو نہانے کو نہ ملے تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اس مثال میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح محرکات بدلتے جاتے ہیں۔ شروع میں آدمی جس تحریک سے کوئی کام کرنے لگ جاتا ہے بعد میں اس کام یا مشغلہ کے دوران میں خود بخود ایسی تحریکیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جو کرنے والے کو اس کو جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہیں اس مثال سے ہم نے دیکھا کہ کس طرح جبلی محرکات عادات اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ شروع میں آدمی کے جوابی عمل بالکل شعوری محرکات سے طے ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے آدمی اپنی سیرت کی تدریجی تشکل کے دوران میں ان ابتدائی محرکات کی تربیت کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ بعد میں جا کر نہ وہ صرف عادات اور فوری محرکات سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ وہ سوچ سمجھ کر بھی بہت کچھ اپنے طرز عمل کو طے کرتا ہے۔ چنانچہ جتنا زیادہ آدمی کام سمجھ بوجھ سے لیتا ہے اتنا اس کا کام زیادہ با تربیت اور جچا تلا ہوتا ہے۔ اس کے کام میں بے ساختگی اور من موجی پن کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر قدم کسی متعین منزل کی طرف بڑھا ہوتا ہے۔ اور اس کا ہر ایک کام کسی طے شدہ خاکہ کا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ محرک شعوری Impulse خواہش، مقصد، ارادہ یہ سب محرک کی مختلف صورتیں ہیں جو سوچ بچار اور جبلی محرکات کے اثرات کی نسبتی کمی بیشی سے مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ہمیں ان مختلف الفاظ کی تشریح سے معلوم ہو جائے گا کہ سوچ بچار کس طرح جبلی محرکات کو بدلتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ محرک یا فوری جذبہ ہوتا ہے جس میں آدمی ایک دم بے ساختہ طور پر کسی کام کو کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے جیسے بچہ کھلونے کو دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکنے لگتا ہے اس صورت میں بچہ جو کچھ کرتا ہے اس سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر یہ آگاہی بالکل وقتی ہے۔ ذرا سی دیر میں اگر وہ چیز نظر سے غائب ہو جائے تو اسے بھول جاتا ہے دوسری بات ہے مقصد۔ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مقصد کی حالت میں طلب کی یہ کیفیت دیر تک رہتی ہے اس میں اس طلب کو پورا کرنے میں سوچ بچار کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس میں بچہ نہ صرف کسی چیز کو حاصل

کرتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں حاصل کرنے کے خاص خاص امکانات ہوتے ہیں۔ وہ ان امکانات کو سوچتا ہے۔ اور حصول مقصد کے لئے ذرائع سوچتا ہے مثلاً کسی چھوٹے بچہ کو اس کا باپ ایک خوبصورت تصویر دکھاتا ہے بچہ خوش ہوتا ہے اسے حاصل کر کے کچھ دیر تک اپنے پاس رکھتا ہے باپ اس کی توجہ کو ہٹا کر تصویر اٹھا لیتا ہے اس اندیشہ سے کہ شاید بچہ تصویر خراب کر ڈالے۔ بچہ کو تصویر یاد آتی ہے۔ اس کے لینے پر اصرار کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ماں کے پاس تصویر دلانے کے لئے دوڑتا ہے۔ کسی اور قریبی رشتہ دار کو تصویر دلانے کے لئے آمادہ کرتا ہے اب یہ بچہ نہ صرف کسی فوری تحریک کے اثر سے کسی دیکھی ہوئی تصویر کو اٹھاتا ہے جیسے پہلے مثال میں ہم نے دیکھا بلکہ اس صورت میں تصویر غائب ہونے پر بھی تصویر کا تصور اس کے دماغ پر حاوی ہے۔ وہ تصویر دوبارہ حاصل کرنے کے لئے نئے طریقے سوچتا ہے۔ تصویر کی یاد برابر اسے ستاتی ہے۔ اس صورت میں بچہ زیادہ غور و فکر اور اپنے گزشتہ کامیاب تجربوں سے فائدہ اٹھاتا ہے مثلاً جب وہ دیکھتا ہے کہ اتا اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی۔ تو اماں کے پاس دوڑتا ہے۔ ان کو پریشان کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطالبہ اماں کے ذریعہ پورا کرانے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ارادہ کی صورت میں جوابی عمل اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہاں پر کسی کام کے کرنے کے لئے صرف ایک محرک نہیں ہوتا بلکہ کئی محرکات ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں مثلاً ایک بچہ مدرسہ بھیجا جاتا ہے راستے میں وہ دوسرے لڑکوں کو کھلے میدان میں مزے سے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ کھیلنے کے لئے جی بہت للچاتا ہے مگر کیا کرے مدرسہ نہ جائے تو والد ناراض ہوں۔ بچہ نیک طبیعت کا ہے۔ وہ والد کی ناراضگی کا بھی خیال کرتا ہے ادھر گلی ڈنڈے کی لالچ اور ساتھیوں کا بلاوا پھسلا رہا ہے۔ آخر کیا کرے۔ اس کشمکش کی حالت میں وہ تھوڑی دیر رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ والد کا ناراض کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مدرسہ ہی چلنا چاہیئے۔ یہاں پر بچہ کو دو کاموں میں سے ایک کام کو ترجیح دینی پڑی۔ جب ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو اس صورت میں محض جبلی محرکات یا جبلی محرکات پر مبنی عادتیں آدمی کے طرز عمل میں فیصلہ کن نہیں ہوتیں بلکہ اسے کسی خاص رد عمل کے اختیار کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سوچنے میں وہ اپنے گزشتہ عادات یا جبلی محرکات سے اثر قبول کرے کیونکہ آدمی جب کسی نئی مشکل سے دوچار ہوتا ہے

اور اسے حل کرنے کے لئے سوچتا ہے تو عام طور پر وہ اپنے گذشتہ علم اور تجربہ سے جس کی مدد سے وہ ایسے موقعوں پر کامیاب ہوا ہے کام لیتا ہے اور جب وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملتا تو اس کی روشنی میں احتیاط سے کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

تعلیم اور جبلت

گزشتہ سطروں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جبلتیں بجائے خود ایسی محرکات نہیں ہیں جو ہمیشہ کے لئے ہماری زندگی پر حاوی ہوں۔ ان کے متعلق تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کے لئے ابتدائی محرکات کا کام دے سکتی ہیں۔ پھر جیسے جیسے تجربہ بڑھتا جاتا ہے ان کا اثر گھٹتا جاتا ہے آدمی نیا ذوق پیدا کرتا ہے۔ نئی عادتیں سیکھتا ہے۔ نئے مقاصد بناتا ہے۔ نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اس لئے شروع کی عادتیں مقاصد مشاغل اور دلچسپیاں نئی حاصل شدہ دلچسپیوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور نئے پیدا شدہ محرکات آدمی کی زندگی میں مدد دیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آدمی کی اندرونی صلاحیتوں اور رجحانات پر بھروسہ کر کے ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ ان کی نشو و نما خود رو ہو۔ کیونکہ یہ تبدیلی و ترقی کبھی خود بخود نہیں ہوا کرتی اس کے لئے خاص ماحول خاص اہتمام اور خاص طریقۂ کار کی ضرورت ہوتی ہے جب جا کے کہیں حسب منشا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس لئے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انسانی جبلت بالکل صحیح ہے اور اس کی آزادی ہی تعلیم و ترقی کے لئے کافی ہے وہ انسانی جبلت سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھتے ہیں جس طرح وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی فطرت بری ہے اس کو بدلنا چاہیئے۔ اور اس بنا پر بچہ کی خواہش اور منصوبہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور اس پر پابندی لگانا چاہتے ہیں اپنے خیالات میں زیادہ یاس مشرب ہیں اسی طرح اول الذکر لوگ زیادہ آس مشرب ہیں چنانچہ اول الذکر گروہ کا ایک ممتاز عالم روسو سماجی اثر پذیری کے خلاف بغاوت کر کے کہتا ہے "خدا نے آدمی کو پیدا کیا مگر سماج نے آدمی کو بگاڑ کر شہری بنایا" لیکن ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال ہے کہ انسان نہ فطرتاً برا ہے کہ اس کی ہر ایک امنگ کو دبایا جائے اور نہ اتنا سلیم الطبع ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے طور پر بغیر

رہنمائی کے بہتر راہ نکال سکے اور اچھا اور کامیاب انسان بن سکے۔

انسان تہذیب و شائستگی کے لئے صلاحیتیں ضرور رکھتا ہے مگر تعلیم و تربیت کے بغیر وہ جلا نہیں پاسکتیں۔ چنانچہ ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں بچہ کو تعلیم و تربیت کا موقع نہیں ملا ہے وہاں باوجود آزادی کے جانوروں سے کچھ بہتر زندگی نہیں گذارتا اس لئے تہذیب و شائستگی، عمدہ خیالات، پاکیزہ عادتیں، اچھا ذوق، بلند مقاصد اور عمدہ مہارت اور کاریگری بغیر مناسب ماحول اور تعلیم تربیت کے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتے آج سماج تہذیب و ترقی کے جس معیار پر پہنچ گیا ہے اس نے اور بھی اس بات کو لازمی کر دیا ہے کہ انسان کی تربیت کے لئے ایسا مخصوص ادارہ ہونا چاہیئے جہاں پر وہ شہری زندگی کے لئے بہتر طریقہ پر تیاری کر سکے۔ یہ تربیت صرف کہنے سننے سے عمل میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے لئے تو ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں بچہ سماج کے مختلف مشاغل سے آشنا ہو جائے۔

اس لئے مدرسہ یا تعلیم گاہ ہمارے سماج کا بہترین نمونہ ہونا چاہیئے۔

بچہ کی قدرتی صلاحیتوں کی تربیت بذریعہ سماجی ماحول کے سلسلہ میں امریکہ کا ممتاز فلسفی اور ماہر تعلیمات جان ڈوئی کہتا ہے "بذات خود قدرتی جبلتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں کیونکہ انسان اپنی دلچسپیوں میں سماجی ماحول سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ عقاب اور شیر کی مثال میں غصہ کو براہ راست زندگی کے بچاؤ اور برقرار رکھنے کا مفید ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے مگر انسان کی زندگی میں یہ جبلت بالکل بے معنی سی چیز رہ جاتی ہے۔ اگر اس کو سماج کی اثر اندازی سے الگ سمجھا جائے تو ایسی حالت میں غصہ بھڑاس کے بے کار اخراج سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ غصہ میں اس وقت معنی پیدا ہو جاتے ہیں جب وہ سلگنے والا رنج ہو۔ ایک اندرونی کوفت اور خلش ہو۔ ایک اکسانے والی تحریک ہو۔ ایک خوفناک انتقامی جذبہ ہو یا ایک بھڑکنے والا شعلہ ہو۔ اگرچہ یہ باعنی مظاہر پیدائشی تحریکات کے رد عمل سے پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ سماج کے جوابی طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں یہ اور اس قسم کے دوسرے اشتعال انگیز مظاہر محض جبلی نہیں ہیں بلکہ یہ عادتیں ہیں جو دوسروں کے تعلق سے بن گئی ہیں۔ اور یہ دوسرے لوگ بھی اپنی مخصوص عادتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی عادتوں میں غصہ کی اندھی قوت کو خاص مواقع پر استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں کچھ معنی پیدا ہو جاتے ہیں"

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری جبلتوں کی تربیت اور ہماری عادتوں کی تشکیل کس قدر سماجی اثرات کی مرہون منت ہے۔

قدرتی صلاحیتوں کے بارے میں اس قدر بیان کرنے کے بعد اب ہم ان کو صاف طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نفسیات کی اصطلاح میں ان تمام صلاحیتوں اور رجحانات کے لئے ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ جبلت کہلاتا ہے۔ صاف اور سادہ لفظوں میں "جبلت" سے مراد انسان کے وہ موروثی رجحانات ہیں جو خاص خاص مواقع پر کم سے کم تحریک سے خود بخود کوئی خاص جوابی عمل پیدا کرتے ہیں مثلاً بچہ کو یکایک زمین پر گرانے سے ڈر لگتا ہے اسی طرح کسی آدمی کی خودداری کو ٹھیس لگانے سے اس کو غصہ آتا ہے۔ اور وہ انتقامی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا اگر کسی کو قید تنہائی دی جائے تو وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی محبت کو ترستا ہے یہ اور اس قسم کی دیگر جبلتیں انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے ابھارنے سے آدمی کسی خاص طرز عمل کے اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جبلت کے سمجھانے کے لئے جب اس قسم کی مثالیں دی جاتی ہیں تو اس پر یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ اصلی اور پیدائشی رجحانات نہیں ہیں بلکہ یہ چند حاصل کردہ عادتیں ہیں جن کو انسان نے اپنے تجربہ سے حاصل کیا ہے مثلاً بچہ گرنے سے اس لئے ڈرتا ہے کہ شاید وہ اس سے قبل یہ تلخ تجربہ اٹھا چکا ہو۔ یا آدمی قید تنہائی اس لئے محسوس کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک ماں باپ بھائی بہن، عزیز اقارب اور دوستوں کے ساتھ رہ چکا ہے اور ان سے لطف اندوزی حاصل کی ہے اس لئے جب اسے ان کی صحبت کی خوشی سے محروم کیا جاتا ہے تو اس پر اداسی چھا جاتی ہے پروفیسر وڈرتھ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جبلت" کے سمجھنے میں اس قسم کی الجھنیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم عادات اور جبلتوں کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جبلت ہی ہے جو عادت کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے۔ جبلت ہی پر تو عادت، تجربہ، اور تعلیم کا سارا قصر تعمیر کیا گیا ہے۔ کھانے کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک عادت ہے کیونکہ یہ تو ہر جاندار کی ایک لازمی ضرورت ہے مگر یہ عادت بھی ہے اس لئے

آدمی کو خاص وقتوں میں بھوک لگتی ہے۔ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص چیزیں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خاص خاص لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا ہے۔ غرض کھانا ایک طبعی ضرورت کے ساتھ ایک عادت بھی ہے اور آدمی میں ترقی اور اصلاح کی جتنی گنجائش ہے وہ کھانے میں بھی موجود ہے۔
اسی مطلب کو پروفیسر میکڈوگل نے اپنی کتاب social Psycology میں یوں واضح کیا ہے کہ بالواسطہ یا براہ راست جبلتیں آدمی کے تمام اعمال کے لئے اولین محرک ہیں۔ کسی جبلت کی بے ساختہ تحریک یا جبلت کے ذریعہ حاصل شدہ عادت کی تحریک سے ہر ایک مشغلہ شروع ہوتا ہے اور اختتام کو پہنچتا ہے۔ جبلی تحریکات آدمی کے مقصد کو متعین کر دیتی ہیں اور اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کو قوت دیتی ہیں۔

غرض انسان عام جانوروں کے برخلاف بہت سادہ جبلتیں لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قدم قدم پر اسے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی شائستگی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تطابق کی کتنی صلاحیت ہے۔ وہ کسی نئے کام کو کس قدر آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ موقع پڑ جانے پر وہ اپنی عادتوں کو کیسے بدل سکتا ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ کس طرح نباہ کرتا ہے اس کی شخصیت میں کس درجہ اثر اندازی اور اثر پذیری کی اہلیت پائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ

ان سادہ اور خام جبلتوں کی وجہ سے شروع میں انسان اپنے ماحول کے اندر بالکل بے بس ہو جاتا ہے اگر ماں باپ کا سہارا نہ ہو تو شاید چند گھنٹوں سے زیادہ دنیا میں نہ رہ سکے یہ دوسری بات ہے کہ بالقوۃ وہ اپنی انھیں خام صلاحیتوں کی بدولت بہت تھوڑے عرصہ کے اندر مناسب ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر سے تمدن کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر دوسرے جانوروں کا پہنچنا مشکل ہے۔ حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جانور پیدائشی طور پر بہت سی مہارتیں جانتے ہیں مثلاً بعض بھڑوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی گزشتہ تجربہ یا نقل کے اپنے لئے ایک مخصوص قسم کا چھتہ تیار کرتی ہیں جس میں مادہ انڈے دیتی ہے اور اس طرح یہ خاص طرز کا گھونسلہ ایک نسل سے دوسری نسل تک بغیر وراثت کے اس طرح چلتا ہے کہ دوسری نسل کو پہلی نسل کی کاریگری کا کچھ پتہ نہیں لگتا اس لئے کہ دوسری نسل کے انڈوں

سے برآمد ہونے سے قبل ہی پہلی نسل مرجاتی ہے۔

دور کیوں جائیں کتے کو دیکھئے بغیر کسی گزشتہ تجربہ اور مشق کے پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ یہی حال بطخ کا ہے۔ مگر انسان کی تربیت کے لئے قدرت نے اس کو ایسی خام صلاحتیں بخشی ہیں جن کی صحیح تعلیم و تربیت سے وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ تعلیم و تربیت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس کے دو بڑے حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو انسان کی خام صلاحیتیں" یا "جبلتیں" جن میں عمر اور تجربے کے وقت بوقت تبدیلی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف سماج یا معاشرتی ماحول کا ہمہ گیر اثر ہے جس سے جاہل اور عالم سبھی متاثر ہوتے ہیں اور جن کے مقررہ اداروں، رسوم اور روایات و دستور کے سانچہ میں قوم کے اخلاق و عادات، علم اور تجربہ ڈھل جاتے ہیں۔ اور انھیں کے ذریعہ افراد کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے۔ اس مطلب کو پروفیسر جان ڈوئی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی کتاب "Human Nature & Conduct" میں سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں "بچہ کی منتشر اور غیر مربوط تحریکیں کبھی بروئے کار نہیں آ سکتیں جب تک ان کو سماجی نگرانی اور تعلقات سے رنگا نہ جائے۔ اس کی ابتدائی تحریکیں یا کاوشیں دراصل اپنے اسلاف اور بزرگوں کے مزید علم اور پختہ مہارتوں کو جذب کرنے کے لئے نقطہائے آغاز ہیں۔ یہ وہ ریشے ہیں جو اس غرض سے پھیلے ہوتے ہیں کہ وہ سماج کے دستور و آئین سے وہ خوراک حاصل کریں جس کے سہارے پر وہ آزاد و مستقل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو موجودہ سماجی قوت کو انفرادی قابلیت میں تبدیل کر رہے ہیں یہی تعمیر نو کے ذرائع ہیں۔

"پاکستان"

(اس مضمون کو جن بزرگ نے ہمارے پاس رسالہ جامعہ میں اپنے نام سے شایع کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا بعد میں ان کی یہ ہدایت ہمیں موصول ہوئی کہ یہ مضمون ان کے نام سے شایع نہ کیا جائے بلکہ ان کے چھوٹے بھائی کے نام سے شائع کیا جائے جو کالج میں تعلیم پا رہے ہیں ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے کہ ایک زیر تعلیم نوجوان کے نام کے ساتھ ان کے بڑے بھائی کے وہ خیالات خواہ مخواہ منسوب کئے جائیں جنھیں ان کی مصلحت اندیشی اپنے نام کے ساتھ شایع کرانا مناسب نہیں سمجھتی۔ ہم اس مضمون کو واپس کر دیتے لیکن چونکہ ہم اس کی کتابت کرا چکے تھے اس لئے مصنف کے نام کو مخفی رکھ کر اسے شایع کر رہے ہیں)

رسالہ جامعہ کی اشاعت بابت جنوری میں ایک صاحب نے جنھوں نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تحریک پاکستان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان تمام شکوک و شبہات کو قبل از وقت پیش کر دیا ہے جو اس تحریک کا ایک مخالف پیش کر سکتا ہے۔ سب سے اول آپ نے اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کی رائے میں ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی کے بعد ملکوں کی طبعی تقسیموں اور طبقات الارض کی تفریقوں کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ براعظم یورپ ماسوا ئے روس رقبہ میں ہندوستان کے برابر ہے۔ ذرائع آمد و رفت و وسائل خبر رسانی کی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کو یورپ سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ جہاں پر یورپ میں دو لاکھ میل سے زیادہ لمبی لائن ہے۔ ہندوستان میں ریلوں کی لمبائی ۴۰ ہزار کے قریب ہے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود یورپ کی تقسیم ۲۶ جغرافیائی تقطعوں میں ہو چکی ہے جہاں پر جدا جدا قومی

حکومتیں قائم ہیں۔ اگر ہندوستان میں کلکتہ سے پشاور تک اور بمبئی سے دہلی۔ پشاور۔ کوئٹہ اور کراچی تک آمد و رفت کی سہولتوں کو ترقی ہو چکی ہے تو یورپ میں پیرس سے قسطنطنیہ (استامبول) اور برلن سے روم تک کے طویل سفر بھی ہوائی اور خشکی کے راستوں سے کم از کم مدت میں طے ہو سکتے ہیں۔ دریائے ڈینیوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ ہے اور نصف درجن کے قریب ملکوں میں سے گذرتا ہے۔ جو اسے اپنی تجارت و وسائل آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ملک سیاسی طور پر جدا ہیں۔ لہٰذا وسائل آمد و رفت کسی ملک کے مخصوص محل وقوع کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔ پاکستان حقیقت میں ایک قدرتی خطۂ زمین ہے جو طبعی و جغرافیائی طور پر ہندوستان سے بالکل جدا ہے۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون اس سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کی قدرتی حد بندی جنوب و مشرق کی طرف ریگستان راجپوتانہ و دریائے جمنا کرتے ہیں۔ ان کی آب و ہوا ہندوستان کے مقابلہ میں گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہے۔ اس کے وسائل آمد و رفت ہندوستان سے بالکل جدا ہیں۔ این ڈبلیو آر ریلوے کی شاخیں اس سرزمین کے اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی ہیں جن سے پاکستان کے مختلف حصے یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے بحری تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ اس سرزمین کے تجارتی شہروں کا جو براہ راست تعلق کراچی کی بندرگاہ سے ہے وہ اور کسی دوسری بندرگاہ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لوگ اپنی طرز معاشرت۔ رسم و رواج۔ تمدن و تہذیب جسمانی وضع قطع لباس۔ تاریخی روایات فوجی رجحان میں ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ یوپی مدراس و بنگال کے باشندے پنجابی۔ سرحدی یا سندھی سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتے چہ جائیکہ ان کو ملا کر ایک متحد ہندوستانی قومیت قائم کی جائے۔ لہٰذا جدا محل وقوع و جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اور مخصوص حالات و روایات کے لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے بالکل الگ تھلگ واقع ہے۔

پاکستان کی جداگانہ حیثیت کے جواز میں دوسری دلیل امتیاز نسل ہے لیکن ہم آپ نے یہ کہ کر کستر کر دیا کہ دنیا میں خالص نسل رکھنے والے لوگوں کا

وجود نہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر فلسطین میں عرب یہودی آئرلینڈ میں آئرش اور السٹر کے رہنے والے وسط یورپ میں سلافی اقوام۔ جنوبی یورپ کی لاطینی اقوام وغیرہ کیوں نسلی امتیازوں کی بنا پر جدا قوموں میں منقسم ہیں۔ آئرلینڈ کے باشندے مذہبًا عیسائی ہیں۔ صدہا سال سے ایک ہی ملک میں آباد ہیں۔ سب انگریزی طرز کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن مخصوص نسلی امتیاز کی بنا پر جدا حکومتوں میں منقسم ہیں۔ السٹر کے رہنے والے اپنے آپ کو انگریزی نسل سے منسوب کرتے ہیں اور بقیہ آئرلینڈ کے رہنے والے اپنی قدیم سیلٹک نسل پر فخر کرتے ہیں۔ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ پولز۔ روسی۔ زیچ۔ سرب۔ کروٹ بلغار سب سلافی النسل اقوام ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مخصوص نسلی امتیاز کو قائم رکھتی ہیں قوموں کی تشکیل میں نسلی امتیاز کے جذبہ نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے پاکستان کے باشندے وسط ایشیا کی اقوام سے نسبت رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً زمانہ ماضی میں اس سرزمین میں آباد ہوتی رہیں ہندوستان کے باقی حصوں میں آریہ نسل کے لوگ اصلی باشندوں سے مخلوط ہوئے لیکن یہاں بیرونی اقوام غالب حیثیت میں رہیں اور اصلی باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے یہی وجہ ہے کہ جسمانی مضبوطی۔ قد و قامت۔ رنگت۔ چہرے کی ساخت کے لحاظ سے یہاں کے باشندے بقیہ ہندوستان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

آپ نے مذہب کے اختلاف کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ اس سے مجھے اتفاق ہے لیکن زبان کے اختلاف کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا ہے کہ اس کی وجہ بھی مذہبی اختلاف ہے۔ کیا بنگال میں جہاں مسلمان آبادی کا ۵۵ فی صدی ہیں مذہبی اختلاف کے ہوتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ایک ہی نہیں ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مذہب زبان کے اختلاف کا باعث نہیں۔ پاکستان کے لوگ چونکہ نسل کے لحاظ سے بقیہ ہندوستان سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے زبان کا اختلاف اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان ہی ایسی سرزمین ہے جہاں پر کہ اردو سب باشندوں کے لئے مشترک زبان ہے اور اس کا اثر و رسوخ نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے یہاں پر ہندو اخبارات و رسائل کثرت سے اردو میں شائع

ہوتے ہیں پرائمری و مڈل مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ سرکاری دفاتر میں اردو کو ہی درباری زبان کا درجہ حاصل ہے بقیہ ہندوستان کی مانند یہاں پر بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل وغیرہ مختلف زبانوں کی مقابلہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی اس علاقہ کے باشندے بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں آپس میں زیادہ قریب ہیں۔ اسلام کے براہ راست غالب اثر کے باعث اس سرزمین میں ہندوؤں میں آریہ سماج تحریک کو فروغ حاصل ہوا جو اپنے آپ کو توحید پرست و اہل کتاب سمجھتے ہیں، اور قدیم ہندو بت پرستی کے مخالف ہیں۔ سکھوں میں بھی اسی طرح اسلامی خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مورتی پوجا و بت پرستی کو اس سرزمین میں وہ وقار حاصل نہیں ہے جو اسے ہندوستان میں حاصل ہے۔

اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آپ نے یہ سوال کیا ہے کہ ہم اس اکثریت کو کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر اسی سوال کو ہم ہندوستان پر عاید کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو اکثریت کے پیش نظر کیا چیز ہے اس کا جواب ایک ہندو قوم پرست کی طرف سے یہ ہوگا کہ مکمل آزادی جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اسی طرح پاکستان کا ایک مسلمان قوم پرست یہ جواب دینے کا حق رکھتا ہے کہ وہ پاکستان کی مکمل آزادی چاہتا ہے جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو عنصر غالب رہے گا اور ہندو تہذیب کو فوقیت حاصل ہوگی لیکن یہ نتیجہ فی نفسہ مطلوب نہیں بلکہ خاص ماحول کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں فیڈرل نظامِ حکومت کے قیام سے مسلمان عنصر غالب رہے گا اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہوگا لیکن یہ نتیجہ بھی فی نفسہ مطلوب نہیں۔

آپ نے یہ تصور کرتے ہوئے کہ پاکستان میں مسلمان خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کریں گے جس میں غیر مسلم اقوام سے امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا۔ ان کی آبادی کو ظلم سے بتدریج کم کیا جائے گا۔ ان کو فوجی و سول ملازمت کے حقوق سے محروم کیا جائے گا اس امر کا ثبوت دینے کی

کوشش کی ہے کہ مسلمان حکومت کے اہل نہیں۔ اور ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حمایت پر انصاف پسند حکومت قائم ہو سکتی ہے لیکن پاکستان میں محض اس لئے حکومت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمان غیر مسلم اقوام سے رواداری کا سلوک نہیں کریں گے اگر آج انگریز فیڈرل نظام حکومت میں چند تبدیلیاں کر دیں تو کانگرس کا انتہا پسند طبقہ بھی انگریز سے معاونت کرنے کو تیار ہے۔ کیا مرکزی ہند میں فیڈرل نظام حکومت سے وہ شکوک و شبہات مسلمانوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوں گے جن کا ذکر آپ نے پاکستان کی صورت میں کیا ہے اگر اسی طرح کا ایک نظام حکومت پاکستان میں قائم ہو جائے تو یہ غیر مسلموں کے لئے کیونکر مضرت رساں ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ جب ہمارا مقصد مشترکہ فائدہ ہے تو پھر اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں پر پھر آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مطلوب مسلمان کی اکثریت کا تحفظ نہیں بلکہ پاکستان کا جدید انتظام حکومت ہے جس میں پاکستان کے باشندے کو ریلوے۔ ڈاکخانہ و تار برقی۔ جملہ ذرائع آمد و رفت۔ ہوائی۔ بری و بحری فوج۔ امورات خارجہ محصول اشیائے درآمد و برآمد۔ اندرونی و بیرونی تجارت۔ نقل و حرکت آبادی وغیرہ پر پورا پورا اختیار ہوگا پاکستان ہندوستان کا ایک جزو بن کر اپنی انفرادیت و اہمیت کو کھونا نہیں چاہتا یہاں کے باشندے اپنے مخصوص حالات کے مطابق ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر جذبۂ وطن پرستی سلطنت روس۔ ٹرکی و آسٹریا ہنگری کو ایک درجن سے زیادہ آزاد حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ برِاعظم ہندوستان میں یہ جذبہ کار فرما نہ ہو ان تینوں سلطنتوں میں صد ہا سال تک مختلف مذاہب و نسلوں کے لوگ باہم شیر و شکر ہو کر رہے۔ اقتصادی و معاشی امور میں سب کا مفاد مشترک تھا۔ روس میں غیر روسی اقوام کل آبادی کا ۲۵ فی صدی حصہ تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے مغرب میں پولینڈ۔ ایستونیہ۔ لٹویہ۔ لتھونیہ اور فن لینڈ کی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ حالانکہ یہ پانچوں علاقے جغرافیائی لحاظ سے ملک روس کا جزو تھے اور کوئی قدرتی حد بندی ان کو علیحدہ

ملک روس سے جدا نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح سلطنت آسٹریا ہنگری کی مختلف اقوام جو سب کی سب رومن کیتھولک مذہب کی پیرو ہیں علیحدہ علیحدہ علاقوں میں مالک قرار دی گئیں۔ سلطنت ٹرکی میں چار سو سال تک عرب و ترک ایک ہی حکومت کے ماتحت رہے۔ ترکی اور عربی سوال کو کبھی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ان علاقوں میں جہاں عربوں کی اکثریت تھی ان کا حق خود اختیاری تسلیم کیا گیا۔

پاکستان کے بعد ہندوستان کا دوسرا حصہ جو جدید انتظام حکومت قائم کرنے کا حقدار ہے وہ مشرقی بنگال و آسام ہے۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فی صدی کے قریب ہے اس کے ۱۰ اضلاع میں سے ۱۶ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور تین اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت میں ہیں۔ دریائے گنگا مشرقی بنگال کو مغربی بنگال سے جدا کرتا ہے۔ آسام کا میدانی حصہ جس میں سلہٹ اور گوالپاڑہ کے اضلاع شامل ہیں دراصل مشرقی بنگال کا ہی ایک حصہ ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر بنگالی مسلمان ہیں جو مشرقی بنگال سے جاکر آباد ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی مرتبہ مشرقی بنگال سے اپنے اضلاع کے الحاق کی کوشش کی لیکن وہ محض اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے کہ گورنمنٹ صوبۂ آسام کی جداہستی کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان دونوں اضلاع کی علیحدگی کی صورت میں آسام کے رقبہ و آبادی میں اس حد تک کمی ہونے کا اندیشہ تھا کہ یہ ملک ایک جدا صوبہ نہیں رہ سکتا تھا لہذا اس مشکل کا حل اسی صورت میں ہے کہ مشرقی بنگال و آسام کے الحاق سے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے اور اس جدید صوبہ کی حدبندی انھی پر انے حدود پر قائم کی جائے جس طرح ۱۹۱۱ء سے پیشتر مشرقی بنگال و آسام کا صوبہ قائم تھا اس جدید صوبہ میں ۴ کروڑ کی آبادی میں سے مسلمانوں کی تعداد ۲ کروڑ کے قریب ہو جائے گی اگر پاکستان و مشرقی بنگال و آسام براعظم ہند کے جدا حصے تسلیم کر لئے جائیں تو مسلمانوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے۔ ان ہر دو علاقوں میں کل آبادی ۸ کروڑ کے قریب ہو گی جس میں سے مسلمان تعداد میں ۶ کروڑ کے قریب ہوں گے بقیہ ہندوستان میں دو ڈھائی کروڑ کے

درمیان مسلمان رہ جائیں گے جو بطور اقلیت کے شمار کئے جا سکتے ہیں اور ان کو وہی حقوق دئے جا سکتے ہیں جو ان ہر دو اسلامی صوبوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو دئے جائیں گے۔

پاکستان کے قدرتی ذرائع بہت وسیع اور غیر محدود ہیں۔ براعظم ہند میں پاکستان ہی ایک ایسا حصہ ہے جہاں پر کہ موجودہ آبادی سے تین گناہ زیادہ آبادی سما سکتی ہے کشمیر۔ پنجاب و سندھ میں بڑے وسیع قطعات اراضی زیر کاشت لائے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے جنگلات اس کی عمارتی وصنعتی ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ چراگاہوں میں مویشی بکثرت پالے جا سکتے ہیں۔ معدنیات کی بھی بہتات ہے جو بوقت ضرورت ملک کی صنعت وحرفت کو فروغ دے سکتی ہیں۔ بجلی کی طاقت اسقدر مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے کہ جس سے سینکڑوں کارخانے و کلیں چل سکیں۔ ذرائع آمدنی میں ریلوے کی آمدنی ای آئی آر کے بعد ہندوستان کے ہر دوسری ریلوے لائن سے زیادہ ہے پاکستان میں معاملہ زمین و آبپاشی کی آمدنی بنگال۔ یوپی۔ مدراس ہر ایک سے زیادہ ہے علیحدگی کی صورت میں انکم ٹیکس و محصول بندرگاہ کی آمدنی جو خزانہ مرکزی میں جمع ہوتی ہے براہ راست پاکستان کی آمدنی میں شمار ہوگی اور یہ زائد آمدنی صوبۂ سرحد و بلوچستان کے اخراجات کی کفیل ہو سکتی ہے پاکستان میں وسائل و دولت کو ترقی دینے کے لئے مزدوروں کی کمی نہیں۔ قومی حکومت کے قیام سے صنعت وحرفت کو لازمی فروغ ہوگا کوئی ملک آغاز میں سرمایہ۔ تنظیم و ماہر مزدوروں سے بیک وقت مستفید نہیں ہو سکتا۔ ٹرکی جدید جو آج اس قدر ترقی کر رہا ہے جنگ یورپ سے پیشتر اقتصادی طور پر پاکستان سے بدتر حالت میں تھا۔ وسائل دولت غیر ترقی یافتہ حالت میں تھے۔ ملک میں سرمایہ کی کمی تھی۔ تمام تجارت اجنبی اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا ملک میں خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ترک اپنے اصلی وطن ایشیائے کوچک میں غیروں کے دست نگر تھے زراعت۔ سپہگری یا ملازمت ان کا پیشہ تھا۔ ملک کی اندرونی تجارت پر یونانی ارمنی۔ یہودی لوگوں کا قبضہ تھا۔ بڑے بڑے مشہور شعبہ جات جیسے ڈاکٹری معلمی۔ بنکنگ دوکانداری وغیرہ غیر ترکی اقوام کے ہاتھ میں تھے۔ جس طرح آج پاکستان کا سرمایہ و تجارت ہندو کے قبضہ میں ہے

اسی طرح ٹرکی کا تمام سرمایہ و تجارت یونانی یہودی و ارمنی اقوام کے قبضہ میں تھی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ٹرکی قوم میں قومی احساس اس حد تک پیدا ہوا کہ ہر مشکل سے مشکل مسئلہ ان کے لئے آسان ہوگیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اگر پاکستان کے مسلمان اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے عزم بالجزم کر لیں تو وہ کامیاب ہو جائیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور پاکستان کو ہندوستان سے جدا کرنے کی صورت میں تبلیغ کے مواقعات کم ہو جائیں گے۔ یہ ایک فرضی تخیل ہے اسلام کی اصلی و حقیقی تبلیغ یہ ہے کہ ہر مسلمان صحیح رنگ میں مسلمان بن جائے۔ پاکستان کے مسلمان اگر اپنی علیحدہ و آزاد حکومت میں اسلامی روایات و اصولوں پر پورے طور پر عمل کریں گے تو یقیناً اس کا اثر براہ راست ہمسایہ اقوام پر پڑے گا۔ آج ہر کام میں تنظیم کی ضرورت ہے انفرادی کوشش سے کوئی کام پورے طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر پاکستان کے مسلمان دنیوی و دینی رنگ میں جملہ اسلامی صفات کے حامل بن جائیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نمونہ کو دیکھ کر دنیا میں اشاعتِ اسلام کے کام کو فروغ حاصل ہو جائے آپ نے مشکلات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ درحقیقت حالت مایوسی کا اظہار ہے پاکستانی مسلمان اپنے مستقبل کو امید افزا سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے۔ وہ اپنے دل میں آزادی کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسی آزادی کا خواہشمند ہے جو ہمیشہ کے لئے اس کو انگریز ہندو دونوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ اور اسے اپنی قسمت کا پورا مالک بنا دے۔ ہندوستان کا مسلمان آج دو مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ سیاسی طور پر وہ انگریز کا غلام ہے لیکن اقتصادی طور پر ہندو کا دست نگر ہے۔ اگر آج اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس کی آزادی اور دولت پر ہر دو اقوام نے قبضہ کیا ہوا ہے تو مسلمان کا مسئلہ بہت جلد حل ہو سکتا ہے۔

عہد وسطیٰ[1] میں یورپ کی حالت

سنہ ۱۱۰۰ء میں دنیا کے بارے میں یورپ کا تصور

چند بڑے عالموں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو یورپ کے باقی لوگوں کی کل دنیا سنہ ۱۱۰۰ء میں جس جگہ پیدا ہوئے تھے صرف اس کے آس پاس علاقہ یا زیادہ سے زیادہ قریب کے چند میلوں میں جو گاؤں آباد تھے ان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دور دراز مقامات کا سفر اکثر و بیشتر وہ نہیں کرتے تھے۔ سڑکوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو تھیں ان کی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کے بیشتر حصہ پر جنگل کھڑے تھے اور اکیلے سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ نہ ریلیں تھیں نہ جہاز تھے سوائے کمزور بادبانی کشتیوں کے اور موٹر بھی نہیں تھے۔ کبھی کبھار پیدل یا گھوڑے پر دوسرے گاؤں کا سفر کیا جاتا تھا اور اسے زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سفر کے لئے بھی بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی تھی اور بڑی تیاریاں کرنا پڑتی تھیں اور اس کا بعد میں برسوں تک تذکرہ جاری رکھا جاتا تھا۔

چند بڑے عالموں کو دنیا کے جن حصوں کا علم تھا انھیں حاشیہ کے نقشہ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ نقشہ کے اندر جو سیاہ حصہ ہے اس سے لوگ ابھی تک بالکل ناواقف تھے۔ ان کے دنیا کے تصور میں یورپ کا بیشتر حصہ ایشیا کا کچھ حصہ اور افریقہ کے شمالی اور مغربی ساحل کے قریب کی ایک تنگ اور لانبی کتر شامل تھی۔

---

[1] عہد وسطیٰ سنہ ۴۰۰ء سے شروع ہوتا ہے یعنی جب رومیوں کا تسلط یورپ پر ختم ہو گیا تھا اور سنہ ۱۶۰۰ء یعنی موجودہ عہد کی ابتدا تک جاری رہتا ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ء میں یورپ کی زندگی آئیے عہدِ وسطیٰ کے یورپ پر جادو کے جہاز پر بیٹھ کر سفر کریں۔ اس طرح ہم پورے براعظم کو بہت تھوڑے عرصہ میں دیکھ سکیں گے۔ مصر کے اسکندریہ سے ہم اپنا سفر شروع کریں گے اور یورپ سے ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ جائیں گے۔ ہم وینس سے گذریں گے جو نہروں کا شہر ہے۔ راستہ میں ہمیں بیسیوں چھوٹے چھوٹے قلعے نظر آئیں گے جن کے گرداگرد گاؤں بسے ہوں گے۔ پیرس پر بھی ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں گے جہاں کی گندگی اور تنگ گنجان آبادی سے ہماری طبیعت مکدّر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ محسوس کریں گے کہ پیرس نے یورپ کا ایک اہم شہر بننا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم لندن پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم اسے بالکل نہ پہچان سکیں گے کیونکہ مکان بہت نیچے نیچے لکڑی کے بنے ہوئے اور پھوس کے چھپر کے دکھائی دیں گے۔ جب ہم شہر پر سے گذریں گے تو ہمارے منظر کو دھندلا کرنے کے لئے دھوئیں کی کوئی باریک سی لکیر بھی کہیں نظر نہ آئے گی۔ آمد و رفت کے شور کی گڑگڑاہٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا۔ اسٹیشنوں پر ریلیں تیزی سے آتی جاتی نظر نہیں آئیں گی موٹروں کے ہارن کا شور بھی سنائی نہ دے گا۔ شہر بالکل خاموش اور سویا ہوا نظر آئے گا۔ بیل آہستہ آہستہ بھدی گاڑیوں کو کھینچتے دکھائی دیں گے۔ لدے ہوئے چھوٹے گدھے بھی دوڑتے نظر آئیں گے۔ لیکن نہ تو فولاد کی ملیں دھواں اگلتی ہوں گی، نہ فیکٹریاں ہونگی۔ نہ بجلی کے تار ہوں گے نہ ہوائی جہاز بلکہ جس یورپ کا مشاہدہ ہم اس زمانے میں کرینگے اس میں ہمیں شہر اور قصبے بہت کم نظر آئیں گے۔ یورپ کے اکثر لوگ ان چھوٹی بستیوں میں آباد نظر آئیں گے جنھیں مینر (MANOR) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مینر کی زندگی مینر میں مرکزی حیثیت زمیندار کی گڑھی کو حاصل ہوتی تھی۔ یہ گڑھی یا قلعہ بھورے رنگ کے پتھروں کا ایک بڑا مکان ہوا کرتا تھا جو عموماً کسی پہاڑی پر بنایا جاتا تھا۔ اس کے گرداگرد عمدہ کھیت اور گاؤں کے درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ درختوں کے درمیان مچھلی پکڑنے کے لئے ایک تالاب ہوتا تھا اور درختوں کی زمین میں ہی زمیندار کے شکار کھیلنے کے لئے جانور ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا اس گڑھی سے قریب ہی ایک چھوٹے گاؤں کی مختصر جھونپڑیاں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں بہت کم حیثیت اور خراب ہوتی تھیں اور ان کے رہنے والوں کو اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ گڑھی کے رہنے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ گاؤں کے آگے غلہ

کے کھیت اور درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ ان کھیتوں سے آگے ہر طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں سے گذرنے کے لئے کوئی سڑک بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ صرف بھدی لیکیں اور راستے ہوتے تھے۔

امیروں اور پادریوں کا طبقہ زمین کے بیشتر حصہ کا مالک تھا۔ کچھ کسان بھی ایسے تھے۔ جن کی گھر کی زمینداری تھی لیکن ان کے قبضہ میں رقبہ بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔ باقی سب لوگ گڑھی کے زمیندار کے ماتحت ہوتے تھے زمیندار کو اپنی رعایا پر بیچنے اور خریدنے کے علاوہ باقی سب طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد زمیندار کو زمین کے ساتھ رعایا بھی ترکہ میں ملا کرتی تھی اور زمیندار اپنی اس رعایا اور ان کی اولاد کو اپنے مرنے کے بعد اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے ترکہ میں چھوڑ جایا کرتا تھا۔

زمیندار کی رعیت میں جو لوگ شامل تھے نہ تو زمین کو خرید سکتے تھے نہ فروخت کر سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ زمین کو چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح یہ جس زمین پر پیدا ہوتے تھے اسی زمین سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے پابند تھے۔ انھیں اپنے زمیندار کی پوری طرح اطاعت کرنا پڑتی تھی اور زمیندار کی حفاظت کے معاوضہ میں اس کے کھیتوں کی جتائی، بزائی اور کٹائی کیا کرتے تھے۔ اپنی کچھ پیداوار کو وہ ذاتی استعمال کے لئے رکھ سکتے تھے لیکن زمیندار کا ان کی پیداوار یا جانوروں پر جو مطالبہ بھی ہوتا تھا اسے پورا کرنے کے لئے بالکل مجبور رہتے تھے۔ زمیندار برابر لڑتے رہتے تھے اور بعض وقت گڑھی کے محاصرہ کے بعد جب کسان گڑھی سے باہر نکلتے تھے تو دیکھتے تھے کہ زمیندار کے دشمنوں نے ان کے کھیتوں کو بالکل برباد اور ویران کر دیا ہے۔

۱۳۰۰ء کے قریب انگریزی قوم کی ایک مردم شماری کے اعداد	
	فی صدی
امیر اور پادری	۴
ایسے کسان جن کی گھر کی زمینداری تھی	۱۲
زمیندار کی رعیت	۷۰
واقعی غلام	۹
دیگر	۵

جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کسانوں کی تعداد زمینداروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوا کرتی تھی انھیں "رعایا" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور انھیں دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اول چھوٹے کسان جو دس ایکڑ سے لیکر چالیس ایکڑ تک کاشت کرتے تھے اور دوسرے کمین جو زمیندار کے لئے ہر طرح کا کام کیا کرتے تھے اور انھیں ایک یا دو ایکڑ زمین جوتنے بونے کے لئے دے دی جاتی تھی۔

زمین کی تقسیم اور کاشت کا طریقہ ذیل میں جو نقشہ دیا گیا ہے اس میں زمین کی تین قسمیں نظر آتی ہیں (۱) درختوں کی زمین اور ویران زمین (۲) چراگاہیں اور (۳) مزروعہ رقبہ۔ درختوں کی زمین اور ویران زمین میں سے گھاس کاٹنے اور لکڑی جمع کرنے کی کسانوں کو اجازت تھی۔ ان کے مویشی، سور اور گھوڑے زمیندار کے زندہ دمن کے ساتھ ان میں چر سکتے تھے۔
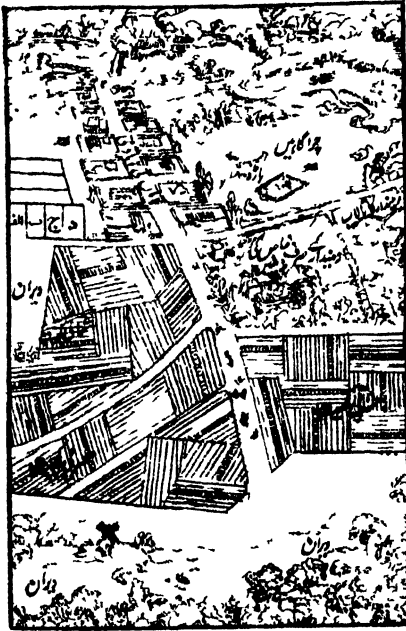
اس وقت کے کھیت آج کل کے بڑے کھلے ہوئے فارموں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ یہ لانبی اور تنگ کتروں میں بٹے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر لانبی کتر ایک شخص کے فارم کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ گاؤں کا رہنے والا ہر شخص ان کھیتوں کی جو سڑک کے دونوں طرف ہوتے تھے اور مغربی کھیت، مشرقی کھیت، شمالی کھیت کے ناموں سے موسوم کئے جاتے تھے ایک ایک کتر کو جوتا کرتا تھا مثلاً نقشہ میں سیاہ رنگی ہوئی کتروں کو تلاش کیجئے۔ مغربی کھیت میں ایسی سات کتریں ہیں، مشرقی میں آٹھ اور شمالی میں آٹھ۔ ان تئیس کتروں کی کاشت ایک ہی آدمی کو کرنا پڑتی تھی چنانچہ ایک شخص کی کاشت میں جو زمین تھی وہ تمام مینر میں بکھری ہوئی ہوتی تھی اور کسان کو اپنی پوری زمین کو جوتنے کے لئے ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک سفر کرنا پڑتا تھا ایک اور بات بھی تھی جو خاص طور پر

اس نقشہ میں انگلستان کے ایک مینر کے جن تین بڑے کھیتوں کو دکھایا گیا ہے ان کی ملکیت زمیندار کو حاصل تھی۔ ایسے کسانوں کے کھیتوں کو جو گھر کے زمیندار تھے الف، ب، ج، د کے عنوان سے علیحدہ دکھلایا گیا ہے جنہیں کرافٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ باڑے میں بعض پالتو جانوروں کو رکھا جایا کرتا تھا۔

لائق ذکر ہے اور وہ یہ کہ ان کتروں میں سے کچھ کتروں کو بغیر جوتے ہوئے پرتی چھوڑ دیا جاتا تھا کچھ کتروں پر گیہوں بوتے تھے، کچھ پر جو اور جئی اور کچھ کو بغیر بوئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس چیز کو "تین کھیتوں کے نظام" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تین کھیتوں میں سے صرف دو کی بوائی کی جاتی تھی اور تیسرے کو آرام کرنے کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ایک ہی کھیت کو مسلسل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کی زرخیزی کو نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

رعا کے لگان ادا کرنے کا طریقہ | رعایا کو زمین کا بہت بھاری لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس نقد دام نہیں ہوتے تھے اس لئے انھیں خدمت کی شکل میں لگان ادا کرنا ہوتا تھا۔ زمیندار اپنے محل میں عیش سے رہتے تھے صرف کبھی کبھی شکار، ماہی گیری یا جنگ کرنے کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ وہ اپنے خرچ کو پورا کرنے کے لئے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا صرف خاص کے لئے رکھتے تھے اس کی بوائی، جتائی اور کٹائی ان کی رعایا کیا کرتی تھی اور یہ کام انھیں اپنی ذاتی زمینوں کی نگہداشت کے علاوہ کرنا پڑتا تھا۔ کام ان کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ہر ہفتہ میں کچھ دن انھیں زمیندار کے لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ رعیت کو تین دن کام کرنا ہوتا تھا اور کمپنیوں کو ایک دن جب بوائی اور کٹائی کا وقت آتا تھا تو کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ اس لئے بعض وقت انھیں اپنے کھیتوں کی طرف سے کچھ دن کے لئے مجبوراً غفلت کرنا پڑتی تھی اور یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ کسان کی ذرا سی غفلت سے فصل کو بڑا زبردست نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ بے چارے اپنے کام سے غفلت زمیندار سے محبت کی بنا پر نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھے یہ بغاوت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر یہ ایسا کرتے تو زمیندار اور اس کے سپاہی جن کے پاس ہتیار تھے ان نہتے لوگوں پر حملہ کر کے انھیں فوراً زیر کر لیتے تھے۔

انھیں زمیندار کے کھیتوں کی صرف جتائی ہی نہیں کرنا پڑتی تھی بلکہ اُسے مویشی، دودھ، مرغیوں انڈوں شہد اور باغ کی پیداواروں کا ایک حصہ بھی دینا پڑتا تھا۔ ایک پادری ان لوگوں کی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بہت سے زمیندار اپنی رعایا کو محنت کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے اور انھیں روٹی تک کھانے کو نہیں دیتے تھے :-

آج کل بہت سے زمیندار ایسے ہیں کہ جب ان کو غریب کسان کی گائے کے بیتنے پر ملامت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس گاؤدی کو اس بات کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ میں نے بچھڑے کو اور خود اسے زندہ چھوڑ دیا۔ اگر میں چاہتا تو اسے اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اس کی بطخ لے لی ہے اور بطخ کے پر اس کے لئے چھوڑ دئے ہیں"

جب رعیت میں سے کسی شخص کی موت واقع ہو جاتی تھی تو زمیندار اس کے ترکہ میں سے بہترین حصہ کا مالک خود بن جاتا ہے۔ دوسرے درجہ کی چیزوں پر پادری قبضہ کر لیتا۔ بیوہ اور یتیم بچوں کو اکثر کچھ بھی نہ مل سکتا۔

جب رعیت میں سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا تو اُسکے باپ کو زمیندار سے اجازت لینا پڑتی اسی طرح اگر کوئی کسان اپنی گائے یا بیل بیچنا چاہتا تو وہ زمیندار کی اجازت حاصل کئے بغیر ایسا نہ کر سکتا۔

رعیت کا افلاس | زمیندار کی رعایا کے رہنے کے لئے افلاس زدہ بدتر سے بدتر قسم کے چھوٹے جھونپڑے ہوتے تھے جنھیں ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں اور گارے سے بنایا جاتا اور پھوس سے چھایا جاتا تھا۔ ان میں صرف ایک کمرہ ہوتا تھا اور کوئی انگیٹھی یا چولھا نہیں ہوتا تھا خالی زمین پر پیال بچھا کر فرش بنا دیا جاتا تھا۔

جب مرد اور کچھ عورتیں کھیت سے کام کر کے واپس آتے تھے تو ان کے سامنے گھر کی ماں ابلی ہوئی بند گوبھی اور نمک سے محفوظ کیا ہوا سور کا گوشت رکھ دیا کرتی تھی۔ کھانے کے برتن میں ہر شخص اپنی انگلیاں ڈالتا تھا یا روٹی کے ٹکڑے کو چمچے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کبھی کبھار انھیں مچھلی مٹر یا اسٹرابیری وغیرہ بھی مل جایا کرتے تھے۔ دن میں یہی ان کا بڑا کھانا ہوتا تھا اور شاید اسی ایک کھانے پر ان کو گذر کرنا پڑتی تھی۔

کسانوں کے کپڑے بڑے گندے ہوتے تھے۔ ان کے دھونے کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ کپڑے دھونے کے معنی یہ تھے کہ جن کے کپڑے دھوئے جا رہے ہیں وہ بستر میں دبکے پڑے رہیں کیونکہ کسی شخص کے پاس دو جوڑے کپڑے ہونا بڑی عیاشی سمجھی جاتی تھی۔

رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے کسی روشنی کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار بکری کی چربی کی موم بتیاں جلائی جاتی تھیں۔ دن کی محنت سے تھک کر چور ہونے کے بعد جب لوگ واپس آتے تھے

تو ایک بھدی سی سیڑھی پر چڑھ کر اٹاری پر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہاں پیال کے ڈھیر پر گر کر صبح تک سوتے رہتے تھے۔

[illegible] مینر کی خودکفالتی زندگی

ہم نے اوپر کے بیان میں صرف کسانوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن گاؤں والوں کو کھیتی کے علاوہ اور دوسرے کام کرنے والے لوگوں کی بھی ضرورت رہتی تھی۔ کسانوں کے اوزار بنانے کے لئے ایک لوہار کی، ان کے غلہ کو زمیندار کی چکی پر پیسنے کے لئے ایک چکی والے کی ضرورت ہوتی تھی۔ کسان کے لئے اور زمیندار کے لئے جب اُسے مچھلی کے شکار کا شوق نہ ہوتا تھا گاؤں کا ماہی گیر مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ بھیڑوں کے بالوں کو کاٹ کر گاؤں کی عورتیں ان کو کاتتی اور بنتی تھیں اور ان کے کپڑے بناتی تھیں۔ مینر کی ایک عدالت بھی ہوتی تھی جہاں زمیندار صدر کی حیثیت سے جج اور جوری دونوں کے فرائض انجام دیتا تھا۔

لیکن مینر میں ہر چیز بن سکتی تھی۔ مثلاً چکی کے پاٹوں کو فرانس جیسے دور دراز مقام سے جنگلوں اور سمندروں کو پار کر کے لایا جاتا تھا۔ زمیندار اپنے زرہ بکتر اور مضبوط تلوار کو اسپین سے حاصل کیا کرتے تھے۔

پھر طویل وقفوں کے بعد گاؤں میں نئی صورتیں بھی نظر آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک پھیری والا یا سفر پیشہ گویا آ نکلتا تھا۔ پھیری والے کی گٹھڑی کو کسان جادو کی گٹھری سمجھتے تھے کیونکہ یہ مشرق کے زیوروں، ریشم کے کپڑوں اور گرم مسالوں سے بھری ہوئی ہوا کرتی تھی۔ انہیں اس بات کی بڑی تمنا ہوتی تھی کہ وہ باہر کی وسیع دنیا کی کوئی چیز خرید سکیں لیکن اپنے افلاس کی وجہ سے کوئی چیز نہ خرید سکتے تھے۔ زمیندار اور کبھی کبھی وہ کسان بھی جن کی گھر کی زمینداری تھی چیزیں خریدا کرتے تھے۔ رعیت غریب کو اگر پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تھا تو وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھی۔

بھاٹ قوال یا گوئیے جو ایک مینر سے دوسرے مینر کا برابر سفر کرتے رہتے تھے ایک عجیب و غریب دنیا کے بہادروں کی لڑائیوں اور ان کی عشق و محبت کے گیت گایا کرتے تھے۔ جب لوگ انھیں سنتے تھے تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور لانبی سانس لیتے تھے کیونکہ یہ گیت انہیں رومانی افسانے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن بھاٹ ان غریب لوگوں کے درمیان زیادہ نہیں ٹھیرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زمیندار کی گڑھی

کے دعوت کے کمرہ میں اسے تمام رات گیت سنانا پڑیں گے۔

۱۱۰۰ء کے بعد مینر کی خودکفالتی زندگی کا خاتمہ تاجروں، میلوں، قصبوں اور شہروں کی ترقی

لیکن مینر کی یہ خودکفالتی زندگی مسلسل جاری نہیں رہ سکی۔ پڑوس کے گاؤں میں کبھی کبھی میلے منعقد کئے جانے لگے۔ اور زمیندار کی نعنایت سے جب تاجر تحفے تحائف اور خراج ادا کرتے تھے گاؤں والوں کو ان میں شریک ہونے کی اجازت ملنے لگی۔ میلہ کا زمانہ بڑی ہماہمی کا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو ایک ہی طرح کی زمین اور لوگوں کے چہرے دیکھتے دیکھتے تھک جاتے تھے۔ میلہ میں خاصا تنوع اور دلچسپی ہوتی تھی۔ پھر ان کے تھکے ہوئے ہاتھوں اور جھکی ہوئی کمر کو بھی اس زمانہ میں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

مذہبی تہواروں کے موقع پر مینر کے لوگ قریب کے شہر کے بڑے گرجا میں جایا کرتے تھے۔ پادری کے خطبہ کے بعد سڑک کے دونوں کناروں پر گرجا گھر میں ڈرامے ہوتے تھے یا جلوس نکلتے تھے یا سڑکوں پر کھیل کود ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر پھیری والے اور دکاندار سڑک کے دونوں کناروں پر کپڑے کی عارضی دکانیں کھڑی کر لیتے تھے اور خریداروں کو للچانے کے لئے اپنے سامان کی نمائش کرتے تھے۔ زندگی کے ضروری سامان مثلاً گوشت، اون، نمک اور مچھلی کی بھی نمائش کی جاتی تھی اور تعیشات مثلاً شراب، گرم مسالے، ریشم کے کپڑے اور زیورات کی بھی نمائش ہوتی تھی۔

اگر مینر کے کسی آدمی کے پاس غلہ کی ایک زائد بوری یا اونی کپڑے کا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک صاف ٹکڑا ہوتا تھا تو وہ دکاندار سے اپنی بیوی کے لئے اتوار کے دن کے پہننے کے واسطے ریشم کا ایک ٹکڑا خرید سکتا تھا۔ دکاندار چیزوں کو صرف فروخت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں آئندہ کسی اور دوسری جگہ بیچنے کے لئے خریدا بھی کرتے تھے۔

اگر دوکاندار کسی شخص کے کپڑے کو اس لئے نہیں خریدتے تھے کہ اس کی بُنائی گھٹیا قسم کی تھی تو وہ میلہ سے یہ ارادہ کرکے لوٹتا تھا کہ آئندہ تہوار کے موقع پر جب دوبارہ میلہ لگے گا تو وہ اس سے بہتر کپڑا بن کر لائے گا۔ میلے میں جن چیزوں کو وہ دیکھتا تھا ان میں سے اکثر کو چونکہ وہ خریدنا چاہتا تھا اس لئے انھیں حاصل کرنے کے لئے سخت سے سخت محنت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ میلہ اس کی زندگی کی یکسانیت میں ایک

ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور جب میلہ دیکھ کر وہ مینر کو واپس جاتا تھا تو مینر کی زندگی اسے بے جان معلوم ہوتی تھی اور اس کے اندر یہ حوصلہ اور امنگ پیدا ہوتی تھی کہ کسی طرح اپنے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کرے۔

چنانچہ میلوں سے چیزوں کے بنانے میں دلچسپی بڑھ جاتی تھی اور ان سے دستی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ رعیت کے جو افراد عمدہ قسم کا کپڑا بننا یا دھات کو کوٹ پیٹ کر عمدہ زیور بنانا یا لکڑی کے ٹکڑوں کو چھیل کر عمدہ صندوق بنانا سیکھ لیتے تھے تو ان چیزوں کے معاوضہ میں وہ ان دوسری چیزوں کو خرید سکتے تھے جن کی طلب انھیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس تجارت سے ان کے پاس ایک ذاتی پونجی روپیہ پیسہ کی شکل میں اکٹھی ہو سکتی تھی اور جب کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو پھر وہ زمیندار کے بالکل پابند اور محکوم نہ رہتے تھے۔

عہد وسطے کے دستکار اور ان کی پنچایتیں

انگلستان میں آج کل تقریباً ہر چیز مشینوں کے ذریعہ بنائی جاتی ہے۔ لیکن عہد وسطے میں ہر چیز سادہ اوزاروں کے ذریعہ ہاتھ سے بنائی جاتی تھی۔ دستکار یعنی ماہر کاریگر لوگوں کے پہننے کے لئے کپڑا بنتے اور سیتے تھے۔ وہ دھاتوں کو کوٹ پیٹ کر لڑائیوں میں کام آنے والے زرہ بکتر اور تلواریں بناتے تھے۔ وہ ہلوں، کدالوں اور انگیٹھیوں کو بناتے تھے۔ غرضکہ صنعت کے سب کام دستکار اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

دستکاری کے یہ کام فیکٹریوں میں نہیں کئے جاتے تھے بلکہ کاریگر انھیں اپنے گھروں پر کیا کرتے تھے۔ جب دستکاروں کی مہارت میں ترقی ہو جاتی تھی اور اپنی دستکاری سے ہی پورے طور پر گذر کرنے کے لائق ہو جاتے تھے تو وہ اپنے گاؤں سے قصبوں اور شہروں کو منتقل ہو جاتے تھے جہاں ان کے مال کے خریدنے اور قدر کرنے والے لوگ زیادہ تعداد میں موجود ہوتے تھے یعنی ایسے لوگ موجود ہوتے تھے جن کے پاس قیمتی زیورات اور کپڑوں کے خریدنے کے لئے روپیہ ہوتا تھا جو اپنے خاندان کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے عمدہ یادگاریں قائم کیا کرتے تھے یا جو اپنے عالیشان مکانوں کی زینت اور زیبائش کے خواہشمند ہوتے تھے۔

خردہ فروشی کی ایسی دکانیں جس میں مال کو جمع رکھا جائے اس زمانہ میں بالکل معدوم تھیں درمیانی تاجروں کا بھی تقریباً کوئی وجود نہیں تھا۔ دستکار اپنے مال کی تجارت خود ہی کیا کرتے تھے۔ جیسے ہی ایک چیز بن کر تیار

ہوتی تھی فوراً فروخت کردی جاتی تھی اور دوسری چیز کا بنانا شروع کردیا جاتا تھا۔

جب چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں تو ہر ایک بنائی ہوئی چیز دوسری سے مختلف ہوتی ہے مشین کی بنائی ہوئی چیزوں کی طرح ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح کاریگروں کے کام کی رفتار بھی یکساں نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک کاریگر دوسروں کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ قسم کا کام انجام دے۔ اس لئے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کسی مصنوعہ چیز کی قیمت کیا ادا کی جائے۔

اس قیمت کی نگرانی کرنے کے لئے کاریگروں نے اپنی انجمنیں بنانا شروع کردیں جنھیں گلڈس (حرگوں یا پنچایتوں) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ پنچایتیں قاعدے بناتی تھیں کہ مال کس قسم کا بنایا جائے مال کی کتنی قیمت لی جائے۔ ایک لڑکے کو پنچایت کا پورا رکن بنانے سے پہلے کتنے سالوں تک امیدوار رکھ کر کام سکھایا جائے۔

عہد وسطیٰ کے دستکاروں کی فہرست سے اس بات کا اندازہ ہوسکے گا کہ اس زمانہ میں پیشوں میں کس قدر تنوع پایا جاتا تھا اور تقسیم عمل نے کتنی ترقی کرلی تھی۔ جو لوگ غذا کی صنعت میں لگے ہوئے تھے ان کے نام حسب ذیل تھے۔ قصائی اور کھالوں کو بنانے والے پن چکی پر آٹا پیسنے والے اور نانبائی شراب کھینچنے والے اور باورچی یہ سب لوگ ایسے تھے جو اپنے اپنے فن کے ماہر ہوتے تھے۔ اسی طرح دھاتوں کی صنعت میں بھی خاصی تقسیم عمل پائی جاتی تھی کچھ لوگ نعلبند ہوتے تھے کچھ لوہار، چاندی کے کاریگر، سنار، تانبے کا کام کرنے والے، ٹین کا کام کرنے والے وغیرہ۔ پھر مختلف قسم کے اوزار بھی مختلف کاریگر بنایا کرتے تھے۔ مثلاً چاقو چھری اور چمچے بنانے والے، بھیڑوں کا اون کاٹنے والی قینچیاں بنانے والے، تلواروں کو مزین کرنے والے، نیام بنانے والے، فولادی زنجیریں بنانے والے، مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹے بنانے والے، تالے بنانے والے، چاقو پر سان رکھنے والے وغیرہ۔ لوگوں کے لئے کپڑا مہیا کرنے کے واسطے ریشم، اون، کتان اور کینوس کے بننے والے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی سلائی کے لئے بھی مختلف خاص پنچایتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً درزی، لیسیں بنانے والے وغیرہ عمارت سازی کی پنچایت میں بھی مختلف ضمنی تقسیمیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً معمار، سنگتراش، کھپریل بنانے والے بڑھئی، ٹین

کی چادر بنانے والے وغیرہ غرضکہ پیشوں کا ایک خاصا پیچیدہ نظام پیدا ہو گیا تھا۔

بعض قصبوں اور شہروں میں چند دستکاریاں خاص طور پر ترقی کر لیتی تھیں مثلاً اٹلی کے شہر فلورنس، میلان، جنوآ اور وینس خوب صورت دستکاری کے لئے مشہور تھے۔ یہ دولتمند شہر تھے اور یہاں کے لوگ یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور یہاں کے دولتمند لوگ نادر اور بیش قیمت چیزوں کے کاریگروں کی خاص طور پر سرپرستی کرتے تھے۔ مثلاً وینس اپنے شیشہ کے برتنوں، پیتل کے کام، بیلوں، چمڑے کے کام، مخمل، ساٹن، زربفت وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ آج بھی وینس کے شیشہ کے پرانے برتنوں کے کام کو اس فن کے ماہر بہت اچھا سمجھتے ہیں اور اس کا شمار نوادر میں کیا جاتا ہے۔ وینس والوں نے ایک خاص رنگ کو بھی دریافت کیا تھا جسے "وینس کے سرخ رنگ" کے نام سے عہد وسطیٰ میں شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اوپر کے تمام بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مینروں کے مقابلے میں شہروں کی زندگی میں خاصا تنوع پیدا ہو گیا تھا۔ ان چیزوں کے بنانے کے لئے بہت سے گھروں اور دوکانوں کو برابر مصروف رہنا پڑتا ہوگا اور جس قسم کا کام یہ دستکار لوگ کرتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو نہایت فارغ البالی اور آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ کے بڑے شہر
۱۔ انگلستان کے قصبے اور شہر۔ لندن

لندن کی حالت عہد وسطیٰ میں وہ نہیں تھی جو اب ہے اس شہر کی آبادی منتشر تھی اس کی سڑکیں بہت تنگ تھیں۔ کچھ سڑکوں کو تو بے ڈھنگے طریقہ پر پتھر سے پاٹ دیا گیا تھا لیکن کچھ ایسی تھیں جو پٹی ہوئی بھی نہیں تھیں۔ سڑک کے بیچ میں ایک نالی بہتی تھی لیکن جب بارش ہوتی تھی تو نالی کا پانی اتنا چڑھ جاتا تھا کہ سڑک کے بھر جانے کے بعد مکانوں کے اندر پہنچنا شروع کر دیتا تھا۔ شہر کے کچھ حصے ایسے تھے جو بھک منگوں سے بھرے ہوئے تھے اور چور بھی بہت تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں پولس کے سپاہی نہیں ہوتے تھے اس لئے رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر چلنا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور لوگ بہت کم اس قسم کی جرأت کیا کرتے تھے۔

جب آہستہ آہستہ بہت سے سالوں کے گذرنے کے بعد انگلستان کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی تو لندن کے شہر نے بھی بڑھنا شروع کیا اور یہ تجارت اور دستکاری کا ایک بہت مصروف مرکز بن گیا۔ تنگ سڑکوں کے دونوں طرف لوگوں کے مکان اور دستکاروں کی دوکانیں بن گئیں۔ دوکانیں مشرقی شہروں کی دوکانوں کی طرح بالکل کھلی ہوئی ہوتی تھیں خریدار جب سڑکوں پر سے گذرتے تھے تو استاد دستکار اور اس کے آدمیوں سے ان کے کام کے دوران میں گپ شپ کیا کرتے تھے۔ مال کی خرید و فروخت کھلے بازار میں کی جاتی تھی اور قیمتوں کے مول تول کے سلسلہ میں بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔

میلوں کے موقعوں پر غیر ملکوں کے تاجر بھی انگلستان میں خرید و فروخت کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ میلے مقررہ اوقات میں منعقد کئے جاتے تھے کبھی سال میں ایک مرتبہ کبھی اس سے زاید۔ گاؤں اور قصبوں کے میلوں کے مقابلہ میں یہ میلے بڑے ہوتے تھے اور ان میں اشیاء کا تنوع بھی زیادہ ہوتا تھا۔ غیر ملکوں کے تاجر اس بات سے واقف ہوتے تھے کہ یہ میلے کب منعقد ہوں گے اور انگلستان میں انہی میلوں کے زمانے میں اپنا سامان یورپ اور ایشیا کے دور دراز ملکوں سے لے کر آتے تھے۔ ان میں سے بعض میلے مثلاً ونچسٹر کا میلہ تجارت کے بین الاقوامی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ فرانس اور ہالینڈ کے تاجر ان میلوں میں ارادہ کر کے شریک ہوتے تھے۔ ان میلوں میں اون، شراب، گرم مصالحے، گوشت، کپڑے، لباس اور مختلف قسم کے زیوروں کی تجارت بڑے پیمانہ پر ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ عہد وسطےٰ کے آخری دور میں انگلستان میں شہر تیزی سے ترقی کر رہے تھے ۱۳۷۷ء میں لندن کی آبادی، ۳۵ ہزار تھی۔ یارک کی ۱۲ ہزار، برسٹل کی دس ہزار، پلیمیتھ کی آٹھ ہزار، کونٹری کی ۷ ہزار، نارویچ کی ۶ ہزار اور لنکن کی ۵ ہزار۔ ۱۳۷۷ء میں انگلستان کی جو مردم شماری کی گئی اس میں ۹ شہروں میں ۵ ہزار سے زاید آبادی تھی گیارہ قصبوں میں تین ہزار اور چار ہزار نو سو ننانوے کے درمیان، ۱۹ قصبوں میں ایک ہزار اور ۲ ہزار نو سو ننانوے کے درمیان اور تین قصبوں میں ایک ہزار سے کم آبادی تھی۔

۲۔ فرانس کے قصبے اور شہر | شاید آپ نے لندن کو جس کی آبادی، ۳۵ ہزار تھی ایک بڑا شہر سمجھا ہو لیکن

پیرس کی آبادی سنہ ۱۳۲۰ء میں ۲ لاکھ تھی اور یہ لوگ بیسیوں پیشوں میں مصروف تھے۔ پیرس کا محل وقوع بہت اچھا ہے یہ دریائے سین کے کنارے واقع ہے اور مغرب سے اس دریا میں تین اور دریا آکر ملتے ہیں اس زمانے میں دریا بہت آسان ذریعہ نقل وحمل کا سمجھے جاتے تھے اس لئے سلطنت روما کے زوال کے بعد فرانس کے بادشاہوں نے پیرس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس شہر نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی اور دریائے سین کے دونوں طرف پھیل گیا۔

ہر سال پیرس میں ایک بڑا میلہ ہوتا تھا جو دو مہینے تک جاری رہتا تھا۔ ان میلوں میں شریک ہونے کے لئے تاجر مل کر بڑی بڑی کمپنیاں بنا لیتے تھے۔ غیر ہموار سڑک پر مال کو لے جانا چونکہ مشکل ہوا کرتا تھا اس لئے لوگ کشتیوں پر سامان لایا کرتے تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے دریائے سین اور اس کے معاونوں میں چلا کرتے تھے لیکن پیرس کی تجارت غیر ملکوں کے ساتھ بہت کم تھی خود فرانس کے دریاؤں کے کنارے جو قصبے آباد تھے انھیں سے پیرس کے لوگ تجارت کرتے رہتے تھے۔ پیرس کی صنعت وتجارت اتنی بڑھتی گئی کہ سنہ ۱۳۰۰ء کے آخری سالوں میں اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہو گئی۔

۴۔ اٹلی کے شہر | اٹلی میں کئی شہر ایسے تھے جو بحر روم میں اپنے محل وقوع کی بنا پر بڑی بڑی بندرگاہیں بن گئے تھے۔ مثلاً وینس اٹلی کے ساحل کے قریب بحر ایڈریاٹک کے چھوٹے جزیروں پر بسا ہوا تھا۔ دوسرے شہروں سے یہ مختلف تھا۔ اس کے گرد اونچی فصیلیں کھنچی ہوئی نہیں تھیں بلکہ اس کا تحفظ سمندر کے ذریعہ ہوتا تھا۔ تنگ بھدی سڑکوں پر چلنے کی جگہ لوگ اس کی نہروں میں کشتیوں پر سوار ہو کر سفر کیا کرتے تھے۔ ان چھوٹے جزیروں میں مکان اور دکانیں تو بنائی جا سکتی تھیں لیکن کاشت اور باغبانی کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے لوگوں کو اپنی گذر اوقات کے لئے کھیتی کی جگہ اور دوسرے کام کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ وہ ماہی گیری تجارت اور صنعت کے کاموں سے لگے ہوئے تھے۔

مشرق سے تجارت کرنے کے لئے شہر کے بہت سے تاجر جہاز بنوایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں وینس والوں کے پاس کئی ہزار جہازوں کا بیڑا تھا۔ ان جہازوں سے انھوں نے بحر روم کے تمام سمندری ڈاکوؤں کو ختم کر دیا تھا اور تجارتی جہازوں کے لئے راستہ محفوظ کر دیا تھا۔ اسی بنا پر وینس اور یورپ کے دوسرے

علاقوں کے درمیان تجارت کو خوب ترقی حاصل ہو گئی تھی۔

ایک پرانی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۱۸ء میں بلجیم کے ایک شہر برگس کے سالانہ میلہ میں وینس کے پانچ جہاز سامان سے لدے ہوئے آئے۔ ان جہازوں میں ہندوستان سے ریشم اور گرم مسالے، مراکش سے شکر دوائیں اور دار چینی، مصر سے سیاہ مرچ اور مسالے، روس سے روئیں دار کھالیں اور موم اور تاتاریوں کے علاقہ سے سونا، ریشم اور روئیں دار کھالیں لائی گئی تھیں۔ جب یہ جہاز وینس اور مشرق کو واپس گئے تو کچے مال سے لد کر گئے۔ مثلاً کھالیں، سریس، نمک، گوشت، مچھلی، سن، عمارتی لکڑی، ٹین اور سیسہ۔ مغربی کاریگروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کی بھی وینس میں مانگ تھی۔ کچھ تو وینس میں ہی بک جایا کرتی تھیں باقی اسکندریہ کے بڑے شہر کو جہازوں میں روانہ کر دی جاتی تھیں جہاں ایک سالانہ میلہ میں مشرقی تاجر جمع ہوا کرتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں اس مال کا کچھ حصہ خشکی کے راستہ سے ہندوستان تک کو بھیجا جانے لگا تھا۔

وینس والے شمالی یورپ کی بندرگاہوں سے کچا مال جہاز پر لادنے کے لئے خریدتے تھے اور مشرقی بندرگاہوں میں جا کر ان کو فروخت کرتے یا ان کے معاوضہ میں دوسرا سامان حاصل کیا کرتے تھے۔ جہاز بھر کر سامان خریدنے کے معنی یہ تھے کہ لوگ ایک بڑی رقم کو خطرے میں ڈالا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کی کشتیاں سال سال بھر تک وینس واپس نہیں آتی تھیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ راستہ میں انھیں سمندری ڈاکو یا طوفان تباہ کر دیا کرتے تھے۔

اس قسم کی تجارت کو چلانے کے لئے وینس کے لوگوں کو بڑے روپیہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس روپیہ کو فراہم کرنے کے لئے وینس کے تاجر متحد ہو کر ساہوکارے کی کمپنیاں بنا لیتے تھے اور جب کسی تاجر کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنے طور پر جہاز پر مال لاد سکے تو ان ساہوکارے کی کمپنیوں سے روپیہ قرض لے لیا کرتا تھا۔ چنانچہ جتنی وینس کی تجارت کو ترقی ہوتی رہی اتنی ہی اس کی دولت اور ساہوکارے کے کام کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ ۱۶۰۰ء میں وینس میں ایک ایسا بڑا بنک موجود تھا جو نہ صرف وینس کے تاجروں کو روپیہ قرض دیتا تھا بلکہ یورپ کے دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس سے لین دین کا کاروبار کیا کرتے تھے۔

اسی طرح وینس کے ساہوکاروں کا اقتدار آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ لوگ اپنے کاروبار میں روز بروز زیادہ روپیہ لگانے لگے اور بنکوں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ روپیہ والے آدمیوں کو وہی طاقت حاصل ہوگئی جو پہلے صرف زمینداروں کو ملی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ تجارت کو ترقی ہورہی تھی اور لوگوں نے ادھر اُدھر سفر کرنا شروع کر دیا تھا بڑے ساہوکار مثلاً میڈیسی وغیرہ کو بہت شہرت اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ جو طاقت پہلے امراء کے ہاتھ میں تھی وہ اب تاجروں کے ہاتھوں میں پہنچنا شروع ہوگئی تھی۔

جرمنی کے شہر | اسی زمانہ میں جرمنی کے کئی شہر بھی اپنی دستی صنعتوں اور تجارت کی وجہ سے دولتمند اور طاقتور بنتے جا رہے تھے۔ جنوب کلوہ شہر تھے جو اٹلی، فرانس یا بحر اٹلانٹک کو جانے والی شارع عاموں پر واقع تھے تاجر قدرتی طور پر مال کو خریدنے اور بیچنے کے لئے ان شہروں میں ٹھیرا کرتے تھے ان میں سے کچھ شہر مثلاً نوزنبرگ اور آسبرگ بہت بڑے تجارتی مرکز بن گئے تھے۔ نوزنبرگ میں بہت سے دولتمند آدمی کپڑے کی صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ کپڑے کی صنعت کے ساتھ دوسری اور صنعتیں بھی ترقی کر رہی تھیں۔ سنہ ۱۵۰۰ء میں آگسبرگ بھی جرمنی کا نہایت اہم شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ایک محلہ ایسا تھا جو تمام یورپ میں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مکانوں کی چھتیں تانبے کی ہوتی تھیں اور مکان پتھر سے بنائے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے سیاحوں کا بیان ہے کہ اس وقت جو لوگ سربرآوردہ اور ممتاز سمجھے جاتے تھے وہ اپنے مکانوں میں لگے ہوئے تانبے اور پیتل کی نمائش کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے بڑے پھاٹک تمام دن کھلے رہتے تھے تاکہ آنے جانے والے لوگ ان کے مکان کو دیکھ کر ان کی بڑائی کا اندازہ کر سکیں۔

ان کے علاوہ شمالی جرمنی میں بحر بالٹک اور بحر شمالی کے ساحل پر اور بھی کئی بڑے شہر تھے مثلاً ہیمبرگ، بریمن اور لوبک۔ جرمنی کے یہ شہر، انگلستان، فرانس، اٹلی اور اسپین کے شہروں کی طرح پتھر کی بڑی فصیلوں سے گھرے ہوتے تھے جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر گول یا چوکور مضبوط دمدمے ہوا کرتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے شہر بالکل قلعہ جیسے ہوتے تھے۔ ان شہروں میں صرف بڑے بڑے

پھاٹکوں کے ذریعہ سے داخل ہو سکتے تھے جو رات کو بند کر دئے جاتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے آخری زمانہ میں صلیبی جنگوں سیاحوں اور تاجروں کے اثر سے تبدیلیاں

اس زمانہ میں جب کہ یورپ والے دنیا سے الگ تھلگ اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور شہروں میں زندگی بسر کر رہے تھے، ایشیا کے اکثر حصوں میں دولت و ثروت کے بڑے بڑے مرکز موجود تھے۔ مشرق بعید میں جس کو اس زمانہ میں یورپ کے لوگ "کیتھے" کے نام سے موسوم کرتے تھے زرخیز زراعتی زمینیں، بڑے تجارتی شہر، منڈیاں، مدرسے اور خوب صورت عمارتیں پائی جاتی تھیں۔ عراق، ایران اور ترکی میں بھی تجارت اور صنعت کی بڑی گرم بازاری تھی۔

آج چین ہندوستان اور ایران کو "پس ماندہ" ملکوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن سنہ ۱۱۰۰ء میں یورپ کے "پس ماندہ" لوگوں کو ایشیا والوں نے شایستگی اور تہذیب کے ہزاروں سبق سکھائے تھے۔ ایشیا کے مہذب لوگ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ کے وحشیوں کو جن کے یہاں نہ منظم حکومت تھی نہ امن و امان، جہاں خانہ جنگیوں اور شراب کی بدمستیوں کا دور دورہ تھا، جو فن مصوری فن عمارت سازی اور فن پارچہ بافی وغیرہ میں بہت پیچھے تھے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کی ناپاکی تو ضرب المثل بن گئی تھی۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مشرقی بندرگاہ میں ایک انگریز جہاز سے سمندر میں گر گیا۔ جب اسے بمشکل تمام سمندر سے نکال کر ساحل پر لایا گیا تو ایک ایشیائی حضرت نے ان پر پھبتی کہی "میاں خدا کی مہربانی کا شکر ادا کرو عمر بھر نہانا نصیب نہیں ہوا تھا خدا نے تمہیں نہلا دیا"

صلیبی جنگیں

سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد ایشیائی تہذیبوں کے بارے میں یورپ کے گوشہ نشین لوگوں کو دو ذریعوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ پہلا ذریعہ صلیبی جنگیں تھیں اور دوسرا ذریعہ یورپ کے وہ سیاح تھے جنھوں نے ایشیا کا سفر کیا اور واپسی پر اپنے سفر ناموں کو یورپ میں شایع کیا۔ سنہ ۱۰۵۰ء کے بعد یروشلم پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور انھوں نے عیسائیوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ دو سو سال تک یعنی سنہ ۱۰۹۶ء سے سنہ ۱۲۹۱ء تک کیتھالک چرچ کے پادری اور یورپ کے امرا اور بادشاہ اپنے لوگوں کو فلسطین پر دوبارہ قبضہ جمانے کے لئے ابھارتے رہے۔ فلسطین پر حملہ کرنے کے لئے سات مہموں کو

تنظیم دی گئی اور کسانوں اور زمینداروں کے مسلح جتھے فلسطین کے لئے روانہ کئے جاتے رہے۔ اس دو سو سال کے عرصہ میں، یورپ کے بہت سے امیروں تاجروں کاریگروں اور کسانوں کو فلسطین میں رہنے کا موقع ملا۔ اس کا اثر انگلستان، فرانس اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں پر بہت اچھا پڑا۔ مشرق قریب اور مشرق بعید کی تہذیبوں کا علم انھیں روز بروز زیادہ حاصل ہوتا رہا اور یورپ اور ایشیا کے شہروں میں تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔

فلسطین دنیا کے بہترین تجارتی علاقہ میں واقع تھا۔ اس کے مشرق میں ایران، ہندوستان اور چین تھا اور مغرب میں مصر، قسطنطنیہ، وینس، فرانس، جرمنی اور انگلستان۔ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں اس کی حیثیت ایک تجارتی چوراہے جیسی تھی۔

یورپ کے سیاح اور تاجر | دوسرا ذریعہ جس سے یورپ کی واقفیت دنیا کے بارے میں بڑھی وہ یورپ کے راہبوں اور تاجروں کے سفر تھے جو انھوں نے ایران ہندوستان اور چین میں کئے۔ سنہ ١١٠٠ء کے بعد سے اگرچہ یورپ کے کچھ عیسائیوں نے یروشلم میں رہنا شروع کر دیا تھا لیکن ایشیا کے باقی ماندہ حصہ کے بارے میں ان کی واقفیت پھر بھی بہت کم تھی۔ انھیں صرف تاجروں کی زبانی ہندوستان اور چین کے قصے سننے کا کبھی کبھی موقع مل جایا کرتا تھا۔ لیکن سنہ ١١٦٠ء اور سنہ ١٣٣٠ء کے درمیان ایک یہودی پیشوا کئی عیسائی راہبوں اور متعدد تاجروں نے ایشیا کے طویل اور پرصعوبت سفر اختیار کئے کچھ تو ایشیا میں ہی رہ پڑے اور وہیں مر گئے کچھ یورپ واپس آئے اور انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے حالات قلمبند کئے۔ ان کے بیان کئے ہوئے قصے پھیلنا شروع ہوئے اور دوسرے لوگوں کو سفر کی خواہش پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ بہت سے یورپ کے سیاح اور تاجر ایشیا جانے لگے اور اس طرح یورپ کی دنیا کی سرحدیں وسیع ہونا شروع ہو گئیں۔

ان سیاحوں کو خشکی اور سمندر پر ہزاروں میل کے سفر نہایت مشکل حالات میں کرنا پڑے۔ ہر طرف وہ دشمنوں سے گھرے ہوتے تھے۔ اکثر راستہ انھیں پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ کھانے اور پینے کو نہیں ملتا تھا۔ عجیب وغریب تجربات ہوتے تھے۔ ایشیا میں پہنچ کر انھوں نے ایک نئی دنیا

کو دیکھا جس کا تمدن و تہذیب ان سے بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے سفر کے حالات کو یا تو خود لکھا یا دوسروں سے لکھوایا۔ ان سیاحوں میں مارکو پولو کے سفر کے حالات سب سے زیادہ مکمل ہیں۔ اگر ہم مشرق کی تہذیبوں کو اس زمانہ کے یورپینوں کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں تو ان سیاحوں کے سفر ناموں کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔

یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کا اضافہ | صلیبی جنگوں اور راہبوں اور تاجروں کی سیاحت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عہد وسطیٰ میں یورپ کی تجارت بڑھنا شروع ہو گئی۔ یورپ کے قصبے اور شہر ترقی کرنے لگے۔ صنعت و حرفت میں اضافہ ہوا اور یورپ کی شکل وہ بننے لگی جو آج پائی جاتی ہے۔ خشکی اور سمندر کے ذریعہ یورپ کے اندر اور یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت میں اضافہ ہوا۔ مشرق سے خصوصاً ہندوستان اور چین سے یورپ کے لوگوں نے تعشیات حاصل کرنا شروع کیں۔ مثلاً گرم مسالے بخور، عطریات، قیمتی پتھر، قالین اور بیش قیمت کپڑے مغربی ایشیا کو یورپ والے غلہ، تیل، شہد، سیسہ، لوہا، فولاد، ٹین، گندھک، کپڑا، چمڑا، اون، صابن، بال دار کھالیں اور غلام روانہ کرنے لگے۔ اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا رہا تجارت بہت عام اور متنوع ہوتی گئی۔ تاجروں کو بہت منافع حاصل ہونے لگا اور وہ ہمیشہ اپنے کاروبار کو زیادہ وسیع کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ وہ اپنے جہازوں کو اپنے مال کے لئے نئی منڈیاں دریافت کرنے کے لئے بھیجنے لگے۔ چنانچہ کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں جو سفر کیا تھا وہ بھی تجارت کے نئے راستے کی تلاش میں ہی کیا گیا تھا۔

سفر اور تجارت کی دشواریاں | اگرچہ تجارت میں اضافہ ہوا تھا لیکن مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں ایسی ایسی مشکلوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کے بارے میں آج ہمیں یقین کرنے میں بھی تامل ہوگا۔ مثلاً سڑکیں بڑی خراب تھیں اور ان پر سفر کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

عام طور پر تاجر اور دوسرے سیاح گھوڑوں کی پیٹھ پر سفر کیا کرتے تھے۔ سڑکیں جنگلوں اور پہاڑوں پر سے ہو کر گذرتی تھیں۔ جنگلوں کے درمیان کہیں کہیں شہر اور گاؤں نظر آتے تھے اور ان کے بیچ میں فاصلے بہت زیادہ ہوا کرتے تھے۔

اکثر گاؤں ایسے تھے کہ جن میں تین چار گھر ہوتے تھے یہاں تک کہ جو گاؤں شہر پیرس کے قریب تھے وہاں بھی مکانوں کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہ تھی۔ اسپین میں آدمی ۵۰ میل تک سفر کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اسے ایک گھر بھی نظر نہ آتا تھا۔ موجودہ زمانے میں تو سیاح کو آدمیوں سے بچنے میں مشکل اور خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن سنہ ۱۶۰۰ء میں سیاحوں کے لئے مشکل اور سلامتی اس بات میں نظر آیا کرتی تھی کہ کسی طرح دو بارہ آدمیوں کے درمیان پہنچ جائیں۔"

پھر ڈاکوؤں کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ کبھی تو یہ واقعی ڈاکو ہوتے تھے اور کبھی زمیندار ان کو اپنے علاقہ میں روک کر ان سے کچھ اینٹھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہ بات ایشیا میں بھی پائی جاتی تھی اور یورپ میں بھی۔ شارع عاموں پر اس میں شک نہیں سرائیں اور رباط ہوا کرتے تھے۔ بعض وقت ان کی حالت بہت اچھی ہوتی تھی لیکن اکثر یہ بہت گندی اور غیر آرام دہ ہوا کرتی تھیں لیکن جب مسافر گھوڑے کی پیٹھ پر لمبا سفر کر کے آتے تھے تو انھیں یہی غنیمت معلوم ہوتی تھیں۔

غرضکہ سنہ ۱۴۰۰ء اور سنہ ۱۵۰۰ء کے درمیان دنیا کے دور دراز علاقوں نے ایک دوسرے سے نزدیک ہونا شروع کر دیا تھا۔

خلاصہ عہد وسطیٰ میں اکثر مردوں اور عورتوں کی زندگی مینر کے اندر محدود ہوا کرتی تھی۔ یہاں چھوٹی جماعتیں بنا کر وہ رہتے تھے اور باقی تمام دنیا سے تقریباً بے نیاز ہوتے تھے۔ وہ اپنے لئے غلہ اور مویشی خود ہی پیدا کر لیتے تھے۔ اپنا آٹا خود ہی پیس لیتے تھے۔ اپنا دھاگا خود ہی کاتتے اور اپنا کپڑا خود ہی بنتے تھے اپنے جوتے خود ہی بناتے تھے اور جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان میں سے اکثر خود ہی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

پھر سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد دنیا کے کچھ حصوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہونا شروع ہوئی۔ لوگ چونکہ زیادہ چیزیں خریدنا اور بیچنا چاہتے تھے اس لئے چیزیں زیادہ بنائی جانے لگیں۔ قصبے تجارتی مرکز بن گئے اور جب لوگ ان کی طرف زیادہ کھنچنے لگے تو ان کی ترقی اور بھی زیادہ ہونے لگی۔ عہد وسطیٰ کی تنگ دنیا وسیع ہونے لگی۔ دنیا کے دور دراز علاقے ایک دوسرے

کے قریب آنے لگے اور ایک دوسرے پر روز بروز زیادہ انحصار کرنے لگے۔ تجارت اور شہروں کی ترقی اور دنیا کا ایک وسیع تخیل پیدا کرنے میں ان تاجروں اور سیاحوں کا بہت بڑا حصہ ہے جنھوں نے مشرق کی سیاحت اور سفر کئے۔

موجودہ عہد سے اگر مقابلہ کیا جائے تو اس زمانے کی زندگی بہت سادہ تھی۔ چونکہ چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں تجارت اور سفر میں دقتیں تھیں۔ آبادی بکھری ہوئی تھی۔ اس لئے اس عہد کی زندگی موجودہ زمانہ کے صنعتی ملکوں کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ہماری دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جسے کبھی اپنی کسی عادت نے مجبور اور پرانی عادت نے پریشان نہ کیا ہو اور جسے اس پر تعجب نہ ہوا ہو کہ بری عادت کتنی جلدی اور اچھی عادت کتنی دیر میں پڑتی ہے۔ حقہ یا سگریٹ کے دو چار کش، افیون و شراب کے دو چار گھونٹ ان نشوں کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ سویرے سونے اور سویرے اٹھنے کی عادت ڈالتے ڈالتے عمر گذر جاتی ہے یہاںتک کہ وہ غضب کی نیند آتی ہے کہ آدمی قیامت تک اٹھتا ہی نہیں۔ انسان کی طبیعت کو پرکھنے والے پنڈت اور وِدوان جی کہتے ہیں کہ تماشا دیکھنے کا شوق بھی ایسی عادت ہے جو ایک بار پڑ جائے پھر چھڑائے نہیں چھٹتی اور پھر لطف یہ کہ جیسا تماشا ویسی ہی اس کی عادت سینما اور تھیٹر کے شوق کو برا کہنے والے بہت سے ہیں لیکن دونوں سے پوچھئے تو معلوم ہوگا پھر مرغ اور مینڈھے اور ہاتھی کی لڑائی دیکھنے کے سامنے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس لئے کہ وہ آدمی کو بالکل ہی اپنا غلام بنا کر چھوڑتی ہے۔ اس قسم کی سب سے بری لت آدمیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہے ایک زمانہ تھا جب روم میں لوگ آدمیوں کے لڑنے، ان کے زخمی ہونے اور مرنے کو ٹکٹ لے کر دیکھا کرتے تھے جیسے ہم آج کل فلم دیکھتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ بڑے رحم دل لوگ ایک مرتبہ آدمی کا خون بہتے دیکھ لیتے تو پھر ایسا چسکا پڑ جاتا کہ انھیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آدمیوں کو لڑا کر تماشا دیکھنے کی رسم روم سے باہر نہیں پھیلی اور اب جو ایسی لڑائی دیکھنا چاہتا ہے اسے اپنی سلامتی کی فکر بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو تماشا دیکھنے کی لت نہ جانے کیا کیا اندھیر ڈھایا کرتی۔

لیکن اب بھی آپ جدھر نظر اٹھائیے، تماشا دیکھنے کا شوق موجیں مار رہا ہے۔ جب کبھی اس کا خیال آتا ہے کہ لڑائی ہوئی تو ان کے اپنے سروں پر ہی بم پھٹیں گے تو لوگ کانپ اٹھتے ہیں پر چاہتے سب ہی ہیں کہ کوئی نہ کوئی تماشا دیکھنے کو ملے۔ اگر ہماری آپ کی قسمت سے ایسا ہو جائے کہ مسٹر چیمبرلین سے دو دو باتیں کرنے کا موقعہ ملے اور ہمارے دل میں جو بات ہے ہم ان سے کہیں کہ آپ نے ہٹلر اور مسولینی کے سامنے جھک کر دنیا کی آزاد قوموں کی بے عزتی کرائی اور آزاد جمہوری حکومت کے اصول کو خطرہ میں ڈال دیا تو وہ پہلے تو ہمارے اوپر الزام لگائیں گے کہ آپ حضرات بنتے ہیں آزادی اور جمہوریت کے شیدائی۔ مگر دل میں نرے تماشائی ہیں اور آپ کچھ بھی کہیں میں ایسا نہیں ہوں کہ آپ کی باتوں کے پھیر میں آکر آپ کو خوش کرنے کے لئے تماشا دکھانے لگوں۔ اگر تم نے مسٹر چیمبرلین کو کسی طرح یقین دلا دیا کہ ہمیں خونی تماشا دیکھنے کی لت تھی اور نہ ہے تو وہ فوراً بحث کا پہلو ذرا بدل کر جواب دیں گے کہ آپ سے میری مراد خاص طور سے آپ لوگ نہیں تھے۔ اس لئے کہ آپ تو برطانیہ کے وفادار شانتی کی پوجا کرنے والے شہری ہیں۔ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا۔ جو سمجھتے ہیں کہ یورپ کی سیاست ایک گاڑی ہے جس میں ہم گھوڑوں کی طرح جتے ہوئے ہیں اور ہم میں سے کامیاب وہی ہوگا جو اس گاڑی کو اپنی طرف کھینچ لے جائے اس کھینچا تانی میں گاڑی الٹے یا تمام گھوڑوں سمیت کسی گہرے غار میں گر جائے۔ آپ لوگوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے پورا زور نہیں لگایا اور ہٹلر اور مسولینی کو گاڑی بہت دور تک جدھر وہ چاہتے تھے کھینچ لے جانے دی۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ گاڑی کو نہیں دیکھتے کہ کتنی نازک ہے راستہ کو نہیں دیکھتے کہ کیسا اونچا نیچا اور خطرناک ہے فاشسٹ گھوڑے ہنہناتے ہیں تھرکتے اور آپ ہی آپ دولتیاں چلاتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بڑا کام کیا۔ اب آپ ہی سوچیے کہ گھوڑے کا کام کودنا ہے کرتب دکھانا ہے یا گاڑی کھینچنا اور میں نے اگر ہٹلر اور مسولینی کو ذرا ڈھیل دیدی اور سیاست کی گاڑی کو ٹوٹنے اور الٹنے سے بچا لیا تو اس میں دنیا کا فائدہ تھا۔ یا نقصان بے شک

لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا کام بھی بنے اور نام بھی رہے لیکن میں تو وہی کرسکتا ہوں جو مرے بس میں ہے ہٹلر اور مسولینی میرے مقابلے میں نوجوان ہیں انھیں تماشا کرنے اور تماشا دیکھنے کا شوق ہے میں جو کچھ کرسکتا ہوں خاموشی سے کرلیتا ہوں مسٹر چمبرلین کا یہ جواب سنکر آپ شاید چپ ہو جائیں اور چمبرلین تھکے ماندے نہ ہوتے اور انھیں نزلہ کی شکایت نہ ہوتی تو ممکن ہو کہ آپ کو قائل ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ دو چار باتیں ایسی ہی کہہ جائیں جنھیں وہ عام طور پر دل میں چھپا رہے ہیں شاید وہ یہ کہدیں کہ آپ لوگ جو میرے اوپر الزام لگاتے ہیں کہ میں نے آزادی اور جمہوریت کی ناؤ ڈبودی بڑی نادانی کی بات کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ہسپانیہ میں دخل نہیں دیا۔ مگر جرمن اور اٹلی کو دخل دینے سے نہیں روکا بھلا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں دخل دیتا تو کس بنا پر سوشلزم سے آپ جانتے ہیں مجھے ہمدردی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکثر لوگ جو سوشلسٹ بنتے ہیں ایک نئے فیشن کی پیروی کررہے ہیں جو سچے سوشلسٹ ہیں وہ گنتی میں بہت کم ہیں انھوں نے مجھے وزیر اعظم نہیں بنایا اور میں ان کو خوش کرنے کا ذمہ دار نہیں۔ تو میں کیوں آپ ہی آپ برطانیہ کو ایک سوشلسٹ ملک سمجھ کر ہسپانیہ کے جھگڑے میں الجھ جاتا رہا یہ اعتراض کہ میں نے جرمنی اور اٹلی کو دخل دینے سے کیوں نہیں روکا سو آپ ہی بتائیے کہ میں آزاد اور خود مختار ملکوں کو کس طرح روک سکتا تھا میں نے جو کچھ طے کیا برطانیہ کے لئے ہی طے کیا اور فرانس پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا کہ وہ بھی ہسپانیہ کے جھگڑے سے الگ رہیں۔ اس لئے کہ فرانس اور برطانیہ سے اتحاد ہے اور ہم دونوں کو ایک ہی پالیسی پر چلنا چاہیئے'' جرمنی اور اٹلی نے فرینکو کا ساتھ دیا اور اس کی اتنی مدد کی کہ وہ آخر میں جیت گیا۔ آپ کی طرح میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ آپ سے بہت بہتر جانتا ہوں کہ جرمنی اور اٹلی دونوں جیسا موقعہ ہوتا ہے ویسی ہی بات کہتے تھے کل وہ قسمیں کھاتے تھے کہ ہم کو ہسپانیہ کے معاملہ سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم فرینکو کے ہم مذہب ہیں اور اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی وہ کھلم کھلا مدد کرتے اور فرینکو کی فتح کو اپنی فتح سمجھتے۔ میں نے جہاں تک کہ سیاست کے آداب

اس کی اجازت دیتے ہیں ان پر ظاہر کر دیا کہ میں انھیں چھوٹا نہیں سمجھتا ہوں ۔ اگر آپ خیالی باتوں میں نہ پڑے ہوتے اور دنیا کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ میں نے بڑی مصلحت سے کام لیا اس لئے کہ آپ جھوٹے کو اس کے منھ پر جھوٹا کہہ دیجئے تو سچا نہیں بن جاتا بلکہ اور زیادہ صاف اور صریح جھوٹ بولنے لگتا ہے ۔ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کرنا میرا کام نہیں میرا کام تو صرف برطانیہ کا فائدہ اور بھلائی کرنا ہے اور آپ اس میں دیکھیں گے کہ میں کبھی نہیں چوکا ۔ فرینکو کے ہوائی جہازوں نے بیسیوں تجارتی ہوائی جہازوں پر بم باری کی اور میں کچھ نہیں بولا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس میں برطانیہ اور برطانیہ کے شہریوں کو خاص نقصان نہیں ہوتا لیکن ستمبر ۳۷ء میں جب ایک بار گی آب دوزوں نے بحر روم اور اٹلانٹک میں حملے کرنا شروع کر دئے تو میں نے فوراً پہرے ہر طرف بٹھا دئے ۔ اور یہ خطرہ بہت جلد دور ہو گیا ۔ اب ہسپانیہ کی لڑائی ختم ہو رہی ہے تو میں اس کا انتظام کر رہا ہوں کہ برطانیہ اور ہسپانیہ کے جیسے تعلقات جنگ سے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہو جائیں اور برطانیہ کو بحر روم میں جو اطمینان پہلے تھا ۔ اب پھر حاصل ہو جائے آپ نے دیکھا کہ میں نے کس استادی سے ایک برطانوی جہاز بھیج کر منور کا کے جزیرے پر جنرل فرینکو کا قبضہ کرا دیا ۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ جزیرے ہسپانیہ کے دکھن میں ہیں اور جزائر سے جو جہاز جنوبی فرانس کی بڑی بندرگاہ مارسی کو جاتے ہیں وہ ان کے پاس سے گزرتے ہیں اس کے بہت قریب ایک اور جزیرہ میجورکا ہے جسے اٹلی نے زبردستی ایک ہوائی مرکز بنا لیا ہے اور جہاں اس کے جنگی جہاز بھی اب رہنے لگے ہیں میں نے اٹلی سے محبت کئے بغیر ایک چال چلی کہ جس سے اٹلی کا پتہ کٹ گیا اور فرینکو پر مفت کا ایک احسان ہو گیا ۔ میں ایسی ہی کچھ چالیں اور سوچ رہا ہوں فرینکو کی حکومت کو میں نے تسلیم کر لیا ہے اور آپ ذرا صبر کریں پھر دیکھئے گا کہ فرینکو باتیں چاہے اسی زبان میں کرے جس میں کہ ہٹلر اور مسولینی بولتے ہیں ۔ لیکن وہ جو کچھ کرے گا مجھ سے صلاح مشورہ کر کے کرے گا یہی میں چاہتا ہوں مسٹر چمبرلین کی ان دلیلوں کا اب آپ کیا جواب دیں گے ۔ سوائے اس کے کہ دیکھئے فرینکو کی سیاست اب کتنے پلٹے کھاتی ہے ۔

ایک ہسپانیہ کا معاملہ نہیں ہے ساری فاشسٹ سیاست کا ہے جرمنی اور اٹلی نے اس میں اپنا فائدہ دیکھا تو وہ فرینکو کو آپ سے پھرا دیں گے اس لئے کہ وہ ابھی تک بالکل انھی کے ہاتھ میں ہے۔ اور شاید فرینکو بھی اپنا فائدہ دیکھے۔ آپ کی سیاست نے دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ آپ کا اور فرانس کا دن ڈوبنے کو ہے۔ اب تو فرینکو موقع بے موقع ضد کرے گا اور جرمنی اسے اکساتا رہے گا جرمنی نے اب پولینڈ اور اوکرائن کو تاکا ہے۔ وہ ضرور اس کی کوشش کرے گا۔ کہ فرینکو سے اس کا یارانہ رہے اور جب وہ اوکرائن کو دبوچے تو آپ بالکل بے بس ہوں۔

مسٹر چیمبرلین یہ بات سنکر ضرور مسکرائیں گے شاید انھیں ہنسی بھی آجائے وہ کہیں گے کہ آپ صرف اخبار پڑھتے ہیں۔ اور میرے سامنے جرمنی کی نئی اور پرانی تمام کارروائیوں کا دفتر کھلا رکھا ہے آپ اس لئے پریشان ہیں کہ جرمنی بہت زیادہ ملک فتح کرے گا اس کی دولت بہت بڑھ جائے گی اور یورپی سیاست کی باگ ڈور بالکل اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ مگر آپ کو اس کا خوف ہے تو آپ نے مجھ ہی کو سارے یورپ کا چوکیدار کیوں سمجھ لیا ہے اور آخر آپ سے بیس کے مرتبہ کہوں کہ میں صرف برطانیہ کی سلامتی کا ذمہ دار ہوں۔ اگر روس پولینڈ اور رومانیہ میں اتنی طاقت نہیں کہ جرمنی کو روک سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ جرمنی کو روکا نہیں جاسکے گا اوکیرائن حاصل کرنے سے جرمنی کی طاقت بہت بڑھ جائے گی لیکن پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ جرمنی کو اوکرائن اسی طرح خالی دھمکی دے کر مل جائے گا۔ جیسے کہ چیکوسلواکیا ملا تھا روس پولینڈ اور رومانیہ اس کی ضرور مخالفت کریں گے اور ہٹلر بھی یہ خوب جانتے ہیں کہ اوکرائن کا مال مفت ہاتھ آنے والا نہیں۔

پھر آپ اس کا بھی خیال رکھئے کہ میں نے مسولینی کو بگڑنے نہیں دیا۔ اور جب وہ چاہیں مجھ سے دوستی و اتحاد کر سکتے ہیں انھوں نے اپنے داماد وزیر خارجہ چیانو کو ابھی پولینڈ بھیجا ہے بلقان کی ریاستوں کو بھی وہ جرمنی کی بڑھتی طاقتوں سے ڈرا رہے ہیں اور اگر میں نے ان کے ساتھ روپے سے سلوک نہ کیا تب بھی وہ جرمنی کے حوصلے دیکھ کر آپ ہی میری طرف جھکیں گے۔ اوکرائن

پر حملہ کرنے سے فاشسٹ سیاست کی کشتی اس طرح ڈگمگائے گی کہ ہر ہٹلر خود پانی میں گر جائیں تو کچھ تعجب نہیں۔ یہ سب باتیں آپ کو خود سوچنا چاہیئے میں اب کچھ نہیں کہونگا۔ ورنہ آپ مجھ پر اور اعتراض جڑ دیں گے مجھے اپنے بڑھاپے اور تجربے پر ناز ہے اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہنے کا موقع نہیں لیکن جب آپ اور تمام مسلوں پر مسٹر چیمبرلین کی رائے سن چکے ہیں تو آپ کے منہ سے چین کا نام ضرور نکل جائے گا ممکن ہے مسٹر چیمبرلین یہ لفظ سنیں ہی نہیں۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے کہدیں۔ کہ اس معاملے میں آپ نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ بھی غلط ہے آپ سیاست کی زبان نہیں سمجھتے آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ چینی اور جاپانی لڑ کس بنا پر رہے ہیں۔ میں نے اب تک اپنی سیاست کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے اس پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ برطانوی سیاست کا مقصد کیا ہو سکتا ہے غور کرنے کے لئے وقت بھی بہت ہے چین اور جاپان کا جھگڑا کچھ جلد طے ہونے والا نہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن مطبوعہ [illegible] پریس دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت :۔ نورالحسن صاحب ہاشمی ایم ۔ اے ۔ (علیگ

جلد ۳۳ ۔ نمبر ۶	دسمبر ۱۹۳۹ سنہ ۶	چندہ سالانہ صہ ۔ فی پرچہ ۸

فہرستِ مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

نظریۂ انقلاب کے چند اہم پہلو

(محمد عبدالقادر صاحب بی ایس سی (آنرز) لندن لکچرار شعبہ معاشیات۔ جامعہ عثمانیہ)

دنیا ایک آزمائشی دور سے گزر رہی ہے۔ سماج اب تک جن بنیادوں پر قائم رہا ہے انھیں ڈھایا جا رہا ہے اور نئی بنیادوں پر تعمیر کا کام شروع ہوگیا ہے۔ آج کل ایک ایسا طبقہ موجود ہے (اور روز بروز لاکھوں اس طبقہ کے ہم خیال بنتے جا رہے ہیں) جو اس بات کی شد و مد کے ساتھ تلقین کر رہا ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سماجی نظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے باہمی گفت و شنید اور اصلاحی تدابیر کے طریقوں کو بجا ل رکھا جائے۔ کیونکہ تبدیل شدہ حالات کے تحت یہ طریقے ازبس غیر موثر اور فرسودہ ہیں اور انقلاب ہی موجودہ دور کی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے۔ دنیا میں جب اس خیال کے حامی کافی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ انقلاب کے سیاسی اور معاشی فلسفہ اور اس کے چند اہم جدید تاویلات کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف انقلاب کے چند بنیادی اصولوں پر مختصر نظری بحث کی جائے بلکہ موزوں مثالوں کے ساتھ اس کے خاص خاص عملی پہلوؤں کو بھی واضح کر دیا جائے۔ یہاں میرا یہ منشا نہیں ہے کہ کسی ایک انقلاب کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ البتہ میں نے چند اہم انقلابوں کی طرف اشارے کئے ہیں تاکہ میرے موضوع کے ضروری عنوانات کی تفہیم میں آسانی ہو۔ انقلاب کے پیدا کرنے کے بعد ہی انقلابی جماعت کو اپنی قوت مستحکم بنانے کے سلسلہ میں جن پیچیدہ، دشوار گذار اور صبر آزما مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے ان کا بھی ایک چھوٹا سا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع میں صرف سیاسی اور معاشی عناصر سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مجھے مذہبی، علمیاتی اور فلسفیانہ محرکات کی اہمیت سے انکار ہے۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ انقلاب کے پیدا کرنے میں مذہبی تحریکات

حکیمانی ایجادات اور فلسفیانہ تخیلات کا خاصہ حصّہ ہوتا ہے۔ محض مضمون کی حد بندی کے خیال سے میں نے چند مقررہ عنوانات پر اکتفا کیا ہے۔

انقلاب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے اس کے اور چند دیگر متجانس اصطلاحات کے درمیان تفریق ضروری ہے ورنہ ذہنی انتشار و پراگندگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے عام بول چال میں ہمیں لفظ انقلاب کے علاوہ دو تین اور لفظوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے مثلاً بغاوت۔ بلوہ۔ شورش وغیرہ۔ گو ان سب میں چند مشترک عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر ایک میں جداگانہ خصوصیات موجود ہیں۔ بغاوت (Rebellion) کا لفظ ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ارضی خود مختاری یا خطہ واری آزادی حاصل کرنے کی غرض سے رعایا کا ایک طبقہ شد و مد کے ساتھ حکومت کے خلاف اقدام کرے۔ چنانچہ بعض مصنفین نے سلطنت روما کے زوال کو صوبجاتی بغاوتوں کا ایک پیہم سلسلہ قرار دیا ہے یہ بغاوتیں مختلف اسباب کے تحت اور مختلف شدّت کے ساتھ جاری رہیں۔ جن میں سے کچھ تو فوجی استبداد کی مخالفت میں تھیں اور کچھ انتظامی اور مالیاتی خرابیوں کو رفع کرنے کی غرض سے۔ جہاں تک دور جدید کا تعلق ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی بغاوتوں کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان میں بیشتر جذبۂ قومیت اور نظریہ قومی خود اختیاری (National Self Determination) کا اثر کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بغاوت کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مروجہ حکومت کے بنیادی نظام کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

بلوہ یا دنگا (Riot) ایک عارضی لیکن تشدد آمیز اجتماعی فتنہ و فساد بپا ہونے کا نام ہے۔ خواہ یہ کسی خانگی فرد یا سرکاری حکام یا حکومتی اداروں کے خلاف ہو۔ لیکن اس مخالفت کا مقصد حکومت کی پائمالی یا مغلوبی نہیں ہوتا۔ یورپ میں پادریوں بادشاہوں۔ خاص خاص معاشی اور سیاسی اداروں کے خلاف اکثر و بیشتر ایسے بلوے ہوتے رہے ہیں۔

شورش (Insurrection) بھی اسی قسم کی تشدد آمیز تحریک کا نام ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وسعت کے لحاظ سے مقابلتہً یہ ایک محدود چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق زیادہ تر مخالفت حکومت کی ابتدائی منازل سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی حیثیت ایک مقامی انقلابی تحریک کی ہوتی ہے جو بہت ممکن ہے بعد میں چل کر مکمل اور باقاعدہ انقلاب کی شکل اختیار کرلے لیکن فی الوقت اس کا مقصد اسی قدر ہوتا ہے کہ حکومتی مسلک میں چند ترمیمیں کروائی جائیں ۔یا چند حکام کی برطرفی عمل میں لائی جائے ۔لیکن یہ کوشش کبھی نہیں ہوتی کہ مروجہ حکومت کو تہ و بالا کر دیا جائے۔

مذکورۂ بالا بحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا تینوں قسم کی مخالفتوں (بغاوت بلوہ ۔اور شورش) میں ایک اہم مشترک عنصر یہ ہے کہ ان سب کا مقصد سماج کے سیاسی اور معاشی بنیادوں کو ڈھانا نہیں بلکہ ان کو برقرار رکھتے ہوئے چند تبدیلیوں کے لئے حکومت کو مجبور کرنا ہے ۔انقلاب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔اس میں رائج الوقت سیاسی اور معاشی نظام کو تہ و بالا کرنے اور نئی بنیادوں پر ایک نئی عمارت قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے ۔بالفاظ دیگر انقلاب ایک تشدد آمیز اور مسلح کوشش ہے جو برسر اقتدار حکومت کے خلاف کی جاتی ہے تاکہ مملکت کے مسلمہ اور مروجہ مقاصد کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کے عوض مملکت کی بنیادیں انقلابی جماعت کے سیاسی اور معاشی فلسفہ پر قائم ہوں ۔یہ ایک ایسی تحریک ہوتی ہے جو نہ صرف ایک عظیم الشان اور سنسنی خیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی اہم اور دیرپا اثرات کی حامل ہے۔

فطری طور پر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس قسم کی تحریک کوئی آسان چیز ہے جسے جب جی میں آئے شروع کر دیا جائے یا اس کے بھی کوئی خاص لوازم ہوتے ہیں جن کی عدم موجودگی میں انقلاب کا پیدا کرنا غیر ممکن بن جاتا ہے ۔ظاہر ہے کہ انقلاب چند خاص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب تک کہ یہ بدرجہ اتم موجود نہ ہوں انقلاب پیدا ہو نہیں سکتا۔ بہت

ممکن ہے کہ کچھ حالات ایسے پائے جائیں کہ ملک میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو لیکن جب تک کہ سماج کی برائیاں پر امن اور اصلاحی طریقوں کے ذریعہ ناقابل علاج نہ بن جائیں اس وقت تک نہ انقلابی تحریک پنپ سکتی ہے اور نہ کامیاب انقلاب کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی قبل از وقت تحریکات زیادہ سے زیادہ بغاوت۔ بلوہ۔ یا شورش کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتیں پس انقلاب کے پیدا کرنے میں صحیح موقع کی تلاش اور اس کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

انقلاب اسی صورت میں ناگزیر ثابت ہوتا ہے جب سماج میں دو علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے کے مخالف طبقے موجود ہوں یعنی ایک طرف تو قلیل التعداد لیکن ذرائع پیدائش پر قابض طبقہ اور دوسری طرف ایک کثیر التعداد لیکن مفلس اور نادار طبقہ۔ اور پھر یہ کہ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج تفریق حائل ہو چنانچہ انقلاب روس میں "پرولتیاری" طبقہ نے اصل شاہی نظام کا خاتمہ کیا اور اپنے اغراض کے مطابق مملکت کی از سر نو تشکیل کر لی۔ اسی سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات بنیادی ہونے کے بجائے محض سطحی اور فروعی ہوں تو انقلاب کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی صورت میں مخالف گروہوں کے مابین مصالحت قائم ہونے کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

انقلاب کے پیدا ہونے کے لئے اختلافات کا محض موجود رہنا ہی کافی نہیں۔ بلکہ مظلوم اور زیر بار طبقہ کو اس کا بڑھتا ہوا احساس ہونا چاہیئے۔ یہی سبب ہے کہ کارل مارکس نے طبقہ داری شعور (Class Consciousness) پر بہت ہی زور دیا ہے لیکن ضروری ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ مجوزہ علاج کے سوا کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تاریخ شاہد ہے کہ اقوام کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات رائج الوقت معاشرتی نظام کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسی صورتوں میں معاشرتی نظام میں مقابلہ کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے اور بالآخر ترقی پذیر قوتوں کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ انقلاب ایسی چیز نہیں جو دفعتہً نمودار ہو جائے۔ بلکہ یہ متعدد اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے پیدا ہونے اور رنگ لانے کے لئے بالعموم سالہا سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاگیری نظام کے زوال اور "بورژوا" طبقہ کے آغاز ونشوونما کے لئے ایک مدت درکار ہوئی۔ اسی طرح "پرولتیاری" جماعت میں طبقہ واری شعور جو پیدا ہوا وہ نتیجہ ہے کئی سالوں کے مظالم اور مصائب کا جو مزدوروں کو اٹھانے پڑے۔

ایک اور اہم عنصر جو کامیاب انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ وہ فوج کے طرز عمل سے متعلق ہے۔ مقتدر جماعت اپنی فوج کے ذریعہ انقلابیوں کے منصوبوں کو شکست دینے کی حتی الوسع کوشش کرے گی اور تاوقتیکہ خود فوج کا طرز عمل اپنے فرماں رواؤں کے ساتھ نہ بدل جائے انقلاب کی کامیابی کے بہت کم امکانات ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے فوج میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہونی چاہیئے جو انقلابیوں کے ہم خیال ہوں اور جو حسب موقع مقتدر جماعت سے لڑنے کے لئے تیار رہیں۔ فوج کو بغاوت پر ایسی وقت آمادہ کیا جا سکتا ہے جب خود فوج کو فرماں رواؤں سے سخت شکایتیں ہوں یہ چیز بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ بعض موقعوں پر فوج کی ذہنیت اور رجحانات کے متعلق غلط اندازے قائم کر لینے کی وجہ سے انقلابی جماعت کو ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موافق صورت حال کا پیدا کرنا دراصل اس چیز پر مبنی ہے کہ پہلے سے ہی فوج کو حکومت سے حقیقی شکایتیں ہوں اور اس سے انقلابی جماعت بروقت اور صحیح فائدہ اٹھائے۔

فوج کے متعلق بحث کے ساتھ ہی "تشدد" کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کوئی مقتدر جماعت اپنے ان اصولوں کو (جو کہ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے ہوں) خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ ان کو بحال رکھنے کی کوشش نہ کرلے۔ اور اس غرض سے وہ ہمیشہ مسلح طاقت کو کام میں لاتی ہے۔ ایسی حالت میں مخالف جماعت بھی "ترکی بہ جواب ترکی" پر عمل کرتے ہوئے قوت کا جواب قوت سے دیتی ہے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ "تشدد"

اور قوت" کے استعمال کو بذاتہ غیر اخلاقی سمجھنا نہایت ہی غلط ہے۔ تشدد کا استعمال اس حد تک جائز ہے کہ اس کے ذریعہ مظلوموں کو پنجۂ استبداد سے آزاد کر کے ایک بہتر نظام قائم کیا جا سکے۔ " قوت" اور " تشدد" سے متعلق اصلی مسئلہ ان کے استعمال یا غیر استعمال کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کو کس وقت استعمال کیا جائے اور کس حد تک۔

مذکورۂ بالا حالات کے علاوہ کچھ ایسے سامان بھی ہو سکتے ہیں جو انقلابی جماعت کے مقاصد میں مزید اعانت کا باعث بنیں۔ لیکن یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ لوازم انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناکام جنگ یا سخت اور تباہ کن قحط کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہو سکتی ہے اور نتیجۃً انقلابی عمل میں آسانی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ان واقعات سے متوسط طبقہ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے جذبات متزلزل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ طبقہ انقلابی جماعت کی مدد نہ کرے تو بھی اس کے غیر جانبدار رہنے کے زیادہ قرائن ہو جاتے ہیں۔ عوام کی بے چینی اور اضطراری کیفیت مقامی شورشیں اور دنگے عمارات عامہ پر بمبازی سرکاری دستاویزات کا جلا دینا۔ ہڑتالوں کی کثرت احتجاجی جلوس وغیرہ طوفان انقلاب کی دیگر علامتیں ہوتی ہیں۔

انقلابیوں کا اصلی کمال مواقع کے صحیح استعمال اور پھر حکومت کی کل (جس کے ذریعہ حقوق قائم محفوظ رہتے ہیں) پر قبضہ جما لینے میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی ماحول سے صحیح فائدہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ اس لئے لینن نے بولشوک جماعت کو نومبر کی شورشں کے وقت لکھا تھا کہ انقلابی ایسے موقع پر تاخیر سے کام لیں تو تاریخ ان کے فعل کو ہرگز معاف نہ کرے گی۔ انقلاب روس کے واقعہ میں ہمیں مواقع کے بروقت استفادہ کی ایک بین مثال ملتی ہے۔ اس کے برعکس جنگ عظیم کے بعد انقلاب جرمنی موقعوں کو کھو دینے کی ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ "سوشل ڈیموکراٹس" (Social Democrats) نے اصلی مسئلہ کو نظر انداز کر دیا اور نظام قدیم کے ساتھ مصالحت کر لینا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جمہوریت جو جرمنی میں قائم

ہوئی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔ پروفیسر لاسکی نے لکھا ہے کہ جرمانی جمہوریت کی شکست
ہٹلر کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں نہیں ہوئی بلکہ اس سے پندرہ سال قبل "دستور ویمر" کے بنانے
والوں کے ہاتھوں ہوئی یعنی جنگ کے بعد جو دستور جرمنی کے لئے مرتب ہوا اس میں جمہوریت
کی آئندہ تباہی کے جراثیم موجود تھے۔

انقلاب کے اسباب کی تشریح کے بعد خود ان مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہے جو دوران
انقلاب میں پیش آتے ہیں۔ انقلاب کے آغاز پر جب مقتدر جماعت اپنی کمزور حالت
کو محسوس کرتی ہے تو عوام کو چند رعایتیں عطا کرنے لگتی ہے۔ یہ چیز انقلابی محاذ میں تفرقہ اندازی
کا باعث بنتی ہے۔ اس جماعت کا ایک حصہ ان عطا کردہ رعایتوں سے خوش اور مطمئن
ہوجاتا ہے اور برسرپیکار فریق سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے اور اب ایک ایسی جماعت
قائم کرلیتا ہے جو آئینی طریقوں پر اور "امن عامہ" پر زور دیتا ہے لیکن انتہا پسند انقلابیوں
اور اس نئی رجعت پسند فریق میں برابر کشمکش جاری رہتی ہے۔ اگر آخر الذکر زیادہ طاقتور بنتی
جائے تو پھر ایک مخالف انقلاب ——— (Counter Revolution) کے لئے
راہ صاف ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اول الذکر اگر زیادہ طاقتور ثابت ہو تو پھر انقلابی حکومت
قائم ہوجاتی ہے۔ لیکن انقلابیوں کے مسائل یہیں ختم نہیں ہوجاتے بلکہ درحقیقت دشواریوں کا
آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس وقت جب انقلابی اپنی طاقت کو مستحکم بنانے میں مصروف
رہتے ہیں رجعت پسند جماعت دوبارہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع
کرتی ہے۔ شاکی اور غیر قانع انقلابیوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے اور ان کی مدد حاصل ہوجانے
پر ملک میں دوبارہ ایک ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس کے تحت بعض موقعوں پر انھیں ایک
ایسا نظام قائم کرنے میں کامیابی ہوجاتی ہے جو قدیم نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا بلکہ
جو ایک ترمیم شدہ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں انہیں انتہا پسند انقلابیوں کے
حملہ آور ہونے کا خدشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان انقلابیوں کو

جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی اہمیت اصلی جنگ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے یعنی انھیں ایک ایسے محاذ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس میں رجعت پسند اعتدال پسند اور ابن الوقت انقلابی —— (Revolutionaries by Adoption) سب شامل رہتے ہیں طرفہ تماشا یہ کہ بیرونی حکومتوں کی مداخلت اور ان ملکی جماعتوں سے ان کا رشتہ قائم ہونے کا خدشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اسی لئے انقلاب فرانس کے دوران میں ایک مجلس تحفظ عامہ —۔ (Committee of Public Safety) قائم ہوئی تاکہ ملکی اور بیرونی رجعت پسند طاقتوں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔

انقلاب کے بعد ہی ان مشکلات کا زمانہ ایک دور عبوری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فتوحات کو مستحکم بنانے کی خاطر" آمریت " کی ضرورت بھی پیش آتی ہے اور کسی قسم کی مخالفت روا نہیں رکھی جاتی۔ یہ دور آزمائش گزر جانے کے بعد خود اندرون ملک زندگی کے جملہ شعبہ جات کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اور تھوڑی بہت رواداری سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ روس میں گو انقلاب ۱۹۱۷ء میں ہوا لیکن" معاشی نظم جدید" —(New Economic Planning) بعد میں قائم کیا گیا اور مخالفین کے ساتھ روادارانہ برتاؤ تو بہت بعد میں شروع ہوا۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم

(از جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب)

مسز سروجنی نائیڈو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ :۔

"ہندوستان کے عہد گزشتہ کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو ماضی ہی میں محدود رکھا اور کبھی مستقبل کی طرف نظر نہیں دوڑائی ۔عہد موجودہ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے ماضی اور مستقبل دونوں ہی کے اوپر نظر دوڑانے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلہ میں حال کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کو سمجھے بغیر ماضی و مستقبل کے واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا محال ہے ۔اس میں ہمیں گزشتہ اور آئندہ حادثات کی جھلک نظر آتی ہے، ارتقا کی تمام داستانیں اسی میں پوشیدہ ہیں بلکہ یہ ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں اگلے پچھلے سب واقعات نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں جب ماضی و مستقبل دونوں حال میں غرق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہماری اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے قطعاً بے خبر رہیں ۔انیسویں صدی کے آخر تک لوگوں کو ان تبدیلیوں کا مکمل احساس نہیں ہوا تھا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا کو احاطہ کر رہی تھیں، اور ہم ہندوستانیوں کو تو شاید آج تک ان تغیرات کا صحیح علم نہیں ہو سکا ۔اب دوری و نزدیکی کا سوال ہمیشہ کے لئے مٹ چکا ہے تمام ممالک ایک دوسرے کے ہمسایہ اور ایک بڑے کل کا جزو بن چکے ہیں اور یہ رشتہ اس قدر استوار ہو گیا ہے کہ اگر پیرس، وائنا یا ٹارنٹو میں کوئی طبی ایجاد ہوتی ہے تو وہ دو ماہ بعد ہندوستان میں بھی عام ہو جاتی ہے ۔ آسٹریلیا یا کناڈا میں اگر گیہوں کا نرخ بڑھ جاتا ہے تو لائل پور کی ایک

بڑی آبادی بھوکوں مرنے لگتی ہے۔ روئی کی قیمت اگر بڑھ جاتی ہے تو الموڑہ اور آسام میں اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آج چین و فلسطین کا معاملہ ہندوستان کا معاملہ ہے اور پولینڈ کا معاملہ تمام دنیا کا معاملہ۔ غرض اب گوشہ نشینی ناممکن ہو چکی ہے اور اپنے آپ کو دنیا کے معاشیاتی اور سیاسی جھنور سے نکالنا محال ہو گیا ہے۔ اب پیداوار کی تعداد اور اس کے طریقے بدل گئے ہیں مشین نے "بڑی" تجارتوں کے فروغ میں امداد دی ہے۔ نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم نے انسانی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اور موجودہ تباہ کن جنگ کا اثر جانبدار اور غیر جانبدار سب ہی پر یکساں پڑ رہا ہے —— لیکن ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ ہمیں دنیا کی ان پیہم تبدیلیوں اور اس میں اپنے فرائض کا صحیح علم ہی نہیں۔ ہمیں "ہر دم رواں دواں" زندگی کا احساس ہی نہیں پیدا ہوا۔ ہماری زندگی کے ادارے اب بھی اسی جگہ پر ہیں' جہاں پہلے تھے' اور ہمارا تمام نظام معاشرت و سیاست پچھلی ہی منزل پر ٹھہرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور ہماری ضرورتوں کے قدم بقدم نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اب اس میں گدلے اور رُکے ہوئے پانی کی سی بدبو آنے لگی ہے۔

ضرورت ہے کہ معاشرتی ورثہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ زمانہ کے تغیرات کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ زندگی کی دوبارہ تنظیم کی جائے اور نظریات میں ضروری تبدیلیاں پیدا کی جائیں دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہمیں ماضی کی صحیح تعبیر' حال کی صحیح تفسیر اور مستقبل کی صحیح تیاری کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام سب سے بہتر اسکولوں میں ہو سکتا ہے جہاں کہ نئی قوم تیار کی جا رہی ہے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام اس ضرورت کو پورا کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ آپ کسی ہندوستانی اسکول کے طالب علم کو لے لیجئے اور اس سے پوچھئے کہ جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ یہ کیوں ناگزیر تھی؟ ورسائی کی صلح کیوں ناکام کوشش اور "صلح نما جنگ" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی؟ موجودہ جنگ کے اسباب کیا ہیں؟ صلح کس کا نام ہے اور جنگ

کس کو کہتے ہیں؟ تو وہ حیرت سے آپ کا منھ تکنے لگے گا۔ پھر یہ تو بڑے سوالات ہیں ذرا اس سے اس گیہوں اور جو کے بارے میں پوچھیے جو وہ روز کھاتا ہے یا بنک کے بارے میں جو اسے روپیہ کے عوض چک بک دے دیتا ہے یا دوکان دار کے بارے میں جو اس کی ضرورتیں فراہم کرتا ہے یا اسی پولیسمین کے بارے میں پوچھئے جو حفاظت و امن کا ضامن ہو تو شاید وہ ان سوالوں کے "غیر اہم" ہونے پر ہنس پڑے! لیکن اس کا الزام بچوں پر رکھنا بیکار ہے اس لئے کہ وہ ہمارے ہی آغوشِ تربیت کے سپلے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ جو پڑھے لکھے کہلاتے ہیں ان سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔

ہمارے بہت سے اسکولوں میں ابھی تک شہریات کورس میں داخل نہیں ہے تاریخ بھی ۱۸۵۷ء یا ۱۹۰۱ء سے آگے نہیں پڑھائی جاتی۔ اسکول کا ماحول بھی عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ طالب علم واقعات حاضرہ کے متعلق معلومات فراہم کر سکے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ علاؤ الدین اور اکبر کی فتوحات کے بارے میں بڑی تفصیل سے جانتا ہے لیکن گاندھی، جواہر لال، جناح، ہٹلر، مسولینی، اسٹالن، رزوولٹ اور چمبرلین کے بارے میں بالکل ناواقف ہوتا ہے اسی طرح وہ ریگولیٹنگ ایکٹ کے بارے میں زیادہ جانتا ہے لیکن ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور "میثاقِ میونک" سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جب اسکولوں سے نکلتے ہیں تو انھیں باہر کی فضا بالکل دگرگوں نظر آتی ہے۔ وہ ذہنی بے مائگی کی وجہ سے اپنے آپ کو اسی ماحول میں بالکل اجنبی محسوس کرتے ہیں ہر چیز کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں۔ یہ حال کی صحیح تعلیم نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سے بھی بے خبر ہوتے ہیں اور فرد اکی طرف سے بھی بے نیاز۔

واقعاتِ عالم کا تسلسل اور ان کا ارتقائی پہلو ذہن نشین کرانے کے لئے شہریات اور تواریخ دونوں کو سائنٹیفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے پڑھانے کی ضرورت ہے لیکن اسی کے

ساتھ ساتھ "واقعات حاضرہ" کا ایک کورس بھی اگر داخل نصاب کر دیا جائے تو وہ بے حد مفید ہوگا۔ اس کو پڑھاتے وقت اگر استاد تحقیق و تجسس کے جذبہ کو فروغ دے، طالب علموں کو کد و کاوش اور رد و قدح کے مواقع بہم پہنچائے اور ایمان داری کے ساتھ موافق اور مخالف رائیں پیش کر دے اور خود لڑکوں کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع دے تو وہ بہت اچھے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ علت و معلول کو پیش کر دے اور ماضی، حال اور مستقبل کے ربط کو ظاہر کرتا جائے اور اس طریقہ سے طالب علموں کی سائنٹیفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے واقعات کو سوچنے اور پرکھنے کی عادت ڈلوائے۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ حال کی پیچیدگی طالب علموں کے لئے کافی دقت کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی الجھاؤ کی وجہ سے اس تمام مواد کو باقاعدہ ترتیب بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ لڑکے ہنگامہ خیز اور غیر اہم باتوں کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو جائیں اور ان کے نسلی، مذہبی اور سیاسی تعصبات واقعات کی تہ تک پہنچنے میں حائل نہ ہوں۔ لیکن "واقعات حاضرہ" کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان تمام دقتوں کو دور کرنا ضروری ہے اس لئے کہ ترقی کا انحصار ان شہریوں پر ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے کما حقہٗ باخبر ہیں اور ان کا عقلی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم میں حسب ذیل تجاویز مفید ثابت ہوں گی:۔ بچوں کے اندر مختلف اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور ان کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کئے جائیں تاکہ وہ مختلف شہادتوں اور روایتوں کو جانچ سکیں اور ان کی تحلیلی قوتوں کو فروغ حاصل ہو سکے۔

بچوں کو اخبارات کے مختلف صفحات کی اہمیت بھی تبلائی جائے اور ان کو دیکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔ طالب علموں کی فعالیت اور عملیت کو بھی کام میں لایا جائے اور بعض وقت انھیں کچھ کام کرنے کو دیے جائیں۔ کبھی کبھی اخبارات کے کچھ نقشے بڑے

پیمانہ پر بنائیں یا انھیں کاٹ کر اپنی کاپی پر چپکالیں۔ ابھی حال میں اسٹیٹسمین کی ۸ اور ۱۵ ستمبر کی اشاعتوں میں جو یورپ کے نقشے شائع ہوئے وہ طالب علموں کے لیئے بڑے کار آمد تھے۔ بچوں میں اخبارات کی تصویریں بھی جمع کرنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس کام کو تقسیم کر دینا بہت مناسب ہوگا کچھ لڑکے بڑے آدمیوں یا نئی ایجادات کے بارے میں اور کچھ ہندوستان کی خبروں یا بین الاقوامی سیاسیات سے متعلق تصاویر فراہم کریں۔

اخبارات کی تعلیم اور دیگر علوم میں تعلق باہمی بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات لڑکوں سے خبروں کا ایک کالم یا مقالہ افتتاحیہ لکھوایا جائے یا کسی کتاب پر تبصرہ کروایا جائے۔ اس سے لکھنے کے نئے ڈھنگ معلوم ہوں گے اور ان کے طرز تحریر پر "کتابی" رنگ غالب نہیں ہوگا۔

کبھی کبھی واقعات حاضرہ پر مباحثے منعقد کئے جائیں اور ریڈیو اور سینما کے ذریعہ جو خبریں حاصل ہوں ان پر تبصرے کئے جائیں۔ کچھ لڑکوں سے مقالے بھی پڑھوائے جائیں اور انھیں اس سلسلہ میں اخبارات کے تراشے رکھنے کا شوق دلایا جائے۔ ان تراشوں اور رسائل کی امداد سے مضامین بھی لکھوائے جائیں لیکن تحریروں اور تقریروں دونوں میں اس پر زور دیا جائے کہ طالب علم باقاعدہ سند پیش کریں۔ محض یہ کہہ دینا کہ "ہم نے اخبار میں دیکھا ہے" کافی نہیں ہے۔ اخبار، تاریخ، صفحہ اور مضمون نگار کے نام اور عنوان کا حوالہ ضروری ہے۔ کبھی کبھی اساتذہ اور باہر کے لوگوں کو بھی تقریروں کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ واقعاتِ حاضرہ کی تعلیم میں اسکول میگزین بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بہت سے اسکول قلمی رسالے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے نکال سکتے ہیں اور اگر ان کا کام لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے تو ان کے ذریعہ بھی گرد و پیش کے حالات سے بہت کچھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

لڑکوں میں مہارت خصوصی کا بھی شوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تمام کلاس کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک گروہ کے سپرد ایک خاص حلقۂ عمل کر دیا جائے۔ مثلاً ایک کے

سپرد یورپ کی خبریں کردی جائیں دوسرے کے سپرد ہندوستان کی اور تیسرے کے مقامی۔ اس سے بھی بہت مفید نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم کے لئے اسکول میں بلیٹن بورڈ بھی ضروری ہے اسی کے ذریعہ لڑکوں میں مختلف رسائل اور اخبارات کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے ہر لڑکے کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے نام کے آگے اسی مضمون اور رسالہ کا نام لکھ دے جو اس نے پڑھا ہے اور جس کو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی پڑھیں۔ اس سے لڑکوں کو مختلف اخبارات کے نام بھی معلوم ہوں گے اور انھیں پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔ ہفتہ کے مباحثہ کے لئے طالب علم مختلف موضوعات بھی تجویز کر سکتے ہیں اور ان کی اطلاع وہ معہ اپنے نام کے بورڈ کے ذریعہ دے سکتے ہیں۔ ان مباحث میں تنوع ضروری ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ دو لڑکے ایک ہی مضمون کو منتخب کریں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم میں استاد کو حتی الوسع غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے بیانات تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوں۔ اسے چاہیئے کہ واقعہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ ایک بڑے قصہ کا جزو معلوم ہو، تاریخ ارتقا کی ایک داستان نظر آئے، اور ماضی اور حال کا ربط خوب واضح ہو جائے۔ اسباب وعلل، نتائج واثرات پر زور دیا جائے لیکن واقعات حاضرہ کی تعلیم دیتے وقت کسی بات کو بھی "لفظ آخر" کے طور پر نہ پیش کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ دائمی حقیقت ہے اور اس میں چوں وچرا کا امکان ہی نہیں۔

ملکۂ بہار

(صدیق احمد صاحب صدیقی۔ بی اے۔ آنرز (علیگ))

انگلستان کے مختلف قریوں اور دیہاتوں میں گھومنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیاحت کے سلسلے میں آوارہ گردی کرتا ہوا میں ایک ایسے گاؤں میں جا پہنچا جو پختہ سڑک سے کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں کے باشندوں کی سادہ تہذیب، ستھری اور قدیم معاشرت ان دیہاتوں کے تمدن سے مختلف معلوم ہوتی تھی جو عین شاہ راہ پر واقع تھے یہ غالباً اس وجہ سے کہ یہاں کے ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ جی چاہا کہ رات وہیں بسر کی جائے چنانچہ ایک چھوٹی سی دہقانی سرائے میں جا کر میں نے قیام کیا۔ موسم کی خاموش سنجیدگی اور میرا آوارہ گردی کا شوق۔ چائے پی کر ٹہل کھڑا ہوا۔ چند قدم چل کر سامنے گاؤں کا گرجا گھر نظر آیا۔ یہ مکانات سے ہٹ کر میدان میں واقع ہوا تھا۔ اس کا مینار جس پر کائی کی ایک موٹی تہ جم گئی تھی اور جو قرب و جوار کی سبز پوش وادیوں کے درمیان ایک شان امتیاز کے ساتھ کھڑا تھا میرے لئے نہ صرف کافی جاذب توجہ ثابت ہوا بلکہ میرے احساسات نے بھی اس کی خاموش دعوت قبول کی اور میں بے تکلف اس کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

عموماً دن بھر کی ہیجان بارش میں ختم کر چکی ہو شام کے وقت بہت دلفریب ہو جاتے ہیں اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ موسم بہت نکھرا ہوا اور صاف تھا۔ سپید بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے غیر محسوس رفتار سے ہوا میں تیر رہے تھے۔ گویا کوشش کر رہے تھے کہ آسمان کی خونی نشانیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں۔

آفتاب کی ترچھی کرنیں ایک الم انگیز خاموشی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے

ایک مقدس عیسائی دنیا کی گناہ پروری پر اپنے آخری لمحات میں مسکراتا ہے اور اپنے خاموش زوال سے یقین دلاتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے قدس کی تابانیوں کے ساتھ واپس آئے گا۔

موسم کے اس "موت آگیں" سناٹے نے میرے قدم پکڑ لئے اور میں ایک قبر کے پتھر پر جو نصف کے قریب دھنس چکا تھا بیٹھ گیا۔ شام کا وقت۔ قبرستان کی ویرانی اور آفتاب کی ڈوبتی ہوئی نبضیں! ماضی کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

بچپن کے معصوم احباب۔ دور افتادہ اعزا اور قبریں سونے والے متعلقین ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور میں اس روح فرسا تخیل میں گم ہو گیا جس میں غم کی تلخی بھی مسرت چند روزہ کی حلاوت سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گرجا کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا۔ اس کی کرخت لیکن جھنکار پیدا کرنے والی سنجیدہ آواز میرے خیالات کی ہمنوائی کر رہی تھی۔ یہ غالباً کسی نئے مہمان کی آمد کا اعلان تھا جو یہاں کی برادری میں شریک ہونے والا تھا۔

فوراً ہی میری نظر ایک جنازہ کے جلوس پر پڑی جو گاؤں سے قبرستان کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میت کے چوبی صندوق کو چند نوجوان لڑکیاں سنبھالے ہوئے تھیں اور ان کے آگے آگے ایک خوب صورت دہقانی دوشیزہ سادہ فراک پہنے سفید پھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لٹکائے متانت کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی ناکتخدا لڑکی کا جنازہ ہے۔ سوگوار والدین جو بظاہر گاؤں کے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، میت کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ باپ کی ساکت نگاہیں، کھنچے ہوئے ابرو اور ستا ہوا چہرہ اس کی قلبی کش مکش کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ "رنج اگر دل کی گہرائیوں میں محبوس ہو جائے تو خطرناک حد تک تکلیف دہ ہو جاتا ہے"۔ اس کی بیوی ایک ضعیف عورت۔ شوہر کے داہنے بازو کو پکڑے زور زور سے کراہتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی تنر پا دینے والی چیخیں اندرونی کرب و بے چینی کی علامت ماں کی بے لوث اور معصوم محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں۔

میں بھی جنازہ کے ہمراہ گرجا میں چلا گیا۔ صفوں کے درمیان میں صندوق رکھ دیا گیا۔ دو سفید ہار اور سفید داستانے اس جگہ پر لٹکا دیئے گئے جہاں وہ موت کی آغوش میں پناہ لینے والی لڑکی اپنی زندگی میں بیٹھا کرتی تھی۔

جنازہ کی دعا! موت کا روح شکن راگ!! والدین کی سوگوار محویت!!! کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر تڑپ نہ اٹھا ہو؟ کون خوش قسمت ہستی ایسی تھی جو اپنے کسی عزیز محبوب یا محبت کرنے والے دوست کو سپرد خاک نہ کر چکی ہو؟ اور پھر اس دعا کی اندوہناکی کا کیا ٹھکانا جو اس مجسمۂ حسن و معصومیت کے لئے کی جائے جس نے اپنی زندگی کے لہلہاتے ہوئے شباب میں دنیا سے منہ پھیر لیا ہو!

ان مسرت بھرے لمحات میں جب جسم کو انتہائی خاموشی کے ساتھ قبر کے سپرد کیا جا رہا تھا اور عناصر دنیا سے عاریتہً مانگے ہوئے حسین ذرات پھر واپس کئے جا رہے تھے اس لڑکی کی ہمجولیوں کا سسک سسک کر رونا! معاذ اللہ۔ کتنا دلگداز سین تھا۔ ضعیف باپ اب بھی اپنے جذبات غم کو اس یقین سے دبانے کی کوشش میں تھا کہ جو لوگ دربار ایزدی میں پہنچ جاتے ہیں ان پر رحمت کی بارش زیادہ ہونے لگتی ہے۔ لیکن غم نصیب ماں جس کی نظروں میں صرف اپنی لڑکی کی آخری تصویر تھی اور جس کی نگاہیں محبت کے ظاہری حدود سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتیں مسلسل آنسوؤں کی بارش کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ایک غنچۂ ناشگفتہ جس کی ہر ہر پنکھڑی سے ہزاروں آرزوئیں لپٹی ہوئی ہیں، موت کی تیز و تند ہوا سے مرجھا رہا ہے۔ اس کے غم آلود بشرے اور گریۂ پیہم کو دیکھ کر مجھے راحیل کے قلبی اضطراب اور روحانی اندوہ کا اندازہ ہو گیا۔

سرائے میں واپس آکر میں نے اس کے متعلق تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ ایک معمولی حادثہ تھا جو آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔

وہ ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ حسین اور معصوم۔ شاید قدرت نے حسن کا انتہائی

بلند معیار مقرر کر کے اس کو بھیجا ہو۔ گاؤں کے باشندوں کو اس پر ناز تھا تو کیا بے جا تھا؛ اس کا باپ گاؤں کا ایک کھاتا پیتا کاشتکار تھا لیکن قسمت کے چکر میں پھنس کر اس کی دولت مفلسی میں تحلیل ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو گھر میں رکھ کر بہترین قسم کی تربیت دی تھی گاؤں کی سادہ زندگی اور قدرت کی مشاطگی! گویا گلاب کی ایک کلی تھی کہ باغبان کے مصنوعی آلات سے بے نیاز! کسی ویران پہاڑ کے خوشنما دامن میں پروان چڑھ رہی تھی گاؤں کا مقدس پادری اس کو بچپن میں تعلیم دیتا تھا اور وہ اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور سادہ ہونے کی وجہ سے اس کی شفقت کا خاص مرجع رہ چکی تھی۔ مہربان استاد ایک پدرانہ محبت کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتا تھا گو اس کی تعلیم بہت وسیع نہ تھی لیکن پھر بھی گاؤں کی ایک چھوٹی سی محدود سوسائٹی میں خاموش اور ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے بالکل کافی تھی۔ وہ اس کو بجائے "شمع انجمن" بنانے کے "چراغ خانہ" بنانا زیادہ مناسب خیال کرتا تھا۔ اس کے والدین کی محبت نے گھر کے سخت اور گرانبار کاموں میں حصہ لینے کی اجازت اس کو کبھی نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سنجیدہ حسن اور مزاج کی لطافت آزادی سے ترقی کرتی گئی اور وہ اس نوخیز پودے کی طرح شاداب ہونے لگی جو اتفاق سے کسی سخت قسم کے جنگلی درختوں کے درمیان اُگ آیا ہو۔

اس کی سہیلیاں بھی اس کے حسن کی غیر معمولی فوقیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں لیکن ان کے جذبات ستائش میں رشک و حسد کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے کہ اس کی دلکش معصومیت اور سادہ ادائیں، اس کی پرخلوص محبت اور سچی ملنساری تصنع اور بناوٹ سے پاک تھی۔

یہ گاؤں ایک چھوٹی اور قدیم بستی ہونے کی وجہ سے اب تک پرانے انگریزی چلن کا علمبردار تھا۔ دیہاتی رقص، سرودی محفلیں اور موسم بہار کے طرب آمیز جلسے ابھی تک پرانے رسم و رواج کے مطابق ادا کئے جاتے تھے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک گاؤں کے اس

لکھیا پرھی عائد ہوتی تھی جو تہذیب قدیم کا عاشق اور ان چند نیک سیرت سادہ لوح عیسائیوں میں سے تھا جو دنیا میں انسانی زندگی کی رگ رگ کو مسرت کی لہروں سے متلاطم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی کے زیر نگرانی "جلسۂ بہار" کے عالیشان انتظامات ہوتے تھے۔ گاؤں کے بڑے سبزہ زار میں ایک آراستہ اور خوبصورت جھنڈا عین وسط میں نصب کیا جاتا تھا اور خاص "یوم بہار" کے دن ایک بڑا پنڈال بنا کر اس کو پھولوں اور جھنڈیوں سے سجایا جاتا تھا۔ گاؤں کی سب سے زیادہ حسین اور دوشیزہ لڑکی "ملکۂ بہار" کے نام سے منتخب کی جاتی اور وہی جلسے کی صدر ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے دلچسپ مقابلوں میں کامیاب ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کو انعامات تقسیم کرنا اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

بستی کا دلفریب محل وقوع اور اس کی شعر آفریں فضا، جلسۂ بہار کی پرخلوص اور سادہ رنگ صحبتوں میں مل جل کر کچھ اس درجہ دل کش ہو جاتی تھی کہ کوئی سنگ دل سے سنگ دل مسافر بھی ان حیات افروز مشاغل کو نظر انداز کر کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

چنانچہ ایک نوجوان فوجی افسر جس کا دستہ قریب کے ایک گاؤں میں مقیم تھا، ان خوش فعلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گاؤں والوں کی ستھری اور خوش مذاق زندگی ----- ابتدا سے بہار کی نوخیز انگڑائیاں، اور پھر ملکہ بہار کی ساحرانہ شخصیت گویا اس فوجی کی خشک زندگی کو یکسر شباب و شعر میں تبدیل کر دینا ہی ان کا مقصد تھا۔

یہ ملکۂ بہار، بسے اگر میں "فتنۂ بہار" کہوں تو روا ہے، گاؤں والوں کا عزیز ترین سرمایہ حسن سر پر پھولوں کا تاج رکھے، عنفوان شباب کی گھبراہٹ میں شرماتی اور مسکراتی، خزاں اور بہار کو زیر و زبر کرتی بادہ بچشم لڑکی اپنی معصوم سیرت اور سادہ خوش طبعی سے اس فوجی افسر کو اتنی جرأت دلا چکی تھی کہ وہ اس سے اپنا تعارف کرا سکے۔ اس نے رفتہ رفتہ اس بارگاہ حسن میں رسوخ حاصل کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نوجوان فوجی افسر کی غیر محسوس محبت پاشیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں صداقت کی بو بھی تھی کیونکہ بظاہر اس کا "طریقۂ کمند اندازی" بالکل

وہی تھا جو اکثر شہری حضرات گاؤں کی بھولی لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں اس کے انداز دوستی میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس معصوم لڑکی کو چونکا سکے۔ حتیٰ کہ کبھی اس نے محبت کے عنوان پر گفتگو بھی نہ کی تھی لیکن بایںہمہ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خاموش اعلانات، محبت کے ان بلند بانگ دعووں سے زیادہ دل نشین ہوتے ہیں جو زبان سے کئے جائیں اور غالباً کیوپڈ کا یہی وہ کاری تیر ہے جو نشانہ پر پہونچنے کے بعد بھی بے قرار رہتا ہے۔ آنکھوں کی چمک! آواز کی لچک اور وہ ہزاروں لطافتیں جو ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرکت سے نمایاں تھیں، اس کی محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں اور محبت کی یہی وہ خاموش جادو بیانیاں ہیں جو صرف محسوس کی جا سکتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔

پھر اگر ان اداؤں نے ایک معصوم اور نوجوان دل کو شکست دے دی ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ چنانچہ جہاں تک اس لڑکی کا تعلق تھا، وہ بغیر یہ سوچے کہ کل کیا ہو گا؟ محبت کر رہی تھی۔ اس نے کبھی غور ہی نہ کیا کہ جس جذبہ کی وہ پرورش کر رہی ہے وہ کہاں تک اس کے دوسرے خیالات اور احساسات پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل کے مبہم نتائج اس کی نظر سے بالکل پوشیدہ تھے۔ نوجوان افسر کی موجودگی میں اس کی محبت پاش نظروں اور روح پرور الفاظ نے کبھی غریب لڑکی کے خیالات کو اپنے مرکز سے ہٹنے ہی نہ دیا اور اگر کبھی وہ نظروں سے اوجھل ہوا بھی تو ماضی قریب کے حسین لمحات نے اپنا سکہ جما کر اس کو مستقبل سے بے پرواہ کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ قریب کے سبزہ زاروں اور باغات میں روزانہ ٹہلنے جاتی تھی اس دوران میں وہ اس کو فطرت کی رنگینیوں پر درس دیا کرتا تھا اور کبھی کبھی شباب اور شعر کی سحر کاریوں سے بھی آشنا کراتا جاتا تھا۔

جنس لطیف کے کسی فرد کے احساساتِ محبت شاید ہی کبھی اتنے بے لوث رہے ہوں جتنے کہ اس حسین لڑکی کے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدائی ملاقات میں اس نوجی افسر کے ورزشی جسم اور مردانہ قدوقامت کے اثرات اس کے لئے جاذبِ نظر ثابت ہوئے

ہوں لیکن درحقیقت یہی وہ چیز نہ تھی جس نے اس کو مسحور کر رکھا تھا! اس کے جذبات محبت میں پرستش کا عنصر غالب تھا۔ اس کے نزدیک وہ ایک ما فوق الفطرت شخصیت کا حامل تھا اس کی عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ ایک حسین اور با اخلاق آدمی کی دوستی نے اس کے خفتہ احساسات کو بیدا کر دیا۔ مرتبہ اور دولت کے ذلیل امتیازات نے نہیں، بلکہ اخلاق اور طرز گفتگو، فہم اور شرافت کی خوبو نے جو ایک دیہاتی اور شہری میں حد فاصل قائم کرتی ہیں اس لڑکی کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سامنے سر نیاز شش خم کر دے۔ اس کے ہر ہر لفظ پر وہ اس طرح کان دھرتی گویا جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، الہام خداوندی سے کم نہیں!

دوران گفتگو میں اگر کبھی اس کی شرمائی ہوئی آنکھ اس کے چہرہ پر پڑ بھی جاتی تو کچھ اس طرح گھبرا کر وہ نظریں چرا لیتی گویا اس کی فرد مائگی اس فوجی افسر کے علوئے خیال کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت کی محبت مرد کی برتری ہی پر مرکوز ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مرد اپنے اس ہتھیار سے کام لے کر محبت کے نازک ریشمین لباس کو بوالہوسی کے کانٹوں سے تار تار کر ڈالتا ہے۔

بہرکیف وہ حسین لڑکی اس فوجی افسر کی خاموش پرستش میں محو تھی اور اس کو وہ بھی محسوس کر چکا تھا۔ اس کے قلب کی گہرائیاں بھی جذبات سے لبریز تھیں لیکن یہ اتنے بے لوث اور لطیف نہ تھے۔ اس کی محبت کی سنجیدگی صرف وقتی تھی وہ اپنے ہم عمر افسروں سے " دستانی فتوحات" کے ہیجان پیدا کر دینے والے واقعات سن سن کر اپنے ضمیر کا توازن اخلاقی درہم برہم کر چکا تھا اور اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر اپنے مردانہ پندار، کا ثبوت دینا چاہتا تھا نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تمام تر محبت فی الحقیقت یہیں تک محدود تھی یا اپنے نفس کو دھوکا دینے کی غرض سے وہ یہ سوچ رہا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی عکس پذیر شیشے پر کہرہ کا سیاہ پردہ پڑا ہو تو جو شخص بھی اس کو اٹھائے گا اسی کی تصویر نقش اول بن کر اس پر ثبت ہو جائے گی۔ بعینہ یہی کیفیت اس افسر کے قلب کی ہوئی۔ اس کے احباب کی گفتگو اور ان کے عشق و محبت کے

افسانے اس کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا کر چکے تھے کہ وہ جلد از جلد اس ذات کی تصویر لے لے جو پہلی مرتبہ تکلف کو برطرف کر کے اس کی نقاب کشائی پر آمادہ ہو ——————

اس مہم کو اس معصوم لڑکی نے غیر اختیاری طور پر انجام دیا۔

ابتدا میں اس کی خواہش تھی کہ وہ اس لڑکی سے چند روز تک دلچسپی لے اور پھر جب یہاں سے کوچ ہو کر دوسری جگہ فوج کا قیام ہو تو وہاں کسی نئے شکار کی تلاش کرے لیکن چند ہی روز میں اس باعصمت لڑکی کی بے لوث محبت نے اس کے دل کو تسخیر کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شعلہ ریزی اب اسی کے جیب و دامن کو خاکستر بنانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ جی تو چاہتا تھا کہ شادی کرے لیکن وہی رکاوٹیں جو اس قسم کی واقعات میں عام طور پر پیش آتی ہیں یہاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اس کا بلند رتبہ، زندگی کا روشن مستقبل، خاندانی اعزاز اور پھر ایک خوددار باپ کی دولت پر آئندہ کامیابی کا انحصار! یہ سب فریب دینے والی حقیقتیں یکے بعد دیگرے اس کو مجبور کرنے لگیں کہ وہ شادی سے اپنا دامن بچائے۔ لیکن فریق ثانی کا مرکز ثقل بھی معمولی نہ تھا ایک معصوم لڑکی کی الفت، اس کی نسوانی لطافتوں کی پاک سپردگی، اس کی پریشان کن نگاہوں میں تلاش محبت کا نظارہ اور پھر سونے پر سہاگہ اس کی فطری حیا! کون شخص ہے جو ان بے پناہ قوتوں سے مغلوب ہو کر کثافت روح کا ادنیٰ ترین نمونہ بھی پیش کر سکے؟ گو اکثر یہ اتفاق ہوا کہ اس کے احباب کی مکروہ گفتگو اور ان کی بداخلاقی کی بدترین مثالوں نے اس کی نیت کو ڈانواں ڈول کر دیا لیکن پھر بھی ان تاریکیوں کو کبھی جرأت نہ ہو سکی کہ اس لڑکی کی پرتو محبت کے سامنے ایک لمحہ بھی ٹھیر سکیں۔ چنانچہ جب کبھی شام کو ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو وہ محسوس کرتا کہ دوشیزگی کی عفت ایک روشن اور مقدس فضا ہے جس میں گناہ کا تخیل اڑ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

———— ——— ———

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کے تضاد ارادے اور اس کے ضمیر اور نفس کی مختلف قوتیں

آپس میں ٹکرا کر تھک جاتی ہیں تو فطرت کی طرف سے ایک ناطق فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اس کے حق میں مفید ہو یا مضر۔ چنانچہ یہی واقعہ اس فوجی نوعمر افسر کے ساتھ بھی پیش آیا ابھی وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ ایک روز اس کے دستے کے متعلق یہ حکم آیا کہ وہ انگلستان چھوڑ کر فوراً براعظم یورپ کی طرف روانہ ہو جائے۔ یہ حکم کیا تھا گویا اس کی اندرونی کش مکش کی تکمیل تھی۔ چند منٹ تک اس کی تمام دماغی اور ذہنی قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ لیکن بہرحال اس کو یہ اندوہ ناک خبر معصوم لڑکی تک پہنچانی تھی کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ بتا دے لیکن نفسیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جب محبت کا زمانہ اپنے شباب پر ہو، اور پھر شباب بھی کیسا؛ —— موت کے اندوہگین لمحوں کو اپنے دامن میں پوشیدہ کئے ہوئے —— ایک خبرِ بد سے عیش کی صحبتوں کو برباد کر دینا، قبل از وقت اعترافِ شکست سے کم نہیں ہوتا۔

معاملہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آہی گیا جب ان کی محبت پر در صحبتوں پر مرگِ ناگہانی کا حملہ ہونے والا تھا۔ مجبوراً شام کو ٹہلتے وقت اس افسر نے چند ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنی داستانِ محبت اور ساتھ ہی خبرِ جدائی بھی کہہ ڈالی۔

لڑکی کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کبھی اس کو اپنے محبوب سے جدا ہونا پڑے گا ظاہر ہے کہ ایسی خوش خیالی میں جب محبت کی دیوی اپنی تمام رنگینیوں سمیت ان کی پاکیزہ صحبتوں پر مسکرا رہی ہو، اس خطرناک اور اچانک خبر نے اس کے دل و دماغ کے ساتھ کیا کام کیا ہوگا۔ پہلے لمحے میں تو سکوتِ حیرت تھا لیکن فوراً ہی تمام صورتِ حالات اس کی نظر کے سامنے پھر گئی۔ ایک لرزتی ہوئی نگاہ سے اس نے اپنے رخصت ہونے والے دوست کو دیکھا اور پھر ایک معصوم بچے کی طرح سسک سسک کر رونے لگی۔ بہت ممکن ہے آپ اس اشکباری کو عورت کا آخری حملہ قرار دیں لیکن اس وقت وہ آنسو صرف قلبی راز کے آئینہ دار تھے اور بس!

نوجوان افسر اس تباہ کن منظر کی تاب نہ لاکر بے چین ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے نمناک صحیفۂ محبت پر اپنے کانپتے ہوئے لبوں سے چند مہریں ثبت کر دیں۔ لڑکی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس قسم کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں محبت کے کثیف اجزا غم کی دہکتی ہوئی بھٹی میں پڑکر نیست ونابود ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ ممکن ہے کبھی کبھی صحیح بھی ہو جاتا ہو لیکن کم از کم اس وقت تو یہ اس کی معصومیت کا فریب ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے چہرہ کا تمتماتا ہوا حسن اور پھر اس کی بے اختیار سپردگی ! ! ایک فریب خوردہ انسان کو مغالطہ میں ڈال دینے کے لئے کم نہ تھیں۔ اس کو یہ یقین تھا کہ اس کی ذہنیت کا سکہ لڑکی پر جم چکا ہے اور اب اس سے فائدہ نہ اٹھانا گویا قدرت کی عطا کی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دینا ہے چنانچہ فوراً اس نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چل کھڑی ہو اور اس کے غم و راحت میں برابر کی حصہ دار رہے۔

کہنے کو تو وہ کہہ گیا لیکن اس گاؤں میں اپنی اجنبیت محسوس کر کے اور اپنی اس خود غرض تجویز کی رکاکت کا خیال کر کے وہ اس درجہ خجل ہوا کہ پھر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا وہ خاموش تھا اور اس کا دماغ، قلب کی تنگ ظرفی پر نالاں ! لڑکی نے جب یہ الفاظ سنے تو پہلے تو وہ قطعاً یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ اپنا گھر کیوں چھوڑے ؟ اپنے شفیق والدین کی معیت سے کیوں بھاگ کھڑی ہو ؟ کیا صرف اس لئے کہ اس کو فوجی افسر سے محبت تھی ؟ لیکن محبت تو زمان و مکاں کی قیود سے بالاتر ہوا کرتی ہے اور پھر محبت تو اس کو اپنے والدین سے بھی تھی۔ وہ بھی ایک معصوم محبت تھی اور یہ بھی ایک معصوم محبت !! پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح کی وجہ ؟

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس کی نسوانی فراست نے اصل معاملے سے اس کو آگاہ کر دیا کہ فوجی افسر کی محبت "آرزوئے خام" سے بے نیاز نہیں۔ وہ زہر کی ایک تلخ گولی تھی جس پر شکر چڑھا کر وہ اس کو پیش کر رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کا ہر قطرہ جہاں تھا وہیں منجمد ہو کر

رہ گیا۔ وہ جوشِ الم میں ایک حرف بھی اپنی زبان سے نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس کا دماغ رنج اور غصہ سے کھول رہا تھا۔ اس کی محبت نے اپنا رخ تبدیل کیا اور وہ اس طرح جھجک کر پیچھے ہٹی گویا اس کے سامنے ایک خطرناک زہریلا سانپ پڑا ہو۔ وہ اپنی روحانی کوفت میں دونوں ہاتھ ملنے لگی اور ایک نفرت آمیز نگاہ اس فوجی کے چہرہ پر ڈال کر اپنے گھر کی طرف اس طرح بھاگی گویا کہہ رہی ہو ؎

کہ عنقا را بلند ست آشیانہ!

افسر اپنی اس ذلیل حرکت پر پشیمان، حیرت میں غرق کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ چند لمحات اس کی زندگی کی وہ خطرناک اور پریشان کن گھڑیاں تھیں جن میں مستقل مزاج سے مستقل مزاج اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی بھی گھبرا کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک نو آموز اور غیرت مند شخص جس نے سوسائٹی کی اخلاق کُش لیکن دلفریب ترغیب سے متاثر ہو کر اپنے ضمیر کو پہلی مرتبہ اتنا سخت دھچکا پہنچایا ہو۔ وہ جو کچھ بھی کر گزرتا وہ کم تھا لیکن روانگی کی ہلچل اور یار دوستوں کے ہنگامے نے اس کو بڑی حد تک باز رکھا اور وہ نہ طے کر سکا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ بہرکیف وہ اپنی فوج کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نئی سرزمین کے دلکش مناظر، نت نئے واقعات جدید احباب اور حالات کی تبدیلی نے اس کے حال پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا اور وہ حال، کی سرگرمیوں میں ماضی کے روح فرسا واقعے کو رفتہ رفتہ فراموش کرنے لگا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی گزشتہ صحبتوں کی یاد، سپاہیوں کی نقل و حرکت سے بے نیاز ہو کر فوجی زندگی کی ہنگامہ خیز مصروفیت کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی اس کے دل و دماغ تک پہنچ ہی جاتی۔ گاؤں کی ستھری، معاشرت، جلسہ بہار کے رنگینیاں، ایک حسین لڑکی کی دوستی، اس کا شام کو نہر کے کنارے کسی کے بازو کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ٹہلنا، اپنی لطیف محبت کا مرکز ایک مسافر کو بنانا اور پھر اس کی غلط فہمی، اپنی تنگ ظرفی کا ایک ناگوار پیرایہ میں اظہار، یہ سب خیالات

مل جل کر کچھ اس بُری طرح اس کو متاثر کرتے کہ وہ گھنٹوں شرم اور ندامت سے اپنا سر نہ اٹھا سکتا!

غریب لڑکی کو جو صدمہ اپنی محبت کی تباہی سے پہنچا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے دل و دماغ کی تمام قوتیں جو ایک مرکز کی طرف مائل ہو چکی تھیں، اب اس طرح ہچکولے کھانے لگیں جیسے ایک ڈوبتا ہوا جہاز سمندر کی بے پناہ موجوں پر زیر و زبر ہوتا ہے۔ ابتدا میں غشی اور بے ہوشی کے دورے پڑے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ ان مسلسل حملوں کی تاب نہ لا کر صاحبِ فراش ہو گئی۔

اس نے اپنی کھڑکی سے فوج کو کوچ کرتے ہوئے دیکھا جس میں اس کا بے وفا دوست اپنی شاندار وردی پہنے ایک ہاتھ سے کرچ اور دوسرے سے باگ سنبھالے بینڈ کی آواز پر گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے اندازِ نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بڑی زبردست فتح حاصل کر کے لوٹ رہا ہو! معصوم لڑکی نے ایک درد آمیز نگاہ سے اس کے چمکتے ہوئے خود اور لہراتے ہوئی کلغی کو دیکھا اور دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بس ایک بجلی تھی کہ چمکی اور اس کے دل میں پیوست ہو گئی!!

یہ بیان کرنا کہ اس حادثہ کے بعد اس لڑکی کی کیا حالت ہوئی، ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ اس قسم کے اندوہناک واقعات جن میں ایک پاک محبت کا جذبہ آخر میں صرف فریبِ نفس ثابت ہو، اکثر "المیہ" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

فطرتاً یہی کیفیت اس کی بھی ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سوسائٹی اس کی خوش و خرم زندگی میں کوئی ناگہانی تغیر محسوس کرے۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں کی نظر بچا کر جنگل میں تنہا نکل جاتی اور ایک مجروح ہرنی کی طرح گھنٹوں اپنی بدبختی پر آنسو بہاتی رہتی۔ اس کا سفید اور ستا ہوا چہرہ صاف بتاتا تھا کہ اس کی شکستہ محبت دل کی ہر ہر رگ سے خون چوس چکی ہے۔ اکثر شام کو دودھ بیچنے والی لڑکیوں نے اس کو گرجا گھر کی تاریک برساتی میں کوئی غمگین راگ الاپتے ہوئے سنا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ دنیا کی تکالیف سے تنگ آ جاتا ہے تو ان سے پناہ حاصل کرنے کے لئے کسی

مافوق الفطرت ہستی کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب بتوں کی بے نیازی اس کو خدا کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے —— اس لڑکی کی دنیوی مصروفیتیں بھی گرجا کی چہار دیواری میں محدود ہونے لگیں۔ عبادت میں اس کا استغراق بڑھنے لگا اور وہ رفتہ رفتہ مریم کی ایک مقدس چیلی معلوم ہونے لگی۔ جب گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کو گرجا میں آتے دیکھتے —— اس طرح کہ پوست و استخوان کا ایک نازک ڈھانچہ تقدس کے ہالے میں آسمانی پیکر بنا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس کو راستہ دیدیتے اور درمیان سے گذر جانے کے بعد اس پر اس طرح نظر ڈالتے گویا وہ ایک مایوسی و حسرت کا مرمریں مجسمہ ہے کہ دنیا میں عبرت دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اس کو اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ بہت تیزی سے اپنی موت کی طرف جا رہی ہے لیکن وہ سمجھتی تھی کہ قبر کا تاریک گوشہ ہی اس کو دوامی آرام پہنچا سکتا ہے —— محبت کا وہ سیمیں رشتہ جو اس کی زندگی کا وزن سنبھالے تھا اب ڈھیلا ہو چکا تھا۔ وہ محبت کی بلند چوٹی سے ایک بار گر پڑنے کے بعد چاہتی تھی کہ اجل کی عمیق ظلمتوں میں گم ہو جائے۔ لیکن داد دیجیے اس کی شرافتِ نفس کی کہ اپنے دوست کے فریبِ محبت سے واقف ہو جانے پر بھی اس کے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ یا ممکن ہے کہ چند لمحوں کے احساس کے بعد اس کی تمام چنگاریاں خاکستر ہو چکی ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس کے دل میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ نفرت یا غصہ کا کوئی جذبہ اس میں پرورش پا سکے۔

ایک روز جب اس کی حالت بہت نازک ہو گئی، تو اس نے ایک دداعی خط بہت ہی سادہ اور مختصر الفاظ میں اپنے دوست کے نام لکھا لیکن اس کی سادگی بھی بلا کا اثر رکھتی تھی۔ یہ تحریر اس کے دل کی فریاد تھی جس میں کوئی لے نہیں ہوتی! اس نے لکھا کہ وہ مرنے والی ہے اور اس کی موت کا باعث صرف اس کی ذات ہے۔ اس نے اپنی تمام جسمانی اور روحانی اذیتوں کا ذکر نہایت سادہ پیرایہ میں کیا جو اسے اس دوران میں جھیلنا پڑیں۔ اختتام میں اس نے جو جملے

لکھے وہ یہ تھے کہ :۔

"میں نے محسوس کیا کہ اس وقت تک میں آرام سے جان نہیں دے سکی جب تک میں تمہاری فریب دہی کو معاف نہ کر دوں اور اپنی پُر خلوص دعائیں تم تک نہ پہنچا دوں"

شباب کی قوتیں پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اب رفتہ رفتہ اس کی کمزوریاں بھی جواب دینے لگیں حتیٰ کہ وہ اپنے گھر سے باہر بھی نہ نکل سکتی تھی۔ اب اس کا مشغلہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر کھڑکی تک پہنچ جائے اور وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر سامنے کے میدان کا نظارہ کیا کرے ——— وہی میدان جو چند روز قبل اس کی محبت کا جولانگاہ رہ چکا تھا۔

کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ نہ اس نے کبھی اس راز کا ذکر کیا جو اس کی روح کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے محبوب افسر کا نام بھی کسی کو نہ بتایا البتہ کبھی کبھی تنہائی میں، جب جوشِ غم کی فراوانی ہوتی، وہ اپنی ضعیفہ ماں کی گود میں سر ڈال کر خاموشی سے رو لیا کرتی!

اس کے غریب والدین اس صدمے کو جس خاموشی سے برداشت کر رہے تھے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ اپنی امیدوں کے لہلہاتے ہوئے باغ کو مرجھاتا ہوا دیکھتے لیکن زبان سے اُف نہ کر سکتے تھے۔ اب بھی ان کو کبھی کبھی یہ امید ہوتی کہ شاید یہ غنچۂ پژمردہ از سرِ نو شاداب ہو جائے اور اس کے چہرہ کی وہ دمک جو کبھی محبت کی تنویر سے مالامال تھی منتقل ہو کر اس کی آئندہ صحت کا یقین دلا دے۔ لیکن محبت کرنے والے امیدوں کی چار دیواریاں کھینچا ہی کرتے ہیں اور موت اپنا شکار چپکے سے دبوچ کر غائب ہو جاتی ہے۔

اسی دوران میں ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت وہ اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی ماں کی گردن میں حمائل تھے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ہوا ہلکے ہلکے ہلکورے

بستی ہوئی کمرے کو اس بھینی خوشبو سے مہکا رہی تھی جو دروازے پر لٹکے ہوئے گملوں میں سے نکل رہی تھی۔ اس کا باپ انجیل مقدس کا وہ باب سنا رہا تھا جس میں دنیا کی ناپائداری اور آخرت کی ان راحتوں کا ذکر تھا جو نیک بندوں کے لئے دائمی طور پر مہیا کی گئی ہیں۔

مضمون کی نوعیت اور اس کا ملہمانہ انداز بیان، پھر خود اس کے موجودہ حالات کی نفس مضمون کے ساتھ ہم آہنگی! یہ سب چیزیں کچھ اس قدر موثر ثابت ہوئیں کہ اس کا قلب ایک ابدی اطمینان محسوس کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں اپنے دیہاتی گرجا گھر کی چوٹی پر لگی تھیں، شام کی عبادت کے لئے گھنٹی بج رہی تھی اور عبادت کرنے والے سادہ لوح دیہاتی ایک قلبی عقیدت کے ساتھ خاموش گردن جھکائے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ فضا کا ذرہ ذرہ اس مقدس سکوت میں غرق ہے جو صرف اتوار ہی کو گاؤں بھر پر طاری ہوتا ہے۔ اس کے والدین لڑکی کے سنجیدہ چہرہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بیماری اور غم نے جو بعض چہروں کی توانائی اور تازگی زائل کر دیتے ہیں، اس کے چہرہ کو ایک لاہوتی حسن بخش دیا تھا۔ اس کی ناتواں، نیلگوں آنکھوں میں دو آنسو تھرتھرا رہے تھے ——— کیا اسے اپنے فراموشکار کی یاد آئی؟ یا اس کے خیالات گرجا کی اس سرزمین پر منڈلا رہے تھے جس کے مقدس سینے میں وہ سما جانے والی تھی؟؟ یکایک ٹاپوں کی آواز آئی۔ ایک سوار مکان پر آکر رکا۔ وہ کھڑکی کے سامنے اتر پڑا ——— بے چاری لڑکی نے ایک ہلکی چیخ ماری اور اپنی کرسی میں گر گئی ——— یہ اس کا منفعل دوست تھا ——— وہ جلدی سے گھر میں داخل ہوا اور اسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بڑھا لیکن اس کا لاغر جسم، اس کا پژمردہ چہرہ! اتنا حقیر مگر کتنا دلکش!! اس کے دل میں ایک دھچکا سا لگا اور وہ غم کا مارا اس کے قدموں میں گر پڑا ——— وہ کمزوری کی وجہ سے اٹھ نہ سکی ——— اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس نے بڑھانا چاہا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی جیسے اس نے کچھ کہا مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس بے چاری نے کوشش کی کہ اٹھ کھڑی ہو لیکن نقاہت نے ہلنے بھی

نہ دیا۔ اس نے کوشش کی —— ایک آخری کوشش — کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو اٹھا لے لیکن وہ اپنی نصف درازی تک بھی نہ پھیلے تھے کہ گر گئے —— اس کے خشک لبوں نے ہل کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بے سود! اس کی کمزور نگاہیں ایک سوگوار شیفتگی کے ساتھ اپنے دوست کے اشک آلود چہرہ پر مسکرائیں اور مسکرا کر ہمیشہ کے لئے اس میں جذب ہوگئیں!!

یہ ہیں وہ تفصیلات جو اس دیہاتی قصہ کے متعلق میں جمع کر سکا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی ایسی جدت بھی نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ آپ کو مجبور کر کے سناؤں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ اپنی تباہ کاریوں سمیت آپ کو فراموش کر دینے کے قابل معلوم ہو لیکن کم از کم میرے دل و دماغ پر اس کا اثر اس وقت بہت پڑا اور پھر خصوصاً اس لئے کہ ڈرامہ کا وہ آخری منظر جو غم کی تکمیل کر رہا تھا، میری نظروں کے سامنے گزرا ہے—
بہرحال! بھول جائیے کہ یہ لوگ بھول جانے ہی کے قابل ہیں:۔

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

(تلخیص از واشنگٹن ارونگ)

سرمایہ داری کارل مارکس کی نظر میں

(ایم - ایم - جوہر صاحب)

عوام کے لئے اقتصادیات میں وہ دلچسپی نہیں ہو سکتی جو شاعری یا افسانہ میں ہے لیکن قحط کے زمانے میں عاشق عشق فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں بھوک کی شدت رُخ زیبا کا کل مشکیں، نگاہِ بدمست کو بھلا دیتی ہے اور انسان کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقتصادی دنیا میں داخل ہو کر قحط کی وجوہات سمجھے اور اس کے رفع کرنے کی کوشش کرے۔

عام گھرانوں کی یہ اقتصادی الجھنیں کہ صاحب زادے کی تعلیم کے لئے سرمایہ نہیں۔ بھائی کو معقول عہدہ نہیں ملتا، خاوند کی تنخواہ کم ہے، بہن اور بیٹی کی شادی نہیں ہوتی، رشتہ آتا ہے تو لڑکے والے منہ پھاڑ کر مانگتے ہیں، اور اسی قسم کی خانگی مشکلات کا سبب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ انسان اپنی سماج کے اقتصادی حالات نہ سمجھے۔ لیکن فی زمانہ ہر سماج کی اقتصادی حالت تمام دنیا کی اقتصادی حالت سے منسلک ہے۔ اپنی سماجی حالت کو دنیا کی عام حالت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ خانگی زندگی کی کش مکش سماجی زندگی کا عکس ہوتی ہے اور کسی سماج کی زندگی تمام دنیا کی کش مکش کا پرتو ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح گھر کی چار دیواری کو اپنی دنیا خیال کرنا موجودہ دور میں حماقت ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام دنیا کی اقتصادی حالت پر جس کو سرمایہ داری کہتے ہیں، ایک نظر ڈالی جائے۔ بیسویں صدی میں جہاں اور بہت سی متضاد باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں قحط اور فراوانی اجناس بہ یک وقت موجود ہیں اور اس تضاد نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن سرمایہ دار مصنفین اقتصادیات سرمایہ دارانہ نظام کو بہترین نظام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر دنیا کی اقتصادی زندگی کی سطح

پر کچھ بدحالی دکھائی بھی دے رہی ہے تو وہ وقتی چیز ہے، کچھ عرصے کے بعد آپ جاتی رہے گی نظامِ سرمایہ داری میں کوئی ایسی اصولی خامی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ یہ اوپری بیماری ایسی مہلک ہے کہ سرمایہ داری کی جان کے لئے خطرہ ثابت ہوگی۔ جیسے انسان کو نزلہ زکام ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں خود سرمایہ داروں کی کوتاہ اندیشی سے کبھی کبھی تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے گھبرا کر سرمایہ دارانہ نظام ہی کو دفن کر دیا جائے۔

لیکن کسی حقیقت سے انکار کرنے سے وہ حقیقت بدل نہیں جاتی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب نفع کی شرح گری، کام کاج بند ہوئے اور دنیا کی تجارت موت کے کنارے آ لگی۔ انسان بے کاری اور بھوک سے بدحال ہو گیا۔ سرمایہ دار اور مزدور طریقِ پیداوار کے دو کناروں پر جمع ہو گئے لیکن ایک جگہ مل کر کام نہ کر سکے۔ میانوں میں تلواریں کھڑکنے لگیں تب سرمایہ دار مفکرین چونکے۔ درجنوں نے اعتراف کر لیا کہ سرمایہ داری میں آشوب (CRISIS) ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد سب ماہرینِ آشوب کی موجودگی کا اقرار، اس کے سبب نوعیت اور نتائج پر غور و فکر کرنے لگے۔

لیکن کارل مارکس نے آج سے ایک صدی قبل سرمایہ داری کی ہر ارتقائی منزل کی تحلیل کر دی تھی۔ اس نے ان تمام منازل کا مفصل ذکر کیا ہے جن میں سے سرمایہ داری گذرتی ہے جہاں اُس نے سرمایہ داری کے بچپن اور نمو کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی پیری کی درماندگیوں نزع کی حالت اور موت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

مارکس کا تخیل روشن اور واضح ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ اقتصادی دور اس کے پیشِ نظر تھا اور وہ آج کل کے حالات کو دیکھ کر اپنے اقتصادی نظریے تراش رہا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ سو سال قبل کے حالات موجودہ زمانے سے بالکل مختلف تھے لیکن چونکہ مارکس نے سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کے صحیح قانون دریافت کر لئے تھے اس وجہ سے ان

قوانین کی بنا پر جو نتیجے نکالے وہ بھی درست ہیں۔ اس نے ان قوانین کی بنا پر پیشین گوئیاں کی ہیں جن کی صحت کا ثبوت موجودہ اقتصادی حالات دے رہے ہیں۔ مارکسٹ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ان نظریوں کی بنا پر نہ صرف سماجی زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکتے ہیں بلکہ پیشنگوئیاں کر سکتے ہیں کہ آیندہ کیا ہوگا؟

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دعوے کہاں تک ٹھیک ہیں اور مارکس کا قیمت کا نظریہ کہ سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے کس حد تک آشوب کی علت و اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں ہم مارکس کے مختلف نظریوں سے بحث نہیں کریں گے۔ ان کی صحت وغیرہ کے متعلق ہم اپنے دوسرے مضامین میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اُن کو درست مان کر یہ بتائیں گے کہ وہ سرمایہ داری کے موجودہ دور کی کس خوبی سے تحلیل کرتے ہیں۔

یہ بہتر ہوگا کہ یہاں اجمالاً مارکس کے ان اقتصادی نظریوں کا ذکر کر دیا جائے جو نفسِ مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

مارکس نے سرمایے کی دو قسمیں کی ہیں:۔

(۱) زندہ سرمایہ

(۲) مردہ سرمایہ

(۱) زندہ سرمایہ: کل سرمایے کا وہ جز ہے جو مزدور کو بطور اُجرت دیا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ جنس میں قیمت پیدا کرتا ہے۔ جیسے جیسے کسی طریق پیداوار میں زندہ سرمایہ کم ہوتا جاتا ہے جنس کی قیمت گرتی جاتی ہے۔ اور نفع کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ طریق پیداوار میں ' ز ' کم ہو رہی ہے تو ہمارا یہ مطلب ہوگا کہ مشین مزدور کی جگہ لے رہی ہے۔

(۲) مردہ سرمایہ: یہ سرمایہ کا وہ جز ہے جو زندہ سرمایے کے علاوہ طریق پیداوار میں صرف ہوتا ہے، مثلاً مشین، خام اجناس، عمارت وغیرہ۔ مردہ سرمایہ جنس میں قیمت کا اضافہ

نہیں کرتا بلکہ جنس میں صرف اپنی قیمت منتقل کرتا ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ "م" بڑھ رہا ہے۔ تو ہمارا یہ مطلب ہوگا کہ طریق پیداوار آلاتی ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں ہم یہ بھی بیان کر دیں کہ مارکس کے نفع اور قدرِ زائد کے نظریے کیا ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔

(۱) قدر زائد:۔ مزدور قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ جب مزدور سے چھ گھنٹے کی اُجرت دے کر بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے تو گویا دوسرے چھ گھنٹے مزدور مفت میں کام کرتا ہے۔

اس بیگار کے وقت میں جو قیمت پیدا ہوتی ہے وہ قدر زائد کہلاتی ہے۔ سرمایہ دار جماعت اسی قدر زائد کے مختلف نام رکھتی ہے۔ ایک جز کو سود کا نام دے کر ہضم کر جاتی ہے۔ دوسرے جز کو نفع کہہ کر کھا لیتی ہے۔ تیسرے جز کو خطرے کا معاوضہ کہہ کر صاف کر جاتی ہے۔ ہم اس مضمون میں قدرِ زائد کی شرح سو فی صدی مانیں گے ہم یہ فرض کریں گے کہ مزدور کو چھ گھنٹے کی اُجرت دی جاتی ہے اور اس سے بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کارخانے میں مزدوری کا بل سو روپے ہے تو سو روپئے قدر زائد ہوگی۔

(۲) نفع:۔ نفع کی شرح کا دار و مدار اس پر ہوگا کہ کارخانے میں کل کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ مثلاً اگر زندہ سرمایہ دس لاکھ روپئے ہے اور مُردہ سرمایہ تیس لاکھ روپئے ہے تو کل سرمایہ چالیس لاکھ ہوا۔ فرض کیجئے کہ دس لاکھ کی رقم بطور قدرِ زائد ملی تو کل چالیس لاکھ پر شرح نفع پچیس فی صدی ہوئی۔ لیکن اگر کسی کارخانے یا سماج میں زندہ سرمایہ دس لاکھ ہو اور مردہ سرمایہ نوے لاکھ ہو تو قدر زائد تو وہی دس لاکھ رہی۔ لیکن نفع کی شرح میں فرق آگیا۔ وہ دس فی صدی رہ گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی سماج میں مردہ سرمایے کی مقدار زندہ سرمایہ سے زیادہ ہو جائے تو اس سماج میں (اگر اور اقتصادی حالات بدستور ہیں) نفع کی شرح

کم ہو جائے گی۔

آیندہ آسانی کے لئے ہم اس مضمون میں زندہ سرمایے کو 'ز' کہیں گے اور مردہ سرمائے کو 'م' اور جب یہ کہنا مقصود ہوگا کہ کسی سماج یا ملک میں سرمایہ داروں میں آپس میں بڑے شدومد سے مقابلہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے طریق پیداوار کو آلاتی بنایا جا رہا ہے۔ مشین مزدور کو برطرف کر رہی ہے، آلات و مشین کے ذریعے جنس سستی کی جا رہی ہے، مزدوری گھٹائی جا رہی ہے تاکہ جنس سستی ہو اور نفع کی شرح بھی نہ گرنے پائے تو ہم صرف یہ کہیں گے کہ طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے۔

اب ہم کارل مارکس کے دعوے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار ترقی کرتا جائے گا نفع کی شرح گرتی جائے گی اور طریق پیداوار کی ترقی اور انفرادی نفع میں تضاد واقع ہوتا جائے گا۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ 'ز' کے گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون (جو مارکس کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے) اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی (جس کو کرائسس کہتے ہیں) کے اسباب علل بتائے۔ اب ہم مارکس کے دعوے کی صحت پر نظر ڈالتے ہیں۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے دنیا کی صنعت و حرفت بہت تیزی سے آلاتی ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی 'ز' گھٹ رہی ہے 'م' بڑھ رہا ہے۔ دراصل صنعتی و حرفتی ترقی نام ہی اس کا ہے کہ 'ز' گھٹے اور 'م' بڑھے۔ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی انسانی ترقی کے مترادف ہے۔ انسانی ترقی اس کے سوا کیا ہے کہ انسان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ فرصت حاصل ہو جس میں وہ اپنی جسمانی دماغی اور روحانی ترقی کی راہیں دریافت کر سکے۔

مارکس کا دعویٰ ہے کہ طریق پیداوار میں 'ز' کا گھٹنا اور 'م' کا بڑھنا نفع کی شرح کم کر دیتا ہے۔ البتہ کچھ عرصے کے لئے یہ ممکن ہے کہ باوجود 'ز' گھٹ جانے کے نفع کی شرح نہ گھٹے۔

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ مزدور کو خوب نچوڑ کر اس سے قدر زائد زیادہ وصول کی جائے۔ فرض کیجئے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے نفع کی شرح ۵۰ فی صدی کم ہوگئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ جنس کے دام بڑھائے جائیں لیکن وہ مقابلے کی وجہ سے نہیں بڑھ سکتے) دوسرے یہ کہ مزدور کی مزدوری کم کی جائے اور کام زیادہ لیا جائے۔ مزدوری کم کرنے سے کساد بازاری پھیلتی ہے اس لئے مزدور سے زیادہ کام کرا کے نقصان کو پورا کیا جاتا ہے۔ ایسی تیز کار مشینیں بنائی جاتی ہیں کہ ان پر ایک گھنٹہ کام کرنے سے مزدور کی اتنی قوت عمل صرف ہو جاتی ہے جو سست رفتار مشین پر تین گھنٹے میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن مارکس کا خیال ہے کہ مشین مزدور کو نچوڑ کر قدر زائد میں اتنا اضافہ نہیں کرسکتی کہ 'ز' کی کمی سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو پورا کر دے۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے، مارکس کا اقتصادی اصول یہ ہے کہ 'ز' اور 'م' کی نسبت پر نفع کی شرح کا انحصار ہوتا ہے۔ 'ز' کے نسبتاً گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے سے نفع کی شرح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کا گھٹنا تین طریقوں پر ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ 'ز' واقعی گھٹ جائے۔ دوسرے یہ کہ 'ز' تو اسی قدر رہے لیکن 'م' بڑھ جائے۔ جس نسبت سے 'م' بڑھے گا اسی نسبت سے 'ز' گھٹ جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طریق پیداوار میں 'ز' بڑھ رہی ہو لیکن 'م' اس سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہو تو بھی 'ز' نسبتاً گھٹ جائے گی اور چونکہ 'ز' قدر زائد پیدا کرتی ہے اور نفع کی شرح قدر زائد کی کل سرمائے سے نسبت کا نام ہے۔ اس لئے جب 'ز' کے گھٹنے سے قدر زائد گھٹے گی تو نفع کی شرح یقیناً کم ہو جائے گی۔ مثلاً کسی سماج کا زندہ سرمایہ ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ ہو جاتا ہے اور اسی عرصے میں اس کا مردہ سرمایہ ۴۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ ہو جاتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ

پہلے سماج کا کل سرمایہ

'م' مردہ سرمایہ	'ز' زندہ سرمایہ	کل سرمایہ
(۱) ۰۰۰ ۰۰۰،۴ روپئے +	۰۰۰ ۰۰۰،۲ روپئے =	۰۰۰ ۰۰۰،۶ روپئے تھا

قدر زائد ۰۰۰ ۰۰۰،۲ روپئے نفع کی شرح ۳۳⅓ فی صدی ہوئی۔

اب 'م' مردہ سرمایہ	'ز' زندہ سرمایہ	کل سرمایہ
(۲) ۰۰۰ ۰۰۰،۱۵ روپئے +	۰۰۰ ۰۰۰،۳ روپئے =	۰۰۰ ۰۰۰،۱۸ روپئے ہوگیا

قدر زائد ۰۰۰ ۰۰۰،۳ روپئے ۔ نفع کی شرح ۱۶⅔ فی صدی ہوئی۔

نمبر ۱ میں 'ز' اور 'م' میں ½ کی نسبت ہے مگر نمبر ۲ میں ⅕ کی نسبت ہے۔ اگر مان لیں کہ 'ز' اپنے برابر قدر زائد پیدا کرتی ہے تو جب نمبر ۱ میں زندہ سرمایہ ۲۰ لاکھ تھا تو اسی قدر زائد بھی ۲۰ لاکھ ہوئی اور ۶۰ لاکھ پر نفع کی شرح ۳۳⅓ فی صدی ہوئی۔ طریق پر نمبر ۲ میں نفع کی شرح صرف ۱۶⅔ فی صدی ہوئی۔ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح گھٹ گئی۔ لیکن یہاں ایک اور امر غور طلب ہے وہ یہ کہ نمبر ۲ میں نفع کی شرح میں ۵۰ فی صدی کی کمی واقع ہوگئی۔ لیکن مجموعی نفع ۰۰۰ ۰۰۰،۲ روپئے سے ۰۰۰ ۰۰۰،۳ روپئے ہوگیا مارکس کہتا ہے کہ یہ سرمایہ داری کا ایک نہایت اہم پہلو ہے کہ سرمایہ داری میں یہ ممکن ہے کہ نفع کی شرح گرتی جائے۔ لیکن اس کی کل مقدار بڑھتی جائے۔ جیسے جیسے نفع کی شرح گرتی جاتی ہے سرمایہ دار کل سرمایے کو بڑھا کر مجموعی نفع زیادہ کرتا جاتا ہے۔ جوں ہی نفع کی شرح ۳۳⅓ فیصدی سے ۱۶⅔ فی صدی ہوئی۔ سرمایہ دار نے فوراً ۰۰۰ ۰۰۰،۱۲ روپئے زیادہ لگا کر نفع کی مقدار کو ۰۰۰ ۰۰۰،۲ روپئے سے ۰۰۰ ۰۰۰،۳ روپئے کر لیا۔ نفع کی شرح تو کم ہوگئی لیکن مقدار میں اضافہ ہوگیا۔ اگر یہ صورت حالات برابر قائم رہے تو سرمایہ دارانہ نظام قائم رہ سکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ صورت قائم نہیں رہتی اس شکل میں سرمایہ دار صنعت و حرفت میں برابر روپیہ لگاتا رہے گا اور مزدوروں کے لئے روزگار مہیا کرتا رہے گا سرمایہ دار کا مطمح نظر صرف نفع کی شرح ہی نہیں ہے بلکہ اس کی کل مقدار بھی ہے۔ سرمایہ دار

اپنا نفع بڑھانے کے لئے اس پر مجبور ہے کہ طریق پیداوار کو ترقی دے۔

لیکن فرض کیجئے کہ کل سرمایہ ۶۰۰۰۰۰ سے صرف ۸۰۰۰۰۰ ہوا لیکن 'ز' اور 'م' کی نسبت ۱/۵ ہوگئی یعنی ۱۶۰۰۰۰ (ز) ۶۴۰۰۰۰ (م) (ز) نے حسب قاعدہ اپنے برابر ۱۶۰۰۰۰ روپئے قدر زائد پیدا کی یعنی

نمبر (۳) مردہ سرمایہ		زندہ سرمایہ		کل سرمایہ
۶۴۰۰۰۰	+	۱۶۰۰۰۰	=	۸۰۰۰۰۰

قدر زائد ۱۶۰۰۰۰ ہوئی نفع کی شرح ۲۰ فی صدی ہوئی نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے مقابلے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۳ میں کل سرمایہ بڑھ گیا۔ لیکن نفع کی شرح اور مجموعی نفع کم ہوگیا۔ نمبر ۱ میں ۶۰۰۰۰۰ روپئے لگاکر ۲۰۰۰۰۰ روپئے قدر زائد ملی تھی اور شرح نفع ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہوئی تھی۔ نمبر ۳ میں کل سرمایہ تو زیادہ لگا۔ لیکن قدر زائد نفع کی شرح کم رہی۔ کون سا ایسا سرمایہ دار ہے جو ۲۰۰۰۰۰ روپئے زیادہ لگاکر اپنے نفع میں ۴۰۰۰۰ روپئے کی کمی کرے گا۔ جب کسی سرمایہ دار سماج میں زندہ اور مردہ سرمایے کی نسبت مثال نمبر ۳ کی سی ہوجائے گی تو اس سماج کا طریق پیداوار فوراً مفلوج ہوکر رہ جائے گا۔ اس مثال سے یہ اظہار مقصود ہے کہ طریق پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع کی شرح کا کم ہونا لازمی ہے اور سرمایہ دار کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھائے تاکہ مجموعی طور پر نفع بڑھے۔ ۶۰۰۰۰۰ روپئے کو بڑھاکر صرف ۸۰۰۰۰۰ روپئے کرنے سے مقصد حل نہیں ہوتا۔ نمبر ۲ کی طرح مردہ سرمایہ ۱۵۰۰۰۰۰ روپئے بڑھانا ہوگا تب کہیں مجموعی نفع بڑھ سکے گا۔

اب مارکس یہ بتاتا ہے کہ سرمایے کے بڑھنے کی کیا شرح ہونی چاہئے کہ طریق پیداوار مفلوج ہوکر نہ رہ جائے۔ مارکس یہ کہتا ہے کہ سرمایہ اتنی تیزی سے بڑھنا چاہئے تاکہ 'ز' بڑھ سکے۔ دوسرے الفاظ میں جس تیزی سے 'م' میں 'ز' گرے اس نسبت سے تھوڑی زیادہ تیزی

کو سرمایہ بڑھنا چاہئے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار زیادہ رہے اگر 'ز' آہستہ آہستہ گر رہی ہے تو کل سرمایے کی تھوڑی سی زیادتی نفع کی شرح کو سنبھالے رکھے گی۔ لیکن اگر 'ز' تیزی سے گر رہی ہے تو کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھنا ہوگا۔ مارکس وہ شرح بیان کرتا ہے جس تیزی سے سرمایے کا بڑھانا لازمی ہے' اگر سرمایہ اس تیزی سے نہ بڑھے تو سرمایہ داری ترقی نہیں کر سکتی۔ فرض کیجئے کہ کسی سماج میں (زر کے گھٹنے سے) نفع کی شرح (ہر سال) آدھی رہ جاتی ہے۔ مثلاً پہلے سال نفع کی شرح چالیس فی صدی تھی، دوسرے سال بیس فی صدی ہوئی، تیسرے سال دس فی صدی ہوئی اور چوتھے سال پانچ فی صدی رہ گئی۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ اگر مجموعی نفع کو پہلے کے برابر رکھنا ہو تو ہر سال سرمایے کو دگنا کرنا ہوگا۔ اگر پہلے سال سرمایہ ۱۰۰ روپئے تھا تو دوسرے سال ۲۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ چوتھے سال ۸۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ اس مثال میں نفع کی شرح ہر سال $\frac{1}{2}$ رہ جاتی ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ہر سال سرمایے کو دگنا کرنا پڑتا ہے یعنی نفع کی شرح کا مقسوم سرمایے کا مضروب فیہ ہونا چاہئے تب یہ مشکل حل ہوگی کہ مجموعی نفع کی مقدار برابر رہے۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگر سرمایہ داری کو قائم رکھنا ہے تو سرمایے کو اسی نسبت سے بڑھانا ہوگا جس نسبت سے نفع کی شرح گر رہی ہو۔ ورنہ طریق پیداوار کی ترقی رک جائے گی۔

اگر سرمایہ اتنی تیزی سے نہ بڑھے گا تو نفع کم ہو جائے گا جیسا ہم نمبر ۳ میں ظاہر کر چکے ہیں اور سرمایہ دار کو کوئی لالچ نہ رہے گا کہ طریق پیداوار کو ترقی دے۔ مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانے میں ایک خاص رفتار سے سرمایہ جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی وجہ سے اس رفتار سے سرمایہ جمع نہ ہو سکے تو نفع میں کمی ہونی لازمی ہے اور ایسا ہوتے ہی طریق پیداوار کا رک جانا لازمی ہے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں سرمایہ جمع کرنا طریق پیداوار کو آلاتی بنانا اور نفع کی مجموعی مقدار کو بڑھانا لازمی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ لازمی باتیں

سرمایہ داری کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ اُن کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مشین انسان کی جگہ لے لیتی ہے۔ سرمایہ سمٹ کر چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ سماج میں جنس خریدنے کی استطاعت نہیں رہتی۔ بازار میں اجناس کی بھیڑ ہو جاتی ہے، نفع غائب ہونے لگتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ اس تیزی سے جمع نہیں ہو سکتا جس کی طریقِ پیداوار کو ضرورت ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طریقِ پیداوار میں آشوب ہو جاتا ہے۔

جس نے ۱۹۲۹ء سے آج تک کی اقتصادی بدحالی کا مطالعہ کیا ہے (جو سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کا عطیہ ہے) اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ آشوب جنس کے بھیڑ ہو جانے اور نہ فروخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ مفکرین اس آشوب کو رفع کرنے کی کیا صورت بتلاتے ہیں۔ وہ اس آشوب کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ عوام کی خرید کی طاقت سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن دے کر بڑھانی چاہئے تاکہ اس میں جنس خریدنے کی اہلیت پیدا ہو اور پھر طریقِ پیداوار نفع بخش ہو جائے لیکن یہاں سرمایہ دار مفکرین یہ بھول جاتے ہیں کہ جب نفع کی شرح گرتی ہے اس وقت سرمایہ دار کو خود سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار بڑھا سکے۔ اس وقت وہ غریب کی کب مدد کر سکتا ہے۔

آج کل سرمایہ دار کو سرمایہ جمع کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ز، م کی نسبت بہت تیزی سے گر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری بجائے اس کے کہ عوام کی جنس خریدنے کی طاقت بڑھائے، مزدوری کو کم کرتا ہے اور جنسوں کی قیمت بڑھاتا ہے۔ ہر آشوب میں یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مزدوری گھٹا دیتا ہے اور سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن وغیرہ بند کر دیتا ہے تاکہ سرمایہ جمع کرنے کی رفتار میں کمی واقع نہ ہو۔ ہم اس رفتار کا اوپر ذکر کر آئے ہیں نفع کی شرح کا مقسوم سرمائے کا مضروب فیہ ہونا چاہئے۔ اگر سرمایہ اس رفتار سے جمع نہ ہو تو یہ سرمایہ داری کے لئے بہت ہی مہلک شکل ہے۔

مزدور کی اُجرت میں اضافہ اس فنڈ ہی کو ختم کر دیتا ہے جو نفع کی شرح گرنے پر صنعت میں لگایا جاتا ہے تاکہ نفع کی کل مقدار کو بڑھایا جا سکے۔

یہاں ہم نے سرمایہ داری کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔ اگر سرمایہ دار عوام کو مالی امداد نہیں دیتے تو بازاروں میں جنسوں کی بھیڑ ہو جاتی ہے، قیمت گر جاتی ہے، نفع کی شرح کم ہو جاتی ہے اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر امداد دیتے ہیں تو نفع کی شرح گر جاتی ہے۔ سرمایہ ضروری رفتار سے جمع نہیں ہو سکتا طریق پیداوار رُک جاتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ دار کو طریق پیداوار کے چلانے کا کم لالچ رہ جاتا ہے۔ وہ طریق پیداوار سے روپیہ کھینچ لیتا ہے اور دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طریق پیداوار اور منڈیاں سکڑ جاتی ہیں، مزدور بیکار ہو جاتا ہے، جنس فروخت نہیں ہوتی اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔

دراصل سرمایہ داری اسی وقت چل سکتی ہے جب سماج کا زیادہ حصّہ افلاس زدہ رہے اور سرمایہ دار کوڑی کوڑی جمع کرتا رہے تاکہ 'ز' کی گرتی ہوئی نسبت سے جو نقصان ہو اس کو کل سرمایہ بڑھا کر پورا کر سکے۔ جب سرمایہ دار مفکّروں کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ آشوب کو رفع کرنے کے لئے سماج میں جنس کے خریدنے کی طاقت تقسیم کرنی چاہیے تو سرمایہ دار بہت ہراساں ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے سرمایہ داری کے چلنے کے لیے جو دوسری شرط ہے (کہ سرمایہ تیزی سے بڑھے) پوری نہیں ہو سکتی۔ ان کا ہراس درست ہے کیوں کہ اگر ان ماہرین اقتصادیات کی رائے پر جو سماج کی خرید کی طاقت بڑھا کر آشوب کو رفع کرنا چاہتے ہیں کبھی بھی بڑے پیمانے پر عمل کیا گیا تو یہ کوشش سرمایہ دارانہ نظام کو فوراً درہم برہم کر دے گی۔

سرمایہ داری کے لئے دو متضاد باتیں ضروری ہیں:۔

(۱) سرمایہ داروں کا انفرادی نفع کا تخیل اور آپس کا مقابلہ ان کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ طریق پیداوار کو آلاتی بنائیں یعنی 'ز' کو کم کریں اور 'م' کو بڑھائیں۔

(۲) طریق پیداوار کو آلاتی بنانے سے جنس کی بھیڑ ہو جاتی ہے، آدمی غریب ہو جاتا ہے

سرمایہ دار کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ 'زر' بڑھے۔

سرمایہ داری بیک وقت یہ چاہتی ہے کہ 'زر' گھٹے بھی اور بڑھے بھی۔ یہ متضاد باتیں کیسے ہو سکتی ہیں؟

آج کل سرمایہ داری نظام کا یہ پہلو کہ اس میں پیسہ پیسہ جمع کرنا پڑتا ہے، ایک بھیانک حقیقت ہو گئی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے میں یہی وہ خصوصیت تھی جو اس کو بام ترقی پر لے گئی تھی۔ شروع میں سرمایہ دارانہ مقابلہ کے قانون اور نفع کی شرح کے گرنے کے قانون نے سرمایہ دار کو مجبور کیا کہ سائنس آلات اور مشین صنعت و حرفت کو ترقی دے، دنیا کے چپہ چپہ میں جا کر صنعت و حرفت جاری کرے اور اس کو آلاتی بنائے۔ سرمایہ داری دنیا کے ہر گوشے میں نہ صرف کلیں اور مشینیں لے کر پہنچی بلکہ اس تہذیب و تمدن کو بھی لے گئی جو ان آلات اور مشینوں کا پیدا کردہ تھا۔ بادی النظر میں یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ تہذیب و تمدن بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کو مشین پیدا کرے۔ مگر کسی زمانے کا تمدن، تہذیب اور مذہب ہمیشہ اس زمانے کے طریقِ پیداوار کا عکس ہوتا ہے۔ سرمایہ داری ایک ایسا طریق پیداوار تھا جو دنیا نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس طریقِ پیداوار کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ انسان کو مجبور کرتا تھا کہ قدرت کی طاقتوں پر قابو پائے۔ کیونکہ اس طریق میں ان طاقتوں کے پھیلنے کے لئے بہت وسیع فضا تھی۔

اقتصادی مقابلے میں نفع کی شرح گرنے اور سرمایہ بڑھانے کے قانون ہی تھے جنھوں نے ذرائع رسد و رسائل کو اتنا عام کر دیا۔ کڑوروں فیکٹریاں جاری کر دیں۔ دلدلوں کو شہروں میں تبدیل کر دیا۔ مارکس نے بارہا سرمایہ دار جماعت کا شکر سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے "یہ سرمایہ داری ہی کی برکت تھی کہ اس نے بڑی تیزی مگر بے رحمی کے ساتھ قدرت کی سوئی ہوئی طاقتوں کو انسانی خدمت کے لئے لا کھڑا کیا"۔ وہ سرمایہ دار جماعت کو TRUSTEES OF SOCIETY کے نام سے پکارتا ہے کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جس کے خزانوں میں وہ تمام دولت جاتی ہے جو انسانوں

کے آپس کے تعاون سے کام کرنے کا نتیجہ ہے۔

لیکن آج سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اپنا مشن پورا کر چکا ہے۔ سرمایہ داری نے انسان کی سست دستکاری کو ختم کر دیا ہے اور پیداوار کی طاقتوں کو اتنا وسیع اور طاقتور بنا دیا ہے کہ اب سرمایہ دارانہ نظام ان طاقتوں کے لئے تنگ ہو گیا ہے۔ جب تک سرمایہ داری کی چار دیواری مضبوط ہے اس وقت تک اگرچہ وہ طریق پیداوار کی طاقتوں کو مقید رکھ سکتی ہے لیکن وہ طاقتیں اپنے فطری رجحان کے مطابق وسیع ہونے کی کوشش میں چار دیواری سے ٹکراتی رہیں گی اور تصادم پیدا ہوتا رہے گا جس کی وجہ سے سماج میں ابتری بڑھتی چلی جائیں گی۔

طریق سرمایہ داری میں 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون سرمایہ دار ملکوں کو مجبور کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں جا کر دیکھیں کہ نفع کی شرح کہاں زیادہ ہے تاکہ وہاں فیکٹریاں کھولیں لیکن فی زمانہ یہ ظلم ہے کہ جہاں بھی کوئی کسی سرمایہ دار ملک میں پہنچتا ہے وہیں ایک حریف موجود ہوتا ہے جو اس کی دال گلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس ملک کا سرمایہ بیکار رہے اور کس کا نفع پیدا کرے۔ کیونکہ سرمایہ داری میں نفع کا مسئلہ حیات و موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لئے اس کا حل میدان جنگ پر ہوتا ہے۔

اب ہمیں دنیا کی اقتصادی اور سیاسی حالت کا اندازہ بہت صاف ہو گیا ہے کہ موجودہ ہنگامہ آرائی کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ مارکس کا قیمت کا نظریہ ہی یہ تحلیل ممکن کرتا ہے کہ آج کل دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ مارکس نے عرصہ ہوا یہ کہا تھا کہ جس تیزی سے طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داری ختم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا بادل دنیا پر ابھی تک چھا رہا ہے اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ مارکس کا نظریہ غلط ہو۔ اب اس پر غور کرنا ہے کہ سرمایہ داری اب تک کیوں

ختم نہیں ہوئی اس کی وجوہات ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) 'ز' اتنی تیزی سے نہیں گر رہی جتنا کہ مارکس کا خیال تھا۔

اگرچہ سماج میں 'ز' عام طور پر کم ہوگئی ہے لیکن اس کی کمی کو مزدور سے زیادہ کام لے کر پورا کیا جا رہا ہے مثلاً اگر دو آدمی چھ گھنٹے کام کرتے تھے تو ان کو برطرف کرکے دونوں کی اجرت سے ذرا کم پر ایک آدمی رکھا جو بارہ گھنٹے کام کرتا ہے یہاں 'ز' کی تعداد میں تو فرق آگیا لیکن مقدار میں فرق نہیں آیا۔ محنت وہی بارہ گھنٹے کی رہی۔ البتہ دو مزدور کی بجائے ایک مزدور رہ گیا۔ انگلستان میں اب بھی 'ز' کافی ہے اور 'م' اس قدر نہیں بڑھا جتنا امریکہ روس اور جرمنی میں بڑھا ہوا ہے۔ اس پر بھی یہ حالت ہے کہ آسٹن کے موٹر کے کارخانے میں ۱۹۲۳ء میں ۵۵ آدمی ایک موٹر کی تیاری کے لئے درکار تھے لیکن ۱۹۳۲ء میں آٹھ آدمی موٹر بنا لیتے ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ کارخانہ کو اور آلاتی بنایا اور ان آٹھ مزدوروں سے تگنا چوگنا کام لیا جانے لگا۔ یہاں اگر مزدوروں کو تعداد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو 'ز' بہت گر گئی لیکن اگر محنت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اتنی نہیں گری

(۲) قدرِ زائد بڑھ گئی ہے۔

طریقۂ پیداوار جیسے جیسے آلاتی ہوتا جاتا ہے جنسوں کے دام گرتے جاتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدور کو زندہ رکھنے اور بال بچوں کو پرورش کرنے میں جن اجناس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے دام بھی گر جاتے ہیں۔ نتیجتاً مزدور کی قیمت گرتی جاتی ہے

فرض کیجئے سو مزدور ایک ہفتے میں چار سو روپے کی قیمت پیدا کرتے ہیں ان کی اجرت دو سو روپیہ ہے اور پچاس فی صدی قدرِ زائد پیدا کرتے ہیں مگر صنعت و حرفت کی ترقی سے اور نتیجتاً جنس کے سستا ہونے کے باعث جن مزدوروں کو پہلے دو سو روپے ملتے تھے اب ایک سو پچاس روپے ملنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اجرت کم ہوجانے پر بھی وہ چار سو روپے کی جنس پیدا کرتے رہیں گے اس کے یہ معنی ہوئے کہ اجرت گھٹ جانے پر شرحِ پیداوار

کو دو سو پچاس روپئے قدرِ زائد مل گئی ۔ جہاں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے وہاں نفع کی شرح کے گرنے کا کم اثر محسوس ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی جہاں نفع کی شرح کم کرتی ہے وہاں زیادہ بھی کرتی ہے۔ اس طریق پر سرمایہ داری کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے اور آرام کا سانس لے سے ۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو مزدور کو نچوڑ کر اور اس کی اُجرت کم کر کے پورا نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ شرح کے گرنے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مزدور کو نچوڑنے کی بھی ایک حد ہے جس کے بعد اس کو نہیں نچوڑا جا سکتا لیکن نفع کی شرح کے گرنے کی کوئی حد نہیں۔

(۳) "م" کی قیمت اور حجم میں فرق ہے۔

'م' کے حجم کی زیادتی اور 'م' کی قیمت کی زیادتی میں فرق ہے۔ 'م' کی قیمت اس نسبت سے نہیں بڑھتی جس نسبت سے حجم بڑھ رہا ہے۔ مشینیں اب مشینوں سے بنتی ہیں اس لئے ان میں قیمت کم ہوتی ہے۔ لیکن بظاہر دنیا کی صنعت و حرفت میں 'م' بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ جب 'م' کی زیادتی اس قدر ہو گئی تو نفع کی شرح صفر ہو جانی چاہئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'م' کا حجم بڑھ رہا ہے اور قیمت کم ہو رہی ہے۔ سماج میں 'م' 'ز' کی نسبت اتنا زیادہ نہیں ہوا کہ نفع کی شرح صفر ہو جائے ۔

نفع کی شرح اس طرح بھی بڑھائی جاتی ہے کہ دوسرے ملکوں سے مزدور کے استعمال کی جنسیں غلہ وغیرہ سستے داموں پر منگا لی جاتی ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدوری کم ہو جاتی ہے قدرِ زائد زیادہ پیدا ہونے لگتی ہے۔ سرمایہ دار ملک غیر ترقی یافتہ ملکوں کے بازاروں میں اقتصادی لوٹ مچا کر بھی نفع کی شرح بڑھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں نفع کی شرح کو گرنے سے روک نہیں سکتیں ، صرف گرنے کی تیزی کو آہستہ کر سکتی ہیں ۔ عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر آشوب کی رفتار آہستہ کی جا سکتی ہے تو کیا اس کو روکا نہیں جا سکتا ۔ مارکس کہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری میں آشوب ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار مفکرین کہتے ہیں

کہ 'ز' اور 'م' کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ بازار میں جنس کی بھیڑ نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار اور امیر طبقے کیلئے ہی جنس بنانی چاہیئے عوام کے لیے جنس بنانے کی ضرورت ہی نہیں لیکن جب جنس چند امیروں کے لئے ہی بنے گی تو ذرائع پیداوار بنانے سے کیا فائدہ اور امیر آخر کتنی جنس خرید لیں گے

دوسری بات سرمایہ دار مفکرین یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ابھی تک اس قدر غیر ترقی یافتہ ممالک موجود ہیں کہ ان میں سرمایہ لگا کر سرمایہ داری کو از سر نو جوان کیا جا سکتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر سرمایہ دار ممالک تحفظ و حفاظت کی پالیسی ترک کر دیں اور ممالک میں آزادی کے ساتھ لین دین ہونے دیں تو سرمایہ داری میں آشوب نہیں ہوگا۔

کارل مارکس کے نزدیک یہ سب تجاویز بے کار ہیں کیونکہ یہ 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کو نہیں روک سکتیں۔ سماج میں تھوڑے ہی عرصے میں اتنا سرمایہ پیدا ہو جائے گا کہ اس کو طریق پیداوار میں لگانے سے نفع کی شرح بجائے بڑھنے کے گھٹنے لگے گی مثلاً ۲۰۰۰ روپئے سے ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا ہے تو شرح نفع ۱۰ فی صدی ہوئی۔ فرض کیجئے کہ سماج نے نفع کو اصل میں جمع کر کے ایک عرصے میں ۳۰۰۰ روپئے کر لئے اور مشین وغیرہ خرید لی یعنی 'م' اب ایک ہزار روپئے زیادہ ہو گیا۔ اور جنس ½ زیادہ پیدا ہونے لگی۔ لیکن 'ز' وہی رہی یعنی سماج میں جنس کی مقدار تو بڑھ گئی لیکن خرید کی استطاعت نہیں بڑھی لامحالہ جنس کو سستا کرنا پڑے گا نفع کی شرح گر جائے گی۔ فرض کیجئے کہ نفع کی شرح ۶۔۶ فیصدی ہو گئی اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۳۰۰۰ روپئے پر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا پہلے ۲۰۰۰ روپے لگا کر ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا تھا اب ۳۰۰۰ روپئے لگا کر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا اس صورت میں کون سی سرمایہ دار سماج ہے جو طریق پیداوار کو بڑھائے گی۔ مارکس کہتا ہے کہ کتنا ہی کچھ کیجئے لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں ایک وقت ایسا آئے گا کہ سرمایے کا ذرا سا بڑھنا کل سماجی سرمایہ کی نفع کی شرح کو گھٹا دے گا۔ مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ اور مزدور دونوں موجود ہوں گے مگر ایک دوسرے کو استعمال نہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ اُن کے ملنے سے نفع کی شرح بجائے

بڑھنے کے گرنے لگے گی جس کو آشوب کہتے ہیں۔ نفع سرمایہ داری کی جان ہے اگر سرمایہ داری سے نفع کا تخیل مفقود ہو جائے تو وہ سرمایہ داری ہی نہیں رہتی۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جنس کی افزائش کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ انسانی ضرورت سے زیادہ بن گئی۔ ممکن ہے کہ لاکھوں انسان اس جنس کی ضرورت سے مر رہے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جنس نفع کے لئے بنائی جاتی ہے اور جونہی کہ اس کے لین دین سے نفع غائب ہوا سرمایہ دارانہ اصطلاح میں وہ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی۔ سرمایہ داری کا مطمح نظر انسانی ضرورت کو پورا کرنا نہیں ہے بلکہ نفع کو بڑھانا ہے۔ سرمایہ داری کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ہر انسان اپنے نفع کی طرف دیکھے تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوگا کہ سب انسانی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی اور سماج بہت ترقی کر سکے گی۔ سرمایہ داری کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اس نے انسانی خودغرضی کو طریق پیداوار کے ساتھ منسلک کر کے اس کو ترقی کا ایک سبب بنا دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا مطمح نظر نفع ہے۔ یہ بالکل اتفاقی امر ہے کہ طریق پیداوار میں حصہ لینے سے نفع پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر بغیر جنس بنائے نفع ہونے لگتا تو سرمایہ دار کبھی بھی جنس نہ بناتا۔ چنانچہ جب بھی جنس بنانے میں نفع غائب ہوتا ہے سرمایہ دار جنس بنانی بند کر دیتا ہے اور جب جنس تباہ کرنے میں نفع معلوم ہوتا ہے تو وہ اس کو تلف کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ تاچ کی روئی، قہوہ، چائے، نارنگیاں، گیہوں، مچھلی عام طور پر تباہ کی جاتی ہیں تاکہ نفع کی شرح نہ گرنے پائے۔ ہندوستان میں شکر اور سن کی پیداوار گھٹائی جاتی ہے حالانکہ لاکھوں ہندوستانیوں کو شکر دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ معاملہ خام جنس کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ فیکٹریاں تباہ کر دی جاتی ہیں تاکہ نفع کی شرح گرنے نہ پائے۔

مارکس مندرجہ بالا تدابیر کو ناپاسیدار اور ہنگامی کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح نفع کی شرح بڑھانے سے نقصان ہوتا ہے کیونکہ جب دوبارہ آشوب ہوتا ہے تو اور زیادہ

سخت ہوتا ہے۔

سرمایہ داری کا نفع بڑھانے کا دوسرا طریقہ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں قدرِ زائد کو زیادہ کرنا ہے۔ لیکن یہ سرمایہ دار کی آدھی فتح ہے۔ کیونکہ جب تک سرمایہ دار قدرِ زائد روپے میں نہ بدل لے اس وقت تک اس کا مقصد حل نہیں ہوتا۔ لیکن قدرِ زائد بڑھانے سے سماج میں روپئے کی تقسیم میں کمی آتی ہے۔ یہاں بھی وہی تضاد کی شکل پیدا ہو جاتی ہے سرمایہ داری کی ساری خرابی یہ ہے کہ اس کا مطمعِ نظر نفع ہے۔ کچھ عرصے نفع کا بڑھنا اور طریقِ پیداوار کی ترقی دوش بدوش چلتی ہیں۔ طریقِ پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع بھی بڑھتا ہے۔ لیکن ایک منزل پر پہنچ کر انفرادی نفع اور طریقِ پیداوار کی ترقی میں تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ نفع کو بڑھائیں تو طریقِ پیداوار سکڑتا ہے اور اگر طریقِ پیداوار کو وسیع کریں تو نفع گرتا ہے۔

موجودہ زمانے میں طریقِ پیداوار میں مستقل تضاد کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اب کوئی ایسا طریقِ پیداوار تخلیق کرنا پڑے گا جس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشوونما کے لئے وسیع فضا ہو۔ مارکس کہتا ہے کہ کسی طریقِ پیداوار کو زندہ رہنے کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشوونما کے لئے گنجائش ہے۔ سرمایہ داری اب اس پر مجبور ہو گئی ہے کہ طاقتوں کو بجائے بڑھانے کے گھٹائے؛ لہٰذا اب اس کو حق نہیں کہ پیداوار کی طاقتوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے۔

کارل مارکس کا خیال تھا کہ اگر سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کو نہیں بدلا گیا تو دنیا میں اس قدر کشت و خون ہوگا کہ عجب نہیں کہ دنیا کا تہذیب و تمدن ختم ہو جائے، اگرچہ یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ آیا ہمارا تہذیب و تمدن اس قابل ہے بھی کہ اس کی تباہی پر کفِ افسوس ملا جائے؟ بہرحال جب انسان ہی فنا ہو گیا تو اچھی بری تہذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں حیوانات کا زندہ رہنا اور نسلِ انسانی کا ایک غلط سماجی نظام کا شکار ہو جانا قابلِ افسوس ضرور ہے اس تباہی سے اگر کوئی نظام بچا سکتا ہے تو وہ سوشلسٹ نظام ہے۔

ملک الشعرا ذوقؔ

(۱) غزلیات

ذوقؔ کو آج کل کے معیار سے جانچنا درست نہیں اس لئے کہ وہ بالکل اپنے زمانے کی پیداوار تھے اس لئے انھیں اس عہد سے باہر نکال کے دیکھنا ان کی حق تلفی کرنا ہے۔ موجودہ معیار کے مطابق وہ شاعر نہیں تھے لیکن اپنے عہد کے بہترین شاعر سمجھے جاتے تھے محض اس لئے کہ اس زمانے کا معیار شاعری دوسرا تھا یعنی شعر میں ظاہری خوبیاں پیدا کرنا اور ان پر داد طلب کرنا۔

کچھ تو شاہ نصیر کی دلی سے غیر حاضری اور کچھ معرکوں میں دوبدو کامیاب مقابلوں نے

پیدائش ۱۷۸۹ء۔ وفات ۱۸۵۴ء۔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جن کو شعر گوئی سے شوق تھا۔ ان کے طلبا میں بھی اسی وجہ سے شوق پیدا ہوا ان کے ایک ہم عمر اور ہم سبق میر کاظم حسین بیقرار کی وساطت سے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے ذوق نے غیر معمولی صلاحیت دکھلائی چنانچہ شاہ نصیر نے انھیں ٹالنا شروع کیا یہاں تک کہ شاگردی منقطع ہوگئی۔ خود اپنی غزلوں پر نظر ثانی کرنے لگے۔ غزلیں بے انتہا مقبول و معروف ہوگئیں۔ ظفر بادشاہ کی غزل شاہ نصیر ٹھیک کیا کرتے تھے وہ دکن چلے گئے۔ اس کے بعد میر کاظم حسین نے بنانا شروع کیا لیکن وہ بھی الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر باہر چلے گئے چنانچہ بادشاہ کی غزلوں کی اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہوا۔ انہیں دنوں میں نواب الٰہی بخش خاں (غالب کے خسر) بھی ذوق کو اپنی غزلیں دکھلانے لگے ان دونوں کی غزلیں بنانے میں آپ خود بھی بن گئے۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو مشاعروں میں اکثر ان سے معرکے ہوتے رہتے تھوڑے عرصے میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو خاقانی ہند کا خطاب دیا ظفر جب بادشاہ ہوئے تو بھی یہ موقعہ موقعہ پر قصائد کہتے رہے یہانتک کہ تنخواہ انکی چار سے سو روپے ہوگئی۔ ایک دفعہ گاؤں جاگیر میں ملا اور خطاب خان بہادری و ہاتھی معہ حوضہ دوسرے موقع پر۔ بعمر ۶۰ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔

تصانیف:۔ ظاہر ہے کہ بہت کچھ کہا ہوگا مگر غدر میں سب تباہ ہوگیا۔ ان کے شاگردوں یعنی محمد حسین آزاد اور حافظ غلام رسول ویراں وغیرہ نے کچھ کلام فراہم کرکے ۱۲۰۰۰ اشعار کا ایک دیوان ترتیب دیا ہے جن میں ان کے ۱۵ قصیدے اور ایک ناتمام مثنوی نامۂ جہاں سوز بھی ہے۔

شاگرد:۔ محمد حسین آزاد۔ بہادر شاہ ظفر۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب مرزا خاں داغ۔ حافظ غلام رسول ویراں ظہیر الدین ظہیر۔ شجاع الدین انور وغیرہ

ذوق کی شہرت اور شاعری کو چمکا دیا۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں۔ محاوروں کا نگینوں کی طرح
بٹھانا اور گرمی کلام نے لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لیا۔ یہاں تک کہ خاقانی ہند کے خطاب
سے سرفراز کئے گئے اور کم سنی ہی تھی کہ بوڑھے بوڑھے لوگوں نے اپنے اشعار ان کو دکھلانے
شروع کر دئے۔

ذوق اپنے زمانے کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ علوم متداولہ عقلی و نقلی میں ماہر جو اس زمانے
کے شاعر کی خصوصیات اور ضروریات میں سے تھا۔ بحور وا وزان پر تکملہ اس کے ساتھ ہی طبیعت میں
جدت و اختراع بحور کا شوق الفاظ کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ کیونکہ سینکڑوں دیوان نظر
سے گذر چکے تھے اور اس قدر کاوش سے مطالعہ کیا تھا کہ مختلف الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف
ہو گئے۔ طبیعت میں گرمی تھی اور جو ممکن ہے اگر اس علم و فضل میں نہ گھرے ہوتے اپنا اصلی رنگ
زیادہ واضح طور پر دکھاتی، مگر جو اس قدر محصور ہو گئی اور اس قدر پابند کہ ذوق کی شعریت مفقود
ہو گئی مضامین زبان پر تھے اس لئے کہ اس زمانے تک کے خیالات اسنے گنے تھے۔ خود اپنی طرف سے
جدت مضامین و خیالات میں نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ پیارے کہ اصل شئے مانتے تھے نہ کہ اس کے
اندر کی شئے کو۔ پابند قیود شاعری تھے نہ کہ شاعر یعنی آزاد۔ اس لئے اگر کبھی واقعات نظم بھی
کرتے تھے تو اس قدر صورت بگاڑ کر کرتے کہ وہ خارجی سی چیز ہو کر رہ جاتی[۱] ایک نپی تلی چیز
حقیقت سے بیگانہ۔ اصلیت سے الگ۔ لیکن قواعد شاعری سے مستحکم۔ اور یہ دقت اس زمانے
ہر شاعر کو پیش آتی تھی کہ دل کو بڑی مشکل سے چھیڑ پاتے تھے اور محض خارجی دماغی تعریفیں ہو کر
رہ جاتی تھیں۔ اور اسی خارجی و دماغی تعریف کا ہر شاعر متمنی رہتا تھا۔ اگر کسی کے تصور نے قواعد
دبا دئے ساغر کے جھرمٹ میں اپنے دل کی بات نکال لی۔ یا شاعر نے اتفاقیہ یا دانستہ کہیں لگتی
بات کہدی تو صوفی کو محفل میں حال آ جاتا تھا، نہ شعرا عموماً ماجرے دل سیدھی سیدھی طور پر

---

[۱] ملاحظہ ہو وہ غزل جو ہمدمی وطن و جدائی پر شاہ علی شاہ کی مسند پر کہی وہ غزل جو فضل حق کے لئے لکھی اور وہ غزل جو لشکریوں
کے لئے لکھی وغیرہ وغیرہ یا بارہ ٹوپیوں والے مخمس۔

بیان کر دینا ایک بہت آسان بات سمجھ کر اس طرف کبھی مشغول نہ ہوتے تھے۔ تعریف اور طرۂ امتیاز وتمغۂ لیاقت اسی وقت تھا جب کہ اسے علمیہ طور پر بیان کیا جائے۔ ورنہ یوں رونے کو تو ہر شخص بین کر لیتا ہے اور کہنے کو ہر ایک کے منہ میں زبان ہے۔

ذوق کا زمانہ عموماً قدرتِ بیان کو سراہتا ہے نہ کہ ماجرائے بیان۔ صورتِ کلام نہ کہ کلام۔ اور اسی قدرتِ بیان وصورتِ کلام کی تعریف ہوتی۔ مشاعرے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے بلکہ کس طرح کہا ہے۔ اور کس صورت وشکل کو لے کر۔ دقیق سے دقیق ردیف و قافیے انمل بے جوڑ قسم کے لیتے ہیں اور استاد وہی سمجھا جاتا ہے جو ان کو نباہ دے۔ خیالات و احساسات وجذبات سے کسی کو تعلق نہیں۔ گویا یہ شاعری کے لوازمات میں نہیں ہے شاعری ان کے نزدیک محض لفظی بازیگری ہے۔ اگر کسی میں جدت واپچ اور تصور ہے بھی تو طرزِ ادا کی پیچیدگیاں اختراع کرنے میں صرف کرتا ہے نہ کہ خیالات پیدا کرنے میں۔ خیالات کو یہ طبقہ محدود سمجھتا ہے اور طرزِ ادا کو لامحدود۔ اسی لئے طرزِ ادا ہی میں محض کاوشیں ہوتی ہیں نہ کہ تخیلات اور تصورات میں۔ خیالات وہی فارسی شعراء سے آئے ہوئے بندھے ٹکے ہیں اس لئے ادھر کاوش غور وفکر کی گنجائش نہیں۔ ذوق کے یہاں یہ سب باتیں انتہائے کمال پر ملتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ان کی گرمیِ طبع تشکیل میں مصروف رہی نہ کہ تعمیر میں۔ جسم میں نہ کہ روح میں اور یہ اس زمانے کا تقاضا تھا۔

ایک عالم[1] شخص شاعر نہیں ہوا کرتا اور شاعری کے لئے علمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ

---

[1] ذوق نے بہت کچھ پڑھا۔ دیوانِ اساتذہ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات، بیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا ان کی زبان پر تھیں [illegible] شعر لے کر ختم کئے۔ اردو شعر بہت زبردست اور گفتگو کے وقت وہ نہایت شوق سے سند پیش کرتے تھے مجھے اس کا تعجب نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے ہوئے بیٹھے تھے یہ باتیں اس کے لوازمات ہیں [illegible] پانچ کا ذکر ہے تو وہ ایک صاحبِ نظر ہو [illegible] ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں تصوف کا ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں وحدت وجود [illegible] وحدت شہود میں علم شراف کا ذکر تو [illegible] کبھی ابوسعید ابوالخیر کبھی محی الدین عربی [illegible] کانٹے کی تول [illegible] دل پر نقش ہوتا تھا" اس کے علاوہ رمل نجوم، طبابت، موسیقی کے واقفات کے تھے [illegible]

جو شعر کہہ کر کلیاں کر کے دہن و زبان صاف کرڈالتا ہو[۵۱] اس کا احترام شاعری معلوم۔ چنانچہ ہم ذوق کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ محض فن شاعری یعنی شعر بنانا جانتا ہے لیکن اپنے فن میں اس قدر استاد ہے کہ اکثر ہم کو دھوکے میں ڈال دیتا اور ڈال سکتا ہے گویا وہ اصلی شاعر ہے۔ اصلی شاعری ان کے یہاں ڈھونڈے سے نہ ملے گی حالانکہ فنی شاعری سے ایک مصرعہ بھی خالی نہیں۔ کمال فن کے دھوکے اکثر اس جگہ نظر آجائیں گے جہاں شعر ایسا صاف بندھا ہو کہ رواں اور آمد معلوم ہوتا ہو فنی ارتقا ان کے کلام سے صاف ہویدا ہے یعنی ابتدائی غزلیں ایسی سانچے میں ڈھلی ہوئی اور چھینی سے تراشی ہوئی نہ ہوتی تھیں جیسی بعد کو ہو گئی تھیں۔ لیکن جو طرز انھوں نے شروع کیا تھا اس سے مرتے دم تک علیحدہ نہ ہو سکے[۵۲] وہی الفاظ کی نشست کا خیال۔ محاوروں کو باندھنے کی کاوش اور قوافی و ردیف کا التزام الفاظ سے الگ ہو کر معانی کی طرف آجاتے اس قسم کا انقلاب اُن کے یہاں کبھی نہ ہو سکا۔ جوانی کا طرز رنگینیت کی طرف مائل ہے جو بعد کو پرہیز گاری کے سبب محض گرمی طبع ہو کر رہ جاتا ہے۔

صرف ذوق ہی ایسے شخص ہیں جو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہیں ورنہ اس زمانے کا کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنی کم نصیبی اور ناقدری کا شکوہ نہ کرتا ہو اور بھلا ذوق کر بھی کیسے سکتے تھے۔ ایک تو طبیعت قناعت پسند۔ دوسرے حوصلہ و اُمنگ بوجہ کم حسبی کے محدود۔ تیسرے یہ کہ استاد شاہ تھے اور درحقیقت اپنے عہد کے استاد مانے بھی جاتے تھے۔ محض دلی میں نہیں بلکہ باہر بھی۔ اس کے علاوہ خود پر اعتمادِ فنی تھا۔ اس لئے بے نیازی آگئی اور طبیعت غنی ہو گئی۔ آمدنی و جاگیران

---

[۵۱] پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے   کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

[۵۲] آخری غزل

کیا کہیں اس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا   وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا
بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشرِ مستِ غرور   گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا
کرتا ہے جب نالہ اپنا عالمِ بالا کی سیر   ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا
آفتابِ حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد   پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

کی سی معاش و طبیعت رکھنے والے کے لئے کافی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سوائے ابتدائی ایک دو غزلوں کے کہ جب تک یہ بادشاہ کے نوکر نہیں ہوئے تھے اُن کے یہاں اُن کو اپنے زمانے سے کوئی شکایت معلوم نہیں ہوتی[1] اور بہادر شاہ محض شاہ شطرنج ہو لیکن اُن کے لئے سلطان سنجر سے کم نہیں اگر کبھی شکایت کی قسم کا کوئی جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس پر قناعت غالب آجاتی اور دلی کی گلیاں زنجیر پا بن جاتیں[2] اس کے علاوہ طبیعت پرہیزگاری اور تصوف کی طرف مائل۔ وظیفہ و وظائف میں مشغول رہنے والے دنیا بھر کی بہتری کے لئے دعائیں مانگنے والے۔ منکسر المزاج، قانع اور حلیم الطبع ایسا شخص ناصح بہتر ہو سکتا ہے بہ نسبت شاعر کے۔ شاعر کے لئے ہمیشہ ایک بے چین روح کی ضرورت ہے وہ ذوق کے یہاں مفقود تھی۔ اُن کے جوانی کے ولولے بھی شاعروں کے معرکوں میں صرف ہوئے نہ کہ وارداتِ شعری میں۔ شب ہجر کے مضمون بنانے میں نہ کہ شب ہجر کے تارے گنے ہیں۔ ان کی جوانی کی غزلیں دیکھئے۔ الفاظ رنگین اور بہت شگفتہ ہیں لیکن مضمون رنگین نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پرہیزگار شاعر کا دیوان کا دیوان الٹ جائیے معاملہ بندی میں بھی ایسا شعر نہ نکلے گا جسے محض الفاظ و محاورہ ہی کے خاطر عریاں کہا جا سکے[3] اور اپنے عہد میں ذوق اس خصوصیت کے تنہا علمبردار ہیں۔ ورنہ اور سب کبھی نہ کبھی ضرور بہک جاتے ہیں۔ کچھ زمانے کا مذاق اور کچھ ان کا اپنا طریقہ کہ ارباب نشاط کے لئے بھی غزلیں لکھتے ہیں تو مضمون بندی کی نہ کہ ایسی جو گرما دیں اور تڑپا دیں۔ معاملہ بندی بھی کئی جگہ ہے لیکن وہ اُن کی ذاتی چیز نہیں۔

---

[1] ابتدائی دو غزلوں کے دو شعر

در مضمون ہیں ترے ذوق زلبس بے بہا — کم کوئی اُن کا خریدار نظر آتا ہے
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ — سب فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا

[2] گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں مضموں کی قدر — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

[3] سوائے ایک آدھ شاذ مثالوں کے وہ بھی محض لفظی رعایت کی خاطر (معاملہ بندی کے اشعار کا انتخاب عام اشعار کے انتخاب میں دیدیا گیا ہے)

گھبرانا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش — گھبرانے لگا سینے میں دم اور زیادہ
کل کے جو وصل کے عالم میں نظر میں پھرتے — آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ذوق کو الفاظ سے اور نشست الفاظ سے بے حد اور بچپن ہی سے شوق تھا[1] کچھ تو یہ کثرت مطالعہ کے سبب تھا کچھ یہ کہ اُن کا زور طبع یا زور جذبات چونکہ خیالات کی طرف جاتا نہیں تھا اس لئے لامحالہ فراوانی الفاظ چاہتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جوانی میں نئی نئی اور طویل بحروں میں اپنا زور طبع دکھلایا[2]۔ بلکہ لمبی بحروں میں کہنے کا شوق انھیں اخیر تک باقی رہا۔ ابتدا کے قصائد میں بھی فراوانی الفاظ کا خاص مظاہرہ اور اہتمام ہے[3]۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشاعروں میں لمبی بحروں والی غزلیں پڑھ کر اور الفاظ و نشست الفاظ کی شان دکھا کر اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے اور جما لیتے تھے۔ بلکہ ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قصیدے میں سوداؔ کا تتبع کرنے سے غزل میں بھی لفظی دروبست اور سلیقے میں مدد ملی ہو۔ لیکن دراصل لمبی بحروں۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں میں کہنے کی عادت انھوں نے شاہ نصیر کی میراث و مقابلے میں پائی۔ اس کے علاوہ خواص اور عالی شعرا کی پہچان اور طغرائے امتیاز یہی دقت پسندی اور مشکل گوئی تھی نہ کہ خیالات کی بلند پروازی جیسی کہ آج کل ہے اس لئے قدرت کلام اور قوت بیان کی آزمائش اور پہچان اسی وقت ہوتی اور ہو سکتی تھی جب اُن مل بے جوڑ باتیں ملا دی جائیں۔ عوام اس سے عاری تھے اس لئے وہی شعرا لائق ستائش و منزلت سمجھے جاتے جو اس معیار پر آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے حالانکہ ذوق کے زمانے میں مصحفی و انشا تو نہ رہے تھے پھر بھی ناسخ کی غزلیں لکھنؤ سے برابر آیا کرتی تھیں اور ان پر غزلیں نہ کہنا ذوق اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ غرضکہ قافیہ پیمائیوں کا برا ہو کہ اُن کا تمام دیوان اسی قسم کے دفتر سے بھرا پڑا ہے

---

[1] ابتدا کی غزل ہے

ارے ہے کچھ وصل کا ذکر اب لانا نہیں اچھا — وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی سکے جب جب

تم نے دشمن ہے جو اپنا نہیں جانا اچھا — یار نادان سے تو ہے دشمن دانا اچھا

بچپن کی غزلوں میں سے

وہ نوخط تیغ جو میں جب تری بہتا آب حیات ہو — تو شہید ناز ہو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو

[2] تمنا نہیں ہے کہ بلا دل پہ تیغ کا صدمہ ہو مرد و تقسیم ہو — یہی حق ہے قاتل اگر حق دلاوے یہ بسمل ترے پا دل بجان بچی ہو

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے کر اس میں زلف سرکش ہو — پھر زیب بنے وہ دست موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

کوئی ہے ہندو فرنگی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں — ہوا اس کے نزدیک بیری سے وہ اس کے نزدیک ہر کی ہو

[3] سحر جو گھر میں ہے شکل آئینہ تھا میں تنہا نظارہ حیراں — تو اک پری چہرہ جو طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں (وغیرہ)

اور گویا ایک جسم ہے[1]

رعایت لفظی ذوق کے آرٹ کا خاص جزو ہے۔ کہیں کسی غزل کسی شعر میں اس سے چھٹکارا نہیں[2]۔ اور ذوق کیا یہ بھی اس زمانے کے روایات میں سے ہے اور جس کو خصوصاً نصیر اور ناسخ نے بہت سراہا اور رواج دیا اور جو اتنا مرغوب زمانہ رہا کہ نہ صرف اسی زمانے میں اس کی گرما گرمی رہی (یہاں تک کہ مومن نے بھی بیشتر اور غالب نے اکثر اس کو اختیار کیا۔) بلکہ بیسوی صدی کے ربع اول تک اس کا قبول عام قائم رہا۔ ذوق کی صناعی کی بنیاد بہت کچھ اسی پر قائم ہے۔

---

[1] مشکل ردیف اور قافیے کی صرف ردیف الف سے چند مثالیں:۔ سراغ پا۔ چراغ پا۔ باہمدگر دونوں جدا۔ ہم سفر دونوں ہم دونوں جدا۔ تصویر دل میرا۔ شمشیر دل میرا۔ مقارزر یا۔ ساغرزیر یا۔ آغوش نقش پا۔ روپوش نقش پا۔ طوفان چڑھا۔ بیابان چڑھا۔ تھوڑا اٹکا۔ روڑا اٹکا۔ منڈیر کا ٹھینگر کا۔ بغل میں مارا۔ اجل میں مارا وغیرہ۔ ذوق نے ناسخ کی غزل پر غزل کہی۔

شوق نظارہ ہے جب اس رخ پر نور کا ہے مرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک صیاد کا خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

لچکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز جنباں ہو جوں نسیم چمن سے سمن کی شاخ

مشہور یہ تھا کہ اس طرز پر کوئی نہیں کہہ سکتا ذوق نے سہ غزلہ کہا۔ ۳۸، ۹، اور ۲۱ اشعار کا

قافیہ پیمائی کی چند مثالیں:۔

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر فلک گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھینگر کا

کوٹھے پہ ان کے خوب بچے آج رات کو تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

یا

جلد آ وعدہ دیدار پہ اے وعدہ خلاف کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا وغیرہ

اور جس غزل میں مشکل ردیف و قوافی نہ ہوتے تو ان کا جی شعر کہنے میں نہ لگتا۔ ایک آسان مصرعہ طرح پر شکایت کرتے ہیں۔

ذوق بازیچہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

[2] چند مثالیں

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

میں وہ شہید ہوں لب خندان یار کا ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

۱ دوسری چیز محاورے کا استعمال ہے [۵] عموماً محاوروں کا استعمال اس لئے کیا جاتا تھا کہ شعر عوام کی زبان پر رواں ہو سکیں جس کی وجہ سے مشہور ہوں۔ دوسرے ان میں خوب صورتی اور روانی پیدا ہو جائے۔ تیسرے اس لئے کہ خود محاورے محفوظ ہو جائیں اور اس طرح زبان کی خدمت ہو سکے اکثر یہ وجہ بھی ہوتی تھی کہ چونکہ عموماً محاوروں کا استعمال اور موزوں کر دینا بوجہ ان کی شہرت کے

(بقیہ صفحہ)

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا / کہہ جو تجھے کہنا ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا

تھے دو گھڑی سے شیخ جی۔ شیخی بگھارتے / ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون مری چتون پر / میں کہوں میں! تو کہے "میں کے چھری گردن پر"

قاصد لکھوں لفافے کو خط غبار سے / تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

در دِ دل سے لوٹتا ہوں کس کو میرا درد ہے / ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

چند لفظی صناعیاں۔

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق / نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہو گیا

کوئی آواز تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا / ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہر دوں۔ نہ ٹھہرے گا

ہے وہ آزار محبت سے دل زار کو رنج / جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

راحت و رنج زمانے میں ہیں دونوں لیکن / یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو / ہے جو ناکامی فرہاد کا کہسار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج / خط بھیج یا نہ بھیج زبانی خبر تو بھیج

پھر کر اِدھر اُدھر بھی نہ اپنا گیا قلق / لفظ قلق کی طرح سے یونہی رہا قلق

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا / ہے دل سے یاد ساقیٔ کوثر لگی ہوئی

بندشس الفاظ۔

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو / دیتا ہے ایسی کوئی بھی مرد خدا اصلاح

یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کرتے ہیں آج / چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا اصلاح

اے ذوق جانہ ہوش و خرد کی صلاح پر / جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

[۵] ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا / سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں ملے گا / پہن کر وہ جامہ ہی اگر آئے قرآن کا

یار نادان ست ہے دشمن دانا اچھا / کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

لکھے موسیٰ پڑھے خدا۔ گھنگنیاں بھرے منہ میں بیٹھے رہنا۔ کسی شخص کا منہ دیکھ کر اٹھنا۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ حرام زادے کی رسی دراز ہے۔

آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے / خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے / آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

مال موذی نصیب غازی ہے۔ مال عرب پیش عرب منہ کالا کرنا۔ وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

مشکل اور رقت آمیز ہوتا ہے اس لئے بیان پر قدرت رکھنے والے شاعروں کے تفاخر کو ایک خاص سکون ہوتا جب وہ ایسی ٹھیٹھ نثر کو خوب صورت نظم کی شکل میں پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذوق اور داغ اس امر میں خاص طور پر معروف ہیں۔ اُن کے شاگرد محاوروں کی فہرستیں ان کو پیش کرتے تاکہ اُن کو یہ ماہرین فن شعر میں منتقل کر دیں۔ تاکہ محاورے محفوظ ہو جائیں اور ان کے نام و کلام کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں۔ ذوق کے یہاں جذبات عموماً نہیں ملتے لیکن اکثر وہ یہ کرتے ہیں کہ جذبات کی مثال یا مناسبت کے طور پر مناسب محاورہ پیش کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محاورے کا استعمال کلام کو بقائے دوام دینے کا ایک بڑا ذریعہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس طرح شعر میں نبھائے جائیں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ شعر انھی کی خاطر کہا گیا ہے اور وہ محض اوپر سے جما دئے گئے ہیں۔ ذوق کو محاورے استعمال کرنے کا شوق ابتدا سے مرتے دم تک قائم رہا۔[۵]

کچھ تو طبعی مناسبت کی بنا پر اور کچھ اسی محاورہ بندی کے شوق کی طرح کہاوت، مثلوں اور تجربے کی باتوں کو نظم کرنے کی خواہش خلیفہ ذوق کے یہاں خیالات کے ضمن میں یہ ایک اہم خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اکثر وہ اپنے تجربوں کو چند زندگی کے مسلمات کو دنیا کے تجربوں کو اور چند سیدھی

---

۵ حافظ ویران کی اسنتد عابد مرنے سے چند گھنٹے پہلے ذوق نے پاؤں تلے کی زمین نکل جانے کا محاورہ باندھا

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے ‏ ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے ‏ فلک کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے

یا یہ مصرع

۱۔ اسے احسان مانوں سر میں تنکا نہ رہے کا ۔ ۲۔ کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

۳۔ کس وقت مرا منہ کو کلیجا نہیں آتا ۔ ۴۔ وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

۵۔ کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا ۔ ۶۔ پلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

۷۔ وہ ساری شیخی جھڑی آکی دو گھڑی کے بعد ۔ ۸۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

سادھی زندگی کی نصیحتوں اور حقیقتوں کو نظم کر دیتے ہیں اس طرح اور ایسے موزوں سادہ الفاظ میں کہ لوگوں کی زبانوں پر رواں ہوسکے اور ایک کہاوت کی طرح مناسب موقعوں پر مستعمل ہوسکے[۵] اور اس طرح ہمیشہ قائم رہے۔ لیکن دراصل اس قسم کی ناصحانہ و بزرگانہ باتوں[۶] کو شاعری نہیں کہہ سکتے اور نہ ان میں کوئی شعری لطافت ہے۔ محض چند سیدھی سادھی زندگی کی حقیقتوں کو نظم کر دیتا ہے۔ سیدھی سادھی نثر کی طرح۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی ان میں مثلوں کی طرح عوام کے زبان زد ہوگئی ہیں۔

۵

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا ۔۔۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
رہا ٹیڑھا مثال نیشِ کژدم ۔۔۔ کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
ذوق اس بحرِ جہاں میں کشتیٔ عمرِ رواں ۔۔۔ جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہوگیا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا ۔۔۔ حکم ازلی ذوق یوں ہی ہوچکا تھا
موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں ۔۔۔ ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
اے عیاں پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو ۔۔۔ جسے یاں دوست سمجھے اپنا آخر وہ عدو نکلا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے ۔۔۔ گر انھیں آکے خدا ساری خدائی دیتا
کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا ۔۔۔ جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
اے ذوق ہوش اگر ہے تو دنیا سے دور بھاگ ۔۔۔ اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا
نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم ۔۔۔ کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر ۔۔۔ آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا
حلاوتِ شرمِ دپائداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری ۔۔۔ مزے سے گذری اگر گذاری کسی نے بے ننگ و نام ہوکر
واں سے یاں آئے تھے لے ذوق تو کیا لائے تھے ۔۔۔ یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنائے کر
برق خرمن سوختہ ہے عام میں نافہمی تری ۔۔۔ ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں
اس گلستانِ جہاں میں کیا گل عشرت نہیں ۔۔۔ سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
لیتے ہیں ثمر شاخ ثمرور کو جھکا کر ۔۔۔ جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ
صحبت عیسیٰ بنائے کیا گدھے کو آدمی ۔۔۔ جس کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے
کہیے نہ تنگ ظرف سے سے ذوق کبھی راز ۔۔۔ کہہ کر اسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہیے
ثبات کب ہے زمانے کے عزوشاں کے لئے ۔۔۔ کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ ۔۔۔ ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
کتنے مفلس ہوگئے کتنے تونگر ہوگئے ۔۔۔ خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہوگئے

حسن تعلیل اور ایک مصرعے میں ایک بات کہہ کر یا مسلمہ بنا کر دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت یا شہادت پیش کرنا یہ ایک طرز خاص تھا کہ متاخرین خصوصاً صائب کے مطالعے سے اس زمانے میں پیدا ہوا اور تمام اردو شاعری (کیا دلی و کیا لکھنؤ) پر محیط ہو گیا۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتا تھا تو وہی لطف آتا تھا جو ایک مسئلے کے حل کرنے میں آتا ہے۔ تخئیل کو آزادی تھی کہ جس قسم کے مسئلے یا مسلمے بنا کر پیش کرے اور تعریف کرنے والے یوں کہتے کہ بھئی واہ فلاں بات کا کیا ثبوت پہنچایا ہے۔ غرضکہ یہ طرز عام تھا اور مقبول تھا اور چنانچہ ذوق نے بھی اس کو برتا اور بہت کافی بہتات کے ساتھ۔ ایک شعر بہت مشہور ہے۔

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے　　خط بڑھا۔ زلفیں بڑھیں۔ کاکل بڑھے۔ گیسو بڑھے

حسن تعلیل کی خوبی اور خوب صورتی اسی میں ہے کہ ثبوت یا وجہ شاعرانہ طور پر اس قدر لطیف ہو کہ واقعیت ٹپکے اور بالکل صحیح معلوم ہو۔ لیکن اگر تخئیل کی آزادی کی وجہ سے ایسا مسلمہ یا ثبوت پیش کیا جائے جو اصلیت سے بہت ہی دور ہو جائے تو وہ باوجود شاعرانہ لہذا قابل

جس انسان کو سگ دنیا نہ پایا　　فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے　　لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا
رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق　　اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنہ مقصود　　اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے
بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے　　بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف　　لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا　　بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے
جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی　　پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا
اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا　　دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
میں وہ شہید ہوں لب خنداں یار کا　　ہشیار ہے چراغ بھی میرے مزار کا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا　　آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
جہاں باریک بین و ناتواں ہیں اس قدر دیکھا　　ہلال انتیسویں کا سب کو منظور نظر دیکھا
حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیئے کان دو　　اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو

لہ

معانی ہونے کے مرغوب و پسندیدہ نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی سے جو نئے شعراء پیدا ہوئے انھوں نے اس طرز کو چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر وجہ یہ ہے کہ ان کی قوت تخئیل دوسرے میدانوں اور حقیقت کی طرف آزاد ہوگئی ہے۔ برخلاف اس کے متاخرین کی صرف اسی صنعت میں آزاد ہوتی تھی اس لئے گنجلک ہوجاتی تھی۔

بہت کچھ اسی طرح مقبول چیز رعایت لفظی تھی۔ چونکہ قادرالکلامی کے اس عہد میں معنی یہ تھے کہ الفاظ کے استعمال پر کامل قدرت ہو۔ اس لئے اس قدرت کا اظہار اس طریقے پر بہترین ہوسکتا تھا لہٰذا ہر شاعر اس صنعت سے کافی متاثر تھا اور اس کی بندش معیار لیاقت و لائق ستائش ہنر سمجھا جاتا۔ ذوق کا بیشتر کلام اس صنعت پر موقوف ہے اور اپنے عہد کے دیگر شاعروں کے مقابلے میں بہت اکمل طریقے پر۔ لیکن اگر یہ صنعت بغیر کسی خیال کے ہو تو محض لفظی گورکھ دھندا ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے اس قسم کے اشعار اب زیب طاقِ نسیاں ہوتے جارہے ہیں، بہ نسبت مومن و غالب کے کہ ان کے یہاں یہی چیزیں بوجہ خیال کے زیادہ اُجاگر ہیں۔ رعایت لفظی چونکہ لفظی صنعت گری کا بہت بڑا جزو ہے اور اس میں شک نہیں کہ اکثر موقعوں پر شعر کو خوب صورت بنا دیتا ہے اس لئے ابھی تک اس کا رواج ہے حالانکہ گذشتہ کی فراوانی کے ساتھ نہیں، پھر بھی ہے۔ لیکن اب مقصد اصلی یہی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس کا درجہ

برہم اسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے بے زلف — اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا — کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

نگہہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی — چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق — اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

چمن میں کہتے ہیں پھر موسم عیش و طرب آیا — بہاریں خوب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا

دیکھا کر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں — دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے ۴

اس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو — لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

زبان ریختہ کردی زبان اہل ولایت کی — محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہ ولایت سے

دوسرا ہے اور محض اسی کے خاطر خیال کا خون نہیں کیا جاتا۔

۱۳۔ روز مرہ[۵] بھی اسی طرح اُن اہلِ زبان کا خاص گر ہے اور اس میں شک نہیں کہ شعر کی ظاہری خوبی روز مرہ کے مناسب استعمال سے نہایت درجہ بڑھ جاتی ہے۔ روانی الگ آ جاتی ہے اس کے علاوہ عام پسند بھی ہو جاتا ہے۔ ذوق روز مرہ کے استعمال کرنے میں بادشاہ ہیں کبھی شعر کو بغیر اس طرح خوب صورت بنائے نہ چھوڑیں گے۔ ہاں یہ صحیح کہ چونکہ اکثر و بیشتر مقصد محض روز مرہ کا استعمال ہی ہوتا ہے اس لئے خیال کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن اگر کبھی خیال اس طرح کے خوب صورت سانچے میں آ کر ڈھل جاتا ہے تو بہت اچھا اور بامزہ ہو جاتا ہے۔

تشبیہ[۵] اور استعارے ذوق کے عموماً بے مزہ، غیر فطری اور بیکار ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی اچھا نکل آیا تو اسے اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ اول تو رعایتِ لفظی سے

۵؎ بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج — کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

مٹ گئے جوہرِ وفا کے اُٹھ گئے سب اہلِ دل — اب وفا ہے نام کو اور باوفا کہنے کو ہیں

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے — تمھیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کیا نظر ہے تمھیں یاروں سے تو کہیے — گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

~ موذن مرحبا بروقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یوں ہی سہی — آپ کی یوں ہی خوشی ہے خیر ہاں یوں ہی سہی

۶؎ دانت ... چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے — میں نے جانا ... اس پارہ پارہ ہو گیا

چھوڑا نہ ایک دانہ انشا سحر تلک — گردوں ہو تک لیا ہو مزا شیب ڈھنگر کا

جھکائے ہو سرِ تسلیم ماہِ نو پردہ — غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں

چاندنی سمجھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر — عکسِ رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق — گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمان میں — کہ جیسے بہے کوئی کشتی دخانی میں

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

تشبیہ یا استعارے بنانا چاہتے ہیں یا حسن تعلیل سے ثابت کرنا یا کسی اور لفظی صنعت سے حاصل کرنا شاہ نصیر کی طرح۔ ظاہر ہے جب مقصود بالذات صنائع لفظی ہوں گے تو تشبیہ واستعارے کی خوبی معلوم۔ لیکن پھر بھی وہ اس قسم کے تشبیہ اور استعاروں سے پرہیز کرتے تھے۔ مثلاً ع ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا۔ یا ع منیڈھا حلال کہتے ہیں دریائے نیل کا۔ جس سے کلام بالکل ہی بدمزہ ہو جاتا ہے۔

پرانے متروک الفاظ کا استعمال ذوق کے یہاں بہت ہی کم ہے بلکہ صرف ان کے بچپن اور جوانی کے اشعار میں پائے جاتے ہیں اور وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ بول چال میں اپنے بچپن میں سنتے تھے وہی باندھ دیتے تھے مگر آخر کے کلام میں ٹک ۔ یارو۔ جانِ من کے الفاظ چھوڑ دیئے اور تقریباً تمام تر کلام کی زبان موجودہ کہی جاسکتی ہے اور سوائے بل بے۔ آئے ہے جائے ہے۔ آوے، جاوے ۔ پر، کھوئیگے، کیونکہ بمعنی کیونکر۔ چٹ بمعنی جلدی وغیرہ معدودے چند الفاظ کے اور کوئی لفظ ابھی تک گوش پر گراں نہیں گذرتا۔ جملے کی ترکیبیں بھی ایسی ہیں کہ ابھی تک رائج ہیں۔ اور آئے ہے۔ جائے ہے کی ترکیب باوجود اس کے کہ متروک ہوگئی ہے نظم میں اب تک بھلی معلوم ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تازہ کلامِ جگر

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

کوئی اتنا بھی نہ مصروف خود آرائی ہو
کہ تماشا رہے باقی نہ تماشائی ہو

مستیٔ حسن، غم عشق پہ یوں چھائی ہو
دل سے جو موج بھی اٹھے تری انگڑائی ہو

کیوں نہ گھر بیٹھے ہی یوں انجمن آرائی ہو
دل کے ہر گوشے میں کونین سمٹ آئی ہو

نالہ یوں کیجیے، یہ اعجاز شکیبائی ہو
جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

پھر وہی رت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر ہر اک چوٹ محبت کی ابھر آئی ہو

حسن وبیچارگیٔ حسن، الٰہی توبہ
میں تو مر جاؤں، جو یوں عشق کی بن آئی ہو

وہ محبت ہی نہیں ہے، وہ قیامت ہی نہیں
جو کسی پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

آج سے ترک ملاقات بھی منظور مجھے
توبہ توبہ کہ ترے حسن کی رسوائی ہو

اے غم دید، ترا صبر مجھی پر ٹوٹے
بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

ہائے اُس حصۂ گلشن کا مقدر، ہمدم
نہ بہار آئی ہو جس میں نہ خزاں آئی ہو

ہو گئی دل کو تصور سے ترے نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

بھول جاؤں کہ مِرا فرض محبت کیا ہے
اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

ہائے اُس عاشق و دیوانۂ گلشن کی بہار
کہ جب آئی ہو بہ انداز خزاں آئی ہو

تو ہی جذب غم عشق کی تاثیر جگر
میں تمنا نہ کروں، خود وہ تمنائی ہو

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندوستان کی صنعت اور تجارت۔ ضخامت ۲۱۴ صفحے تقطیع ۲۶×۲۰/۱۶ قیمت

ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر بہار

ہندوستان کے صنعتی اور تجارتی حالات کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس ملک کی گذشتہ صنعتی ترقی اور اس کے اسباب زوال کی عبرتناک داستان بیان کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانوی تسلط کے بعد حکومت کے طرز عمل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تباہ کن حکمت عملی سے ہندوستان کی معاشی زندگی کو کیا کیا نقصانات پہنچے اور کس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت کا ایک ترقی یافتہ نظام دیکھتے دیکھتے تباہ ہو گیا سرکاری یادداشتوں سے اور مستند کتابوں سے بکثرت اقتباسات جمع کئے گئے ہیں اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی ، مالی اور صنعتی پستی حکومت برطانیہ کی معاندانہ تجارتی پالسی کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ کو ملک کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ سے آگاہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور معاشی مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس لئے معاشی مسائل کے سیاسی پہلو کو واضح کرنے پر مصنف نے زیادہ زور دیا ہے۔

اردو زبان میں ایسا بہت کم مواد اس موضوع پر شائع کیا گیا ہے۔ منت اللہ صاحب رحمانی فاضل دیوبند مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی۔ پوری کتاب دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جس کے لئے مصنف نے مواد جمع کر لیا ہے بہت جلد شائع ہو گا۔ اچھا ہو گا اگر دوسرے حصے میں اقتباسات کے ساتھ کتابوں کا حوالہ بھی دے دیا جائے

تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مزید مطالعہ کے لئے اصل کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔

(ش)

گیس کا دفاع۔ مرتبہ جناب سید ہادی حسین رضوی صاحب۔ ضخامت $\frac{20\times30}{16}$ ۶۲ صفحات۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ امیریہ دار التصنیف والتالیف، محمود آباد ہاؤس قیصر باغ، لکھنؤ

جنگ انسانی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ضرور ہے، مگر ذاتی شجاعت و شہامت کے مظاہرے کی حیثیت سے انسان نے جب انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں قدم رکھا تو اس کی یہ جنگی فطرت بھی اجتماعیت کے رنگ میں رنگ گئی مگر اس کی انتہائی اجتماعی شکل کو لیجیے تو بھی قوانین جنگ کا اطلاق صرف لڑنے والوں ہی تک محدود تھا۔ صنعتی تہذیب کی برکت سے اب اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اور جنگ کے معنی اب یہ لئے جانے لگے ہیں کہ اس سے شہری آبادی کس حد تک تباہ اور برباد ہوئی ہے۔ اس تخیل کو جب فروغ ہوا تو اس کی راہیں بھی نکل آئیں۔ چنانچہ آج کل اس مقصد کے لئے زہریلی گیس کا استعمال بہترین طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

زیر نظر رسالے میں اسی زہریلی گیس کے دفاع کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، اور اس مہلک وبا سے بچنے کے لئے ہندوستان میں حفاظتی تعلیم کے فقدان کے پیش نظر" اس ملکی اور قومی خدمت کا احساس سب سے پہلے جناب راجہ صاحب محمود آباد کو ہوا،" مصنف نے ممدوح ہی کے ایما سے اس کو ترتیب دیا ہے۔

کتاب کل ١٦ عنوانات پر ختم ہوئی ہے۔ پہلے جنگ کی مختصر سی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے بعد آلات جنگ کے تدریجی ارتقا کی تاریخ کے سلسلے میں گیس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے چند صفحات میں گیس کے مختلف اقسام اور ان کے استعمال کا بیان ہے، اور بعد کے ابواب میں اس کے حملے کے بچاؤ کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ بیان مختصر ہو اور مطالب جامع۔ ہندوستان کی موجودہ علمی اور تعلیمی کساد بازاری کے پیش نظر یہ سودا سستا بھی ہے

اور اچھا بھی۔ (ب۔ع۔ف)

دورِ انبساط۔ مولوی عبدالودود صاحب دردؔ بریلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ نظامی پریس بدایوں نے چھاپا ہے کتاب کا کاغذ اور چھپائی اچھی خاصی ہے۔ لیکن کتابت کی بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ قیمت کہیں درج نہیں شروع میں دردؔ صاحب کی تصویر اور پروفیسر عبدالشکور صاحب کا تعارف شامل ہے۔ تعارف میں شکور صاحب نے شاعر کے مختصر حالات بیان کئے ہیں اور لوگوں کو کلام سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مصلحتاً کسی مفصل تنقید اور تبصرہ سے پرہیز کیا ہے اور اپنی ناقدانہ ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے اس کا احساس ہے کہ مولانا کا کلام اغلاط سے پاک نہیں۔ جابجا لفظی اور فنّی نقائص موجود ہیں"۔ آگے چل کر ان نقائص کی وجہ بتائی ہے اور کہتے ہیں "اگر فن شاعری میں اس قدر مطلق العنانی کو کام میں نہ لاتے تو یقیناً ان کے کلام میں اور زیادہ پختگی، سنجیدگی اور پاکیزگی آجاتی۔ ان کے اشہب قلم کی روانی، تیز گامی ان رکاوٹوں کو قطعاً برداشت نہ کر سکتی تھی"۔ اس رائے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تعارف کرانے والے کو خود اپنی رائے پر یقین نہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کرتا ہے اور اسے کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس سے اس کی گرفت ہو سکے۔

اس کی وجہ مجموعہ کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ کم و بیش ۲۰۰ نظمیں ہیں۔ کچھ پر مذہبی عقائد کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ کچھ تاریخی اور قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں کچھ میں اخلاقی درس کی جھلک ہے اور کچھ "نیچرل شاعری" کے عام رجحان کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک شاعرانہ لطف اور حسنِ کلام کا تعلق ہے، کسی نظم میں نام کو بھی نہیں۔ لیکن اس مجموعہ میں شاعر نے "میری شاعری" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اسے پڑھنے کے بعد شکایت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شاعر کے نزدیک اگر شعر میں "بے ساختہ پن" نہیں تو وہ شعر نہیں۔ لیکن بے ساختہ پن کا جو مفہوم شاعر کے ذہن میں ہے وہ عام مفہوم سے کسی قدر مختلف ہے۔

نگارشات۔ آغا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزاد مرحوم کے مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے شیخ مبارک علی نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ مجموعہ میں کل ۳۲ مضامین ہیں اور ۴۲۸ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین ہر طرح کے ہیں۔ ادبی، تنقیدی اور اخلاقی۔ ہر مضمون کافی بڑا ہے اور اُنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے ہر مضمون کے لکھنے میں کاوش اور محنت سے کام لیا ہے۔ خصوصاً ادبی، تنقیدی مضامین بہت محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں سے "انشا پردازی" "قومی زبان" "اُردو اخبارات" خاص طور پر اچھے ہیں۔

تنقیدی مضامین میں تو بے شک کاوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن عام طور پر دوسری قسم کے مضامین میں توجہ اور محنت کو لکھنے والے دردسری سمجھتے ہیں۔ لیکن آغا صاحب کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ کسی قسم کے مضامین لکھیں اُنھیں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالے بغیر قرار نہیں آتا۔ اور حقیقت بھی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو شاید اپنے مضامین کو اتنا دل کش نہ بنا سکیں مثال کے طور پر دو ایک مضامین پر سرسری نظر ڈالیئے۔

مجموعہ میں ایک مضمون ہے "سیر و سفر" مختصر سی تمہید کے بعد آغا صاحب نے مضمون کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے ـــــ "سفر سقر کیوں تھا، سفر بعض امراض کا علاج ہے، سفر کی علامات، سفر کا بھُوت، مسافر نوازی، بحری سفر، بحری سفر کی آسائشیں، تعلیم کی برکتیں، جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ، سفر تجربہ سکھاتا ہے، سفر وسیلۂ ظفر ہے، علمی سفر کا شوق، تعلیمی سیر و سیاحت میں اساتذہ کے فرائض، سیاحت کا شوق نہ ہونے سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے"۔

اسی طرح ایک مضمون "شکار" پر ہے۔ اس میں پہلے شکار کی تدریجی ترقیاں بیان کی ہیں پھر غلیل کا ذکر ہے۔ نشانہ کی مشق، گراں بہا نصیحتیں، اُڑتے پرندوں کا شکار، تیتر کا شکار، مرغابی کا شکار، ہرن کا شکار، رائفل کا شکار، بلّم سے ہرن کا شکار، ٹوُچ سے شکار، چکارے کا شکار، جنگل کا شکار، شیر کا شکار، حادثات کے عنوانوں سے شکار کی مختلف تفصیلیں بیان کی ہیں۔ بیچ بیچ میں واقعات اور لطیفے بیان کئے ہیں۔

یہی انداز مختلف مضامین کا ہے۔ طرز بیان کی بے تکلفی کی وجہ سے، ان کی طوالت بھی ایک لطف پیدا کرتی ہے۔

جواہرِ سخن۔ (مرتبہ محمد مبین صاحب چڑیا کوٹی۔ ہندوستانی اکاڈمی۔ الہ آباد۔ قیمت ۶/)

ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد کی طرف سے اب تک جواہر سخن کے نام سے ابتدائی دوروں کے شعرا کے تین انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں ادبی حلقوں میں، بعض معمولی اختلافات کے ساتھ، عام طور پر قدر کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اکاڈمی نے یہ سلسلہ اب تک جاری کر رکھا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔

مؤلف نے اس انتخاب میں جس دور کے شعرا کا حال اور کلام شامل کیا ہے، اسے اس نے دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا اور دہلی کے شعرا۔ موجودہ انتخاب میں صرف لکھنؤ کے شعرا شامل ہیں۔ اس دور کے دہلوی شعرا کو پانچویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اس مجموعہ میں کُل ۲۵ شعرا کا ذکر ہے۔ اور پچھلی جلدوں کی طرح اس میں بھی مؤلف نے پہلے شاعر کے مختلف حالات دئے ہیں، پھر اس کے کلام کا انتخاب۔ جن شعرا کا کلام شامل ہے ان میں گویا، قلق، خنجر، فلیق، انیس، دبیر، عشق، مونس، نفیس، منیر، عام طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ باقی شعرا سے اردو داں طبقہ عموماً واقف نہیں۔ اور اس لئے یہ مجموعہ اس لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے کہ ایسے شعرا جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، اس کی مدد سے منظر عام پر آ گئے۔ اور اُن کے کلام کا منتخب حصہ ایک جگہ محفوظ ہو گیا۔

انتخابات میں صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ انتخابات کیسے ہیں۔ تو اس چیز میں ہمیشہ سے اختلافات رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہر شخص کا مذاق سخن جداگانہ ہے۔ اس لئے ایک شخص کا انتخاب ضروری نہیں کہ پورا کا پورا دوسروں کو پسند آ جائے۔ جواہر سخن کے انتخابات، ان اختلافات کی روشنی میں دیکھنے کے بعد بھی اچھے خاصے معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب بڑے سائز کے ۲۲۷ صفحوں پر چھپی ہے۔ قیمت عا ر ہے۔ اور ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

و۔ ع

سررشتہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ سے مندرجہ ذیل کتب تاریخ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے مرتب کرائی ہیں۔

۱۔	تاریخی کہانیاں	تیسری	جماعت	کے لئے
۲۔	" "	چوتھی	"	"
۳۔	تاریخ دکن	پانچویں	"	"
۴۔	ہندوستان کی تاریخ	چھٹی	"	"
۵۔	تاریخ ہند حصہ اول	ساتویں	"	"

یہ سب کتابیں غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، ہر دور کی تہذیبی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، زبان سلیس ہے اور معیار طلبہ کی لیاقت کے مطابق۔

پہلی دو کتابیں ابتدائی جماعتوں کے لئے ہیں۔ ان میں ایسے اشخاص کی زندگی کا حال پیش کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں ہماری ملکی اور قومی زندگی میں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اخلاق وعادات اور ان کی قومی حوصلہ مندیوں کو قصہ کے پیرایہ میں آسان اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بچوں کی اخلاقی زندگی اُن کی سیرت سے اثر لے۔ صرف ایسے حالات بیان کئے گئے ہیں جن کے ساتھ نوعمر بچوں کو قدرتی طور پر دلچسپی ہو، جو ان کے حافظہ پر بار نہ ہوں اور جو ان کے اندر تاریخی ذوق کی تعمیر کریں۔

تیسری کتاب دکن کی تاریخ پر ہے، اس کتاب میں موجودہ تحقیقات کی روشنی میں تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ انداز بیان دلچسپ ہے اور تاریخ کا تہذیبی پہلو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

چوتھی کتاب میں ہندوستان کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس بات کا خاص طور پر

خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ صرف جنگوں کی داستان نہ بن جائے یا چند بادشاہوں کے حالات پر ختم نہ کردی جائے بلکہ ہر دور کے تہذیب اور تمدن کی تصویر طلبہ کے سامنے آجائے۔

ساتویں جماعت کی کتاب میں مغلوں کی آمد تک ہندوستان کی پوری تاریخ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کردی گئی ہے، سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اشخاص کی سیرت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر دور کے تہذیب، تمدن اور علوم و فنون کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد وارتباط کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تمام کتابوں میں ہر سبق کے ختم پر سوالات اور مشہور تاریخیں دی گئی ہیں۔ سوالات ایسے ہیں جو طلبہ میں بات کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کردیں گے۔ مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے وقت میں جب کہ ہماری قومی زندگی کی تشکیل ہو رہی ہے، جدید طرز پر تاریخی تحقیقات کو غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے مدرسوں کے نوعمر طلبہ کے سامنے پیش کردیا۔ امید ہے کہ یہ کتابیں تمام ہندوستان کے مدرسوں کے لئے مفید ثابت ہوں گی اور یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے بچوں میں شروع سے رواداری کے جذبات نشو و نما پائیں گے اور وہ مختلف مذہبوں کے اصول کی قدر کرنا سیکھیں گے۔

تاریخ سلطنتِ خداداد (میسور)۔ یہ کتاب محمود خاں صاحب بنگلوری کی تصنیف ہے، ۶۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا ایڈیشن اب سے چار سال قبل شائع ہوا تھا، اب مزید اضافہ کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بعد کی تاریخ سے عام ہندوستانی بڑی حد تک بے خبر رہے خصوصاً گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی تاریخ اوروں کے قلم سے لکھی گئی، وہی ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی گئی اور وہی ہمارے سامنے آئی۔ ظاہر ہے کہ ان لکھنے والوں کو ہماری قومی اور ملکی تاریخ کی خوبیوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اوران کے اپنے اغراض و مقاصد اس کی اجازت کب دے سکتے تھے کہ تعصب سے دور ہوکر واقعات کو سچائی کے ساتھ پیش کردیں۔

ان کی تو یہ کوشش رہی کہ بدصورتی اور بدوضعی کے جتنے لوازمات ہیں سب ہی بھر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدنما کارٹون کو ہم اپنی ہی تصویر سمجھنے لگے۔

تاریخ وہ سرمایہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثہ میں ملتا ہے اور اسی سے قومیں بنتی ہیں اسلاف کے ایسے کارناموں سے جن میں قومی مقاصد اور قومی حوصلہ مندیاں نمایاں ہوں تاریخی روایات قائم ہوتی ہیں اور انھیں روایات میں سے قومی جذبہ کی سوتیں جاری ہوتی ہیں۔ سلطان فتح محمد خاں ٹیپو کی شخصیت ماضی کی ان شخصیتوں میں سے ہے جو دنیا کے لئے جوانمردی، عزم و ہمت، قومی حمیت، آزادی اور حرّیت کا اپنے اندر سبق رکھتی ہیں۔

اس بطل حرّیت کے حالات ہماری زبان میں آج تک اس اہتمام کے ساتھ نہ لکھے گئے تھے محمود خاں صاحب ہمارے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سلطنت میسور کی تاریخ پر ساڑھے چھ سو صفحے لکھ کر تاریخ اور ادب دونوں پر احسان کیا۔ واقعات کی چھان بین میں انھوں نے کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ کتاب کو سلطنت میسور میں مسلمانوں کے آنے سے شروع کیا ہے اور سلطان ٹیپو کے عہد کے اختتام تک میسور کی مکمل تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ابتدا کے تقریباً دو سو صفحوں میں سلطان حیدر علی کے عہد کی تاریخ ہے، اس کے بعد ابوالفتح فتح محمد خاں ٹیپو سلطان کے عہد کے حالات و واقعات ہیں۔

مصنف نے اس زمانے کے سب سیاسی حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں جو پالیسی کارفرما تھی آج بھی ہندوستان کے اندر اور باہر وہی پالیسی کام کر رہی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں بیرونی تسلط کے اثرات، سلطان ٹیپو کی قومی عزت اور حمیت اور سلطنت میسور کے زوال کے اسباب کا تفصیل سے ذکر کرکے انھوں نے اپنے اس خیال کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ ایسے واقعات بیان کئے جائیں جو موجودہ حالات سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہوں اور جن کی تفصیل سے کوئی ذہنی فائدہ مرتب ہو۔ "انتظام سلطنتِ خداداد" کے تحت میں تقریباً ساٹھ صفحات میں انھوں نے اس عہد

کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بیان کرکے تاریخ کا یہ اہم مقصد کما حقہ انجام دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک باب "مزارِ سلطان پر عقیدت کے پھول" کے عنوان سے ہے۔ اس میں بعض مشاہیر ملک کی وہ نظمیں جو سلطان شہید کی یاد میں وقتاً فوقتاً لکھی گئیں، جمع کردی گئی ہیں اور جو سلطان کی سیرت، اور اس کے عہد کی سیاسی حالت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

حق تلفی ہوگی اگر مصنف کی محنت کی داد نہ دی جائے۔ انھوں نے بہت محنت سے تاریخی مواد جمع کیا ہے اور ایسے دور میں جب کہ قوم میں تاریخی تحقیق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے اُن کی کتاب یقینی طور پر اس کی مستحق ہے کہ عام لوگ اس کا مطالعہ کریں اور مصنف کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں۔ (ق)

اقبال ۔ گو علامہ اقبال مرحوم کے کلام اور ان کے فلسفہ پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مقصد کی توضیح پوری طرح ہو چکی ہے جسے علامہ اقبال نے ملک کے سامنے پیش کیا۔ کاش اقبال کو بھی کوئی جانسن، یا سویل یا حالی مل جاتا۔ ہم مایوس نہیں ہیں۔ اقبال کو مستقبل کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ مستقبل ہی اقبال کی صحیح تفسیر بھی پیش کریگا

البتہ اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں اقبال کی زندگی پر مجموعی حیثیت سے بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جسے محمد حسین خاں صاحب ایم اے بی، ٹی (علیگ) نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اقبال کی مختصر سوانح عمری بیان کرکے جستہ جستہ ان عنوانات کو مع اشعار کے پیش کیا ہے، جو اقبال کے کلام میں نمایاں ہیں۔ مگر کتاب اتنی مختصر ہے کہ ہم اسے اقبال کے کلام اور فلسفہ کی 'فہرست مضامین' سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ اس کے پڑھنے سے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کے کلام میں کس قسم کے موتی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ان موتیوں کی قیمت کیا ہے۔ کتاب کی چھپائی ناقص ہے۔ اور قیمت ۱۲ر ہے۔

خورشید اینڈ برادرز نمبر ۱۰۹۹ فراشخانہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

رازونیاز۔ حبیب اشعرؔ صاحب دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ گو "عرض مصنف" میں شاعر نے کہیں تذکرہ نہیں کیا مگر اشعار کی سلاست اور مضامین کے ستھرے پن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حبیب صاحب نے اپنے کلام کا بہت مختصر حصہ شائع کیا ہے۔ کل اڑتالیس صفحوں کی کتاب ہے جس میں تمام تر غزلیں ہیں۔ آخر میں دو صفحوں پر "متفرقات" کے عنوان سے چند اشعار دیئے گئے ہیں۔

کلام میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اشعار کی سادگی ہے۔ زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے اور غالباً یہ مصنف کی کوشش کا کامیاب نتیجہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

صاف و رنگین و دلاویز اشعار
کیا کہے گا کوئی اشعرؔ کی طرح

دائرۃ الادب محلہ رودگراں دہلی اور منزل بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۳۱ بلی ماران دہلی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

شمع ازل۔ اقبال کا اثر اردو لٹریچر پر جتنا گہرا پڑا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اگر ایک طرف معنی پسند طبیعتیں اپنے غور و فکر میں گہرا فلسفیانہ رنگ اختیار کرنے لگیں تو دوسری طرف شعرا کے ایک بڑے گروہ نے بھی اس میدان کو اپنی جولانگاہ بنانے کی کوشش شروع کردی ہے۔ جس کی شاہ راہ کا اقبال نے افتتاح کیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس میدان میں اگر ایک طرف جوش کے ایسے مذہب کے باغی شاعر ہم کو نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اثرؔ زبیری ایسے پرستاران مذہب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں آثر زبیری صاحب نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سب کا موضوع مذہبی بزرگوں کے کارنامے اور اسلام کی اہم خصوصیات ہیں جن کے انداز بیان میں اقبال کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ "پیش لفظ" میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اثر صاحب کی اس کتاب پر ایک نظر ڈالی ہے اور جستہ جستہ اشعار بھی پیش فرمائے ہیں۔

اثرؔ صاحب نے بڑے کامیاب انداز میں ان مضامین کو "شعریت" کے رنگ و بو سے مالامال کیا ہے جن کی خشکی اردو کے تردامن شعرا کے لئے اکثر وجہ "اعتذار" بنی رہی۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم

کی فوجیں فارس فتح کرنے کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ اور شاعر اس روانگی پر خوش ہوکر "سامان نشاط" کے نام سے ایک نظم لکھتا ہے جس کی ابتدا ملاحظہ فرمائیے۔

لے کے آیا ہوں عجب شان سے سامانِ نشاط
داورِ حشر سے باندھے ہوئے پیمانِ نشاط
قلزمِ عیش کی اٹھتی ہوئی موجوں کی قسم
فرش سے عرش پہ جانے لگا سامان نشاط

اس طرح کی نظمیں آثر صاحب نے بہت پر اثر اور والہانہ انداز میں کہی ہیں۔ ایک آدھ جگہ ہنگامی اور مقامی سیاست سے بھی متاثر ہوکر کچھ فرمایا ہے لیکن ایسی نظمیں اس کتاب میں کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً "جنگِ جبشہ" "فرانس کے مظالم" "حرم لکھنؤ" "کاغذی اصنام" "دار المبلغین لکھنؤ" وغیرہ

آثر صاحب اگر اس قسم کی تمام نظموں کو ایک علیحدہ عنوان کے ماتحت کر دیں تو کتاب کی ترتیب نسبتاً بہتر ہو جائے گی۔

صفحات کی تعداد ۲۲۶ ہے جس میں ۱۵۷ نظمیں ہیں۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ۔ زبیر منزل۔ پاٹانالہ۔ لکھنؤ

ص۔ ا۔ ص

معارف جمیل ۔ "از قاآنیِ ہند" حکیم آزاد انصاری۔ ناشر محمد تراب علی خاں باز۔ بازار گھانسی حیدر آباد دکن۔ قیمت غیر مجلد ۲/ مجلد ۲/۸

یہ حکیم آزاد انصاری صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں تقریباً ۱۰۰ صفحے کا اپنا تعارف لکھا ہے: الطاف احمد مشہور نام۔ نظر حسین تاریخی نام۔ ابو الاحسان کینت۔ آزاد تخلص۔ والد کا اسم گرامی

محمد حسن خلف امیر احمد۔ سکونت سہارن پور خاص۔ محلہ شاہ ولایت۔ نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔"

اپنی خصوصیات شاعری یوں بیان کی ہیں۔

"ہر شاعر اور بالخصوص حقیقی شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ہم بھی اسی پنجاہ سالہ کوشش و مشق سے اپنی شاعری میں بری بھلی چند خصوصیات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ انھیں ہماری اختیار کردہ خصوصیات نے ہماری سعی و کوشش سے مل کر ہم کو اپنا رنگ خصوصی پیدا کرنے میں مدد دی ہے وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کلام کی اصلی ترتیب۔ ۲۔ سلاست و صفائی زبان۔ ۳۔ ندرت بیان
۴۔ تکرار الفاظ حسین ۔ ۵۔ صنعت ترصیع و تقابل ۔ ۶۔ صنعت ترصیع جدید کی ایجاد ۔ ۷۔ شعر میں اصطلاحات علمیہ کا استعمال"

مثالیں یہ دی ہیں۔

۱۔ محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری — محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
اُسی بیم و رجا میں ہوں، اسی دُہری بلا میں ہوں — وہی تو اور جفا تیری، وہی میں اور وفا میری

۲۔ تو ہو اور تیری زلفہائے رسا — میری قسمت رسا نہیں، نہ سہی
آپ کا تو پتہ لگا لیا، لیکن — اب جو میرا پتہ نہیں، نہ سہی
زلفوں والو! یہ اندھیر — دہرے دہرے کالے ناگ
میرا سر اور تیرا در — دھن مری قسمت، دھن مرے بھاگ

۳۔ چارہ ساز زخم دل! درمانِ زخم اچھا کیا! — زخم کی سب لذتیں مجروح درماں ہو گئیں
مطرب نغمہ کار ہو۔ ساقیٔ بادہ بار ہو — زہرہ نو انگار ہو۔ میکدہ زا بہار ہو

۴۔ آرزوئے بہار جنت ہے — آرزوئے بہار جلوۂ روح

جستجوئے دیار وحدت ہے	جستجوئے دیار جلوۂ روح
۵۔ نام خدا جدہر گئے دل میں اتر اتر گئے	خنجر آبدار ہو۔ دشنۂ تابدار ہو
رفع ملال چاہیئے کچھ تو خیال چاہیئے	روح تن فگار ہو۔ راحت جان زار ہو
۶۔ قدر و قیمت فصل طیار شباب	حسن و صحت نقد دستار شباب
عزم و ہمت خادم کار شباب	تاب و طاقت کفش بردار شباب
۷۔ پرستش کے قابل ہو، تحقیق ہے	تصور کے ہمراہ تصدیق ہے
وہ مجھ سے قریب اور میں اس سے دور	مری ' جمع ' بھی رشک تفریق ہے

دراصل آزاد انصاری صاحب پرانے رنگ کے شعرا میں سے ہیں۔ بیدل سہارن پوری اور حالی کے شاگردوں سے ہیں۔ کثرت مشق سے نشست الفاظ اور بندش پر اچھی قدرت بہم پہنچالی ہے معنویت کچھ تو اپنی حدود کی بنا پر اور کچھ مناسبت طبع لفظی خوبیوں کی طرف ہونے کی وجہ سے میسر نہ آئی۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں ریاست حیدر آباد میں قدر ہے۔ جو مسلسل غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں وہ کافی اچھی ہیں۔

یاد ایامے کہ عالم غیرت میخانہ تھا	نظم ہستی تخت نظم نرگس مستانہ تھا
جو جبیں تھی حاصل انوار محبوبانہ تھی	جو حسیں تھا صاحب انداز معشوقانہ تھا
وہ امنگیں تھیں کہ بے شغل طرب بنتی نہ تھی	وہ ترنگیں تھیں کہ بے بادہ کشی چارہ نہ تھا
دن کو فکر سرخوشی تھی اور بے باکانہ تھی	شب کو شغل میکشی تھا اور آزادانہ تھا
ایک جانب مطربوں کے نغمہ ہائے مست تھے	ایک جانب مغبچوں کا رقص سرشارانہ تھا
کون سی وہ رات تھی جو کیف کی حامل نہ تھی	کون سا وہ روز تھا جو لطف سرتاپانہ تھا
جو عطا تھی بے حد و عد جو کرم تھا بیحساب	ہر سلوک دوست میرے ساتھ فیاضانہ تھا
کچھ نہیں معلوم کیوں مجرم نہ گردانا گیا	میں کہ جو مجموعہ افعال گستاخانہ تھا
اب کوئی کیونکر دکھا سکتا ہے کیا کیا لطف تھے	اب کوئی کیونکر بتا سکتا ہے کیا تھا کیا نہ تھا

ماحصل یہ ہے کہ میں تھا اور نشاط جاوداں　　　مختصر یہ ہے کہ میں تھا اور غم جانانہ تھا
آہ آزاد! اب وہ ہم باقی نہ وہ لطفِ حیات　　　"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

غزلوں کے بعد کچھ نظمیں بھی ہیں جس میں "چاند سے جھڑپ" خاصی ہے۔ اردو رباعیات اور چند فارسی رباعیات کے منظوم ترجمے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت معمولی ہے۔

انتخاب الہلال۔ ادبستان۔ چابک سواران اسٹریٹ۔ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین "الہلال" کا انتخاب ایک اشد ضرورت تھی جو ادبستان لاہور نے پوری کی ہے۔ اس انتخاب میں سترہ مضامین ہیں اور ایک نظم "تنزل اسلام کا سبب اصلی"۔

مولانا ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کے متعلق کچھ لکھنا یہاں پر بیکار ہے۔ انتخاب البتہ زائد تر مذہبی مضامین کا ہے۔ اگر اس میں سیاسی مضامین بھی شامل ہوتے تو بہتر تھا۔ ناشرین دوسری جلد میں اگر اس کا خیال رکھیں تو بہتر ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۲ مجلد عا

رسالہ جات

مسافر۔ ماہوار ادبی رسالہ ہے جو تھوڑے عرصے سے کوکب مرادآبادی کی زیر نگرانی اور ہمیں مرحومی اور عادل ادیب صاحبان کی زیر ادارت مرادآباد سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین خاصے ہیں۔ کاغذ خراب لگا ہے۔ خدا کرے قائم رہے۔ چندہ سالانہ عہ

نور التعلیم۔ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کا ماہوار رسالہ ہے جو ناخواندہ بالغوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تعلیم بالغان ہندوستان کی جہالت مٹانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر اس طرح بہت سے اور رسالے نکلنا شروع ہو جائیں تو ملک کو بہت جلد فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نگران۔ ثناء اللہ خاں صاحب ایم، اے

قیمت سالانہ ایک روپیہ عہ

نقشہ جات

نقشہ حبش، نقشہ افغانستان و سرحدی صوبہ نقشہ وزیرستان،

یہ نقشے خالد کمپنی دہلی نے انگریزی اور اردو میں تیار کئے ہیں۔ علاوہ صفائی اور درستی کے الگ گوشہ میں ان مقامات کی آب وہوا، آبادی، مذاہب، زبانیں، پیداوار، معدنیات، ذرائع نقل وحمل اور مختصر تاریخ وغیرہ پر مفید اور مختصر معلومات بھی بہم پہنچائی ہے۔ نقشے بہت اچھے ہیں۔

حبش کے نقشے کا سائز ۳۴ × ۲۴ ہے اور قیمت ۱۰ر ہے۔

وزیرستان اور افغانستان وصوبہ سرحد کے نقشوں کا سائز ۳۰ × ۲۰ ہے۔

اور قیمت ۱۲ر اور ۸ر علی الترتیب ہے۔

انشائے سلمیٰ۔ (عصمت بکڈپو دہلی) لڑکیوں کو خط وکتابت سکھانے کے حق میں یہ رسالہ ایک اچھا رہنما ہے، اولاً کتابت اور ار دو زبان کی خطوط نویسی پر ایک دلچسپ اور مفید نوٹ ہے، اس کے بعد خطوط کے مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور القاب وآداب کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے مبتدیوں اور خاص کر لڑکیوں کے لئے خطوط نویسی کے باب میں یہ رسالہ ایک اچھا معلم ثابت ہو سکتا ہے۔ خطوط نویسی کے تمام ابتدائی اصول اور اصطلاحات اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ان حیثیات سے یہ خطوط نویسی سکھانے والی کتابوں میں ایک خاص درجہ اور بعض پر ایک مخصوص فوقیت رکھتا ہے۔ لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت ۶ر

رعایتی اعلان

بجائے تین روپیہ سالانہ کے صرف دو روپئے سالانہ

چوں کہ اس وقت جنگ کی وجہ سے کاغذ و اشیاء طباعت نہایت گراں ہو چکی ہیں اور شائقین اخبار میں متوسط طبقہ و کم استطاعت لوگوں کو اخبار کی خریداری کسی حد تک ناقابل برداشت ہوگئی ہے اس لئے کارپردازان "روزانہ اخبار" بریلی عام کم استطاعت اخبار بین حضرات کو باخبر کرتے ہیں کہ "روزانہ اخبار" کا ہفتہ وار ایڈیشن ۱۱ دسمبر ۱۹۳۹ء میں بجائے سہ سالانہ کے صرف دو روپئے سالانہ میں اپنے نام جاری کرا سکتے ہیں۔

(ملحوظ) واضح ہو کہ رعایت مذکورہ سے جدید خریداران ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر یا دفتر میں دستی موصول ہونی چاہیئے۔ نمونہ کا پرچہ ار کا ٹکٹ موصول ہونے پر ارسال ہو سکتا ہے۔

المعلن :- نیازمند ایس ایم مہر الٰہی اسسٹنٹ منیجر

ہندوستان کی چار کروڑ انصاری برادری کا واحد ترجمان

مومن گزٹ

جو زیر سرپرستی آل انڈیا مومن کانفرنس ہر ہفتہ بڑے آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں انصاریوں کے حالات کے علاوہ ادبی، معلوماتی، تاریخی نیز تفریحی مضامین بھی ہوتے ہیں۔

قیمت سالانہ صرف للعہ

ملنے کا پتہ

منیجر مومن گزٹ مسٹن روڈ کانپور

مطبوعات امیریہ دارالتصنیف والتالیف لکھنؤ

دیوان ثاقب :- یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں انکی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں حجم پانچسو پچاس صفحات قیمت مجلد للعہ ر غیر مجلد ہے ر (علاوہ محصول ڈاک)

انیس الاخلاق :- میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً ستو رباعیاں مختصر مقدمے کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دارالتصنیف والتالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع :- آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرلیا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کیگئی ہے۔ تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کرسکیں قیمت ۱۲ر علاوہ محصولڈاک

مفتاح البیان :- حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابوالبیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروی مولف جواہرالبیان وغیرہ

فن ذاکری اور روزہ خوانی پر نہایت مفید کتاب

قیمت ہر حصہ عہ ر (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ :- دفتر امیریہ دارالتصنیف والتالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ (قائم شدہ ۱۸۷۷ء)

سب سے پہلی قدیم کمپنی جو ساٹھ سال سے حجاج کی خدمت کر رہی ہے۔

عازمان حج کو خوشخبری

اب جبکہ حکومت ہند نے حاجیوں کو لے جانے کا انتظام کر دیا ہے آپ اپنی سب سے بڑی آرزو یعنی فریضہ حج کی تکمیل کر سکتے ہیں معلوم ہوا ہے کہ امسال حج اکبر ہوگا مغل لائن کے جہازوں میں آپ کو ہر طرح کا آرام اور سہولت حاصل ہے۔

تاریخ روانگی

جہاز "اسلامی" (وزن ۸۰۹ ٹن) کراچی سے ۲۹ نومبر ۳۹ء کو روانہ ہوگا۔

جہاز "علوی" (وزن ۳۵۶۶ ٹن) بمبئی سے ۳ دسمبر ۳۹ء کو روانہ ہوگا۔

(یہ تاریخیں تقریباً ہیں اور بغیر کسی اطلاع کے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے)

اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے حج کے موسم میں جہاز روانہ ہوں گے۔

شرح کرایہ	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ
پہلا درجہ	۶۲۱ روپیہ	۵۹۰ روپیہ
دوسرا درجہ	۴۴۶ روپیہ	۴۲۲ روپیہ
تیسرا درجہ	۱۷۳ روپیہ	۱۶۰ روپیہ

اس میں قرنطینہ اور حفظان صحت کی فیس بھی شامل ہے

مزید تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر لکھئے

(۱) مسرس ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی (۲) مسرز ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ

(۳) مسرس گراہم ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ کراچی

ہفتہ وار "حمایت اسلام" میں

مسائل حاضرہ پر عالمانہ بحث ہوتی ہے

تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور قومی ضروریات پر ہر ہفتہ مفید ترین مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

معلومات عامہ

کے زیر عنوان بڑی محنت اور عرق ریزی سے بیحد

دل چسپ مضامین جمع کئے جاتے ہیں۔

دنیا کی ہفت روزہ ڈائری میں

عالم اسلام، ہندوستان اور دنیا بھر کے اہم ترین واقعات کو دل کش انداز میں خلاصہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

نئے انتظام کے ماتحت "حمایت اسلام" کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ اس کی جدید خوبیوں کی وجہ سے اسے چار چاند لگ گئے ہیں۔ نمونے کا پرچہ مفت منگا کر مطالعہ کریں۔ آپکو خود بخود ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

سالانہ چندہ صرف روپیہ پیشگی۔ ممالک غیر سے چار روپیہ آٹھ آنے

المشتہر

منیجر حمایت اسلام برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

شہزادی شب نور۔ مصنفہ خان محمود طرزی۔ ایک افغان شہزادی اور اس کے خاندان کے دیگر افراد کی دلچسپ داستان۔

بین الاقوامی بدمعاشوں کے گروہ کی سرگرمیاں مشرقی شکاگو یعنی کابل میں اجتماع نور وظلمت، اردو میں اپنے طرز کی پہلی کتاب قابل مصنف کی تخیلی بلند پردازیاں آپ کو جدید عالم خیال میں پہنچادیں گی جدید طرز نگارش کا اعلیٰ نمونہ پلاٹ کے لحاظ سے انتہائی دلچسپ ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک آپ کی نظر سے اس قسم کا ناول نہ گذرا ہوگا۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

سوتیا چاہ۔ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت شوکت تھانوی:۔

آج کل دہلی سے ریڈیو کے ذریعہ ہندوستانیوں کو ہنسا رہے ہیں آپ بھی ہنسئے اور اگر آپ کے مکان میں ریڈیو نہ ہو تو فی الحال ان کی تازہ ترین تصنیف "سوتیا چاہ" ملاحظہ فرمائیے۔ جو مزاح نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے، فسانہ ہذا حریم میں مسلسل شائع ہوچکا ہے۔ اب عوام کی فرمائش پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

بُڑھبس۔ از شوکت تھانوی نے اپنے قہقہہ آفرین قلم سے ایک بوالہوس بڑے میاں کا افسانہ عشق بیان کیا ہے جن کو ایک کمسن حسین دوشیزہ سے نادیدہ محبت ہے، اور بجائے مرنے کے اس سے شادی رچانے پر مصر ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی کیا کیا گت بنتی ہے اس کو آپ افسانہ میں ملاحظہ فرمائیں جو تقریباً ۲۰۰ صفحات پر محیط ہے آپ ناممکن ہے کہ اس ناول کو پسند نہ فرمائیں اور بار بار نہ پڑھیں آپ کے وی۔ پی طلب خط کا انتظار ہے۔ قیمت ایک روپیہ

منیجر نسیم بکڈپو لکھنؤ

مسائل حاضرہ پر عالمانہ بحث ہوتی ہے

تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور قومی ضروریات پر ہر ہفتہ مفید ترین مضامین شائع کئے جاتے ہیں

معلوماتِ عامہ

کے زیرِ عنوان بڑی محنت اور عرق ریزی سے بے حد دلچسپ مضامین جمع کئے جاتے ہیں

دنیا کی ہفت روزہ ڈائری میں

عالم اسلام، ہندوستان اور دنیا بھر کے اہم ترین واقعات کو دلکش انداز میں خلاصہ کرکے رکھ دیا جاتا ہے

نئے انتظام کے ماتحت "حمایت اسلام" کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے۔ کہ اس کی جدید خوبیوں کی وجہ سے اسے چار چاند لگ گئے ہیں۔ نمونہ کا پرچہ مفت منگا کر مطالعہ کریں۔ آپ کو خود بخود ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی

سالانہ چندہ صرف تین روپے پیشگی — ممالک غیر سے چار روپے آٹھ آنے

المشتہر: منیجر "حمایت اسلام" برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

ایجنسی کی کتابیں

سلکِ شہوار علیاحضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کی ان تقاریر کا مجموعہ جو مرحومہ نے وقتاً فوقتاً عورتوں کے جلسوں میں مختلف مسائل نسواں پر ارشاد فرمائی تھیں۔ ان میں آپ کو صنفی مسائل کا عمیق مطالعہ ملے گا۔ جدید خیالات کے ساتھ ساتھ مذہبی اور قدیم معاشرتی خیالات پر اس طرح پیش کئے گئے ہیں گویا کہ ان ہی کو بنا قرار دے کر جدید خیالات ترقی پذیر ہو سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی تعلیمی اور تمدنی و معاشرتی ترقی کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ عورتیں اسے بار بار غور سے پڑھیں اور اس سے فائدہ حاصل کریں۔ قیمت ۱۲عہ

سلطان ابن سعود سلطان عبدالعزیز ابن سعود والی حجاز و نجد و ملحقاتہا کے سوانح حیات، اس میں اس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے۔ عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے الجھے ہوئے حالات، خاندان رشید کی المناک داستان، تحریک وہابیت کی تبلیغ و اشاعت۔ وہابیوں کا جزر و مد۔ تحریک اخوان کی بناء و تاسیس، سلطان ابن سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات۔ فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام و نفاذ انتظامات ملکی کی اصلاحات۔ علوم و فنون کی ترویج۔ نجدی معشیت و معاشرت، مغربی حکومتوں سے تعلقات اور سلطنت سعودیہ کے اُن سے معاہدات شرح و بسط سے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت عام

رموزِ تجارت از جناب محمد نور اللہ صاحب قریشی مصنف کو تجارت سے فطری لگاؤ ہے اور اسے ایک علم اور فن کی حیثیت سے حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہ ان کی ذاتی تجربات کا مجموعہ ہے۔

ابتدا میں تجارت اور تاجر پر تبصرہ کرتے ہوئے تجارت میں ناکامی کے اسباب اور ان سے محفوظ رہنے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں، پھر خاص خاص موضوع حساب و کتاب، نقد و اُدھار، شہرت و دوکانداری

وغیرہ کے متعلق تبصرہ کیا گیا ہے۔

ایسے شخص کے لئے جو تاجر ہو یا بننا چاہتا ہو اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اسے پڑھ کر وہ صحیح راہِ عمل اختیار کرے گا۔ قیمت صرف بارہ آنے ۱۲؍

ڈرامہ اکبر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے جلال الدین محمد اکبر شہنشاہِ ہند کے نورِ نظر جہانگیر و نورجہاں کے عشقیہ قصہ کو سب سے پہلے ڈرامہ اردو کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ چھپائی نہایت اعلیٰ۔ قیمت عہ

داستانِ غدر از ظہیر دہلوی۔ شاگرد رشید حضرت ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ دلی کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس کے اب قصے اور افسانے سن کر دل ہل جاتے ہیں۔ یہ مصنف کے خود چشم دید حالات کا مجموعہ ہے۔

اس میں تاریخ بھی ہے۔ غم والم کی داستانیں بھی۔ ساتھ ہی ساتھ نثر اردو کی ابتدائی حالت اور اس زمانہ کی طرزِ تحریر اور گفتگو کا طریقہ بھی درج کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ

سیرِ اندلس مؤلفہ عبدالرب بی، اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ اس میں فتح اندلس اور ہشت صد سالہ اسلامی حکومت کے عروج و زوال کے واقعات سپرد قلم کئے گئے ہیں۔

فتح افریقہ کا بھی ضمناً ذکر ہے۔ اس کے تین باب ہیں۔ پہلے میں افریقہ کے دور دراز ممالک کے فتح ہونے کے حالات درج ہیں۔ دوسرے میں تسخیر اندلس کے مفصل حالات ہیں۔ اور تیسرے میں اسلامی حکومت کی عظمت اور شاہانِ اسلام کی فخرِ روزگار خدمات کے تذکرہ کے ساتھ امراء کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی ذکر ہے۔ قیمت نو آنے ۹؍

حکایات واحتساسات یہ کتاب سید سجاد صاحب یلدرم کے مختصر افسانوں اور مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اسے خیالستان حصہ دوم کہنا چاہیئے۔ جو اردو زبان کے ادب لطیفہ میں ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۱۴؍

خزانۂ اسرار:- از مولوی حکیم علی محمد صاحب اس میں پانچ سو مجرب صدری نسخے درج کئے گئے ہیں اور نسخہ اپنی جگہ نہایت مفید، بیش بہا اور تیر بہدف ہے قیمت ۸ر

چاندی بنانے کے نسخے:- مرتبہ سید منظور احمد جلالی۔ اس میں چند ایسے کیمیاوی نسخے درج ہیں جن پر اگر صحیح طور سے عمل کیا جائے تو چاندی بن جاتی ہے۔ قیمت ۸ر

حیات اجمل:- حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات جس میں مرحوم کے اخلاق و عادات، علمی و طبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج کئے گئے ہیں از جناب شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عار

خالدہ ادیب خانم:- از محمد عبد المجید صاحب عتیقی۔ خالدہ ادیب خانم سابق وزیر تعلیم حکومت انگورہ کے سبق آموز حالات زندگی۔ سیاسی انقلاب کا نازک موقعہ پر انجمن اتحاد و ترقی کا سرگرم ممبر بننا اور اور ایک جریدہ احرار کی ادارت، جنگ بلقان اور جنگ یورپ میں فوجی خدمات اور اسی قسم کے بیسیوں ایسے واقعات ہیں جن سے اس معزز خاتون کی ہستی کا اندازہ ہوتا ہے قیمت ۱۲ر

خیابان ترنم:- (خاں صاحب) جناب مولوی سید محمد نوح صاحب شبیر مرحوم رئیس مچھلی شہر علم و ادب کے ماہر اور اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی وغیرہ تمام اصناف سخن پر آپ کو یکساں قدرت حاصل تھی اور ہر صنف میں آپ کا کلام، اہل ذوق کے دل پر اپنے سکے بٹھا چکا ہے۔ "آپ ایک کامل الفن شاعر تھے" شاہ سر محمد سلیمان۔ قیمت عہ

چیچک:- از جناب حکیم جمیل خاں صاحب اس مختصر رسالے میں چیچک کی بابت اس کے اسباب کن لوگوں میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاج اور نتائج سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے آنرز۔ فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن وملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خودنوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست، چند اوراق۔ بند

۲۔ مسائل ملی: سنت ناویہ اور سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت

۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند

۴۔ مسلمان اور کانگرس

۵۔ انگریز اور ان کی سیاست

۶۔ مسلم یونیورسٹی

۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس

۹۔ مسلمان اور آزادی۔

۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت

۱۱۔ آخری تقریر

۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۔۔ ۵۰۰ صفحات مجلد قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرول باغ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ

جامع مسجد۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

لوہاری دروازہ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ

امین آباد۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ

پرنسس بلڈنگ۔ جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے

سیاست کی پہلی کتاب قیمت ۳ر

اجتماعی زندگی کی ابتدار . . " . . ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض . . " . . ۳ر

مسئلہ آبادی . " . ۴ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:۔ نور الحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے (علیگ)

نمبر ۵	نومبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

ذاکر صاحب کا خط

(جب سے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یورپ تشریف لے گئے آخر ستمبر تک ان کے صرف دو تین پوسٹ کارڈ آئے تھے جس سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ جہاز سے اتر کر کچھ دن وینس ٹھیرے پھر ویانا اور بوداپیسٹ گئے اور وسط اگست میں جرمنی جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی خط نہیں آیا۔ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کی صحت کا کیا حال ہے اور علاج کیسا ہو رہا ہے۔ لڑائی چھڑ جانے کے بعد یہ فکر پیدا ہوئی کہ اگر وہ اعلان جنگ کے وقت جرمنی میں موجود ہوئے اور فوراً وہاں سے روانہ نہ ہو گئے تو نظربند کر دیئے جائیں گے۔ سخت پریشانی اور انتظار کی حالت میں ۲ ستمبر کو یہ خط پہنچا جس سے بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔

بعض حضرات کی رائے سے یہ خط ڈاکٹر صاحب کے احباب اور ہمدردان جامعہ کی اطلاع کے لئے رسالہ جامعہ میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مختصر خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ موصوف وسط نومبر تک ہندوستان واپس آئیں گے)

HOTEL DES FAMILLES

GENEVE

۱۱ ستمبر ۳۹ء

مکرم عابد صاحب۔ تسلیم

آپ کا خط مجھے اس دن ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط بیگم صاحبہ کا ملا۔ ان خطوط سے ادھر کا حال تو اتنا معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گذار سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی

بندۂ خدا نے خبر نہ لی۔ شفیق صاحب نے مجیب صاحب، اکبر صاحب اور سعید صاحب کے مفصل، خطوط کا حوالہ دیا ہے جو مجھے نہیں ملے!

میری کہانی سنئے ۔ ۳؍جولائی کو وینس پہنچا۔ شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا۔ دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا۔ بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں۔ واقعی سیکھا بھی تھا۔ لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸؍جولائی کو ویناّ پہنچا۔ وہاں امتیاز آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک ہفتہ کے لئے بوداپسٹ چلا گیا۔ بڑا ہی "گتھا ہوا" شہر ہے۔ واقعی خوبصورت۔ تقریباً ہر شخص جرمن بھی جانتا ہے۔ وہاں سے پھر ویناّ واپس آئے۔ مگر ہوائی جہاز پر! یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا۔ ویناّ سے پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کئے کہ معاذ اللہ۔ در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں۔ احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا۔ آنتیں البتہ بہت خراب ہیں۔ پرانی پیچش ہے اور خوب ہے۔ اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں۔ زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیئے تھی لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لئے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے۔ خون کی جو حالت ہونی چاہیئے تھی اس سے بہت بہتر ہے۔ اس لئے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (رستم ظریفی ملاحظہ ہو!) پرچا ہے۔ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی۔ سات انجکشن تجویز کئے گئے اور حکم ملا کہ کسنجن چلے جاؤ، وہاں ۳ ہفتہ رہو۔ انجکشن لو، پرہیز کرو۔ اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آ گئی ہو تو ۴ - ۵ ہفتہ کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا ورنہ ۳ ہفتہ کا وقفہ کافی ہو گا۔ چنانچہ میں ۵؍اگست کو KISSINGEN پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی، اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ ویناّ سے ڈاکٹر نے ایک مفصل وصیت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک اور ڈاکٹر کے نام تعارفی خط۔ انھوں نے اسی دن سے علاج شروع کر دیا۔ ایک مکان میں رکھ دیا جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر تھی اور ایک

ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی! یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا۔ چند ہی روز میں بین فائدہ
محسوس ہونے لگا۔ لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہئے، لڑائی کی خبریں آنے لگیں۔ آدمی، گھوڑے،
گاڑیاں، موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ ۲۵ اگست کو سب تیاری ہو چکی تھی۔ ہمارے نوکر سب
فوج میں جا چکے تھے۔ بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے۔ ریلیں کم ہو گئی تھیں۔ مگر ہم تھے کہ
ڈٹے رہے۔ اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے۔ طبیعت برابر صحت کی طرف
مائل تھی۔ ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہو گی۔ اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ اگست کو شکم
کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولد ہوا!! یعنی) ایک عدد عظیم الشان کیڑا، طول جس کا کوئی ۹ انچ
تھا، برآمد ہوا، پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے
انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا
اور کہا بہت اچھا ہوا کہ یہ نکل گئے۔ بہت پرانا ہے۔ خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب
ہو رہا ہے۔ اور جمے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہو گئے۔ غسل جو تجویز کئے گئے تھے وہ
بھی پورے ہو گئے۔ اور دو تاریخ کو اعلان جنگ برطانیہ نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک
بس یہ معلوم ہوا تھا کہ صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اور پوری امید تھی کہ پرامن طریقہ پر معاملہ
یکسو ہو جائے گا۔ حالت جنگ کا اعلان ہمیں ۲، کو سہ پہر میں سنایا گیا۔ اتوار کا دن تھا۔ اسی
وقت اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے وہ صبح ۵ بجے ہے۔ واپس آ کر حساب چکایا
سامان باندھا۔ رات کو دس بجے جا کر سامان اسٹیشن پر دیا۔ اور ٹکٹ خریدا۔ صبح ۵ بجے روانہ ہو گیا۔
ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا کہ ایک حلقہ والا دوسرے حلقہ کی کوئی خبر نہ دیتا تھا۔ بس اس حلقہ
میں گاڑیوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا وہ بھی غیر معین طور پر (stuttgart) میں نے
سوئٹزرلینڈ کا قصد کیا۔ کہا گیا کہ STUTTGART تک جا سکتے ہو، آگے معلوم نہیں۔ خیر
STUTTGART کا ٹکٹ لیا۔ راستہ میں تین جگہ گاڑی بدلتی تھی۔ دو دفعہ بدل چکا تھا۔ تیسری
جگہ پہنچنے سے پہلے ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ سب مسافر اتر جائیں

اتر گئے۔ ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ چھوٹا سا اسٹیشن۔ ہوائی جہازوں کے ڈر سے تاریک۔ بس ہر گھنٹہ دو گھنٹہ میں ایک گاڑی گذر جاتی تھی جس میں سرحدی مقامات کے بڈھے بچے ہوتے تھے جنھیں اندرون ملک بھیجا جا رہا تھا۔ خیر یہ وقت بھی گذر گیا اور ہم STUTTGART پہنچے۔ وہاں کہا کہ ZURICH جانا ہے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جا رہی ہے سامان پوچھا، معلوم ہوا ساتھ نہیں آیا۔ اسی دریافت کرنے میں ZURICH کی گاڑی روانہ ہو گئی رات وہیں قیام فرمایا۔ قاعدہ سے سرکاری مہمان ہو جانا چاہیے تھا، مگر مہمان نوازی نہ معلوم کیوں نہیں کی گئی دوسرے دن ZURICH کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا۔ جرمن علاقہ میں LAKE CONSTANCE کے کنارے فریدرش ہافن پر اترا وہاں سے اسٹیمر لینا ہوتا ہے رات کو پہنچا تھا دوسرے دن ۳ بجے دن کے اسٹیمر جانے والا تھا۔ رات میں معلوم ہوا تھا کہ اسٹیمر پھر چلنا بند ہو گئے آگے نہ جا سکو گے۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسٹیمر پھر چلنے لگے ہیں۔ سہ پہر میں اسٹیمر پر پہنچا۔ جرمن پولیس نے کہا کہ تم کو سوئٹزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ دیں گے، صبح ہی ۵۰ آدمی اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں! میں نے کہا آپ تو جانے دیں میں قسمت آزمائی کروں گا۔ مسکرائے، کندھے اچکائے، اور پاسپورٹ پر مہر لگا دی میں اسٹیمر پر بیٹھ ROMANSHORN پہنچا۔ اسٹیمر پر ۴۰۰ آدمیوں کی جگہ تھی اس پر عملہ کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے۔ میں اور دو سوئس جو فوجی خدمت کے لئے جرمنی سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔ کپتان نے پوچھا کہ تم نے سوئس VISA لے لیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہا پھر کیسے چلے ہو۔ یہ جہاز اسی لئے تو خالی جا رہا ہے۔ کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری حکومت نے باہر سے آنے والوں کے لئے بلا استثنا VISA کی قید لگا دی ہے اور اس کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی کہ جہاز چل چکا تھا۔ میں نے کہا اب میں تو چل کھڑا ہوا ہوں فرمایا کہ نہیں واپس جا سکتے ہو۔ پھر اس جہاز پر واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر جاکر VISA کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کہا کہ حضرت اب یہ تو ہوتا نہیں۔ ایک دفعہ

جرمنی سے نکل آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمائش کروں۔ خیر اسی گفتگو میں ROMANSHOM پہنچے وہاں وہی پیش آیا جو کپتان نے کہا تھا۔ سرحدی پولیس نے کہا واپس جاؤ۔ میں نے کہا ناممکن۔ یہیں قید کرو۔ کچھ دیر تو وہ اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے واپس جانا ہی ہوگا مگر جب میری طرف سے بھی انکار ہوتا رہا تو کہنے لگا کہ تم بات تو ٹھیک کہتے ہو جرمنی واپس جاؤ گے تو تمھیں وہاں قید کرلیں گے تمھیں واپس بھیجنا تو نا انصافی ہے۔ میں کیا آپ ہی سمجھئے۔ چنانچہ اس نے (برن) کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے مجھے اجازت مل گئی۔ اور میں (ZURICH) پہنچا۔ وہاں برطانوی کانسل نے مشورہ دیا کہ جینیوا جاؤ۔ انگلستان جانے یا اٹلی سے ہندوستان واپس جانے کے متعلق وہیں سے زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ میں ۹ کو یہاں پہنچ گیا۔ یہاں ڈاکٹر گوکل سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اتفاق سے اسی ہوٹل میں ہیں جس میں میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اب یہاں اطمینان ہے۔ چند روز کی اس دوڑ بھاگ میں ذرا رنگ روغن ویسا نہیں رہا جیسا KISSINGEN میں ہوگیا تھا۔ مگر فی الجملہ اچھا ہوں۔ خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں، اور ہضم کرتا ہوں۔ اور کیا چاہئے۔ وقفہ گزار کر پھر یہیں کہیں انجکشن لینے کا انتظام کروں گا۔ اور اگر اٹلی غیر جانبدار رہا تو انشاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آملوں گا مجھے امید ہے کہ روپیہ کی اور ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن آپ اگر ۲۰۰-۳۰۰ پونڈ کا انتظام رکھیں تو اچھا ہے۔ شاید ضرورت پڑ جائے تو مرا تار ملنے پر آپ بھیج سکیں۔

اس خط کے مضمون سے سب احباب کو مطلع کر دیجیئگا۔ اور یوسف اور محمود کو بھی۔ مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ دیکھئے۔ یہ قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں +

مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی، ایچ، ڈی)

(انجمن ترقی اردو ہند سقراط کے چند منتخب مکالمات کا ترجمہ کرا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ آئندہ سال شائع ہو جائے گا۔ ہم جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی اجازت سے شکریے کے ساتھ اس چھوٹے سے مکالمے کا ترجمہ قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں)

اشخاص مکالمہ

سقراط　　　　کریٹو

مقام۔ سقراط کا قید خانہ

سقراط تم اس وقت کیوں آئے، کریٹو؟ ابھی تو بہت سویرا ہوگا؟

کریٹو ہاں، بے شک۔

س ٹھیک وقت کیا ہے؟

ک پو پھٹ رہی ہے

س تعجب ہے کہ قید خانہ کے محافظ نے تمہیں آنے دیا

ک وہ مجھے جانتا ہے کیونکہ میں اکثر آتا رہتا ہوں، سقراط۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ کچھ سلوک بھی کیا ہے۔

س کیا تم ابھی پہنچے ہو۔

ک نہیں، مجھے آئے تھوڑی دیر ہوئی۔

س — تو پھر تم چپ کیوں بیٹھے رہے۔ فوراً جگا دیا ہوتا۔

ک — سقراط، مجھ سے تمہاری طرح یہ تکلیف اور پریشانی نہ اٹھائی جاتی ہرگز نہ اٹھائی جاتی۔ میں تمہاری پرسکون نیند کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تمہیں اسی وجہ سے نہیں جگایا کہ میں چاہتا تھا جہاں تک ہو سکے تمہاری تکلیف میں کمی ہو یوں تو میں تمہیں ہمیشہ سے خوش مزاج سمجھتا تھا مگر جس اطمینان سے تم یہ مصیبت برداشت کر رہے ہو اس کی مثال میری نظر سے آج تک نہیں گذری۔

س — بھئی کریٹو، جب انسان میری عمر کو پہنچ جائے تو اسے اس خیال سے کڑھنا نہیں چاہئے کہ موت قریب آ رہی ہے۔

ک — مگر اور بوڑھے بھی تو ہیں جو اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں ان کا بڑھاپا انھیں کڑھنے سے نہیں روکتا۔

س — یہ سچ ہے، مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ اتنے سویرے کیوں آتے ہو؟

ک — میں تمہارے پاس ایک پیام لے کر آیا ہوں جو افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے۔ غالباً تمہارے لئے تو نہیں مگر تمہارے دوستوں کے لئے خصوصاً میرے لئے نہایت افسوس ناک ہے۔

س — ہائیں؟ کیا وہ جہاز ڈیلوس سے آ گیا جس کی واپسی پر میں مارا جاؤں گا۔

ک — نہیں ابھی آیا تو نہیں مگر غالباً آج آ جائے گا۔ جو لوگ سینم سے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے وہاں چھوڑا تھا۔ لہٰذا سقراط کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔

س — اچھا کریٹو اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو میں بھی راضی ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن کی دیر ہو جائے گی۔

ک — تم یہ کیوں سمجھتے ہو؟

س — میں بتاتا ہوں۔ مجھے جہاز کے پہنچنے کے دوسرے دن مرنا ہے نہ؟

ک ہاں حکام یہی کہتے ہیں

س مگر میرے خیال میں جہاز کل سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ یہ مجھے ایک خواب سے معلوم ہوا جو میں نے کل رات کو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ابھی سویرے دیکھا تھا جب کہ خوش قسمتی سے تم نے مجھے سونے دیا۔

ک اور یہ خواب تھا کیا؟

س مجھے ایک حسین و جمیل عورت کی صورت زرق برق لباس میں نظر آئی جس نے مجھے مخاطب کرکے کہا سن اے سقراط،

"آج سے تیسرے دن تو فتھیا کے زرخیز خطے کو جائے گا"

ک کیا عجیب خواب ہے سقراط،

س میرے خیال میں کریٹو، اس کی تعبیر کے بارے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

ک ہاں افسوس، تعبیر تو بالکل صاف ہے۔ مگر میرے پیارے سقراط، میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ میری بات مانو اور یہاں سے نکل بھاگو اگر تم مر گئے، تو صرف یہی نہیں کہ میرا ایک دوست جاتا رہے گا جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک اور خرابی ہے جو لوگ تم کو اور مجھ کو نہیں جانتے وہ سمجھیں گے کہ اگر میں روپیہ خرچ کرنے پر تیار ہوتا تو تمہیں بچا سکتا تھا مگر میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اب تباؤ اس سے بڑھ کر کوئی ذلت ہو سکتی ہے ـــــ کہ میرے متعلق یہ سمجھا جائے کہ میں روپیہ کو ایک دوست کی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں؟ لوگ تو یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ میں چاہتا تھا تم بھاگ جاؤ مگر تم نے انکار کر دیا۔

س مگر پیارے کریٹو، ہم عام لوگوں کی رائے کی پرواہ ہی کیوں کریں؟ ہمیں تو صرف اچھے آدمیوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور یہ ان معاملات کو اسی طرح دیکھیں جس طرح حقیقت میں پیش آئے۔

ک گر، سقراط عوام کی رائے کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اس لئے کہ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ جس شخص سے بدظن ہو جائیں اسے انتہائی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

س کاش ایسا ہوتا، کریٹو کہ عوام انتہائی نقصان پہنچا سکتے، کیونکہ وہ اس صورت میں انتہائی فائدہ پہنچانے کے قابل بھی ہوتے۔ اور اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے تھی! لیکن حقیقت میں وہ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ کسی شخص کو دانش مند بنا سکتے ہیں اور نہ بے وقوف ان کے سارے کام محض اتفاقی ہوتے ہیں۔

ک خیر میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو کہو سقراط کہیں تم میرے اور اپنے دوسرے دوستوں کے خیال سے تو ایسا نہیں کر رہے ہو؟ تمہیں یہ خوف تو نہیں کہ اگر تم قید خانے سے بھاگ گئے تو جاسوس ہمیں دق کریں گے کہ ہم تمہیں اڑا لے گئے اور ہماری ساری املاک یا اس کا کچھ حصہ چھن جائے گا یا اس سے بھی برا انجام ہوگا؟ اگر تم ہماری وجہ سے ڈرتے ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو کیونکہ تمہیں بچانے کے لئے ہمیں یقیناً یہ اور اس سے بڑھ کر خطرہ برداشت کرنا چاہیئے۔ تو پھر مان جاؤ اور جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔

س ہاں کریٹو، ایک خوف یہ بھی ہے جس کا تم نے ذکر کیا مگر صرف یہی نہیں ہے۔

ک تم اطمینان رکھو —— ایسے لوگ موجود ہیں جو بہت کم خرچ پر تمہیں قید خانہ سے نکال لے جانے کو تیار ہیں۔ اب رہے جاسوس تو ان کا معاملہ بھی کچھ زیادہ نہیں —— تھوڑی سی رقم میں خوش ہو جائیں گے۔ میری دولت جو حقیقت میں بہت ہے تمہارے لئے حاضر ہے اور اگر تمہیں میری ساری پونجی صرف کرنے میں تامل ہو تو بعض اجنبی اپنا سرمایہ پیش کرتے ہیں کہ تم اسے کام میں لاؤ ان میں سے ایک سمیاس

تھیسلی خاص اسی غرض سے ایک بہت بڑی رقم اپنے ساتھ لایا ہے سیبن وغیرہ بہت سے لوگ تمہیں بھاگنے میں مدد دینے کے لئے اپنا روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تم ہمارے خیال سے تامل نہ کرو اور وہ بات نہ کہو جو تم نے عدالت میں کہی تھی کہ دوسری جگہ جا کر میری سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ کیا شغل اختیار کروں تم جہاں کہیں جاؤ گے لوگ تمہیں عزیز رکھیں گے کچھ ایتھنس پر موقوف نہیں۔ تھیسلی میں میرے دوست موجود ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جانا چاہو تو تمہاری قدر اور حفاظت کریں گے اور کوئی تھیسلی والا تمہیں نہیں ستائے گا اور میں نہیں سمجھتا سقراط تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ جب تمہاری جان بچ سکتی ہے تو تم خود اسے ہلاکت میں ڈالو۔ تم تو اپنے دشمنوں کا مقصد پورا کر رہے ہو جو تمہیں جلد سے جلد برباد کرنا چاہتے ہیں اور پھر میں یہ بھی کہہ دوں کہ تم اپنے اپنے بچوں سے بے وفائی کر رہے ہو بجائے اس کے کہ تم ان کی پرورش کرتے اور انھیں تعلیم دلاتے انھیں چھوڑ کر جا رہے ہو اور اب انھیں خود ہی قسمت آزمائی کرنی پڑے گی اگر وہ اس انجام سے بچ گئے جو عموماً یتیموں کا ہوا کرتا ہے تو اس میں تمہاری کوئی کارگذاری نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کو دنیا میں بچے پیدا ہی نہیں کرنے چاہئیں جو آخر تک ان کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم وہ راہ اختیار کر رہے ہو جس میں زیادہ آسانی ہے وہ نہیں جس میں زیادہ خوبی اور مردانگی ہے اور جو تم جیسے شخص کے لئے مناسب ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات میں نیکی کا لحاظ رکھتا ہے۔ مجھے سچ مچ شرم آتی ہے نہ صرف تم پر بلکہ ہم سب پر جو تمہارے دوست کہلاتے ہیں، جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارا قصہ محض ہماری کم ہمتی سے منسوب کیا جائے گا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ اس مقدمے کو دائر ہی نہ ہونے دیتے یا کچھ اور انتظام کرتے، یہ آخری حرکت یہ انتہائی حماقت تو سراسر ہم لوگوں کی غفلت اور بزدلی کا نتیجہ سمجھی جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ اگر ہم کسی کام کے ہوتے

تو ہمیں بچا لیتے اور تم خود بھی بچ سکتے تھے اس لئے کہ کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ دیکھو سقراط اس کے نتائج ہمارے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی کس قدر افسوس ناک اور شرم ناک ہیں تو پھر فیصلہ کر ڈالو بلکہ یہ سمجھو کہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو اس لئے کہ سوچنے کا وقت گزر گیا۔ اب صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے اور وہ آج رات کو ہو جانی چاہئے اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو اس کی کوئی صورت یا امکان نہیں رہے گا۔ اس لئے میری التجا ہے کہ تم راضی ہو جاؤ اور جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔

سقراط

س

پیارے کریٹو، تمہارا یہ جوش اگر صحیح ہو تو نہایت قابل قدر ہے لیکن اگر غلط ہو تو جتنا زیادہ شدید ہوگا اتنا ہی زیادہ خطرناک ہوگا۔ لہٰذا ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ میں تمہارے کہنے پر عمل کروں یا نہ کروں۔ اس لئے کہ میری طبیعت ہمیشہ سے عقل کی راہ پر چلتی ہے جو غور کرنے کے بعد مجھے سب سے بہتر معلوم ہو۔ اس مصیبت کے پیش آنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے قول سے پھر جاؤں جن اصولوں کی میں اب تک قدر اور عزت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں اور بجز اس صورت کے کہ ہمیں فوراً کوئی دوسرے ان سے بہتر اصول ہاتھ آجائیں مجھے ہرگز تمہارے ساتھ اتفاق نہیں ہو سکتا چاہے جمہور کی طاقت مجھے کتنی ہی بار قید، ضبط املاک اور موت کی سزا دے جس طرح بچوں کو ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کا سب سے معقول طریقہ کیا ہوتا ہے؟ کیا میں پھر لوگوں کی رائے کے بارے میں تمہاری پرانی بحث کی طرف رجوع کروں؟ —— ہم یہ کہہ رہے تھے کہ بعض کی رائے کا لحاظ کرنا چاہئے اور بعض کا نہ کرنا چاہیئے۔ اب بتاؤ کہ یہ بات جو میری سزا کا حکم سنائے جانے سے پہلے کہی گئی تھی، ٹھیک ہے یا نہیں؟ کیا وہ بحث جو پہلے معقول تھی اب محض بکواس ثابت ہوئی —— محض بچوں کی سی مہمل گفتگو؟ یہ وہ سوال ہے کریٹو، جس پر میں تمہاری مدد سے غور کرنا چاہتا ہوں:— آیا موجودہ حالات میں ہمیں اپنا استدلال

کچھ مختلف نظر آتا ہے یا نہیں اور میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں؟ اس کا خلاصہ جس پر میرے خیال میں بہت سے مستند اشخاص متفق ہیں یہ تھا کہ جیسا میں ابھی کہہ رہا تھا. بعض لوگوں کی رائے کا لحاظ کیا جائے اور بعض کی رائے کا نہ کیا جائے اب سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں تو کل مرنا نہیں —— کم سے کم انسانی عقل کو اس کا کوئی احتمال نظر نہیں آتا —— لہذا تمہاری رائے بے لوث ہوگی اور تم گرد و پیش کے حالات سے دھوکا نہیں کھاؤ گے۔ تمہیں بتاؤ میری یہ بات صحیح ہے یا نہیں کہ بعض رائیں اور صرف بعض اشخاص کی رائیں قابل قدر ہیں اور باقی رائیں اور باقی لوگوں کی رائیں قابل قدر نہیں ہیں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

ک یقیناً

س اچھوں کا لحاظ کرنا چاہیے، بروں کا نہیں کرنا چاہیے؟

ک اور کیا

س اور دانش مندوں کی رائے اچھی اور بے وقوفوں کی رائے بری ہوتی ہے؟

ک یقیناً

س اچھا ایک اور مسئلے میں ہم لوگوں نے کیا کہا تھا؟ کیا وہ شخص جو ورزش کا شغل اختیار کرتا ہے ہر ایک کی تعریف اور مذمت اور رائے کی پروا کرتا ہے یا صرف ایک شخص کی، خواہ وہ اس کا معالج ہو یا استاد۔

ک صرف ایک شخص کی۔

س اور اسے بہت سے لوگوں کی نہیں بلکہ صرف ایک شخص کی مذمت سے ڈرنا چاہیے اور تعریف سے خوش ہونا چاہیے؟

ک ظاہر ہے

س اور اسے اس طریقہ سے کام کرنا، ورزش کرنا، کھانا پینا چاہیے، جسے ایک فرد

واحد یعنی اس کا استاد جو صاحب فہم ہے، مناسب سمجھتا ہے نہ کہ اور سب لوگوں کی رائے کے مطابق۔

ک سچ ہے۔

س اور اگر وہ ایک شخص کی رائے کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی کرے اور ان بہت سے لوگوں کی رائے مان لے جو بالکل نافہم ہیں تو نقصان اٹھائے گا یا نہیں؟

ک یقیناً نقصان اٹھائے گا۔

س اور وہ نقصان کیا ہوگا کس طرف رخ کرے گا اور خلاف ورزی کرنے والے کی کس چیز پر اثر ڈالے گا؟

ک ظاہر ہے اس کے جسم پر اثر ڈالے گا۔ یہی چیز ہے جسے یہ نقصان برباد کر دیتا ہے

س بہت ٹھیک۔ اب بتاؤ کریٹو، کیا یہ بات دوسری چیزوں پر صادق نہیں آتی جنھیں ایک ایک کر کے گنوانے کی ضرورت نہیں؟ کیا عدل و ظلم، حسن و قبح۔ نیک و بد کے مسائل میں جن پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں ہمیں بہت سے لوگوں کی رائے پر عمل کرنا اور ان سے ڈرنا چاہیئے یا ایک شخص کی رائے پر جو صاحب فہم ہے؟ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ تمام دنیا سے زیادہ اس سے ڈریں اور اس کا احترام کریں؟ اور اگر ہم اس کا ساتھ دیں تو کیا اپنے نفس کے اس جوہر کو برباد نہ کر دیں گے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے؟ آخر یہ جوہر وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

ک یقیناً سقراط۔

س ایسی ایک اور مثال لے لو:۔ اگر ہم نافہم لوگوں کے مشورے پر عمل کر کے اس چیز کو برباد کر دیں جو تندرستی سے بنتی اور بیماری سے بگڑتی ہے تو زندگی کا لطف باقی رہے گا؟ اور یہ چیز جو برباد ہوتی ہے جسم ہی ہے نہ؟

ک ہاں۔

س اگر ہمارا جسم خراب اور فاسد ہو تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں ؟

ک ہرگز نہیں ۔

س اور کیا اس صورت میں زندگی کا لطف باقی رہے گا اگر انسان کا وہ اعلیٰ جوہر برباد ہو جائے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے ؟ کیا ہم انسان کے اس جوہر کو، خواہ وہ کچھ بھی ہو، جس کا تعلق اور ظلم سے ہے، جسم سے کم تر سمجھتے ہیں ؟

ک ہرگز نہیں ۔

س پھر کیا اسے جسم سے برتر سمجھتے ہیں ؟

ک بدرجہا برتر ۔

س تو میرے دوست، ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ عام لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں بلکہ یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک شخص جو عدل اور ظلم کی ماہیت کو سمجھتا ہے کیا کہے گا اور حق کیا کہے گا ۔ اس لئے جب تم نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں عدل و ظلم بد و نیک، عزت و ذلت کے بارے میں عام لوگوں کی رائے کا لحاظ رکھنا چاہیئے تو گویا بسم اللہ ہی غلط کر دی ——— مگر ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ " عام لوگ ہمیں قتل جو کر دیں گے "

ک ہاں سقراط، ظاہر ہے کہ یہی جواب دیا جائے گا ۔

س اور یہ ٹھیک ہے ۔ پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارا پرانا دعویٰ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے ۔ مگر کیا میں ایک اور دعوے کے متعلق بھی یہی بات کہہ سکتا ہوں ——— کہ اصل میں زندگی کی نہیں بلکہ اچھی زندگی کی قدر کرنی چاہیئے ۔

ک ہاں یہ بھی اپنی جگہ پر قائم ہے ۔

س اچھی زندگی با عدل اور با عزت زندگی کا نام ہے ۔ یہ دعویٰ بھی صحیح ہے ؟

ک ہاں صحیح ہے ۔

س	ان مقدمات کی بنا پر میں اس علیے پر بحث کروں گا کہ مجھے بغیر اہل ایتھنس کی اجازت کے قید خانہ سے نکل بھاگنا چاہیئے یا نہیں۔ اگر میرے لئے بھاگنا صریحًا جائز ہے تو میں اس کی کوشش کروں گا ورنہ نہیں اور چیزیں جن کا تم ذکر کرتے ہو یعنی روپے کا سوال، بے عزتی کا ڈر اور بچوں کی تعلیم کا خیال میرے خیال میں محض عوام کے نظریات ہیں۔ وہ تو، اگر ان کے امکان میں ہو، لوگوں کو زندہ کرنے پر اسی طرح مستعد ہو جائیں جس طرح قتل کرنے پر مستعد رہتے ہیں ـــــ بغیر کسی معقول وجہ کے۔ اب چونکہ یہاں تک ہمارا سارا استدلال تسلیم کیا جا چکا ہے اسکے بعد صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے آیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم بھاگیں یا دوسروں سے اپنے بھاگنے میں مدد لیں اور انھیں روپے کی یا شکریے کی شکل میں اس کا معاوضہ دیں یا در اصل یہ ناجائز ہے۔

اگر دوسری صورت ہے تو موت یا کسی اور مصیبت کو جو میرے نہ بھاگنے سے واقع ہو گی بحث میں لانا ہی نہ چاہیئے۔

ک	میرے خیال میں تم ٹھیک کہتے ہو سقراط، تو پھر ہم کس طرح آگے بڑھیں۔

س	آؤ ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں۔ ممکن ہو تو تم میرے دعوے کو غلط ثابت کرو، میں قائل ہو جاؤں گا۔ ورنہ میرے پیارے دوست، اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ مجھے اہل ایتھنس کی مرضی کے خلاف بھاگ جانا چاہیئے، تم جو مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہو اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن اتنی بہتر رائے کے مقابلے میں تمہاری بات نہیں مان سکتا تو اب مہربانی کر کے میرے پہلے دعوے پر غور کرو اور جس طرح مناسب سمجھو جواب دو۔

ک	اچھی بات ہے۔

س	کیا ہم یہ کہیں کہ ہمیں کبھی جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کرنا چاہیئے یا یہ کہ ایک طرح سے بے انصافی کرنا جائز ہے اور دوسری طرح سے ناجائز ہے یا بے انصافی کرنا ہر حالت میں برا اور باعث ذلت ہے جیسا میں نے ابھی کہا تھا اور تم نے مان لیا تھا؟ کیا ان

سب باتوں کو جو ہم پچھلے چند روز میں تسلیم کر چکے ہیں رد کر دیں ؟ کیا اس عمر میں زندگی بھر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ ہم میں اور بچوں میں کوئی فرق نہیں ؟ یا عام لوگوں کی رائے کے باوجود چاہے نتیجہ اچھا ہو یا برا ہم اس پر زور دیں کہ جو ہم نے اس وقت کہا تھا وہ سچ تھا یعنی ظلم یا بے انصافی کا کام کرنے والے کے لئے برا اور باعث ذلت ہے؟ ہم یہ کہیں یا نہ کہیں ؟

ک ضرور کہیں ؟

س تو ہمیں کبھی بے انصافی نہیں کرنی چاہیئے ۔

ک کبھی نہیں۔

س اور جب ہمیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے بدلے اسے نقصان نہ پہنچائیں ۔جیسا کہ عوام کا خیال ہے ۔اس لئے کہ نقصان تو کسی کو پہنچانا ہی نہ چاہیئے ؟

ک ظاہر ہے ۔

س اور کریٹو، کیا ہم کسی کے ساتھ برائی بھی نہ کریں ؟

ک ہرگز نہیں ۔

س اور برائی کے بدلے برائی کرنا جو عوام کا اخلاقی اصول ہے —— یہ انصاف ہے یا بے انصافی ؟

ک بے انصافی ۔

س اس لئے کہ کسی کے ساتھ برائی کرنا اور اسے نقصان پہنچانا ایک ہی بات ہے ؟

ک بالکل ٹھیک ہے ۔

س تو پھر ہمیں انتقام نہیں لینا چاہیئے یعنی کسی کے ساتھ برائی کے بدلے برائی نہیں کرنی چاہیئے خواہ اس نے ہمارے ساتھ کتنی ہی بدسلوکی کی ہو ۔مگر ذرا سوچ لو ،کریٹو ، کیا تمہارا واقعی یہی خیال ہے جو تم کہہ رہے ہو ۔اس لئے کہ یہ رائے زیادہ آدمیوں کی نہ کبھی تھی اور نہ

ہوگی اور اس کے مخالفوں اور موافقوں کوئی بنائے اشتراک نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں کس قدر شدید اختلاف ہے تو لامحالہ ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ تو اب بتاؤ کیا تم میرے پہلے اصول سے متفق ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو کہ نقصان پہنچانا، یا انتقام لینا یا برائی کو برائی سے روکنا کسی صورت میں جائز نہیں؟ کیا ہم اسے اپنے استدلال کا مقدمہ قرار دیں؟ یا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں لیکن اگر تمہاری کچھ اور رائے ہوگئی ہو تو مجھے بتاؤ۔ اور جو تم اس سے پہلے خیال پر قائم ہو تو میں ایک قدم آگے بڑھوں۔

ک تم شوق سے آگے بڑھو اس کے لئے میں نے اپنی رائے نہیں بدلی ہے۔

س تو پھر میں ان کی بات کو لیتا ہوں جو ایک سوال کی شکل میں ظاہر کی جاسکتی ہے ــــ کیا انسان کو وہی کرنا چاہیئے۔ جسے وہ حق مانتا ہے یا حق کو چھوڑ دینا چاہیئے؟

ک اسے وہی کرنا چاہیئے جسے وہ حق سمجھتا ہے۔

س اگر یہ صحیح ہے تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ میں اہلِ ایتھنس کی رائے کے خلاف قید خانے سے چلا جاؤں تو کسی کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں جن کے ساتھ مجھے خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیئے کیا یہ ان اصولوں سے غداری نہیں ہے جنھیں ہم قرین انصاف تسلیم کر چکے ہیں تباؤ کیا کہتے ہو؟

ک میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سقراط، اس لئے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

س تو پھر مسئلے پر اس پہلو سے غور کرو:۔ فرض کرو کہ میں فرار ہونے پر تیار ہوں (تمہیں اختیار ہے اس عمل کو جو چاہو کہو) اور قوانین اور حکومت اگر مجھ سے باز پرس کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔ "بتاؤ سقراط یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟ کیا تم اپنے ایک فعل سے ہم سب کو تباہ نہیں کر رہے ہو۔ کل قوانین کو اور ساری ریاست کو۔ جہاں تک تمہارے اختیار

میں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ریاست قائم رہے گی اور برباد نہ ہو جائے گی جس میں قانون کے فیصلے کوئی قوت نہیں رکھتے اور افراد انھیں پیروں تلے روند ڈالتے ہیں؟" ہم کیا جواب دیں گے، کریٹو، اس بات کا یا اسی قسم کی اور باتوں کا؟ ہر شخص، خصوصاً وہ جو فن خطابت میں ماہر ہو، تعزیری قانون کی حمایت میں بہت کچھ کہہ ڈالے گا۔ وہ ہدایت کرے گا کہ اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا ہم یہ جواب دیں" یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ریاست نے ہمارے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور خلاف انصاف سزا دی ہے؟"

ک بہت مناسب ہے، سقراط۔

س اس پر قانون پوچھے گا "کیا ہمارا تمہارا یہی معاہدہ تھا یا تم اس کے پابند تھے کہ ریاست جو سزا دی گی اسے برداشت کرو گے؟ اور اگر میں نے الفاظ کو سن کر حسرت کا اظہار کیا تو غالباً قانون یہ کہے گا "سقراط، آنکھیں پھیلا کر نہ رہ جاؤ، بلکہ جواب دو۔ تمہیں تو سوال کرنے اور جواب دینے کی عادت ہے بتاؤ تم کو ہم سے کون سی شکایت ہے جس کی وجہ سے تمہیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ ہمیں اور ریاست کو تباہ کرنے کی کوشش کرو؟ کیا ہم تمہارے وجود میں آنے کا باعث نہیں ہوئے؟ تمہارے باپ نے ہماری مدد سے تمہاری ماں سے شادی کی اور اس طرح تم پیدا ہوئے کیا تمہیں ہم میں سے ان قوانین پر اعتراض ہے جو شادی سے متعلق ہیں؟ مجھے جواب دینا پڑے گا کہ نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یا ان قوانین پر جو بچوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں اور جو تم نے بھی حاصل کی ہے؟ کیا تعلیم کے قوانین نے تمہارے والد کو جو حکم دیا کہ تمہیں علوم موسیقی اور ورزش سکھائے جائیں وہ بے جا تھا"؟ میں جواب دوں گا بالکل بجا تھا۔" تو پھر جب ہم تمہیں وجود میں لائے اور ہم ہی نے تمہاری پرورش کی، تمہیں تعلیم و تربیت دی تو کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم ہمارے بچے اور ہمارے غلام ہو جیسے کہ تم سے

پہلے تمہارے آباؤ اجداد تھے؟ اور اگر یہ سچ ہے تو تم ہمارے برابر کے نہیں ہو اور تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمہیں ہمارے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنے کا حق ہے جیسا ہم تمہارے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر تمہارا استاد یا باپ ہی ہوتا اور وہ تمہیں مارتا یا برا بھلا کہتا یا تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتا تو کیا تمہیں یہ حق تھا کہ تم بھی اسے مارو یا برا بھلا کہو یا اس کے ساتھ اور کسی قسم کی بدسلوکی کرو؟ ظاہر ہے کہ تم یہ کبھی نہیں کہو گے۔ کیا اس وجہ سے کہ ہم تمہیں ہلاک کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تمہیں اپنے خیال میں یہ حق حاصل ہے کہ تم اس کے بدلے ہمیں اور اپنے ملک کو برباد کر دو جہاں تک تمہارے امکان میں ہے؟ اے حقیقی نیکی کا دعویٰ کرنے والے کیا تم بناوٹ سے یہ کہو گے کہ تمہارا یہ فعل جائز ہے؟ کیا تم جیسے فلسفی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا ملک ماں باپ اور سب بزرگوں سے زیادہ قابل قدر ہے اُن سے زیادہ مقدس، محترم اور دیوتاؤں اور ذی فہم انسانوں کی نظر میں زیادہ عزیز ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جب وہ خفا ہو تو اس کے غصے کو ٹھنڈا کریں، اس کی منتیں کریں اس سے بھی زیادہ نرمی اور ادب سے جتنی اپنے باپ کی کرتے ہیں، اسے سمجھا بجھا کر قائل کریں یا اگر وہ قائل نہ ہو تو اس کے حکم کی تعمیل کریں، جب وہ ہمیں قید کی یا تازیانے کی سزا دے تو اسے چپ چاپ برداشت کرلیں، اگر وہ ہمیں میدان جنگ میں زخم کھا کر یا جان دینے کے لئے بھیجے تو ہم وہاں چلے جائیں جیسا کہ ہمارا فرض ہے کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ دشمن کے آگے سر جھکا دے یا پیچھے ہٹ جائے یا اپنی صف کو چھوڑ دے بلکہ خواہ میدان جنگ ہو خواہ عدالت یا کوئی اور جگہ اس پر لازم ہے کہ وہی کرے جو اس کے ملک یا شہر کا حکم ہے، ورنہ پھر نیکی کے بارے میں ان کا جو نظریہ ہے اسے بدل دے اگر اسے اپنے باپ یا ماں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہیئے تو اپنے ملک کے ساتھ تو اور بھی نہیں کرنی چاہیئے" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو قوانین کا قول سچ ہے یا نہیں میرے خیال میں

سچ ہے۔

ک میرے خیال میں سچ ہے۔

س قوانین یہ کہیں گے" ذرا سوچو تو سقراط' کیا ہمارا کہنا ٹھیک نہیں کہ جو کوشش تم کر رہے ہو' اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اس لئے کہ جب ہم تمہیں دنیا میں لاکر تعلیم و تربیت دے چکے اور تم کو اور دوسرے شہریوں کو ہر اچھی چیز جو ہمارے اختیار میں تھی تقسیم کر چکے اس کے بعد اسی آزادی کی صورت میں جو ہم نے ہر باشندۂ ایتھنس کو دے رکھی ہے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے شہر کے طور طریق کو دیکھنے اور ہم سے واقف ہونے کے بعد وہ ہمیں پسند نہ کرے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں جی چاہے چلا جائے اور اپنی املاک ساتھ لے جائے۔ ہم میں سے کوئی قانون نہ اسے منع کرے گا اور نہ اس کی راہ میں حائل ہوگا' ہر وہ شخص جو ہمیں اور ہمارے شہر کو پسند نہیں کرتا اور کسی اور شہر یا نوآبادی میں جا کر رہنا چاہتا ہے اسے اس کی اجازت ہے اور وہ اپنی املاک پر بدستور قابض رہے گا۔ لیکن جس شخص کو اس کا تجربہ ہے کہ ہم کس طرح عدالت اور ملک کا انتظام کرتے ہیں اور پھر بھی وہ ہماری ریاست میں رہتا ہے اس سے گویا ہم نے بالکنایہ یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ کرے گا اور جو ہماری نافرمانی کرے وہ تہرے جرم کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ ہماری نافرمانی گویا والدین کی نافرمانی ہے' دوسرے اس لئے کہ ہم اس کے مربی ہیں' تیسرے اس لئے کہ اس نے ہم سے معاہدہ کیا ہے کہ ہمارے احکام کی تعمیل کریگا نہ تو وہ ہمارے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور نہ ہمیں قائل کرتا ہے کہ یہ احکام خلاف انصاف ہیں۔ ہم اس پر زبردستی نہیں کرتے بلکہ یہ اختیار دیتے ہیں کہ یا تو ہمارا حکم مانے ورنہ ہمیں قائل کر دے ———— ہماری طرف سے یہ موقع دیا جاتا ہے مگر وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا۔

اس طرح کے الزام تم پر لگائے جائیں گے سقراط، جیسا کہ ہم نے کہا ہے اگر تم اپنے ارادے کو عمل میں لائے۔ تم ایتھنس کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مورد الزام قرار پاؤ گے۔" اب فرض کرو میں ان سے پوچھوں کہ آخر میں اوروں سے زیادہ مورد الزام کیوں ٹھہروں گا تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ تم نے اوروں سے زیادہ اس معاہدہ کو تسلیم کیا ہے۔ وہ کہیں گے "اس بات کا صریحی ثبوت موجود ہے، سقراط، کہ تم ہم کو اور شہر کو ناپسند نہیں کرتے ایتھنس کے باشندوں میں تم سب سے زیادہ شہر میں رہے ہو اور چونکہ تم یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتے اس لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ نہ تم ایک بار کے سوا کبھی کھیل دیکھنے استھمس گئے اور نہ کہیں اور بجز ان موقعوں کے جب قومی خدمت انجام دے رہے تھے۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح سفر نہیں کرتے۔ تمہیں دوسری ریاستوں اور ان کے قوانین کو دیکھنے کا شوق نہیں۔ تمہاری محبت کا دائرہ تو بس ہم تک اور ہماری ریاست تک محدود ہے۔ تم ہمیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے ہماری حکومت سے راضی تھے۔ اسی شہر میں تم نے بچے پیدا کئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اس سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں تم چاہتے تو اپنے لئے جلا وطنی کی سزا تجویز کر دیتے۔ ریاست اب تمہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی مگر اس وقت دے دیتی۔ مگر تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم موت کو جلا وطنی پر ترجیح دیتے ہو اور مرنے کے لئے تیار ہو۔ اب تم ان سب اعلیٰ جذبات کو بھول گئے ہمارے قوانین کا ادب کرنے کے بجائے ہمیں ستانے کے درپے ہو اور وہ حرکت کر رہے ہو جو صرف ایک ادنیٰ غلام ہی کر سکتا ہے یعنی بھاگ کر جا رہے ہو اور ان سب معاہدوں سے پھرے جاتے ہو جو تم نے شہری کی حیثیت سے کئے تھے سب سے پہلے تو اسی سوال کا جواب دو:۔ کیا ہمارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے ہمارے زیر حکومت رہنے کا معاہدہ کیا تھا؟ بتاؤ یہ

بات سچ ہے یا نہیں ؟" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو ؟ کیا ہم اس پر مجبور نہیں کہ اس کی تصدیق کریں ؟

ک   اس کے سوا کوئی چارہ نہیں سقراط۔

س   تو پھر کیا وہ یہ نہیں کہیں گے" سقراط تم ان معاہدوں کو توڑ رہے ہو جو تم نے فرصت سے سمجھ بوجھ کر کئے تھے، عجلت یا جبر یا فریب کی حالت میں نہیں بلکہ ستر سال تک غور کرنے کے بعد۔ اس اثنا میں تمہیں یہ آزادی تھی کہ اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے یا ہمارے معاہدوں کو خلاف انصاف سمجھتے ہو تو شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تمہیں انتخاب کا موقع حاصل ہے خواہ لیکڈیمون چلے جاتے یا کریٹ جن دونوں ریاستوں کے نظم حکومت کی تم نے اکثر تعریف کی ہے یا کسی اور یونانی یا غیر ملکی ریاست میں۔ مگر تم اور سب اہل ایتھنس سے زیادہ ریاست سے، یا دوسرے الفاظ میں ان کے قوانین سے (اس لئے کہ بغیر قوانین کے ریاست کو کون پوچھتا ہے) اتنے خوش معلوم ہوتے تھے کہ تم نے اس کی حد سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لولے لنگڑے اور اندھے بھی اس طرح جسم کو ایک جگہ نہ رہتے ہوں گے جیسے تم رہے اور اب تم بھاگنے پر آمادہ ہو اور اپنے معاہدے سے پھرے جاتے ہو۔ ہماری بات مانو تو یہ ہرگز نہ کرو سقراط کیوں شہر سے فرار ہو کر اپنے کو ہنسواتے ہو ؟

" ذرا سوچو تو کہ اگر تم اس طرح کی غلطی کرو گے تو تمہارا یا تمہارے دوستوں کا اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟ یہ بات کہ تمہارے دوست جلاوطن کر دئے جائیں گے اور حق شہریت سے محروم ہو جائیں گے یا اپنی املاک کھو بیٹھیں گے قریب قریب یقینی ہے اور خود تم سقراط، کسی ہمسایہ ریاست مثلاً تھیبس۔ یا میگارا میں چلے جاؤ جن دونوں کا نظم حکومت بہت اچھا ہے، دشمن کی حیثیت سے وہاں پہنچو گے ان کی حکومت تمہارے خلاف ہوگی اور سب وطن دوست شہری تمہیں قانون کی جڑ کھودنے

والا سمجھ کر بری نظر سے دیکھیں گے اور ججوں کے دل میں اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی کہ ان کا تمہیں سزا دینا بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص قوانین کا بگاڑنے والا ہے اغلب ہے کہ وہ انسانوں کے نوجوان اور ناسمجھ طبقے کا بگاڑنے والا بھی ہوگا تو پھر کیا تم خوش آئین شہروں سے اور خوش خصلت انسانوں سے دور رہو گے؟ کیا ان شرائط پر زندگی قابل قبول ہوگی؟ یا تم ان کے پاس جا کر بے باکی سے گفتگو کرو گے مگر تم ان سے کہو گے کیا؟ وہی جو تم یہاں کہا کرتے ہو کہ نیکی اور عدل اور رسوم و قوانین انسانوں میں بہترین چیزیں ہیں؟ کیا یہ بات مناسب ہوگی؟ ہرگز نہیں لیکن اگر تم خوش آئین ریاستوں کو چھوڑ کر کریٹو کے دوستوں کے پاس تھسلی چلے گئے جہاں بدنظمی اور بے اصولی کا دور دورہ ہے تو وہ لوگ تمہارے قید خانے سے فرار ہونے کا قصہ سن کر بہت محظوظ ہوں گے اور اس میں زیب داستان کے لئے بہت سی مضحک باتوں کا اضافہ کر دیں گے کہ تم نے کس طرح بکری کی کھال اوڑھ رکھی تھی یا کوئی اور بہروپ اختیار کر رکھا تھا جیسا کہ مفرور شکل بدلنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص یہ پوچھنے والا نہ ہوگا کہ تھوڑے دن اور زندہ رہنے کی حقیر خواہش کی بنا پر تمہیں اس بڑھاپے میں مقدس ترین قوانین کو توڑتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ شاید کوئی نہ پوچھے اگر تم نے ان سب کو خوش رکھا لیکن اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو تمہیں بہت سی ذلت آمیز باتیں سننی پڑیں گی۔ تم زندہ تو رہو گے مگر کس حالت میں؟ ـــــ سب لوگوں کے خوشامدی اور خدمت گار بن کر اور تمہارا شغل کیا ہوگا؟ ـــــ تھسلی میں رہنا اور کھانا پینا گویا تم نے محض پیٹ بھرنے کی خاطر پردیس کا سفر اختیار کیا اور یہ تمہارے عدل وخیر کے اعلیٰ خیالات کہاں چلے جائیں گے؟ اگر تم یہ کہو کہ میں اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں ـــــ ان کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہوں ـــــ تو کیا تم انھیں اپنے ساتھ تھسلی لے جاؤ گے اور ایتھنس کی شہرت سے محروم

کر دو گے؟ یہی وہ احسان ہے جو تم ان پر کرو گے؟ یا تم اس خیال میں ہو کہ اگر تم زندہ رہتے خواہ ان سے دور ہی کیوں نہ ہو، تو ان کی تعلیم و تربیت بہتر ہو گی اس لئے کہ تمہارے دوست ان کی خبر گیری کریں گے؟ تم سمجھتے ہو کہ اگر تم تھسلی کے باشندے ہو گئے وہ تمہارے بچوں کی خبر لیں گے اور اگر دوسری دنیا کے باشندے ہو گئے تو وہ ان کی خبر نہیں لیں گے؟ حالانکہ اگر وہ لوگ جو اپنے آپ کو تمہارا دوست کہتے ہیں کسی کام کے ہیں تو وہ ان کی مدد کریں گے —— یقیناً کریں گے۔

"لہٰذا سقراط، ہم جنھوں نے تمہاری پرورش کی ہے جو کچھ کہتے ہیں کان دھر کر سنو"۔ زندگی اور بچوں کو مقدم اور عدل کو مؤخر نہ سمجھو بلکہ عدل کو سب سے مقدم سمجھو تاکہ عالم زیریں کے حاکموں کی نظر میں تمہارا عمل صحیح ٹھہرے۔ اس لئے اگر تم نے کریٹو کی بات مان لی تو نہ تم کو اور تمہارے متعلقین کو اس دنیا میں زیادہ خوشی اور پاکی اور نیکی میسر ہو گی اور نہ دوسری دنیا میں زیادہ سعادت حاصل ہو گی۔ اب تم بے گناہ دنیا سے جا رہے ہو مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ظالم کی۔ تمہیں انسانوں نے سزا دی ہے نہ کہ قوانین نے۔ لیکن اگر تم بدی کے عوض بدی کرو اور نقصان کے بدلے نقصان پہنچاؤ ان معاہدوں کو جو ہم سے کئے ہیں توڑ دو اور ان لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک کرو جن سے تمہیں خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیے یعنی اپنے اپنے دوستوں کے، اپنے ملک کے اور ہمارے ساتھ تو جب تک تم زندہ ہو ہم تم سے بیزار رہیں گے اور ہمارے بھائی یعنی عالم زیریں کے قوانین تمہیں دشمن سمجھیں گے اس لئے کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے ہمیں برباد کرنے کی پوری کوشش کی ہے اس لئے تم ہماری بات مانو اور کریٹو کی نہ مانو۔"

یہ ہے پیارے کریٹو وہ آواز جو میرے کانوں میں آ رہی ہے جس طرح نے کی آواز صوفی کے کانوں میں آتی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ صدا میرے کان میں اس طرح گونج رہی ہے کہ میں اور کوئی صدا سن ہی نہیں سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اگر تم اور کچھ کہو گے تو بالکل بے کار

ہوگا۔ پھر بھی اگر کچھ کہنا ہو تو کہو۔

ک — مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، سقراط۔

س — تو پھر مجھے چھوڑ دو کریٹو کہ میں خدا کی مشیت کو پورا کروں اور جدھر وہ لے جائے چلا جاؤں۔

"کاروباری تعلیم کے خطرات

(سید وقار عظیم ایم۔ اے۔ جامعہ)

مضمون شروع کرنے سے پہلے ہی مجھے اس بات کا احساس ہے کہ مضمون میں کاروباری تعلیم کے جن خطرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ان سے کہیں زیادہ خطرناک میرے مضمون کی سرخی ہے اس لئے کہ پڑھنے والے مضمون کو پڑھنا شروع کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر چکے ہوں گے کہ میں کاروباری تعلیم کے خلاف ہوں اور اس جگہ ایک ایک اس کی خرابیاں بیان کروں گا۔ اس لئے ناظرین سے سب سے پہلے تو یہ استدعا ہے کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ اس لئے کہ میرے خیال میں تعلیم کی نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی اور ہر اس قسم کی ضرورت کا حل اگر ہمارے پاس ہے تو صرف اسی قسم کی تعلیم ہے جس میں بچے مدرسوں سے اپنی نمایاں خصوصیات و ضروریات کے مطابق، زندگی کے مختلف کاموں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو کر نکلیں۔

کاروباری تعلیم صرف اس لئے سب سے اچھی نہیں کہ وہ بچوں کی ہر نفسیاتی اور فطری ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوق تعمیر کی تکمیل کرتی ہے۔ انھیں ایک آزاد فضا میں رہ کر اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پلنے اور بڑھنے کا موقع دیتی ہے۔ ان میں شرکت عمل، ہمدردی، رواداری، محبت، کے جذبات کا صحیح احساس پیدا کرتی ہے۔ انھیں زندگی کے صحیح مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔ ان کی سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی قوتوں کو بیدار کر کے، ان پر جلا کرتی ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے سب سے اچھی ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے صحیح راستے پر چلاتی ہے۔ اس کے تجربات میں عملی اضافہ کرتی ہے۔ اور انھیں اس کی زندگی کا جزو بناتی ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق کاروباری تعلیم حاصل کرنے کے بعد، جو نوجوان زندگی کی راہوں میں قدم رکھیں گے اور اپنے مخصوص کاموں میں حصہ لیں گے، انھیں ایک تو اس لئے خوشی ہوگی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے انھیں حقیقی دلچسپی اور فطری لگاؤ ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ انھیں زندگی میں اپنے مرتبے کا صحیح اندازہ ہوگا۔ وہ یہ سوچیں گے کہ نظامِ حیات کو کل

بنانے میں ان کا بھی تھوڑا بہت حصہ ہے۔ اور زندگی کا پہیہ اس وقت تک روانی کے ساتھ حرکت نہیں کر سکتا، جب تک اس میں ان کا بھی ہاتھ نہ لگے "خود آگاہی" اور خود اعتمادی کا یہ جذبہ اس کی انفرادیت کی تکمیل ہے۔ اور ہر سوسائٹی کے ہر فرد کی تکمیل کا لازمی نتیجہ ہے خود سوسائٹی اور اس کے نظام کی ترقی، تکمیل اور معراج۔

موجودہ زمانہ میں زندگی کی دوڑ بے حد دشوار ہے۔ اس کے ہر قدم پر ایک کانٹا، اور ہر منزل پر ایک نئی رکاوٹ ہے۔ اس لئے کوئی سوسائٹی اس وقت تک تیز رو قوموں کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک اس کے افراد میں خود اعتمادی کے ساتھ اس تگ و دو میں شریک ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو کچھ ہو رہا ہو تصور کے نزدیک اس سے بہتر ممکن نہ ہو۔ جب تک ہر شعبہ میں تکمیل نہیں، مکمل سوسائٹی کی تکمیل بھی غیر ممکن ہے لیکن ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں ہر شخص صرف وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے تو ہر شعبہ اتنی ہی ترقی کرتا ہے، جتنی تصور کے نزدیک ممکن ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے سوسائٹی کی ترقی اور بہبودی، زندگی کی دشوار دوڑ میں شرکت اور کامیابی کا امکان۔ اس لحاظ سے بھی "کاروباری" تعلیم کا تصور بہترین ہے۔

انفرادی اور مجموعی حیثیت سے، یا یوں کہیئے کہ افراد کی ترقی اور قوم کی ترقی دونوں کے لحاظ سے "کاروباری" تعلیم تعلیم کے دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں کہیں اچھی ہے۔ لیکن حقیقت میں تعلیم کو "کاروباری" نقطۂ نظر سے دیکھتے وقت تعلیمی رہنماؤں کے سامنے نہ تو شخصی تکمیل کا تصور ہوتا ہے اور نہ قومی۔ نہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ تعلیم فطرت کے اصول کے مطابق ہے، نہ انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں نفسیات کے نکات پوشیدہ ہیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے افراد اس قابل ہو سکیں کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ان لوگوں کو سہارا دے سکیں جو سوسائٹی کے موجودہ نظام میں ان کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کے رشتے ان کے دم کے ساتھ ہیں۔ تعلیم کا عموماً یہی مقصد رہا ہے کہ قوم کا ہر شخص اسے حاصل کرنے کے بعد اپنی روزی کما سکے اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مقصد بہت اچھا ہے۔ اور ہم اپنے گردوپیش "زندگی کے دن پورے کرنے والوں" کے ان گنتی ڈھانچوں کو دیکھ کر اس مقصد کے افادی پہلو کو اور بھی زیادہ قابل قدر سمجھنے لگے ہیں۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس صاحب درد کے ہم آواز بن کر جو زندگی کے غمناک پہلوؤں اور افسردگیوں کو تعلیم کی خرابیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے، پورے جوش کے ساتھ اس کے علم انقلاب کے نیچے آجاتے ہیں۔ لیکن کسی انقلابی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مانا کہ ہماری زندگی کی تمام تر خرابیوں کی ذمہ داری ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم پر ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کا ڈھانچہ بھی شروع سے آخر تک "کاروباری" تصورات پر بنایا گیا ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے تعلیم کے ان بلند مقاصد سے بالکل محروم ہیں، جو قدیم زمانے میں تعلیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان کی "انفرادی" صلاحیتیں مردہ، ان کی شخصی قوتوں کا سرچشمہ خشک اور قوت فکر و عمل پابہ زنجیر۔ تعلیم ان میں فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے، نہ انھیں زمانہ کی ترقیوں کا ہمسفر ہونے کے قابل بناتی ہے، اور نہ ان میں قومی اور ملکی روایات کی جھلک باقی رکھتی ہے۔ یہ اس لئے کہ "تعلیم یا علم" میں بذات خود کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ خرابی ہے صرف مقصد کی ہمارے موجودہ مدرسوں کی تعلیم کا مقصد صرف "کاروباری" ہے اور بے حد محدود حد تک "کاروباری" ہے۔ اسے زندگی کی حقیقتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، اور اسی لئے وہ بچے کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے دنیا "بیکاروں" اور "ناموزوں" انسانوں سے بھرتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے صرف اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ دفتروں کے بابو بن سکیں۔ "دفتر کا بابو" کوئی حقیر چیز نہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ دفتر کے بابوؤں کی تعداد بھی تھوڑی ہی سی ہے۔ اور خدا نے ہر شخص میں "دفتر کا بابو" ہونے کی صلاحیتیں تو نہیں پیدا کیں۔

اس لئے اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بیکاروں کی تعداد کم ہو اور کم ہوتے ہوتے بالکل باقی نہ رہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ

دنیا میں ایسے آدمی نہ دکھائی دیں جو اپنے ماحول کے لئے "ناموزوں" ہیں یا جو اپنے آپ کو دنیا سے بالکل بیگانہ اور بے واسطہ سمجھتے ہیں۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر شخص وہ کام کرے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ ہر شخص دفتر کا بابو نہ بنے۔ بلکہ اپنی فطری دلچسپی کے مطابق زندگی کے دوسرے مشاغل میں حصہ لے۔ اور دوسروں کا ہاتھ بٹا کر، زندگی کے نظام کو مکمل بنانے میں مدد دے۔ یہ ہے سب سے اہم مقصد جسکی بنا پر ہم اپنے مدرسوں کو "کاروباری" بنانا چاہتے ہیں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ نفسیات، اور فطرت کے اصول مختلف حیثیتوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔

ہر احساس دل چاہتا ہے کہ جلد وہ دن آئے جب ملک بھر میں اس طرح کے مدرسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھل جائیں۔ اور ملک کا ہر بچہ ان میں جاکر آزادی کی فضا میں پروان چڑھے۔ کھیل کھیل کر زندگی کی ضرورتوں میں حصہ لینے کے قابل ہو۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دے اور جوان ہو کر زندگی کے سفر میں گامزان ہو۔ بے شک بڑا مبارک وقت ہوگا جب ہمارے ملک کی فضا اس طرح بارونق نظر آئے گی —— لیکن زیادہ حساس دل یہی سمجھتے ہیں کہ اس مبارک وقت کا پیش خیمہ کچھ بدشگونیاں بھی ہوں گی۔ تصوّر کو ان پھولوں میں کانٹے چھپے ہوئے نظر آرہے ہیں اور ہمیں انھیں کانٹوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ انھیں خطروں کی روک ضروری ہے۔

سب سے پہلا خطرہ تو یہی ہے جس کا ہم آج شکار ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ بچے انگریزی پڑھیں اور نوکریاں حاصل کرنے کے قابل ہوں۔ بچوں نے انگریزی پڑھی انھیں نوکری ملی قوم کو ایک سیدھا راستہ مل گیا۔ ایک بھیڑ ادھر گئی تھی اس لئے سب ادھر گئیں۔ اور یہ مرض ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہوا ہم تک آیا۔ "جب سب نے انگریزی پڑھ لی" تو ہر ایک کو نوکری ملنی بند ہوگئی۔ بظاہر یہی انجام مہلک ہے لیکن اس سے زیادہ یہ ہوا کہ جب مشرق کے دماغوں میں مغرب کے اصول ٹھونسے گئے، مشرق کی تاریخ کے بجائے مغرب کی تاریخ پڑھائی گئی۔ کالیداس، انیسؔ اور غالبؔ سے زیادہ شکسپیر کی پرستش ہونے لگی۔ ہندوستان کے قدیم فلسفے کی جگہ برگساں، ہیگل اور سوپنہار کے فلسفیانہ نظریوں نے لی تو تعلیم کا اخلاقی تعمیری اور تمدنی

مقصد فوت ہوگیا۔ اور قوم کے بچے اپنے ملک کی معاشرتی اور تمدنی روایات سے بیگانہ ہوکر ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جو ان کی فطرتوں کے منافی تھیں۔ انفرادی اور شخصی ترقی کا خاتمہ ہوگیا اور اس سے قوم اور ملک کی ترقی کو بہت بڑا دھکا لگا۔

اس لئے اپنے مدرسوں کو افادی پہلو سے "کاروباری" بنانے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے بلند مقاصد بھی سامنے رہیں۔ زندگی صرف اس کا نام نہیں کہ انسان کچھ کما کر کھانے کے قابل ہو جائے مقررہ وقتوں پر کام و دہن کی لذت سیرابی کو اپنا مقصد سمجھے۔ سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اسکی کہ وہ زندگی کے تنوع کے مفہوم کو سمجھے۔ اسے اپنے گردوپیش کی چیزوں میں حیات کی روح افزا کیفیتیں نظر آئیں۔ فطرت کی رنگینیاں اس کی زندگی کو زیادہ قابل رشک بنا سکیں وہ اپنی قومی اور ملکی روایات کا آئینہ دار ہو ان کا تصور اسے زندگی کو زیادہ قیمتی سمجھنے پر مجبور کرے۔

اس نقطۂ نظر کو چھوڑ کر بھی اگر ہم صرف افادی پہلو سے دیکھیں تو "کاروباری" تعلیم کا مقصد اتنا محدود نہیں ہونا چاہئے کہ مدرسوں سے نکلنے والے نوجوان ایک خاص قسم کا کام کرنے کی مشین بن کر نکلیں انھیں اپنے اوزاروں اور مشینوں کا غلام نہیں بن جانا چاہئے۔ اوزار اور مشینیں ان کے لئے ہیں وہ اوزاروں اور مشینوں کے لئے نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ جو کام وہ سیکھ کر نکلے ہیں، اس کے قومی پہلو سے بھی واقف ہوں۔ انھیں صرف یہ خیال نہ ہو کہ وہ ایک کام صرف روپے کمانے کے لئے کر رہے ہیں، بلکہ ان کے پیش نظر یہ خیال ہونا چاہئے کہ انسانی زندگی میں ہمارے کام کی یہ اہمیت ہے اور اس لئے ہم یہ کام کرکے قوم، ملک اور انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص قسم کے چکر کا شکار نہیں ہو جانا چاہئے اس ترقی کرتے ہوئے زمانہ کو ضرورت ہے ایسے لوگوں کی جن میں اپنے مخصوص کام کی مہارت کے علاوہ، آزادیٔ عمل، جدت، قوت فیصلہ، خود اعتمادی اور سب سے زیادہ اپنے آپ کو بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زمانہ آگے بڑھ جائے اور وہ ایک پرانی لکیر کے فقیر بن کر ایک خاص گھیرے میں محدود رہ کر کام کرتے رہیں۔ زمانے

کی ضرورتیں ہر چیز کو تیزی کے ساتھ بدل رہی ہیں۔ خصوصاً مشین اور سائنس کے اس عہد میں زمانہ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ سست فکر آدمی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جن میں ہر نئی ضرورت اور تبدیلی کا احساس اور اس کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہی اس زمانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس لئے بھی تعلیم کے نقطۂ نظر کو محدود بنانے سے کام نہیں چل سکتا۔ صرف اس لئے کہ سڑک پر لگا بجلی کا کھمبا ہماری ضرورتوں سے، آسمان کے تارے کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے، اگر ہم بجلی کے قمقمے کے حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنا لیں گے تو ہماری ہر قوت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے تعلیم میں مقصد کی بلندی کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ ہر کاروباری تعلیم میں کم و بیش یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خطرہ سے بچنا بہت سخت ضروری ہے۔

ہماری تعلیم اس مقصد میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ مدرسوں میں بچوں کو مادری زبان، قومی ادب، قومی تاریخ اور ملک کی قدیم روایات سے اچھی طرح واقف کرنے کے علاوہ، انھیں برابر فکر و عمل کا موقع دینا ضروری ہے۔ ان میں مختلف قسم کی اخلاقی قدروں کا صحیح احساس بے حد اہم چیز ہے۔ ان سب چیزوں سے سب اچھے مدرس واقف ہیں اور جو واقف نہیں بھی ہیں، وہ ان طریقوں پر عمل کریں گے جو ہمارے تعلیمی مفکر اس مقصد کی تکمیل کے لئے بنا رہے ہیں۔ لیکن مدرسے کے علاوہ، ایک دوسری چیز ہے جس کی مدد سے تعلیم کے بلند مقاصد کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہے یونیورسٹی۔

مدرسے کا مقصد بہت بڑی حد تک یہ ہونا چاہئے کہ وہ بچوں کو ان کی فطری ضرورتوں اور صلاحیتوں کے مطابق، زندگی کی کشمکش اور جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیار کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے بلند مقاصد کو بھی جاری رکھے۔ لیکن "کاروباری" تعلیم مدرسے میں ختم ہو جانی ضروری ہے۔ اتنے دن میں قوم کے بچوں کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے جو کہ وہ قوم کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے میں شریک ہو سکیں۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی ہوں گے جو فطرتاً فنون لطیفہ ادب و شعر تاریخ

فلسفہ کے لئے زیادہ موزوں ہیں، انھیں بھی "کاروباری" تعلیم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا ایک دوسری مہلک غلطی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع ملنے چاہئیں۔ تاکہ وہ مدرسے سے نکل کر کالج اور یونیورسٹی کی زیادہ آزاد فضا میں اپنی فطری دلچسپیوں کو سیراب ہونے کا موقع دیں۔ یونیورسٹی کو "کاروباری" زندگی سے الگ رکھ کر اسے صرف علم و فن، ادب و شعر، فلسفہ و تاریخ کے نکات کا سرچشمہ بنانا چاہیئے۔

اجتماعیت کے ربط خاص کے ساتھ

(مترجمہ مولوی برکت علی فراق - بی اے جامعہ)

یہ مسٹر جوڈ کی کتاب *An Introduction to Modern Political Theory* کے ترجمے کا ایک باب ہے۔ یہ سیاسیات پر ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ عام مطالعہ کیلئے مختلف سیاسی نظریے سلیس عبارت میں پیش کریں اور کامیاب بھی ہوئے ہیں یہ رسالہ اپنی جامعیت اور اسلوب بیان کی باعث بہت مقبول ہوا ہے۔

تمہید:-

ایک چھوٹے سے رسالے میں اشتراکیت کا پورا پورا بیان جو اس کے سارے نظام پر حاوی ہو، ذرا مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول لفظ اشتراکیت سے جہاں نظریات کا ایک نظام مراد ہے وہاں اس سے ایک سیاسی تحریک کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ گو ہمارا خاص موضوعِ بحث اشتراکیت کا نظریہ ہی ہوگا مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس بحث میں اشتراکیت کی متعدد تحریکوں کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو۔ دوسرے نظریات کا یہ نظام جسے صحیح یا غلط، اشتراکیت کہا جا سکتا ہے کلیتہً سیاسی نہیں ہے اور کلیتہً کیا خصوصی طور پر بھی نہیں یہ نظام بڑی حد تک معاشی ہے۔ پھر معاشی اور سیاسی نظریات باہم کچھ اس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں کہ عملی طور پر ہمارے امکان سے یہ چیز باہر ہے کہ ہماری بحث اشتراکیت کے سیاسی پہلوؤں ہی تک محدود رہے۔

ایک تیسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اشتراکیوں کے متعدد مذاہب میں جو آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، ہر مذہب ایک دوسرے سے مقاصد اور طریق کار

میں نہایت خفیف اختلاف کی وجہ سے الگ رہتا ہے۔ ان مذاہب کی بعض حالات میں کافی اہمیت بھی ہے اور وہ نظریات جن کی یہ وکالت کرتے ہیں، بڑی خوبی سے واضح کردئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ان کے حامیوں کے ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز القاب قائم ہوگئے ہیں، وہ اشتراکی نہیں ہوتے، بلکہ سنڈیکلسٹ، پنچایتی اشتراکی یا اشتمالی کہلانے لگتے ہیں۔ اشتراکیت کے ان ارتقائی مذاہب کا ذکر الگ الگ ابواب میں ہوگا۔ اشتراکیت کی بحث اس لحاظ سے بھی مختلف ہوگی کہ اس نظرئے تک پہنچنے کے لئے کیا راہیں اختیار کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اشتراکیت پر اس معنی میں بحث کرسکتے ہیں کہ یہ انفرادیت کے ردعمل کا ایک نتیجہ ہے یا اس معنی میں کہ یہ کارل مارکس کے نظریات کی ایک تفسیر ہے۔ غرض بحث کا ہر طریقہ جو اختیار کیا جائے گا، اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت پر دال ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طریق بحث ایک مختلف تصویر پیش کرے گا۔ یہ بات غالباً ہر نظرئے کی بہ نسبت اشتراکیت میں سب سے زیادہ ہے کہ جو بھی اس کا حامی ہے، اس کے ذہن میں اشتراکیت کا ایک سب سے الگ مفہوم ہوتا ہے اور ہر مفہوم مطابق ہوتا ہے اس کے حامیوں کی افتادِ طبیعت اور موجودہ نظام کی افراط و تفریط کے متعلق اس زاویۂ نگاہ کے جس کے ماتحت وہ حمایت کرتے ہیں۔ چونکہ اشتراکیت کے حامیوں کی تعداد کثیر ہے، اور ان میں بعض چھوٹے چھوٹے سیاسی رسالوں کے بلند پایہ مصنف ہوئے ہیں اس لئے اس موضوع پر تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے کہ اشتراکیت کے صحیح اجزا کیا ہیں۔ مختصراً یہ کہ اشتراکیت اس حسن کی مانند ہے جو ہر بوالہوس کی پرستش کی وجہ سے اپنی اصلیت کو کھو بیٹھا ہے۔

پھر چند ایسے مقاصد قائم کرلئے گئے ہیں جو بیشتر اشتراکیوں کے نزدیک خاطر خواہ ہیں، خواہ ان ذرائع کی نوعیت سے وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں جن سے ان مقاصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اشتراکی تصورات کا ایک اور مذہب بھی ہے جسے اجتماعیت یا ریاستی

اشتراکیت (State Socialism) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس مذہب کا ابھی زیادہ زمانہ نہیں ہوا زوال ہو چکا ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ ایک مرکزی نظریہ بھی ہے اور دوسرے نظریات کے لئے ایک مرکز آغاز بھی۔

بہرحال ہم اس عام اشتراک خیال کو جو اشتراکیت کے ہر مذہب میں یکساں پایا جاتا ہے۔ بنیاد بنا کر اس باب میں اشتراکیت پر بحث کریں گے۔ یہ اشتراکِ خیال جس حد تک ریاستی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے، ہماری بحث میں بیشتر اسی سے تعلق رہے گا۔

سب سے پہلے اشتراکیت کے ان مقدمات پر غور کیا جائے گا جن پر نظام اشتراکیت کا انحصار ہے، پھر اس کے اجتماعی اور سیاسی فلسفے کا ایک خاکہ دیا جائے گا اور آخر میں چند تجاویز کو بیان کیا جائے گا جن سے اشتراکیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ حتی الوسع ہم اپنی بحث کے لئے انہی تجاویز کا انتخاب کریں گے جو خفیف تبدیلیوں کے ساتھ ہر مذہب کے نزدیک قابل قبول ہیں۔

۱۔ اجتماعی اشتراکیت کے مقدمات :-

(الف)۔ کارل مارکس کی تصانیف۔ کارل مارکس حقیقت میں اشتراکیت کا باوا آدم ہے (برطانوی اشتراکیت کے معاملہ میں یہ دعویٰ کسی قدر تبدیلی کا محتاج ہے۔ مارکس یورپ کے لگ بھگ تمام اشتراکیین اور چند برطانوی اشتراکیین کے لئے مرکز ہدایات ضرور رہے۔ مگر دوسرے مذاہب اور خاص طور پر فیبین اشتراکیوں کے لئے ہاکن، اووین، اور رسکن بہ حیثیت ماخذ کے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں)

مارکس سے پہلے، واقعہ یہ ہے، بے شمار نظریہ ساز مفکر تھے جو جماعت کی موجودہ حالت سے بیزار ہو کر معاشرت کے مثالی نظامات گڑھا کرتے تھے جس میں ملکیت مشترک سمجھی جاتی تھی اور بے انصافی کا نام تک نہ تھا۔ یہ لوگ انہی ذہنی تعمیروں کے ذریعے اپنی بھڑاس نکالا کرتے تھے۔ افلاطون کی "ریاست" (Republic) بھی انہی مثالی معاشرتوں میں سے

ایک کہی جا سکتی ہے۔ رابرٹ اووین کی طرح کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے تصورات کو جامہ شکل میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ نمونے کی بستیاں بساتے تھے جن کے بسنے والوں کو اسی خاص قسم کی زندگی گذارنے کی ترغیب دی جاتی تھی جو ان کے بانیوں کے نزدیک انسانی زندگی کا بہتر سے بہتر نمونہ تھی اس قسم کے تجربے بلا استثناء ناکام رہے۔ اووین کو کسی حد تک مستثنیٰ کرکے مارکس سے پہلے اس قسم کے اشتراکی مصنفوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا کہ جماعت کا جو معیاری نظام وہ پیش کرتے ہیں وہ وجود پذیر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ نہ اس مسئلے کو سلجھایا گیا کہ اگر وہ نظام قائم ہو جائے تو اسے باقی رکھنے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جانا چاہیئے۔ بیشتر مفکر جن میں اووین اور فارئے بھی تھے اسی اعتماد کے ساتھ جو ایک الہامی صاحب نظریہ کو اپنے اوپر ہو سکتا ہے، یہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلا دیں کہ جب تمام بنی نوع انسان ان کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود بخود اپنی مرضی سے مجبور ہو جائیں گے اس وقت ان کی اسکیمیں اپنی مکمل صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ ان تصوری معاشرت کے بانیوں میں سے بیشتر کی زندگیاں ناکامیوں اور نامرادیوں سے پر ہیں۔

غرض مارکس پہلا اشتراکی مصنف ہے جس کی تصنیف کو علمی کہا جا سکتا ہے۔ جس قسم کی جماعت کی اسے تمنا تھی، اس کا اس نے صرف خاکہ ہی نہیں تیار کیا ہے بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ ان مراحل کا بھی ذکر کیا ہے جن سے گذر کر اس کی تکمیل ہونی ہے۔

مارکس کی تصانیف عام اس سے کہ مزدور پیشہ طبقے پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا، پیچیدگی سے خالی نہیں ہیں اور ان کی صحیح تعبیر کے مسئلے پر بہت شدید اختلاف رائے ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ مختلف تعبیرات جن کے لئے ان تصانیف میں گنجائش نکل سکتی ہے، اشتراکیت میں مختلف مذاہب کے قیام کا باعث ہوئی ہیں۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لئے صرف یہ کافی ہوگا کہ مارکس کے دو نمایاں اور اہم نظریات کی

تشریح کر دی جائے۔ اور ان پر جو حاشیہ آرائیاں اور تعبیریں ہوئی ہیں، ان کو دوسرے ابواب کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ ان میں سے ایک ہے نظریۂ قدر (Theory of Value) اور دوسرا تاریخ کا مادی تصور (Materialistic Conception of History)

۱۔ نظریہ قدر زاید :۔

مارکس انیسویں صدی کی جامد معاشیات کے اس نظریے کو کہ "قدر کا ماخذ محنت ہے" مسلمہ طور پر تسلیم کرتا ہے۔ وہ اسی نظریے پر تحقیق کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو قدیم معاشیین کے نتائج کے بالکل برعکس پڑتے ہیں مارکس کی تعبیر کے مطابق یہ نظریہ حسب ذیل ہے

سرمایہ دار جماعتوں کی دولت اصل میں اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ اشیاء قدر رکھتی ہیں اور یہ قدر اسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے وہ اشیاء انسانی ضروریات کی تکمیل کی اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ان کی قدر ان کے افادہ کے تناسب سے ہوتی ہے۔ ہم کسی چیز کے افادے کی مقدار اس کی صلاحیت مبادلہ کے مطابق متعین کرتے ہیں، چنانچہ مارکس اسی اصول کے مطابق ایک دوسرے کے مقابلے میں اشیاء کی قدر کو واضح کرنے کے لئے قدر مبادلہ (Exchange Value) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ قدر مبادلہ جسے عام طور پر قیمت کہا جاتا ہے، بازار کے حالات کے مطابق چڑھتی اترتی رہتی ہے لیکن یہ اتار چڑھاؤ اتفاقی ہوتا ہے خود اشیاء کی صلاحیت کو جس سے اس کی قدر یا یوں کہئے اس کی قدر مبادلہ متعین ہوتی ہے کو ختم کرنا تو کیا، کم بھی نہیں کرتا۔ یہ صلاحیت نام ہے اس محنت کی اوسط مقدار وقت کا جو اس چیز کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ گویا محنت کے وقت کی مقدار جو اشیاء کی پیدائش کے لئے اجتماعی حیثیت سے لازمی ہے، قدر مبادلہ کا اصلی معیار یا پیمانہ ہے اور قدر ہائے مبادلہ کے غیر اہم تغیرات کے باوجود اپنی جگہ اسی طرح مستحکم اور اٹل ہے جس طرح فطرت کا کوئی مستحکم قانون۔"

مگر انسان کی محنت آپ سے آپ کوئی قدر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے اسے آلات

واوزار استعمال کرنے ہوں گے جن کے بغیر محنت اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔ ان آلات واوزار میں مشینیں ہیں، کارخانے ہیں، بھاپ کی طاقت ہے، بجلی ہے اور اسی طرح کے بے شمار اور آلات۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں بے شمار ایجادیں ہوئیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قدر کی پیدائش کے لئے ان آلات میں کام کردگی اور تعداد دونوں اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے اور ان پر ایک نسبتاً چھوٹے سے طبقے کا جسے سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے، قبضہ ہے۔ سرمایہ دار ننگے بھوکے مزدوروں کی محنت کو خریدتا ہے اور اسے اپنی مشین اور خام اشیاء پر لگا کر ایسی اشیا تیار کرتا ہے جن میں مبادلہ کی قدر موجود ہوتی ہے۔ یعنی ایسی اشیاء جنھیں اتنی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے جو مزدور کی اجرت اور کارخانے کے مصارف کے مجموعے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اشیاء کی اس قدر مبادلہ اور مزدور کی محنت کی قیمت میں جو فرق ہوتا ہے اسے قدر زائد (Surplus Value) کہتے ہیں۔ یہ قدر زاید مزدور کی محنت سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا فائدہ اٹھاتا ہے سرمایہ دار آجر۔ یہ حقیقت میں وہ دولت ہے جو مفت کی محنت کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔

قدر زائد پر سرمایہ دار کا یہی غاصبانہ قبضہ ہے جو موجودہ صنعتی نظام کی صاف وصریح بے انصافی ہے اور جسے اشتراکیت کا ہر مذہب دور کرنا چاہتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام حقیقت میں یک غلامانہ نظام جماعت ہے جو صرف صورت ہی میں مختلف ہے۔ غلام بھی اپنے آقاؤں کے لئے قدر زائد پیدا کرتے تھے لیکن جبر کے ساتھ۔ موجودہ زمانے کا مزدور قدر زائد ایک آزادانہ معاہدے کے ماتحت پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ مزدور کے پاس دولت آفرینی کا اپنا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے، اس کے لیے، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ سرمایہ دار کے ہاتھ اپنی "شے" یعنی محنت بیچ دے۔ سرمایہ دار اس کے بدلے میں اسے سدر مق کے لئے تھوڑی سی اجرت دے دیتا ہے اور اس کی محنت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے، اسے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔

(۲) تاریخ کا مادی تصور :-

اس کے بعد مارکس تاریخ سے اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ جماعت کس طرح ایک ایسے نہج پر منظم ہوئی جس میں ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ نہایت استقلال کے ساتھ قانون کی پشت پناہی کے ذریعے قدر زائد کو غصب کر رہا ہے جو نتیجہ ہے مزدوروں کی محنت کا۔ اس سوال کا جواب تاریخ کے مادی تصور کے ذریعے ملتا ہے۔ مارکس پہلا مفکر ہے جس نے اس بات کو غیر معمولی اہمیت دی کہ تاریخ میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کا تنہا محرک معاشی حقائق ہوتے ہیں۔ دوسرے مفکرین ان واقعات کا محرک شخصی حوصلوں، شاہی درباروں کے اثرات، یا سیاسی غصب و اقتدار کو ٹھہراتے ہیں، لیکن مارکس کا دعویٰ یہ تھا کہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جایئے تو آخر تمام سیاسی رجحانات کے پیچھے معاشی مصالح نظر آئیں گے جو ان تاریخی واقعات کا سبب بنے۔ گویا تاریخ کی اس تعبیر کی رو سے مثلاً کا یونانیوں کو ٹرائے لے جاکر پاریس سے جو ہیلن کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا تھا، بدلہ لینا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے رومیوں کا یہ مقصد تھا کہ مشرق سے تجارت کرنے کے لئے ایک نیا راستہ دریافت کیا جائے۔ ہاں تو تاریخ کا تعین آخری مرحلے پر معاشی محرکات سے ہوتا ہے۔ اور انسانی جماعت کے ارتقا کی ہر منزل میں مادی ارتقا کی ایک منزل نظر آئے گی جس پر وہ ایک خارجی دنیا میں ہو کر پہنچی ہے۔

اس طرح ہر منزل جو معاشی محرکات کے زیر اثر آئی، اس میں ساتھ ہی ساتھ ایک مناسب وقت سیاسی نظام اور ایک طبقہ وارانہ ڈھیر بھی موجود تھا۔ انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کے ذریعے معاشیات کو جو غیر معمولی فروغ ہوا، اس کے زیر اثر (۱) ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ الگ پیدا ہو گیا جو ذرائع دولت آفرینی پر قابض تھا اور (۲) ایک محروم الملک مزدوروں کا طبقہ الگ پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی انقلاب سے پہلے بھی آجر اور مزدور تھے اور چھوٹے پیمانہ کے سرمایہ دار بھی تھے، مگر جدید جماعت کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ ہے سرمایہ دار کا بہ حیثیت ایک طبقے کے اقتدار، ریاست کی ایسی ساخت جو اس اقتدار کو مؤثر بنائے، اور

مزدوروں کا پورے معاشی نظام میں سرمایہ داروں سے مقابلہ۔ یہ مہلک مقابلہ اور دونوں طبقوں کے مفادات کا تضاد جو اس مقابلے کا سبب ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان اس کشمکش اور جھگڑے کو آگے بڑھاتا جارہا ہے جسے عرف عام میں "طبقہ وارانہ جنگ" کہتے ہیں۔

لیکن جماعت کوئی قائم اور جامد چیز نہیں ہے۔ یہ ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ جماعت کے ارتقا کی سرمایہ دارانہ منزل اسی تبدیلی اور گردش کے ماتحت جب وقت آجائے گا، ختم ہوجائے گی اور دوسری منزل آجائے گی۔ سرمایہ داری نظام کی مستقبل میں یہ شکل ہوگی کہ سرمایہ چند سے چند ہاتھوں میں مجتمع ہوجائے گا اور ایک طرف چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار بتدریج ختم ہوجائیں گے اور دوسری طرف محروم الملک مزدور روز افزوں بڑے پیمانہ پر منظم اور ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ جب یہ صورت حال عروج پر پہنچ جائے گی تو مزدور طبقہ آگے بڑھے گا اور سرمایہ دار طبقے کو ختم کردے گا، اور جس طرح سرمایہ دار نے حقوق یافتہ خاندانی طبقوں کو جو پہلے صاحب اختیار تھے الگ کردیا یا اپنے اندر جذب کرلیا، اسی طرح یہ مزدور طبقہ سرمایہ داروں کو ذرائع دولت آفرینی سے محروم کردے گا۔

اس نظریے کے مطابق کہ سیاسی واقعات کے پردے میں معاشی تغیرات کا عکس نظر آتا ہے، مزدوروں کا غلبہ اپنے ساتھ ساتھ جماعتی نظام میں بھی ایک تبدیلی لائے گا اور طبقات کے باہمی امتیاز کے خاتمے کا باعث ہوگا۔

اس نظریے کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اس نے مزدور پیشہ طبقے کے خیالات پر نہایت غیر معمولی اثر ڈالا، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مارکس کو اشتراکیت کے "باوا آدم" کا پیغمبرانہ خطاب اس کے جس اثر کے پیش نظر دیا جاتا ہے اس کو قائم کرنے میں اس کے نظریۂ قدر زائد کی بہ نسبت اس نظریے (تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ) کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کی جاذبیت کا راز یہ ہے کہ یہ مزدور پیشہ طبقے کو اس جدوجہد میں ان کی فتح مندی کی بشارت دیتا ہے۔ تاریخ کا تجزیہ اگر اجتماعی ارتقا

کے اٹل اصول کے مطابق کیا جائے جس کے زیر اثر سیاسی تغیرات (جن کے پیچھے معاشی تبدیلیاں کارفرما ہوتی ہیں) رونما ہوتے ہیں، تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وقت آنے پر سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار سے محروم ہو جائے گا۔ پھر اس تمام کشمکش، طبقہ وارانہ جنگ، اور مزدور پیشہ طبقے کی تحریک کے کیا معنی؟ کیا یہ باتیں لازمی اور ناگزیر ہیں؟ کیا ارتقا تشدد آمیز اور ناگہانی تغیرات کے ذریعے واقع ہوتا ہے، یا کیا ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے کہ فطری ارتقا کی تدریجی رفتار ہی سے وہ جماعتی انقلاب جس کی ہمیں تمنا ہے آ جائے گا؟

ان سوالات کے جو مختلف جوابات دیئے گئے ہیں، ان کی بنیاد پر اشتراکیت کے دو مذہب، انقلابی اشتراکیت اور ارتقائی اشتراکیت قائم ہو گئے ہیں۔ یہ دوسرا مذہب جسے بہ حیثیت مجموعی برطانیہ عظمیٰ میں اقتدار حاصل ہے، مارکس کی تصانیف کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتا ہے۔ جماعت چونکہ ارتقا پذیر اور حامل ارتقا ہے، اس لئے وہ ایک جان دار ہستی ہے، ایک با روح جسم جو ہر جان دار ہستی کی طرح پیدا اور فنا ہوتا ہے۔ حیات و ممات دونوں تدریجی رفتار کے پابند ہیں۔ انسان کے تدبر کے ذریعے انھیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے، سہارا دیا جا سکتا ہے اور ان میں انسان کی کوششوں سے تازہ روح پیدا کی جا سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی فطرت بدل دی جائے یا ان کے دھارے میں رکاوٹ پیدا کر دیا جائے اور نہ یہی ممکن ہے کہ ان کی رفتار تیز کر کے ان میں ناگہانی طور پر ہولناک قسم کے تغیرات پیدا کئے جا سکیں۔

غرض رفتار ارتقا نام ہے اصلاحات کے ایک سلسلہ کا جو جماعت کی تدریجی رفتار کو آنے والے انقلاب کی طرف لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ انقلاب انھی اصلاحات کے مجموعے کا ایک مرکب ہوگا، وہ کسی ناگہانی تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہوگا جو ان اصلاحات کی بنیاد پر رونما ہوگی۔ ارتقائی اشتراکیت کا یہی مذہب جسے اجتماعی یا ریاستی اشتراکیت بھی کہتے ہیں، اس باب کے بقیہ حصے کا موضوع بحث ہوگا۔

بہت سے اشتراکی ایسے بھی ہیں جو مارکس کے نظریوں کی ایک بالکل مختلف تعبیر کرتے

ہیں۔ مستقبل میں صورت حال جو کچھ بھی ہو، وہ بہر حال اس حقیقت کو اہمیت دیتے ہیں کہ موجودہ جماعت دو باہم متضاد طبقوں سے مرکب ہے، ایک صاحب ملک طبقہ اور ایک محروم الملک طبقہ جن میں آپس میں کوئی اشتراکیت مفاد نہیں ہے۔ ان کے درمیان ایک بہت گہری خلیج حائل ہے جسے صرف ایک ایسا انقلاب جو جماعت کی مکمل طور پر قلب ماہیت کر دے، پاٹ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جماعت میں واقعات کی قدرتی رفتار ہی کے ذریعے تبدیلی اور ارتقا ممکن ہو، مگر اس اثنا میں مظلوم مزدوروں کی زندگیاں مصیبت و فلاکت میں بسر ہوتی ہیں اور ان میں انتظار کا یارا نہیں ہے۔ لہذا جماعت کے آنے والے انقلاب کو جلد از جلد بروئے کار لانے کے لئے ہر ممکن طریقے اختیار کئے جانے چاہئیں۔ یہ انقلاب سیاسی اور معاشی نظام کو سرے سے بدل دے گا۔ اسے ایک ایسی جنگ کے ذریعے بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس میں جنگ آزما مزدور پیشہ طبقہ تشدد اختیار کرے گا تاکہ سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔

مارکس کے نظریات کی یہ تعبیر جو اشتمالیت اور کسی حد تک سنڈیکلزم کی بنیاد ہے، آئندہ کسی باب میں زیر بحث لائی جائے گی۔

یہودی

(پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب پاٹھک)

ا۔ یہودی دنیا میں کب اور کس طرح پھیلے

بنی اسرائیل کا قومی وطن فلسطین ہے مگر آج وہ دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا یا اس کے ثبوت میں کچھ خامہ فرسائی کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے کب اور کن حالات میں نکلے۔ یہودیوں کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جبراً وطن سے نکالا گیا' یا ان کو کسی بات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا' اور یہ کہ پہلے تو وہ مشرق میں بابل کی طرف گئے' بعدازاں مغرب میں روم کی طرف چلے گئے' حقیقت یہ ہے کہ وہ وطن سے نکلے' اور کچھ تو مشرقی ممالک کی طرف چلے گئے' باقی روم وغیرہ مغربی ممالک کی طرف۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یروشلم کی تباہی بلکہ مسیح کی پیدائش سے بھی بہت عرصہ پہلے یہودی ہر ملک میں موجود تھے' "ہجرت" سے پہلے بھی ان کے "بیاج گھر" میسوپوٹیمیا کے علاقے میں پائے جاتے تھے بابل سے رفتہ رفتہ وہ مشرقی ممالک میں بڑھتے گئے۔ مغرب کی طرف اس زمانے میں ان کا سراغ یونان کے جنوب مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر آیونیا میں ایشیائے کوچک میں' اور اگر مذہبی کتب پر یقین کیا جائے تو ہسپانیہ میں بھی' جہاں کہ وہ فنیقی جہاز رانوں کی معیت میں چلے گئے تھے۔ ملتا ہے۔

اس زمانے کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے ذرا بعد کے زمانے کے متعلق متعدد ذرائع سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہزار ہا یہودیوں نے اس بنا پر وطن چھوڑنے کا ارادہ کیا کہ وہاں کھیتی باڑی اور انگور کی کاشت میں بڑی مشقت درکار ہے اور فیصلہ کیا کہ آسان آسان

اور منفعت بخش پیشے اختیار کیے جائیں۔ اس موضوع پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔
ملک شام میں سیدون اور طاروس کے مقاموں پر فینیقیوں کے پہلو بہ پہلو سب سے پہلے یہودیوں نے بستیاں بسائیں اور رفتہ رفتہ شام کے دوسرے شہروں بالخصوص انطاکیہ سلوشیا، لاوڈیشیا اور دمشق میں بھی پھیل گئے۔ وہاں سے آگے چل کر وہ ایشیائے کوچک میں جا پہنچے اور کاروانی راستوں پر یا ساحلی شہروں میں قیام پذیر ہوئے۔ مثلاً کاپے ڈوشیا فرجیا ترسوس اور طراَیس میں ـــ آیونیا میں وہ سمرنا افیس ملٹ ہالی کارنیس اور کنیڈس کے مقامات پر بالخصوص پائے جاتے تھے، اس کے علاوہ ان کی نوآبادیاں سائپرس، روڈس، ڈیلوس، پروس، کرتیا، تھیسے لونیا، کورنتھ، سپارٹا اور ایجی کا میں بھی پھیل چکی تھیں،
اٹلی میں روم کے مقام پر یہودیوں کے قیام کے متعلق سب سے پہلی قابل وثوق خبر ۱۳۹ء قبل مسیح کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہر روم میں اس سے بھی کافی مدت پہلے سے آباد ہوں گے۔ کیونکہ وہاں ان کی ایک بہت بڑی مذہبی مجلس قائم تھی۔
شمالی افریقہ خصوصاً مصر کے شہروں میں بھی یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، اسکندریہ کی آبادی میں یہودیوں کی اقلیت سب سے زبردست تھی۔ اور یہ بطلیموس لاگی کی ہی رواوار حکومت کا نتیجہ تھا کہ مصر میں یہودیوں نے جس جگہ چاہا بلا مزاحمت آباد ہوتے چلے گئے۔
اس طرح بحیرہ روم کے گرداگرد یہودی بستیوں کا دائرہ مکمل ہوا۔ یہ بستیاں باقاعدہ تجارتی شاہراہوں سے ایک دوسری کے ساتھ مربوط تھیں گاہے بگاہے فلسطین سے یہودیوں کی ایک نئی لہر اٹھتی تھی اور ان نئی بستیوں میں پھیل جاتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہودی ساحلی علاقوں کے علاوہ اندرونی تجارتی شاہراہوں پر بھی آباد ہوتے گئے۔ سٹرابو لکھتا ہے کہ "مسیح کی پیدائش کے وقت شاذ و نادر ہی کوئی مقام ایسا ہو گا جہاں یہودیوں کی آبادی اور ان کا اقتدار نہ ہو" یہ الفاظ حرف بحرف صحیح ہیں۔
مندرجہ بالا حقائق سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ یہودی اپنے آبائی وطن فلسطین

سے نہایت قدیم زمانے میں نکلے، دوسری یہ کہ یہ ہجرت ان کی اپنی ہی رضا و رغبت سے واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ کسی قوم نے ان کو اس بات پر بھی مجبور نہیں کیا کہ وہ آئیں اور ان کے وطن میں آباد ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو یا جنوں سا سوار تھا جو پہلے تو ان کو ملک بہ ملک لئے پھرتا رہا پھر چند صدیوں کے بعد اس امر کا موجب ہوا کہ یہودی مورخ ہرز فیلڈ کے قول کے مطابق وہ میڈیا سے لے کر روم تک، پونٹس سے لے کر خلیج فارس تک، اور مقدونیہ سے لے کر زنگ و حبش تک سارے ممالک میں آباد ہو گئے۔ اور اس وسیع خطہ میں کوئی علاقہ کوئی تجارتی شہر ایسا نہ رہا جس میں یہودی نہ جا پہنچے ہوں،

۲۔ تجارت اور ساہوکارہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دوسری اقوام نے کچھ اچھا سلوک نہ کیا، وہ جہاں جہاں گئے ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو لوگوں سے ملنے جلنے نہ دیا گیا لہذا ان کے پاس کسب معاش تجارت اور سود خواری کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ رہا مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہوس زر اور طمع منفعت کی وجہ سے وہ سود خوار رہے، جہاں گئے لوگوں کا خون چوسنے لگے، لہذا لوگوں نے ان کا مقاطعہ کیا تجارت بذات خود کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ موجودہ تمدن کا ایک جزو اہم ہے، ہمیں اگر ہم کوئی کلام ہے تو یہودیوں کی مخصوص طرز تجارت سے ہے۔

تاریخی حقائق یہ ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بلکہ اس سے بھی پیشتر فلسطین اور بابل کے درمیان تجارتی قافلوں کے راستے موجود تھے، حضرت سلیمانؑ آنے جانے والے سوداگروں سے ٹیکس وصول کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے ان سوداگروں کی سہولت کے واسطے دمشق اور دیگر مقامات میں منڈیاں اور بازار تعمیر کروائے تھے، ان کے زمانے میں مصر کے ساتھ گھوڑوں کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، نیز انہی کے زمانے میں فنیقیوں کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل نے مشرق بعید کے پُر اسرار اور دولت مند شہر اوفر کا مشہور سفر

اختیار کیا۔

اس شاہراہ کے علاوہ، جو دمشق سے چل کر صحرائی کنعان میں سے ہوتی ہوئی، خلیج ایکو تک پہنچتی تھی، اور بھی تجارتی راستے موجود تھے، ایک سوٹو پولس سے تمنہ تک جاتا تھا، دوسرا بھی جنبیا میں ہوکر تمنہ اور پھر وہاں سے یروشلم پہنچتا تھا یروشلم اور ایلات کی بندرگاہ کے درمیان بڑی آمد و رفت رہتی تھی، تیسرا راستہ بندرگاہ ایاپ کو جاتا تھا، یہودی ان ہی تجارتی راستوں پر آباد تھے اور از منہ قدیم سے قافلوں کے ساتھ لین دین اور بیوپار کرتے تھے، ممکن یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہت سے فلسطین کے اندرونی علاقے میں زراعتی اور صنعتی پیشوں میں مشغول ہوں گے ورنہ بصورت دیگر ان کے لئے ضروریات زندگی اور سامان خوردونوش حاصل کرنا قریب ناممکن تھا۔

یہ جب وطن کو خیرباد کہ کر باہر نکلے تو ان کی حریص نگاہوں کو جابجا حصول زرومال کے زرین مواقع نظر آئے۔ ایران میں گئے، وہاں کے زراعت پیشہ باشندے بڑے سادہ طبع تھے، بس وہیں ساہوکارہ جما کر بیٹھ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مالا مال ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد وطن کو واپس جانے کی تحریک شروع ہوئی۔ بڑی بڑی پرجوش نظمیں لکھی گئیں کہ اجڑے ہوئے وطن کو پھر سے بسانا چاہیئے۔ ایک طرف مال و دولت کے انبار، دوسری طرف فلسطین کا حوصلہ شکن ریگستان، جاتا کون؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ماسوائے چند کنگلوں اور چند ناکارہ، بوڑھے ربیوں کے، جن پر ہر شخص دباؤ ڈال سکتا تھا اور کسی نے "اجڑے وطن" کا رخ نہ کیا، اور ان کی تجارت اور ساہوکارہ مشرق کی طرف بڑھنے لگا، اور وہ لوگ وہیں آباد ہوتے گئے۔ اب جو جو ان میں سے واپس وطن پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ویران سا، غیر آباد سا ملک ہے، جس میں اناج کی کاشت کرنے کے لئے بڑی محنت، اور بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ سارا جوش وہیں بیٹھ گیا۔ وطن کی محبت پر طمع زر غالب آئی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جلد ہی وطن سے واپسی کی تحریک بھی شروع ہو گئی۔

بعض لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اطراف و جوانب کے ممالک میں بکھر گئے، جہاں ان سے کچھ روادارانہ سلوک نہ ہوا بلکہ الٹے ان کے خلاف متعصبانہ قوانین وضع کئے گئے۔ لہٰذا ان کے لئے سوائے ساہوکارے کے کسب معاش کا اور کوئی ذریعہ نہ رہا۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، یہود دوسرے ممالک میں گئے کیونکہ وہاں ان پیشوں کے لئے ان کو کافی گنجائش نظر آئی۔ یہ محض ایک اتفاقیہ امر ہی نہیں تھا کہ یہودی مشہور مشہور تجارتی مرکزوں میں ہی آباد ہوئے۔ اگر ان کو یہ خواہش ہوتی کہ محنت مزدوری کر کے روزی پیدا کی جائے، تو اول تو وہ اپنے وطن کو ہی نہ چھوڑتے اور اگر چھوڑنا بھی تھا تو بجائے پہاڑی جزیروں، ساحلی چٹانوں اور صحرائی قصبوں کے وہ کسی زرخیز خطے میں آباد ہوتے۔ مگر ہوس زر نے ان کو ایسا نہ کرنے دیا۔ یہ حقائق ناقابل تردید ہیں، اور ان کے جواز میں ہم جس قدر اور جس زمانے کے چاہیں ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی اسپین کا پہاڑی علاقہ جہاں باسک قوم آباد ہے شہروں سے بالکل عاری تھا۔ سانچو یا سانخو دانشمند (۱۱۰۹ء) نے چاہا۔ کہ اس علاقے میں آمد و رفت سے رونق ہو جائے، اس غرض سے اس نے قدیمی گشٹائز کو ایک شہر بنا دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ بیرونی ممالک کے جو لوگ اس شہر میں اپنی اشیا و اجناس فروخت کرنا چاہیں گے ان پر کوئی محصول یا ٹیکس نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کے تمام علاقہ جات سے یہودی جوق در جوق اس شہر میں آنے لگے تاکہ اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایران میں عباس صفوی مسند آرا سلطنت ہوئے تو دیکھا کہ باہم خانہ جنگیوں نے مملکت کو ویران کر دیا ہے۔ چاہا کہ اس کی مالی حالت کو بہتر بنائے۔ اس غرض سے اس نے بیرونی ممالک کے سوداگروں کو وسیع مراعات دیں نتیجہ یہ ہوا کہ اوروں کے علاوہ یہودی بھی بے شمار تعداد میں آن وارد ہوئے۔ یہی حال پولینڈ، بوہیمیا اور دیگر ممالک میں ہوا۔ ان حقائق سے یا تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے دل جذبۂ حب وطن سے عاری ہیں۔ یا یہ کہ ہوس زر نے

اس جذبہ کو محض کر نفس کے کسی تنگ و تاریک کونے میں چھپا دیا ہے اور ان کی سرشت میں آوارگی بھر دی ہے کہ جہاں سود خواری اور تجارتی ہیر پھیر کا داؤ لگتا نظر آئے اسی طرف کو کھچ جائیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ لت ان کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہے، یہ کہنا کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے انھوں نے یہ عادات اختیار کیں محض بے بنیاد ہے۔ اینگلو سیکسن، سیکنڈ نیوین اور جرمن قوم کے لوگ بھی بیرونی ممالک میں گئے۔ عرق جبیں اور محنت بازو سے غیر آباد علاقوں کو آباد کیا، قابل زراعت بنایا اور انھیں اپنا وطن سمجھ کر لوگوں میں مخلوط ہو گئے۔ ان کے دوسرے بھائی جو وطن میں رہ گئے، حقائق ارضی و سماوی کے مشاہدات میں مصروف، کائنات کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے۔ مگر بنی اسرائیل اس اثنا میں عمدہ عمدہ تجارت خانوں اور منڈیوں کے انتخاب میں مصروف رہے۔

قرون اولیٰ میں بابل کا علاقہ، جسے آج کل عراق کہتے ہیں، تجارت کا مشہور مرکز تھا جہاں پر ہندوستان، چین اور دیگر دور دراز ممالک سے سوداگروں کے قافلے آتے تھے اور اپنے مال کے تبادلہ میں بابل والوں سے بحیرۂ روم کی منڈیوں کا مال لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ اسی طرح بابل والے، ہندوستانی، چینی، ایرانی، کشمیری، ترکستانی مال بحیرۂ روم کی منڈیوں کو بھیجتے تھے اور خود اس عوض معاوضہ سے خوب نفع اٹھاتے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بابل میں بھی یہودی ساہوکاروں اور آڑھتیوں کا زور تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے سوداگر بھی انہی امراض میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ بھی یہود کی طرح بدنام ہو گئے تھے۔ فنیقی جہاز راں بھی سوداگری کرتے تھے۔ یہودی اور فنیقی نسلی لحاظ سے ایک ہی اصل سے تھے۔ مگر جب کبھی لین دین یا بیوپار کے معاملہ میں مقابلہ آپڑتا۔ یہودی مغلوب الحسد ہو کر ان سے بھی برسر پیکار ہو جاتے۔

اسکندریہ میں بھی یہودی ساہوکار بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔ ملکی محاصل کے اجارہ دار ہونے کے علاوہ وہ چونکہ وہ بادشاہ کو بھی سود پر قرض دیتے تھے اس وجہ سے دربار شاہی میں بھی بڑی بڑی اسامیوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اس بڑھتے ہوئے

اسرائیلی اقتدار کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ان کے خلاف جذبہ پھیل گیا۔ فسادات ہوئے جن میں یہودیوں کو بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑتے۔ یہ حال ۳۸ء میں تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ پھر اپنی پیشوں کی بدولت امیر کبیر ہو جاتے تھے۔

اسکندریہ کی طرح حبش میں بھی وہ بڑے مال دار و صاحب اقتدار تھے، اعمال رسل ۸۔۲۷، کے مطابق ملکہ کنادکی کا میر خزانہ ایک یہودی تھا، عرب میں، بحیرہ اسود کے گرد، اور یونان میں بھی ان کا بڑا زور تھا۔ یونان میں وہ غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔

تالمود کا مقولہ ہے" ایک سو فلورنس تجارت میں لگانے والا گوشت کھاتا اور شراب پیتا ہے۔ مگر ایک سو فلورنس زراعت میں لگانے والا ترکاری اور نمک" یہودی ابتدا سے اس مشورے پر کاربند تھے۔

جب ربی ایلیازر نے گوبھی اور چقندر کے کھیت کو دیکھا تو اس نے کہا" اے ترکاری چاہے تیری کتنی کاشت کی جائے تجارت کا رتبہ تجھ سے کہیں بلند ہے" جب وہ گیہوں کے کھیت میں سے گذرا اور لہلہاتی ہوئی بالیں دیکھیں تو وہ بولا" چاہے کتنا لہلہاؤ بیوپار تم سے افضل ہے۔"

اس فن و فریب، اس تاجرانہ ہیر پھیر کے خلاف خدائے بزرگ کے نبیوں نے بار بار آوازیں اٹھا دیں (اس سلسلہ میں رسول عربی نے سب سے زیادہ اور موثر کام کیا۔ مولف) تالمود میں بھی جا بجا اس قسم کی تلقین موجود ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے ان ہدایات پر کبھی غور نہ کیا۔ ایک دفعہ بنی اسرائیل کو مشورہ دیا گیا کہ بجائے دھات کے وہ پتھر یا آبگینہ کے اوزان اور بٹے استعمال کریں۔ کیونکہ دھات گھس جاتی ہے اور نہ ہی ان کو نمک میں ڈالیں کیونکہ نمک ان کو کھا جاتا ہے۔ یہ حکم یا مشورہ ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں مگر یہودیوں کی ایمان داری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کیا گیا۔ ہوزیا نے بھی لکھا ہے۔" کنعان کے ہاتھوں میں جعلی اوزان ہیں، کنعان ایک دولت پرست، ملک ہے۔" دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ جا بجا یہی بات ملتی ہے۔ جن جن قوموں میں یہود جا کر آباد ہوئے مفلس

ونادار ہوگئیں اور جب تک انھوں نے شور شر برپا نہ کیا یا وطن کو خیرباد نہ کہا اس بے رحم ساہو کار نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزامات دشمنی یا حسد کی وجہ سے لگائے جاتے تھے مگر بیسویں صدی کی دنیا ان طفل تسلیوں میں کب آتی ہے جب یہودیوں کے قیام کا ہر جگہ ایک ہی سا نتیجہ نکلتا ہے۔ تو کیا ہم یہ فرض کریں کہ ہر قوم ان کی دشمن یا حاسد ہے؟ ہرگز نہیں۔ لازمی طور پر اس کی دیگر وجوہات ہیں' تاریخ عالم کے جاننے والے ہر قوم' ہر ملک' ہر شہر میں موجود ہیں' اور وہ جان سکتے ہیں' کہ یہ وجوہات کیا ہیں۔

جب ساآنجو دانشمند کے اعلان کے بموجب یہودی باسک قوم کے علاقوں میں جاکر آباد ہو گئے۔ تو انھوں نے سیدھی سادھی تجارت کی تجارت کی بجائے وہی روپے کا لین دین بھی شروع کر دیا ضرورت مند کسان اور شہری قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے' حتیٰ کہ ان کی جائدادیں اور زمینیں سب یہودیوں کے پاس رہن ہوگئیں اور ان کی حالت بہت خستہ و خراب ہوگئی۔ مگر اس بات پر پیچ و تاب کھا کر کہ باہر سے آئی ہوئی ایک چھوٹی سی قوم ہمیں یوں تباہ کرتی چلی جائے' ان کی غیرت نے جوش مارا اور وہ آمادۂ فساد ہوئے۔ شہر وکٹوریہ کے بلدیہ نے شاہ کے پاس جاکر داد و فریاد کی' کہ لوگوں میں یہودیوں کے خلاف جذبۂ نفرت پھیل رہا ہے ممکن ہے کشت و خون تک نوبت جا پہنچے۔ حفاظتی پیش بندی کرلینی چاہیئے۔ شاہ نے فوراً فوج بھیج دی اور اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی یہودی ساہوکارہ نہ کرے' ورنہ "سارے شہری برباد ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ہمارے محنت سے بسائے ہوئے شہر کو چھوڑ کر کہیں ہجرت کر جائیں"۔ یہ واقعہ ۱۳۳۲ء کا ہے' عباس صفوی کے اعلان کے بعد ایران میں جاکر بھی بنی اسرائیل نے یہی وتیرہ اختیار کیا اور ایرانیوں کے خون کو اس طرح چوسا کہ وہ سخت قلاش ہو گئے۔ اس غاصبانہ لوٹ کھسوٹ اور رعایا کی داد و فریاد کا آوازہ شاہ کے کانوں میں بھی پڑا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم بے چارہ مدت تک اس الجھن میں پھنسا رہا کہ یہودیوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ تاکہ دوسرے غیر ملکوں کو ضعف نہ پہنچے" قسطنطنیہ میں بھی وہ

اسی طرح مال دار ہو گئے تھے" ٹاورنیر لکھتا ہے " دولت یا تو قیصر کے ہاتھ میں ہے یا یہودیوں کے خصوصاً ان یہودیوں کے جو قسطنطنیہ میں رہتے ہیں کیونکہ جہاں تک بیرونجات کا تعلق ہے، یہ کمبخت لوگ، عیسائیوں سے بھی نکمے ہیں۔ کھیتی باڑی سے ان کو سخت عار ہے اور چونکہ ان کی معاش کا مدار ہی سود خواری پر ہے، قسطنطنیہ سے باہر ان کا گذارہ مشکل ہے" پاشا کو بھی یہودی قرض دیتے تھے۔ مگر اکثر جعلی سکوں میں۔ صیغۂ محصول کی بھی وہی مہتمم تھے، اور عیسائیوں سے بڑی سختی سے محصول وصول کرتے تھے، شام و مصر و فلسطین میں بھی محصولات کے اجارہ دار وہی تھے۔ سارگریدو اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے " طمع زر قسطنطنیہ کے اندر ایک پیشہ ور عورت ہے جس کے دلال یہودی ہیں"۔

فرانس اور پرتگال کے متعلق ہم آئندہ لکھیں گے، جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، وہاں یہ حالت تھی کہ یہودی "بے رحم غلام فروش" کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ چونکہ وہ بہت امیر تھے اس لئے جہاں جاتے تھے لوگوں کو دبا لیتے تھے۔ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح وہ قوانین جو عیسائیوں کی محافظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں ٹوٹ جائیں یا کم از کم سپرد طاق نسیان رہیں اور استعمال میں نہ آئیں۔ حتیٰ کہ آخر کار حکومت کو سخت گیرانہ پالیسی اختیار کرنی پڑی، بہت سوں کو عیسائی بنا یا گیا، بہت سوں کو ملک بدر کیا گیا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا، اور صدیوں تک جائز شہری حقوق، اور ساہوکارے کے درمیان کشمکش جاری رہی، اور ایک مدت تک دونوں فریق ایک دوسرے کی مذہبی تنگ نظریوں اور تعصبات کا شکار ہوتے رہے۔ مشہور یہودی مورخ کیسر لنگ لکھتا ہے " بنی اسرائیل ازمنۂ قدیم سے دلالی، آڑھت، اور ساہوکارے کا کام کرتے ہیں، وہ مورخین جو یہودیوں کے خلاف ہیں اسے سود خواری (WUCHER) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں"۔ یہی مورخ اپنی تاریخ کے آغاز میں اس بات کا اقرار کرتا ہے " کہ یہودیوں کو دوسرے شہریوں کے برابر حقوق حاصل تھے بلکہ ان کو زیادہ مراعات حاصل تھیں"

مندرجہ بالا تاریخی حقائق اس بات کو اچھی طرح سے ثابت کر دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے دوسروں کی دشمنی یا جبر کی وجہ سے سود خواری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کی سود خواری نے دوسروں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ ایک اور جگہ یہی یہودی مورخ فخر سے لکھتا ہے "ازمنہ وسطی میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی تجارت کہاں ہوتی تھی؟ اسپین کے یہودی قدیم زمانے سے غلاموں کی تجارت کرتے تھے، جزیرہ نمائے آئبیریا کے اندر کوئی مقام ایسا نہیں تھا جس میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی منڈی ہو۔ یہ منڈی بہت مدت تک قائم رہی اور جب تک کہ موروں نے آکر اس ملک پر اچھی طرح سے تسلط نہ جما لیا۔ اس منڈی میں یہودیوں کا بول بالا رہا۔ بعد ازاں یہ تجارت موروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اب روم کو لیجئے۔ یہ شہر صدیوں تک سیاسی اور مذہبی مناقشات اور فسادات کا مرکز رہا۔ کئی فاتح آئے اور لوٹ مار کر کے واپس لوٹ گئے، یہاں بھی بنی اسرائیل نے اپنے گھناؤنے لچھنوں کو نہ چھوڑا، قیصر اور پوپ سب یہودیوں کے ہی بکھیڑوں میں پھنسے رہے۔ بالآخر انھیں مجبوراً یا تو یہودیوں کے حقوق و مراعات چھیننے پڑے یا سود خواری کے خلاف قوانین وضع کرنے پڑے، یا ان سے وہ بلا جسے دینے سے وہ انکاری تھے جبراً وصول کرنی پڑی اور ان کو اس بات سے منع کرنا پڑا کہ وہ عیسائی قوم کے بزرگوں کی ہتک کریں۔ یا کبھی ان کے تیوہاروں اور قومی رسوم کی ادائگی کے لئے ایک مجلس نگراں قائم کرنی پڑی، وغیرہ وغیرہ۔ روم کے اندر مالدار یہودیوں کے پاس بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ جن میں وہ خود کام نہیں کرتے تھے بلکہ جیسا کہ فاگل شتائن رگیر لکھتا ہے "ان کی جاگیروں پر کھیتی باڑی کرنے کے لئے گالیائی اضلاع (موجودہ فرانس) سے غلام درآمد کئے جاتے تھے، چنانچہ غلاموں کی خوب تجارت ہوتی تھی" اٹلی کے دوسرے شہروں میں بھی یہودی بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔

کیسینیہ کے باشندگان کو خوف لاحق ہوا کہ مبادا سرمایہ کے زور سے یہود سارے شہر پر قابض ہو جائیں انھوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف جدوجہد کی جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ "یہودی سود خوار اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ ۲۰/ بیس فی صدی سے زیادہ سود نہ لیں گے، شہر کا منصف اس فیصلہ سے اپنی کامیابی پر بڑا خوش ہوا" لوآرنو میں بنی اسرائیل استنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ عیسائیوں کو ان کی وجہ سے بجائے اتوار کے ہفتہ کے روز چھٹی منانی پڑتی تھی، یہی حال بہت سے دوسرے شہروں کا بھی تھا،

وینس، جنوا، اور فلورنس ان باتوں سے مستثنیٰ رہے کیونکہ وہاں کے باشندے یہودیوں سے زیادہ چالاک اور سود خوار تھے۔ چنانچہ لمبارڈون کے خلاف بھی اسی قسم کے الزام لگائے جاتے تھے فرانس میں ان کے خلاف بھی قوانین وضع کئے گئے، یورپ کے رہنے والے بھی بسا اوقات عیسائیوں کی سی نہیں بلکہ "بپتسمہ یافتہ" یہودیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ (لمبارڈون کو نفرت کی وجہ سے "بپتسمہ یافتہ یہودی" کہا جاتا تھا۔ اب یہ بات کہ ان کے خلاف بھی اسی طرح نفرت پھیلی جس طرح کہ یہودیوں کے خلاف، صاف ظاہر کرتی ہے کہ نفرت کسی قوم سے نہیں تھی بلکہ سود خواری، اور بیوپاری ہیر پھیر سے تھی، جو قوم یا فرقہ ساہوکارے کا پیشہ اختیار کرتا تھا، لوگوں میں اسی کے خلاف جذبہ نفرت پھیل جاتا تھا اور یہ ایک قدرتی امر ہے)
بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف یہود کا رویہ یہ تھا۔ کہ جنگ وجدال کے واسطے ان کو قرضہ دیتے رہتے تھے۔ ان کی دیگر جائز و ناجائز ضروریات و خواہشات کو پورا کرتے رہتے تھے، ان کو فضول خرچی اور عشرت پسندی پر اکساتے رہتے تھے اور اچھی طرح سے گمراہ اور مقروض کر دینے کے بعد ان کو ایسا بنا لیتے تھے کہ بغیر یہودیوں کے ان کا گذارہ مشکل ہو جاتا تھا۔ ان "خدمات" کے عوض بھاری سود کے علاوہ جا و بے جا مراعات بھی حاصل کر لیتے تھے۔ ایسے حکمراں بھی قدرتی طور پر یہود کی حمایت کرتے تھے۔ ان حالات میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باشندگان ملک کو اپنے حقوق منوانے کے لئے کس قدر جد و جہد کرنی پڑتی ہو گی۔ اس زمانے میں یہود کے خلاف حکمرانوں سے کوئی بات منوا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ضرورت پڑنے پر لاؤ لشکر سے بھی یہودیوں کی محافظت کی جاتی تھی۔ لوآرا کے مقام پر یہودیوں کی ہتک کرنے والوں کو اس سختی سے سزا

دی جاتی تھی گویا اس نے کسی معزز شخص کی عزت پر ہاتھ اٹھایا ہو' وہاں یہودی ساہوکاروں کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں ان کے تجارتی مال پر کوئی محصول نہیں تھا۔ ٹوڈیلا میں تو شاہ سانچو دانشمند نے ایک قلعہ یہودیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ کہ اس میں حفاظت سے رہیں' اس کے علاوہ جو جائداد یہودیوں کو ورثہ میں ملتی تھی اس میں ۱/۱۰ دسوند نہیں لی جاتی تھی۔ جب کوئی یہودی کسی عیسائی کا مقروض ہوتا تو موخر الذکر کے لئے لازمی تھا کہ وہ شہادتیں پیش کرے جن میں سے ایک یہودی ہو ۱۲۳۳ء میں ٹوڈیلا میں یہود کے خلاف سخت فساد برپا ہوگیا' لوگوں کو نیا آئین حکومت اور نئے حقوق دیے گئے' تب کہیں یہ فتنہ فرو ہوا۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وہی حال ہو گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ نوآرا کا شاہی خاندان بھی اس قدر مفلس ہوگیا۔ کہ ایک دفعہ انھیں شام کا کھانا بھی میسر نہ آیا اور انھوں نے یہودیوں سے غلہ ادھار لے کر گذارہ چلایا۔ اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ بنی اسرائیل کو اپنے محسنوں کے حال زار پر رحم آیا ہوگا۔ تو ہم سخت غلطی کریں گے انھوں نے الٹا اپنی شرح سود کو اور تیز کر دیا۔ یہودی مورخ کیسر لنگ اس امر کا اعتراف کرتا ہے" ہم اس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس وقت یہودیوں کی شرح سود انتہا کو پہنچ گئی' لوگوں نے سب کچھ گروی رکھ دیا۔ کسان نے اپنا ہل' جاگیردار نے اپنی جاگیر' بادشاہ نے جواہرات' پشب نے خاتم و نگین'

تمام ممالک میں یہی حال تھا۔ شاہانہ فضول خرچیاں اور بیرونی شان و شوکت ایک طرف' اور یہودیوں کی ناقابل تسکین حرص و آز دوسری طرف' لازم و ملزوم چیزیں ہوگئیں۔ بالآخر سوائے جبر و تشدد کے اور کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کرسکی' مگر اس کی قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑی' مارٹن لوتھر لکھتا ہے" لوگ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے بغیر حکومت کو چارہ اس لئے نہیں کہ وہ بڑی بڑی رقمیں قرض دے سکتے ہیں۔ مگر یہ رقمیں آتی کہاں سے ہیں؟ اپنی گرہ سے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ خود لوگوں اور ان کے حکمرانوں کی جیب سے۔ روپیہ رعایا کا ہے مگر یہودی مفت ہی میں لوگوں کا خون چوستے ہیں۔ کیا وہ ہماری سادہ لوحی پر ہماری پیٹھ پیچھے ہنستے نہ ہوں گے؟"

بنیادی قومی تعلیم میں سیر کی اہمیت

(محمد نذیر صاحب - استاد تعلیمی مرکز - جامعہ)

(یہ مضمون گذشتہ مضمون (نمبر ۱) کی فہرست کے نمبر ۱ کی تشریح میں لکھا گیا ہے۔
اس میں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بچوں نے مشاہدے کے لئے خود سوالات
قائم کئے ہیں اور ان کا مشاہدہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے بہت
غور و فکر کے بعد پروگرام بنایا ہے۔)

بنیادی قومی تعلیم میں بنیادی اور ضمنی حرفے کرانے کے سلسلے میں بچوں کو کئی مرتبہ تعلیمی مشاہدہ
اور تعلیمی سیر کے لئے لے جانے کا موقع پیدا ہوگا۔ اس سے حرفوں کے کرانے اور سیر سے متعلق
مضامین کے مطالعہ کرانے میں کافی مدد مل سکے گی۔

چھوٹے بچے سیر یا تفریح کا نام سنتے ہی ایک خاص دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فطرتی طور
پر اس کے شوقین ہوتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کی کئی ایک جبلتیں تسکین حاصل کرتی اور
نشو و نما پاتی ہیں۔ گو ہمیں بچوں کی سیر کے فطری جذبے میں بظاہر کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا لیکن
ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر بہت سی باتیں سوچ لیتے ہیں اور دوران سیر میں انھیں عملی
جامہ پہناتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر کرنے کے وقت جس قدر باتیں وہ سیکھتے ہیں ان کا اندازہ
ہم کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن پڑھائی کے دوران میں جب بچے اپنے کئے ہوئے مشاہدہ کا اعادہ
کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ باتیں بچے کے مشاہدہ میں آ گئی ہیں۔ بچوں کے اس
قسم کے مشاہدے گو بے ترتیب اور بے مقصد ہوتے ہیں لیکن مدرسہ میں بامقصد پڑھائی کے
دوران میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ جماعت کے کئی بچوں کی بیان کی ہوئی باتیں جب جمع کی جاتی ہیں تو
استاد کی رہنمائی میں وہ باترتیب اور بامقصد بیان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور اس طرح بچوں کی

تجسس اور راز جوئی کی فطری صلاحیتیں اپنے کئے ہوئے مشاہدے کے بعد استاد کی رہنمائی سے صحیح راستہ پر لائی جا سکتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک صحیح واقفیت میں اضافہ اچھے مشاہدے اور کامیاب تجربات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بچے کی قوت مشاہدہ کی جتنی اچھی تربیت کی گئی ہوگی اور جتنے کامیاب اور تخلیقی تجربات کئے گئے ہوں گے واقفیت اتنی ہی ٹھوس، وسیع اور پر از صحیح معلومات ہوگی۔ بچے سیر کرنے کے دوران میں جن دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں انہیں تعلیمی مفاد کے لئے استعمال کرنا بہترین طریقۂ تعلیم ہے۔ اس دلچسپی کو بامقصد بنانا اور بچوں کی آمادگی کا بغور مطالعہ کرتے رہنا اور مناسب وقت پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا بنیادی قومی تعلیم کے استاد کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بچہ ہر آنے والے مہمان سے پیار کرنے لگتا ہے اور مراجعت کے وقت اس کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کیا ایک دو دن میں اس کو مہمان سے اتنی ہی محبت ہو گئی تھی جس کا اس نے اظہار کیا؛ نہیں بلکہ فوری دلچسپیوں کے ماتحت اسے تو اسٹیشن کا ہنگامہ۔ ریل کا سفر اور انواع و اقسام کے لوگ دیکھنے مقصود ہیں۔ کیونکہ وہ فطری طور پر ایسا کرنے کے لئے مجبور ہے بچے کی اس قسم کی اپج اور فوری دلچسپیوں کو ایک خاص سلسلے میں منسلک کرکے اور بامقصد بنا کر زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں ذیل میں اس بات کو درج کرتا ہوں کہ گتے کے کام میں کیونکر اکثر سیر کے لئے مواقع پیدا ہوتے رہے اور ان سے کس طرح تعلیمی فائدہ حاصل کیا گیا۔

جہاں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ بخوبی جانتے ہوں گے کہ بچوں کو عملی کام میں کتنی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کہاں تک تخلیقی اور تعمیری سرگرمیوں میں مشغول نظر آتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اپنی قوت تجسس کی بنا پر سوالوں کی کس قدر بوچھار کرتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی جبلتوں کو سیر کے ذریعے بہترین طور پر تسکین دی جا سکتی ہے۔

ان ضمنی کاموں یا بنیادی حرفوں کے لئے دو قسم کی سیر کرائی جا سکتی ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق

کسی گذشتہ سبق یا کام سے ہے اور دوسری وہ جو بچوں میں کسی کام کے لئے تحریک پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہو۔ گویا کبھی سیر کام کے سلسلہ میں اور کبھی کام سیر کے ماتحت کرائے جاتے ہیں۔

گتّے کے کام میں سیر کے لئے مواقع اور ان کی تیاری :۔

استاد کام شروع کرانے سے پہلے بچوں کی تجاویز طلب کر کے سال بھر کا پروگرام مرتب کرے یعنی کون کون سے ماڈل تیار کئے جائیں۔ کون سا پہلے ہو اور کون کون سا بعد میں؟ اور اس کی تکمیل کے لئے کون کون سی اشیا درکار ہیں؟ اس طرح ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔ بچے کاموں کی فہرست مرتب کرانے کے دوران میں عملی طور پر سوچنے اور لکھائی وغیرہ کی کافی مشق کریں گے۔

مثال کے طور پر ابتدائی چہارم کے طلبا نے کثرت رائے سے فائل بنانا پسند کیا۔ اب استاد بچوں کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتا ہے کہ ہم اس کا سائز ایسا رکھیں جس میں نہ تو گتا ہی ضائع ہو۔ نہ ابری اور نہ کاغذ۔ اس کام کے لئے بچوں کو گتے اور ابری وغیرہ کی پیمائش کی ضرورت ہے۔ لیکن فل اسکیپ کاغذ کی ابری اور گتا کسی صورت میں بھی ایسا نہیں کاٹا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی چیز ضائع بھی نہ ہو اور دیگر کاغذات اس میں بآسانی رکھے جا سکیں۔ اس وقت استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ فرض کر لیجئے اس نے تحریک کے طور پر تبلا دیا کہ اخباروں۔ رسالوں اور رجسٹروں کے کاغذوں اور سائزوں میں فرق ہوتا ہے۔ بچے فوراً سمجھ جائیں گے کہ کاغذ محض ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی کئی ایک قسمیں ہیں اور کئی ایک سائز ہیں۔ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کے متعلق مزید واقفیت حاصل کی جائے۔ لہٰذا فوراً کاغذی کی دکان کا خیال آتا ہے۔ اس وقت اگر سیر کا پروگرام مرتب کیا جائے تو ایک لفظ سیر کی خوشی دوسرے حصول مقصد بچوں کے لئے بے حد دلچسپی اور خوشی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ لیکن یوں ہی کاغذی کی دکان پر چلے جانا اور کاغذ کے مختلف سائز دریافت کر کے لوٹ آنا زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ دیہاتی مدارس کے لئے تو ایسا ممکن بھی نہیں کہ بات بات پر سیر کا پروگرام مرتب کرتے رہیں اور آئے دن شہر آنے جانے کی

زحمت برداشت کریں۔ سیر کے لئے ایک دن نہیں بلکہ ہفتوں پہلے تیاری شروع ہونی چاہیئے سیر کے نام اور اس کی امید کی جو دلچسپی بچوں میں موجود ہے اس سے اس اثنا میں بے حد فائدہ اٹھایا جائے۔ کاغذ کے متعلق مختلف سوالات کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہاں بنتا ہے؟ کس چیز سے بنتا ہے؟ کیسے بنتا ہے؟ اس کے مختلف اوزان کا کیا حساب ہے؟ مختلف کاغذوں کے نام کیا ہیں؟ مختلف کاغذوں کے رنگ کیا ہیں؟ کاغذ کس کس کام میں لایا جاتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

جب بچوں کے سامنے بہت سی چیزیں ہو جائیں تو ان کو یادداشت کے طور پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت ان مختلف عنوانوں کو ایک فارم کی شکل دی جاسکتی ہے جو ہر حال میں مفید ہے۔ اس سے تھوڑے وقت میں زیادہ واقفیت مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے دکان دار۔ کاریگر اور دیگر لوگ ابھی اس بات کو نہیں سمجھتے کہ بچوں کی اس قسم کی تعلیمی مشاہدہ میں مدد کریں۔ ان کی حسب ضرورت اور حسب استعداد واقفیت بہم پہنچا سکیں مختلف جگہوں پر اس قسم کی معلومات حاصل کرنے میں اگر دکان دار یا کارخانے والے کسی وجہ سے پوری واقفیت نہ بھی دیں تو اس قسم کی خانہ پری بنیاد کا کام دے سکتی ہے اور استاد جماعت واپس لاکر بچوں کو ان کے متعلق مفصل معلومات دے سکتا ہے۔

ذیل میں تعلیمی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا رکی کاپیوں کا ایک ورق نقل کیا جاتا ہے۔ جو انھوں نے اپنی سیر کے ضمن میں کاغذ کے لئے تیار کیا تھا۔

اخباروں اور رسالوں کا کاغذ

نمبر شمار	نام کاغذ	وزن	سائز	قیمت فی پونڈ	تعداد کاغذ فی رم	کہاں کہاں سے آتا ہے	کس چیز سے بنتا ہے	کیفیت
(۱)	رف	۱۰ پونڈ	۱۸ × ۲۲	۲ سے ۳ آنہ تک	۴۸۰	ناروے سویڈن جرمنی زیکوسلواکیہ	بانس	
(۲)	"	۱۸ "	۲۶ × ۲۰	"	"		"	
(۳)	"	۲۱ "	۳۰ × ۲۰	"	"	"	"	کاغذ نمبر ۵ تا ۸ کاغذ نمبر ۱ تا ۴ کا دگنا سائز ہے
(۴)	"	۲۴ "	۲۹ × ۲۲	"	"	"	"	
(۵)	"	۲۸ "	۳۴ × ۲۲	"	"	"	"	
(۶)	"	۳۸ "	۴۰ × ۲۶	"	"	"	"	
(۷)	"	۴۸ "	۴۶ × ۲۹	"	"	"	"	
(۸)	"	۱۴ "	۲۷ × ۱۷	"	"	"	"	

اس نقشہ کی مانند کاغذ کے سلسلے میں بچوں نے کئی ایک دوسرے نقشے بھی تیار کئے تھے مثلاً فل اسکیپ کاغذ۔ ماؤنٹ پیپر۔ ڈرائنگ پیپر۔ رنگ دار کاغذ۔ رائٹنگ پیڈ پیپر۔ خاکی کاغذ مومی کاغذ۔ باریک کاغذ وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق مندرجہ بالا عنوانوں کے ماتحت معلومات حاصل کی تھیں۔ اس قسم کی واقفیت مضامین کی مربوط پڑھائی میں بے حد مفید ثابت ہوسکتی ہے خصوصاً حساب میں اس قسم کے خاکوں کو دوران سیر میں پُر کرانے کے بعد اس پر ایک طویل گفتگو کی ضرورت ہے۔ بچوں کی انفرادی۔ ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری واقفیت کو جماعتی حیثیت دے کر مکمل کیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد ایک مضمون مرتب ہوسکتا ہے۔ جس میں مقابلہ کی صورت پیدا کر دینے سے نتائج بہترین۔ خوشگوار اور کامیاب ہوسکتے ہیں۔ کاغذ کے متعلق بہترین واقفیت بہم پہنچانے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کاغذ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد تاریخ اور جغرافیہ کے کئی ایک اسباق بچوں کو پڑھائے جا سکتے ہیں۔

آیئے ایک اور مثال پر غور کریں۔ بچہ چاقو سے گنا کاٹتا ہے۔ لیکن برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے چاقو زنگ آلود ہوکر کام کا نہیں رہتا۔ اس وقت اسے تیز کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بچے اس کو پتھری پر رگڑ رگڑ کر تیز کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ پورے طور پر کام نہیں دیتا۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سان پر چڑھا کر صاف اور تیز کیا جائے۔ استاد اس وقت چاقو کے متعلق زیادہ سے زیادہ گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً اسے کون بناتا ہے؟ جب لوہار نے چاقو بنایا تو کیا اس نے سان پر چڑھایا ہوگا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ چاقو بنانے میں اور کس کس کاریگر نے مدد دی ہے؟ لوہار اور بڑھئی ہمارے لئے اور کون کون سی چیزیں بناتے ہیں؟ ہاتھ اور مشین کے کام میں کیا فرق ہے؟ لوہا کتنی قسم کا ہوتا ہے؟ چاقو کس طرح بنایا جاتا ہے؟ لوہے کی دیگر چیزیں کس طرح تیار کی جاتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس قسم کی گفتگو کے دوران میں بچے اپنے مشاہدے میں آئی ہوئی باتیں پیش کرتے ہیں اور سب کی بات اور استاد کا مشورہ مل کر ایک مکمل واقفیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس وقت بچوں میں خواہ مخواہ یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود کاریگروں

کی دکانوں کا بغور مشاہدہ کریں۔ چنانچہ کئی ایک سمجھ دار طالب علم ایسا کرتے بھی ہیں لیکن جماعت کو اگر بحیثیت مجموعی دوران سیر میں ان باتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دلچسپی کے ساتھ ساتھ حصول مقصد ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے یعنی سیر کا پروگرام مرتب کرنا اور بآسانی معلومات حاصل کرنے کے لئے خاکے تیار کرنا وغیرہ اس قسم کے ایک سلسلے میں مرکز ہذا کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبار نے جو سیر کا پروگرام مرتب کیا تھا اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) بڑھئی کی دکان
(۲) لکڑی کا کارخانہ
(۳) لوہار کی دکان
(۴) ڈھلائی کا کارخانہ
(۵) لوہے کا سامان فروخت کرنیوالی دکان
(۶) لوہے کی کان
(۷) لوہے کی خراد
(۸) لکڑی کی خراد
(۹) گتے کا سامان تیار کرنے والا کارخانہ
(۱۰) چاقو اور قینچی تیز کرنے والے کی مشین
(۱۱) کاغذی کی دکان

پروگرام مرتب کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی اور دو باتیں نکال دی گئیں جن کا اس وقت عمل میں لایا جانا مشکل تھا مثلاً لوہے کی کان، گو بچوں کی دلچسپی زیادہ تھی لیکن جب روپے کی فراہمی کا سوال ان کے سامنے آیا تو انھوں نے معمولی غور و فکر کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔ باقی جگہیں دیکھنے کے لئے باری باری ہر ایک مد پہ غور ہونے لگا۔ ہر ایک مد کے لئے کاپی کے الگ الگ صفحوں پر بچوں کے مشورے سے خاکے تیار کئے گئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں صرف عنوانات کو درج کیا گیا ہے۔ پُر کرنے کا طریقہ تو آپ "اخباروں اور رسالوں کا کاغذ" کے خاکے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

بڑھئی کی دکان کا مشاہدہ:۔

(۱) کس قسم کا لکڑی کا کام ہوتا ہے؟

(۲) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟
(۳) کس قسم کی لکڑی استعمال کرتے ہیں ؟
(۴) وہ لکڑی کہاں سے منگواتے ہیں؟
(۵) کاریگر کتنے ہیں اور ان سے کیا کام لیتے ہیں ؟

لوہار کی دکان کا مشاہدہ :-

(۱) لوہے کا کس قسم کا کام ہوتا ہے ؟
(۲) کون سے اوزار کس کام کے لئے استعمال کرتے ہیں ؟
(۳) لوہا کہاں سے منگاتے ہیں ؟
(۴) کاریگروں کی تعداد کتنی ہے ؟
(۵) کونسا کاریگر کیا کام کرتا ہے ؟
(۶) کاریگروں کی مزدوری روزانہ کیا ہے ؟

لکڑی کا کارخانہ :-

(۱) کارخانے میں کون کون سی لکڑی موجود تھی ؟
(۲) یہ لکڑی کہاں کہاں سے آتی ہے ؟
(۳) مختلف لکڑیوں سے کون کون سی چیزیں بنتی ہیں ؟
(۴) پہاڑوں یا جنگلوں سے لکڑی کس طرح لائی جاتی ہے ؟

ڈھلائی کا کارخانہ :-

(۱) مشینیں کس سے چلتی ہیں ؟
(۲) لوہا کس چیز میں پگھلایا جاتا ہے ۔ اور پگھلانے کے لئے کیا کیا چیزیں استعمال کرتے ہیں؟
(۳) پگھلے ہوئے لوہے سے کون کون سی چیزیں ڈھلتی ہیں؟
(۴) لوہے کو کیسے پگھلاتے ہیں ؟

(۵) لوہا کہاں سے لاتے ہیں ؟

لوہے کا سامان فروخت کرنے والی دکان کا مشاہدہ :-

(۱) اس کی دکان میں کون کون سی چیزیں موجود تھیں ؟

(۲) کون کون سی دیسی اور کون کون سی ولایتی چیزیں بک رہی تھیں ؟

(۳) مختلف چیزوں کے نرخ کیا تھے ؟

(۴) کارڈ بورڈ کے لئے کوئی اور کار آمد چیز جو اس کے ہاں موجود ہو ؟

لوہے کی خراد کا مشاہدہ :-

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی ؟

(۲) کتنے کاریگر کام کر رہے تھے ؟

(۳) ہر ایک کو اجرت یومیہ کیا ملتی تھی ؟

(۴) یہ مشین کس ملک سے منگوائی گئی تھی ؟

(۵) اس مشین کی قیمت کیا تھی ؟

لکڑی کی خراد کا مشاہدہ :-

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی ؟

(۲) کتنے کاریگر کام کرتے تھے ؟

(۳) ہر ایک کی اجرت یومیہ کیا تھی ؟

(۴) مشین کی بناوٹ کیا تھی ؟

(۵) کیا چیز بنائی جا رہی تھی ؟

(۶) مشین کی قیمت کیا تھی ؟

کارڈ بورڈ کا کارخانہ :-

(۱) کس کس وزن کا کارڈ بورڈ استعمال کرتے ہیں ؟

(۲) کس وزن کے گتے سے کون سی چیز بناتے ہیں ؟

(۳) گتا کہاں کہاں سے منگاتے ہیں ؟

(۴) کیا کیا چیزیں بناتے ہیں ؟

(۵) کس کس سائز کی بناتے ہیں ؟

(۶) کون سی چیز کس حساب سے بیچتے ہیں ؟

(۷) کس کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں ؟

(۸) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟

(۹) کاری گروں کی تعداد اور ان کے کام۔

(۱۰) کاری گروں کو کیا مزدوری دیتے ہیں ؟

چاقو اور قینچی تیز کرنے والی مشین کا مشاہدہ :۔

(۱) مشین کس سے چلتی تھی ؟

(۲) اس کو زمین پر کس طرح لگایا گیا تھا ؟

(۳) اس کی بناوٹ کیا تھی ؟

(۴) کتنے آدمی کام کرتے تھے ؟

(۵) ان کی اجرت یومیہ کیا تھی ؟

(۶) کون سی چیز تیز کی جا رہی تھی ؟

ان نقشوں کے پیش کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہر جگہ ایسے ہی مواقع پیش آئیں گے۔ بلکہ یہ ہے کہ پیدا ہونے والے موقعوں کو کس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے تعلیمی سیر کی تیاری پر روشنی ڈالی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کو بھی کمرۂ جماعت ہی میں طے کر لینا چاہیئے اس قسم کی بامقصد گفتگو بچوں میں آزادی کی روح اور

قوت استدلال کی تربیت کا باعث ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بڑھئی کی دکان کو لے لیجئے، شہر کے بازاروں یا تنگ گلیوں میں تمام جماعت کا بیک وقت گزرنا اور پھر اس کی چھوٹی سی دکان پر جمع ہو کر واقفیت حاصل کرنا کس قدر دقت طلب کام ہے۔ البتہ گاؤں میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی۔ نیز ہمارے ملک کے کاریگر جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں چونکہ ناخواندہ ہیں لہذا وہ بچوں کی حسب استعداد واقفیت بہم پہنچانے سے بھی قاصر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ تمام باتیں لکھ کر نہ معلوم کیا کریں گے۔ کہیں پولس میں ان تمام باتوں کی رپورٹ نہ کر دیں یا تمام واقفیت حاصل کر کے کہیں خود کارخانہ نہ کھول لیں۔ جانے سے پہلے دوکان داروں اور کارخانہ داروں سے کسی باا ثر آدمی کے ذریعہ بچوں کو ان باتوں کے متعلق دکھلانے کا مسئلہ طے کر لینا چاہیئے۔

اس قسم کی مشکلات پر اگر بچے پہلے ہی سے غور کر لیں تو ان کے لئے اس قسم کے مشاہدہ کے لئے جانا عملی طور پر مفید ثابت ہوگا۔ درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا نے جانے سے پہلے جو تجاویز بورڈ پر لکھوائیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بچوں کو اگر کسی با مقصد کام کے ماتحت سوچنے کا موقع دیا جائے تو ان کے لئے کس قدر مفید ہوتا ہے۔

آئیے بچوں کی ان تجاویز پر غور کریں جو انھوں نے مشاہدہ کرنے کے متعلق مرتب کیں۔

(۱) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں۔ ہر ایک گروپ ایک ہی قسم کی مختلف دکانوں پر جا کر معلومات حاصل کرے۔ ان میں سے ایک لکھنے والا ہو ایک پوچھنے والا اور باقی غور سے سنیں۔

(۲) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں۔ ایک لوہار کی دکان پر ایک بڑھئی کی دکان پر اور ایک ڈھلائی کے کارخانے وغیرہ وغیرہ میں بھیج دیا جائے۔ ان میں ایک سوال کرنے والا ہو ایک لکھنے والا اور باقی سننے والے ہوں۔ سیر کے بعد سب لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کر کے جماعت کو سنائیں ان رپورٹوں کی مدد سے ہر ایک طالب علم اپنی اپنی کاپی مکمل کر سکتا ہے۔

(۳) جماعت چھ گروپ پر مشتمل کر لی جائے۔ ہر ایک گروپ تجویز کردہ پروگرام کے مطابق بھی

لوہار وغیرہ کی دکان پر پہنچ جائے اور مشاہدہ کرے۔ اس کے بعد لوہار کی دکان والا بڑھئی کی دکان پر بڑھئی کی دکان والا ڈھلائی کے کارخانے میں اور کارخانے والا فرنیچر ہاؤس میں علیٰ ہٰذا القیاس پہنچ جائے۔ گویا دائرہ بن جائے جو مکمل ہونے کی صورت میں تمام جگہوں سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

(۴) ساری جماعت کو بیک وقت ہر ایک چیز دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔

اس وقت جماعت میں چار تجاویز تھیں اور ہر خیال کا طالب علم اپنی تجویز کو اہمیت دے رہا تھا۔ چونکہ اس جماعت کو میں اور نگراں صاحب سیر کرانے والے تھے لہٰذا نگراں صاحب نے میری موجودگی میں ان چاروں تجویزوں کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر تبصرہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نمبر ۲ کثرت رائے سے منظور ہوئی۔ کیونکہ دہلی میں ایک ہی قسم کی اور ایک ہی جگہ پر کئی ایک دکانوں کا مل جانا نہایت آسان تھا اس لئے تجویز میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تجویز نمبر ۴ کو بھی داخل کر لیا گیا۔ یعنی ڈھلائی کے کارخانے یا لوہے کا سامان بیچنے والی دکان کا مشاہدہ ساری جماعت ایک ہی وقت میں کر سکتی تھی۔ پروگرام مکمل ہونے کی صورت میں اگلے دن کے لئے سیر کا اعلان ہو گیا۔

یہاں پہنچ کر استاد پر ایک اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یعنی اگلے دن بچوں کو پیدل یا لاری میں سوار کرا کے سیر کی غرض سے جانا مناسب نہیں۔ بلکہ مجوزہ مقامات پر پہلے ہی سے پہنچ کر طے کر لینا استاد کا فرض ہے۔ ایسا کرنے سے ایک تو کام باآسانی ہوگا۔ دوسرے پروگرام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوگی۔ بچے پابندیٔ وقت جیسی نیک عادت کی مشق کریں گے۔ یہ کام استاد کے لئے بھی ذاتی طور پر سرانجام دینا مشکل ہے۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ استاد اس مقام ماحول یا اس علاقہ سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا اسے کسی بارسوخ آدمی کی مدد حاصل کرنی چاہیئے۔ گاؤں کا استاد تو اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ اس جماعت کے پروگرام کی تکمیل میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ ہم لوگوں نے اپنے طور پر پہلے سے ہی ایک علیحدہ پروگرام تیار کر لیا تھا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ

وقت مقررہ پر اسکول سے چلے اور عین چھٹی کے وقت اسکول میں واپس پہنچ گئے۔

سیر کے ذریعے بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ سیر کے متعلق کوئی خاص تیاری عمل میں لائی گئی ہو لیکن کیا سیر کے خاتمے پر استاد کا مقصد پورا ہوگیا؟ نہیں بلکہ اب وہ وقت ہے جب استاد اس حاصل کردہ واقفیت کو کسی کام میں لا سکتا ہے۔ بچوں کی حاصل کردہ واقفیت گو دیر پا اور مضبوط ہے لیکن کسی خاص سلسلے میں منسلک نہیں وہ ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط واقفیت ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک طالب علم یکساں واقفیت نہیں رکھتا۔ اس واقفیت کو مستقل اور باترتیب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کمرۂ جماعت میں اس قسم کے سوال کئے جائیں جن سے ان کی واقفیت کا اعادہ ہو۔ اور اسی تکرار میں وہ کوئی منطقی صورت اختیار کرلے۔ یا یوں بھی ہوسکتا ہے کہ بچوں سے انفرادی طور پر سیر کا حال سنا جائے۔ سنانے والا بچہ استاد کی میز کے پاس کھڑا ہوکر اور جماعت سے مخاطب ہوکر گفتگو کرے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے جملے یا بھولی ہوئی باتیں استاد پوری کرتا جائے۔ اس طرح جماعت کے سامنے چند بچوں کی مدد سے سیر کی تمام کیفیت دوبارہ پیش کی جاسکتی ہے تیسرا طریقہ ڈرامہ ہے اگر وقت ہو تو اسی سیر کے اعادہ کے لئے کوئی ڈرامہ دیا سکتا ہے جس سے سیر اور سیر کے متعلقات اچھی طرح بچوں کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔

ہم نے اپنے پروگرام کے اختتام پر جو طرزِ عمل اختیار کیا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

میں نے اور نگراں صاحب نے مل کر یہ اسکیم تیار کی کہ بچوں سے دو قسم کے مضامین لکھوائے جائیں یعنی ایک تو وہ ہوں جو ہر ایک پیشہ ور اور مقام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں اور دوسرے وہ جو سرسری طور پر سیر کے متعلق ہوں۔ چنانچہ ذیل کے مضامین لکھوائے گئے۔

مضامین خصوصی:۔ بڑھئی۔ لوہار۔ لوہے کا کارخانہ۔ فرنیچر ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔

مضامین عمومی:۔ سیر کی تیاری۔ دوران سیر میں کیا کیا دیکھا۔ سیر میں ہماری شرارتیں۔

چھوٹے بچوں کا ذخیرۂ الفاظ تو کم ہوتا ہی ہے لہٰذا ابتدائی چہارم کے طلبا سے مکمل طور پر اظہار خیال کی توقع کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان کی واقفیت کو ترتیب دیتے وقت مختلف مضامین کے لئے

اشارات تجویز کرلئے گئے۔ تاکہ بچے ان کی مدد سے باآسانی مضامین لکھ سکیں۔ ذیل میں چند ایک مضامین کے اشاروں کے خاکے تحریر ہیں۔

I لوہے کا کارخانہ:۔

(۱) تیاری:۔ ا۔ موقع۔ ب۔ گفتگو۔ ج۔ پروگرام میں اس کو کس طرح شامل کیا گیا۔
د۔ تیاری (خاکے وغیرہ)
(۲) سیر کے قوانین۔
(۳) پروگرام کی تقسیم۔

II سیر:۔

ا۔ روانگی۔ ب۔ جو جو مقامات دیکھے گئے۔ ج۔ مختصر حال۔ د۔ شرارتیں۔ ہ۔ واپسی۔

مندرجہ بالا مضامین ہر ایک طالب علم نے لکھے۔ بچوں کی تحریر کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ قارئین سمجھ سکیں۔ کہ بچے اس قسم کی رہنمائی میں کتنی آسانی سے اظہار خیالات اور برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لوہے کا کارخانہ:۔ " ہماری جماعت کارڈ بورڈ کا کام کرتی ہے۔ ہم چاقو سے گتے کو کاٹتے ہیں ایک دن ہماری جماعت میں ذکر آیا کہ چاقو بنانے میں کن کن کاری گروں نے ہماری مدد کی ہے۔ ماسٹر صاحب نے بڑھئی اور لوہار کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ دوران گفتگو میں یہ ذکر آگیا کہ یہ دونوں کاری گر ہمارے لئے اور کیا کیا بناتے ہیں تو ہماری جماعت نے بورڈ پر ایک لمبی فہرست لکھوا دی۔ جب ہماری جماعت میں سیر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ہم نے مناسب خیال کیا کہ لوہے کے کارخانے کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ چنانچہ ہم نے اسنے بھی پروگرام میں شامل کرلیا۔ سیر کے روز پونے نو بجے لاری میں بیٹھ کر باڑے ہوتے ہوئے پہاڑی دھیرج پہنچے جہاں لوہے کا کارخانہ تھا اور اس کا نام خراد کی مشین بھی ہے جو کہ بجلی کے ذریعہ چلتی ہے وہاں ایک سان کا پتھر تھا۔ وہ پرزوں اور اوزاروں کو تیز کرتا تھا۔ وہ پتھر بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ مشین

لوہے کو چھیلتی تھی۔ کارخانہ کے ایک طرف لوہے کا کام اور دوسری طرف لکڑی کا کام ہوتا تھا۔"

سیر:۔

دوران سیر میں ہماری شرارتیں :۔ (۱) سڑک پر دوڑتے تھے۔ (۲) دکانوں پر سے چیزیں خرید کر سڑک پر کھاتے تھے۔ (۳) لالہ سری رام کی دکان پر جب گئے تو لڑکوں نے چنے لا کر جگالی شروع کر دی۔ (۴) بغیر اجازت لوگوں کی چار پائیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ (۵) چاروں طرف گھومتے تھے (۶) لاری میں شور مچاتے تھے۔ (۷)۔ ماسٹر صاحب کا کہنا نہیں مانتے تھے۔

ہماری تیاری اور تجاویز جہاں تک تعلیمی لحاظ سے کامیاب رہیں وہ تو آپ ملاحظہ فرما چکے اب آخر میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ بچوں نے اس قسم کے مشاغل کو جاری رکھنے کے لئے قدرتی طور پر استاد کو مزید تعلیم کے لئے کتنے مواقع فراہم کر دئے۔ ذیل میں محض ان موقعوں کو قلم بند کرتا ہوں جن سے باآسانی تعلیمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی تشریح اور تفصیل اگر پھر کبھی موقعہ ہوا تو ہدیہ ناظرین کروں گا۔

(۱) جب لاری پہاڑی پر سے گزر رہی تھی تو ایک بچے نے کہا "آ ہا جی! اب تو ڈرائیور صاحب کو بہت سا پٹرول پھونکنا ہوگا۔

(۲) ڈرائیور صاحب نے سڑک کے موڑ پر لاری آہستہ کر کے موڑی۔ فوراً ایک طالب علم نے کہا "ماسٹر صاحب!" ایک دن ڈرائیور صاحب نے جو تیز لاری موڑ دی تو ہم سب لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے"۔

(۳) ماسٹر صاحب! لاری میں زیادہ پٹرول خرچ ہوتا ہے یا کار میں؟

(۴) بچے موٹر میں رفتار بتانے والی سوئی کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جونہی لاری تیز یا ہلکی ہوتی وہیں ایک دوسرے کو رفتار بتانے لگتے۔

(۵) لاری کی اگلی سیٹ سپرنگ دار تھی۔ میں اس پر بیٹھا ہوا موٹر کی معمولی حرکت پر اچھل جاتا تھا۔ لڑکے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ دیکھو! ماسٹر صاحب خوش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سپرنگ سے واقف ضرور تھے۔

(۶) ایک بچے نے بتایا کہ ایک دن ہم لاری میں سو گئے۔ جب ڈرائیور صاحب کو کسی نے اطلاع دی تو انھوں نے چلتی لاری ایک دم روک لی زور کا جھٹکا لگا اور ہم دھم سے دو سیٹوں کے درمیان آرہے۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ ہوا ہم ندامت سے سر نہ اٹھا سکتے تھے۔

(۷) لوہے کے کارخانوں کا مشاہدہ کراتے وقت مستری صاحب نے بتایا کہ ہمارا انجن ایک ہارس پاور کا ہے۔

(۸) کاغذی کی دکان پر منیم نے بتایا کہ فلاں کاغذ ناروے اور سوئیڈن سے بن کر آتا ہے۔ کیونکہ وہاں جنگلات پائے جاتے ہیں۔ یہ کاغذ ایک قسم کی لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔

(۹) ایک بچے نے دریافت کیا کہ ہماری لاری سے چنگی کیوں نہیں لی جاتی؟

(۱۰) اسکول کی لاری پر اگر لڑکے زیادہ ہوں تو چالان کیوں نہیں ہوتا؟

(۱۱) ماسٹر صاحب برف کا کارخانہ دکھا دیجئے۔

ارشادات جگر

(۱)

فتنۂ روزگار میں امن ہے کیا قرار کیا
حاصلِ زیست غم سہی غم کا بھی اعتبار کیا

عشق کمالِ ہوش ہے، ہوش سے ننگ و عار کیا
سینۂ چاک چاک کیوں، دامن تار تار کیا

جان ہے کس شمار میں، جان پہ اختیار کیا
ہو چکے ان کے جب ہمیں، ان پہ کریں نثار کیا

فطرتِ شوق کی قسم، غیرتِ عشق کی قسم
دولت دو جہاں سہی، دولت مستعار کیا

تیری نصیحتیں بجا۔ یہ تو بتا کہ ناصحا
اور ہے عشق کے سوا مقصد حسن یار کیا

عشق خزاں مزاج سے، لطف جمال پوچھئے
جس کی نظر ہو خود بہار اسکے لئے بہار کیا

ناز سے مسکرا کے دیکھ چشم حیا اٹھا کے دیکھ
دل سے حریف کے لئے نیچی نظر کا وار کیا

سوز تمام چاہیئے رنگ دوام چاہیئے
شمع تہ مزار ہو، شمع سر مزار کیا

میں نے کیا ہی جرم عشق مجھ سے ہوئی خطائے شوق
خواہش عفو کس لئے بخشش حسن یار کیا

منزلِ عشق میں جگرؔ غیر تو پھر بھی غیر ہیں
دل کا بھی اعتماد کیوں، اپنا بھی اعتبار کیا

۱۸ اکتوبر ۳۹ء

(۲)

وہی اس نظر میں ہیں کھپ جانے والے — جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے کوئی جبیں پر — پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں — مرے حال پر رحم فرمانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں — سلامت رہیں ان کو بہکانے والے

مری طاقتِ ضبط کی خیر یارب — کرم پر تلے ہیں ستم ڈھلنے والے

جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت — وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

ترے اک اشارے پہ ساکن کھڑے ہیں — نہیں کہہ کے سب سے گذر جانے والے

ترے حسن کا راز کیوں کر چھپاؤں — مرے دیدہ و دل پہ چھا جانے والے

محبت سے انکار کب تک کہاں تک
مرا نام بھی سن کے شرمانے والے

۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

تنقید و تبصرہ

(تنقید و تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہئیں)

ابو الخمر: ٹالسٹائے کی مشہور تمثیل (THE FIRST DISTILLER) کا ترجمہ ہے، جسے حضرت مجنوں گورکھپوری نے کیا ہے۔

کتاب میں ٹالسٹائے نے اپنی مخصوص انداز میں شراب کے مہلک اثرات دکھائے ہیں ڈرامے کو شروع اس طرح کیا ہے کہ شیطانوں کا سردار۔ اپنے ماتحتوں سے ان کی کارروائیوں کی تفصیل دریافت کر رہا ہے۔ تمام شیطان اپنی اپنی کامیابی کی تفصیل سے بیان کرتے ہیں لیکن جس شیطان کے سپرد کسانوں کو ورغلانا ہے وہ نہایت مایوسی سے جواب دیتا ہے کہ میں ان کے پاک دلوں پر قبضہ نہیں کر سکا۔ سردار اسے سخت سزائیں دیتا ہے، تو وہ آئندہ اپنے فرائض کو زیادہ تن دہی سے انجام دینے کا وعدہ کرتا ہے اور اپنے سردار سے اجازت لے کر کسانوں کی دنیا میں جاتا ہے۔ اپنی عیاری سے انھیں شراب کا غلام بنالیتا ہے۔ ان کی زندگی بہشت سے دوزخ بن جاتی ہے۔

حضرت مجنوں نے ترجمہ بھی بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے، زبان ستھری، بامحاورہ اور ادبی ہے۔

کتاب انوار بک ڈپو لکھنؤ سے ۶ر میں مل سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی قیمت ۴ر ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔

زندگی کے کھیل۔ حضرت ل۔ احمد اکبرآبادی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کتاب عظیم اظہر، منٹولہ، آگرہ اور آرمی پریس شملہ سے عہ ر میں مل سکتی ہے اس مجموعہ میں، بارہ افسانے ہیں، اور ان سب میں ہماری سماجی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ل۔ احمد صاحب ایک کہنہ مشق ادیب اور افسانہ نگار ہیں اور ایک خاص قسم کے رنگین

طرز انشار کے مالک ۔ اسی رنگینی کی جھلک افسانوں کے زیر نظر مجموعہ میں بھی جا بجا ہے۔
افسانے بعض بہت دلچسپ ہیں لیکن بعض میں انداز بیان کی طوالت کی وجہ سے دلچسپی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حفیظ جونپوری:۔ یہ ایک ۲۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے۔ جسے کاملؔ جونپوری نے مرتب کیا ہے شروع میں حفیظ جونپوری کا عکس تحریر ہے۔ دس صفحوں میں حفیظؔ مرحوم کے مختصر حالات ہیں اور کلام پر تھوڑا سا تبصرہ۔ لیکن دونوں کاموں میں تحقیق اور ذمہ داری سے کام نہیں لیا گیا ہے کوئی ۴ اصفحات میں حفیظؔ کے کلام کا انتخاب ہے۔ انتخاب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں حفیظؔ اچھے شاعر تھے اور ضرورت ہے کہ ان کے حالات اور ان کا کلام عام طور پر لوگوں کے سامنے آئے، کامل صاحب کو چاہئے کہ اس کام کو ذرا اور محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

حفیظ کا جو انتخاب اس رسالہ میں ہے اس میں بعض شعر اچھے ہیں ؎

وہ سخی ہے جو اہل حاجت کا
بھر دے دامن سوال سے پہلے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

بھی جی چاہتا ہے منہ چھپا کر روئیے برسوں
طبیعت خود بخود ایسی کبھی مغموم ہوتی ہے

پس پردہ:۔ منشی چندر بھوشن سنگھ کے افسانوں کا مجموعہ ہے، لکھائی اور چھپائی اچھی ہے کتاب پر جلد بھی بندھی ہوئی ہے، کتاب کی قیمت ۴ ار ہے اور آزاد آفس کانپور مل سکتی ہے۔
مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں۔ جن میں سے اکثر پر پریم چندر اور سدرشن کے رنگ کی جھلک ہے، لیکن پلاٹ اور فن کی دوسری نزاکتوں کے لحاظ سے وہ ان کے ہم پلہ

نہیں۔ کسی کی تمہید دلچسپ ہے تو کسی کا خاتمہ۔ طرز بیان البتہ جگہ جگہ دلکش ہے اور رسد رشن کا انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً

"گھمنڈی لال چپ تھے، راج رانی بڑبڑا رہی تھی۔ پتھر پڑا دوبے پڑ رہے تھے"۔

"اتنے دنوں تک وہ پتھر کے نیچے دبی ہوئی دوب تھی۔ اب اس کی چھاتی سے پتھر ہٹ گیا تھا اور آزادی کی ہوا نے اس کا رنگ نکھار دیا تھا"۔

"جنگل کی آگ پانی سے نہیں بجھتی"

سلسلۂ عصمت کے دو نمبر پیش نظر ہیں ۱۴۹ اور ۱۵۰

کپڑے کی چھپائی۔ مصنفہ اقبال احمد صاحب ا، صفحات، لکھائی چھپائی معمولی، کپڑا چھاپنے کی صنعت کا حال اور اس کی مختلف ترکیبیں بیان کی گئی ہیں۔ چھاپنے کے طریقے رنگوں کے اقسام وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب ماہرین فن اور مبتدیوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ بڑے پیمانہ پر اس صنعت کو جاری کیا جائے۔ قیمت ۱۰ ار۔ ملنے کا پتہ۔ عصمت بک ڈپو دہلی۔

دیہاتی گیت:۔ مصنفہ ڈاکٹر اعظم کریوی۔ تعداد صفحات ۸۲۔ چھ مختلف عنوانات کے ماتحت دیہاتی گیت جمع کئے گئے ہیں، اصل کے ساتھ صحیح اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے یہ گیت دیہاتی زندگی کی کیفیات نمایاں کرنے کے لئے نہایت اچھا ذریعہ ہیں، اگر اس قسم کے گیت وغیرہ بہت زیادہ جمع کئے جائیں تو نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ تمدنی تاریخ کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوں گے۔ نیز اہل نظر کے لئے ان میں دلچسپی کا سامان بھی کافی موجود ہے۔ کیونکہ وہ فطرت انسانی کو بے نقاب حالت میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم صاحب کی یہ دلچسپ کوشش ضرور قابل داد ہے۔ ایک بہت بڑی کمی کو انھوں نے پورا کیا ہے لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت آٹھ آنہ

دی مغل لائن لمیٹڈ

حج سروس

مغل لائن نے حکومتِ ہند کے اس اعلان (کومیونکے) کو دیکھا ہے، جو حج کے متعلق ۱۴ اکتوبر کو جاری کیا گیا۔

مغل لائن اس سلسلے میں حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہی ہے اور کمپنی کو یہ امید ہے کہ وہ بہت جلد حاجیوں کے جہازوں کی روانگی کا پروگرام شائع کر سکے گی۔

عازمانِ حج سے درخواست ہے کہ وہ حاجیوں کے جہازوں کی روانگی کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے "دی مغل لائن لمیٹڈ بمبئی" سے خط و کتابت کریں۔ حکومت ہند سے گفت و شنید کے فیصلے کے بعد فوراً ہی جواب دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ، بمبئی

تفسیر بیانُ لِلنَّاس

قرآن مجید کی بے شمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی لیکن ذرا تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر تفسیرِ قرآن ہونے کی بجائے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور اعتقادات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے ائمہ و اجلہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے (اِلّا ماشاء اللہ) قرآن کو، کہ قول الٰہی ہے، آیاتِ قرآنی اور صحیفۂ فطرت (کہ فعل الٰہی ہے) کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی تصنیف کو اُس کے مصنف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ بس یہی ضرورت تھی جو محرک ہوئی تفسیر پیش نظر کے وجود میں آنے کی۔ قدما میں بھی خال خال ایسے لوگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے ماحول کے لحاظ سے نہایت قابل قدر تفسیریں لکھیں لیکن چونکہ قرآن ایک مخصوص ماحول کا پابند نہیں۔ کسی خاص فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں۔ کسی متعین زمانہ اور محدود ملک کی ضرورتوں کا متکفل نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ عصرِ حاضر تک کی ترقی علوم و تجارت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ایک عمیق مطالعہ تمام کائناتِ انسانی کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اس تفسیر میں یہ چھ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) اس کے مخاطب بلا لحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

(۲) اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔

(۳) ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو محفوظ رکھا گیا ہے۔

(۴) اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے جو محکمات سے واضح ہے۔

(۵) اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے۔

(۶) قانون وراثت کا احیا۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا دبیز۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، باوجود ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے قیمتیں نہایت مختصر یعنی:۔ منزل اوّل صفحات ... مجلد سنہری (اسے) منزل دوم (اعہ) منزل سوم (اعہ) منزل چہارم (اعہ) منزل پنجم (اعہ) منزل ششم (اعہ) منزل ہفتم (اعہ)

منگانے کا پتہ:۔ **دفتر اُمت مسلمہ امرتسر**

مطبوعات امیریہ دار التصنیف و التالیف لکھنو

دیوان ثاقب:۔ یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں حجم پانچسو پچاس صفحات قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ (علاوہ محصول ڈاک)

انیس الاخلاق:۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و التالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت ۵ر علاوہ محصول ڈاک۔

گیس کا دفاع:۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے! اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھکر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اسکی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۴ر علاوہ محصول ڈاک۔

مفتاح البیان:۔ حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابو البیان مولینا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جیدپی مولف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت ہر حصہ عہ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:۔ **دفتر امیریہ دار التصنیف و التالیف محمود آباد ہاوس قیصر باغ لکھنو**

دو نادر کتابیں

جذباتِ بسمل منشی سکھ دیو پرشاد صاحب سنہا بسمل (الہ آبادی) کا مجموعہ کلام" کتاب کا نام جذبات بسمل بہت موزوں ہے کیونکہ جذبات ہی مصنف کے کلام کا بہترین امتیاز ہیں۔ زبان کی سادگی اور سلامت ان کے کلام کی دوسری خصوصیت ہے۔ اور کیوں نہ ہو فن شاعری میں آپ ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مدظلہ کے شاگرد ہیں جو فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے بلند پایہ تلامذہ میں ہیں۔"

جناب بسمل زمانہ حال کے مقبول شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ زبان کی سادگی کی وجہ سے ان کا کلام بہت پسند کیا جاتا ہے۔ آج کل جتنے اچھے اُردو رسالے چھپتے ہیں وقتاً فوقتاً بسمل صاحب کے کلام سے مزین ہوتے ہیں شروع کتاب میں آنریبل جسٹس سر عبدالقادر جج ہائی کورٹ لاہور نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے، ۲۱ تصویروں سے "جذبات بسمل" مزین ہے جس میں زیادہ سہ رنگی تصاویر ہیں اور بعض ہندوستانی فن تصویر کا بہترین نمونہ ہیں۔ لکھائی چھپائی کے متعلق صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ایسی نفاست و خوشنمائی سے کوئی کتاب اردو زبان کی آج تک شائع نہیں ہوئی کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے للعہ

پیام روح یعنی مجموعہ کلام مسٹر حامد اللہ افسر بی اے" مع تقریب از آنریبل سر شاہ سلیمان صاحب ایم اے، ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ و مقدمہ از میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں" لاہور۔ میرے خیال میں ظاہری صورت اور باطنی خوبیوں کے لحاظ سے یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ اُسے زبان اردو کی بہترین اور پائدار تصنیفات کے ساتھ جگہ دی جائے اس ظاہری و معنوی محاسن پر میں لایق شاعر کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ پبلک انھیں وہ داد دے گی جس کے وہ مستحق ہیں" (میاں بشیر احمد بی اے آکسن) بیرسٹر ایڈیٹر ہمایوں لاہور
افسر کا نام اور کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی شہرت خود ان کی مقبولیت کا ثبوت ہے "پیام روح" اُن کی تمام نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے اس کی اشاعت سے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا" (آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم اے ایل ایل ڈی چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد) کاغذ دبیز لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ ۶ ہاف ٹون تصویریں جن میں تین سہ رنگی ہیں۔ اس مجموعہ سے کتبخانہ خالی نہ رہنا چاہیئے۔ قیمت صرف تین روپے سے

مینجر بکڈپو، انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔ اور اپنے پیروؤں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے، اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی۔ تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ پیروانِ اسلام کی شمشیرِ خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا۔ اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتابِ عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اور اسکے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی۔ مگر خود اسکے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی۔ تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین و آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا اس تمام مورخانہ تحقیق و تفتیش اور عالمانہ بحث و اکتشاف سے ان کا منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں۔ جسکے خود ان کی اپنی خونریزیوں کے خلاف امنڈ آنے کا اندیشہ ہے؟ لیکن انسان کی یہ کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو دماغ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اسکے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، اور اسی لیے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کیے جاتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کر لیا کہ کسی آسمانی وحی کو بھی اس طرح قبول نہ کیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کماحقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو الجہاد فی الاسلام کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک بھی پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بے جلد چار روپے مجلد پانچ روپے۔

پتہ: دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

جدّت ہندوستان کا بہترین سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے

ہفتہ میں دو بار جدّت مُراد آباد

اس کی خریداری کے لئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال، آنریبل سر سکندر حیات خاں، وزیر اعظم پنجاب، راجہ صاحب محمود آباد و دیگران لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپیلیں شائع کی ہیں۔

جدّت دل کش نظموں، بہترین جنگی تبصروں، بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ، اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔

یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے۔ بلکہ پُرانا ہے۔ اس کی تیرھویں جلد ہے اس اخبار کی ایڈیٹری کے لئے ملک کے ایک ایسے مایۂ ناز اہل قلم و انشا پرداز گریجویٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کئی روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کر چکے ہیں۔

جدّت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپے کے صرف پانچ روپے سالانہ اور ۲عہ/ ششماہی اور ۱ہہ/ سہ ماہی مقرر کی ہے۔

شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرا لیں۔

ایجنٹ صاحبان کو ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جاوے گا

چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے، اس لئے مشتہرین کے لئے بہت منفعت بخش ہے۔

منیجر

اخبار جدّت مُراد آباد، پرنس روڈ۔

ہفتہ وار "کرتی لہر" (اردو۔ گرمکھی)

ہندوستان کا سب سے زیادہ قربانیاں دینے والا اخبار ہے۔ جس نے اپنی چودہ سالہ زندگی میں ہزار روپیہ ضمانتوں اور ضبطیوں میں اور درجنوں کارکنان جیل خانوں میں بھینٹ چڑھا دئے۔

ہندوستان عوام کا سب سے بیخوف اور بے باک ترجمان ہے جس کا ہر مضمون شہنشاہیت کی جڑ پر ضرب کاری سمجھا جاتا ہے اور کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا جو اس کے نمبر متعدد مرتبہ ضبط نہ ہوتے ہوں۔

ایک آنے میں ملک کے سب ویکلی اخبارات سے زیادہ مواد اور ٹھوس مضامین پیش کرتا ہے، ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاسیات پر اس کے آرٹیکل ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس لئے یقیناً اس قابل ہے کہ ہر بیدار مغز ہندوستانی کے مطالعہ میں رہے۔ چندہ سالانہ للعہ ششماہی عہ بیرونی سالانہ صہ ششماہی عہ اس میں اشتہار دینا تجارت کی کامیابی کا ضامن ہے۔ (اجرت بہت کم)

جنرل منیجر "کرتی لہر" کچہری روڈ میرٹھ

صوبہ بہار کا کثیر الاشاعت بلند پایہ ہفتہ وار

اپنے دلچسپ مضامین، اہم سیاسی مقالات، تازہ ملکی و بیرونی خبروں اور دیگر پر معلومات اطلاعات کی بنا پر اعلیٰ درجہ کے اردو جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ فن صحافت کے مشہور مبصر حضرت مولانا ظفر علی خاں قبلہ ایم ایل اے (مرکزی نے) اس اخبار کے متعلق ذیل کے شاندار الفاظ میں اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

"میری نظر سے آئینہ" کی متعدد اشاعتیں گزریں، اس کے مدیر مولانا محمد اسمٰعیل ناصح ایک مشاق صحیفہ نگار ہیں اور ان کے قلم میں روانی کے ساتھ زور بھی موجود ہے۔ اخبار کے بین السطور سے بیباک صداقت اور آزادی صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اخبار کی اشاعت میں کوشاں ہوں اور ایک بہت بڑی ملی ضرورت کو پورا کریں۔" سالانہ چندہ ستے، نمونہ مفت،

پتہ:۔ منیجر "آئینہ" کشن گنج، ضلع پورنیہ

بہترین کتابیں

طلسمِ خیال۔ کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ہے' ان کے افسانے ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں' ان میں حیات انسانی کا گہرا مطالعہ ہے' موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز نشتر بھی ہیں' اور واقعیت کے ساتھ محبت و رومانیت کی خوشبو بھی۔

کرشن چندر ایم' اے — مجلد ایک روپیہ چار آنے

ترکی جمہوریہ۔ میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے' ترکی انقلاب سے پہلے کیا تھا، انقلاب کے بعد ترکوں کے ذہن میں کیا انقلاب پیدا ہوا، ترکی کے متعلق مستند اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بیحد مفید ہے۔

سید ضمیر احمد ہاشمی — مجلد مطلا دو روپے

شعلے۔ فطرت انسانی کے اسرار و رموز آشکار کرنے والے ریاکاری کی خس و خاشاک جلانے والے "افسانے" وہ کتاب جسے ادیب شاعر چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں، زبانی کوستے ہیں اور دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔

احمد علی ایم' اے (مصنف ضبط شدہ کتاب انگارے) — مجلد ایک روپیہ

لینن۔ یقیناً یہ مزدوروں کا رہنما انیسویں صدی میں سب سے بڑا انسان تھا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے روس کی کایا پلٹ دی، کون ہے جو اس لوہے کے انسان' اس مزدوروں کے پیغمبر' اس بہادر سپاہی کے سوانح حیات کو دلچسپی سے پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔ مصنفہ ڈی' ایس' مرسکی۔ مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف — مجلد عہ

صحرا نورد کے خطوط۔ رومان انگیز دنیا میں بھٹکنے والے صحرا نورد کی کتاب زندگی کے ہیجان خیز اوراق جن کا ایک ایک لفظ آپ کو قعر حیرت میں گم کر دے گا۔ مرزا ادیب بی' اے — عہ

کمپنی کی حکومت۔ داستان ہے اس صد سالہ دورِ پُر آشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔ اشتراکی ادیب باری — مجلد ڈیڑھ روپیہ

مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں

منگوانے کا پتہ:۔ مکتبہ اُردو۔ لاہور

مصری جدید برقعہ

دو حصوں میں منقسم

تشریح زیریں حصہ	تشریح بالائی حصہ
کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنے تک رہتا ہے اس کی وضع مثل اورکوٹ کے ہے کمر کے اوپر خوبصورت پلیٹ پڑے ہیں پہلو میں جیب ہے کالر بھی مثل اورکوٹ ہے	سر سے شروع ہو کر ہاتھوں کی لمبائی تک رہتا ہے اس میں نہایت خوبصورت جنٹ دار ٹوپی ہے جس کے پہننے سے نہ سر کا نشیب ظاہر ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کی تکلیف۔

بشرط واپسی منگائیں۔ آپ کندھے سے پیر کے ٹخنے تک اور سر کی گولائی ناپ کر روانہ کریں۔ قیمت سفید رنگین سوتی ۶/ نسری عہ کریب سلک ۱۲/ بوسکی سلک ۱۵/ ناپسند ہونے پر اسی دن واپس کریں۔

خاتون اسٹور ۲۵ فتحپوری دہلی

سالانہ چندہ دو روپے | **پیامِ نسواں** لکھنؤ | نمونہ مفت

خواتین ہند کا ایک بیش قیمت رسالہ

جس میں

ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور انشا پرداز خواتین کے علمی مضامین معاشرتی افسانے۔ روح نواز نظمیں، ادبی مقالے، طبی معلومات، نجوم اور قیافہ کی دلچسپیاں، بچوں کی پہیلیاں، معمے اور کشیدہ کاری کے خوب صورت نمونے شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی تمام خوش مذاق عورتیں "پیام نسواں" کو شوق سے پڑھتی ہیں۔ کتابت طباعت اعلیٰ۔ کاغذ سفید چکنا۔ ٹائیٹل خوب صورت۔ سالانہ چندہ دو روپے

مینجر "پیام نسواں"۔ ماڈل ہاؤس لکھنؤ

ایجنسی کی کتابیں

حیدر علی:۔ مصنفہ محمود خاں محمود۔ مصنف تاریخ سلطنت خداداد اور میسور۔ میسور کے اسلامی عہد یعنی نواب حیدر علی بانی سلطنت خداداد کے زمانے کی ایک حسین و جمیل داستان جس میں عشق و محبت کے حیرت انگیز واقعات کو نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ایک قوم پر جب زوال آتا ہے تو اس کی سیاست کس قدر سطحی، اس کے رہنما کیسے گمراہ اور مذہب کے نام پر عوام کو کس طرح فریب دیا جاتا ہے۔ قیمت صرف ۸ر

خیالات مہاتما گاندھی:۔ از سی۔ ایف اینڈ ریوز۔ اس کتاب میں ان بڑے بڑے اصولوں اور خیالات کی جو مہاتما گاندھی کی پراز معلومات زندگی کا طرۂ امتیاز رہے ہیں، تحریری شہادت ہے۔ مہاتما گاندھی کی ان تمام تقریروں اور تحریروں کے محدود اقتباسات درج کئے ہیں جن میں انھوں نے پبلک سے خطاب کیا ہے۔ قیمت ہر دو حصص ۱۲ر

حیات النبی:۔ یہ ایک میلاد نامہ ہے شروع میں مروجہ طرز بیان کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کے بعد زیادہ تر بیان حضور کے اخلاق و عادات کا رکھا گیا ہے تاکہ خیر و برکت کے ساتھ ساتھ حضور کی حیات پاک کا ایک مختصر خاکہ ذہن نشین ہو سکے۔ اس میں ایک حصہ ایسا بھی رکھا گیا ہے جس سے نئی روشنی اور غیر مذہب والوں کو بھی دلچسپی پیدا ہو سکے۔ قیمت ۱۰ر

چندر ہاس:۔ پروفیسر رام سروپ کوشل راج کمار چندر ہاس کی پیدائش، سلطنت کی تباہی، الشور بھٹکتی اور پھر مقابلہ کر کے سلطنت واپس لے لینا ایسے واقعات ہیں کہ کتاب بغیر ختم کئے چین نہیں آتا۔ قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

دکن کے تعلیمیافتہ طبقوں کے احساسات کا ترجمان

اور حیدرآباد کا واحد قوم پرست اخبار

روزنامہ "پیام"

بہ اعتبار اپنے مضامین اور مسلک کے ایک مخصوص

حیثیت رکھتا ہے

خواتین اور بچوں کیلئے اسکے صفحات

پر دلچسپی کا بہت سامان مہیا کیا جاتا ہے

مشتہرین جو سلطنت آصفیہ کے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقوں

تک پہنچنا چاہیں "پیام" کے صفحات کو اپنا وسیلہ بنائیں

مہتمم روزنامہ "پیام" ۔ حمایت نگر

حیدرآباد دکن

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے آنرز فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست، چند اور بند
۲۔ مسائل ملی: سنت مالویہ اور سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند
۴۔ مسلمان اور کانگرس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس
۹۔ مسلمان اور آزادی۔
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۔۔ ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ بمبئی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرول باغ ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ

جامع مسجد ۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

لوہاری دروازہ ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ

امین آباد ۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ

پرنس بلڈنگ جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳

مطبوعات جامعہ

اجتماعیات

(الف) سیاسیات معاشیات وغیرہ

معاہدہ عمرانی۔ قیمت مجلد عہ آزادی ۔ قیمت عمر

محکومیت نسلوں۔ قیمت عمر مبادی معاشیات۔ قیمت ۱۲ر

سیاسیات کی پہلی کتاب۔ قیمت ۱۴ر ہندستان کا دیہی قرض قیمت ۱ر

دیہی صنعتیں۔ قیمت ۲ر ہندستان میں زراعت کا مسئلہ ۱۴ر

جدید دستور کا خاکہ قیمت ۲ر شہری آزادی قیمت ۱۴ر

ہندستان میں برطانوی حکومت ۹ر کسان ۔ قیمت عمر

مالیات عامہ۔ قیمت عہ قوم کی آواز۔ قیمت عمر

اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ قیمت ۸ر نہرو رپورٹ قیمت مکمل عمار

مسئلہ آبادی۔ قیمت ۱۴ر

(ب) تعلیم

پیتا نوانی۔ قیمت عمر مسلمانوں کی آئندہ تعلیم قیمت ۵ر

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب۔ اردو، ہندی، انگریزی ہر ایک کی قیمت ۸ر

ایمیل (زیر طبع)

معیار تعلیم (زیر طبع) بنیادی دستکاری ،،

باغبانی پر دھکٹ۔ قیمت ۲ر میلا دہنی پر مکٹ قیمت ۵

بیت بازی پر مکٹ (زیر طبع) اردو لکھائی کا آسان طریقہ قیمت ۱ر

تعلیم بالغان کے قاعدے قیمت ۳ر حصہ اول قیمت ۔ر

حصہ دوم قیمت ۰ر حصہ سوئم قیمت ۰ر

مدرس کا قاعدہ نیا قیمت ۲ر حرفہ کا قاعدہ قیمت ۲ر

آسان قاعدہ قیمت ۸ر بچوں کا قاعدہ قیمت ۱۴ر

نیا قاعدہ۔ قیمت ۸ر ہندستانی کی پہلی کتاب قیمت ۲ر

نئی کتابیں: پہلی کتاب ۲ر دوسری کتاب قیمت ۷ر

تیسری کتاب قیمت ۸ر چوتھی کتاب قیمت ۹ر

تاریخ

تاریخ ہند کی تمہید۔ ۵ر دنیا کی کہانی قیمت عمر

ہندوستان کے آثار قدیمہ ۵ر دلی کی دستاویزوں کی تاریخ ۵ر

تاریخ ہند قدیم۔ قیمت ۸ر ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ۱۲ر

تاریخ مغربی یورپ قیمت عہ صحیفہ چین۔ قیمت عمر

جاپان ۔ قیمت ۱۴ر تاریخ الامت ———

سیرۃ الرسول عہ ۱۴ر خلافت راشدہ قیمت عہ ۱۴ر

خلافت بنو امیہ۔ قیمت عہ خلافت عباسیہ۔ قیمت عہ ۱۴ر

عباسیہ بغداد قیمت عہ ۱۴ر عباسیہ مصر قیمت عہ

خلافت عثمانیہ قیمت ۱۴ر تاریخ نجد۔ قیمت عمر

دور متقدمین ۲ر دور متوسطین ۲ر
دور متاخرین ۲ر دور حاضر ۲ر
ضرب الامثال ۲ر کلام جوہر ۸ر
دیوان غالب قسم اول عہ قسم دوم عار
قسم سوم عہ دیوان شیدا قسم اول عہ
قسم دوم عار تسخیر یابس ۱۵ر
فردوس خیال ۸ر مسدس حالی ۸ر
سبد چین ۶ر جواہر ۳ر
رباعیات اخگر ۸ر تخمیس ۸ر

(ج) ناول و افسانے

میدان عمل عہ گئو دان عہ
بیوہ عہ واردات عہ
خیالستان عہ دلی کا سنبھالا عہ
کیمیاگر عہ بنی اسرائیل کا چاند عار
نیرنگ عہ

(د) ڈرامے

پردۂ غفلت ۸ر انجام ۶ر
کھیتی ۶ر گناہ کی دیوار ۸ر
ہمزاد ۶ر صید زبوں ۱۰ر
نقش آخر ۱۰ر نیم شب ۸ر
نفرت کا بیج ۶ر

(ہ) قواعد و لغت

نور اللغات قیمت ہر چہار حصص - چالیس روپئے
قواعد عربی عار ضرب الامثال ۸ر

مذہب

بیان ۱۲ر صراط مستقیم عار
سبیل الرشاد ۱۰ر عبرت ۱۲ر مجلد عہ
برہان ۱۲ر سبیل السلام ۱۲ر
ذکری عار مجلد عہ بصائر ۸ر

متفرقات

مشاہدات سائنس عہ اسلامی تہذیب و فنون نعیم
قواعد و اسلامی تعلیم کا نظام ۳ر مسلمانوں کی تعلیم ادر جامعہ ۲ر
لطائف غالب ۳ر

بچوں کی کتابیں

ہمارے نبی ۳ر آخری نبی ۲ر
قرآن پاک ۲ر رسول پاک ۸ر
آنحضرت ۲ر بنات رسول ۵ر
سرکار دو عالم ۲ر سرکار کا دربار ۲ر
خلفائے اربعہ ۲ر چاریار ۶ر
دین نستعلیق ۵ر عقائد اسلام ۱۰ر
ارکان اسلام ۲ر ہمارا دین ۲ر
اردو لڑکیاں ۲ر چالیس صحابیہ ۲ر

محاسن اسلام	۸ر	اچھی باتیں	۴ر
مسلمان بیبیاں	۶ر	نبیوں کے قصے	۵ر
اسلامی تاریخ کی کہانیاں	۱۰ر	تاریخ ہند کی کہانیاں مکمل	۸ر
دہلی	۴ر	دعوتیں کی پھانسی	۸ر
کائنات	۳ر	دنیا کے بسنے والے	۵ر
دنیا کے بچے	۵ر	تعلیمی کھیل	۲ر
بچوں کی نظمیں	۳ر	بچوں کے اسمبل	۵ر
بچوں کا چڑیا گھر	۳ر	بچوں کی رباعیاں	۱ر
سمندر کا عجائب خانہ	۱۰ر	ایورسٹ کی کہانی	۵ر
ننگا پربت	۳ر	جادو کا جہاز	۲ر
جھوٹے اور سچے دوست	۲ر		

کہانیاں :-

ننھی مرغابی	۲ر	بچوں کی کہانیاں	۲ر
لال مرغی	۲ر	جگنو کی بلی	۲ر
مرغی اجمیر چلی	۲ر	تانبیل خاں	۲ر
پوی جو کر مٹھائی سو نکل بھاگی	۲ر	چھوٹا چھو	۴ر
نیت کا پھل	۳ر	شیدلا	۳ر
چھدو	۲ر	انعامی مقابلہ	۳ر
بیکاری	۳ر	شہزادی گلنار	۳ر
عقاب	۳ر	ترکوں کی کہانیاں	۴ر
دو بھائی	۳ر		

ڈرامے

دیانت	۲ر	شریر لڑکا	۳ر
قوم پرست طالب علم	۳ر	بچوں کا انصاف	۳ر
اسکول کی زندگی	۳ر	کایا پلٹ	۳ر

THE GREAT PROPHET.

مصنفہ

ایف۔کے۔ خاں درّانی

یہ آنحضرتؐ کی مختصر سوانح عمری ہے۔ مصنف نے رسول مقبولؐ کو ایک مکمل انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ طرزِ بیان اتنا آسان ہے کہ بچے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ قیمت عہ

THOUGHTS ON THE PRESENT DISCONTENT

مصنفہ

مولانا محمد علی

اس میں مولانا مرحوم نے نہایت واضح طور سے ہندوستان کی سیاسی بے چینی اور اس کا علاج بتایا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے لئے یہ ایک مفید حل ہے۔ قیمت ۸ر

THE NATIONS OF TO-DAY

مصنفہ

John Buchan

ماضی کی تاریخ مستقبل کے واقعات کا پس منظر ہے جب تک اس پر نظر نہ ہو دنیا کی سیاست انسان کے بے جان چیز ہے تمام اقوام کی تاریخ پر ایک مفید سلسلہ نیشنز آف ٹوڈے کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے کو ایسے کتب خانے میں ضرور رکھنا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت جو دس جلدوں پر مشتمل ہے ماشہ ۱۲۵ روپے ہے پبلک لائبریری کیلئے رعایت بھی ممکن ہے۔

INDIA IN THE BALANCE

مصنفہ

خواجہ کمال الدین بی۔ اے

اس کتاب کا خاص مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کے سامنے ہندوستانیوں کی اصلی حالت صفائی اور بے باکی سے پیش کی جائے مصنف نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ غیر جانبدارانہ طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا ایک مرقع پیش کیا جائے اور بتایا جائے کہ مستقبل میں انکے جذبات کی صورت اختیار کرنے والے ہیں قیمت ۲ر

انگریزی کی چند اچھی کتابیں

THE QUEST FOR EMPIRE.

مصنفہ

ڈاکٹر محمود حسین پی ایچ۔ ڈی

مسئلہ نوآبادیات پر نہایت مفصل و مشرح بحث۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان کے توسیع پروگرام پر خاص نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد ســ؏

NIZAMUL MULK ASAFJAH

مصنفہ

ڈاکٹر یوسف حسین ڈی لیٹ

مصنف نے بہت مستند ماخذوں سے نظام الملک اور اس کے زمانے کی تاریخ مجتمع کی ہے نظام الملک کی حیثیت اس معنی میں اور بھی اہم ہے کہ اس نے مغلیہ حکومت کے آخری تباہ کن دور میں کوئی معمولی کام انجام نہیں دیا ہے۔ طرز بیان تنقیدی ہے اور دلچسپ۔ تاریخ کے طلباء کو عموماً اور مغلیہ عہد آخری دور پڑھنے والے طلبا کو خصوصاً اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ـلــ؏

THE KHILAFAT & ENGLAND

مصنفہ

ڈاکٹر سید محمود۔ وزیر تعلیم بہار۔

ڈاکٹر محمود نے خلافت کی پچھلی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور نہایت واضح طور سے سلطنت عثمانیہ اور برطانوی حکومت کے گذشتہ اور موجودہ تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔" ابوالکلام آزاد

قیمت ؏

نصہ

تعلیم بالغان پر چند کتابیں

جامعہ کے شعبۂ تعلیم و ترقی نے تعلیم بالغان کے لئے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کئی قاعدے اور عام مطالعہ کے لئے بارہ ۱۲ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ آیندہ ایک سال میں عام مطالعے کی کتابوں کی تعداد پوری ایک سو کر دی جائے گی۔ یہ کتابیں بڑے سائز پر شائع کی گئی ہیں۔ کتابت صاف اور روشن ہے۔ رسم الخط میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگوں کے مطالعے میں آسانی ہو۔ اردو میں اس انداز کی کتابیں اب تک شائع نہ ہوئی تھیں۔ تعلیم بالغان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے انھیں غیر معمولی طور پر مفید پایا ہے۔

نام کتاب	مصنف	قیمت
اردو کا قاعدہ نمبر ۱	ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب سابق وزیر تعلیم بھوپال	-ر
اردو کا قاعدہ نمبر ۲	" " "	٠ر
اردو کا قاعدہ نمبر ۳	" " "	٠ر
مدرس کا قاعدہ نما	" " "	۲ر
نماز		۳ر
حبیب خدا	الیاس احمد صاحب مجیبی	۳ر
صدیق اکبر	" "	۳ر
حکایتیں۔ حصہ اول		۳ر
حصہ دوم		۳ر

نام کتاب	مصنف	قیمت
نقلیں	مولوی شفیع الدین صاحب نیر	ۃر
غزلیں		ۃر
خط وکتابت		ۃر
بھیا غفور پڑھنے لگے		ۃر
میونسپلٹی	شیخ فضل الرحمٰن صاحب قدوائی فجی ایم اے دعلیگ،	ۃر
ضلع کا انتظام	" " "	ـلر
ہمارا ہندوستان		ۃر

جدید اُردو اٹلس

مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے، بی، ٹی سررشتہ تعلیمات سرکار عالی موصوف نے نہایت محنت اور کوشش سے یہ اٹلس تیار کئے ہیں۔ ان کی قبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں داخلِ نصاب ہیں۔ کاغذ طباعت وغیرہ بہترین۔

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

اعتذار

ستمبر ۳۹ء کا رسالہ بعض دشواریوں کے سبب صرف ایک دن تاخیر سے تیار ہوا، اس لیے ڈاک خانہ والوں نے اپنے قاعدے کے مطابق اسے روانہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ لاہور کے صدر ڈاک خانہ سے خط و کتابت میں اتنی تاخیر ہوئی کہ ستمبر کا رسالہ جو شروع مہینے میں شائع ہوتا تھا آخر مہینے میں روانہ کیا جا سکا۔

اکتوبر کا رسالہ بھی کچھ ایسی ہی مجبوریوں کے سبب نسبتاً کم ضخامت پر شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ امید ہے کہ نومبر سے یہ دقتیں نہ رہیں گی۔

اس پرچے سے رسالہ کی ادارت میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اب تک یہ اہم کام پروفیسر محمد عاقل صاحب کے سپرد تھا۔ اب اس مہینے سے ادارت کے فرائض مولوی نور الحسن صاحب ہاشمی انجام دیں گے۔ گو پروفیسر محمد عاقل صاحب رسالے کی ادارت سے سبکدوش ہو چکے ہیں پھر بھی اکتوبر کا رسالہ ان ہی کے مرتب کیے ہوئے مضامین پر مشتمل ہے اور آئندہ بھی امید ہے کہ ناظرین ان کے اعلیٰ مضامین سے استفادہ کر سکیں گے۔ اب تک جس ذوق اور دلچسپی سے جناب عاقل صاحب نے رسالے کا کام کیا ہے میں کارکنان "جامعہ" اور رسالے کے ناظرین کی جانب سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ان کی امداد اور مشورے رسالے کو آئندہ بھی حاصل رہیں گے۔

مہتمم

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ قرول باغ، دہلی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(اس اشاعت میں اس سلسلہ کا دوسرا مضمون شایع کیا جا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اس مضمون کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کریں۔ اس کے قابل عمل اور کامیاب ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکے گا جب اس طریقہ سے تعلیم دیے ہوئے طلبہ زندگی کے کاروبار میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے لیکن تعلیم کے مقاصد اور ذرائع کے پیش نظر تعلیم کے ماہر اگر اس پر تنقید فرمائیں گے تو ممکن ہے اس کی خامیوں، فروگذاشتوں، غلطیوں یا گمراہیوں کو رفع کیا جا سکے۔ مدیر)

اپنے گذشتہ مضمون میں میں نے چار ضمنی کاموں (Minor Projects) کا تذکرہ کرتے ہوئے ان مواقع کو بیان کیا ہے جہاں استاد کوئی سبق، خواہ وہ زبان کا ہو، خواہ جنرل سائنس، اور سوشل اسٹڈیز کا، مربوط حرفہ کر کے پڑھا سکتا ہے ان ضمنی کاموں (Minor Project) میں، جو خاص (Major Projects) کے سلسلہ میں اختیار کئے جاتے ہیں، میں نے صرف انھیں مواقع کا تذکرہ کیا ہے جو بالکل صاف طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بچوں کے سوالات اور ان کی پوچھنے گچھنے کی فطری عادت ان بیان کردہ مواقع سے کہیں زیادہ مربوط پڑھائی کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ لیکن استاد کو چاہیے کہ ضمنی کاموں میں پیدا شدہ مواقع سے فائدہ اٹھائے جتنا مضامین اور مضامین کے اسباق کے عنوانات کو مربوط کر کے پڑھانے کی ضرورت ہو اس لئے کہ بعض اوقات بچوں کی دلچسپی اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ اصل کام یا خاص حرفہ میں دلچسپی کم ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ لہذا استاد کی تھوڑی سی رہنمائی، بچوں کو اصل مقصد یا حرفہ پر دلچسپی اور شوق سے کام کرنے پر قائم رہے گی اور یہ ضمنی کام ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً کرائے جائیں گے اور کسی مضمون یا

کسی مضمون کے کسی سبق کی تکمیل تک ہی اس کام کی دلچسپی کو بڑھایا جائے گا۔

تمام ان مواقع سے جن کا میں نے کسی ضمنی کاموں (Minor Projects) میں تذکرہ کیا ہے کسی ایک جماعت میں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ نہ تمام مواقع کے بیان کرنے کا یہ مطلب ہے۔ بلکہ یہ تمام باتیں کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جماعت کے معیار کے مطابق اس میں سے باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور مواقع کے مطابق اسباق تعلق دے کر پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً لیئی بنانے میں لیئی بننے کا خرچ معلوم کرنے کے لئے زبانی حساب کسی جماعت میں نکل وایا جا سکتا ہے لیکن لیئی میں پانی، میدہ اور نیلا تھوتھا کس نسبت سے ہے اور کتنے کتنے فی صدی ہے؟ یہ باتیں ساتویں جماعت میں تبلائی جا سکتی ہیں، یا کسی چیز کی قیمت کا صرف مرکب کے ذریعہ پھیلانے کا کام چوتھی جماعت میں کرایا جا سکتا ہے۔

کام کرانے والوں کو ایک اور تجربہ ہوگا یعنی کسی عملی کام کے کرانے کے دوران میں بہ یک وقت کئی باتوں کے سکھانے کا موقعہ ملے گا۔ مثلاً گتے سے کام کرانے کے دوران میں مختلف سائز کے گتے ناپ کر کاٹنے میں رقبہ نکلوانے کا موقعہ پیدا ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ چیزوں کی خریداری میں روپے آنے اور پیسے کی جمع، تفریق اور ضرب تقسیم کے سکھانے اور مشق کرانے کا بھی موقعہ پیدا ہوگا۔ اب اگر استاد کے رقبہ سکھانے کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر بچوں کو رقبہ سکھانا شروع کیا ہے تو اسے بغیر اس قاعدے کی اچھی طرح مشق کرائے اور بچوں کو ذہن نشین کرائے روپے آنے کی جمع، تفریق اور ضرب تقسیم کے قاعدوں کے سکھانے کی طرف نہ آنا چاہیئے۔ ورنہ کام میں بے حد انتشار پیدا ہو جائے گا دھیان (Concentration) جاتا رہے گا اور کوئی بات پختہ طریقہ پر نہیں سکھائی جا سکے گی۔ یہی اندیشہ دوسرے مضامین میں بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا استاد کی استادی اور ہوشیاری اسی میں ہے کہ کسی ضمنی کام میں پیدا شدہ مواقع سے اس طرح فائدہ اٹھائے کہ انتشار نہ پیدا ہو۔ یہ صورت نہ پیدا ہو کہ آج ایک بات سکھائی گئی تو کل بچوں کا رجحان کسی دوسری طرف دیکھتے ہوئے دوسری بات سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے طریقہ کار میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ کام میں پیدا شدہ مواقع کی دلچسپی اس وقت تک قائم رکھے جب تک زیر بحث سبق یا حساب کا کوئی قاعدہ پختہ طریقہ پر بچوں کو نہ سمجھا دیا گیا ہو اور اس کی کافی مشق نہ ہو چکی ہو۔

خیال یہ ہے کہ اس طرح کام کرانے سے بچوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بے جا طریقہ پر روکا جائے گا لیکن نہیں اس کی نوبت بہت کم آئے گی۔ اس لئے کہ بچے جس شوق سے کسی بات کے کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں اسی رفتار سے بہت جلد ان کی دلچسپی جاتی رہتی ہے جب تک استاد برابر کوئی ایک طریقہ نہ اختیار کرتا رہے جس سے اس آمادگی اور دلچسپی میں تناہی زور (Force) برقرار رہے جتنا کام کے شروع کراتے وقت نظر آرہا تھا۔ بچوں کی دلچسپیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اصلی اور نقلی۔ کسی کام کے آغاز میں جب بچے آمادگی ظاہر کرتے ہیں، خواہ یہ آمادگی ان میں خود بخود پیدا ہوئی ہو یا استاد کے کام کے پیش کرنے کے دوران میں پیدا ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں استاد کو بچوں کی اس آمادگی کو اچھی طرح پرکھ کر کام شروع کرانا چاہیئے۔ کبھی دو چار سوالات کرنے سے اور کبھی جماعت کی رائے لینے سے بچوں کی آمادگی کے اصلی اور نقلی ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ بچوں کی اصلی دلچسپی میں سنجیدگی اور پختہ آمادگی نظر آئے گی۔ اس وقت ان کی نشست اور طرز گفتگو سے ان کی دلچسپی کے اصلی ہونے کا اندازہ ہو رہا ہوگا۔ آپ کی تھوڑی سی بے توجہی سے ان میں افسردہ دلی نظر آنے لگے گی لیکن نقلی دلچسپی میں یہ باتیں نہ ہوں گی۔ وہ دلچسپی نہ ہوگی بلکہ دل لگی ہوگی۔ اس میں غور و فکر نہ ہوگا اور جب آپ اس کام کے متعلق تجاویز طلب کریں گے تو معنی خیز خاموشی چھا جائے گی جس سے اب اندازہ لگا سکیں گے کہ بچوں نے جس بات کا ارادہ کیا ہے وہ محض تفریح کے لئے ہے، اس سے وہ کوئی تعلیمی فائدہ حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، محض جماعت میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں، لہذا جس دلچسپی میں دل لگی کا شائبہ پایا جاتا ہو اسے کوئی اہمیت نہ دینی چاہیئے اس لئے کہ اس سے کوئی تعلیمی فائدہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ اس وقت بچوں سے کام کرانا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ بچوں کی دلچسپی کو تعلیم کے لئے استعمال کرنا فنی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عملی کام میں بھی دلچسپی اور آمادگی اصل مرکز اور طاقت ہے۔ یہی ربط کی بنیاد ہے۔ بچوں کی اس آمادگی اور دلچسپی کو صحیح راستہ پر ڈالنا ہی اصل کمال ہے۔ ہوشیار استاد وہی ہے جو عملی کام سے پیدا شدہ دلچسپی سے زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھائے اور اسباق کو بچوں کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ عملی کام کو اچھی طرح کرنے اور اس سے واقف ہونے کے ضمن میں اسے ایک نہایت ضروری کام سمجھیں۔ بچے اس سبق کے مطالعہ کے

بچے بھی اتنے ہی بے تاب ہوں جتنا کسی عملی کام کے شروع کرتے وقت ہوتے ہیں۔ مثلاً جتنی آمادگی بچوں میں کوئلہ لانے، کوئلہ جلانے، میدہ اور نیلا تھوتھا پانی میں ملانے اور لیئی پکانے میں ہوتی ہے، اتنی ہی آمادگی اور شوق اس بات کے معلوم کرنے میں بھی پیدا ہو جانا چاہیے کہ دیگچی سے نکلی ہوئی بھاپ کہاں گئی اور میدے میں ملا ہوا پانی کہاں غائب ہو گیا یا بھاپ نے دیگچی سے نکلتے وقت ڈھکنا کیوں گرادیا؟ لیئی پکتے وقت ان تمام باتوں پر روشنی پڑنی چاہیے، اور بھاپ اور پانی کے اسباق اس طرح مربوط ہو کر سامنے آنے چاہییں۔ اگر طالب علموں نے کئی بار لیئی پکائی اور پھر بھی انھیں کوئلے کا نرخ نہیں معلوم ہے اور انھوں نے اس کا ایک ادھ سوال نہیں نکالا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ پیدا شدہ ضمنی کام سے پورا تعلیمی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اگر عملی کاموں سے اس طرح تعلیمی فائدہ نہیں حاصل کیا گیا ہے تو ہر عملی کام محض کھیل اور شوق کا مقصد پورا کر سکے گا۔

۵۔ تیل اور لیئی سے ابری بنانا

طریقہ کار: تیل کی ابری بنانے کے لئے (Oil eclour) آئل کلر، برش، جست کی کشتی، لیئی اور مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیئی کی ابری بنانے میں بڑے برش، کپڑا رنگنے کے رنگ، بڑے پیالے اور لیئی کی ضرورت ہے۔ تیل کی ابری کا ڈزاین اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ رنگ کی جیسی نہ پانی پر ہوگی ویسی کاغذ پر آجائے گی لیئی کی ابری اختیاری ہے۔ مرضی کے ڈزاین بنا سکتے ہیں۔ لیکن تیل کی ابری نیچرل ہونے کی وجہ سے نسبتاً خوشنما ہوتی ہے اور بہت آسانی سے بن سکتی ہے۔ لیئی کی ابری میں کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے لیکن وہ زیادہ تخلیقی (Creative) ہے۔ وہ مشق ڈرائنگ کے ہے لیکن ڈرائنگ بنانے سے آسان اور رنگوں کے حرچ کے اعتبار سے کم خرچ۔

ابری خواہ لیئی کی بنوائی جائے خواہ تیل کی بچوں کی آمادگی اور دلچسپی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان سے بہت کام لے سکتا ہے۔ بچے ابری بناتے وقت بہت خوش ہوتے ہیں۔ نئے نئے ڈزائن اور نئی نئی شکلیں بنتی ہیں اور رنگوں کے استعمال سے برابر تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے لہذا خوشی اور مسرت میں بے قابو بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر ایک طالب علم کو ابری بنانے کا کافی موقعہ نہیں دیا جاتا تو وہ کاپی

سے ورق پھاڑ پھاڑ کر کشتی میں ڈال دیتا ہے اور ابری بنا کر گھر لے جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کافی سامان ہو۔ ایک بڑی کشتی میں چار لڑکے یا زیادہ سے زیادہ چھ لڑکے کام کر سکتے ہیں۔ شروع شروع میں بچوں کو اپنی بنائی ہوئی ابری واپس لانے کے وعدہ پر گھر لے جانے کی اجازت ہونی چاہیئے تاکہ وہ اپنی بہنوں اور والدہ کو دکھلا سکیں۔ ایسا کرنے سے بچے نہ تو چھپا کر ابری لے جائیں گے اور نہ کاپی سے ورق پھاڑیں گے اگر کوئی بچہ ابری واپس نہ لائے تو باز پرس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے اگر اپنا کیا ہوا کام یا بنائی ہوئی چیزیں گھر پر دکھلانے لے جاتے ہیں تو گویا وہ مدرسہ کی تعلیم کا اثر گھر تک لے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کا چرچا گھروں پر بھی کرتے ہیں۔ بچوں کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب وہ کوئی نئی چیز بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس وقت تو واقعی انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے جب ان کی کامیابی کی تعریف گھروں پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر بچے پوچھ کر ابری گھروں کو لے جانا چاہتے ہیں تو مدرسہ کو تھوڑا سا نقصان برداشت کرنا چاہیئے۔

اس کام میں رنگوں کے متعلق بہت کچھ بتلایا جا سکتا ہے۔ مختلف رنگین چیزوں کے ہلکے اور بھاری ہونے کے متعلق بھی بتلایا جا سکتا ہے۔ رنگوں کے متعلق بچوں کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ وہ شوخ رنگوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگوں کی ترتیب کا بھی انھیں کوئی خیال نہیں ہوتا یعنی کون سا رنگ کس رنگ کے ساتھ زیادہ خوشنما اور جاذب نظر ہوگا۔ یہ بات خود ہمارے استادوں کو بھی نہیں معلوم ہے۔ رنگوں کے ملانے میں اور ترتیب دینے میں ہم خود اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ رنگوں کے متعلق مختلف لوگوں کا مختلف Taste "مذاق" ہے۔ پھر بھی ہمیں اس کا معیار بلند کرنا چاہئے بازار کی مختلف رنگین چیزوں کا معیار تو بہت پست ہے وہ تو آنکھوں کو بھی بری معلوم ہوتی ہیں بچوں کو اگر آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے دیں گے اور اپنی ہدایت اور نگرانی میں کام نہ کرائیں گے تو وہ نہایت گہرے رنگ کی ابری بنائیں گے جس رنگ کو بحیثیت زمین کے کاغذ پر ہونا چاہیئے وہ بحیثیت بیل بوٹے کے بنایا گیا ہوگا یا جس رنگ کو بیل بوٹے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے تھا، وہ زمین کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا اور اس پر نہایت گہرے بیل بوٹے دوسرے رنگ کے بنے ہوئے

ہوں گے۔ بچوں کو رنگوں کے ملانے میں بھی خاص تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ رنگوں کی تمام پیالیاں خراب کر دیں گے۔ اور بعض بعض بچے تو کام میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اپنے کپڑوں پر بھی ابری بنا لیتے ہیں۔

عملی کام میں بھی اچھے ڈسپلن سے بہت اچھا کام ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ بہ یک وقت پچیس تیس لڑکوں کے لئے کام مہیا کرنا ہوتا ہے اس لئے ضبط کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بہتر ہوگا اگر استاد ابتدا میں کام شروع ہونے سے پہلے خود تھوڑی سی تیاری کرلے۔ مثلاً جن کاغذوں پر ابری بنوانا ہے انھیں کاٹ کر رکھ لے۔ رنگوں کو پیالوں میں ملا کر بچوں کو دکھا دے اور کشتی کے ارد گرد کرنے سے رکھ دے۔ کاغذ کو ابری بنانے کے لئے تیل پر ڈالنے اور اٹھانے کا دو تین مرتبہ ڈیمانسٹریشن دے پھر باری باری سے بچوں کو بلا کر اس کے مطابق عمل کروائے۔ اس وقت دوسرے بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر دیکھیں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔ اس عمل کے دوران میں استاد بچوں کو رنگوں کے متعلق زبانی بتلاتا بھی جائے اور بچوں کی آمادگی سے فائدہ اٹھائے۔ اس بنیادی کام اور پیش بندی سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب بچے ان کے متعلق اپنی کتاب سے اسباق پڑھیں گے تو بہت زیادہ توجہ اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔

زبان | رنگوں پر بچوں سے مختلف سوالات کئے جائیں مثلاً خاص رنگ کون کون سے ہیں؟ کس رنگ کو کس رنگ میں ملانے سے کون رنگ تیار ہو جاتا ہے؟ (عملی طور پر استاد بچوں کو ملا کر دکھلائے کہ فلاں رنگ کو فلاں رنگ کے ساتھ ملانے سے فلاں رنگ تیار ہو جاتا ہے اور پھر بچوں سے بھی ایک ایک کر کے یہ کام کروایا جائے) مقررہ رنگ کس کس چیز میں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بچے بڑی مستعدی سے لکھوائیں گے اور ایک لمبی فہرست تیار ہو جائے گی جس کو استاد ذیل کے عنوانات میں تقسیم کر سکتا ہے۔

(۱) مختلف قسم کی تیتریاں، (۲) مختلف قسم کے پرندے، (۳) مختلف قسم کے پھول، (۴) مختلف قسم کے جانور، (۵) مختلف قسم کی چھالیں (۶) دھنک

رنگوں پر ایک سبق ترتیب دیا جا سکتا ہے جس میں اس قسم کی جملہ باتیں آسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ تیتری، پھول، اور پرندوں پر حسب معیار اور نصاب کے مطابق اسباق لکھے اور پڑھائے جا سکتے ہیں۔

جو ادبی حیثیت سے مفید ہوں گے۔ پھولوں، پرندوں، اور تیتری پر نظمیں پڑھائی جا سکتی ہیں اسباق کو زیادہ بامعنی موثر اور واضح کرنے کے لئے بچوں سے مختلف رنگ کے اونی اور سوتی کپڑے جمع کرائے جا سکتے ہیں۔ اس ضمنی بامقصد کام میں اگر بچوں کی چیزیں جمع کرنے کی فطری عادت کو تحریک دی جائے تو بچے مختلف رنگ کی تیتریاں، پر، تاگے، پھول، پتیاں اور ایسی ہی کتنی رنگین چیزیں جمع کر لائیں گے جن کو استاد کارڈ بورڈ پر نہایت قرینہ سے ترتیب دے کر جماعت میں آویزاں کر سکتا ہے اور اس سے تعلیمی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

عملی کام میں ابری بناتے وقت ایک جماعت نے تیتری کے سبق کے بعد کشتی میں تیتری کے پروں سے ملتی جلتی ابری بنائی اور پھر تیتری کی طرح قینچی سے کاٹ کر ایک پن میں لگا کر رکھا اس طرح کئی قسم کی تیتریاں بنوائی جا سکتی ہیں۔ رنگ برنگ کے پرندے، اور پھول بھی اسی کی ابری میں بنائے جا سکتے ہیں۔ انھیں کارڈ بورڈ پر چپکا کر فریٹ ورک کی طرح کاٹا جا سکتا ہے کارڈ بورڈ کے ریشے جو اس آری سے کاٹنے سے نکل آئیں گے ریگ مال سے صاف کئے جا سکتے ہیں۔

حساب | رنگوں کی خریداری میں روپے، آنے اور پیسے کی ضرب اور تقسیم سکھائی جا سکتی ہے۔ بذریعہ تجارت اور اکائی بھی قیمتیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ رنگوں کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں ایسا موقعہ آنے پر فی صدی کے سوالات سکھائے اور مزید مشق کے لئے نکلوائے جا سکتے ہیں۔ رنگوں میں مختلف رنگوں کی قیمتیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً تیل کا رنگ (Oil colour) پسٹل کلر، مومی پسٹل کلر، واٹر کلر کپڑے رنگنے کے رنگ اور وارنش کے رنگ۔

سوشل اسٹڈیز | ہندوستان کی صنعت رنگ سازی بیسویں صدی کے وسط تک خوب ترقی پر تھی لیکن اس کے بعد سے اس صنعت کا کاروبار پھیکا پڑ گیا۔ اس کی وجوہات کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کرنا تاریخی واقعات کے سمجھنے میں مدد دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام باتوں کا مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہوگا جن سے ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی تباہی واقع ہوئی۔ ہندوستان میں رنگ کی ضرورت اب بھی مختلف طریقوں سے پوری کی جاتی ہے۔ مثلاً ہر سنگھار کے پھول سے لال رنگ نکالتے ہیں۔ مہندی کی پتیوں سے لال رنگ حاصل کرتے ہیں۔ ہلدی سے اور ٹیسو کے پھول سے زرد رنگ نکالتے ہیں

اور دیہاتوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن یہ تمام صورتیں محنت طلب ہیں اس لئے عوام باہر سے آئے ہوئے رنگ ہی کو استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کا نقشہ بنوایا جا سکتا ہے، اور صوبہ بہار اور اس کا وہ رقبہ بنوایا جا سکتا ہے جہاں نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ صوبہ بہار کی دوسری پیداواروں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اس علاقہ میں اب نیل کی کاشت کی بجائے گنے کی کاشت ہوتی ہے اور وہ تمام رقبہ جہاں بیسویں صدی کے وسط تک نیل بنانے کے کارخانے نظر آتے تھے، شکر سازی کے کارخانوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ خام اجناس اور پھل کی پیداوار کے اعتبار سے بہار کا صوبہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔ جغرافیہ کے اسباق میں آب و ہوا، ذریعہ آمد و رفت اور مشہور شہر اور منڈیاں تبلائی جا سکتی ہیں۔

آج کل تمام رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے ہیں۔ ان کی بابت بھی جغرافیہ کے اسباق کے تحت معیار کے مطابق مختلف جماعتوں میں مختلف باتیں تبلائی جا سکتی ہیں۔ ذریعہ آمد و رفت اور بندرگاہوں کے اسباق تیار کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مٹی کا تیل کہاں سے آتا ہے؟ کیسے نکالا جاتا ہے؟ کیسے آتا ہے؟ بازاروں میں کیسے بکتا ہے؟ اس کا کیا استعمال ہے۔ برما کے علاوہ دنیا میں مٹی کا تیل اور کہاں کہاں پایا جاتا ہے؟ نقشوں کی مدد سے اس کے متعلق ضروری واقفیت دی جا سکتی ہے۔

جنرل سائنس | تیتری کی مکمل زندگی، یعنی لاروا، پیوپا اور مکمل تیتری۔ تیتری ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر جانے میں کیا خدمت انجام دیتی ہے؟ مکمل پھول اور نامکمل پھول۔ ان کی پہچان۔ نامکمل پھول جس میں صرف مادہ حصہ ہوتا ہے، اس وقت مکمل ہوتا ہے جب تیتری نر پھول کا برادہ (جس کو پولن کا برادہ کہتے ہیں) اپنے پیروں اور سونڈوں کے ذریعہ لے جا کر مادہ پھول پر ڈالتی ہے۔ تیتری کی طرح کے دوسرے کیڑے بھی جو اس قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں، پڑھائے جا سکتے ہیں۔

تیل اور دوسری تیل سے ملتی جلتی رقیق چیزیں پانی پر کیوں تیرتی ہیں؟ تجربے سے معلوم کیا جائے۔

"ہماری مشکلات کا حل"

(از جناب محب الحسن خاں صاحب بی، اے آنرز (لندن)

گذشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک نے حیرت انگیز اختراعات اور ترقیاں کی ہیں لیکن ابھی تک وہ سماجی انصاف کے اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند لوگوں کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور وہ عیش و آرام سے زندگی گذارتے ہیں لیکن محنت اور مشقت کرنے والوں کے دن بھوک تنگدستی اور مصیبت میں کٹتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور محبت ہر طرف مفقود ہو رہی ہے اور اس کے بجائے تجارتانہ ذہنیت اور خود غرضی کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔ چند سرمایہ دار ملک دنیا کو غلامی اور استبدادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی مطمئن نہیں نظر آتے بلکہ ایک دوسرے سے ایسی جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہیں جو یقیناً موجودہ تمدن کو خاک میں ملا دے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان تمام کا کیا علاج ہے۔ کیا ہماری موجودہ سوسائٹی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری زندگی کو بہتر بنا سکے۔ یا سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ موجودہ سماج کو شیرازہ کشی نئے اصول پر جمایا جائے۔ یہی دو مسئلے ہیں جو کہ اس مضمون میں زیر بحث ہوں گے۔

دنیا میں بہت سے ماہر تعلیم[1] اور فلسفی ایسے ہیں جن کو سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی خلقی نقص نہیں نظر آتا بلکہ صرف چند ظاہری خامیاں جو کہ ان کے خیال میں رفتہ رفتہ اچھی تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح کلیسا کے سربرآوردہ پیشواؤں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں ایک عظیم الشان

---

[1] جان ڈیوی (John Dewey) جو امریکہ کا بہت بڑا ماہر تسلیم اور فلسفی ہے، اپنی کتاب فلسفہ اور تمدن صفحہ ۳۲۹ میں اس نظریہ کو بہت زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

تغیر ظہور میں آسکتا ہے اگر حضرت عیسیٰ کی ہدایت پر لوگ قدم بہ قدم چلیں۔ ہندوستان میں گاندھی جی اپنے فلسفہ اہنسا کے ذریعہ سے نہ صرف اس ملک کا بلکہ تمام دنیا کا اخلاق اور روحانی معیار بلند کرنے کے لئے ریتا ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا محض تعلیم ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتی ہے اور کیا اس میں اتنی قدرت ہے کہ ہماری مشکلات کو حل کر سکے۔ ان سوالات کے جواب کے لئے ہمیں مغربی یورپ کے حالات پر نظر ڈالنا پڑے گی مغربی یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حالانکہ وہاں ایک عرصہ سے تعلیم عام ہے لیکن پھر بھی بے روزگاری، فلاس اور تمام انسانی کمزوریاں موجود ہیں۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہاں تعلیم میں بڑے نقائص ہیں اس لئے سوسائٹی میں بھی خامیاں ہیں لیکن اگر اچھی تعلیم کا پرچار کیا جائے تو لوگوں کا اخلاقی معیار بہت بلند ہو سکتا ہے اور ان کی زندگی سے ظلم اور بے انصافی وغیرہ ہٹائے جا سکتے ہیں، مگر اس خیال کے حامی بدقسمتی سے یہ نہیں سمجھتے کہ موجودہ حالات میں اچھی تعلیم کا رائج کرنا ہی ناممکن بات ہے۔ جو برسر اقتدار طبقہ ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام نظام ملکی ہے، وہ یہ نہیں چاہتا کہ عوام کو اچھی تعلیم دی جائے اور ان پر حقیقت روشن کی جائے کیونکہ اس میں ان کے مفاد معرض خطر ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی ادارے حکمراں طبقہ کے لئے ایسے مفید آلہ ہیں کہ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے اثر اور قوت کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ عوام کو ایسی تعلیم دیتے ہیں جو ان کو ان کی موجودہ حالت پر قائم رکھے۔ ان کو ابھرنے نہ دے اور جو ان میں فرماں برداری اور غلامی کی ذہنیت پیدا کرے، مثلاً انگلستان میں بادشاہ سے محبت اور وفاداری کرنے کے لئے ایک عظیم الشان پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے دلوں پر یہ بات جاگزین کی جاتی ہے کہ سرمایہ داری ایک قدرتی نظام ہے۔ امیر حکومت کے لئے پیدا ہوا ہے اور غریب محکومیت کے لئے، غربت اور امارت ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ بالکل یہی تعلیم ہم کو ہندوستان میں دی جاتی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم محض یہاں کے امرا کا گیت گائیں ہم کو اپنے غیر ملکی حکمرانوں کی بھی قصیدہ خوانی کرنی پڑتی ہے، چنانچہ

تعلیم کا مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم بالکل بے کار ہے جو حقیقتِ حال کو پوری طرح واضح نہ کر سکے بلکہ واقعات پر پردہ ڈال دے ہماری سوسائٹی میں فی الحال اسی طرح کی تعلیم رائج ہے اور یہ رہے گی جب تک اس میں دو طبقہ قائم رہیں گے یعنی حاکم و محکوم آسودہ وغیرہ آسودہ۔ امیر و غریب وہ، جو بغیر محنت کے آرام و آسائش اٹھاتے ہیں، اور وہ جو محنت و مشقت کے باوجود بھی پیٹ اور تن کے محتاج رہتے ہیں۔

اب ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا محض وعظ و تلقین سے دنیا کی حالت بہتر ہو سکتی ہے؟ انگلستان میں فیبن سوشلسٹس (Fabian Socialists) جن کے برنارڈ شا (Bernard Shaw) اور سڈنی ویب (Sidney Webb) بڑے رکن ہیں اسی خیال کے حامی ہیں کہ اگر اشتراکیت کا کافی پروپیگنڈہ کیا جائے تو سرمایہ دار خود بخود اس کی خوبیاں سمجھ کر سوشلسٹس بن جائیں گے اور اپنی جائداد اپنی خوشی سے قوم کے حوالہ کر دیں گے۔ اسی طرح جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ہمارے ملک میں گاندھی جی انسان کو بغیر سوسائٹی کے نظام میں بنیادی تبدیلی کئے ہوئے اپنے اہنسا کے ذریعہ سے فرشتہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ وعظ اور تلقین کے اثر کے اس قدر قائل ہیں کہ انسانی نفسیات کو بالکل بھول جاتے ہیں، یہ اس بات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ جو سماجی نظام غیر مساوات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ اپنے میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ اس میں معدودے چند لوگ ذرائع پیداوار پر قابض ہو جانے کی وجہ سے دنیا کی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اکثریت کو وہ مواقع نہیں ملتے جس سے وہ اپنی شخصیت کو ترقی دے سکیں۔ عوام کی زندگی جہالت غلامی اور افکار معاش میں صرف ہوتی ہے۔

دوسری بات جو ہم کو سمجھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتی خواہ کتنی ہی اس کو تلقین کی جائے۔ اگر محض بات چیت سے کام چلتا ہوتا تو فرانس اور روس میں انقلاب نہ ہوتے اور بے کار خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ بغیر انقلاب کے

ترقی نہیں ہوتی، اور جو پارٹی اس راز کو نہیں سمجھ سکتی وہ صحیح قیادت نہیں کر سکتی ہے۔ آسٹریا، جرمنی اور اٹلی کی اشتراکی پارٹیاں "وعظ و تلقین" پر زیادہ زور دیتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کو سرمایہ داروں کی طرف سے بہت حسن ظن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ان ملکوں میں ایسی ہولناک تنزل پذیر اور وحشیانہ حکومت قائم کرنے کے لیے، جس کو ہم فسطائیت کے نام سے پکارتے ہیں، راستہ کھول دیا۔

میرا اس بحث سے یہ مطلب نہیں کہ انسان فطری طور پر بے حس، بد خلق، خود غرض، بے انصاف اور ظالم پیدا ہوا ہے جیسا کہ انگریز فلسفی (ہابس (Hobbes) کا خیال تھا۔ نہ میرا روسو (Rousseau) کی طرح ایمان ہے جس کی رو سے انسان طبیعتاً نیک نفس، منصف مزاج، خوش اخلاق اور ایثار پسند ہے لیکن اس کو سماج نے خراب کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان نہ پیدائشی طور سے اتنا بڑا ہے جیسا کہ ہابس (Hobbes) کا خیال ہے اور نہ اتنا اچھا جیسا کہ روسو (Rousseau) کا۔ انسان کی طبیعت کا انحصار اس کے ماحول پر ہے اور اس کے معاشی حالات پر۔ جب تک کہ اس مسئلہ کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے گا ہماری زندگی بہتر نہیں بن سکتی۔

ہماری سوسائٹی میں اس قدر عیوب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ نہیں بلکہ افراد کا ہے۔ دولت آفرینی عوام کے فائدے کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ ذاتی منفعت کے لئے، یہی دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ بین الاقوامی جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ اس لئے کہ ایک ملک کے سرمایہ دار دوسرے ملک کے سرمایہ داروں کے بازاروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی کمزوری کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہمارا موجودہ معاشی نظام ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ کسی اور بات کی طرف توجہ کی جائے، ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم اس کی تشکیل اشتراکی اصول پر کریں۔ میرا اس بحث سے یہ مقصد نہیں کہ تعلیم غیر ضروری چیز ہے اور بس اشتراکی حکومت قائم کر دینے سے تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ہرگز نہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ معاشی نظام کا سوال ایک بنیادی

مسئلہ ہے اس لئے اس کا حل سب سے پہلے ضروری ہے۔ دوسری دشواریوں کو ہم اسی وقت دور کرسکتے ہیں جب ذرائع پیدا وار پر قوم کا قبضہ ہو جائے۔

میدان تعلیم میں جو نئی نئی باتیں معلوم کی گئی ہیں یا فرائڈ (Freud) نے جو نئے نئے نظریہ انسانی نفسیات پر قائم کئے ہیں ان سے ہم موجودہ سرمایہ داری نظام کے ہوتے ہوئے فائدہ نہیں حاصل کرسکتے اس لئے کہ سرمایہ دار اس کے مخالف ہوں گے۔ مثلاً ایڈورڈ گلوور (Edward Glover) جو کہ فرائڈ (Freud) کے ایک بڑے شاگرد ہیں اپنی کتاب "انسان ہونے کے خطرات"[1] میں لکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنی خرابیاں ہیں تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کی پرورش پہلے چار پانچ برس کرنا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو عورت تین بچے رکھتی ہو اس کو تقریباً دس برس تک ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی اور اس زمانہ میں یہ باپ کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کافی وقت صرف کرے۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کو پانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ باقی وقت کھانے آرام کرنے اور اپنے بیوی بچوں میں صرف کرے۔ ڈاکٹر گلوور (Glover) نے یہ اسکیم تو خوب پیش کی لیکن ان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سرمایہ پرست سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے کب اس پر کاربند ہونے کی اجازت دیں گے یہ اس کی شدید مخالفت کریں گے کیونکہ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا اور کم سے کم اجرت دینا ان کا شیوہ ہے۔ ڈاکٹر گلوور کی اسکیم پر اگر کہیں عمل ہو سکتا ہے تو صرف سوویٹ روس میں۔ اس لئے کہ وہاں کی حکومت کے مدنظر کسی ایک طبقہ کا فائدہ نہیں بلکہ عوام کا۔ اس لئے کہ وہاں کے لوگوں نے سرمایہ داری نظام سے سبکدوشی حاصل کرلی ہے اور اشتراکی حکومت قائم کردی ہے جس میں ذرائع پیدا وار پر افراد کا قبضہ نہیں ہے۔ بلکہ قوم کا۔

---

[1] "انسان ہونے کے خطرات" ۱۵۷ (Dangers of Being Human)

میرا اس بحث سے تعلیم و تربیت، پند و نصائح کی اہمیت کو کم کرنا نہیں، صرف مقصد یہ ہے کہ میں دنیا کے معاشی نظام کو سب سے بنیادی سوال سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے اسی کا حل ضروری ہے۔ اس کے بعد اور چیزوں کا۔ اگر معاشی نظام بدل دیا جائے تو پھر تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا جا سکتا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال نیکی کے لئے تلقین ذرا بے معنی ہوتی ہے اس لئے کہ اس پر عمل مشکل ہے یہ کہنا کہ "چوری مت کرو" تو بہت آسان ہے لیکن کیا اس پر وہ آدمی عمل کر سکتا ہے جس کو دو یا تین دن سے کھانا نہ ملا ہو اور جس کے بیوی اور ننھے ننھے بچے بھوک کی وجہ سے تلملا رہے ہوں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ کچھ دن ہوئے انگلستان میں ایک بھوکی عورت نان بائی کی دوکان سے ایک روٹی چرائی ہوئی پکڑی گئی۔ گورنمنٹ نے بجائے اس کے کہ اس کو نوکری دلائی ہوتی قید کی سزا دی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ تو تمام سرمایہ داری حکومتوں کے طریقے ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ جرائم پیشگی کی بنیاد ہمارے معاشی نظام میں ہے، اگر اس کو بدل دیا جائے تو جرائم بھی دور ہو جائیں گے۔ بجائے اس کے کہ لوگوں سے کہا جائے کہ چوری مت کرو، جھوٹ مت بولو وغیرہ وغیرہ۔ ہم کو چاہیئے کہ ایسی صورتیں پیدا کر دیں، ایسا نظام قائم کریں کہ برائی کرنے کی ترغیب ہی نہ رہے۔ یعنی اگر لوگوں کا افلاس دور کر دیا جائے تو جرائم کی تعداد میں بہت کثرت سے کمی ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جرائم دماغی خرابیوں کی وجہ سے بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ دماغی خرابی بھی ہمارے موجودہ سماج کا ایک نتیجہ ہے۔ ایک نئے قسم کا ماحول اور ایک نئے قسم کی تعلیم کے ذریعہ سے جرائم کے نفسیاتی اسباب بھی دور کئے جا سکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے قبل ہمارے سماجی نظام کی تشکیل صرف ذاتی ملکیت ہی کی بنیاد پر ہو سکتی تھی اس وجہ سے کہ اس وقت کی پیدائشی قوتیں غیر ترقی شدہ اور کمزور تھیں۔ سوسائٹی کی بقا کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ دو طبقوں میں منقسم رہے۔ ایک طبقہ ایسا ہو جو محض پیدائشی کا کام کرے اور اتنا وافر سامان پیدا کرے کہ دوسرے طبقہ کو اس کی تلاش

معاش کے افکار سے نجات دے تاکہ یہ حکومت کے انتظام میں اور علوم وفنون کی ترقی کے لئے اپنا وقت صرف کرے۔ یہ تقسیم کار اٹھارھویں سدی کے قبل ضروری تھا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ جن گروہوں نے اس اصول کے خلاف کوشش کی کہ ذاتی ملکیت کو اڑا دیں اور معاشی مساوات قائم کریں، وہ ناکامیاب رہے۔ اس لئے کہ ایسے نظام کے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سوسائٹی کا ہر فرد پیدائشی کام میں مشغول رہتا تب کہیں سب کی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں۔ لیکن پھر حکومت کا کام کون کرتا۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو، جو انسان کی دماغی زندگی کے لئے وہی اہمیت رکھتے ہیں جیسے کھانا اور پینا اس کی جسمانی زندگی کے لئے، کون ترقی دیتا۔ ان حالات میں سماج کا کام ایک دن بھی ٹھیک سے نہیں چل سکتا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد حالات بالکل مختلف ہوگئے چنانچہ اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن اصولوں پر ڈیڑھ سو برس پہلے عمل محض خواب وخیال تھا، اب اس پر عمل نہ صرف دائرہ امکان میں آگیا ہے بلکہ اگر ان اصولوں کو اختیار نہ کیا جائے گا تو موجودہ سوسائٹی تباہ وبرباد ہوجائےگی پیدائشی قوتیں اب اتنی ترقی کرگئی ہیں کہ پرانے تقسیم کار کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ فی زمانہ اس کی ضرورت نہیں کہ سوسائٹی دو طبقوں میں منقسم رہے۔ اب اگر سب لوگ چند گھنٹہ روزانہ پیدائشی کام میں اپنا وقت صرف کریں تو نہ صرف اتنا وافر سامان پیدا ہوسکتا ہے کہ سب کی ضروریات پوری ہوجائیں بلکہ سب کو اتنا موقع اور وقت مل سکتا ہے کہ وہ حکومت کے کام میں اور علم وفن کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ باوجود ان باتوں کے دنیا کا بیشتر حصہ ابھی پرانے اصول پر منظم ہے یعنی ذاتی ملکیت پر۔ چند اشخاص کے پاس دولت جمع ہوگئی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے ایک کثیر اکثریت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ صرف پیدائشی قوتوں کی ترقی رکی ہوئی ہے بلکہ وہ تیزی کے ساتھ تنزل کی طرف جارہی ہیں۔ بے روزگاری، مستقل کساد بازاری، افلاس اور خطرہ جنگ اس کے لئے صاف دلالت کرتی ہیں۔

دنیا میں صرف ایک ملک ہے جس نے اپنے معاشرتی نظام کی عمارت اس بے بہا بنیاد پر کھڑی کرلی ہے جس میں ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ ہے نہ کہ افراد کا۔ وہ ملک سویٹ روس ہے جب سے سویٹ روس نے ذاتی ملکیت کو اڑا دیا وہ ترقی کے مدارج تیزی کے ساتھ طے کر رہا ہے ان حالات کو دیکھ کر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسان اتنا خوش اور بہتر ہو جائے گا جتنا کہ وہ اپنی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا بیس برس کے قلیل معیار میں جو ترقیاں وہاں ہوئی ہیں، وہ مغربی یورپ کی صدیوں کی تہذیب اور تمدن کو شرمانے کے لئے ابھی سے کافی ہیں۔ فرانس اور انگلستان کے مدبرین ایک عرصہ سے بے روزگاری کے سوال کو حل کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک نہ کوئی کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ اس کے کوئی آثار نظر آتے ہیں البتہ جرمنی نے بے روزگاری دور کر دی ہے لیکن دو تباہ کن طریقہ اختیار کر کے یعنی مزدوروں کی اجرت کم کر کے اور ان کو اسلحہ جنگ کی فیکٹریوں میں نوکری دلا کر برخلاف اس کے روس میں مزدوروں کی اجرت برابر بڑھ رہی ہے اور مزدور اس کام پر نہیں مامور ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کی آزادی چھیننے کے لئے سامان جنگ تیار کریں، بلکہ ان کی تمام قوتیں ان کی ضروریات زندگی کی چیزیں بنانے میں صرف ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں لوگوں کا معیار زندگی برابر بڑھ رہا ہے اور مزدور اتنے خوش و مطمئن نظر آتے ہیں، جتنے کہ دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہیں۔ ان کو روزانہ زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، یہ محض اس لئے کہ وہ اپنا باقی وقت مختلف دلچسپیوں میں صرف کریں۔ ان کے بچوں کے لئے اسکول اور پرورش گاہیں ہیں جہاں وہ بہت اہتمام اور آرام کے ساتھ رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ شہروں کی گلیوں میں جب کہ ان کے ماں باپ کام میں مشغول ہوں کس مپرسی کی حالت میں آوارہ گردی نہ کریں۔ چنانچہ اس وقت ماسکو (Moscow) جیسے بڑے شہر میں میلے کچیلے بچے گلیوں میں کھیلتے ہوئے مشکل سے دکھلائی دیں گے۔ سویٹ روس نے عورتوں کے مرتبہ کو بھی بہت بلند کر دیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں عورت کو سب سے پہلے اسی ملک میں آزادی نصیب ہوئی ہے۔ ان کو وہ ہی حقوق

حاصل ہو گئے ہیں جو کہ مردوں کو۔ ان کو مرد کے برابر اجرت ملتی ہے ہر آدمی کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ لڑکے کی ماں (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کی اپنی کمائی کے چوتھائی حصہ سے کفالت کرے چاہے وہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرے یا نہ کرے۔ حاملہ عورتوں کو چار ماہ کی پوری تنخواہ پر چھٹی مل جاتی ہے اور یہ معیار ڈاکٹر کی رائے سے بڑھ سکتا ہے عصمت فروشی قریب قریب بالکل کم ہو گئی ہے۔ انقلاب سے پہلے زار کے (Czar) زمانے میں تقریباً بیس ہزار رنڈیاں ماسکو میں تھیں لیکن اب صرف چار سو رہ گئی ہیں اور یہ تعداد بھی ملک کی معاشی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ باقی نہ رہیگی۔

سویٹ حکومت عوام کی محض جسمانی نشوونما کو ضروری نہیں سمجھتی بلکہ ساتھ ساتھ ان کی دماغی اور روحانی زندگی کو بھی بہتر بنانا اپنا فرض جانتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے پہلے حکومت وقت تعلیمی معاملات میں نہ صرف دلچسپی ہی نہیں لیتی تھی بلکہ تعلیم عامہ کی مخالف تھی اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں میں سیاسی شعور اور کسی قسم کی بیداری پیدا ہو۔ لیکن جب سے بالشویک پارٹی برسر اقتدار ہوئی ہے ملک میں تیزی کے ساتھ تعلیمی ترقی جاری ہے۔ تاتاریوں اور مغلوں کی زبانوں کے حروف جو کہ پہلے ملاؤں اور پادریوں کا اجارہ تھے اور ان کا سیکھنا دشوار تھا اب آسان کر دیئے گئے ہیں تاکہ عوام ان کو آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں بہت سی زبانوں کے پاس نہ کوئی حروف تھے اور نہ کوئی خط چنانچہ حکومت نے بڑے بڑے ادیب مقرر کئے جنہوں نے محنت اور مشقت کر کے ان زبانوں کے لئے نئے حروف ایجاد کئے۔ مزدوروں اور کسانوں کے پڑھنے کے لئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ فیکٹریوں میں کتب خانے قائم ہیں اور ملک میں تقریباً سات عرب کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں جس میں مختلف اقوام کے بڑے بڑے پرانے ادیب اور فلسفیوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔

اقلیتوں کے مسئلہ میں بھی روس نے جرأت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں غیر رواداری اور قومی تعصب کا چرچہ ہو رہا ہے لیکن روس میں ایسا ملک ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اقلیتوں کا سوال تقریباً بالکل حل ہو گیا۔ نہ صرف روسی حکومت

اقلیتوں کی اقتصادی زندگی کی ترقی کی ذمہ دار بن گئی بلکہ اس نے ان کی تہذیب، زبان اور ان کی
روایات کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کا بھی ذمہ لے لیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ
میں سویٹ جمہوریت میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے اور جہاں مغربی یورپ کے باشندوں پر
افسردگی، بے اطمینانی اور بے بسی کے آثار چھائے ہوئے ہیں وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جوش
بھروسہ اور استقلال موجیں مار رہا ہے اس لئے کہ یہ ان کا ایمان ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بہتر بنا
سکتے ہیں۔

اس بیان سے یہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ ذرائع پیداوار کو افراد کے چنگل سے نکال کر قوم
کے سپرد کرنے کے بعد سویٹ روس کے سامنے اب کوئی سوال نہیں ہے۔ اصل میں ابھی تو بڑے
بڑے مرحلے سر کرنا ہیں لیکن میرا جو اس بحث سے مقصد ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں
کوئی بنیادی اور مستقل تبدیلی محض تلقین اور وعظ سے نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کو عمل میں لانے کے
لئے ضروری ہے کہ ہم ذرائع پیداوار کو افراد کے تصرف سے نکال کر قوم کے حوالے کریں۔ اس کے
بعد پھر پند و نصائح مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور تعلیم و تربیت سچے معنوں میں کی جا سکتی ہے۔

فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل)

(بہ سلسلۂ سابق)

درحقیقت عربی زبان کیا ہے | دنیا کی اکثر زبانیں خواہ وہ تورانی کی شاخیں ہوں یا آریائی کی کچھ نہ کچھ سامی زبانوں سے متاثر ضرور ہوئی ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ سامی تمام زبانوں میں الفاظ کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد جزیرۃ العرب میں بولی جانے والی دوسری زبانیں اس میں جذب ہوگئیں۔ علاوہ بریں اس کا دامن علمی خزانوں سے مالا مال ہے۔

علماء لغت کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ سامی زبانوں میں کون کس کی شاخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ سامی کی بڑی بڑی اصلیں عبرانی سریانی اور عربی اب تک زندہ ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسری کی شاخ نہیں ہے۔ لیکن یہ تینوں ایک اصل کی شاخیں ضرور ہیں جس کو دوآبہ میں بسنے والے سامی بولتے تھے مگر امتداد زمانہ سے فنا ہوگئی جن لوگوں نے طوفان کے بعد دوآبہ کی درمیانی سرزمین کو آباد کیا توریت انکو ارض شنعار کے بسنے والے سے تعبیر کرتی ہے۔ اقتضاء زمانہ سے اس قوم کے فرقے منتشر ہونا شروع ہوئے اور ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلتے چلے گئے جن کی ضروریات زندگی کے مطابق زبانوں میں ارتقا ہوتا رہا۔ ان مہاجرین میں سے بعض لوگ شام کے ساحلی مقامات پر آباد ہوگئے ان کی زبان جو عبرانی کی ایک شاخ ہے فینیقی کے نام سے موسوم ہوئی بعض لوگ عراق عرب میں جا بسے۔ ان کی زبان آشوری کہلاتی تھی جس کی شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ کچھ لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کی سکونت اختیار کی، ان کی زبان ترقی کر کے عربی کہلائی جس کی شاخیں حبشی، حمیری، عدنانی اور قریشی تھیں

موُخرالذکر وہ زبان ہے جس میں کلام پاک نازل ہوا اور جس کو ابھی تک عربی بولنے والی قومیں بطور تحریری زبان کے استعمال کرتی ہیں۔

مذکورہٗ بالا سامی زبانیں ایک ہی مرتبہ میں نہیں پیدا ہوئیں بلکہ ضرورتوں کے مطابق بتدریج ارتقار طبعی کے مدارج طے کرتی رہیں۔ ان زبانوں کو سامی سے علیحدہ ہوئے جس وقت تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا اس وقت آپس میں ایک دوسری سے بہت مشابہ تھیں۔ وہ تمام عربی قبائل جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب مصر، شام، عراق اور بلاد مغرب میں آباد ہیں عربی بولتے ہیں لیکن ایک گروہ دوسرے گروہوں سے جتنا دور ہے اسی تناسب سے اس کی زبان اور دوسروں کی زبان میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف ان سب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کلام پاک نہ ہوتا تو ہر شاخ اپنی جگہ ایک مستقل زبان ہو جاتی اور جس کو دوسری شاخیں بولنے والے سمجھ بھی نہ سکتے جیسا لاطینی زبان کی فرعون (فرانسیسی، ہسپینی، پرتگالی وغیرہ) میں ہوا لیکن عربی بولنے والے قبائل اپنی اپنی زبانوں کی حفاظت کلام پاک کے نمونہ پر کرتے ہیں اور تحریری زبان میں اس کی اتباع کرتے ہیں جو سب فرعون کو ایک اصل پر جمع کئے ہوئے ہے (تھوڑا بہت اختلاف بازاری اور عامیانہ زبانوں میں پایا جاتا ہے)

زمانہ قدیم میں جب سام کی نسل منتشر ہوئی اس وقت ان کے پاس کوئی لغت مدون نہ تھی اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا جو سب فرعون کو جمع کئے رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتضا رزمانہ نے طبعی طور پر اپنا اثر دکھایا کہ ان کی زبانیں شاخ در شاخ ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ کچھ صدیاں گذرنے پر ہر ضرع ایک مستقل زبان بن گئی اور دوسری شاخوں سے مختلف ہو گئی۔ تاہم اگر کوئی شخص چاہے تو اصول و قواعد کی یکسانی جیسے وسائل اس کو مل جائیں گے جن سے وہ اصل تک پہنچ سکتا ہے عربی اور سریانی کی گردانوں اور الفاظ و معانی میں اتنی زبردست مشابہت ہے کہ ان کی اصل ایک ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر عہد قدیم کے سفر نامے پڑھے جائیں تو یہی معلوم ہوگا کہ پرانے زمانہ میں یہ سب زبانیں

ایک جیسی تھیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا زمانہ آگیا اور وہ چالیس سال تک دشت سینا اور جزیرہ نمائے عرب میں رہے۔ باوجودیکہ ان کی زبان عبرانی تھی مگر جب عربوں سے ملتے تھے تو ایک دوسرے کی زبان بلا امداد ترجمان سمجھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً اسی واقعہ کو لیجئے کہ ملکۂ سبا جو عرب کے ایک حصہ کی فرمانروا تھیں، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام شاہ بنی اسرائیل کی ملاقات کے لئے سنہ۔ ق۔ م۔ میں گئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملیں تو دونوں نے بغیر مترجموں کے گفتگو کی۔ ایسے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک سامی زبان کی شاخیں ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ غالباً ان کی اصل سے علیحدگی اور استقلال کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔

آریائی اور طورانی کی شاخوں پر سامی زبانوں کے اثرات

طورانی۔۔۔۔۔۔ خلافت عباسیہ ترکوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنکر رہ گئی تھی وہ جس خلیفہ کو چاہتے معزول یا قتل کر دیتے اور جس کو چاہتے خلیفہ منتخب کر لیتے۔ باوجود اس سیاسی اقتدار کے جو انھیں خلافت پر خاص دار السلام بغداد میں حاصل تھا اپنی زبان کو عربی اثرات سے نہ بچا سکے۔ ترکی زبان عربی سے خوب متاثر ہوئی اکثر وبیشتر ترکی الفاظ متروک ہوگئے اور ان کی جگہ عربی الفاظ نے لے لی۔ ترکوں نے عربی رسم الخط اختیار کر لیا تھا جو مصطفےٰ کمال مرحوم کے ابتدائی دور تک رائج رہا لیکن مرحوم نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو ترک کر کے لاطینی رسم الخط کو رواج دیا۔

مخلوط۔۔۔۔۔ ہندوستان میں خلجیوں کے عہد حکومت تک عربی کو بڑا عروج حاصل تھا حتیٰ کہ تعلیم یافتہ طبقہ کسی دوسری زبان میں خط کتابت کرنا بھی معیوب سمجھتا تھا اور فارسی عامیانہ بازاری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ اس عہد کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لے لی تاہم مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا وقار قائم رہا۔ اب اردو جو ارتقائی حالت میں تھی فارسی کے مقابلہ پر عامیانہ زبان تسلیم کی گئی۔ باوجودیکہ اردو کی پیدائش اور نشو ونما ہندوستان ہی میں ہوئی پھر بھی آریائی زبان سے اتنی متاثر نہیں معلوم ہوتی جس قدر سامی سے ہے۔

دوسری متاثر ہونے والی زبانوں (جیسے ترکی فارسی وغیرہ) نے صرف الفاظ کی تبدیلی تک عربی کا اثر قبول کیا۔ ترکیبوں کا اس اثر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اردو زبان کے الفاظ اور ترکیبیں دونوں عربی سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ الفاظ کچھ تو اپنی اصلی حالت پر باقی رہے اور کچھ میں تلفظ کا ہلکا سا اختلاف پیدا ہوگیا۔ اول الذکر کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ جیسے "ہوا" "آدمی" "لباس" "توجہ" "جاہل" "صحبت" "حکم" "صورت" "سلام" اور "منصب" وغیرہ۔ مؤخرالذکر کی کچھ مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں۔

عربی (درار) دہلی (درے) روہیلکھنڈ (اتے) — عربی (قفل) لکھنؤ (قلف) حیدرآباد و مدراس (خفل) عامیانہ (کلف)۔ کلیھ) — عربی (جنزیر) شہری اردو (زنجیر) عامیانہ (جنجیر) — عربی (وقت) دہلی و لکھنؤ (وقت) پنجاب (وکت) حیدرآباد (دخت) عامیانہ (وکھت)

ترکیبوں پر عربی اثرات کے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) الف و لام کا استعمال صرف سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اردو میں ہم کو ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں الف و لام فارسی اور ہندی الفاظ پر داخل ہوا ہے جیسے۔ قریب المرگ، جوان العمر فوق البھڑک وغیرہ۔ اس میں مرگ خالص فارسی اور بھڑک ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں۔

(۲) "و۔ن" اور "ی۔ن" بڑھا کر جمع بنانا عربی کے خصوصیات میں سے ہے مگر اردو میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جیسے کھال کی جمع "کھالوں۔ کھالیں" "سڑک کی جمع سڑکوں۔ سڑکیں۔ میز کی جمع میزوں۔ میزیں۔ بوتل کی جمع بوتلوں۔ بوتلیں وغیرہ۔ (عربی میں "ن" کھلی ہوئی آواز دیتا ہے اردو میں غنہ ہو جاتا ہے اور حروف علت "و۔ی" مجہول ہو جاتے ہیں۔)

(۳) "ا۔ت" آخر میں لگا کر عربی کی جمع مؤنث سالم جیسی جمع بنائی جاتی ہے مثلاً۔ بیگمات کھنڈرات۔ باغات وغیرہ۔

(۴) الف یا ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں حرف جار عربی کی طرح اپنا اثر کرتے ہیں جیسے "لوٹا۔ یا آملہ" ان پر جب حرف جار داخل ہوگا تو "ا" یا "ہ" یائے مجہول سے بدل جائیں گے

اور طویل کسرہ کی صورت پیدا ہوگی۔ لوٹے پر۔ لوٹے میں۔ لوٹے سے۔ لوٹے تک۔ آملے سے آملے پر۔ آملے میں۔ آملے تک۔ یہی صورت حالت اضافت میں بھی عربی کی طرح برقرار رہے گی لوٹے کی ٹونٹی۔ آملے کا مربّہ۔

(۵) تنوین کا استعمال بھی عربی ہی سے ماخوذ ہے جیسے۔ اندازاً۔ بمونتہً وغیرہ۔

(۶) آریائی زبانوں کی گردانوں میں تذکیر و تانیث کے لیے الگ الگ صیغے نہیں پائے جاتے۔ "آیا" اور "آمد" مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں مستعمل ہے۔ بعض شاخوں میں صرف واحد مذکر غائب اور واحد مؤنث غائب میں تفریق کرنے کے لیے مذکر اور مؤنث کی ضمیریں بشرطیکہ موجود ہوں لگادی جاتی ہیں جیسے "He came" اور She came لیکن اردو میں عربی اثرات کے ماتحت مذکر اور مؤنث کے صیغے الگ الگ موجود ہیں جیسے۔

	ماضی معروف	حال معروف	مستقبل معروف	ماضی مجہول	حال مجہول	مستقبل مجہول	اسم فاعل	اسم مفعول
واحد مذکر غائب	وہ لایا	وہ لاتا ہے	وہ لائے گا	وہ لایا گیا	وہ لایا جاتا ہے	وہ لایا جائے گا	لانے والا	لایا ہوا
واحد مؤنث غائب	وہ لائی	وہ لاتی ہے	وہ لائے گی	وہ لائی گئی	وہ لائی جاتی ہے	وہ لائی جائیگی	لانے والی	لائی ہوئی
جمع مذکر غائب	وہ لائے	وہ لاتے ہیں	وہ لائیں گے	وہ لائے گئے	وہ لائے جاتے ہیں	وہ لائے جائیں گے	لانے والے	لائے ہوئے
جمع مؤنث غائب	وہ لائیں	وہ لاتی ہیں	وہ لائیں گی	وہ لائی گئیں	وہ لائی جاتی ہیں	وہ لائی جائینگی	لانے والیاں	لائی ہوئیں
واحد مذکر حاضر	تو لایا	تو لاتا ہے	تو لائے گا	تو لایا گیا	تو لایا جاتا ہے	تو لایا جائے گا	تو لانے والا	تو لایا ہوا
واحد مؤنث حاضر	تو لائی	تو لاتی ہے	تو لائے گی	تو لائی گئی	تو لائی جاتی ہے	تو لائی جائیگی	تو لانے والی	تو لائی ہوئی
جمع مذکر حاضر	تم لائے	تم لاتے ہو	تم لاؤ گے	تم لائے گئے	تم لائے جاتے ہو	تم لائے جاؤ گے	تم لانے والے	تم لائے ہوئے
جمع مؤنث حاضر	تم لائیں	تم لاتی ہو	تم لاؤ گی	تم لائی گئیں	تم لائی جاتی ہو	تم لائی جاؤ گی	تم لانے والیاں	تم لائی ہوئیں
واحد مذکر متکلم	میں لایا	میں لاتا ہوں	میں لاؤں گا	میں لایا گیا	میں لایا جاتا ہوں	میں لایا جاؤں گا	میں لانے والا	میں لایا ہوا
واحد مؤنث متکلم	میں لائی	میں لاتی ہوں	میں لاؤنگی	میں لائی گئی	میں لائی جاتی ہوں	میں لائی جاؤنگی	میں لانے والی	میں لائی ہوئی

جمع مذکر متکلم	ہم لائے	ہم لاتے ہیں	ہم لائیں گے	ہم لائے گئے	ہم لائے جاتے ہیں	ہم لائے جائیں گے	ہم لانے والے	ہم لائے ہوئے
جمع مؤنث متکلم	ہم لائیں	ہم لاتی ہیں	ہم لائیں گی	ہم لائی گئیں	ہم لائی جاتی ہیں	ہم لائی جائیں گی	ہم لانے والیاں	ہم لائی ہوئیں

صیغوں میں تذکیر و تانیث کا فرق سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے۔

آریائی —— فتح ایران کے بعد مشرقی آریائی زبانوں میں فارسی جس حد تک عربی سے متاثر ہوئی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی ترکوں کی طرح عربی رسم الخط اختیار کرلیا۔ موجودہ فارسی لغت میں تقریبًا نصف الفاظ عربی کے ہیں جن میں سے کچھ الفاظ فارسی میں کھپ گئے جیسے طلبیدن۔ اور فہمیدن وغیرہ اور کچھ اپنی اصلی حالت پر قائم ہے جن کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جیسے خطا۔ صواب۔ جنت۔ ساقی۔ انس۔ عشق۔ حسن۔ سجادہ۔ خال۔ اسیر وغیرہ۔ پہلے دور کی فارسی شاعری میں عربی بھی برابر کی شریک تھی بسا اوقات ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا عربی میں ہوتا تھا مثلاً حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

الا یا ایها الساقی ادر کاسا وناولها — که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلها

حضوری گر همیں خواهی ازو غائب مشو حافظ — متی ما تلق من تهوی دع الدنیا واهملها

آں تلخوش که صوفی ام الخبائثش خواند — اشهی لنا واحلی من قبلة العذارا

شربت نارا ز کف محبوبه ام آمد بدست — قلتها ذا قیل قالت اشرب قد کفاک

یا قرۃ العین طاہرہ کے اشعار ہیں

اگر آں صنم ز رہ ستم پئے کشتن من بیگنہ — لقد استقام بسیفه فلقد رضیت بما رضی

سحرے نگار ستمگرم قدمے نہاد ببسترم — فاذا رأیت جماله طلع الصباح کأنما

چو شنید نالۂ مرگ من پئے ساز من شدہ برگ من — نشکی علیه مجدلا وبکی علیه مجلجلا

مغربی آریائی یا یورپی زبانیں تقریبًا سب کی سب سامی لغات سے کم و بیش متاثر ہیں۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں نے مفتوح ہونے کی وجہ سے عربی کے اثرات قبول کر لئے (مسلمانوں نے فتح اسپین کے بعد فرانس پر حملہ کر کے تقریبًا نصف حصہ ملک پر قبضہ کر لیا تھا جو بعد میں ان کے

ہاتھ سے نکل گیا۔ صقلیہ (سسلی) کی وجہ سے اٹلی کی زبان عربی سے متاثر ہوئی) انگلستان کے محل وقوع کے لحاظ سے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریزی کسی سامی زبان سے متاثر ہو سکے گی لیکن واقعات نے بتا دیا کہ وہ بھی سامی زبانوں کے عالمگیر اثرات سے نہ بچ سکی۔ عربی الفاظ سپین سے فرانس میں ہو کر یا اٹلی سے جرمنی میں ہوتے ہوئے انگریزی زبان میں داخل ہو گئے یا حروب صلیبیہ کے دوران میں براہ راست انگریزی نے اخذ کئے (معرکہ ہائے صلیبی کے دوران میں ایک مشترک زبان بن گئی تھی جس کو دونوں فریق اظہار مافی الضمیر کے لئے استعمال کرتے تھے۔) یورپ کی کل آبادی بجز چند بت پرست جرمن قبائل کے مذہب عیسوی کے پیرو تھی۔ اسی بنا پر ان کی مذہبی اصطلاحیں اور گذشتہ پیغمبروں کے نام عبرانی سے لئے گئے، جن کے تلفظ میں آلات نطق کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر فرق ہو گیا۔ (واضح رہے کہ عربی اور عبرانی تلفظ میں کہیں کہیں برائے نام فرق پایا جاتا ہے) مثلاً۔

اردو	عربی تلفظ	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
ابراہیم	ابراہیم	Abraham	
آمین	آمین	Amen	
فرشتۂ موت	عزرائیل	Azrael	
آدمؑ	آدمؑ	Aadam	
ایک بت کا نام	بعل	Baal	حضرت الیاس کے زمانہ میں آشوری اور سوری قومیں اس کو
ابیلت لحم	بیت اللحم	Bethlehem	پوجتی تھیں اس کا قدیم عبرانی تلفظ "بیت ایل" یعنی خانہ خدا ہے
اونٹ	جمل	Camel	
الیاسؑ	الیاسؑ	Elijah	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں "ایلیاہ" لیکن اصل لفظ الیاس ہے
حوّاؑ	حوّاؑ	Eve	

اردو	عربی تلفظ	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
اسحاق ؑ	اسحاق ؑ	Isaac	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (اضحاق)
بنی اسرائیل	اسرائیلی	Israelite	
یعقوب ؑ	یعقوب ؑ	Jacob	
عیسیٰ ؑ	عیسیٰ ؑ	Jesus	
ایوب ؑ	ایوب ؑ	Job	
یحییٰ ؑ	یحییٰ ؑ	John	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (یوحنا)
ایک دریا	اردن ۔ یردن	Jordan	
یوسف ؑ	یوسف ؑ	Joseph	
آتش پرست	مجوس	Magi	
من و سلویٰ	من (و سلویٰ)	Manna	
مریم ؑ	مریم ؑ	Mary	
میکائیل ؑ	میکال	Mike	
موسیٰ ؑ	موسیٰ ؑ	Moses	
شہر ناصرہ کا باشندہ	نصرانی ۔ ناصری	Nazarene	حضرت عیسیٰ ؑ ہجرت کر کے ناصرہ تشریف لے گئے تھے اس لئے آپ بھی ناصری کہلائے
نوح ؑ	نوح ؑ	Noha	
فردوس	فردوس	Paradise	
شاہ مصر فرعون	فرعون	Pharoh	
یہودیوں کا ایک فرقہ	فریسی	Pharisee	یہودیوں میں دو بڑے فرقے ہیں "فریسی" اور "صدوقی"
سینچر	سبت	Sabbath	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی تلفظ	اردو
یہودیوں کا دوسرا فرقہ۔	Sadducee	صدوقی	صدوقی
	Samuel	اسماعیلؑ	اسماعیلؑ
	Sarah	سارہؑ	سارہؑ
	Satan	شیطان	شیطان
	Sepn	سبطا	نسل پوتے
اس شہر کی ملکہ بلقیس سے حضرت سلیمانؑ نے نکاح کیا	Sheba	سبا۔	یمن کا ایک شہر
	Solomon	سلیمانؑ	سلیمانؑ
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (زکریاہ)	Zechariah	زکریاؑ	زکریاؑ
	Jerusalem	یروشلم	یروشلم

نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یورپ میں جہالت پورے شباب پر تھی۔ مذہبی خانقاہوں سے جو پادریوں اور اسقفوں کے ہاتھ میں تھیں، درس گاہوں کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ ایسے مدارس یورپ کے بڑے بڑے ممالک میں پائے جاتے تھے۔ فلسفہ و حکمت کی تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ فلسفہ کی کتابوں پر راہبوں نے قبضہ کرکے جا بجا مذہبی کتب خانہ میں مقفل کردی تھیں۔ کسی کو ان کے مطالعہ کرنے یا نقل لینے کی اجازت نہ تھی۔ (اگر کہیں ان علوم کا کوئی ماہر نظر آتا تو یا وہ اندلس کے اسلامی مدارس کا تعلیم یافتہ ہوتا یا جنوبی اٹلی کے مدرسہ کا جو مسلمانان سسلی کی کوشش سے قائم ہوا تھا) مسیحی مدارس میں صرف لاطینی اور یونانی زبانیں سکھائی جاتیں جن کی صرف و نحو میں طلبہ کی عمر کا بیش قیمت حصہ برباد کردیا جاتا تھا۔ جب وہ ان زبانوں میں کسی قدر ترقی کرلیتے تو دینیات کی طرف متوجہ کردیئے جاتے جس کی تعلیم کا اصول زبور توریت اور انجیلیں تھیں۔ منتہی طلبہ کو چند دیگر کتب روایات اور غیر مقبول اور مشتبہ انجیلیں بھی پڑھائی جاتیں تو اپاکریفہ کے نام سے مشہور تھیں

علاوہ بریں کلیسا کی پرانی تاریخیں، گذشتہ ولیوں کی سوانح عمریاں، مذہبی کونسلوں کی مفصل اور مشرح رپورٹیں بھی نصاب میں داخل تھیں۔ یہی علوم تھے جن کو لاطینی اور یونانی زبانوں میں ان کی پیچیدہ صرف و نحو کے ساتھ طلبہ پڑھا کرتے تھے۔ اس نصاب نے مدرسوں کی یہ حالت بنا رکھی تھی کہ نیچے درجوں کے طلبہ لاطینی اور یونانی کی صرفی گردانیں پلا پلا کے ازبر کرتے اور اوپر کے منتہی طلبہ آپس میں الٰہیات پر مباحثہ کرتے جو کبھی کبھی مکابرہ و پھر مجادلہ اور مقاتلہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ان کو ممانعت تھی کہ سوا ان مباحث کے کسی عقلی مبحث کی طرف توجہ نہ کریں۔

یہ تھا یورپ کی جہالت کا پورا نقشہ۔ اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی بدولت یورپ نے علوم میں خاصی ترقی کرلی یورپی قومیں عربوں کی حسب ذیل علوم میں شاگرد ہیں علم الادویہ، علم ریاضی، ہیئت طبیعیات، فلسفہ، اور طب وغیرہ۔ یہ علوم اسپین سے وسط یورپ ہو کر تمام یورپی ممالک میں پھیلے یورپ کی زبانوں میں ابھی تک مذکورہ علوم کی اصطلاحیں عربی ہی کی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے لئے انگریزی کو لیجیے جو بہ نسبت دیگر یورپی زبانوں کے عربی سے بہت دور واقع ہوئی ہے۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
کیمیا (علم الادویہ)	الکیمیا	Alchemy	
الکوہل (جوہر شراب)	الکول	Alcohol	
قرع انبیق	الانبیق	Alembice	
جبر و مقابلہ	(علم) الجبر	Algebra	زرنیخ تین رنگ کا ہوتا ہے۔ سفید جس کو سم الفار یا سنکھیا کہتے ہیں
ہرتال	زرنیخ	Arsenic	زرد کو ہرتال اور سرخ کو سنگ سلیمانی کہتے ہیں۔
سنکھیا			
سلیمانی			ستاروں کی معلومات حاصل کرنے کا آلہ۔
اسطرلاب	اصطرلاب	Astorlabe	
قیراط (ایک وزن)	قیراط	Carat	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Sypher	صفر	صفر
اس میں حروف مقدم موخر ہو گئے ہیں	Cube	کعب	پہلو دار
یہ وزن بارہ قیراط کے برابر ہے	Degree	درجہ	درجہ
	Dram	درہم ۔ دراہم	درم (ایک وزن)
کچھ حروف کم ہو گئے	Magnet	مغناطیس	مقناطیس
”	Oval	اہلیلجی	بیضاوی شکل
	Philosophy	فلسفہ	فلسفہ (حکمت)
	Tumour	دمّل	پھوڑا

عرب تاجروں کے قافلے اکثر سرزمین مغرب میں سامان تجارت لے جایا کرتے تھے جس میں زیادہ تر مشرقی مصنوعات اور پیداواریں ہوتی تھیں جیسے حلب کے بنے ہوئے مشہور آئینے کشمیری زعفران اور مصری چاول۔ اس قسم کی تمام چیزوں کے نام انگریزی میں عربی سے ماخوذ ہیں اگرچہ بعض الفاظ میں کسی قدر تغیر ہو گیا ہے (کیونکہ وہ فرانسیسی یا اطالوی کی وساطت سے انگریزی تک پہنچے)۔ لیکن تلفظ کی رعایت کرکے ان کی اصلیت معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Amber	عنبر	عنبر
	Anise	انیسون	انیسون

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عرق	عرق	Arrack	
بلساں	بلساں	Balsam	اس کا تیل اکثر امراض میں مفید ہوتا ہے۔
کافور	کافور	Camphir	
قہوہ۔ کافی	قہوہ	Coffee	یمن کی خاص پیداوار ہے۔ اس کے تلفظ میں کچھ فرق ہوگیا ہے۔
زیرہ	کموں	Cummin	
پوستین	فرود	Fur	
یشب	یشب۔ یصب	Jasper	اس کے آخر میں ر (R) زیادہ ہوگیا۔
مصطگی رومی	مصطکار	Mastic	
کان	معدن	Mine	اس میں حرف کی کمی ہوگئی۔
آئینہ	مرآۃ	Mirror	عربی میں "رویت" سے اسم آلہ ہے
مشک	مسک	Musk	
کوکابیلی	نیلوفر۔ نینوفر	Nenuphar	
عطر	عطر	Odorous "Otto Or Otto	
مرچ	فلفل		
پستہ	فستق	Pistachio	
چاول	ارز۔ رز	Rise	
زعفران	زعفران	Saffran	
تل	سمسم	Sesame	
جو چیزیں پی جائیں	شربت	Sherbet	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
صابن	صابون	Soap	
شربت (میٹھا)	شراب	Syrup	
املی	تمر ہندی	Tamarind	
ایک قسم کی گھانس	طرخون	Tarragon	اس گھانس کی جڑ عاقر قرحا کہلاتی ہے۔

یورپ سے خوش اعتقاد زائرین بیت المقدس آیا کرتے تھے اور جن نئی چیزوں سے ان کو واسطہ پڑتا ان کے نام انھیں یاد ہو جاتے اور سفرنامہ بیان کرتے وقت وہی عربی الفاظ اپنے تلفظ میں ادا کرتے جو رفتہ رفتہ ان کی زبانوں کے جز بن گئے۔ مثلاً۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عرب	عرب	Arabia	
بدّو	بدوی	Badouin	
قاضی	قاضی	Cadi	
خلیفہ	خلیفہ	Caliph	
خطّہ - اقلیم	اقلیم	Clime	
گنبد	قبّہ	Cope	
جن	جنّی	Genii	
آدم خور دیو غول بیابانی	غول	Ghoul	
سرائے	خان	Khan	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
قریہ۔ گاؤں	قریہ	Kraal	ایک حرف (L) زیادہ ہوگیا۔
مینار	منارہ	Minaret	
مسجد	مسجد	Mosque	تلفظ میں کسی قدر فرق ہوگیا۔
راستہ	طریق	Track	

کارزار صلیبی اس لڑائی (Crusade) کو کہتے ہیں جو پانچویں صدی ہجری سے چھٹی صدی تک بیت المقدس کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہوتی ہیں۔ اس لڑائی میں سارے یورپ نے سنبھل سنبھل کر اور اپنی تمام قوت یک جا کر کے لاکھوں کے گروہ سرزمین شام میں بھیجے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ مسلمان کامیاب رہے۔ یورپ نے اس عرصہ میں شام پر نو حملے کئے۔ اسی اثنا میں ایک زبان، لنگوفرینکا، مشرقی اور مغربی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوگئی تھی۔

جنگ صلیبی کی اس طویل مدت میں لنگوفرینکا کی وجہ سے اکثر عربی الفاظ یورپی زبانوں میں جذب ہوگئے جن کی یورپی فہرست درج کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر تھوڑے سے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
بھونا	القلی	Alkali	
الف لام استغراقی	ال	All	
حلیف	ییغ	Ally	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
نیلگوں	ازرق	Azure	اس میں ایک حرف کی کمی ہوگی۔
آسمانی رنگ			
البتہ	البتہ	Albeit	
تس پر بھی			
چھوٹنا	براۃ	Breuet	
عیب سے بیزاری			
بھنگا	بق	Bug	
پشہ			
بگل	بوق	Bugle	
قمیص۔ کرتہ	قمیص	Camisol	
چراغ۔ قندیل	قندیل	Candle	
لبادہ	قباء	Capote	
شاہی محل	قصر	Castle	
بلّی	قط	Cat	
قضیہ، مقدمہ	قضیہ	Cause	
قرض	قرض	Corrode	
روئی	قطن	Cotton	
چھلنی	غربال	Cribble	
کنڈے دار پیالہ	کوب	Cup	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
زمین	ارض	Earth	
فرق کرنے والا	فارق	Forky	
جوش۔ ہیجان	فورہ	Fury	
جنس قسم	جنس	Genus	
کھر۔ سم	حافر	Hoof	
بیمار	علیل	Ill	
چنبیلی	یاسمین	Jasmine Jessamine	
پتیلی	قدر	Kettle	
مار ڈالنا	قتل	Kill	
نیبو	لیموں	Lemon	
نرمی	لینۃ	Lenity	
خوش ذائقہ	لذید	Luscious	
غلام	مملوک	Mameluke	
پوشیدہ	مستتر	Misterious	
بزرگ	نبیل	Noble	
گردن	عنق	Neck	ع' کا تلفظ یورپ والے نہیں کر سکتے۔
گدی	نقار	Occiput	
شکار	فریسہ	Prey	
چھوڑ دینا۔ انکار کرنا	رفض	Refuse	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
تلوار	سیف	Sabre	
اژدھا۔زہریلا سانپ	ثعبان	Serpent	
زنجیر آہنی	سلسلہ	Shackle	
کشتی۔ جہاز	سفینہ	Ship	
ڈوبنا	غرق	Shipwreck	انگریزی کا لفظ عربی کے دو الفاظ سفینہ غرقت سے مرکب
آواز	صوت	Sound	ہے کثرت استعمال سے درمیانی حروف غائب ہو گئے۔
اصطبل۔طویلہ	اصطبل	Stable	اصطبل شامی عربوں کی زبان کا لفظ ہے۔
سلطان	سلطان	Sultan	
آدھا ٹکڑا	شطر	Sunder	
نقارۂ طبل	طبل	Tabour	
دراز قد۔ لانبا	طویل	Tall	
گیہوں کوٹنا	درس	Thrash	
دھمکانا	تہدید	Threat	

فلسفۂ تحریر

لکھائی کی ایجاد کا قدرتی طریقہ | ہر چیز اس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جائے۔ ضرورت پڑنے پر انسان قوائے دماغی کو کام میں لا کر ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جن سے اپنی حاجت روائی میں آسانیاں حاصل کر سکے۔ اگر آگ سے پیدا ہونے والی تمام اختراعات

کی تلاش کریں جن کی ابتدا زمانۂ تاریخ سے بھی پہلے کی ہے تو آج نہایت آسانی سے ریڈیو کی لہروں تک پہنچ جائیں گے جو گھر گھر رائج ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے جس نے کہا بالکل سچ کہا۔

زبانوں کی ایجاد کو قرنہا قرن گذر گئے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر صرف آوازوں میں ادا کر سکتا تھا۔ جب اس کی نسل بڑھی اور پھیلی حتی کہ لوگوں نے کسب معیشت کے لئے سفر اختیار کیا تو اب ان کو اپنے وطن میں خبریں پہنچانے کی، یادداشت میں پیش آنے والے واقعات کو محفوظ کرنے کی ضرورت پیش آئی جس کی بنا پر انھوں نے نقوش اور تصاویر سے اس طرح کام لینے کی ابتدا کی۔

دور بربریت کے انسان بھی زینت و آرائش کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جن جانوروں کا وہ شکار کرتے یا جن حیوانات و نباتات کی پرستش کرتے، ان کی تصاویر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلے یہ تصویریں بچوں کی بنائی ہوئی تصاویر کی طرح بھدی اور بھونڈی ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مہارت بڑھتی گئی۔ وہ ہڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر انسانوں اور جانوروں کی شکلیں بنا کر اپنے رہنے کے غاروں کو سجاتے تھے اور غاروں کے در و دیوار پر معمولی نقاشی بھی کر لیتے تھے۔ (اس کا رواج ابھی تک ہندوستان کے اکثر مکانوں میں پایا جاتا ہے جن کے دروازوں پر دیوتاؤں اور جانوروں کی تصویریں منقوش یا کندہ ہوتی ہیں) جب معاشرت نے زیادہ ترقی کی اور لوگ خاندانوں اور قبیلوں پر تقسیم ہو گئے تو قبائل کے سرداران تصویر دار ہڈیوں اور سینگوں کو ایک دوسرے کے پاس بطور تحفہ بھیجنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ تصاویر بجائے ہدیہ کے نامہ و پیام کا ذریعہ بن گئیں۔ گویا کہ اس وقت تک تصویروں پر تین دور گذر چکے تھے، پہلے دور میں وہ صرف زیبائش کی چیزیں تھیں، دوسرے دور میں بطور تحفہ و ہدیہ استعمال ہونے لگیں اور تیسرے دور میں نامہ و پیام کے کام آئیں۔

ہم عہد اوّل کے انسانی قبائل میں سے ایک قبیلہ فرض کرتے ہیں جس کے افراد پھلوں اور حیوانوں کے شکار سے اپنی خوراک حاصل کیا کرتے تھے اور غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے

ان کے قبیلہ میں کوئی تاریخی یا اہم واقعہ پیش آگیا مثلاً شیر نے حملہ کرکے ان کے سردار کو پھاڑ کھایا، اس واقعہ کو وہ محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا صورت اختیار کی جائے جس سے واقعہ محفوظ رہ سکے۔ آپ کے خیال میں کوئی صورت سوا تصویر کشی کے آہی نہیں سکتی خواہ وہ نقش کی صورت میں ہو یا ان کے حالات کے مطابق کسی چیز پر کھدائی کی صورت میں۔ اب وہ ایک تصویر بنائیں گے جس میں شیر اپنے پنجوں سے آدمی کو نوچ رہا ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری تصویر ہوگی۔ یہ پہلا قدم ہے جو انسان نے لکھائی کی طرف بڑھایا۔ اس دور کو ہم ذاتی تصویر کشی کا دور کہیں گے کیونکہ اس زمانہ میں صرف ایسے ہی حادثے محفوظ کئے جا سکتے ہیں جن میں صورت کشی ممکن ہو۔

بعض مفہوم ایسے بھی پائے جاتے تھے جن کی کوئی خارجی شکل نہیں ہے جیسے محبت عداوت۔ یا آج۔ کل۔ صبح۔ شام وغیرہ جو محض معنی ہی معنی ہیں۔ ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے کچھ اشاروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو مقرر کر لئے گئے، جیسے محبت کے لئے کبوتر۔ عداوت کے لئے سانپ۔ دن کے لئے دائرے کے اوپری حصہ میں سورج وغیرہ وغیرہ۔ ہم کچھ ایسے آدمی فرض کرتے ہیں جو کسی قبیلہ پر تین دن کی مسافت طے کرکے حملہ کرنے کے لئے رات میں ساحل پر اترے۔ سردار قبیلہ موجود نہیں تھا اس کے لڑکے نے اسے اطلاع دینا چاہی۔ وہ بجز اس کے کوئی ذریعہ نہیں اختیار کر سکتا کہ مندرجہ ذیل تصویر بنا کر باپ کے پاس بھیج دے۔
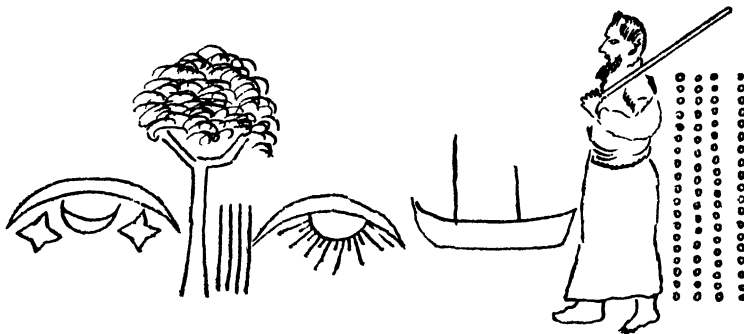
تصویر میں نقطوں سے کثرت ظاہر کی گئی ہے۔ مسلح آدمی سے دشمن مراد ہے۔ کشتی سے سمجھا جائے گا کہ وہ لوگ بحری راستہ سے آئے۔ قوس میں سورج کی تصویر دن کا وقت بتاتی ہے۔ تین لکیروں سے تین کا عدد سمجھا جائے گا۔ درخت خشکی کی علامت ہے اور قوس سے جس میں چاند اور تاروں کی شکل بنی ہوئی ہے، رات مراد ہے۔

یہ لکھائی کی طرف دوسرا قدم ہے۔ اس میں اشارات مقرر کرکے تصویریں بنائی گئی ہیں جو بہرحال مفہوم ادا کرنے میں ذاتی صورت کشی سے کہیں زیادہ بہتر اور کارگر ثابت ہوئیں۔ اس دور کو ہم "رمزی تصویر کشی کا دور" کہیں گے جس میں انسان کی بیشتر تعبیری ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

ایک عرصۂ دراز گذر نے پر لوگوں نے تصویر کے مفہوم کا حرف اول مع اعراب مراد لینا شروع کیا جیسے دشمن کی تصویر سے پہلا حرف (د۔ مضموم) مراد لیا یا کشتی کی تصویر سے (ک مکسور) اور شاخ کی تصویر سے (ش۔ مفتوح) وغیرہ۔ لکھائی کی ایجاد کا یہ تیسرا قدم تھا اور بہت ہی اہم کیونکہ شکلوں کے مفہوم سے پہلا حرف مع اعراب مراد لیا جانا اس بات کی ابتدا تھی کہ مفرد آوازوں کی شکلیں الگ الگ مقرر ہو جائیں۔ اس دور کو ہم "آوازوں کی شکلوں کے دور" سے تعبیر کریں گے۔

مختلف چیزوں کی تصویریں بنا لینا کوئی آسان کام نہ تھا علاوہ بریں اس طرح کی لکھائی میں پھیلاؤ بہت ہو جاتا تھا۔ کچھ تو انسان کا ہاتھ طبعی طور پر سرعت اور تیزی کی طرف مائل ہے تاکہ جلدی جلدی مختلف شکلیں بن سکیں، اور کچھ وقت کی بچت کے خیال سے مسلح دشمن کی شکل ایسی بننے لگی جو تصویر تو نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن اس سے ملتی جلتی چیز تھی۔ پھر اس میں بھی اتنی تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں کہ اس کی اصلی شکل کا پتہ چلنا دشوار ہو گیا۔

اب وہ وقت آیا کہ انسان کو الگ الگ اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ کسی شکل سے ایسی آواز مراد لے جس میں حرف کے ساتھ ساتھ حرکت بھی ہو، ایسی آوازیں مراد لینے لگا جو صرف حرف تھیں اور اعراب کے لئے دوسری علامتیں مقرر کر لیں۔ پہلے جس شکل

سے (دِ پیش ۔ دُ) سمجھا جاتا تھا اب اس سے فقط حرف (د) سمجھا جانے لگا اور اعراب کے لئے دیگر علامات کا اضافہ کر لیا گیا اس طرح آسانی بھی ہوئی اور وقت کی بچت بھی۔ یہ تھا "دورِ ہجائی"۔

لکھائی کو عہد اول سے ابتک چار دوروں سے گذرنا پڑا۔

(پہلا) ذاتی تصویر کشی کا دور ۔ اس میں تصویریں صرف مرئیات ہی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس کی بنا پر فقط موٹے موٹے واقعات محفوظ کئے جا سکتے تھے۔

(دوسرا) رمزی تصویر کشی کا دور ۔ اس کو ذاتی تصویر کشی پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ رمزی تصویریں ایسے معنوی مفہوم میں بتاتی ہیں جن کی کوئی خارجی شکل موجود نہیں ہے ۔ اس دور میں انسان اکثر وہ چیزیں قلم بند کر سکتا تھا جو اس کے ذہن میں مختلف معنوی مفہوموں کے متعلق گذرتی تھیں۔ لیکن اس صورت میں ہزارہا شکلیں بنائی جاتی تھیں اور خاصی زحمت ہوتی تھی (چینی رسم الخط دوسرے اور تیسرے دور کے درمیانی زمانہ کی یادگار ہے جس میں اشکال حروف کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے ۔)

(تیسرا) آواز کی شکلوں کا دور ۔ اس میں منقوش تصویر اپنے نام کا پہلا حرف مع اعراب بتاتی تھی جو کتابت کی ایجاد میں سب سے بڑا اور اہم قدم ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے دور میں مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے ہزاروں شکلوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا جو اس دور میں گھٹ کر سینکڑوں پر محدود ہو گئیں ۔

(چوتھا) دور ہجائی ۔ اس میں ان شکلوں نے حروف کی صورت اختیار کر لی۔ حروف ہجی منضبط ہو جانے کی وجہ سے شکلوں کی تعداد دھائیوں تک پہنچ گی۔

اس کے بعد بھی دو دور مزید گذرے چوتھے دور تک حروف الگ الگ لکھے جاتے تھے (جیسے اب تک یورپی زبانوں کے طباعتی حروف ہیں ۔ ان میں حروف کو ترتیب دے کر الفاظ بنانے کے بعد دو لفظوں میں فرق کرنے کے لئے تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تامل تلنگی اور عبرانی وغیرہ در حقیقت اس چوتھے دور کی یادگار ہیں ۔) اس صورت میں بسا اوقات الفاظ

ایک دوسرے میں مخلوط ہو کر صاف سمجھ میں نہیں آتے تھے لہذا ضرورت ہوئی کہ حروف کو ایک دوسرے میں جوڑ کر ایک لفظ بنایا جائے پھر دوسرا پھر تیسرا تاکہ ہر لفظ دوسرے سے ممتاز اور علیحدہ رہے۔ اس جوڑائی کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ انگریزی تحریری رسم الخط میں ایک حرف کی پشت دوسرے حرف کے سرے سے جوڑ دی جاتی ہے سریانی میں بھی یہی صورت ہے۔ ہندی میں ایک لفظ پورا کرنے کے لئے حروف علت اور ماترے سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ لکھائی کا پانچواں دور ہے۔

یہاں تک تو آریائی اور سامی لکھائیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ آگے بڑھ کر عربی رسم الخط اور اس کی شاخوں پر چھٹا دور گذرتا ہے۔ ابھی تک پورے پورے حروف جوڑ دئے جاتے تھے لیکن مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر حرفوں کے صرف ابتدائی حصے ایک دوسرے میں جوڑے جانے لگے، اور لفظ کے خاتمے پر پورا حرف جوڑ دیا گیا۔ اکثر آریائی خطوط بائیں سے داہنے کو اور سامی خطوط داہنے سے بائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ اگر داہنے ہاتھ میں قلم ہو تو طبعاً ہاتھ کی کشش بائیں سے داہنے کو ہوگی جس کی وجہ سے آسانی بھی ہوگی اور وقت بھی کم خرچ ہوگا۔ برخلاف اس کے داہنے سے بائیں کو قلم ٹھیلا جاتا ہے جس میں کسی قدر دقت بھی ہوتی ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ حروف کے سرے جوڑ کر الفاظ بنائے جائیں تاکہ جگہ اور وقت کی بچت ہو سکے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ قدیم عربی رسم الخط محض اٹکل پر پڑھا جاتا تھا کیونکہ اس میں نقطہ دار اور بے نقطہ حروف میں کوئی امتیاز نہ تھا اس بنا پر خیال کیا گیا کہ اسلام مختلف بلاد عجم میں پھیل چکا ہے جہاں لوگ عربی سے ناواقف ہیں اور بہت ممکن ہے کہ کلام پاک کی تلاوت میں غلطیاں رائج ہو جائیں لہذا اعراب اور نقطے ایجاد ہوئے، خط صاف اور واضح اور خوب صورت بنایا گیا۔ (اس سے پہلے اعراب کا کام حروف علت سے لیا جاتا تھا لیکن اعراب معروف اور اعراب مجہول میں کوئی فرق ممکن نہ تھا اس لئے زیر زبر پیش کی شکلیں مقرر کی گئیں،

رسم الخط میں یہ اصلاح حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں ہوئی اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری میں علامہ سجاوندی نے آیت، وقف مطلق، اور وقف لازم وغیرہ کی علامتیں مدون کیں۔ یہ تھا خط نسخ جو اب تک رائج ہے۔ اس میں معمولی تغیر کے بعد فارسی اور ترکی رسم الخط بن گئے۔ اگرچہ ان تینوں خطوں میں جزئی اختلاف ہے لیکن ایک کا جاننے والا بقیہ دونوں کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

ان رسوم خطوط کی تاریخ جو اب تک مستعمل ہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ لکھائی نے ابتدا سے اب تک کس طرح تدریجی ترقی کی۔ اب ہم اس کی تائید میں تاریخی واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عہد اول کے انسان نے کیسے خطوط سے کام لیا جو موجودہ خطوط کی پیدائش کا سبب ہیں۔

انسان نے عہد اول سے اب تک جن خطوط سے کام لیا ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے مگر ان میں کے اکثر خط اب متروک ہو چکے ہیں۔ ہم اس بحث میں آسانی پیدا کرنے کے لئے لکھائی کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) اصلی خطوط (۲) فرعی خطوط۔

(اصلی) یہ وہ قسم ہے جس کو قدیم متمدن قومیں کام میں لاتی تھیں۔ اس کی ابھی تک چار ہی شاخیں مل سکی ہیں۔

(۱) خط ہیروگلیفی (Hieroglyphic) (۲) خط میخی (۳) خط حبشی (۴) خط چینی۔ ان میں سے تقریباً ہر خط نے الگ الگ نشو و نما پائی اور ذاتی تصویر کشی کے دور سے ترقی کرتا رہا لیکن دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان ٹھہر گیا۔

(فرعی) وہ خطوط ہیں جو اصلی سے نکلے ہیں اور اب تک ان کا بیشتر حصہ زندہ یا مردہ پایا جاتا ہے۔ ان کا بیان آگے آئے گا۔

(۱) خط ہیروگلیفی۔ خطوط اصلیہ میں یہ سب سے اہم ہے اور عام طور پر یہی گمان کیا جاتا ہے کہ دنیا کے اکثر مشہور و معروف خطوط اسی سے پیدا ہوئے۔ یہ دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان زمانہ کا خط ہے۔ اس کی بعض شکلیں اپنے ذاتی معنی دیتی ہیں بعض رمزی معنی اور بعض ابتدائی حرفوں کی

جس کی وہ تصویر تھی۔ (۲۲ حروف حسب ذیل تھے ا۔ب۔ج۔د۔ہ۔و۔ز۔ح۔ط۔ی۔ک۔ل
م۔ن۔س۔ع۔ف۔ص۔ق۔ر۔ش۔ت۔) مثلاً بیل کی تصویر ( ) جس سے مصری
لوگ بیل ہی مراد لیتے تھے اور اس کو اپنی زبان میں آوا کہتے تھے، فینیقیوں نے بیل کے سر سے
ملتی جلتی ایک شکل ( ) بنائی جس کا نام (الف یعنی بیل رکھا اور اس سے الف کا پہلا
حرف (ا) مراد لیا۔ مصری ایک شکل گھر کی سی بنائی تھے ( ) اور اس کو اپنی زبان میں (با)
کہتے تھے جس کے معنی ہیں گھر فینیقیوں نے سہولت کے لئے اس سے ملتی جلتی ایک شکل بنائی
( ) جس کا نام "بیتھ" رکھا (جس کے معنی ہیں "گھر" یا "خیمہ" عربی میں بیت صرف گھر کے معنی
میں مستعمل ہے) اور اس کا حرف اوّل (ب) مراد لیا۔ مصری (ج) کے لئے اونٹ کی شکل ( )
استعمال کرتے تھے فینیقیوں نے اس کی شکل ( ) آسان بنا کر جیمل (عربی جمل = اونٹ) نام
رکھا اور حرف اوّل (ج) مراد لیا۔ اسی طرح دندانے دار شین کی خط ہیروگلیفی میں یہ شکل ہے ( )
جس میں اگے ہوئے درخت (شجر) بنائے گئے ہیں۔ انہی پر باقی حروف کو قیاس کر لینا چاہئے
فینیقی لوگ حروف کا اقتباس کر کے اپنا لیتے تھے اور جس چیز کی شکل ہوتی اسی کا نام رکھ دیتے
تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی زبان کے کل حروف جمع کر لئے اور فینیقی ابجد عالم وجود میں آگئی
جس کے حرفوں کے نام ان کی شکلوں پر دلالت کرتے ہیں جیسے۔

جدول ابجد اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

فینیقیوں نے ۱۵۰۰ ق۔م۔ میں اہل یونان کو لکھنا سکھایا اور فینیقی حروف کسی قدر تغیر
کے ساتھ یونانی میں رائج ہو گئے۔ عراق کے دوآبہ میں جا کر اشوریوں کو بھی سکھایا جو اس سے
پہلے خط میخی استعمال کرتے تھے لیکن چونکہ فینیقی حروف کے استعمال میں زیادہ آسانی تھی لہٰذا
انھوں نے خط میخی اس کے مقابلہ میں بالکل ترک کر دیا کیونکہ اس میں ہر لفظ کے لئے ایک علیحدہ
شکل تھی اور پڑھنے والوں کو ہزاروں الفاظ کی جداگانہ شکلیں یاد رکھنا پڑتی تھیں یہ چینی رسم الخط
میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔

یونانی سے رومی گاتھک یونانی جدید اور سلانی وغیرہ رسم الخط پیدا ہوئے جو اب تک یورپ اور امریکہ میں مستعمل ہیں۔ قبطی بھی یونانی ہی کی شاخ تھی جو اب مردہ ہو چکی۔

(یورپی حروف کی جدول صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ ہو)

آرامی یا کلدانی سے تمام مشرقی خطوط جیسے عبرانی مربع، سطرنجیلی، نبطی اور ہندی پیدا ہوئے۔ سطرنجیلی کی شاخیں سریانی اور کوفی ہیں۔ نبطی سے عربی خط پیدا ہوا۔ ہندی کی شاخیں بنگالی اور گجراتی وغیرہ ہیں۔ فینیقی سے براہ راست قدیم عبرانی قبرسی اور قرطجنی خطوط نکلے۔ قدیم عبرانی سے سامری حروف پیدا ہوئے۔ مذکورہ بالا خطوط میں سے اکثر اب مردہ ہو چکے ہیں۔

(تیسری جدول صفحہ ۴۳ و ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

آرامی تمام مشرقی خطوط کی اصل ہے جو ابتدا میں درحقیقت فینیقی حروف تھے جن میں اختلاف پڑتے پڑتے اصل سے دوری ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ بعض حروف اوپر سے کھل گئے اور بعض بند ہو گئے، جس کی مثال حسب ذیل ہے۔

بیلجا سلم عمرن بر معنن قرب زی میتبا

لحا نخشہ

عربی حرفوں کا نام	فینیقی حرفوں کے نام	ان کے معنی	یونانی حرفوں کے نام	عربی حروف	فینیقی حروف	یونانی حروف	سامری حروف
الف	الف	بیل	الفا	ا	𐤀	A	𐤀
بار	بیتھ	خیمہ یا گھر	بیٹا	ب	𐤁	B	𐤁
جیم	جیمل	اونٹ	جملا	ج	𐤂	Λ	𐤂

عربی حرفوں کے نام	فینیقی حرفوں کے نام	ان کے معنی	یونانی حرفوں کے نام	عربی حروف	فینیقی حروف	یونانی حروف	سامری حروف
دال	دالتھ	دروازہ	ڈلٹا	د	𐤃	Δ	ࠃ
ہار	ھ	؟	ای	ہ	𐤄	E	ࠄ
واؤ	واؤ	گرز	او	و	𐤅	Υ	ࠅ
زار	زین	ہتھیار	؟	ز	𐤆	I	ࠆ
حار	حیتھ	دیوار	اِتا	ح	𐤇	H	ࠇ
طار	طیط	سانپ	سیتا	ط	𐤈	Θ	ࠈ
یار	یود	ہاتھ	یوتا	ی	𐤉	ϛ	ࠉ
کاف	کاف	رکاوٹ	کپّا	ک	𐤊	K	ࠊ
لام	لامدہ	چھونا	لامدھا	ل	𐤋	Λ	ࠋ
میم	میم	پانی	می	م	𐤌	M	ࠌ
نون	نون	مچھلی	نی	ن	𐤍	N	ࠍ
سین	سامک	ستون خانہ	سگما	س	𐤎	Σ	ࠎ
عین	عین	آنکھ	?	ع	𐤏	O	ࠏ
فار	فا	منھ	پی	ف	𐤐	Π	ࠐ
صاد	صادی	—	زیٹا	ص	𐤑	Ϻ	ࠑ
قاف	قوف	کان	—	ق	𐤒	Ϙ	ࠒ
رار	ریش	سر	رو	ر	𐤓	P	ࠓ
شین	شین	دانت	—	ش	𐤔	Σ	ࠔ
تار	تاو	نشانی	ٹاؤ	ت	𐤕	T	ࠕ

یورپی حرفوں کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
اے	A	A	A	A
بی	B	B	B	B
سی	C	C	C	C
ڈی	D	D	D	D
ای	E	E	E	E
ایف	F	F	F	F
جی	G	G	G	G
ایچ	H	H	H	H
آئی	I	I	I	I
جے	J	—	—	J
کے	K	K	K	K
ایل	L	L	L	L
ایم	M	M	M	M
این	N	N	N	N
او	O	O	O	O

یورپی حرفوں کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
پی	P	P	P	P
کیو	Q	Q	Q	Q
آر	R	R	R	R
ایس	S	S	S	S
ٹی	T	T	T	T
یو	U	U	U	U
وی	V	V	V	V
ڈبلو	W	W	W	W
ایکس	X	X	X	X
وائی	Y	Y	Y	Y
زیڈ	Z	Z	Z	Z

نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حروف کے نام	تامل حروف
۱	ا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ܐ - ܐ	א	اَ	அ
۲	ب	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ܒ	ב	آ	ஆ
۳	ج	?	?	?	?	ג	اِ	இ

نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حروفوں کے نام	تامل حروف
۴	د	?	[glyph]	[glyph]	ܕ	ד	ای	ஈ
۵	ه	7	[glyph]	?	ܗ	ה	اُ	உ
۶	و	?	?	[glyph]	ܘ	ו	اَو	ஊ
۷	ز	2	?	?	ܙ	ז	اِ	எ
۸	ح	7	[glyph]	[glyph]	ܚ	ח	اِے	ஏ
۹	ط	?	?	?	ܛ	?	اَی	ஐ
۱۰	ی	2	[glyph]	[glyph]	ܝ	י	اُ	ஒ
۱۱	ك	?	?	?	ܟ - ܟ	ך - כ	اُو	ஓ
۱۲	ل	[glyph]	[glyph]	[glyph]	ܠ	ל	اَو	ஔ
۱۳	م	[glyph]	[glyph]	?	ܡ	ם - מ	اِک	ஃ
۱۴	ن	[glyph]	[glyph]	[glyph]	ܢ	ן - נ	کا - گا	க
۱۵	س	[glyph]	V	?	ܣ	ס	نیا	ங
۱۶	ع	ب	[glyph]	[glyph]	ܥ	ע	سا - چا	ச
۱۷	ف	?	[glyph]	?	ܦ	פ	نیا	ஞ
۱۸	ص	?	?	?	?	צ	ٹا - ڈا	ட
۱۹	ق	[glyph]	?	[glyph]	ܩ	ק	نا	ண
۲۰	ر	[glyph]	[glyph]	[glyph]	ܪ	ר	تا	த
۲۱	ش	[glyph]	V	?	ܫ	ש	نا	ந
۲۲	ت	[glyph]	[glyph]	?	ܬ	ת	با - پا	ப

تامل حروف	تامل حروف کے نام	عبرانی حروف	سریانی حروف	جدید نبطی حروف	قدیم نبطی حروف	آرامی حروف	عربی حروف	نمبر شمار
ம	ما	ת	ܬ	—	—	—	ث	۲۳
ய	یا	ח	ܟ	—	—	—	خ	۲۴
ர	را	ד	ܕ	—	—	—	ذ	۲۵
ல	لآ	—	ܓ	—	—	—	غ	۲۶
வ	وا							
ழ	ڑا	פ	ܦ	—	—	—	پ	۲۷
ள	لا	—	ܓ	—	—	—	گ	۲۸
ற	را							
ன	نا	—	—	—	—	—	ض	۲۹
		—	—	—	—	—	ظ	۳۰
		—	—	—	—	—	ٹ	۳۱
		—	—	—	—	—	چ	۳۲
		—	—	—	—	—	ڈ	۳۳
		—	—	—	—	—	ڑ	۳۴
		—	—	—	—	—	ژ	۳۵

یہ حروف کا عربی میں اضافہ ہوا......

ان زبانوں میں یہ حروف بالکل نہیں پائے جاتے

ہندی حروف	ہندی حروف کے نام	ہندی حروف	ہندی حروف کے نام	ہندی حروف	ہندی حروف کے نام
श	شا	ट	ٹا	अ - अ	اَ
ष	کھشا (خا)	ठ	ٹھا	आ - आ	آ

ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف
اِ	इ	ترَ	ञ	وا	व
اِی	ई	ٹا	ट	سا	स
اُ	उ	ٹھا	ठ	ہا	ह
اُو	ऊ	ڈا	ड		
اِے	ए	ڈھا	ढ		
اَے	ऐ	ڑاں	ण		
اُو	ओ	تا	त		
اَو	औ	تھا	थ		
اَن	अं	دا	द		
اَہ	अः	دھا	ध		
کا	क	نا	न		
کھا	ख	پا	प		
گا	ग	پھا	फ		
گھا	घ	با	ब		
ڑاں	ङ	بھا	भ		
چا	च	ما	म		
چھا	छ	یا	य		
جا	ज	را	र		
جھا	झ	لا	ल		

ہیروگلیفی	فینیقی	یونانی
(آوا) بیل	(الف) بیل	(الفا)
ہیروگلیفی میں بیل کا پورا چہرہ بنا کر (آفا) کا پہلا حرف (آ) مراد لیا جاتا ہے۔	اس کی شکل ایک مثلث نما کی سی رہ گئی جس کو وسط سے کاٹ کر بائیں کا مثلث منہ اور داہنی طرف کی شاخیں سینگ فرض کی گئیں یہ بیل کی تصویر بگڑ کر پہلی حرفی شکل تیار ہوئی	فینیقی شکل کو اس طرح گھمایا گیا کہ دونوں سینگ نیچے آگئے اور منہ اوپر ہو گیا۔ یہ یورپی زبانوں کے حرف (اے) کی ابتدا ہے
سامری	قدیم انگریزی	رومی
	(اے)	(اے)
اس میں درمیان سے خط قاطع غائب ہو گیا۔	یونانی شکل سامری حرف کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر قدیم انگریزی (اے) کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔	(اے) کی سہل نگاری کے لیے ایک طالبی شخص نے یہ شکل وضع کی جو خوب صورت ہونے کے علاوہ سہل بھی ہے اور اب تک اکثر یورپی خطوط میں رائج ہے۔
عبرانی	جرمنی	تامل
(آلیف) بیل		(آ)
یہ شکل بھی کافی حد تک سامری حرف کی خوب صورتی سے متاثر ہوئی۔ سامری حرف میں داہنی طرف دو شاخیں ہیں اور اسمیں ایک۔	یونانی حرف (الفا) کا منہ اوپر سے کھل گیا اور خوب صورتی پیدا کرنے کے لئے عبرانی حرف (آلیف) کی اتباع کی گئی۔	جرمنی حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ عبرانی سے بھی۔

ہندی	آرامی	نبطی قدیم
अ (اَ)		
براہ راست تاملِ حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ جرمنی اور عبرانی سے بھی۔	آرامی میں یہ دونوں شکلیں رائج تھیں۔	بیل کے سر (مثلث) پر صرف ایک لکیر سینگوں کی یادگار باقی رہ گئی۔
نبطی جدید	**ع۔ بی**	**سریانی**
		ابتدائی / ابتدائی
اس میں مثلث بھی مٹ گیا لیکن نیچے کی لکیر سے مثلث کی کچھ یادگار سی رہ گئی۔	اس میں نبطی جدید کے حرف کی اوپری لکیر بالکل سیدھی ہو گئی (ہندی میں آ مدود بھی یوں ہی سیدھا "آ" بنتا ہے۔ جیسے आ میں ہے)	یہ عربی الف کی طرح لمبائی میں لکھا جاتا ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں ایک ابتدائی جس میں ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے کیونکہ اوپر سے نیچے کی طرف کشش میں لہر پیدا کرنا آسان ہے۔ دوسری انتہائی جو عربی الف کی طرح بالکل سیدھی ہے اس کی کشش نیچے سے اوپر کو ہو گی۔

(سلسلہ کے لئے صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو)

یعنی وہ تحفت جو معنن بن عمرن نے سلم دیوتا کو اپنی زندگی کے لئے پیش کیا۔ اس میں (ر۔ ب۔ اور ع) کے منہ اوپر سے کھل گئے جس کا فینیقی خط میں کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔
خط آرامی ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلا اور ہر گروہ میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کی جس کی وجہ

سے مذکور بالا شاخیں پیدا ہوئیں۔ مندرجہ بالا نقشہ یہ بتایا ہے کہ شکلوں نے کس طرح ارتقائی مدارج طے کئے اور اپنی اصل سے بتدریج دور ہوتی چلی گئیں اسی نمونہ پر دوسرے حروف کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

خط نبطی بھی آرامی ہی کی ایک شاخ ہے جس سے عربی خط نسخ پیدا ہوا۔ یہ رسم الخط بصریٰ اور صرخد میں بسنے والی قوم انباط میں مستعمل تھا۔ اسی نواح میں اس طرز تحریر کے کچھ نمونے دستیاب ہوئے جن کی دو مختلف قسمیں ہیں۔ ایک جو قدیم ہے، اپنی وضع قطع میں آرامی رسم الخط سے قریب تر ہے۔ اس کی ان کتبوں کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو حوران کے قرب وجوار میں دستیاب ہوئے۔

نفشہ دی ہمرت دی بنہ لہ ادینت بعلہ

یعنی ہمرت کا اسٹیچو جسے اس کے آقا ادینت نے بنایا۔

خط نبطی کی دوسری قسم جدید ہے جو عربی رسم الخط سے مشابہ ہے۔ ایک ایسا ہی کتبہ دستیاب ہوا جس پر عبارت اسی رسم الخط میں کندہ ہے۔ غالباً یہ اتصال حروف کی سب سے پہلی مثال ہے۔

دنخ قبرا دی عبد عیدو بن کھیلو بن

یعنی یہ قبر عیدو بن کھیلو بن ...... کی بنوائی ہوئی ہے۔

(۲) خط حتی۔ حتی ایک پرانی قوم تھی جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان عہد قدیم میں آباد تھی۔ اس کی لڑائیاں فراعنۂ مصر اور آشوریوں سے ہوئیں۔ بعد ازاں تباہ و برباد ہوگئی اور اس کے آثار ہزاروں برس پیشتر معدوم ہوگئے تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی میں

ہیں ماہرین آثار قدیمہ نے ایک نئی کتبہ ڈھونڈ نکالا جس پر ہیرو گلیفی جیسے تصویری حروف کندہ ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ طرز تحریر ہیرو گلیفی کی طرح خود ایک اصل ہے۔ یہ پتھر شہر حماۃ (شام) میں پایا گیا۔
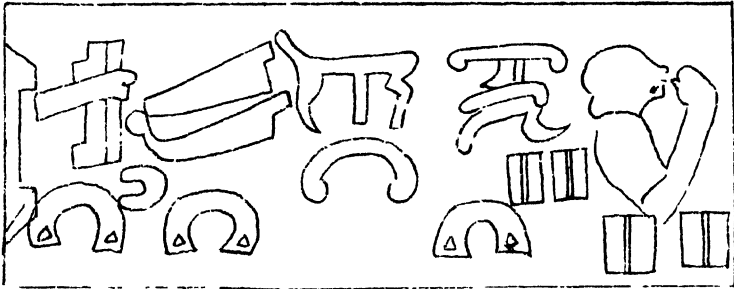
منہ میں ہاتھ دکھا کر بات کرنا مراد لیا گیا ہے۔ اس کے نیچے دو چوکور شکلوں سے (م۔ × ما) سمجھا جائے گا۔ گھوڑے کی نعل جیسی تین شکلیں ہیں جن میں ہر ایک سے (ا۔س × اس) مراد ہے اور فاعلیت کی علامت ہے۔ اسی پر بقیہ دلالتوں کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے جو ابھی تک حل نہیں کی جا سکیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حتی طرز تحریر سے کچھ رسم الخط پیدا ہوئے تھے جو بھلاوے میں پڑ گئے کیونکہ حبشی اور حمیری دو ایسے رسم الخط ہیں جو ہمارے نزدیک حتی سے پیدا ہوئے۔ ان میں اور خط حتی میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ابھی تک ان کی اصل کا بھی پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مشابہ تر خط حتی ہے۔ خط حمیری مندرجہ ذیل ہے۔

(ا) ⊓ ⊓	(ب) ⊓ A A A ⊓	(ت) X ⧖	(ث) 8 8
(ج) ך Γ	(ح) [illegible]	(خ) [illegible]	(د) [illegible]
(ذ) H И N H	(ر) > <) (	(ز) X X X	(س) [illegible]

(ش) (ص) (ض) (ط)
(ظ) (ع) (غ) (ف)
(ق) (ک) (ل) (م)
(ن) (و) (ہ) (ی)

اور یہ خط حبشی ہے:-

اس میں اور حمیری خط میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے بجز اس کے کہ حمیری داہنے سے بائیں کو اور حبشی بائیں سے داہنے کو لکھا جاتا ہے۔ بائیں طرف سے پہلا حرف (الف) کس قدر حمیری الف سے مشابہ ہے۔ دوسرا (جیم) اور تیسرا (زے) ہے جو حمیری کی ذال سے ملتا ہوا ہے۔ چوتھا (الف) پانچواں (بے) چھٹا (ط) اور ساتواں (ر) ہے۔ اسی پر باقی حروف کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

(۳) خط میخی۔ اس طرز تحریر کو آشوری اور بابلی قومیں اس وقت تک استعمال کرتی رہیں جب تک فینیقیوں کے حروف تہجی ان کو نہیں پہنچ گئے۔ اس کو خط میخی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے حروف کی شکلیں کیلوں جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان کا لفظ (کالو) اس طرح لکھا جائے گا۔ جس کے معنی ہیں (جلانا)۔ بابل اور آشور (عراق) کے کھنڈروں میں یہ رسم الخط اینٹوں پر کندہ پایا جاتا ہے۔ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ مٹی کی اینٹوں پر کسی نوک دار چیز سے حروف کھود کر خشک کر لی جاتی تھیں۔ پہلی نظر میں خط میخی کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ اس کو تصویر نویسی سے کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل تصویر نویسی ہی کی ایک شاخ ہے۔ اگر اس کی پرانی شاخیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے حروف تصویروں جیسے ہیں۔

(۴) چینی خط۔ یہ طرز تحریر بہت پرانا ہے۔ اس کی شکلیں پورے پورے الفاظ کو ادا کرتی ہیں جیسے کہ قدیم تحریریں ہوتی تھیں۔ اسی بنا پر اس کی شکلوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ جرجی زیدان اور بعض دیگر علما کا خیال ہے کہ غور کرنے سے اس کی شکلیں تصویروں جیسی

معلوم ہوتی ہیں اگرچہ امتداد زمانہ سے ان میں تغیر واقع ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہو اور چینی تحریر خط میخی اور خط تصویری کی درمیانی کڑی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خط میخی کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

۔ اگر غور کیا جائے تو خط میخی کی مشابہت صاف نظر آتی ہے۔

مندرجہ بالا نمونہ میں داہنی طرف سے شکل نمبر (۲) شکل نمبر (۳) اور شکل نمبر (۴) بالکل صاف مشابہ ہیں۔ اب رہیں پہلی اور پانچویں شکلیں تو ان میں کیلیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے میں سرے جڑے ہوئے ہیں۔ ہیرو گلیفی اور حتی کی شاخیں داہنے سے بائیں یا بائیں سے داہنے کو لکھی جاتی ہیں لیکن چینی کی سطریں اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔ خط میخی میں بھی ہر لفظ کے لئے ایک شکل تھی۔ ایسی شکلوں کی تعداد اس زمانہ کے محدود ضروریات کے مطابق ۶۰۰ تھی۔ ممکن ہے کہ چین نے اس کو قبول کر کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق دیگر شکلوں کا اضافہ کر لیا ہو جن کی موجودہ تعداد میں ۲۱۴ مفرد آوازوں کی اور ۸۶۷۹ الفاظ کی علامتیں ہیں۔

نوٹ:۔ فاضل مضمون نگار نے اس موضوع پر اور بھی بہت کافی مواد جمع کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس مضمون سے استفادہ حاصل کرنا چاہیں تو وہ جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل لکھنؤ سے براہ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

جمہوریت جدید اور اسلام

(محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے)

(اس موضوع پر اگر کوئی اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے تو ہم ان کو رسالہ جامعہ میں ضرور شائع کریں گے۔ مدیر)

تمہید آج دنیا میں ہر جگہ جمہوریت اور آمریت برسر پیکار ہیں۔ اکیسویں صدی تک یہ خیال عام تھا کہ جمہوریت سیاسی ارتقار کی آخری منزل ہے اور حکومتوں کا مستقبل اسی طرز فرماں روائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ آئندہ جو کچھ ترقی ہوگی اس کی بنیاد عمومیت ہی ہو سکتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جو کچھ تغیرات ہوں گے وہ اسی طرز حکومت کے ردوبدل اور توسیع و اصلاح سے متعلق ہوں گے۔ سیاسی ارتقار کی کوئی نئی راہ اور نظم مملکت کی کوئی نئی شکل انیسویں صدی کے ماہران سیاست کے تصور میں بھی نہ آتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ان تعلقات کو غلط ثابت کر دکھایا اور جمہوری طرز حکومت کے نقائص جو ابھی تک منظر عام پر نہ آئے تھے اب بے نقاب ہونے لگے۔ اطالیہ اور جرمنی میں جو انقلاب پیش آئے انھوں نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا کہ شخصی حکومت بشرطیکہ اس کا مقصد ملک کی فتح اور جمہور کی بہبود ہو کارکردگی اور منفعت کے لحاظ سے جمہوری حکومت سے کہیں فائق و برتر ہے۔ ان دو ملکوں میں جمہوری حکومت کی ناکامی کے کیا اسباب تھے ان سے ہمیں بحث نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ناکامی سے سیاسی تصورات میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور آمریت کے اثرات دور دور تک پھیلنا شروع ہو گئے۔ ہمارے ملک میں بھی جہاں ابھی عمومیت کا پودا لگایا ہی جا رہا تھا اس کی مخالف کی ہوائیں چلنے لگیں اور آمریت کسی نہ کسی بھیس میں جلوہ نما ہونے لگی۔ واقعات کی دنیا سے ہٹ کر خیالات و افکار کی دنیا میں بھی ان دونوں تصورات کی آویزش و پیکار جاری ہے اور یقین نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس کے حق میں مستقبل بالآخر فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ اور زیادہ نازک اور پیچیدہ ہے کیونکہ جس وقت سے ہندوستان میں عمومی حکومت اور نیابتی ادارہ جات کا قیام شروع ہوا انھیں روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نظام حکومت میں ان کی ترقی کے امکانات تو ایک طرف ان کے وجود بقا رکے لئے بھی کوئی تحفظ موجود نہیں ہے۔ یہ احساس درجہ بدرجہ قوی تر ہوتا گیا تا آنکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ سے بالآخر عمومیت کے خلاف صدائیں اٹھنے لگیں لیکن اس جذبۂ مخالفت میں لوگوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ اصل قصور نفس عمومیت کا نہیں ہے بلکہ خرابی کی اصل جڑ عمومیت اور جمہوری ادارہ جات کی وہ خاص شکل ہے جسے ہمارے سر تھوپا جا رہا ہے اور جس کا قبول کر لینا اپنے امتیازی وجود کو مٹانے کے مترادف ہوگا۔
اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس امر کی جانچ کی جائے کہ حکومت وسیاست کا اسلامی تصور کہاں تک جمہوریت جدیدہ سے مطابقت رکھتا ہے اور کس حد تک اس میں آمریت کے عناصر داخل ہیں۔

جمہوریت کا مفہوم

لیکن سب سے پہلے ہمیں جمہوریت یا عمومیت کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے کیونکہ اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جمہوریت کی ایک عام تعریف یہ ہے کہ یہ وہ حکومت ہے جو جمہور کی ہو، جمہور ہی کے لئے ہو اور جس کے چلانے والے خود جمہور ہوں (Government of the people, for the people and by the people) لیکن غور کیجئے تو یہ ایک نصب العین ہے جس کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حکومت جمہور کی ہو اور جمہور کے لئے ہو لیکن یہ تصور بجا غیر ممکن ہے کہ کسی ریاست کی ساری آبادی حکومت کو چلائے اور اس میں براہ راست شرکت کر سکے۔ ہاں اگر یونان قدیم کی طرح ہر شہر ایک خود مختار ریاست بنا دیا جائے تو یہ خیال شاید عملی شکل اختیار کر سکے۔ لیکن یونان قدیم کی مثال دیتے وقت اس واقعہ کو فراموش نہ کر دینا چاہیے کہ شہر ایتھنز (Athens) میں اس قسم کی حکومت میں عوام کی براہ راست شرکت صرف اس لئے ممکن ہو گئی کہ وہاں غلاموں کا ایک کثیر التعداد طبقہ موجود تھا جو ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم تھا اور جس کی زندگی کا صرف یہی مقصد تھا کہ وہ یونانیوں کے لئے ضروریات زندگی فراہم کرے تاکہ انھیں سیاسیات کی ہنگا

آرائیوں میں شرکت کے لئے فرصت مل سکے۔

چونکہ جمہوریت کا مذکورہ بالا تصور عملی دنیا کے لئے یکسر بے سود ہے اس لئے حصول مقصد کا بہترین طریقہ یہ قرار پایا کہ نیابتی ادارہ جات قائم کئے جائیں اور حکومت کا دروبست جمہور کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔ عرف عام میں جمہوریت سے اس کی یہی خاص شکل مراد لی جاتی ہے جس کا نام نیابتی حکومت (Representative Government) خود نیابتی حکومت کی ایک سے زیادہ شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں جو تصور مشترک ہے وہ یہ حکومت کو جمہور کی مرضی کا تابع ہونا چاہیئے دوسرے الفاظ میں حکومت رائے عامہ (public opinion) کی پابند ہو۔ یہی خیال درحقیقت جمہوریت کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہے کہ ریاست کے قوانین اور مملکت کا انتظام جمہور کی اکثریت کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہیں سے حاکمیت (Sovereignty) کا مابہ النزاع مسئلہ پیدا ہوتا ہے یعنی حکومت کے اقتدار کا اصل سرچشمہ کہاں ہے۔ آیا حاکم یا فرمانروا اپنی ذات میں اس اقتدار کا حامل ہے یا اس کی حیثیت صرف ایک نائب کی ہے اور اقتدار کا اصل سرچشمہ جمہور کی ذات ہے۔ جمہوریت آخر الذکر نقطۂ نظر کی حامی ہے اس کے نزدیک حاکمیت جمہور کی ہے اور قانون اس وقت تک قانون نہیں کہلایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس کے برخلاف آمریت جمہور کی یہ حق نہیں دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اقتدار کا منبع خود آمر کی ذات ہے اور قانون اس کی مرضی کا نام ہے۔

اسلامی نظریہ | اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دونوں نظریات کہاں تک قرین صواب ہیں۔ اس کے لئے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی ہے کہ قرآن ان دونوں میں سے کسی نظریہ کو بھی قبول نہیں کرتا ہے۔ قرآن نہ کسی ایک انسان کو اور نہ انسانوں کے کسی گروہ یا جماعت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لئے جو قانون چاہے بنالے اسلامی نقطۂ نظر سے حاکمیت (Sovereignty) نہ آمر کو حاصل ہے اور نہ جمہور کو۔ حاکمیت ساری کی ساری خدا کے لئے ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکومت تو بس اللہ کی ہے)، یہی توحید کی بنیاد

ہے کہ ہر معاملہ میں اصل مرضی خدا کی ہے۔ کوئی قانون جسے کسی ایک انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بنایا ہو اور جو انسان کی مرضی پر مبنی ہو، اسلامی حکومت کا قانون نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ یا تو قرآن و حدیث کی تائید اپنے پیچھے نہ رکھتا ہو یا بصورت دیگر وہ ان کی اسپرٹ اور منشاء کے خلاف نہ ہو۔ یہاں نہ آمریت کا گذر ہے اور نہ جمہوریت کا دخل۔ حاکم اور جمہور دونوں خدا کی مرضی کے تابع اور منشائے ایزدی کے محکوم ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑا قانون یہی ہے کہ وہ اپنے مصالح اور اپنی آراء کو اس کے فیصلوں میں دخیل نہ کریں۔ اسلامی حکومت میں قوانین کا بنانا یا منسوخ کرنا حاکم یا فرمانروا کا کام نہیں ہے اور نہ اس میں جمہور کا کوئی دخل ہے۔ اس حکومت کے تمام قوانین کا ماخذ و منبع مرضی خداوندی ہے جس نے خود کو تمام و کمال کتاب اللہ میں ظاہر فرما دیا ہے۔ البتہ ذیلی قوانین کی ترتیب و تدوین جو قرآن و حدیث کے احکام سے معارض نہ ہوں یا جن امور کی بابت قرآن و حدیث ساکت ہیں ان کی نسبت قوانین کا بنانا یہ اختیارات بے شک امیر کو حاصل ہیں جن کو وہ اپنی مجلس شوریٰ کی مدد اور مشورہ سے عمل میں لا سکتا ہے۔ یہاں صرف عمومیت کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس امر کے فیصلہ کا حق کہ آیا زیر بحث قانون قرآن و حدیث کی اسپرٹ اور ان کے منشا کے مطابق ہے یا نہیں جمہور کو دیا گیا ہے لیکن یہاں بھی جمہوریت جدیدہ اور اسلامی نظام حکومت میں یہ فرق ہے کہ یہ حق عامۃ الناس کے ہر فرد کو حاصل نہیں ہے بلکہ صرف انھیں افراد (خواہ وہ اصطلاحی معنوں میں علماء کے زمرہ میں داخل نہ ہوں) جو علم دین رکھتے ہوں اور اپنے فیصلہ پر قرآن و حدیث سے استدلال لا سکتے ہوں۔ جب اس قسم کا کوئی اختلاف ہوگا تو آخری فیصلہ اجماع امت کے مطابق کیا جائے گا ایک دوسرے نقطہ نظر سے اسلامی حکومت آمریت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اگرچہ اسلامی حکومت کا آج تک کوئی دستور مرتب نہیں ہوا ہے لیکن ایک ایسے دستور کے خد و خال اس قدر واضح ہیں کہ اس میں شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے عملاً اسلامی حکومت کا قیام صرف خلافت راشدہ تک رہا اس لئے اگر ہم ایک اسلامی حکومت کا دستور مرتب کرنا چاہیں جو حقیقی معنوں میں اسلامی حکومت کہلائی جا سکے تو وہ خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہونا چاہیئے۔ اس خلافت کا ایک پہلو ضرور آمریت

سے قریب تر تھا وہ یہ کہ خلیفہ یا امیر اپنے فیصلوں میں مجلس شوریٰ یا جمہور کی رائے کا لازمی طور سے پابند نہ تھا اگرچہ اکثر و بیشتر ان کی رائے کے مطابق ہی کام کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بحیثیت صدر عالم رئیس (Head of the Executive) خلیفہ نے مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کے خلاف عمل کیا ہے لیکن خود خلیفہ کا انتخاب نیم جمہوری طرز پر ہوتا تھا یعنی خلیفہ اپنے جانشینوں کی ایک فہرست چھوڑ جاتا تھا یا جدید اصطلاح میں وہ چند اشخاص کو خلافت کے لئے نامزد کر دیتا تھا جو اس کے تجربہ میں منصب خلافت کے اہل ہوتے تھے۔ ان نامزد شدہ اشخاص میں جس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل ہو جاتی تھی وہ خلیفہ منتخب ہو جاتا تھا۔ اسلامی حکومت کا ایک جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ خلیفہ کو معزول کر دینے کا حق جمہور کو حاصل ہے اگر جمہور کو یہ محسوس ہو کہ خلیفہ یا امیر عدل و انصاف سے حکومت نہیں کر رہا ہے یا وہ حکومت خدا اور رسول کے احکام اور قرآن کی رہنمائی کے مطابق نہیں کرتا ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔

اس تمام تحریر سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مسلمانوں کو خالص اسلامی نقطہ نظر سے نہ جمہوریت کا شیدا ہونا چاہیئے اور نہ آمریت کا دلدادہ۔ اسلامی نظام حکومت ایک نرالا نظام حکومت ہے جس میں جمہوریت اور آمریت دونوں کے عناصر کا ایک عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے اور نظری حیثیت سے وہ ان دونوں پر فوقیت رکھتا ہے عملی حیثیت سے بھی جب تک یہ طرز حکومت قائم رہا اس سے زیادہ کامیاب اور مبنی بر انصاف طرز حکومت کا تصور ذرا مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس قسم کی حکومت زیادہ عرصہ تک کیوں نہ قائم رہ سکی اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اس میں اس قدر جلد زوال آ گیا نیز یہ کہ اگر موجودہ زمانہ میں اس قسم کی حکومت قائم کی جائے تو اس کے دستور کی کیا شکل ہو گی اس کے لئے زیادہ گہری نظر اور زیادہ غائر مطالعہ درکار ہے اور محل کی تنگنائی بھی اطناب کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ بمبئی

بمبئی، کراچی اور کلکتہ سے جدہ کو تازہ ترین ساخت کے آرام دہ جہازوں کی خاص حج سروس

ضروری اعلان یورپ کے بین الاقوامی خطرناک صورت حالات کے پیش نظر حکومت ہند نے ایک کمیونکے شائع کر کے اعلان کیا ہے کہ دوسری اطلاع کے جاری ہونے تک ہندوستان اور جدہ کے درمیان جہاز رانی روک دی گئی ہے"۔ اس لئے مغل لائن افسوس کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ حاجیوں کے تمام جہازوں کی آمدو رفت بند ہے۔ اور اخباروں میں جو اعلانات جہازوں کی روانگی کے بارے میں کئے گئے تھے وہ منسوخ سمجھے جائیں۔

مسافر اور مال کے تمام جہاز حسب دستور اور حسب ضرورت آتے جاتے رہیں گے۔ لیکن ان میں بھی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ردو بدل ہو سکتا ہے۔

بمبئی اور کراچی سے شہر، مکلا، عدن، بربرا، جبوتی، مساوا، پورٹ سوڈان اور جدہ

بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی ماریشس۔

ہمارے تمام جہازوں میں کیبن اور ڈیک کلاس کے مسافروں کے لئے کافی جگہ کا معقول انتظام ہے۔ مزید معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجئے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

تار کا پتہ: مغل بمبئی

مینجنگ ایجنٹس ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ ۔ بمبئی

کس طرح ایک بے پرواہ کبوتر کو شکست دی بہت دلچسپ۔ قیمت ۵ر

تاریخ یہود۔ ضخیم وبسیط تاریخ ارض مقدس کا حصہ اول۔ اس میں بنی اسرائیل کی تاریخ آغاز سے انجام تک پوری آگئی ہے اور بجائے خود ایک مستقل تاریخ۔ بڑی تقطیع ۵۲ صفحے قیمت عہ

تذکرہ کاملان رام پور۔ حافظ احمد علی خاں شوق کی تصنیف ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں رام پور کے پانچ سو اسّی کاملین کا تذکرہ کیا ہے حجم ۵۶۰ صفحات۔ قیمت صرف سے

تمدن اسلام۔ مصنفہ عبدالباسط ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ اس میں نظریۂ تمدن سے مکمل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن دنیا کے تمدنوں میں بہترین اور عقل وضرورت انسانی کے بالکل مطابق ہے قیمت عہ

تفسیر سورۂ اخلاص۔ اس سورۃ کی تفسیر ہر دور میں لکھی گئی لیکن اہل نظر نے اعتراض کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی اس تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ قیمت ۵ر

تفسیر سورۂ کوثر۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حیثیت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے حجم ۱۲۳ صفحے قیمت ۸ر

تفسیر سورۂ لہب۔ اس میں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورۂ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ حجم ۴۷ صفحات قیمت ۶ر

ثالث بالخیر۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ۸۱ صفحات قیمت ۸ر

جناب سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک ترکی فسانہ نگار احمد حکمت کے ناول کا ترجمہ کیا ہے یہ ترکی افسانوں کی لطافت ونزاکت ادب لطیفہ اور جذبات لطیفہ کا کامل ترین نمونہ ہے۔

پرانا خواب۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ حجم ۱۰۰ صفحات۔ قیمت ۱۰ر

مشاہیر کے حالات جہاں پچھلی نسلوں کیلئے تذکرہ ہیں وہاں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے تبصرہ بھی ہیں۔ اس سے مکارم اخلاق کے حصول کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے قیمت مجلد عہ/

پردۂ مجاز۔ مشہور افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند کا دلچسپ ناول۔ مصنف نے اپنے خاص انداز میں یہ بتایا ہے کہ مختلف طبائع کے زیر اثر محبت کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ قیمت ہر دو حصص عہ/

تذکرہ علماء۔ از شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد۔ (دہلوی) اس میں بڑے بڑے نامور چالیس علماء ہندوستان کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے بعض شریعتی علماء ہیں، بعض طریقت و شریعت کے جامع ہوتے ہیں اور بعض طبقہ آخر میں شریک کرنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۵/

تمنائے دید۔ از سجاد مرزا بیگ دہلوی۔ مصنف نے دلی اور دلی میں دل لگی کی صحبتوں اور سامان تفریح کی یاد میں یہ کتاب لکھی ہے۔ پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے وہ خود بھی اسی محفل کا ایک رکن ہے۔ قیمت ۱۰/

پرتھال یا حور دکن۔ مصنفہ ادریس احمد ادیب۔ یہ ایک کافی ضخیم ڈرامہ ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک زرگر کی لڑکی کیسے اپنی سیرت اور صورت کی بدولت پہلے حسن خاں کی شاہی مہمان اور پھر شریک حیات بن جاتی ہے۔ ایک ہندوستانی عورت کی سیرت اور اس کے مقصد حیات کو بہترین طریقے سے پیش کیا گیا ہے قیمت ۱۲/

تم کامیاب ہو سکتے ہو۔ پروفیسر رام سروپ کوشل۔ اس کے پڑھنے سے نوجوانوں میں عملی زندگی کی وہ روح حلول کر جاتی ہے جس کے بغیر دنیا میں کسی قسم کی ترقی یا عملی کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ قیمت عہ/

تجربی طبیعات۔ یہ کتاب مدارس فوقانیہ کی آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے۔ طبیعات کی تازہ ترین معلومات اس انداز سے پیش کی گئی ہیں کہ مبتدی ان کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں مشکل اور غیر دلکش مضامین کو خاص طور سے دلچسپ بتایا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ/

تمدن عتیق۔ از ابوظفر اور عطاء الرحمٰن صاحبان۔ اس کتاب میں مولفین نے تواریخ اور سنن کی اعانت کے بغیر ارتقاء تمدن کی مدارج کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قیمت مجلد با تصویر عہ/

پر پروانہ۔ از آغا شاعر قزلباش۔ ہمت اور حریت کا افسانہ۔ ایک باہمت لڑھکنے

ہمایوں

۱۔ ہمایوں اتنا پابند وقت ہے۔ کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لے کر جب سے یہ جاری ہوا ہے، آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی۔ اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲۔ ہمایوں۔ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل منزہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدنظر نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ ہمایوں۔ کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس میں فحش اشتہارات عریاں تصویر اور مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ہمایوں" کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں" کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔

۵۔ ہمایوں" کے مضامین صرف پر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں اس لحاظ سے ہمایوں اپنی نظیر آپ ہے۔

۶۔ ہمایوں" صحت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ہمایوں" میں علمی ادبی تاریخی و تمدنی مضامین دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں مزاحیہ مقالے مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸۔ ہمایوں" ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں انتہا مقبول ہے

۹۔ ہمایوں" کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا ہے۔

۱۰۔ ہمایوں" کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ صہ اور ششماہی تے (مع محصول ڈاک)

المشتھر

منیجر رسالہ ہمایوں" لاہور

صوبہ بہار کا کثیر الاشاعت، بلند پایہ اور مصور ماہنامہ

رسالہ سُہیل (مصور) گیا

جس کے

سبق آموز مصور افسانے۔ وجد آور نظمیں۔ معیاری تنقیدیں، ظریفانہ مضامین اور تحقیق و تلاش سے لکھے ہوئے علمی مقالات۔ آپ کی علمی استعداد۔ ادبی صلاحیت اور ذوقِ سلیم کی لطافت میں گرانمایہ اضافہ کا باعث ہوں گے۔

اس لئے اپنی اولیں فرصت میں ایک کارڈ لکھ کر اس کی خریداری قبول فرمالیجئے۔ نمونہ کا پرچہ ۴/ آنہ کا ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جائے گا۔ چندہ سالانہ تے، ششماہی عمہ، فی پرچہ ۴/

"منیجر رسالہ سُہیل شمسی پریس گیا"

القریش

بہ فضل اللہ تعالیٰ ۱۹۱۵ء سے قومی خدمات انجام دے رہا ہے

قومی مرکز کا قیام، مختلف اضلاع پنجاب میں تنظیمی سب کمیٹیوں کی تشکیل، تنظیم و شیرازہ بندی کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مختلف مقامات پر شاندار قومی جلسوں کا انعقاد، قومیت سے متعلق اہم عدالتی فیصلے، قومی مفاد کے لئے اہم ترین امور کا تصفیہ، پنجاب کے باقی ماندہ چھ اضلاع کے قریشیوں کے حقوق زراعت کا حصول، تحفظ نسب کے سلسلہ میں مدعیوں اور قصابوں کے دعویٰ قریشیت کی پرزور موثر تردید۔ یہ تمام احسن ترین خدمات القریش کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہیں۔

جدید پروگرام میں ریاست حاضرہ کے فریب خوردہ مسلمانوں کو سیاست اسلامی سے آشنا کرنے کے لئے ہی ایک باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ قارئین و معاونین کے غائبانہ تعارف و تعلقات کے لئے ان کی سوانح حیات اور عکسی شبیہات کی اشاعت کا خاص التزام کیا گیا ہے۔ ان مفید ترین قومی خدمات کے پیش نظر بہی خواہان قوم کا اولیں فرض ہے کہ فراخدلی کے ساتھ دست اعانت بڑھائیں۔ اپنے وقعہ اثر و احباب میں توسیع اشاعت کے لئے سعی بلیغ کریں، تاکہ القریش بیش از بیش خدمات کی انجام دہی منازل ترقی قریب تر لانے کے قابل ہے۔ قیمت سالانہ امراد رؤسا سے پانچ روپے، عوام سے تین روپے۔ کلیاسے دو روپے آٹھ آنے عہ/۔ فی پرچہ چار آنہ (۴/)

منیجر جریدہ "القریش" شریف گنج امرتسر

"ہل"

دیہات سدھار کا خاص رسالہ

یہ باتصویر ماہوار رسالہ ہندوستان کے دیہاتی باشندوں اور خصوصاً کسانوں کے لئے نکالا گیا ہے اور اسے صوبہ جات متحدہ کے محکمہ گاؤں سدھار کی پوری امداد حاصل ہے۔

اس کے مضامین کا انتخاب اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے کہ وہ گاؤں والوں کے لئے دلچسپ اور مفید ثابت ہوں۔ اس کی زبان اتنی سادہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اسے بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

یہ رسالہ اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوتا ہے۔ اور دونوں کی زبانیں قریب قریب ایک سی ہوتی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر ہیں

ٹھاکر شری ناتھ سنگھ

اور بورڈ آف ایڈیٹرس میں مندرجہ ذیل معزز حضرات شامل ہیں

شری وینکٹیش نرائن تیواری — شری شکدیو بہاری مشر

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب — شری مہاویر تیاگی

شری سمترانندن پنت — شریمتی تارا پانڈے

شری منوہر داس چترویدی

ضخامت ۹۶ صفحات ہوتی ہے ایک سہ رنگی تصویر کے علاوہ بیشمار سادی تصویریں ہوتی ہیں۔ دیہات کے رہنے والے جو بھائی ذرا بھی پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں انھیں یہ رسالہ فوراً منگانا چاہیئے۔ آرڈر بھیجتے وقت اردو ہندی کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ قیمت سالانہ للعہ ایک پرچہ کی قیمت ۶ آج ہی نمونہ مفت طلب فرمایئے

پتہ:- منیجر "ہل" انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

مطبوعات امیریہ دار التصنیف والتالیف لکھنؤ

دیوان ثاقب۔ یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ نمبر اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانسو پچاس صفحات قیمت مجلد عا؎ غیر مجلد عا؎ (علاوہ محصول ڈاک)

انیس الاخلاق۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں اور تتمہ مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم۔ اے رکن امیریہ دار التصنیف والتالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت ۵؎ علاوہ محصول ڈاک۔

گیس کا دفاع۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرلیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کرسکیں قیمت ۴؎ علاوہ محصول ڈاک۔

مفتاح البیان۔ حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابو البیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جرولی مولف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روزہ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت ہر حصہ عمر (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ۔ **دفتر امیریہ دار التصنیف والتالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ**

ایک لاکھ علم دوستوں کے ہاتھ جانے والے رسالہ

"رتن" کی چند خصوصیات

(۱) رتن ریاست جموں و کشمیر کا واحد علمی، ادبی اور اصلاحی ماہنامہ ہے۔

(۲) رتن اپنے خریداروں کو اپنی قیمت کی نسبت کئی گنا زیادہ قیمت کا رسالہ مہیا کرتا ہے۔

(۳) رتن میں ہر ماہ معلوماتی مضامین نئے نئے چٹکلے اور انعامی معمے شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) رتن میں اچھے اچھے مضمون لکھنے والے بچوں کی تصویریں دی جاتی ہیں۔

(۵) رتن میں بلاک کی دلچسپ تصاویر ہر ماہ شائع کی جاتی ہیں۔

(۶) رتن کے خاص نمبر دنیائے صحافت میں نمایاں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

(۷) رتن کے مضمون نگاروں میں ہندوستان کے اکثر مایۂ ناز ادیب ہیں۔

(۸) رتن ہر ماہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

ان خوبیوں کے باوجود رتن کی قیمت صرف دو روپے سالانہ ہے

پھر

آپ کیوں نہ خود بھی اس کے خریدار بنیں اور اپنے دوستوں کو بھی بنائیں۔

(نمونہ مفت طلب فرمائیں)

مینیجر رسالہ "رتن"

دربار گڑھ روڈ جموں توی (کشمیر)

ایجنسی کی کتابیں

تاریخ سلطنت خدا داد - از محمود خاں محمود (بنگلوری) ہندوستان کی تقریباً تمام تاریخیں ایک ہی رنگ میں اور ایک خاص مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہیں یعنی ہندوستان کے قدیم طرز حکمرانی پر نکتہ چینی کرنا، دیسی حکمرانوں کی برائیاں کھول کھول کر دکھانا اور واقعات پر کچھ اس طرح پردہ ڈالنا کہ اصل و نقل میں تمیز نہ ہو سکے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی ایک صحیح اور اصل تاریخ ہونی چاہئے جس میں اگر دیسی حکمرانوں میں برائیاں ہوں تو اسے واضح طور سے بیان کرنا چاہئے تاکہ دوسروں کی آنکھیں کھلیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے اور انھوں نے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے کن وسائل سے کام لیا۔

یہ سلطنت خدا داد اسی طرز کی ایک تاریخ ہے جسے تاریخ ہندوستان کی ایک کڑی کہنا چاہئے اس میں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مکمل حالات ہیں۔ اور اس وقت کی سیاست نہایت واضح طریقے سے دکھلائی گئی ہے۔ نیز حیدرآباد آرکاٹ اور میسور وغیرہ کے واقعات بھی جن کا تعلق سلطنت خدا داد سے ہے۔ دئے گئے ہیں حجم ۵۶۰ صفحات درمیانی سائز قیمت للعہ

پیام روح - حامد اللہ افسر بی۔ اے کے کلام کا مجموعہ ہے دیوان میں تین اجزا قرار دئے گئے ہیں، نغمات الصغر، روح جذبات اور پرتو افکار۔ نغمات الصغر بچپن کی غیر تصحیح شدہ نظمیں ہیں روح جذبات ۱۹۱۹ء کے بعد کا کلام ہے اور پرتو افکار میں وقتی اور ہنگامی نظمیں ہیں۔

تخیل کی جدت، اچھوتے مضامین کو نہایت سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کرنا، سیدھے سادے الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ وہ موسیقیت سے لبریز ہو جائیں یہ افسر کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ قیمت سے

تاریخ فلسفہ سیاسیات - از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) اردو میں شاید اپنے موضوع کے لحاظ سے سب سے پہلی کتاب ہے پروفیسر موصوف نے اس میں سیاسیات کو تین حصوں، تاریخی، نظری اور عملی میں تقسیم کرتے ہوئے صرف پہلی یعنی تاریخی حصے سے بحث کی ہے۔ صفحات ۴۵۰۔ قیمت للعہ

ترقی زراعت - از خاں صاحب مولوی عبدالقیوم - اس میں زمین کی شناخت، موسم، آب پاشی، بھتائی غلے اور ترکاریاں - فارم مویشی، علاج الامراض مویشی، متفرقات اوزان، رفیق اشیاء کے اوزان، تاپ، فصلوں میں بیماریاں اور کیڑے وغیرہ پر مفصل مضامین ہیں۔ مختلف نقشوں نے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات قیمت للعہ

تاریخ مغربی یورپ - مترجمہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل ڈاکٹر روبنسن کی کتاب کا بامحاورہ ترجمہ۔ یورپ کے طرز تمدن، معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یورپ کے ممالک نے اپنی زبان، فن تعمیر اور دیگر علوم و فنون کو ترقی دی اور کس طرح بادشاہ جمہوری یا پارلیامنٹی حکومت کرنے پر مجبور ہوئے قیمت عار

ترکی جمہوریہ - شمیر احمد ہاشمی - ایم - اے - پی - سی - ایس - اس میں ترکوں کی زندگی، ان کی اولیں فتوحات، ترکوں کا نظام حکومت، فوجی افسروں کا یورپ کی زندگی اور خیالات سے متاثر ہونا اور ان کی بیداری، کمیٹی اتحاد ترقی کا آغاز، بغاوت کا آغاز، ترکی کی دس سالہ جنگ آزمائی اور اندرونی بدنظمی، جنگ عظیم اور ترکی کی قسمت کا فیصلہ - انقلاب کے اولین آثار، جنگ ترکی و یونان - اجتماع لوزان اور صلحنامہ - خاتمہ خلافت ترکی جمہوریت، تحریک قومیت، معاشرتی زندگی اور ترکی کے نظام تعلیم وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ حجم ۲۳۴ صفحات قیمت مجلد عما

تنقیدات عبدالحق - جامع محمد تراب علی خاں بآزار اردو کے محسن مولوی عبدالحق صاحب کی ہستی علمی دنیا میں تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ جہاں ایک اچھے مقدمہ نگار ہیں وہ آپ کی مبصر تنقیدیں بھی اعلیٰ معیار رکھتی ہیں۔ اس میں کل ۴۲ تنقیدیں ہیں جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء اردو میں شائع ہو چکی ہیں، یہ تنقیدیں اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ قیمت عہ

تاریخ المشاہیر - از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری - انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین ذریعہ خود اسی کے افراد جنس کے حالات ہوتے ہیں اور انسان کے سامنے انسانی زندگی ہی بہترین نمونہ انسانیت بن سکتی ہے اس لئے اسلاف کے حالات اور تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔

جناب سجاد حیدر یلدرم نے ایک دلکش و دلآویز ترکی ڈرامہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں موصوف نے وہی زور بیان قائم رکھا ہے جو اصل میں ہے۔

پنچھی۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۴۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی آرٹ پیپر۔ قیمت ۱۲/
کدار شرما نے انسانی زندگی کو پنچھی سے نسبت دے کر تینوں زمانوں، بچپن، جوانی، اور بڑھاپے کی لازمی حالات کو گیتوں میں پیش کیا ہے۔

تذکرہ محسن۔ محمد امین صاحب زبیری نے نواب محسن الملک کے حالات زندگی مرتب کئے ہیں ضمنی طور پر علی گڑھ کی تاریخ اور ہندوستان کی سیاست پر بھی بحثیں ہیں۔ قیمت عہ/

تہذیب نسواں:۔ از علیا حضرت شاہجہاں بیگم۔ عورتیں اپنی لاعلمی اور کم فہمی کی وجہ سے کن کن مصائب میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور ان سے کیسے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں حمل سے مرنے تک کے حالات درج ہیں۔ قیمت ۱۲/

ترجمہ شرح اسباب مصور۔ اس ترجمے میں ہر ایک مرض کی تشریح کے ساتھ اس کے معمولات مطب نہایت محنت و تلاش کے بعد تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حکیم شریف خاںؒ کے ہزاروں خاندانی صدری مجربات اور امراض کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان کے تمام طبی کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ قیمت جلد اول عہ/، دوم للعہ/، سوم عہ/، چہارم عہ/، مکمل لعہ/

ترجمہ حمیات قانون۔ اس میں معمولات مطب کے ساتھ ساتھ بخاروں کی تمام اقسام کو بہت مفصل بیان کیا گیا ہے اور ہر ایک بخار کے نسخہ جات تحریر کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱۲/

ترجمہ موجز القانون۔ علامہ علاؤالدین قریشی کے خلاصہ قانون یعنی موجز القانون کے پہلے فن کا نہایت مکمل اور بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ قیمت عمر/

تربیت حسینی۔ اس کتاب میں شباب کی سرمستیوں اور نوجوانوں کی شہوانی کو نہایت مفصل و احتیاط سے تحریر کیا گیا ہے۔ ہر طبیب و غیر طبیب اور خاص کر عمرانیات کی طالب یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ قیمت عمر/

مکتبہ جامعہ
قرول باغ نئی دہلی

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے آنرز فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں ان کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست چند اوراق ربند ۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۲۔ مسائل ملی: سنت نبویہ اور بدعت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت ۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند ۹۔ مسلمان اور آزادی
۴۔ مسلمان اور کانگریس ۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست ۱۱۔ آخری تقریر
۶۔ مسلم یونیورسٹی ۱۲۔ بھائی، ابھی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت ۸؎

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ بمبئی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ
قرول باغ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ
جامع مسجد۔ دہلی

مکتبہ جامعہ
لوہاری دروازہ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ
امین آباد۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ
پرنس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے

سیاست کی پہلی کتاب   قیمت   ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتداء . . . 〃 . . ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض . . . 〃 . . ۴ر

مسئلہ آبادی . . . . 〃 . . ۴ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں | پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین | پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:۔ پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلہ خیالات کرسکیں گے۔

فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب باعالی فرنگی محل)

تمہید| انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے وہ جماعت سے الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جماعت میں رہنے والا تبادلہ خیالات اور اظہار مطلب کے لئے مجبور ہے تاکہ ابتدائی زندگی کی ضروریات میں ایک انسان کو دوسرے سے مدد مل سکے۔ اس مقصد کے لئے اول اول صرف اشارے اور کنائے مقرر ہوئے جن سے ادائے مطلب کا کام ناقص طور پر انجام پاتا تھا۔

کیونکہ دور بربریت کے ابتدائی عہد میں ضروریات زندگی محض سادہ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق ہوتی تھیں آبادیاں نہایت قلیل تھیں پیٹ بھرنے کے لئے پھل پھلاری یا شکار کا گوشت تن ڈھانکنے کے لئے چوڑی پتیاں یا جانوروں کی کھالیں موسمی شدائد سے بچنے کے لئے پہاڑی غار یا درختوں کے کھوکھلے تنے کافی تھے اس لئے عرصہ دراز تک چند مہمل آوازوں کے ساتھ ساتھ جسم کی حرکت دست و ابرو کے اشارے ان کا مافی الضمیر ادا کرتے رہے۔

لیکن رفتہ رفتہ آبادیاں بڑھنے لگیں انسانی ضروریات میں اضافہ ہوا معاملات گنجلک اور معاشرت پیچیدہ ہوتی گئی اب خارجی دنیا اور خود انسانی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر بڑھ گیا کہ اشارات و علامات ادائے مطالب کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہونے لگے علاوہ بریں اشیاء مادی کے ذریعہ اظہار خیال میں غلط فہمیاں بھی ہونے لگیں۔ جن کی وجہ سے معاملات میں خلل واقع ہوتا تھا۔ لہذا اظہار خیالات کے لئے دوسرے ذرائع کی دریافت کی جانب انسان کا ذہن رجوع ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح جذبات و احساسات کا اظہار آوازوں سے خواہ وہ کتنی ہی بھونڈی کرخت اور ثقیل کیوں نہ ہوں کیا جاتا ہے اسی طرح تمام ضروریات خواہشات اور خیالات بھی ترتیب وار آوازوں کے ذریعے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ

ساتھ آوازوں نے بھی ترقی کر لی تھی اس لئے متکلم ہونے میں بلا دقت آوازیں کام آگئیں۔

شروع شروع جب آوازوں کے ذریعے سے انسان نے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو اس کے سامنے زندہ یا مردہ آوازوں کی ایک وسیع دنیا موجود تھی جیسے بادل کی گرج ہوا کی سنسناہٹ ٹہنیوں کا چرانا یا مثلاً گھوڑے کی ہنہناہٹ مینڈک کا ٹرانا کتے کا بھونکنا وغیرہ۔ ابتدا میں اس نے اشیاء کے نام ان آوازوں کی نقل کر کے رکھے جو اشیائے مذکورہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً (کٹ) ایسی آواز ہے جو کسی چیز کے کٹنے سے پیدا ہو یہ آواز اسی معنی میں باختلاف مخارج دنیا کی اکثر زبانوں میں پائی جاتی ہے جیسے انگریزی میں cut عربی میں (قط قطع وغیرہ) یہ طریقہ آسان اور قدرتی تھا۔ پہلے تو صرف مسموعات ہی کی نقل ہوتی تھی لیکن بعد میں مرئیات اور ملموسات وغیرہ سے بھی اسماء اصوات حسی بننے لگے جیسے اردو میں سبزہ لہلہانا چہرہ تمتمانا۔ چراغ ٹمٹمانا۔ جواہرات جگمگانا۔ آنسو ڈبڈبانا اصوات مرئی کی مثالیں اور گدگدی۔ بدن سنسنانا۔ بلبلانا۔ پیر جھنجلانا۔ اصوات لمسی کی مثالیں اور چٹپٹا صوت ذوقی کی مثال ہے۔ عربی میں (تضعضع تذبذب۔ مربرب۔ مقبقب۔ وغیرہ)

جب تمدن نے کسی قدر ترقی کی اور انسان کو ایک چیز کی مختلف حیثیتوں کا علم ہوا تو اس نے معلومہ لفظ میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کر کے نئے الفاظ بنا لئے جن میں پہلا مفہوم قائم رہا جس کی مثالیں اردو میں (کٹ۔ کوٹ۔ کھد) اور عربی میں (قط۔ قطع۔ قتل) ہیں۔ جب انسانی ضروریات زیادہ بڑھ گئیں اور مفرد الفاظ سے کام نہ چل سکا تو ان پر علامات کا اضافہ کیا گیا جیسے کٹنا۔ کاٹنا کٹوائی۔ پھر مشتقات پیدا ہوئے جیسے کاٹا۔ کاٹتا ہے۔ کاٹے گا۔ کاٹنے والا۔ کٹا ہوا۔

یہ تغیرات ایک ہی دن میں نہیں تمام ہو گئے۔ بلکہ روز افزوں انسانی ضروریات کے ساتھ جاری رہے موجودہ زبانیں قرنہا قرن کے حوادث طبعی کا نتیجہ ہیں۔ جب تک دنیا میں نسل انسانی کا وجود ہے اس وقت تک زبانوں میں تغیرات ارتقائی جاری رہیں گے۔

زبان یا لغت | لغت ایسی بامعنی آوازوں کا نام ہے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر ادا کر سکے۔ قوموں کے اختلاف اور ان کی گوناگون آوازوں کی بدولت بے شمار زبانیں یا لغتیں عالم وجود میں آگئیں

جو ایک دوسرے سے اسلوب بیان معانی اور الفاظ کی ساخت میں الگ الگ ہیں۔ کیونکہ جس طرح کی آوازیں ایک قوم آسانی سے نکال لیتی ہے بسا اوقات اسی طرح کی آوازیں نکالنا دوسری قوم کے لئے دوبھر بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اس چیز کا ہم آپ روزانہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یوروپین اپنی پوری کوشش صرف کرنے پر بھی بدقت تمام شاید ہی (ح، خ، ع، غ، ض) کا تلفظ صحیح طور پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح عربوں میں اکثر و بیشتر وہ لوگ ملیں گے جو (T, D, P, WH) کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتے۔ وسط افریقہ میں بسنے والے قبائل کی لغت سے حروف شفویہ (جو حروف ہونٹوں کی مدد سے ادا کئے جاتے ہیں جیسے م، پ، و، ہ، ف) یکسر مفقود ہیں۔ کولمبیا کے سرخ ہندوستانی (ب، ف، ج، د، و) بالکل نہیں نکال سکتے۔ آسٹریلیا کے اکثر باشندے حروف صفیریہ (جن حرفوں میں سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے مثلاً س، ش، ص، ث، ز، ظ) کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ نیوزیلینڈ والے مندرجہ ذیل حروف (ب، س، د، ف ح، ح، ل، ق، ص، و، ی) سے بے نیاز ہیں۔ قدیم مصری زبان ہیروگلیفی (HIEROGLYPHIC) ان حروف سے یکسر خالی ہے (ب، ج، د، ز، ظ، ض)، سنسکرت میں یہ حروف نہیں (ف، ق، خ، ح، غ، ز، ذ، ظ) تامل میں ان حرفوں کا استعمال نہیں ہے (ج، ح، خ، د، ذ، ڑ، ز، ش، ع، غ، ف، ق، ہ) اس اختلاف تلفظ سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ایک زبان بولنے والی قوم کے اعضاء نطق کی ساخت طبعی طور پر یکساں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بعض مخارج پر قادر ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ (ت، م، ن، ہ) ایسے حروف ہیں جن کو ہر قوم آسانی سی ادا کر لیتی ہے کیونکہ اختلاف ہوتے ہوئے بھی یہ حروف تقریباً کل زبانوں میں پائے جاتے ہیں (بجز ہائے مخلوط کے) اگر ہم "ہ" کے طریقۂ تلفظ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا تلفظ طبعی ہے جس کو ادا کرنے میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی جب کہ ہم عادتاً سانس نکالتے وقت منھ بھی کھول دیں "ت" اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ سانس خارج کرتے وقت زبان اوپر کے دانتوں سے لگا لی جائے۔ جو آواز منھ کو اندر سے پولا کر کے ناک اور منھ سے نکالی جائے وہ "م" ہوگی۔ "ن"

"بھی اُم" ہی کی طرح ادا کیا جاتا ہے جب کہ زبان تالو سے لگا کر منھ کھول دیا جائے۔

ان آوازوں کے معانی اور مرکب الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں زبانیں اور لہجے پیدا ہو گئے جو شمار سے باہر ہیں۔ موجودہ زمانہ کا علم اللغت (PHILOLOGY) ان کی حالتوں کا اندازہ کر کے دو قسمیں کرتا ہے "ترقی یافتہ" اور "غیر ترقی یافتہ" اس دوسری قسم میں وہ زبانیں شامل ہیں جو اسلوب بیان کے اعتبار سے کمتر درجہ کی ہیں اور الفاظ کے اعتبار سے بسیط۔ مثلاً زنگیوں کی زبانیں جو جنوبی افریقہ میں بولی جاتی ہیں یا امریکی زبان جو سرخ ہندوستان میں مستعمل ہے چینی بھی انھی زبانوں میں شامل ہے جس کی خاص صفت یہ ہے کہ تمام الفاظ ایک ہی طرح کے ہیں جن میں اسم فعل اور حرف کا مطلق امتیاز نہیں۔ ایک ہی لفظ اسم فعل اور حرف کا کام دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ دوسرے معنی دار الفاظ لگا دئے جائیں۔ حامی زبانیں قدیم مصری قدیم حبشی بربری بھی اس قسم میں داخل ہیں۔ (بعض ماہرین لغت نے قدیم مصری زبان "HIEROGLYPHIC" کو مشرقی زبانوں میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ اکثر حالتوں میں ان سے ملتی جلتی ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ اصل زبان ہے اور وہ سب اس کی فرعین ہیں اس کا اصلی نام حامی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کو حام بن نوح ؑ کی اولاد بولتی تھی۔)

اب رہیں ترقی یافتہ زبانیں جن کی امتیازی شان یہ ہے کہ غیر محدود بولنے والے رکھتی ہیں اور انسان کی مختلف تعبیری ضروریات کو پورا کر دیتی ہیں انھیں کی فرعیں متمدن اقوام میں مستعمل ہیں۔ یہاں سے ان کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ اگر ان میں اس کی صلاحیت ہے کہ گردانیں گردانی جا سکیں اور صیغہ بنائے جا سکیں تو وہ "متصرفہ" کہلائیں گی ورنہ "غیر متصرفہ" آخر الذکر میں تورانی زبانیں شامل ہیں جن کی شاخوں میں سے ایک شاخ ترکی ہے۔ یہ ایشیائے کوچک تاتار اور وسط ایشیا میں شرقاً اور سائبیریا کے شمالی حدود تک شمالاً بولی جاتی ہے۔ اس کی دوسری شاخیں منگولی، تنگناسی اور اوگرانی ہیں۔

"ترقی یافتہ غیر متصرف" زبانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ترتیب جامد اصول پر ہوتی

ہے اور اپنی بناوٹ میں کسی قسم کا تغیر قبول نہیں کرتیں بن میں صیغے بنانے کے لئے کچھ بے معنی مقرر شدہ الفاظ ان اصلوں کے آخر میں لگا دیے جاتے ہیں جن سے اصلیں بلا تغیر باقی رہتی ہیں۔ مثال کے لئے ترکی لفظ "اوقو" کو لیجئے، یہ ایک اصل ہے جس کے معنی ہیں پڑھائی۔ اس سے مصدر بنانے کے لئے آخر میں علامت مصدر "مک" لگا دی جائے گی (اوقومک) جب ماضی مطلق بنایا جائے گا تو اس کے آخر میں "دی" کا اضافہ کر کے کہیں گے "اوقودی" (اس نے پڑھا) پھر ماضی بعید بنانے کے لئے "ایدی" اور "دی" کا اضافہ ماضی مطلق پر ہوگا "اقودیدی" (اس نے پڑھا تھا) جب جمع بنانا چاہیں گے تو اسی پر علامت جمع "لر" لگا دیں گے "اقودیدیلر" (انھوں نے پڑھا تھا) اب منفی بناتے وقت علامت نفی "ما" کو اصل اور دیگر اضافہ شدہ علامتوں کے درمیان رکھ دیں گے "اوقومدیدیلر" (انھوں نے نہیں پڑھا تھا) یہی اضافۂ علامات کی صورت طلب تمنا اور استفہام وغیرہ کے لئے بھی ہوگی لیکن اصل فعلی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے پہلا ہی لفظ رہ گیا۔

متصرفہ زبانوں کی خصوصیت ہے کہ ان کی گردانیں بنانے کے لئے اصلوں کے اول آخر بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور بیچ میں بھی۔ ان کی دو بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آریائی اور سامی۔

ا۔ آریائی زبانیں۔ یا ہندی یورپی جن کا دوسرا نام یافث ابن نوح کی نسبت سے "یافثی" بھی ہے۔ اس کی ایک قسم جنوبی ہے جس میں جنوبی ایشیائی تمام زبانیں شامل ہیں جیسے سنسکرت (اور اس کی تمام شاخیں ہندی وغیرہ) فارسی۔ پشتو۔ کردی۔ بخاری۔ ارمنی اور اوستی۔ دوسری قسم شمالی ہے جس میں یورپ کی کل زبانیں شامل ہیں۔ اس کی چار قسمیں ہیں "قلتی" جس کی فرعیں جزائر برطانیہ میں (انگلستان کو چھوڑ کر) بولی جاتی ہیں۔ "اطالوی" جس کی فرع لاطینی ہے اور لاطینی کی شاخیں فرانس اٹلی۔ اسپین اور پرتگال میں رائج ہیں۔ "ہیلینی" جو قدیم و جدید یونانی اور ونذی کی اصل ہے۔ ونذی کی شاخیں روس بوہیمیا اور بلگیریا میں مستعمل ہیں "تیوتونی" جس سے انگلینڈ جرمنی ہالینڈ۔ ڈنمارک اور آئس لینڈ کی زبانیں پیدا ہوئیں۔ آریائی زبانوں کو گردانے کے لئے ابتدا یا آخر اصل میں لگنے والی علامتیں بامعنی (جو تنہا بغیر کسی لفظ سے ملائے اپنے مستقل معنی رکھتی ہیں)

بھی ہو سکتی ہیں - یہ علامتیں زیادہ تر آخر میں لگتی ہیں اور کبھی کبھی ابتدا میں بھی جیسے انگریزی کا ایک لفظ ہے
THANK (شکریہ) جس سے "THANKFUL" (بہت شکر گذار) بنایا گیا پھر UN-
THANKFUL " (غیر متشکر) اور "UNTHANKFULNESS" عدم تشکر) بنا۔ یا مثلاً "CAPABLE"
(قادر) سے " INCAPABLE " (غیر قادر) اور " INCAPABILITY " عدم قدرت) بنایا گیا۔
یہی صورت تمام گردانوں میں ہو گی -

(۲) سامی زبانیں۔ سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں جس سے اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے
کہ یہی قسم بہت بڑی ہے کیونکہ سامی نسل (جو ان زبانوں کو بولتی ہے) دنیا میں سب سے زیادہ آباد ہے
سامی زبانوں کو لغات شرقی بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ان میں عربی جیسی زبان موجود ہے لہذا ان کا شمار ایسی
زبانوں میں کیا جاتا ہے جو باعتبار اسلوب بیان بہترین باعتبار نطق وسیع تر باعتبار الفاظ سریلی اور باعتبار
تعبیرات لطیف ہیں ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ قدیم ترین تاریخ کی محافظ ہیں (میری مراد توریت سے ہے
جو عبرانی زبان میں ہے) یہ تو معلوم ہی ہے کہ سب سے پہلے تمدن انہی زبانوں کے بولنے والوں میں
پھیلا۔ جیسے فنیقی - بابلی اور آشوری وغیرہ -ان زبانوں کی تین بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آرامی عبرانی
اور عربی -

۱- آرامی- اس کی دو شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں- آرامی بابل کی پرانی زبان ہے جس کے آثار
بابل اور آشور کے کھنڈروں میں اب تک خط میخی اور خط انباری میں کھدے ہوئے پائے جاتے
ہیں- کلدانی میں زمانہ کے ہاتھوں ایسا تغیر ہوا کہ اس کے بعض الفاظ ہی تبدیل ہو گئے -اس میں عہد قدیم
کے بعض سفر نامے لکھے ہوئے تھے جیسے سفر دانیال وغیرہ - اس کا بھی نام وہاں زبردستی آرامی ہی
رکھ لیا گیا تھا حالانکہ اس میں اور اصلی آرامی میں الفاظ معانی کا بیّن فرق موجود ہے -اسی طرح آشوری بھی
بابلی سے مختلف ہے- آج کل سریانی گروہ جس زبان کو کلدانی کہتا ہے وہ کلدانی نہیں بلکہ سریانی ہے جس
کے اعراب میں کچھ تغیر ہو گیا ہے کلدانی تو درحقیقت سریانی کی اصل ہے جس کے الفاظ اور معانی میں
تغیر ہو کر سریانی بنی -پرانی بابلی زبان شروع میں آرامی کہی جاتی تھی جب اس میں تھوڑا سا تغیر ہوا تو وہ

کلدانی کے نام سے موسوم کی گئی۔ جب اس میں دوبارہ تغیر ہوا تو اس کا نام سریانی پڑ گیا پھر اس کے اعراب میں تبدیلی ہونے سے دو الگ الگ زبانیں سریانی شرقی اور سریانی غربی شمار کی جانے لگیں۔

بعض تاریخی حالات اصلی آرامی زبان میں محفوظ ہیں اور بابل و آشور کے کھنڈروں میں کھدے ہوئے ہیں۔ سریانی ہی میں وہ انجیل بھی محفوظ ہے جس کا ترجمہ۔ ترجمۂ بسیطہ کے نام سے دوسری صدی عیسوی میں کیا گیا۔

۲۔ عبرانی۔ اس کی خصوصیت کا راز قدیم تاریخ کی محافظت میں مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اور اس کے بولنے والے تمام قوموں میں نمایاں رہے ہے۔ جو زبان آج کل اسرائیلی بولتے ہیں وہ خالص عبرانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں آرامی اور کلدانی کے بعض الفاظ بھی اس وقت داخل ہو گئے جب کہ یہ لوگ بابل والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ زمانہ قدیم الیام کر ہے جس پہ یہ سب زبانیں مل جاتی ہیں۔ عبرانی کی دو شاخیں تھیں فینیقی اور قرطجنی۔ جو اب مردہ ہو چکی ہیں۔

۳۔ عربی۔ یہ تمام سامی زبانوں میں بلند پایہ ہے اور اس کا جاننا دوسری ہم نسل زبانوں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ صرف جزیرہ نمائے عرب ہی میں بولی جاتی تھی۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد پھیلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ مشرق اور مغرب اس سے گونج اٹھے ہندوستان سے جبل طارق تک شرقاً وغرباً اور بحر عرب سے بحر اسود تک شمالاً وجنوباً اس کا چرچا پھیل گیا۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اس زمانے کی دنیائے تمدن میں عام طور پر رائج تھی۔ عربی حروف کا عجمی زبانوں مثلاً ترکی فارسی اور اردو۔ میں استعمال اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے مشرقی زبانیں تو رہیں ایک طرف یورپین زبانیں بھی اس کی خوشہ چین ہیں جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے عربی کی شاخوں میں سے حبشی اور دوسری زبانیں پیدا ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ واضح رہے کہ اگر قرآن شریف جیسا مرکز موجود نہ ہوتا تو اب تک نہ معلوم کتنی شاخیں عربی سے پیدا ہو چکی ہوتیں۔

اصل لفظ "عرب" کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "عبر" ہے جو الٹ پلٹ کر عرب ہو گیا بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ "عَرَب" سے

ماخوذ ہے جس کے معنی فصاحت کے ہیں چونکہ عربی فصیح ترین زبان ہے لہٰذا اس کا نام عرب ہوا۔ کچھ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ یہ لفظ "یعرب" سے ماخوذ ہے۔ یعرب وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عربی بولی۔ ڈاکٹر واندیک کی رائے مندرجہ ذیل ہے۔

جس زمانہ میں سامی قوم خلیج عرب کے کنارے کنارے اس جگہ آباد تھی جس کا نام بعد میں عراق عرب مشہور ہوا۔ اس وقت کوشی قوم مہر حضر موت اور الحسا کی راہ سے آکر ان پر حملہ آور ہوئی اور ان کو مار بھگایا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بلاد فارس کی طرف نکل گئے۔ کچھ لوگ فرات کے کنارے بس گئے۔ (یہ تارحی کہلاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے اسلاف میں سے تھے) کچھ لوگ مغربی سمت چلے گئے (جس کا نام بعد میں جزیرۂ عرب ہوا) ان لوگوں نے لفظ عرب ערב "غرب" سے لیا جس کے معنی ہیں "سورج ڈوبنے کی سرزمین" عبرانی رسم الخط میں عین اور غین کی ایک ہی شکل ہوتی ہے کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ اردبا (یورپ) بھی اسی ערבה (عروبہ) کی تغیر شدہ شکل ہے (رانسن اور ماکس مولر کی تصانیف اور فورسٹ کی لغت دیکھو) کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اس کا نام لفظ "عرب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی عبرانی میں مخلوط اور ملے ہوئے کے ہیں چونکہ یہ گروہ بنی قحطان "بنی اسمٰعیل۔ بنی مدیان۔ بنی مواب۔ بنی عمون۔ اور بنی عملاق سے مل کر بنا تھا لہٰذا اس کا نام عرب ہوا۔ (ممکن ہے کہ جنوب میں کوشی قوم بھی مخلوط ہو گئی ہو) واللہ اعلم۔

سامی زبانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی اصلیں سہ حرفی ہیں اور مشتقات بنانے کے بعد میں بسا اوقات باقی رہتی ہیں یعنی ان کی حرفوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اعراب میں تغیر واقع ہو جاتا ہے جس سے اس کے مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جیسے عربی میں ایک اصل "قتل" ہے جس کے معنی مار ڈالنے کے ہیں۔ اس کے اعراب میں تغیر کر کے مختلف اسما اور افعال بنائے جا سکتے ہیں... "قَتَلَ" فعل ماضی معروف "قُتِلَ" فعل ماضی مجہول "قَتْلٌ" مصدر "قِتْلٌ" بمعنی دشمن "قُتُلٌ" "مقتول

کی جمع۔ کبھی کبھی یہ اعراب کھینچ کر بڑھ بھی جاتے ہیں جیسے "قَاتِلٌ" "قَاتَلَ" "قَتِیْلٌ" "مَقْتُوْلٌ" "قِتَالٌ" "قَتَّالٌ" اور "قَتْلٰی" وغیرہ۔ لیکن علامات بڑھا کر صیغے بنانے میں آریہ زبانوں جیسی ہیں تمام اس میں دو امتیازی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اول یہ کہ اس کے مشتقات کا بڑا حصہ اعراب کے تغیر ہی سے بنتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے صیغے ایسی علامتیں قبول نہیں کرتے جو معنی دار ہوں۔

اس تقسیم سے یہ بات صریحی طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ ان سب زبانوں کی اصل ایک ہی ہے خاص کر جب کہ شاخیں پھوٹنے کے بعد بہت زیادہ تغیرات ہو گئے۔ لیکن تلاش اور مقابلہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سامی اور آریائی دونوں زبانوں میں اضافہ علامات کر کے یا بلا اضافہ گردانے جانے کی صلاحیت موجود ہے لہذا متصرفہ کی شاخیں سمجھی جائیں گی۔ متصرفہ اور غیر متصرفہ میں مشتقات بنانے کی قابلیت پائی جاتی ہے اس لئے یہ دونوں ترقی یافتہ زبانیں متصور ہوں گی اگرچہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں تغیرات کی بنا پر بہت زیادہ اختلاف اور بعد ہو گیا ہے تاہم تلاش اور مقابلہ سے ان دونوں کا درمیانی رشتہ ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا۔

تمام زبانوں کی اصل | زبانوں کی تقسیم سے ان قوموں کی تقسیم مراد ہے۔ جو ان کو مافی الضمیر ظاہر کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد ہے کہ زبانوں کی قسمیں طورانی۔ آریائی اور سامی ہیں جو قومیں اس وقت طورانی زبانیں بولتی ہیں ایک نسل سے ہیں۔ آریائی زبانیں بولنے والی قومیں ایک نسل سے۔ یہی حال دوسرے گروہوں کا بھی ہے۔ مثلاً جو قومیں آریائی زبانیں بولتی ہیں ان میں کے کچھ فرقے یورپ میں اور کچھ فرقے ہندوستان اور فارس میں ہیں۔ اگرچہ آج فاصلہ کی زیادتی سے ان کے عادات و اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر بھی اس میں شک نہیں کہ قدیم ترین زمانہ میں ایک ہی فرقہ یا خاندان تھا جو ایک سرزمین پر زندگی بسر کرتا تھا پھر امتداد زمانہ سے ان میں علیحدگی شروع ہوئی یہاں تک کہ دو جگہ تقسیم ہو گئے جن کو ہم قسم جنوبی اور قسم شمالی کہیں گے۔ قسم جنوبی تو وسط ایشیا میں جا بسی اور قسم شمالی نے یورپ میں قدم جمائے جیسا

جدول لغات
زبانوں کا نسب نامہ
مفرد آوازیں
مرکب چھوٹے الفاظ
غیر ترقی یافتہ
ترقی یافتہ
حامی
چینی
امریکی
زنگی
بعض جزیروں کی زبانیں
غیر متصرفہ
متصرفہ
طورانی
ترکی
منگولی
تفقاسی
اوغرانی
سامی
عربی
عبرانی
آشوری یا آرامی
حمیری
حبشی
قریشی
عدنانی
فنیقی
قرطاجنی
کلدانی
سریانی
سریانی شرقی
سریانی غربی
آریائی
تیوتانی
ہیلینی
اطالوی
قلتی
ارمنی
بخاری
پشتو
سنسکرت
اوستی
فارسی
کردی
گجراتی
ہندی
بنگالی
مرہٹی وغیرہ
بطانوی (علاوہ انگلستان کے)
لاطینی
یونانی
وندی
انگریزی
جرمنی
ہالینڈی
ڈنمارکی
آئسلینڈی
روسی
بوہیمیائی
بلغاری
فرانسیسی
اسپینی
پرتگالی

جیسا زمانہ گزرتا گیا ان قسموں کی بھی قسمیں ہوتی چلی گئیں۔ بعینہٖ یہی حال سامی زبانوں کا بھی ہوا کہ اس کے بولنے والے دوآبہ (دجلہ وفرات) کے درمیان رہتے تھے اور ایک زبان بولتے تھے۔ جب زمانہ نے پلٹا کھایا یا تو بعض لوگوں نے ترک وطن کیا۔ خواہ کسی سبب سے بھی ہو۔ تلاش یا جنگ سے گریز اور جزیرۃ العرب پہونچ کر سکونت اختیار کرلی۔ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی زبان ترقی کرنے کی وجہ سے بدلنا شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان عربی اور قوم عرب بن کر تیار ہوگئی پھر ان میں سے دوسری گروہ نے ہجرت کرکے شمالی جزیرۃ العرب میں قیام کیا۔ ان کی زبان بھی بدلنے لگی یہاں تک کہ اس کی مستقل حیثیت ہوگئی اور عبرانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ (غالباً اس طرف کے پہلے مہاجر حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں جس وقت یہ شاخیں اپنی اپنی جگہوں پر ارتقائی مدارج طے کررہی تھیں اسی زمانہ میں ان کی اصل بھی دوآبہ کے درمیان ترقی کررہی تھی۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کا سیلان کسی نہ کسی طرف تھا۔ اسی پر تمام زبانوں کی شاخوں کو قیاس کرلینا چاہیئے۔ عبرانی نے جب مستقل صورت اختیار کرلی تو اس سے فینیقی زبان پیدا ہوئی۔ انھی میں سے ایک گروہ نے مغرب کی طرف جاکر قرطجنہ کو اپنا وطن بنالیا اور ان کی زبان مستقل ہونے پر قرطجنی کہلائی۔ یہی صورت دوسری فرعوں میں بھی ہوئی۔ قرطجنی زبان الفاظ اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے اپنی بہن فینیقی۔ اس سے اوپر اپنی خالہ عربی پھر اپنی نانی سامی سے بہت ملتی جلتی ہے جو آریائی جیسی ہے۔ آریائی کا سلسلہ طورانی تک پہنچتا ہے جو چینی سے مشابہ ہے۔ جیسے جیسے قومیں اپنے اصلی قبیلوں سے دور ہوتی گئیں ویسے ہی ویسے ان کی زبانیں بھی اپنی اصل سے مختلف ہوتی چلی گئیں۔

جب ہم زبانوں کے مدارج نشو ونما کو سامنے رکھ کر موجودہ زبانوں سے مقابلہ کریں گے تو ہم کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی فرعیں کیسے اور کس زمانہ میں بنیں۔

یہ مشہور ہے کہ انسان کی ابتدائی نشو ونما فرات اور دجلہ کے درمیان عراق سے آرمینیہ اکوہ قاف تک ہوئی جب نسل زیادہ بڑھ جاتی تو کچھ لوگ علیحدہ ہوکر دوسری جگھوں میں جا بستے۔ تمام گروہ بیک وقت الگ نہیں ہوگئے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جب سرزمین وطن ان کے قیام کے لئے ناکافی ہوتی

اور ذرائع معاش کم ہوجاتے تو ایک فرقہ ان سے جدا ہوکر کسی نہ کسی طرف چلا جاتا۔ توریت میں ایک ایسی ہجرت کا ذکر موجود ہے جس کی وجہ سے متعدد زبانیں پیدا ہوگئیں۔ اس قصہ کی سرخی "حکایت تبلبل الالسنہ" ہے۔ توریت ہی میں دوسری جگہ روئے زمین پر قوموں کے متفرق ہونے اور پھیلنے کا ذکر موجود ہے لیکن صرف وہی قومیں گنائی ہیں جو حضرت نوح کی نسل سے طوفان کے بعد پھیلیں۔ ان قوموں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قبل طوفان نشوونما پا چکی تھیں یعنی نسل قائین اور اس کی فرعین کیا ہوئیں؟ قبل طوفان پائی جانے والی قومیں کہاں گئیں؟ ان باتوں میں توریت بالکل خاموش ہے۔ صرف انہی لوگوں کے حالات سے بحث کرتی ہے جو دوآبہ کے درمیان رہتے تھے اور طوفان میں غرق ہوگئے۔
اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے اور طوفان کے درمیان ایک طویل مدت ہے۔ اس عرصہ میں قومیں بنیں ان سے نسلیں پیدا ہوئیں اور مہاجرت کرکے روئے زمین کا بڑا حصہ آباد کردیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ غیر ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والے دوآبہ کے درمیان بسنے والوں سے کہیں زیادہ پرانے ہیں جیسے چینی اور قدیم مصری جن میں سے ایک فرقہ مشرق میں چلا گیا اور دوسرا مغرب میں۔ اس معاملہ میں تاریخ ہماری تائید کرتی ہے کہ یہ قومیں دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں کیونکہ اگر وہ قدیم ترین قومیں نہ ہوتیں تو ان کی زبانیں بھی بسیط نہ ہوتیں بلکہ قبل طوفان ہی ان کی فرعین بن جاتیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زبانیں ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہیں۔ ابتدائی دور سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ علامتیں پیدا نہیں ہوئی تھیں اور نہ اسم فعل اور حرف میں کوئی امتیاز کیا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ چین قائیں نسل سے ہوں اس لئے کہ توریت ہم کو قائین کا ماہر صنعت و موسیقی ہونا بتاتی ہے اور چینی قوم مختلف صنعتوں میں پرانی ماہر ہے۔

چین کو عربی سین (صین) کہتے ہیں۔ ہم کو صین اور قائین میں یہاں تک لفظی شباہت معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی لفظ شمار کرنا صحیح ہوگا کیونکہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں قاف اور صاد کا آپس میں تبادلہ ہوا ہو۔ علاوہ ازیں یورپی زبانوں میں حرف (C) کبھی تو قاف یا

کاف کی آواز ظاہر کرتا ہے اور کبھی صاد یا سین کی۔ نیز پرانی انگریزی میں اس کا تلفظ جیم اور کاف کی درمیانی آواز سے کیا جاتا تھا "ج" اور "چ" قریب المخرج ہیں لہذا بہت ممکن ہے کہ بعض زبانوں میں قائین کا تلفظ "CHINA چائنا" یا چین ہو گیا ہو۔ اسی طرح قبائل عرب میں "گ" کے تلفظ میں اختلاف ہے بعض قبائل اس کا تلفظ "ک" کرتے ہیں بعض "چ" بعض "سین" اور بعض "شین" یہی مشابہت قائین اور قدیم مصر کے نام میں بھی دکھائی دے گی جو (کیم، یا کیمی) کہلاتا تھا (ممکن ہے کہ علم الادویہ کے متعلق اسی قوم نے ابتدائی معلومات حاصل کئے ہوں اور اس فن کا نام اسی قوم کی طرف منسوب کر کے کیمیا رکھا گیا ہو) کاف اور قاف قریب المخرج ہیں۔ نون اور میم کا آپس میں تبادلہ مشہور ہے۔ رہا زیر و زبر کا اختلاف تو وہ کوئی چیز نہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غیر ترقی یافتہ زبانیں بولنے والی قومیں روئے زمین کو طوفان سے پہلے ہی آباد کر چکی تھیں۔ پھر تورانی بولنے والی قوموں کے اجداد نے ہجرت کر کے شمالی ایشیا میں سکونت اختیار کر لی جن کی نسل سے مغل اور تاتاری وغیرہ قومیں ہیں۔ پھر وہ گروہ بھی الگ ہو گیا جو بعد کو آریہ کہلایا۔ اس کی شاخیں ہندوستان۔ فارس کردستان۔ اور یورپ میں جا بسیں۔ اسی طرح سامی اور ان کی نسلیں بھی الگ ہو گئیں۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جب کوئی زبان اپنی اصل سے جدا ہوتی تو خود اس میں نشوونما پیدا ہو جایا کرتی تھی اور دونوں زبانیں اپنے بولنے والوں کے حالات کے مطابق چلتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ویسے ہی ویسے یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتیں چلی گئیں۔ لیکن ان دونوں دور افتادہ زبانوں کی مشابہت تحقیق اور مقابلہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ زبانوں کو اپنی اصل سے جدا ہوئے جتنا زیادہ زمانہ گذرا اتنا ہی زیادہ اختلاف پیدا ہو گیا اور جتنا کم زمانہ گذرا اتنا ہی اختلاف بھی کم رہا۔ عبرانی اور عربی زبان کے الفاظ طریق تعبیر اور مشتقات کی مشابہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایسی ہی مشابہت ان یورپی زبانوں میں بھی محسوس ہو گی جو لاطینی سے نکلی ہیں۔ ان میں کی ہر زبان اس وقت اپنی اصل سے علیحدہ ہوئی جبکہ مختلف قسم کی تعبیریں اور اشتقاق اصل میں نشوونما پا چکے تھے لہذا مشابہت خوب نمایاں رہی۔ لیکن عربی اور لاطینی مشابہت کے اعتبار سے

بہت دور ہو گئیں کیونکہ یہ اس وقت الگ ہوئیں جس وقت تک اصل میں پوری طرح نشو و نما نہیں ہو چکی تھی بلکہ ان دونوں نے بذات خود الگ الگ ارتقائی مدارج ایک دوسرے سے مختلف طور پر طے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشابہت میں بہت کمی واقع ہو گئی۔ اسی سبب سے عربی اور چینی زبانوں میں انتہائی بعد ہو گیا کیونکہ چینی اصلی سامی قوم سے ہزار ہا سال پیشتر اس وقت علیحدہ ہوئے جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی۔

اب ہم لغت کے اس قدیم ترین مواد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو تمام زبانوں کی اصل میں پایا جائے جس کی وجہ سے ہم ان کی باہمی مشابہت معلوم کر سکیں گے۔

لغت کے سب سے پرانے لفظوں میں ضمیریں۔ گنتی اور ضروریات زندگی کے نام مثلاً کھانا پانی۔ قیام گاہ اور پوشش وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔

ضمیریں ضمیریں صرف تین ہوتی ہیں متکلم۔ مخاطب اور غائب جن پر جمع اور تانیث وغیرہ کی علامتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ جب ہم ان کو علامات اور اس نون سے خالی کر لیں گے جو بعض زبانوں میں پایا جاتا ہے تو ان کے آپس کی مشابہت ظاہر ہو جائے گی۔ ضمیر متکلم "ی" اور "ک" آواز وں سے بنتی ہے (کسی زبان میں دونوں حرف پائے جائیں گے اور کسی میں ایک) اردو میں "ی" اور "ہ" ہے جو ہم کو (میں اور ہم) میں نظر آتی ہے ("ی" "ء" "ح" "ہ" وغیرہ کا آپس میں تبادلہ ہوا کرتا ہے) عربی میں "ی" یا "ح" ہے جیسے "نحن" اور "ی" جو ضمیر واحد متکلم منصوب میں خواہ متصل ہو یا منفصل اور ضمیر مجرور میں پائی جاتی ہے۔ فارسی میں "ام" اور "ایم" بحالت اتصال۔ سریانی میں (ܐܢܐ ان کی) جس کا تلفظ "انی" ہوگا۔ عبرانی میں אנכי (انوک) یا אני (انی) قدیم مصری میں (ان کو) یا (یا)، (آ)، آشوری میں (ago) لاطینی میں (ago) یونانی میں (egom) سنسکرت میں (ahu) یا (ahom) انگریزی میں (I) جرمنی میں (ich) چینی میں (nga) یا (ngu) یا a منگولی میں (na)

مخاطب کی ضمیر سے جس وقت جنس اور عدد کی علامتیں ہٹالی جائیں تو سب زبانوں میں اصل "ت" نکلے گی۔ جیسے اردو میں (تم۔ تو۔ تیرا۔ تجھ) عربی اور سریانی میں (انت) عبرانی میں אתה

مادہ لاطینی میں (tu) فرانسیسی میں (tu) انگریزی میں (Thou) جرمنی میں (du) یا (du) سنسکرت میں (tvam) فارسی میں (تو) آشوری میں (اتا) کلدانی میں (انت) پرانی مصری میں (entuten) قبطی میں (ntok) چینی میں (ni) منگولی میں (ta)۔

ضمیر غائب کی اصل تمام زبانوں میں "ہ" ہے۔ یونانی میں (ا) جرمنی میں (er) فارسی میں (وے) اردو میں (وہ) چینی میں (ta) اس کا تلفظ "اوہ" ہوگا s زائد ہے (عربی میں ہو ہی۔ ہما۔ ہن۔ ہم۔ ہ۔ ہا) سریانی میں (ہو۔ ہی۔ ہ۔ ہ۔ ہنون۔ ہنین) عبرانی میں (ہوا۔ ہیا۔ ہ۔ ہ۔ ہم۔ ہن) انگریزی میں (he - his - him her)۔

گنتی اندازہ کیا جاتا ہے کہ گنتیاں ضمیروں کے بہت بعد وجود میں آئیں اسی واسطے جتنی شباہت ضمیروں میں پائی جاتی ہے اتنی گنتیوں میں نہیں پائی جاتی۔

عربی کے لفظ واحد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب سامی زبانیں آریائی زبانوں کے مقابلہ میں مستقل ہو چکیں تب یہ معرض وجود میں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے آریائی زبانوں میں پایا جاتا ہو جس کے آثار سوا یونانی کے اب مفقود ہو گئے۔ عربی کے واحد میں اصل (حد) ہے جو دوسری سامی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یونانی زبان میں واحد کے معنی میں (hen) مستعمل ہے۔ آریائی زبانوں میں جن الفاظ سے "ایک" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے ان کی اصل "و" اور "ن" ہے۔ لاطینی میں (unus) یونانی میں (hen) انگریزی میں (one) یا (on) اسی طرح دیگر آریائی زبانوں میں بھی ہے۔ اب رہیں سامی زبانیں تو ان میں اصل "و" اور "ل" ہے جو عربی کے لفظ (اول) میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اردو میں اس کی یادگار لفظ (پہلا) میں "ل" باقی رہ گیا ہے (ل۔م۔ن۔ر۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے)

(دو) اس کی اصل "ت" ہے جس کا تبادل "ش۔س۔د" سے ہوتا ہے عربی میں (اثنان) فارسی میں (دو) یونانی میں (duo) لاطینی میں (duo) انگریزی میں (two) یہی حال باقی زبانوں کا بھی ہے عربی میں الف اور نون زائد ہیں جن کا استعمال بطور علامت تثنیہ ہوتا ہے۔

(تین) عربی میں اس کی اصل (ثلث) ہے جو تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اسی طرح آریائی زبانوں میں بھی جیسے لاطینی میں (tres) یونانی میں (treis) انگریزی میں (three) فارسی میں (سہ)۔

(چار۔ پانچ) آریائی اور سامی زبانوں میں مشترکہ طور پر ان کی اصل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

(چھ) اس کی اصل "ست" ہے ("س" اور "چ" قریب المخرج ہیں یہاں تک کہ بعض زبانوں میں ان دونوں آوازوں کے لئے ایک ہی حرف استعمال کیا جاتا ہے) عربی میں (ستہ) عبرانی اور فارسی میں (شش) لاطینی میں (sex) یونانی میں (hex) سلافونی میں (شست) انگریزی میں (six)

(سات) عربی میں (سبعہ) لاطینی میں (septem) یونانی میں (hepta) فارسی میں (ہفت) سنسکرت میں (سپتا) انگریزی میں (seven) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل (سب) ہے جس پر سامی زبانوں میں (ع) اور اکثر آریائی زبانوں میں (ت) کا اضافہ ہو گیا۔

سات کے اوپر کوئی صورت مطابقت کی نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سامی اور آریائی گروہ اس وقت علیحدہ ہوئے جب کہ آٹھواں عدد پیدا نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں اب تک کچھ وحشی قومیں ایسی ہیں جن کی زبان میں پانچ کے اوپر کوئی عدد نہیں پایا جاتا۔

ہم کو مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ گنتی کی مشابہت صرف آریائی اور سامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ زبانیں گنتی پیدا ہونے کے پہلے ہی اپنی اصل سے الگ ہو چکی تھیں بالفاظ دیگر چینی اور مغل اس وقت دوآبہ سے ہجرت کر گئے جب ان کی زبان میں گنتیوں کا وجود بھی نہ تھا۔ بعد میں ان کے یہاں گنتی پیدا ہوئی جس کا تعلق مذکورۂ بالا زبانوں سے نہ تھا۔ چینی زبان میں دو کو (شونگ) تین کو (شام) چار کو (سی) پانچ کو (نیچو) چھ کو (لوک) کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ضروریات زندگی کے نام | عہد اول کے انسان نے اپنی بول چال میں سب سے پہلے ان اشیا کے نام رکھے جو اس کی جہد للبقا میں کام آسکیں۔ چونکہ یہ ضمیروں اور گنتیوں سے بھی پہلے بن چکے

تھے۔ اس لئے ان کی مشابہت تمام زبانوں میں اچھی طرح نمایاں ہے۔ واضح رہے کہ زبان ہمیشہ نشوونما کی حالت میں رہتی ہے نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے ہیں اور پرانے متروک ہو جاتے ہیں۔ الفاظ میں تغیر کمی بیشی۔ تبادلہ۔ اور حروف کے مقدم مؤخر ہونے سے ہو جاتا ہے۔ اکثر زبان زد الفاظ میں اسی قسم کی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ضروریات زندگی کے نام سب سے پرانے زبان زد الفاظ ہیں۔ یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ مشابہ الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی یا ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں بیک وقت مل جائیں گی۔ کبھی کوئی لفظ سامی اور آریائی زبانوں میں مشترک ملے گا یا کبھی ان میں سے ایک اور چینی میں۔ کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو سب میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) ماں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک ہی لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں رائج ہے کیونکہ یہی انسانی بولی کا قدیم ترین لفظ ہے۔ لاطینی میں (mater) یونانی میں (miter) سنسکرت میں (matri) انگریزی میں (mother) فارسی میں (مادر) اردو میں (ماں) عربی عبرانی اور سریانی میں (اُم) تبتی میں (یم) چینی میں (مو) قبطی میں (ماد) جس طرح ان سب الفاظ میں اصل "م" ہے اسی طرح ان الفاظ میں بھی جو ماں کو مخاطب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے ہندی میں (ماتا) اردو میں (اماں) عربی میں (اُمّی) اکثر یورپی زبانوں میں (Mama) یا (Mami)

(۲) باپ۔ آریائی زبانوں میں (pater) یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں جیسے انگریزی میں (Father) فارسی میں (پدر) ہندی میں (پِتا) اس میں اصل "ب" ہے جو سامی زبانوں میں بھی (اب) کی شکل میں پائی جاتی ہے چینی میں (بو) یا (فو) ب۔ پ۔ ف۔ د۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔

(۳) دنیا۔ لاطینی میں (DO) ایسے ہی الفاظ بقیہ آریائی زبانوں میں بھی ہیں۔ فارسی میں (دادن) "دن" علامت مصدر ہے جس کو گرانے کے بعد صرف "دا" باقی رہ جاتا ہے اردو

میں "دینا" اس میں "نا" علامت مصدر ہے۔ اس لفظ میں اصل "د" ہے۔ عربی میں (ادنیٰ) یا (اعلیٰ) یائین زائد ہے۔ قدیم مصری میں (طا) "د" "ت" اور "ط" ہم مخرج ہیں۔

(۴) کٹنا۔ کاٹنا۔ یہ لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں مشترک ہے۔ لاطینی میں (Caedo) انگریزی میں (cut) فرانسیسی میں (Casser) چینی میں کت قدیم مصری میں (کھت) عربی میں (قط قص قطع)

(۵) ہونا۔ لاطینی میں (Esse) سنسکرت میں (اس) انگریزی میں (is-was) عبرانی میں (یش) سریانی میں (ایت) اردو میں (تھا) عربی میں (ایس) مگر عربی میں یہ لفظ لا، نافیہ کے بغیر نہیں پایا جاتا (لاایس جس کا مخفف لیس ہے)

(۶) مرد۔ لاطینی میں۔ (Homo) یونانی میں (Anir) ہسپینی میں (Nambee) انگریزی میں (man) فارسی میں (مردم) اردو میں (مرد) عربی میں (مرء) منگولی میں (Ere) اس لفظ میں اصل "ر" ہے۔

(۷) حرف نفی۔ اکثر سامی زبانوں میں (لا) اور آریائی زبانوں میں (na) یا اس کی شاخیں مستعمل ہیں۔ عربی میں (لا۔ ما) انگریزی میں (no - Non - un) فارسی میں (نہ۔ مَ) اردو میں (نہ۔ نہیں۔ مت) تمام طورانی زبانوں میں (ال۔ نہ۔ ما) تامل میں (الے) ل۔م۔ن۔ کے درمیان نسبت لفظی معلوم ہی ہے۔

مذکورۂ بالا مثالیں ایسے الفاظ کی ہیں جن کی اصل تمام بڑی بڑی زبانوں میں ایک جیسی ہیں لیکن وہ مشابہ الفاظ جو چند زبانوں میں پائے جائیں۔ اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا ایک جگہ جمع کرنا غیر ممکن ہے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اردو (کھوہ) لاطینی (cavon) انگریزی (Cave) عربی (کہف) — عربی (ارض۔ ثری) انگریزی (Earth) فرانسیسی (Terre) — عربی (الہ) تبتی (لہا) — عربی (ماء) قدیم مصری (ما) چینی (مو) وغیرہ وغیرہ۔

(باقی)

قومی تنظیم

(از پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ جنرل سکریٹری قومی تنظیمی کمیٹی)

(ذیل میں اس نوٹ کے ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ نے قومی تنظیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی سب کمیٹیوں کی ہدایت کے لئے شائع کیا ہے۔ مدیر)

پلاننگ یا تنظیم کسے کہتے ہیں؟ جمہوری نظام میں پلاننگ کے معنی ہیں عوام کی منتخب شدہ جماعتوں کی طرف سے چند جماعتی نصب العینوں کا مقرر کیا جانا اور ان کے مطابق ایسے ماہران فن کا جن کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے ذیل کے مختلف کاموں میں باہمی ربط پیدا کرانا یعنی دولت کے صرف کرنے، دولت کے پیدا کرنے، کاروبار میں سرمایہ لگانے، تجارت کرنے اور قومی آمدنی کے تقسیم کرنے کے مختلف کاموں میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا۔ اس قسم کی پلاننگ کو صرف معاشی نقطۂ نگاہ سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس میں تمدنی اور روحانی قدروں اور زندگی کے دوسرے انسانی پہلوؤں کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

پھر تنظیم کے لئے صرف جماعتی نصب العین کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پلین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قوت اور اقتدار کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ قوت کسی اعتبار سے محدود ہوئی یا پلین کو عملی جامہ پہناتے وقت کسی اور قسم کی معاشی یا سیاسی پابندیاں حایل ہوئیں تو ہمہ گیر تنظیم رکھنے والی معیشت ترقی نہ کر سکے گی۔ صحیح تنظیم مکمل سیاسی اور معاشی آزادی کی صورت میں ہی کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہندوستان میں قومی تنظیم کے لئے مکمل کوشش تو اسی وقت کی جا سکے گی جب اس ملک کو پورا اقتدار بالادست حاصل ہوگا لیکن ملک میں جو حالات آج کل

موجود ہیں اور ہم پر طرح طرح کی جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہم کو اپنے پلین یا منصوبے میں ایسی تجویزیں بھی رکھنا ہوں گی جو فوری طور پر قابل عمل ہوں گی اور ہم کو ایسے اقدامات کو تبلانا ہوگا جن کو پلین کے پورا کرنے اور ملک کے ذرائع سے زیادہ سے زیادہ امکانی فائدہ اٹھانے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے ہم اس وقت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ ان اقدامات کو منظم معیشت کی مکمل اسکیم کا ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور کسی حال میں بھی ہم کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جو پلین کے پورا کرنے میں مزاحم ہو۔

ہمارے جماعتی نصب العینوں کا جہاں تک تعلق ہے ملک میں ایک بڑی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے اگرچہ بعض بنیادی اختلافات بھی موجود ہیں جن میں سے بہت سے ممکن ہے ہماری اس تحقیقات کے بعد ختم ہو جائیں۔ ایک حد تک ان نصب العینوں کی طرف نیشنل کانگریس نے اپنی متعدد قراردادوں اور اپنے عام طرز عمل سے ہماری رہنمائی اور ہدایت بھی کی ہے۔ ہمیں کانگریس کے اس عام طرز عمل کی پیروی کرنی چاہیئے اور کانگریس کے تبلائے ہوئے مقاصد کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کراچی کانگریس کے بنیادی حقوق کی قرارداد اور کانگریس کے انتخابی مینی فیسٹو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کانگریس بہت سے سالوں سے گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے پر بہت زور دے رہی ہے اور ملک کو گاؤں کے لوگوں کی حالت کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ ہم بھی اس بات کو نہیں بھلا سکتے کہ ہندوستان کی ترقی کا اندازہ ان کروڑوں آدمیوں کے معیار زندگی کی بلندی سے ہی کیا جا سکتا ہے جو دیہاتوں میں آباد ہیں۔ لیکن لوگوں کے ذہن میں دیہاتی صنعتوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مطالبات کے سلسلہ میں ایک غیر واجب تصادم پیدا ہو گیا ہے۔ تصادم اس بات کا تو ہو سکتا ہے کہ کس کو کس قدر اہمیت دی جائے اور ہندوستان میں اس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں بلاشبہ خانگی صنعتوں کو خوب ترقی دینا جمہور کی فلاح و بہبود کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صاف اور کھلی

ہوئی ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ملک کی نہایت فوری ضرورت ہے۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر کسی ملک کو سیاسی یا معاشی آزادی نہیں مل سکتی اور جب سیاسی آزادی ہی مفقود ہو تو دیہی اور خانگی صنعتوں کی بہت زیادہ ترقی کی بھی کوئی امید قائم نہیں کی جا سکتی بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر لوگوں کے معیار زندگی کو موثر طریقہ پر تیزی کے ساتھ بلند کرنا ممکن نہیں ہے۔ کلیدی صنعتوں، مدافعت کی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کو بڑے پیمانہ پر ہی چلایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ دیہی اور خانگی صنعتوں کی ترقی میں بھی سستی قوت محرکہ اور مناسب مشینوں کے فراہم ہو جانے سے جنھیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لئے ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ بستی صنعتیں اور بڑے پیمانہ کے کاروبار ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ملک کے سامنے مسئلہ کسی ایک کے انتخاب کا نہیں بلکہ دونوں سمتوں میں ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرنے کا ہے اور جہاں تک ہو سکے ہمیں اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ دیہی صنعتوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں باہمی تصادم نہ ہونے پائے۔

کانگریس کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی ترقی پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی خاص وجہ یہ خواہش ہے کہ تقسیم دولت کے نظام میں زیادہ انصاف پیدا کیا جائے اور نگرانی اور امتیاز کی عدم موجودگی میں صنعتی ترقی سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا سدّباب کیا جائے۔ منظم معیشت میں چونکہ تقسیم دولت کی نگرانی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جب تقسیم دولت انصاف پر مبنی ہوتی ہے تو صنعتی ترقی کی برائیوں کا چونکہ سدباب کیا جا سکتا ہے اس لئے ہندوستان کی قومی تنظیم میں تقسیم دولت کی ایک مناسب اسکیم نہایت لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

صنعتی وزرا کی دہلی کی کانفرنس میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اور جس کی وجہ سے قومی تنظیمی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے اس میں کمیٹی کو صنعتوں کو ترقی دینے کی نہایت واضح طور پر ہدایت کی گئی ہے اور وزنی کلیدی صنعتوں، اوسط پیمانہ کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کا مطالبہ

کیا گیا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کے صدہا تحقیقات اسی بات پر شتمل ہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کانگریس نے اپنی بنیادی حقوق کی قرارداد میں اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ "ریاست کلیدی صنعتوں اور خدمتوں، معدنی وسائل، ریلوں، آبی راہوں، جہاز رانی اور پبلک نقل وحمل کے دوسرے ذرائع کی یا خود مالک ہوگی یا ان کی نگرانی کرے گی۔"

قومی معیشت کی تنظیم کا خاص مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے قومی خود کفالت کو حاصل کیا جائے نہ یہ کہ بیرونی منڈیوں کے لئے قومی معیشت کو ترقی دی جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بین الاقوامی تجارت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اس کی تو ضرور حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے لیکن اس طرح پر کہ معاشی سامراج سے محفوظ رہ سکیں۔ ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ملکی ضرورتوں کے لئے غذا، کچا مال اور مصنوعہ اشیا کی رسد مہیا کی جائے البتہ زائد پیداوار کی نکاسی کے لئے راستے ڈھونڈے جا سکتے ہیں تاکہ ہندوستان کی بین الاقوامی قرضوں کا بھگتان کیا جا سکے۔

ہمیں جس بنیادی مقصد کو سامنے رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے لئے ایک مناسب معیار زندگی یقینی طور پر حاصل کیا جائے۔ مناسب معیار زندگی میں کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ آرام اور آسایش کا ایک اضافہ پذیر حصہ بھی شامل ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کے لئے معاشیات کے ماہروں نے کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے روپیہ کی موجودہ قیمت کے ساتھ پندرہ روپیہ ماہوار سے لے کر پچیس روپیہ ماہوار تک کی رقم کا تخمینہ کیا ہے۔ لوگوں کی کم ترین احتیاجات کو رقموں کی شکل میں محض سہولت کے خیال سے ظاہر کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً ان کا اظہار اشیاء اور خدمات کی شکل میں کرنا چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی سالانہ فی کس آمدنی کے اوسط کا تخمینہ پچیس یا تیس روپے کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف غذا بلکہ انسانی زندگی کی اور دوسری لازمی ضرورتیں بھی اس آمدنی کے ذریعہ پوری نہیں کی جا سکتیں۔ اس لئے آئندہ دس سالوں میں ہر شخص کے لئے کم ترین معیار زندگی

کو حاصل کرنے کے واسطے قومی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اس کمترین معیار کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف پیدائش دولت کو بڑھانا ہوگا بلکہ تقسیم دولت کو بھی زیادہ منصفانہ طریقہ پر تنظیم دینا ہوگا۔

ایک حقیقی ترقی پذیر معیار زندگی کے لئے تو ہمیں قومی دولت کو پانچ یا چھ گنا زیادہ کرنا ہوگا لیکن فی الحال آئندہ دس سالوں میں کم ترین معیار زندگی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں آمدنی کو دوگنا تین گنا بڑھانا پڑے گا اور ہمیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اپنی تنظیم کے کام کو شروع کرنا چاہئے۔

منظم ترقی کو چند معروضی طریقوں سے جانچا جا سکتا ہے جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(I) غذا میں ترقی پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات (اور دوسری ضروری مدافعتی غذاؤں) کے کم ترین معیار کو سامنے رکھ کر جس کی قوت حرارت ایک بالغ کام کرنے والے کے لئے ۲۶سو تا ۲۸سو کیلاریز ہونا چاہیئے۔

(II) کپڑے کی ترقی موجودہ ۱۵ گز فی کس سالانہ کے مقابلہ میں ۳۰ گز فی کس سالانہ تک

(III) مکان کے معیار کو کم از کم سو مربع فیٹ فی کس تک پہنچنا چاہیئے۔

دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ترقی کے ناپنے کے دوسرے حسب ذیل پیمانے مقرر کئے جا سکتے ہیں:۔

(I) زرعی پیداوار میں اضافہ
(II) صنعتی پیداوار میں اضافہ
} کم از کم اتنا اضافہ کہ جس کے ذریعہ اوپر کے درج کئے ہوئے غذا اور کپڑے کے کم ترین معیار کو حاصل کیا جا سکے۔

(III) بے روزگاری میں کمی

(IV) فی کس آمدنی میں اضافہ

(V) ناخواندگی میں کمی

(VI) پبلک کے فائدے کی خدمات میں اضافہ

(VII) طبی امداد کی فراہمی اس معیار کے مطابق کہ ایک ہزار کی آبادی کے لئے ایک شفاخانہ

قائم ہو جائے۔

(viii) زندگی کی اوسطاً جو توقع کی جاتی ہے اس میں اضافہ۔

پلین کی تکمیل کو وقتاً فوقتاً ناپنے کے لئے اعداد و شمار کا جمع کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اعداد و شمار کے جمع کرنے کے کام میں بھی ترقی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔

پلین کے مختلف شعبوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا بہت لازمی ہے تنظیم کا راز یہ ہے کہ ترقی کا سلسلہ ہر محاذ پر جاری رکھا جائے۔ زراعت کی تنظیم اس لئے ہو کہ اشیاء غذا کے معاملہ میں ان معیاروں کے مطابق جنھیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے ملک اپنی ضرورتوں کی خود کفالت کر سکے۔ اسی طرح اشیاء خام کو بھی پہلے سے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق پیدا کیا جائے۔ زمین کی زرخیزی کا تحفظ، جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا، گھاس کی زمینوں کا انتظام سیلاب کی نگرانی، دریاؤں کا انتظام، اور اندرون ملک کے دریائی نقل و حمل کی اصلاح، مویشیوں اور چارے کی ترقی یہ منظم پروگرام کے چند ایسے عنوانات ہیں جن کو باقاعدگی کے ساتھ ابھی تک شروع نہیں کیا گیا ہے۔ قوت محرکہ کی ترقی اور صنعتی قوت محرکہ کے لئے کوئلہ اور دوسرے قسم کے ایندھنوں کا تحفظ بھی تنظیم کا محتاج ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم مختلف قسم کی صنعتوں مثلاً بڑے اور اوسط پیمانہ کی اور گھریلو صنعتوں کی تنظیم ہے کہ صرف ان کے ذریعہ سے ہی زمین کے موجودہ دباؤ کو موثر طریقہ پر کم کیا جا سکتا ہے۔ مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ دس سال کے اندر اندر ایک ایسا متوازن معاشی نظام پیدا ہو جائے جس میں تقریباً نصف آبادی زراعت پر انحصار کرے۔ پھر تنظیم کے پروگرام میں عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم اور ترقی میں امداد دینے والی تحقیقات علمی بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سرکاری خدمات کے مقام اور منظیم کو بھی اس پلین کی ضرورتوں کا پابند ہونا چاہیئے۔

اگر معاشی ترقی کے مقابلہ میں آبادی کے اضافہ کی شرح زیادہ رہی تو تنظیم کی کوئی کوشش

مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ ہندوستان کی منظم معیشت میں آبادی کو اس لئے قصداً نہیں بڑھایا جائے گا تاکہ زائد آبادی کو دوسرے ملکوں میں بسنے کے لئے روانہ کیا جا سکے بلکہ جو زائد آبادی فی الواقعی موجود ہو گی اسے معاہدوں کے ذریعہ ترک سکونت کی اجازت دی جائے گی لیکن اس کا خیال رکھا جائے گا کہ نئے علاقوں میں ان مہاجرین کے حقوق کا مناسب تحفظ کیا جائے۔

اس پلین کی تکمیل کے لئے دس سال کی میعاد مقرر کرنا چاہیئے اور مختلف زمانوں اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی کے نگرانی کے لئے درمیانی زمانہ کے معیاروں (CONTROL FIGURES) کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے۔

مدافعت کی صنعتوں[1] کی ملکیت اور نگرانی ریاست کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ پبلک کے فائدہ کی صنعتوں[2] پر بھی ریاست کی ملکیت یا نگرانی ہو سکتی ہے لیکن اس رائے کو سختی سے رکھنے والے لوگ بھی ہیں جو ہر حال میں پبلک کے فائدہ کی صنعتوں پر ریاست کی ملکیت قائم کرانے کے حامی ہیں۔ دوسری کلیدی صنعتوں[3] پر بھی حکومت کی ملکیت یا نگرانی ہونا چاہیئے۔

جب دوسرے حالات (مثلاً اشیاء خام اور وسائل کی موجودگی اور صرف کرنے والے مرکزوں سے قرب) یکساں ہوں تو پلین میں صنعتی حیثیت سے پس ماندہ علاقوں کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف صنعتوں کو تقسیم کرنے کی سفارش کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر صوبہ اور ریاست کو جہاں تک ہو سکے اپنے کچے مال سے فائدہ اٹھانے، اپنے مزدوروں کے لئے روزگار فراہم کرنے اور اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کا پورا موقع ملے۔

مزدوروں کے بارے میں قواعد اور ضوابط تندرستی بیماری اور بے روزگاری کے بیموں

---

[1] [2] [3] مدافعت کی صنعتوں، پبلک کے فائدہ کی صنعتوں اور کلیدی صنعتوں کی فہرست اس مضمون کے خاتمہ پر ضمیمہ نمبر (ب) میں درج کی گئی ہے۔

قوم کے لئے مکانات کی فراہمی اور معاشرتی فلاح کی دوسری اسکیموں میں بھی پلین کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں اور ریاستوں کی طرف سے ان کی ابتدا کی جائے گی لیکن قومی تنظیم کے کمیشن کی طرف سے اجرتوں اور مزدوروں کو روزگار سے لگانے کے سلسلہ میں کم ترین معیاروں کو مقرر کر کے ایک عام طرزِ عمل کا تعین کر دیا جائے گا۔

مختلف صوبوں میں سرمایہ کے وسائل اور صنعتی تجربوں اور ابتدائی کاموں کے شروع کرنے کی اہلیت کے اعتبار سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ قومی تنظیمی کمیشن اور ان کے متعلقہ شعبوں کی معرفت اپنے کام کرائیں۔

جہاں تک عام منظم معاشی ترقی کے لئے مالی ذرایع اور وسائل کے فراہم کرنے کا تعلق ہے صوبہ اور مرکزی حکومتوں کے اعتبار سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ملک کی ساہوکارے اور بیمہ کے اداروں کے روپیہ لگانے کی پالیسی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہیں جن سے صنعتی تنظیم کو ترقی دی جا سکے۔

منظم معیشت کی مکمل اسکیم کا بنانا ایک بہت بڑا کام ہے جس کے لئے مکمل معلومات، اعداد و شمار اور فنی ماہروں، صنعتی تاجروں، منتظموں اور عام پبلک کے اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے اس اسکیم کو ترقی پذیر ہونا چاہیئے۔ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرتے رہنا چاہیئے اور عملی کارروائی کے دوران میں جو تجربے حاصل ہوں ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیئے یہ ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ قومی تنظیمی کمیٹی اس طرح کی مکمل اسکیم کے بنانے سے قاصر ہے اور نہ وہ اس منزل پر اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ اس وقت جس کام کے کرنے کا ارادہ ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منظم معیشت کی ایک ایسی بنیاد رکھ دی جائے جس پر آئندہ عمارت تعمیر کی جا سکے لیکن اس منزل پر بھی پوری تصویر کے خاکہ کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ بعد میں جب موقع ملے اور وسائل بہم ہو جائیں تو اس تصویر کو مکمل کیا جا سکے۔ ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جن کے حدود کے اندر ایک منظم نظام کی تعمیر کے تقریباً پورے وسائل

موجود ہیں۔

اس لئے کمیٹی کا ارادہ ہے کہ جو اعداد و شمار موجود ہیں یا جو آسانی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں ان کی مدد سے تصویر کا ایک عام خاکہ تیار کرے۔ امید یہ ہے کہ آئندہ سال کے شروع میں ایک ابتدائی رپورٹ پیش کی جا سکے گی۔ جسے تنظیم کی دوسری منزلوں کی بنیاد بنایا جا سکے گا۔

قومی تنظیم کی اسکیم کا ایک خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ (الف) قومی معاشی تنظیم کی اسکیم کا خاکہ

(۱) زمین کی تنظیم

زمین کی زرخیزی کا تحفظ۔ جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا اور گھاس کی زمینوں کا انتظام۔ آبادی، غذا اور فصلوں کی تنظیم۔ صوبہ کے درمیان نقل سکونت اور دوبارہ بستی بسانا۔ مویشیوں کی ترقی، مقامی نسلوں کی ترقی اور معاشی حیثیت سے غیر فائدہ بخش نسلوں کا ختم کر دینا۔

(۲) پانی کی تنظیم

سیلاب کی نگرانی اور دریاؤں کا انتظام۔ نہروں کا بنانا اور آبپاشی کی ترقی۔ ملک کے اندر دریائی سفر کی ترقی۔ سمندری اور اندرون ملک کے ماہی گیری کے مرکزوں کی ترقی۔ خشک دریاؤں اور آبی راہوں کو دوبارہ ترقی دینا۔

(۳) قومی وسائل کی تنظیم

قوت محرکہ اور ایندھن کی ترقی (جس میں آبی بجلی کی ترقی اور کوئلہ یا دوسرے قسم کے ایندھن کو صنعتی قوت محرکہ یا متحدہ صنعتوں کے لئے ترقی دینا بھی شامل ہے)۔ ہر قسم کے کچے مال کو (جس میں جنگل کی پیداواریں بھی شامل ہیں) دریافت کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا، معدنی وسائل سے فائدہ اٹھانا۔

(۴) مزدوروں کی تنظیم

مزدوروں کے لئے ضوابط اور قانون سازی، مزدوروں کی تنظیم۔ تندرستی، بیماری اور بے

روزگاری کا بیمہ، مکانوں کی فراہمی اور جماعتی بہبود کی کوششیں۔

(۵) زرعی تنظیم

بیجوں، کھادوں، اوزاروں اور کھیتی کرنے کے طریقوں میں اصلاح۔ کھیتی میں امداد باہمی اور اگر ضرورت ہو تو ان کی اشتمالی اصول پر تنظیم دیہات کے نقل و حمل اور طریقہ خرید و فروخت میں جس کے ساتھ دیہی اعتبار بھی منسلک ہے اصلاح۔ قرض میں کمی کرنا اور زرعی ساہوکارے کی نگرانی زمین کے معاملہ اور ترکہ کے قوانین پر نظر ثانی۔ زراعت سے متعلق خانگی صنعتیں اور ضمنی پیشے۔

(۶) صنعتی تنظیم

کلیدی اور بنیادی صنعتوں کی ترقی (کیمیاوی، معدنی اور دھات سازی کی صنعتیں، مشینیں مشین کے اوزار اور قوت محرکہ فراہم کرنے والے انجن)۔ ہلکی صنعتوں کی ترقی۔ زرعی صنعتوں کی ترقی۔ بڑی منظم صنعتوں کو عقل کے مطابق تنظیم دینا تاکہ اندرونی مقابلہ کا تدارک ہوسکے اور بڑے پیمانہ اور چھوٹے پیمانہ اور دستکاری کی صنعتوں میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکے۔ مختلف صوبوں کی صنعتی پالیسی میں کچے مال، کم ترین اجرتوں اور مزدوروں کے ملازم رکھنے کے معیاروں میں یکجہتی پیدا کرنا۔

(۷) تجارتی تنظیم

امتیازی تحفظ کی پالیسی پر عمل درآمد۔ زراعت کے خاص فائدہ کے لئے باہمی فائدہ کے معاہدے۔

(۸) اعتبار کی تنظیم

زر کی پالیسی میں تنظیم۔ مختلف اعتبار کی ایجنسیوں میں مرکزی نگرانی کے ماتحت ہم آہنگی اور یکجہتی۔ زراعت کے لئے طویل مدت کے اعتبار کی تنظیم۔ صنعتی بنک کاری کی ترقی۔

(۹) مالیات کی تنظیم

محصول کے بار کی ایسی نظر ثانی جس سے دیہی عوام کو فائدہ پہنچے۔ زمین کی معاملہ کی پالیسی پر نظر ثانی۔ دیہی جماعتی فلاح کے مختلف کاموں پر خرچ (اس میں اندرونی وسائل آمد و رفت، بہم رسانی

آب، صفائی اور دیہات کے لئے مکانوں فراہم کرنے کی اسکیم شامل ہے)

(۱۰) تعلیم کی تنظیم

زراعتی تعلیم اور پروپیگنڈا۔ مختلف درجوں کی فنی تعلیم جس میں کارکنوں کی تعلیم بھی شامل ہے

صنعت اور ترقی کے لئے تحقیقات علمی۔

ضمیمہ (ب)

مدافعتی صنعتوں، کلیدی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کی فہرست

مدافعتی صنعتیں

۱۔ آتشیں ہتھیار (زمین، ہوا اور سمندر کے) اور ان کے حصے
۲۔ گولہ بارود، کارتوس، آتشگیر سامان، شیلس، تارپیڈو وغیرہ
۳۔ ٹینک اور مسلح کاریں اور فوجی ضرورت کے لئے دوسرے مشین لگے ہوئے سامان
۴۔ ہر نمونہ کے جنگی جہاز جن میں آب دوز کشتیاں بھی شامل ہیں۔
۵۔ ہر قسم کے جنگی ہوائی جہاز
۶۔ جنگ کے لئے ہوائی گیسیں اور گیس کے نقاب

(نوٹ، جنگی جہاز اور جنگی ہوائی جہاز امن کے زمانہ کے کارخانوں میں بھی بنائے جاسکتے ہیں

کلیدی صنعتیں

۱۔ قوت محرکہ آبی اور حرارت کی
۲۔ ایندھن، کوئلہ اور لکڑی کا ایندھن، معدنی تیل، قوت محرکہ کے لئے کام آنے والا الکوہل، قدرتی گیسیں۔
۳۔ دھاتیں لوہے اور غیر لوہے والی جس میں ان سے خام دھات حاصل کرنا بھی شامل ہے
۴۔ مشین کے اوزار بنانے والی صنعتیں
۵۔ مشین اور مشین کے حصے بنانے والی صنعتیں
۶۔ جہازوں، ریلوں، واگنوں، موٹروں، ہوائی جہازوں وغیرہ کی بنانے والی انجینیری کی وزنی صنعتیں
۷۔ اوزار اور آلات۔ تجارتی صنعتی، علمی
۸۔ کیمیادی، وزنی کیمیادی، باریک کیمیادی جس میں رنگ بھی شامل ہیں، زمین کو زرخیز کرنے

والے مسالے کی صنعتیں ۔

پبلک فائدہ کی صنعتیں

۱۔ بجلی، گیس اور دوسرے قسم کی قوت کو تقسیم کرنے والی صنعتیں

۲۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل کے سلسلہ میں پبلک کی خدمت کرنے والی صنعتیں

۳۔ بہم رسانی آب

۴۔ صفائی

بنک کاری اور بیمہ پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

(نوٹ) اوپر جو فہرستیں درج کی گئی ہے یہ صرف عارضی ہیں ان میں آئندہ اضافہ اور تبدیلی ہو سکتی ہے۔

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ دہلی)

بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں میں اور ان ابتدائی مدرسوں میں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے مطابق تعلیم ہو رہی ہے یہ سوال تمام پڑھانے والوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر استادوں نے اس کا حل بھی سوچا ہے لیکن انھیں ابھی شبہ ہے کہ جو طریقہ ان کی سمجھ میں آیا ہے وہ موثر اور نتیجہ خیز بھی ہے یا نہیں۔ ابتدائی مدرسہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تو ہمارا کام کسی نہ کسی طریقہ سے چل ہی جائے گا اور اگر کہیں مضامین کا براہ راست کسی حرفہ سے تعلق نہ بھی ہوگا تو کام میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوگی لیکن استادوں کے مدرسوں میں جہاں اکثر خود سوچنے والے اساتذہ بھی ہوتے ہیں ہمارا اچھا لائحہ عمل ہی ان کی تشفی کر سکے گا۔

نئی تعلیم میں اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کا سوال تو بہت بعد میں آئے گا۔ اس کے لئے تو ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی لیکن حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی تعلیم کا سوال تو پہلے ہی دن سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس تعلیم کے نئے پن نے ملک کے قابل لوگوں کا رخ بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں کی طرف کر دیا ہے اور جو لوگ ان ٹرننگ اسکولوں کے ذمہ دار ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مدرسوں میں آنے والے اساتذہ پہلے ہی دن سے اس چیز کے معلوم کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ان کو وہ باتیں معلوم ہو جائیں جن سے وہ حرفہ سے مضامین کے مربوط کر کے پڑھانے کی طریقوں سے واقف ہو سکیں۔ لہذا یہ سوال اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم کی دو ہی خوبیاں ملک کے لوگوں کو بہت بھائی ہیں ایک تو اس کا اپنا خرچ آپ برداشت کرنا دوسرے بچے کی مکمل تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہونا۔ ملک کے قابل سے قابل لوگوں نے

اس کی ان دونوں خوبیوں کو اب تک سراہا ہے اور جن مدرسوں میں بنیادی قومی تعلیم کا نصاب پڑھایا جا رہا ہے وہاں روزانہ اس بات کے دیکھنے کے لئے لوگ آتے رہتے ہیں اور ہمارے کام سے زیادہ ہماری گفتگو سے تشفی پاتے ہیں لیکن اس بات کا عرصہ تک جاری رہنا خود اس اسکیم کے لئے بہت مضر ہے۔ اس اسکیم کا جو کچھ خاکہ ہمارے ذہنوں میں ہے اور جس کو ہم ان مہمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کی تشفی کرتے ہیں اس کو اب عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔ اس سے ایک طرف تو ہم ان مدرسین کی تشفی کر سکیں گے اور دوسری طرف اس اسکیم کے بہی خواہوں کی بات رکھ سکیں گے۔

ہم نے اپنے مدرسہ میں حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی پڑھائی کا تجربہ کیا اس دوران میں اس کے نئے نئے طریقوں پر غور کرنے اور آزمانے کا برابر موقعہ ملتا رہا۔ ان مواقع کو میں نے اپنی رپورٹ "گتے کے کام سے مضامین کا ربط" میں درج کر کے شائع کر دیا ہے اور ہم نے جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تجربہ کیا ہے وہ بھی "بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟" کے عنوان سے رسالہ جامعہ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں ان اساتذہ کو جو بچوں کے ساتھ اس قسم کے تجربہ میں جگہ بہ جگہ لگے ہوئے ہیں اپنے تجربوں کو قلم بند کر کے رسالوں اور اخباروں میں شائع کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ اگر تجربوں میں غلطی ہوگی تو ہم اس سے بھی سیکھیں گے۔ اگر ہمارے پہلے تجربہ کا نتیجہ غلط ہوگا تو ہم دوسرا بہتر طریقہ سوچ کر اختیار کریں گے اور اس غور و فکر سے بہتر راستہ نکال سکیں گے۔ نئے کام میں پہلے پہل اچھے نتائج دیکھنے میں نہیں آتے لیکن وہ ہمیں ایسے طریقوں کے سوچنے میں ضرور مدد دیتے ہیں جن سے اچھے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ایک سال کے اندر کارڈ بورڈ کو بطور حرفہ قرار دے کر مربوط پڑھائی کا جو کچھ تجربہ ہم نے کیا اس کو ہم نے کتابی شکل میں شائع کر دیا بغیر اس پس و پیش کے کہ یہ غلط ہے یا صحیح نئے کام میں جب تک کوئی کیا ہوا تجربہ ہمارے سامنے نہ ہو ہم اس کے حسن و قبیح پر کس طرح غور کر سکتے ہیں؟ اگر کارڈ بورڈ کے کام پر کئی تجربے ہمارے سامنے ہوں تو ہم مربوط پڑھائی کے بہترین طریقے پیش کر سکتے ہیں پھر بھی ہم اس تجربہ کے بعد ایک ایسا خاکہ پیش کرتے ہیں جو لوگوں کے لئے تھوڑی ترمیم کے بعد مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

کارڈ بورڈ کے کام میں کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانا اصل دھندا تھا لیکن اس بڑے کام میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے بامقصد کام کرنے پڑے، جن کا کرنا اس بڑے کام کے ضمن میں ضروری تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے عملی کام اس بڑے کام کے کرانے میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں کبھی ارادی طور پر کبھی غیر ارادی طور پر اور کبھی بچوں کے سوالات کرنے کے دوران میں مثلاً

(۱) بازار جاکر کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا۔

(۲) کاغذ اور کارڈ بورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

(۳) لیئی پکانا

(۴) شہر کی ان دوکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈ بورڈ سے لوگ مختلف چیزیں بناتے ہیں

(۵) تیل اور لیئی کی ابری بنانا

(۶) ہاتھ سے کاغذ بنتے ہوئے دیکھنا

(۷) خود ہاتھ سے کاغذ تیار کرنا

(۸) شہر کے لوگ کارڈ بورڈ سے جو چیزیں تیار کرتے ہیں وہ کس کام میں استعمال ہوتی ہیں ؟

(۹) جو ماڈل بچے بناتے ہیں وہ کس کس کام میں استعمال ہوتے ہیں

(۱۰) چیزوں کے بیچنے کا انتظام کرنا۔

(۱۱) کارڈ بورڈ کے کام میں جو اوزار اور چیزیں استعمال ہوئی ہیں ان کو کن کن لوگوں نے تیار کرکے ہماری ضرورت کے لئے مہیا کیا ہے ؟

(۱۲) کارڈ بورڈ اور کاغذ جن چیزوں سے بنتا ہے ان کی پیداوار کا مشاہدہ کرنا

یہ چند ان کاموں کی فہرست ہے جن میں بچوں کو عملاً کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اس قسم کے عملی کاموں کے علاوہ چند مسائل بھی کام کرنے کے دوران میں بچوں کے سامنے آتے ہیں مثلاً

(۱) کاغذ سب سے پہلے کہاں کہاں بننا شروع ہوا ؟ کس طرح شروع ہوا ؟

(۲) دوسرے ملکوں میں کس طرح کن کن لوگوں کے ذریعہ پھیلا۔ اس کی ترقی میں کن ممالک

کے حکمرانوں اور لوگوں نے مدد کی ؟

(۳) کاغذ کی ایجاد سے دوسری کون کون سی چیزیں ایجاد ہوئیں ؟

(۴) کاغذ یا کارڈبورڈ کن کن چیزوں سے بنتا ہے ؟ وہ چیزیں ملک کے کس کس حصہ میں پیدا ہوتی ہیں ؟ اس کے لیے کس قسم کی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے ؟ آب و ہوا کا اثر انسان پر کیا ہوتا ہے ؟

(۵) کس کس قسم کا کاغذ ہندوستان کے باہر سے آتا ہے اور کن ممالک سے ؟ ہندستانی کارڈبورڈ کے علاوہ باہر سے کہاں کہاں سے کارڈبورڈ آتا ہے ؟

(۶) ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں کیسے جاتی ہیں ؟

(۷) ہم کن کن چیزوں میں کاغذ استعمال کرتے ہیں ؟

عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے چند ہی عنوانات میں نے لکھے ہیں لیکن کام کرانے کے دوران میں کام کی وسعت اس قدر ہو جاتی ہے کہ اس میں زیادہ عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے ۔ میں نے چند باتیں اس لئے لکھی ہیں تاکہ میں ربط کے امکانات کو مضامین کے عنوانات کے تحت ظاہر کر سکوں یہ وہ SITUATIONS مواقع ہیں جہاں مضامین کے مربوط کرنے کا امکان صاف طور پر نظر آتا ہے اور یہی مواقع ہمارے لئے مربوط پڑھائی کا راستہ کھول سکتے ہیں ۔ کام کرانے والوں کو دستی کام میں اس قسم کے مواقع کی تلاش خاص طور پر کرنی چاہیئے پھر یہ بات خود سمجھ میں آنے لگے گی کہ ان مواقع پر زبان، حساب، سماج کے علم اور جنرل سائنس کے کون کون سے اسباق، بچوں کو پڑھائے جائیں ؟

آیئے پہلے عملی کاموں کی فہرست سے شروع کریں اور دیکھیں کہ ان کاموں کے کرانے میں کن کن مضامین کے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے ۔

(۱) بازار جا کر کارڈبورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا

طریقہ کار : اس سامان میں مختلف کاغذ رنگین اور سادے کارڈبورڈ، چاقو، قینچی، گنیا، فٹ رول

پنسل، چمڑا، کپڑا وغیرہ چیزیں شامل ہوں گی۔ سامان کی خریداری میں لازمی طور پر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھنا اور بھاؤ معلوم کرنا چاہیے۔ زندگی میں چیزوں کی خریداری میں جو صورتیں پڑتی جاتی ہیں اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کو زندگی کے لئے صحیح طور پر تیار کریں تو ہمیں ان کے لئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ بچوں کے لئے خود سامان مہیا کر دینے سے بچوں میں RESOURCEFULNESS نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر بچے خود جا کر اپنے کام کے مطابق چیزیں خریدیں گے تو وہ اس چیز کی عملی تعلیم حاصل کریں گے کہ چیزوں کے اصل نرخ کیا ہیں اور کون سی چیز کس بازار میں دستیاب ہوتی ہے؟ جغرافیہ کی موجودہ تعلیم دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں سے تو ہمیں واقف کرا دیتی ہے لیکن ہمیں خود اپنے شہر کی منڈیوں کا علم بالکل نہیں ہوتا۔

استاد کے لئے ساری جماعت کا لے جانا مناسب نہ ہوگا بلکہ بچوں کی اس بارے میں رہنمائی کی جائے کہ وہ اپنی جماعت سے پسند طلبا کو منتخب کریں جو جا کر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھیں اور نرخ معلوم کر کے اپنی رپورٹ مرتب کر کے جماعت کے سامنے پیش کریں رپورٹ کا خاکہ بھی خود بچوں کو استاد کی رہنمائی میں جماعت میں طے کرنا چاہیے۔ مثلاً چیزوں کی کتنی اقسام ہیں مختلف اقسام میں کون کون سے فرق نمایاں ہیں؟ کس طرح بکتی ہیں (من کے حساب، یا پونڈ کے حساب یا رم کے حساب یا فی عدد وغیرہ) کیا کیا نرخ ہیں؟ کہاں کہاں سے آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ چیزوں کی فہرست طویل ہوگی اس لئے کئی کمیٹیاں بنانی چاہئیں۔ اگر دکانوں پر تمام باتیں نہ معلوم ہو سکیں تو کتابوں سے معلوم کرنا چاہیے (اس انداز پر کتابیں ابھی نہیں لکھی گئی ہیں) ورنہ استاد اپنی معلومات سے بچوں کو رپورٹ مرتب کرنے میں مدد دے۔ (اس طرح کام کرانے سے جو ذہنی اثرات مرتب ہوں گے ان کا تذکرہ کسی دوسرے مضمون میں کروں گا)

اگر استاد دیکھے کہ کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام بہت زیادہ ہوگا تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے لئے ایک بڑی کمیٹی کے بنانے کی طرف بچوں کی رہنمائی کرے۔ اس بڑی کمیٹی کی کئی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ مثلاً کاغذ اور کارڈ بورڈ کے متعلق دریافت کرنے کا کام یقیناً بہت

زیادہ ہوگا۔ مختلف رنگ مختلف قسم اور مختلف سائز کے کاغذات مختلف ممالک سے آتے ہیں سادے فل اسکیپ کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۶ پونڈ تک ہوتے ہیں' لائن دار کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۴ پونڈ تک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کارڈ بورڈ ہندوستان کے علاوہ جاپان اور ہالینڈ سے بھی منگایا جاتا ہے۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ کے کئی کارخانے ہندوستان میں بھی ہیں۔

اگر ان باتوں کو مضامین اور اسباق کے تحت تقسیم کرکے دیکھا جائے تو ذیل کی باتیں صاف طور پر تبلائی جا سکتی ہیں،

زبان | مختلف دوکان داروں کے نام کمیٹیوں کا خط لکھنا کہ وہ انھیں اپنی دوکان پر آنے اور چیزوں کی متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دیں (تمام طلبا خط لکھیں جو اچھا ہو وہ بھیجا جائے۔ ایک خط کمیٹی کے فائل میں رہے) دکانیں دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا۔ خط لکھنے کے متعلق کوئی مضمون پڑھنا جس سے یہ معلوم ہو کہ خطوط کن باتوں کے متعلق لکھے جاتے ہیں اور ان کے لکھنے کا کیا کیا ڈھنگ ہوتا ہے نمونہ کے خطوط جماعت میں پڑھ کر سنانا۔ نمونہ کے خطوط جماعت میں لکھ کر آویزاں کرنا۔ خطوط کا کوئی معیار طے کرنا۔ کمیٹیوں کا رپورٹ مرتب کرنے کے لئے' جماعت کی رائے اور استاد کے مشورہ سے خاکہ تیار کرنا۔ کمیٹیوں کا اپنی اپنی رپورٹیں جماعت کے سامنے پیش کرنا۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہو تو استاد کے مشورہ سے اس کو شامل کرنا یا ایسی باتوں کو صحیح کرکے لکھنا جو غلط معلوم ہوتی ہوں۔ رپورٹوں کے مرتب کرنے کے دوران میں ان چیزوں کے متعلق کتابوں' رسالوں اور اخباروں سے بھی پڑھنا۔ رپورٹ کا اپنے قلمی رسالہ میں شایع کرنا

حساب | مختلف چیزوں کے نرخ کا چارٹ تیار کرنا۔ مثلاً جاپانی گتا کتنے من بکتا ہے؟ ہندوستانی اور ہالینڈ کا گتا کس حساب سے بکتا ہے؟ گرس' رم' کوڑی' کے پیمانے لکھ کر آویزاں کرنا۔ ہندوستانی تول اور انگریزی تول کے پیمانے لکھ کر جماعت میں لگانا۔ پیمائش کے پیمانہ لکھنا۔ ابتدائی جماعتوں میں جمع' تفریق' ضرب اور تقسیم کے سادے اور مرکب قاعدوں کی مشق کے لئے چیزوں کی خریداری کے سلسلہ میں سوالات مرتب کرنا اور بڑی جماعتوں میں حساب تجارت اور اکائی کے طریقوں سے

قیمت کا پھیلانا۔

سماج کا علم | ہندوستان کے نقشہ پر ان شہروں کا درج کرنا جہاں کاغذ اور کارڈ بورڈ کے مل ہیں ان شہروں کا درج کرنا جہاں چاقو اور قینچیاں تیار ہوتی ہیں۔ ان شہروں کا لکھنا جہاں ہاتھ سے کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے نقشہ پر ان ممالک کا درج کرنا جہاں سے ہندوستان میں کاغذ آتا ہے۔ ان ملکوں کی بابت کتابوں سے پڑھنا ذرایع آمد و رفت کے متعلق پڑھنا۔ رسل و رسائل کے طریقوں کا معلوم کرنا۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں کے لئے کیوں چیزیں تیار کرتے ہیں؟ ہندوستان میں ہندوستان کی ضروریات کے مطابق کاغذ کیوں نہیں تیار ہوتا؟

(۲)، کاغذ اور کارڈ بورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

طریقہ کار | ہندوستان میں ابھی اتنے کارخانے قائم نہیں ہوئے ہیں کہ مدرسوں کو کہیں قریب ہی اس قسم کے کارخانوں کے دیکھنے کا موقعہ مل سکے۔ لیکن اگر کہیں قریب ہی اس قسم کا کوئی کارخانہ ہو تو جماعت کو آپس میں مشورہ کرکے طے کرنا چاہیئے کہ وہ کارخانوں میں جا کر کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ تمام کارخانوں میں یہ دقت ہوتی ہے کہ بچوں کو کارخانہ دیکھنے کے لئے اندر نہیں جانے دیتے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا ہے کہ بچے اندر نہیں جا سکتے۔ غالبًا بچے مشینوں کی دیکھ بھال میں بالکل محو ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ مشینوں سے بچ کر دیکھنے کا خیال جاتا رہتا ہے اور اس طرح حادثات ہو جاتے ہیں لیکن اگر استاد ذمہ داری لے تو غالبًا اجازت مل جاتی ہے استاد کو تھوڑے تھوڑے لڑکوں کو کارخانے میں لے جا کر چیزیں دکھلانا چاہیئے تاکہ بچے مشینوں سے بچ کر تمام باتوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ بننے کا پورا طریقہ اس طرح سمجھانا چاہیئے کہ بچے بعد کو اس کو قلم بند کر سکیں۔ پاور ہاؤس اور اس کے مال کا مشاہدہ خاص طور پر کرنا چاہیئے جس سے کاغذ یا گتا تیار ہوتا ہے کارخانوں میں مزدوروں کی زندگی کا مشاہدہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے تقسیم کار کی منظم مثال کی طرف بچوں کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانی چاہیئے۔

زبان | کارخانہ دیکھنے کے لئے اجازت حاصل کرنا۔ اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواست لکھنا

درخواست میں لکھنا کہ کیا کیا باتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ کارخانہ دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا اور رپورٹ مرتب کرنا۔ رپورٹ کا رسالہ میں شائع کرنا۔ کارخانوں کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ کارخانہ کی تاریخ کے متعلق پڑھنا۔ سفر کے حالات لکھ کر رسالہ میں شائع کرنا۔ ریل پر نظمیں پڑھنا

حساب | اگر سفر ریل کے ذریعہ کیا گیا ہو تو کرایہ خوراک تانگہ اور قلی وغیرہ کا حساب کرنا۔ مختلف درجوں کا کرایہ ریل معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل۔ آمد و خرچ کا بجٹ بنانا۔ آمد و خرچ کا حساب رکھنا۔ آمد و خرچ کا حساب رسالہ میں شائع کرنا۔ اگر سفر لاری کے ذریعہ کیا گیا ہو تب بھی کرایہ خوراک اور رہائش کا حساب معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل بذریعہ لاری معلوم کرنا۔ پٹرول کی قیمت فی گیلن معلوم کرنا گیلن کا پیمانہ لکھ کر جماعت میں آویزاں کرنا۔ ایک گیلن پٹرول میں کار اور لاری کتنے کتنے میل جاتی ہیں؟ ٹائم ٹیبل دیکھنا سیکھنا ٹائم ٹیبل بنانا۔ ریل کی رفتار کے سوالات اکائی سے کرنا۔

سماج کا علم | پٹرول کہاں کہاں نکلتا ہے؟۔ دنیا میں کوئلہ کہاں کہاں نکالا جاتا ہے؟ انجن، موٹر اور بجلی کے ایجاد کرنے والے کون تھے؟ ان کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ ریل، موٹر اور بجلی کی ایجاد سے دنیا کو کتنا فائدہ ہوا؟ مزدور گاؤں چھوڑ کر ملوں میں کام کرنے کیوں جاتے ہیں؟ کارخانہ دار اور مل کے مالک مزدوروں کے لئے کیا کیا کرتے ہیں؟ جو کچھ وہ کرتے ہیں کیا وہ کافی ہے؟ مزدوروں کی تحریکیں اور ان کے چلانے والے۔ کسانوں کی تحریکیں ان کے مقاصد اور چلانے والے ملوں اور کارخانوں میں حادثات کی روک تھام کس طرح کی جاتی ہے۔ مزدوروں کی تندرستی اور صحت کے لئے اور کیا کیا انتظامات ہیں؟ جن جن چیزوں سے کاغذ تیار ہوتا ہے وہ کہاں کہاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کارخانہ تک کیسے آتی ہیں؟ ذریعہ آمد و رفت: بیل گاڑی، ٹرالی، موٹر لاری، ریل وغیرہ

جنرل سائنس | بانس، گنا، گیہوں، روئی اور چاول کیسے پیدا کرتے ہیں۔ پودوں کی زندگی کے متعلق معلوم کرنا۔ بانس کے جنگل میں کون کون سے پرند جانور اور کیڑے پائے جاتے ہیں؟ بجلی اور گیسوں کے متعلق پڑھنا۔ بجلی کی طرح ہوا، پانی اور بھاپ میں بھی طاقت ہوتی ہے ان طاقتوں کو کیسے معلوم کیا گیا؟ معمولی حادثات علاج معالجہ کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کی جاتی ہیں؟۔

(۳) لیپی بنانا

طریقہ کار | بظاہر لیپی پکانا بہت معمولی سا کام ہے لیکن اس کو جب ہم پڑھائی کے نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں تو اس میں کمیسٹری کے اصولوں کے مشاہدہ کا پورا موقعہ ملتا ہے۔ لیپی اچھی اسی وقت بن سکتی ہے جبکہ اس میں زیادہ سے زیادہ چپک ہو۔ ایسی لیپی چیزوں کے مناسب طریقہ سے ملانے سے ہی بن سکتی ہے پھر لیپی عرصہ تک صحیح حالت میں اس طرح رہے کہ اس کی وہ چپک بھی برقرار رہے اس کو اگر آپ کہیں رکھ دیں تو کوئی جانور یا پرندہ پکا ہوا آٹا سمجھ کر کھا نہ جائے لیپی پکاتے وقت نیلا تھوتھا ملانا بچوں کے لئے یہ بہت دلچسپ تجربہ ہوگا اگر نیلا تھوتھا بنا کر دکھایا جائے۔

زبان | کسی ایسے قصے کا سنانا جس میں زہریلے سانپ نے کاٹا ہو اور مرے ہوئے آدمی کو کسی نے زندہ کیا ہو (جیسے منشی پریم چند جی کا افسانہ منتر) ایک آدمی کا قصہ جس نے بہت سے چوہوں کو آٹے میں گولی دے کر مار ڈالا۔ ایسے قصے جس میں کسی نے کسی کو زہر دیا ہو جیسے حضرت حسنؑ کا قصہ۔ یا سقراط حکیم کا قصہ جس کو زہر سے بھرا ہوا پیالہ پینے کے لئے دیا گیا تھا۔ بادشاہوں کے قصے جن کو زہر دیا گیا۔ زہر کی روک تھام کے لئے خاص قسم کے پیالہ کا مغلوں کے وقت میں بنانا ایجاد ہونا۔

حساب | تھوڑی لیپی پکانے میں لکڑی یا کوئلہ میدہ اور نیلے تھوتھے کا خرچ زبانی سوالات کے ذریعہ معلوم کرنا۔ ہر چیز کی مقدار کا مقرر کرنا۔ تناسب اور فی صدی (یہ قاعدے جس جماعت کے نصاب میں ہوں وہاں پڑھائے جائیں)

سماج کا علم | سانپ کے کاٹے سے کتنے لوگ ہندوستان میں مرجاتے ہیں۔ سانپوں کی قسمیں بچھو کی قسمیں۔ زہر کیا ہے؟

جنرل سائنس | زہر کن کن چیزوں میں ہوتا ہے اس کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور کس قسم کا ہوتا ہے؟ نیلا تھوتھا کس طرح بنتا ہے؟ کس اور زنگ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

(۴) شہر کی ان دکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈ بورڈ سے لوگ مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں؟

طریقہ کار | بچوں کو کوئی ایسے کارخانے دکھلانے چاہئیں جہاں لڑکے لڑکیاں مرد اور عورتیں کارڈ بورڈ

کے مختلف سایز کے بکس ان دکانداروں کے لئے تیار کرتے ہیں جو اپنی چیزوں کو ان بکسوں میں رکھ کر فروخت کرتے ہیں بعض کارخانے ایسے ہوتے ہیں جو کارڈ بورڈ اور چمڑے کو ملا کر سوٹ کیس بناتے ہیں اور بعض کارخانے کارڈ بورڈ کی فینسی چیزیں تیار کرتے ہیں مثلاً زیورات کے ڈبے سگار دان اور گڑیوں کے ڈبے وغیرہ۔ اس مشاہدہ میں ان کے اوزاروں اور ان کے بنانے کے طریقوں کو اچھی طرح دیکھنا چاہیے کس وزن کا کارڈ بورڈ کس چیز کے بنانے میں استعمال کرتے ہیں؟ وہ اپنا سامان کہاں کہاں سے منگاتے ہیں؟ کتنے دیر کام کرتے ہیں؟ اپنے یہاں کام کرنے والوں کو کیا اجرت دیتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ باتیں پیش نظر رکھی جا سکتی ہیں۔

زبان | بچوں سے اس مشاہدہ کے بعد مضمون لکھوائے جائیں جو ان کے ماہواری یا پندرہ روزہ رسالہ میں شائع ہوں۔ ان چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں عموماً آتشزدگی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں بچوں کی تجویزیں لکھی جائیں اور ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان پر غور کیا جائے کارخانوں کی حفاظت اور نقصان سے بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے کہا جائے اور ان کی تجویزیں قلمبند کر کے شائع کی جائیں (یہ کام استاد کے مشورہ سے ہونا چاہیے تاکہ بچے بہترین تجویزیں سوچ سکیں اس سے سوشل اسٹڈیز کے نصاب میں پولیس اور میونسپلٹی کے بارے میں بتلانے میں آسانی ہوگی) اس کے متعلق پڑھنا کہ کونسی دستکاری بڑے پیمانہ پر ملوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور کونسی چھوٹے پیمانہ پر گھروں میں کرائی جا سکتی ہے۔

حساب | بکسوں اور ڈبوں پر لاگت اور بکری کے سوالات: چاروں مرکب قاعدوں تجارت اور اکائی کے ذریعہ بطور مشق کرانا۔ چونکہ مختلف سایز اور کوالٹی کے بکس اور ڈبے بنتے ہیں لہذا مختلف قیمتوں کے در سے درجن یا گرس کی قیمت معلوم کرائی جا سکتی ہے۔ کام کرنے والوں کی اجرت معلوم کرنا اور اس کا حساب زبانی سوالات میں نکالنا کہ وہ ایک ماہ میں یا ایک سال میں کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟

سماج کا علم | لوگ اپنے بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کے لئے کیوں بھیجتے ہیں؟ ان کو تعلیم کے لئے کیوں نہیں بھیجتے؟ پولیس اور میونسپلٹی کارخانوں کی حفاظت اور صحت کے لئے کیا کرتی ہیں؟ اجارہ داری

کا کیا مطلب ہے؟ لوگ اپنی چیزیں رجسٹرڈ پیٹینٹ کیوں کراتے ہیں اس قسم کے کارخانوں کے قیام کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟

جنرل سائنس | ایک طرح سے بیٹھ کر متواتر کام اور دیر تک کام کرنے میں دوران خون پر کیا اثر پڑتا ہے دوران خون کے صحیح طریقہ پر انجام نہ پانے کی وجہ سے اعضا کی نشو و نما پر کیا اثر پڑتا ہے کم جگہ میں بہت سے لوگوں کے کام کرنے سے صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

کمپنی کی تجارت ہندوستان میں

(از جناب منت اللہ رحمانی صاحب ایم۔ایل۔اے)

انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ہندوستان کی صنعتیں بے نظیر شمار کی جاتی تھیں خصوصًا مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں تو ہندوستانی صنعتوں نے اس قدر ترقی کی اور ان کی برآمد اس قدر بڑھی کہ دوسرے ملکوں پر ہندوستان کا مال چھایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے اور قالین، موتی، جواہر اور زیورات مرصع طلائی اور نقرئی سامان، خوشبوئیں، رنگ اور مسالے، چوبینہ کا کام، لوہے کا سامان، فولاد کے آلات اور ہتھیار، غرضکہ تمدن اور تمول کی ادنیٰ سے اعلیٰ ضروریات دور دور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے، اور چونکہ ہندوستان نے جہاز سازی اور جہازرانی میں بھی بہت ترقی کرلی تھی، اس لئے یہ ساری چیزیں ہندوستان ہی کے بنے ہوئے جہازوں میں ہندوستانی جہاز راں کی زیرِ نگرانی جایا کرتی تھیں، اور بعض مصنوعات کی خاطر یورپ والے ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے، اور اس کی راہ میں جان و مال لٹاتے تھے۔

سولھویں صدی سے یورپ کے تاجر بحری راستہ سے ہندوستان آنا شروع ہوئے اور سترھویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کے تاجر ہندوستان پہنچے، اور سترھویں صدی کے وسط سے تجارت میں ترقی شروع ہوئی اور سترھویں صدی کے آخر میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ سوتی کپڑا ریشم اور ریشمی کپڑا، اون، متفرق مصنوعات، شورہ، نیل، مصالحے اور ادویات خاص کر انگلستان کو برآمد ہوتی تھیں۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی معرفت ہندوستانی کپڑا انگلستان کے علاوہ آئرلینڈ، اسپین، فرانس، جرمنی اور تمام قرب و جوار کے یورپی ممالک میں پھیل گیا، اور ایسا مقبول ہوا کہ امیر و غریب سب ہی استعمال کرنے لگے، ہندوستانی کپڑا خوش وضع، خوش رنگ، پائدار اور بہت سستا تھا یوں تو وہ عام طور پر کالیکو کہلاتا تھا، لیکن چھینٹیں، دریسیں، گنگم، ہیم وغیرہ اس کی بہت سی قسمیں مشہور

تھیں، تن پوشی سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فیشن اور زیب و زینت کی ضروریات انھیں سے پوری ہوتی تھیں۔ انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی کپڑے کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز تھے، وہ زیادہ تر ادنیٰ کپڑا تیار کرتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ہمسایہ ممالک سے کچھ سن کا کپڑا بھی منگا تے تھے جو لینن کہلاتا تھا۔ انھیں کپڑوں سے پہننے اوڑھنے کا کام چلتا تھا، ہندوستانی کپڑا اپنی خوبیوں کی بدولت اس قدر مقبول ہوا کہ پارچہ بافوں کا روزگار بالکل مارا گیا اور دوسرے ملکوں سے انگلستان میں سن کا کپڑا آنا بھی بند ہو گیا۔

جیمس اول کے زمانہ سے انگلستان میں ریشمی کپڑے کی صنعت پر بھی توجہ جاری تھی، پہلے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارس اور چین سے کچھ ریشم خام لاکر دیا، تو انگلستان کے صناع بہت خوش ہوئے اور صنعت میں جان پڑ گئی، لیکن بنگال ریشم کا گھر ہے، وہاں ریشمی کپڑے کی صنعت درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارخانے قائم کر کے پارچہ بافوں سے ریشمی کپڑے تیار کرانا شروع کر دئے، بلکہ انگلستان سے کچھ پارچہ باف بلا کر ان کی مدد کے لئے رکھ دئے۔ طرح طرح کے لاجواب ریشمی کپڑے تیار ہونے لگے، مثلاً اطلس کمخواب، ساٹن، تن زیب اور رومال وغیرہ اور سب کے سب پائدار اور ارزاں، جب یہ مال انگلستان پہنچا تو لوگ دیکھ کر دنگ ہو گئے اور بے ساختہ بول اٹھے کہ دنیا میں اس سے بہتر کپڑا ملنا محال ہے، اول تو سوتی کپڑے کی بنوبیت کچھ کم نہ تھی، ریشمی کپڑے نے اور بھی دلوں کو موہ لیا، اس کے علاوہ متفرق مصنوعات میں مندرجہ ذیل سامان ہندوستان سے تیار ہو کر انگلستان جایا کرتے تھے اور وہاں بہت مقبول ہوتے تھے۔ ریشمی رومال۔ باناتی ہیٹ یعنی انگریزی وضع کی ٹوپیاں، سلے سلائے کپڑے خوشنما دستی پنکھے چینی کے برتن، تانبے پیتل کے منقش برتن اور صندوقچے، چوبینہ کے سامان، میز کرسی وغیرہ جو نقاشی اور رنگ سازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے، کھلونے اور تصویریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی فہرستوں میں یہ سامان بکثرت درج ہیں کہ فلاں فلاں جہاز میں اس اس قدر سامان ہندوستان سے انگلستان پہنچا۔

ہندوستان سے جو سامان خام برآمد ہوتا تھا' اہمیت کے لحاظ سے اس میں شورہ سب سے مقدم نظر آتا ہے' اس کے بعد نیل' لاک مصالحہ اور ادویات کی برآمد تھی۔

'شورہ' بارود کی جان ہے اور ہر سلطنت کو بارود کی جس قدر ضرورت ہے' وہ محتاج بیان نہیں' اس کی پیداوار عام نہیں شورہ دنیا کے خاص خاص حصوں میں ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے صوبہ بہار میں شورہ قدرتی طور پر افراط سے پیدا ہوتا ہے' ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت انگلستان کے واسطے ہندوستان سے شورہ لے جاتی تھی اور اس کی برآمد پر اس کو ناز تھا۔

جس طرح شورہ بارود کی جان ہے' اس زمانہ میں نیل رنگ سازی کی جان تھی' اور اس کی جگہ جگہ پر بہت مانگ تھی' خوش قسمتی سے نیل بھی ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا تھا اور کمپنی اس کی برآمد بھی خوب کرتی تھی' جب تک یورپ اور خاص کر جرمنی میں نئے نئے رنگ نہیں ایجاد ہوئے' ہندوستان میں نیل کا کاروبار خوب چلتا رہا اور بیسویں صدی کے وسط سے نیل کا کاروبار پھیکا پڑ گیا۔

'لاک' بھی ہندوستان کے جنگلوں کی خاص پیداوار ہے' قدیم زمانہ میں اس سے اعلیٰ قسم کی رنگین وارنش تیار ہوتی تھی جس سے لکڑی کی مصنوعات پر نہایت خوشنما نقش و نگار بنتے تھے اور یہ ہندوستان کی خاص صنعت تھی' سترھویں صدی تک اس کی مانگ بڑی اچھی تھی' اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطے سے اس کی برآمد جاری تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے کچھ ادویات کی جڑی بوٹی بھی برآمد کرتی تھی۔ افیون بھی لے جاتی تھی۔ کافی۔ جو کوہ نیلگری پر پیدا ہوتی ہے' اس کا بھی استعمال انگلستان میں شروع ہو گیا تھا اور وہ بھی برآمد کی فہرست میں نظر آتی ہے۔ بعد کو انگلستان میں چائے کا شوق بھی پیدا ہو گیا اور وہ بھی ہندوستان سے برآمد ہونے لگی۔

سترھویں صدی کے آخر تک ان تمام چیزوں کی برآمد بہت بڑھ گئی اور خصوصیت سے انگلستان' ہندوستانی مال کی فروخت کے لیے منڈی بن گیا' اور اس کے مقابلہ میں انگلستان

کی معدودے چند صنعتوں میں اونی کپڑا قومی صنعت مانا جاتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی خوبی نہ تھی، گراں بہت تھا اور ہندوستان میں تو اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انتہائی کوشش کی کہ انگریزی اونی کپڑا برآمد ہو۔ کمپنی نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ فارس میں تو کچھ ضرور فروخت ہوا لیکن ہندوستان میں تو کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ پارلیمنٹ نے ۱۶۹۳ء کے منشور میں کمپنی کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ وہ کم از کم ایک لاکھ پونڈ قیمتی اونی کپڑا ہر سال انگلستان سے برآمد کرتی رہے۔ مجبوراً کمپنی کو منظور کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہندوستان میں فروخت نہیں ہوتا تھا۔ کمپنی کے گماشتے یہاں سے بار بار لکھتے کہ کپڑا گودام میں پڑا ہوا ہے، دیمک لگ رہی ہے، کوئی نہیں خریدتا اور وہاں سے تاکید آتی کہ اونے پونے جس طرح بھی نکل سکے نکال دو، قیمت کی کچھ پروا نہ کرو ہم بھی کیا کریں مجبور ہیں، جو کچھ نقصان ہوگا دوسری مدوں سے پورا کر دیں گے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۱۶۹۴ء میں لکھا ہے کہ:۔

"ہم کو نیا منشور ملا ہے، اس کے مطابق ہم پہلے سے زیادہ اونی کپڑا فروخت کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی جو مقدار رکھی گئی ہے اس کا فروخت ہونا کسی طرح ممکن نہیں، اس میں سے کچھ تو فارس بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں اس کی کچھ مانگ بھی ہے، اور بقیہ ہندوستان چلا جاتا ہے وہاں بمشکل تھوڑا سا فروخت ہوتا ہے، باقی کو خواہ ہم مفت تقسیم کر دیں، یا گودام میں پڑا رہنے دیں حتیٰ کہ دیمک اور کیڑے جن سے ہم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کو چٹ کر لیں۔"

بہر حال ہندوستانی مصنوعات خاص کر کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا رواج بڑھا، تو انگلستان میں بے کاری پھیلنے لگی اور سخت برہمی پیدا ہونے لگی، اور انگلستان کے صناعوں نے مختلف طریقہ پر حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنا شروع کئے اور پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں جن میں سے چند ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) مدخواست گذار پھول دار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اون اور ریشم ملا کر بھی کپڑا بنتے ہیں

اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا، اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(۲) اس علاقہ میں ریشمی اور ریشم اور اون ملا ہوا کپڑا بنایا جاتا ہے اور لوگوں کا یہی عام پیشہ ہے کچھ دنوں پہلے خوب فراغت سے زندگی بسر ہو رہی تھی لیکن چند دنوں سے کاروبار بہت گر گیا اور لوگ بے کاری سے پریشان ہیں، استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دی جائے۔

(۳) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور انھیں پہ معاش کا مدار تھا لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آ رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ پہلے دوسروں کی امداد کرتے تھے آج وہ خود بے کار اور محتاج ہیں۔ ہم درخواست دینے والوں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(۴) عرضی گذار ایک بڑی جماعت ہیں اور ایک زمانہ سے ان کو قانونی طور پر حقوق حاصل ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان میں بہت سی باناتی ٹوپیاں (ہیٹ) ہنوا کر منگائی ہیں اگر ان کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی، اس لیے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستانی لوگ ہمارے ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ختم کر چکے ہیں پنکھوں کی صنعت بھی انھوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوتہیہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی صنعتوں کو برباد کر دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں ہندوستان پیرس کا جانشین بن کر ہم پر فیشن عاید کرے گا ہم کو تو فرانس ہی کے وضع دار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا، اب ہندوستان سے خوب وضع دار لباس تیار ہو کر بکثرت آ رہا ہے اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرض اس قسم کی بے شمار شکایتیں اور درخواستیں پیش کی گئیں اور یورپ کے صناعوں نے مل کر ہندوستانی مال کے خلاف خوب پروپگنڈا کیا اور ساتھ ہی ساتھ سودیشی کی تحریک بھی پوری قوت سے چلائی گئی۔ وہی سودیشی کے استعمال کی تحریک جب ہندوستان میں چلائی جاتی ہے تو انگریز اس کو کوتاہ نظری سے تعبیر کرتے ہیں اور حکومت اس پر سزائیں دیتی ہے جیل بھیجتی ہے ہر ممکن طریقہ پر اس کے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب خود انگلستان کی صنعت خطرہ میں تھی تو اس حربہ کو پوری قوت سے استعمال کیا گیا۔ سودیشی کی تائید و حمایت میں نظمیں لکھی گئیں مضامین میں شائع کئے گئے اور رسالے چھاپے گئے اور ان میں ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا اور انگلستان ہی کا بنا ہوا مال پہننے اور استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی۔ انگلستان کی عورتیں خصوصاً فیشن کی بہت زیادہ دلدادہ ہوتی ہیں اور وہی ہندوستانی مال کی زیادہ قدر کیا کرتی تھیں۔ اس لئے عورتوں کے لئے خاص طریقہ پر رسالے شائع کئے گئے جن میں ان سے ولایتی مال کے استعمال کی اپیل کی گئی اور مختلف جذباتی اور نفسیاتی طریقہ پر ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا تھا۔

ولایتی صنعتوں کی تباہی و بربادی کے علاوہ ایک سب سے بڑا غم انگلستان والوں کو یہ تھا کہ ہندوستانی مال کے بدلے میں انگلستان سے سونا اور چاندی ہندوستان بھیجا جاتا ہے، جس سے ایک ملک کی تباہی یقینی ہے اور جس کو کوئی بھی اپنے ملک سے باہر نکالنا نہیں چاہتا چنانچہ اسی زمانہ میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ:۔

> "یہ تجارت (ہندوستانی) بدترین قسم کی تجارت ہے۔ چاندی اور سونا جو کسی طرح بھی ہم کو علیحدہ نہ کرنا چاہیے، ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں ہندوستانی مصنوعات اور کمیل کود کی چیزیں آرہی ہیں۔ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

غرض جب اس طرح یورپ والوں نے ہندوستانی مال کے خلاف اپنے ملک میں ہنگامہ کیا تو پھر حکومت کو اس کے خلاف توجہ کرنی پڑی اور کہیں سختی دبانا تو خود ملک والوں کی حکومت

تھی، وہاں ہندوستان کی طرح دوسروں کی حکومت تو تھی نہیں کہ ہندوستانی مریں یا زندہ رہیں، حکومت کو اپنے نفع سے مطلب ہے، ہندوستان کی صنعت تباہ ہو یا محفوظ رہے، حکومت کو اس سے کیا غرض! بہرحال انگلستان کی حکومت نے اپنے ملکی بھائیوں کی چیخ وپکار اور ولایت کی صنعت کے تحفظ وبقا کی طرف توجہ کی اور پارلیمنٹ میں بھی اس پر بحث شروع ہوگئی چنانچہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کرنل پریچ COL. BREECH تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ "کالیکو" یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اس نے ہمارے اونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا کیا افسوس ہے کہ ہندوستانی تو دولت لوٹ رہے ہیں، اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں۔"

ایک اور "صاحب" اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

"انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اس لئے کہ اول تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روز پر گذر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی لیل ونہار ہیں تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہندوستان کے لوگ مالامال ہو جائیں گے، اور ہم غربت اور افلاس میں گرفتار ہوں گے۔"

ایک تیسرے "صاحب" نے ہندوستانی تجارت پر اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ:۔

"ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے۔ کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مال کی درآمد سے خطرے میں پڑ گئی ہیں، ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جایا کرتی تھیں، وہ ان کی جانشین بن گئیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر یا تھ لگائے گا نا باہر۔"

مسٹر پاکسفن MR PALKISFAN نے اپنی تقریر میں کہا کہ :-

" ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے وہ نہ صرف ہمارے یہاں اونی کپڑے کی بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں بھی ہمارے اونی کپڑے کی جگہ لے لیتا ہے اور ان ملکوں کے کپڑوں کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے جو ہم پہلے اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ چونکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اونی کپڑے کا کام تمام کر دیا اور اپنے مقابل دوسرے ملکوں کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

ریشمی کپڑے کے متعلق مسٹر شیلڈن MR SHIELDEN نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ :-

" انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا۔ وہ بالکل بند ہو گیا، اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اس سے نصف قیمت پر آتا ہے، اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل یہ کہ جب ہندوستان کی مصنوعات نے یورپ اور خصوصاً انگلستان کے بازاروں پر قبضہ کر لیا، اور انگلستان کی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو انگلستان کے صناع اور وہاں کے بااثر لوگوں نے خوب ہنگامے کئے۔ سودیشی کی تحریک چلائی، حکومت سے ہندوستانی مال کو قطعاً بند کر دینے اور اس کے استعمال کو جرم قرار دینے کا مطالبہ کیا، اور چونکہ زیادہ تر ہندوستانی مال ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے ذریعہ آیا کرتا تھا۔ اس لئے انگلستان میں عام طریقہ پر کمپنی کی مذمت شروع ہو گئی اور ناراضگی پھیل گئی یہاں تک کہ ایک روز پارچہ بافوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتروں پر حملہ کر دیا اور قریب تھا کہ غصہ میں اس کا سارا خزانہ لوٹ لیں ـــ حکومت پر اتنا دباؤ دیا گیا کہ ایک دفعہ کپڑا بننے والوں کی عورتوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر ہلہ بول دیا اور اس کو گھیر لیا تاکہ اگر کوئی ممبر ہندوستانی مال پر بندش کی مخالفت کرے تو وہ اس کی اچھی طرح مرمت کریں۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حامیوں نے آزاد تجارت کے فوائد بہت سمجھائے اور بڑی کوشش کی کہ ہندوستانی تجارت کا وہی پہلا سا سلسلہ جاری رہنے دیا جائے لیکن ایک

نہ چلی اور آخر سنہ ۱۷۰۰ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر ہی دیا جس کی رو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد بند کر دی گئی اور ہندوستانی کپڑے کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ ایک عرصہ تک یہ قانون جاری رہا اور جب ہندوستان کی صنعت ختم ہو گئی تو انگلستان میں ہندوستانی پارچہ کی درآمد کی اجازت دے دی گئی، لیکن اس پر اتنا زبردست محصول لگایا گیا کہ وہ فروخت نہ ہو سکے۔

جس وقت انگلستان میں ہندوستانی مال کے متعلق امتناعی قانون پاس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہی مسلک اور طریقہ رہا کہ ہندوستانی مصنوعات کی تجارت پھیلے اور دوسرے ملکوں میں اس کے بازار پیدا ہوں کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے اندر جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے مختلف جائز اور ناجائز طریقوں سے صنعت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے ہندوستانی تجارت کی ترقی سے سراسر کمپنی کا فائدہ تھا لیکن جب سنہ ۱۷۰۰ء میں امتناعی قانون انگلستان کی پارلیمنٹ میں پاس ہو گیا تو پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنا طریقہ بدل لیا یعنی ہندوستان سے مصنوعات برآمد کرنے کے بجائے خام سامان لے جانے کی کوشش شروع کر دی اور ہندوستان میں ولایتی مال کے رواج دینے کی تدبیریں اختیار کیں اور اسی روپے سے جو کمپنی ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان سے لے گئی تھی انگلستان میں مختلف قسم کی صنعتوں اور گوناگوں ایجادات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

حاصل یہ کہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی تاریخ میں ایک افسوسناک انقلاب کا زمانہ ہے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی صنعت و تجارت کو ختم کر دیا اور ہندوستان سے کچے مال کی برآمد شروع کی اور ولایتی مصنوعات کو ہندوستان میں رائج کرنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد سارا ہندوستان ولایتی کپڑوں میں لپٹا ہوا نظر آنے لگا۔ ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضروری اور غیر ضروری مصنوعات یورپ سے آنے لگیں یہاں تک کہ ہندوستان سوئی اور تاگے میں بھی انگلستان کا محتاج بن بیٹھا۔

فلسفہ نراج

کیا نراج (انارکزم) اور دہشت انگریزی ہم معنی ہیں

(از جناب عبدالعزیز صاحب فاروقی بی اے ایبٹ آباد، صوبہ سرحد)

جہالت بھی دنیا میں عجب کرشمے دکھاتی ہے لیکن جہالت اور لاعلمی کے طفیل سے بڑا نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہمارا علم محدود ہو۔ بہت سی اچھی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ دل میں غلط نظریے قائم کیے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لیے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ ایز اس رویہ کی وجوہات پر غور کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کسی چیز شخص۔ اصول یا خیال کے خلاف آپ کی حقارت اور بدظنی کی حقیقی وجہ ناکافی معلومات — خواہ اسے کم علمی کہیے یا جہالت — کا ہونا ہے مثال کے طور پر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کو لیجیے ان دنوں وہاں کے اچھے اچھے علما اور فضلا اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہوا خیال کرتے تھے۔ اور بانیٔ اسلام کو (نعوذ باللہ) بت پرست — مانا کہ اس میں مخالف پراپیگنڈا کا بھی کچھ حصہ تھا لیکن پراپیگنڈہ کا اثر بالعموم ناخواندہ اور جاہل عوام پر ہی ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ جنھیں حقایق کا علم ہوتا ہے۔ آسانی سے پراپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے اگر وہ بھی بعض مسائل میں غلط آرا رکھیں تو اس کی وجہ ان کی جہالت — عالمانہ جہالت یا جاہلانہ علمیت — ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ جہالت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غلط ہوں۔ اگر ہماری لاعلمیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ ہٹ جائے تو بہت ممکن ہے کہ ہم بجائے اس چیز کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یا کم از کم اس کی مخالفت ہی ترک کر دیں۔ موجودہ دور میں بہت سے مسائل اور

نظریات ایسے ہیں جو اس خاص قسم کی جہالت کی وجہ سے قبول عام نہیں حاصل کر سکے اور لوگوں میں
ان کے متعلق طرح طرح کی مضحکہ خیز اور بعید از حقیقت باتیں مشہور ہیں۔ ان ہی نظریات میں سے
ایک انارکزم یا نراج بھی ہے۔ انارکزم کا نام سنتے ہی آپ کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے اور
آپ نے اپنے ذہن میں ایک نیم پاگل۔ ضدی جیسے شخص کا تصور کر لیا ہوگا جس کا کام صرف یہ ہے
کہ ہر وقت لوگوں پر بم پھینکنے کی دھن میں رہے۔ طرح طرح کی بھیانک تشددانہ حرکات سے پبلک
میں دہشت پھیلائے اور اپنی انتہا پسند سیاسی آرار کو مجرمانہ حرکات کے جواز کے لئے نقاب کے
طور پر استعمال کرے۔ آپ کو اپنی یہ رائے بالکل قدرتی اور صحیح نظر آتی ہوگی لیکن حقیقت سے یہ
ایسی ہی دور ہے جیسے ازمنہ وسطیٰ کے یورپی علماء کا اسلام کے متعلق نظریہ۔ اس میں شک نہیں
کہ دنیا میں چند افراد ایسے بھی ہیں جو انارکزم کے معتقد ہوتے ہوئے بھی دہشت انگیز حرکات کے
حامی ہیں۔ لیکن حقیقی نراج (جسے بعض اوقات دہشت پسندی سے ممتاز کرنے کے لئے فلسفیانہ
انارکزم کا غیر ضروری اور بھدا نام دیا جاتا ہے) دوسروں کو دہشت انگیز حرکات سے ڈرانے دھمکانے
اور کسی فعل پر خلاف ضمیر مجبور کرنے کے قطعی خلاف ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو بقول برٹرانڈ رسل صرف
بعض انارکسٹ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ مناسب حالات میں بم پھینکنا اور
جبریہ دوسروں سے اپنی بات منوانا روا جانتے ہیں۔ اس لیے جو نام کے انارکسٹ تشدد کے حامی ہیں
وہ گاندھی جی ایسے حامیان عدم تشدد کو چھوڑ کر سماج کے باقی طبقات سے کچھ بہت زیادہ مختلف
نہیں۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی جماعتی جنگ (جو مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے باہمی مفاد کے تصادم
کی پیداوار ہے) کے قائل ہیں اس لئے اگر وہ بم استعمال کریں تو یہ بعینہ ایسے ہے جیسے حکومتیں دوران
جنگ میں بم اور دیگر آلاتِ ہلاکت استعمال کرتی ہیں۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں ایک انارکسٹ
ایک بم تیار کرتا ہے۔ وہاں حکومتیں لاکھوں بم بنواتی ہیں اور بندوقیں بناتی ہیں۔ اور جہاں وہ ایک آدمی
قتل کرتا ہے وہاں حکومتوں کے استبداد اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کا صفایا
ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم انارکزم کے تصور کو بجا طور پر تشدد سے جدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تشدد

اور دہشت انگیزی نہ تو انارکزم کے لازمی اصولوں میں سے ہیں۔ اور نہ ہی محض انارکسٹوں کے لئے مخصوص ہیں۔
اب یہ دیکھنا ہے کہ آخر انارکزم ہے کیا۔ انارکزم کے فلسفہ اور اس کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ہمیں
مروجہ فلسفۂ سیاسیات کی تہ تک جانا پڑتا ہے۔ آج سے کوئی نصف صدی پہلے کے بیشتر علمائے
سیاسیات (سرہنری مین MAINE وغیرہ) نظریۂ جبر کے قائل تھے اور ریاست STATE کی ابتدا اور بقا
کی بنا مادی قوت کو قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں جمہور کی نراجی اور خودسرانہ جبلت کو قابو میں
رکھنے اور امن وامان قائم کرنے کا واحد ذریعہ جبری قوت تھا۔ آج کل اس نظریہ کی صحت سے انکار
کیا جاتا ہے۔ جب بھی بڑے بڑے علمائے سیاست خواہ وہ پروفیسر لاسکی اور پروفیسر میک ایور
MACIVER کی طرح ریاست کے حلقۂ اقتدار واختیار کو جمہور کی مکمل آزادی برقرار رکھنے کے لئے محدود
کرنے کے قائل ہی کیوں نہ ہوں۔ کم از کم یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ ریاست کی منتہائی بنا جمہور کی رضا
مندی ہے۔ اور اگرچہ قوتِ جبر ریاست کی روح اور اصل اصول نہیں لیکن اس کا امتیازی اور
لازمی نشان ضرور ہے۔ یہ نظریہ پرانے نظریہ سے اس حد تک مختلف ہے کہ اس کے مطابق
ہم قوانین کی پابندی اور حکومت کی اطاعت اس وجہ سے نہیں کرتے کہ ہمیں کسی سزا یا دباؤ کا خوف
ہوتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ہماری ثقافتی روایات اور مجلسی جبلتیں INSTINCTS ہمیں قانون
شکنی سے روکتی اور آئین پسندی پر مجبور کرتی ہیں اور قانون کی بنا رضا پر ہے جبر پر نہیں لیکن یہ نیا
نظریہ بھی جبری طاقت کی ضرورت کا قائل ہے۔ اور بجائے یہ کہنے کے کہ چونکہ قانون جمہور کی مرضی سے
بنتے ہیں۔ اس لئے ان کے مفاد کے لئے کسی مادی طاقت اور قوت کی قطعاً ضرورت نہیں یہ
کہتا ہے کہ "قانون کی عمومیت کو ممکن العمل بنانے والی چیز رضا ہے۔ لیکن اس عمومیت کا اطلاق
قائم رکھنے کی گارنٹی طاقت ہے" (میک ایور)۔ آسان لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ
اگرچہ کسی قانون کی موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ جمہور کی اکثریت اس کے اصول سے متفق اور
اس کی پابندی کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قانون پسندی کی
کم صلاحیت رکھنے یا کسی اور وجہ سے قانون کی پابندی سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو قانون کی پابندی پر مجبور کئے بغیر قانون کی عمومیت (سب لوگوں پر برابر اطلاق)
میں فرق آتا ہے اور ان لوگوں کو قانون پسند بنانے کے لئے طاقت کا استعمال بعض دفعہ قانون
کی عمومیت کو حقیقی معنوں میں قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے موجودہ نظریہ
کے مطابق ریاست کا امتیازی نشان جبری طاقت کی موجودگی ہے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر انارکسٹ
دوسرے علمائے سیاسیات سے جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کے لئے
اگر وہ قانون سب کی مرضی سے بنا ہے، کسی طاقت اور جبر کے استعمال کی ضرورت نہیں جب
تمام لوگ ایک کام ہنسی خوشی سے اور مل جل کر سر انجام دے سکتے ہیں تو طاقت کا استعمال کہاں
جائز ہے؟ انارکزم یا نراج جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ حکومت کا مخالف اور اس کی ضرورت
کا منکر ہے۔ کیونکہ حکومت جمہور پر حاکمانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے استعمال کی جانے والی طاقت
کا سرچشمہ اور مظہر ہے۔ اگر انارکزم کسی حکومت کو گوارا کر سکتا ہے تو وہ حکومت صرف آزاد حکومت
ہی ہو سکتی ہے یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ آزاد حکومت کا نراجی تخیل اس کے عام معنی اور مفہوم
سے جدا ہے۔ اور اس کے مطابق آزاد حکومت وہ نہیں جو بیرونی دباؤ اور خارجی رسوخ سے
آزاد ہو۔ جیسا کہ تمام خود مختار ریاستیں SOVEREIGN STATES ہیں اور نہ ہی وہ حکومت ہے
جس کی باگ ڈور بجائے ایک مختار مطلق بادشاہ یا آمر یا کسی محدود گروہ یا طبقہ کے ہاتھوں میں ہونے
کے اکثریت کے ہاتھوں میں ہو۔ بلکہ وہ حکومت جو سب کی مرضی سے چلائی جائے جس میں کوئی
ایک گروہ کسی دوسرے گروہ پر کسی طرح کا مادی دباؤ نہ ڈال سکے جس میں اکثریت اقلیت کو اس کی مرضی
کے خلاف کسی بات پر جبری ذرائع سے مجبور نہ کر سکے جس میں ہر فرد کو ہر طرح کی مکمل آزادی ہو۔ منفی
اور مثبت دونوں یعنی اسے کسی فعل پر خلاف مرضی مجبور نہ کیا جا سکے اور اپنی مرضی پر چلنے کی اجازت
ہو۔ جب ہم اس نظریہ کا موازنہ مروجہ حالات سے کرتے ہیں۔ تو ہماری سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ انارکسٹ
کیوں پولیس اور تعزیری قوانین جیسے اداروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ
جمہور کے ایک طبقہ کی مرضی دوسروں پر جبراً ٹھونسی جاتی ہے اور یہ صورت صرف مطلق العنان

آمروں کی حکومتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جمہوری ممالک میں بھی موجود ہے۔ اس لئے جب تک جمہوریتوں میں بھی قانونی طاقت کے بل بوتے پر اقلیت کو اکثریت کا تابع فرمان بننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ انارکسٹ جمہوری حکومت کو دوسری حکومتوں پر بہت زیادہ قابل ترجیح نہیں سمجھ سکتا۔ انارکسٹ کے مذہب میں سب سے اہم چیز آزادی ہے ——— نوع انسان کے ہر فرد کے لئے مکمل اور مساوی آزادی۔ اس آزادی کے مفہوم کو جامۂ واقعیت پہنانے کے لئے انارکسٹ چاہتا ہے کہ جماعت یا اکثریت کو افراد کو مجبور کرنے کے لئے جس قدر اختیارات ہیں۔ وہ سب موقوف کر دئے جائیں۔

اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکسٹ محض اکثریت کی حکومت نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ حکومت چاہتا ہے جو سب کی مرضی کے مطابق چلائی جائے جس میں جماعتی نظام (پارٹی سسٹم) کا نام و نشان نہ ہو۔ اور سچ پوچھئے تو ان کی خواہش کچھ بے جا بھی نہیں۔ کیونکہ اکثریت کی حکومت آزادی کی ایسی ہی دشمن ہو سکتی ہے جیسے ایک مٹھی بھر آدمیوں کی۔ اکثریت کی حکومت کے اصول کو مروجہ سیاسی تخیل میں جو الہامی رنگ اور تقدس کا درجہ دیا جاتا ہے وہ سچ سے کوسوں دور ہے۔ ایک طاقتور جمہوری ریاست بڑی آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر بدترین مظالم ڈھا سکتی ہے ——— ان شہریوں پر جو اپنی روشن خیالی اور آزادئ ضمیر کے باعث ارتقا کا منبع و مخزن ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ جمہوری حکومتیں آزادی کی روح کچلنے میں دوسروں سے بہت پیچھے نہیں رہیں۔ خود انگلستان میں مسٹر بریڈلا اور مسز بیسنٹ پر مقدمات ٹریڈ یونین اور اشتمالی تحریکات سے بدظنی اور اسی طرح کی کئی غیر آئینی قیود اکثریت کی دراز دستی کا واضح ثبوت ہیں۔ اس لئے انارکزم اگر اکثریت کی حکومت والے اصول کے خلاف علم بغاوت بلند کرے تو تعجب نہیں۔

جدید انارکزم کا بانی مشہور روسی مفکر باکونین ——— کارل مارکس کا شدید ترین مخالف اور حریف ——— تھا۔ لیکن نراجی فلسفہ بذات خود کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ایک قدیم عقیدہ ہے جس کے

نشانات ازمنہ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفیوں اور مفکرین کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اشتراکیت اور نراج میں نمایاں مشابہت ہے۔ دونوں زمین اور اصل کی اجتماعی ملکیت کے حق میں ہیں اور اصل شاہی CAPITALISM کے خلاف۔ دونوں کا بنیادی نظریہ ایک ہی ہے یعنی سرمایہ کی انفرادی ملکیت بعض افراد یا جماعت کو باقی افراد یا جماعتوں پر ظلم اور جبر کرنے کی طاقت دے دیتی ہے اور زیردستوں پر معاشی استبداد کا سرچشمہ ہے۔ راسخ العقیدہ سوشلسٹ کا خیال ہے کہ موجودہ اصل شاہی نظام کو ختم کر کے حکومت کو واحد سرمایہ دار بنا دینے سے افراد کو ہر طرح کی مساوات اور آزادی مل جائے گی۔ لیکن یہاں انارکسٹ سوشلسٹ سے اختلاف رکھتا ہے۔ اور ڈرتا ہے کہ اس صورت میں انفرادی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ اور جابرانہ خصائل حکومت میں پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اجتماعی ملکیت کے اصول کا تو حامی ہے۔ مگر ساتھ ہی حکومت کے اختیارات جس حد تک ہو سکے گھٹانا بلکہ حکومت کو ہی بالکلیہ اٹھا دینا چاہتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سماجی نظام انارکزم کے تجزیہ کردہ اصولوں پر ڈھل جائے تو آخر دنیا کا کام کہاں تک چلے گا؟ جب پیدا شدہ دولت میں ہر شخص کو حصہ لینے کا حق ہوگا لیکن کام کرنے پر کوئی مجبور نہ کیا جا سکے گا تو کیا لوگ کام کرنا چھوڑ دیں گے اور یہ پیدائش دولت میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہوگا؟ انارکسٹ اس کا جواب دیتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے انارکزم کوئی خیالی پلاؤ اور ناقابل عمل سکیم نہیں۔ موجودہ نظام کے تحت پیدائش دولت کا عمل جن اصولوں پر جاری ہے وہ نہ صرف نامنصفانہ اور غیر موزوں ہیں اور مساوات انسانی کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتے ہیں۔ بلکہ بہت بڑی تضیع ذرائع پر منتج ہوتے ہیں یعنی موجودہ ذرائع کے بہترین اور مناسب ترین استعمال سے جس قدر دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اتنی نہیں پیدا ہو رہی۔ اگر پیدائش دولت کا عمل صحیح اور سائنٹفک اصولوں پر ایک معینہ ترتیب PLAN کے ماتحت کیا جائے تو تمام کام کم وقت میں اور خوشگوار طریقے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور سب لوگ خوشحالی اور آرام کی

زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انارکسٹ بجا طور پر کہتا ہے کہ اگر تہذیب اور ترقی کو مساوات کے پہلو بہ پہلو چلنا ہے تو اس کا منشا یہ نہ ہونا چاہیے کہ آبادی کی واضح اکثریت محض روح اور جسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے سارا وقت تکلیف دہ اور ناگوار مشقت میں گذار دے۔ فنون لطیفہ اور علوم کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت کو اس قدر فراغت ہو کہ وہ ان میں دلجمعی سے دلچسپی لے سکے۔ جب لوگوں کو کام کاج کے دھندوں سے ہی فرصت نہ ملے گی تو فنون لطیفہ اور علوم میں کون دلچسپی لے گا۔ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا عمل کیسے جاری رہ سکے گا؟

جو نظام انارکزم کا منتہائے نظر ہے۔ وہ ہر مروجہ یا مجوزہ نظام سے کہیں بہتر ہے۔ انارکزم کا فلسفہ شروع سے آخر تک انسانی ہمدردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی لئے اس کے عملی پروگرام کا پہلا جزو ہی موجودہ انسانیت کش اور ظالمانہ نظام اجرت کو منسوخ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں انارکزم سوشلزم اور کمیونزم سے بھی دو قدم آگے ہے۔ مروجہ اصل شاہی نظام میں مزدور کو مطلوبہ کام کی معینہ مقدار پوری کرنے کے عوض میں اجرت ملتی ہے۔ سوشلزم میں ہر وہ شخص اجرت پانے کا حق دار ہے جو کام کرنے پر رضامندی ظاہر کرے —— کام کی نوعیت یا مقدار کی قید نہیں۔ لیکن انارکزم میں کام کرنے پر رضامندی کی شرط بھی نہیں۔ ہر شخص کو کام کرنے نہ کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن پیداشدہ دولت میں حصہ پانے کا ہر شخص حق دار ہے۔ ایسے نظام میں ہر شخص نکما رہنے کی نسبت کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ لوگوں کا عام طور پر کام سے گریز کرنے کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں کام سے کوئی خاص الفت اور کام کرنے سے نفرت ہے۔ ممکن ہے دنیا میں چند آدمی ایسے بھی ہوں جو فطری کاہل ہوں۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عام لوگ کسی نہ کسی شغل میں مصروف رہنا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً وہ دولت مند لوگ جنہیں وافر دولت کا مالک ہونے کے باعث محنت کرنے کی ضرورت نہیں مگر وہ پھر بھی بے کاری اور کاہلی سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی اعزازی کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔) بلکہ یہ وجہ ہے کہ انہیں سلسلہ حیات قائم رکھنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر نہایت ناخوشگوار اور تلخ حالات میں بھی بعض اوقات اپنی صلاحیت سے بڑھ کر دس بارہ گھنٹے لگاتار روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ جب کام کا مطلب حد سے زیادہ کام اور معاشی غلامی نہ ہوگا۔ بلکہ دن کے چند

محدود اور معینہ گھنٹوں کے دو۔ ان میں ایک خوش گوار مشغلہ جس میں ہر شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق اپنی فطری صلاحیتیں اور قوتیں بروئے کار لا سکے گا۔ تو اس وقت کوئی وجہ نہیں کہ کوئی کام سے جی چرائے۔ ایسی جماعت میں کوئی جبر نہیں کوئی طاقت برتنے والی حکومت نہیں۔ جماعتی قانون البتہ ضرور ہوں گے لیکن طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سب لوگوں کی رضامندی سے نافذ ہوں گے اور کسی "خورد بینی" اقلیت کو بھی بجز اس کی مرضی کے خلاف نہ چلایا جا سکے گا۔

یہ سوال کہ ایسا نظام عملی دنیا میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے کسی آئندہ فرصت میں زیر بحث لایا جائے گا۔ ان چند صفحات کے لکھنے سے مدعا صرف یہ تھا کہ انارکزم کے متعلق تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ انارکزم وہ ہوّا نہیں جو عام طور پر لوگوں کو ڈرانے کے لئے گھناؤنی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکزم کا کوئی اصول ایسا نہیں جو تشدد کے جواز کا حامی یا اس کے ارتکاب کی ترغیب دیتا ہو۔ برعکس اس کے انارکزم کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ کسی طرح دنیا سے جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جاوے لیکن اگر بعض نیم دیوانے انارکسٹ کہلاتے ہوئے بھی تشدد کا ارتکاب کریں یا کوئی نام نہاد انارکسٹ اپنے لب و لہجہ میں درشتی کا اظہار کرے۔ تو اس سے انارکزم پر قیاس کرتے ہوئے سب انارکسٹوں کو دہشت انگیز اور تشدد پسند قرار دینا صریح ناانصافی اور حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

ملکوں کی دولت مندی کا اندازہ کس طرح کیا جاتا ہے

بعض ملک ایسے ہیں جو دولت مند مشہور ہیں اور بعض ایسے ہیں جو غریب کہلاتے ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بہت دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دولت مندی یا غریبی کا فیصلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ آئیے اس سوال کا جواب دینے کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیا کا مقابلہ دنیا کے باقی ملکوں سے کریں۔

پہلے "قدرتی وسائل" کی اصطلاح کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ "قدرتی وسائل" میں دنیا کی زمین، اس کا لوہا، کوئلہ، معدنی تیل اور دیگر معدنیات، قدرتی گیسیں، پانی اور جنگلات شامل ہیں یعنی "قدرتی وسائل" میں وہ چیزیں شامل ہیں جو زمین کے اندر یا اس کے اوپر پائی جاتی ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

"مصنوعہ اشیا" سے مراد اگر ایک طرف دنیا کی ریل پٹریاں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف ہیں تو دوسری طرف روئی کا کپڑا اور اونی کپڑا، گیہوں اور دوسرے اناج اور کھیتوں میں پیدا کی ہوئی روئی ہے۔ اس میں وہ بھیڑیں بھی شامل ہیں جن سے کپڑے کے لئے اون حاصل کیا جاتا ہے اور وہ کاغذ بھی جس کا وجود ہماری موجودہ دنیا کے لئے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اس میں وہ ربڑ بھی شامل ہے جس پر دنیا کے لوگ اپنی موٹروں میں سوار ہو کر گھومتے پھرتے ہیں اور جو دنیا کی بہت سی ضروری اور عیش کی چیزوں کے بنانے میں کام آتا ہے غرضکہ اسی قسم کی بے شمار دوسری چیزیں شامل ہیں جنھیں لوگ مصنوعہ شکل دیتے رہتے ہیں۔

ان اصطلاحوں کی وضاحت کے بعد اب سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیا

کا کس قدر حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ملا ہوا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے سے ہی ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ آیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک دولت مند ملک ہے یا نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں دنیا کی زمین کا حصہ

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ دنیا کی زمین کا کس قدر حصہ ریاست ہائے امریکہ کے قبضہ میں ہے؟ زمین کو دو سو سال سے زائد عرصہ تک امریکہ کی خاص دولت سمجھا جاتا رہا۔ اس براعظم میں آدمیوں کی تعداد کم تھی لیکن زمین کی بہت افراط تھی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی پوری مدت میں جتنے مغرب کی طرف لوگ بڑھتے جاتے تھے انھیں زمین کے ایسے ٹکڑے ملتے جاتے تھے جن پر کسی کا قبضہ نہیں تھا جو شخص زمین لینا چاہتا تھا وہ بغیر کسی جھگڑے کے اپنی مرضی کے مطابق زمین کا انتخاب کر سکتا تھا۔

چنانچہ دو صدی سے زاید مدت تک یورپ کے مہاجرین شمالی امریکہ کے براعظم میں نوآبادیاں بساتے رہے۔ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وسعت مشرق سے مغرب تک تین ہزار میل اور شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس ہے اور دوسری طرف بحر الکاہل۔ اس کے شمال میں کناڈا ہے اور جنوب میں میکسیکو۔ اس کا مجموعی رقبہ ۳۰ لاکھ ۲۶ ہزار ۹۰، مربع میل ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیا کی زمین کا مجموعی رقبہ ۵ کروڑ ۲، لاکھ ۵۵ ہزار دو سو ہے گویا دنیا کا ۱/۲ حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ پھر یہ رقبہ صرف وسعت میں ہی زیادہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی زمینیں شامل ہیں۔ اس میں جنگلات، میدان، پہاڑ، ریگستان، وادیاں اور ساحل سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے حدود میں ایک بڑا مرکزی علاقہ ایسے میدانوں اور سرسبز زمینوں کا ہے جو گیہوں، مکہ اور دوسری فصلیں پیدا کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے مسیسیپی کے مغرب اور کوہ راکی کے مشرق میں زمین کا ایک ایسا وسیع ٹکڑا ہے جس میں لاکھوں مویشیوں کو چرایا جا سکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے پہاڑی اور کوہستانی علاقوں میں لاکھوں ایکڑ زمین پر جنگلات کھڑے ہوئے ہیں۔ کوہ اپالیچین مرکزی

میدان اور مغرب بعید کے بعض حصوں میں کوئلہ کی بڑی زرخیز کانیں موجود ہیں اور منے سوٹا میں خام لوہے کے قیمتی پہاڑ پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی آبادی کا کس قدر حصہ رہتا ہے

امریکہ کی دولت مندی کا خاص سبب یہ ہے کہ اس ملک میں زمین کے رقبہ کی کثرت ہے۔ لوہے اور کوئلہ کی قیمتی کانیں پائی جاتی ہیں، معدنی تیل کے کنوئیں موجود ہیں، آبشاریں ہیں اور بڑے بڑے جنگلات ہیں۔ لیکن یہ سب وسائل بیکار ہوتے اگر امریکہ میں آدمی موجود نہ ہوتے۔ زمین اسی وقت مفید ہوتی ہے جب اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوہا، کوئلہ، معدنی تیل بھی اسی وقت مفید ہوتے ہیں جب ان کو کانوں سے نکال کر استعمال کیا جاتا ہے اور یہی حال تمام دوسرے قدرتی وسائل کا بھی ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی دولت کا اہم ترین حصہ اس کی آبادی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی آبادی قوم کے لئے سب کام انجام دیتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سے آدمی موجود ہیں اور ان کی تعداد اس قدر کافی ہے کہ وہ اس ملک کے کاموں کو اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے لوہے کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں چار کروڑ ۴۲ لاکھ ٹن لوہا سالانہ پیدا کیا جاتا ہے اور باقی تمام دنیا میں ۵ کروڑ ۴۴ لاکھ ٹن سالانہ۔ آج جو ملک لوہا پیدا کرسکتے ہیں وہی فولاد بھی بنا سکتے ہیں اور فولاد ہماری نئی تہذیب کی سب سے اہم پیداوار ہے۔ مہذب ملکوں کے لوگ ہر چہار طرف فولاد سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ فولاد کے بغیر ریل گاڑیاں، موٹریں وائرلیس وغیرہ کوئی چیز بھی نہیں بنائی جا سکتی۔ فولاد کے بغیر شہر قائم نہیں رہ سکتے۔ فولاد اگر نہ ہوتا تو مہذب ملکوں کے وسیع مکانات، بڑے بڑے ہوٹل، تھیٹر اور سینما گھر، ہال اور ایلیویٹر (لفٹ) وغیرہ کچھ بھی نہ بن سکتے۔ فیکٹریوں میں فولاد کے بڑے بڑے کرین ہوتے ہیں۔ ریل گاڑیاں فولاد سے لدی ہوئی اور فولاد کی بنی ہوئی واگنوں کو فولاد کی پٹریوں پر کھینچتی ہیں۔ ہمارے پل فولاد کے بڑے زبردست شہتیروں سے بنائے جاتے ہیں۔ جہاز کی تعمیر میں بھی فولاد کی چادروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ غرضکہ فولاد نئی تہذیب کے لئے بالکل ناگزیر ہوگیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی قوت محرکہ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

ان چیزوں کے بنانے کے لیے جن کے نام اوپر درج کیے گئے قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقدار کی ضرورت پیش آتی ہے جب یہ چیزیں بن جاتی ہیں تو ان کو مفید بنانے کے لئے بھی قوت محرکہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور ان ہزاروں ریل گاڑیوں کو چلانے کے لئے بھی جو مہذب ملکوں کے طول و عرض میں گردش کرتی رہتی ہیں قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقداروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کے چلانے کے لئے جس قدر قوت محرکہ کی ضرورت ہے اس کا اندازہ کیجے۔ اسی طرح مہذب ملکوں کی بندرگاہوں میں بیسیوں جہاز داخل ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو ایسے انجن چلاتے ہیں جو قوت محرکہ کی بڑی مقداروں کو پیدا کرتے ہیں۔ بھاپ گیس اور پانی سے بجلی کی بڑی مقداریں ہمارے شہروں کو روشن کرنے اور ہمارے انجنوں اور مشینوں کے پہیوں کو گھمانے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ اس مشین کے عہد میں جو ملک بھی رہنمائی کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے پاس قوت محرکہ کو پیدا کرنے کے لئے ایندھن کی بڑی مقدار ہونا چاہیئے۔

ہماری اس جدید تہذیب میں قوت محرکہ پیدا کرنے کے لئے کوئلہ اور معدنی تیل کو ایندھن کے طور پر جلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیز بہنے والے پانی سے بھی قوت محرکہ کے پیدا کرنے والے پہیوں کو گھمایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اتنا کافی ایندھن پایا جاتا ہے جس سے قوم کے کام کو چلانے کے لئے کافی قوت محرکہ کو پیدا کیا جا سکے؟ ایسی صورت میں کہ دشمن امریکہ کی بندرگاہوں کا محاصرہ کریں اور بقیہ دنیا سے امریکہ کے لوگوں کو تجارت کرنے سے باز رکھیں تو کیا امریکہ کی ریلیں اور امریکہ کی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی امریکہ کے بڑے بڑے کھیت ویران اور پرتی پڑے رہیں گے یا امریکہ کے لوگ اپنے پاس کی قوت محرکہ کی مدد سے اپنے تمام کام کو چلا سکیں گے۔ ہمارے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۹۰ کروڑ ۵۹ لاکھ ٹن کوئلہ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ایک ارب

۸ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن کوئلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک ارب ۶۰ لاکھ کنستر معدنی تیل کے سالانہ پیدا کیا جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۸۴ کروڑ ۳۰ لاکھ کنستر پیدا کئے جاتے ہیں امریکہ میں آبشار کی قوت سے بجلی کی قوت محرکہ ایک کروڑ ۳۸ لاکھ گھوڑوں کی قوت کے برابر پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۴ کروڑ گھوڑوں کی قوت کے برابر قوت محرکہ پیدا کی جاتی ہے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے اس بات کا صرف ایک تصور قائم کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ والے ہر سال کس قدر کوئلہ اور معدنی تیل پیدا کرتے ہیں اور آبشار کے ذریعہ سے کتنی بجلی سالانہ بناتے ہیں۔ لیکن ان اعداد سے اس بے شمار قوت محرکہ کا پتہ نہیں چلتا جسے امریکہ والے ہر سال استعمال کرتے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے اور بہت سی باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے یہاں گنجایش نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے کس قدر حصہ کا مالک ہے

یہ تو ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ریاست ہائے امریکہ ایک بڑے رقبہ کا ملک ہے اس کے اندر دنیا کے فولاد، کوئلہ، معدنی تیل اور آبی قوت محرکہ کا ایک بڑا حصہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کی آبادی ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور یہ اس کے وسیع علاقہ میں ہزاروں جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو رقبہ کی وسعت کے باوجود ایک متحدہ قوم بنائے رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ اسے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے متعدد رشتوں سے باہم منسلک کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے عہد کی فولاد اور قوت محرکہ کی تہذیب میں چیزوں اور خبروں کو تیزی کے ساتھ منتقل کرنے کے لئے بھی عمدہ ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کی ضرورت ہے۔

گذشتہ سو سال میں امریکہ کے لوگوں نے ویران جنگلوں کو صاف کرکے فارم بنائے کانیں کھودیں اور شہروں کو بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی یعنی ریلوں، ٹیلیگرافوں، ورٹیلیفونوں کو بھی بہت ترقی دی۔ ڈاک خانوں اخباروں اور رسالوں کا بھی ایک نہایت عمدہ نظام قائم کیا۔ چنانچہ امریکہ کے لوگوں کی دولت مندی میں ان چیزوں کا بڑا زبردست حصہ ہے

لیکن اس زمانے میں جب کہ امریکہ اپنی ریلوں اور اخبار کے چھاپہ خانوں کو ترقی دے رہا تھا انگلستان فرانس اور دوسرے ملک بھی اس کام کو کر رہے تھے۔ اس لئے اس بات کا پتہ چلانے کے لیے کہ ان میں سے کون زیادہ دولت مند ہے یہ ضروری ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کا مقابلہ دنیا کے باقی دوسرے حصوں سے کیا جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ریل کی سڑکیں ۲ لاکھ ۶۲ ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ باقی تمام دنیا میں ریلوں کی لائن کی لمبائی ۵ لاکھ ۱۵ ہزار میل ہے۔ امریکہ میں دو کروڑ ۶۶ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں باقی تمام دنیا میں موٹروں کی تعداد ۸۰ لاکھ ہے۔ امریکہ میں دنیا کے ۵ فی صدی رقبہ اور ۶ فی صدی آبادی کے مقابلہ میں ۵۹ فی صدی ٹیلیفون پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے پہننے کے کپڑوں کے لئے کس قدر خام مال مہیا کرتا ہے؟

ہماری نئی تہذیب میں کپڑوں کو روئی، اون، ریشم اور چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ اگر روئی، اون یا ریشم کپڑوں، سوٹوں، قمیصوں بنیانوں، رومالوں اور موزوں کے بنانے کے لئے موجود نہ ہوتا تو ذرا سوچیے لوگ تن پوشی کا کیا انتظام کرتے امریکہ میں ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ لوگوں کی پوشاک کا انتظام کرنا پڑتا ہے اس پوشاک کے بیشتر حصہ کو انھیں چیزوں سے بنانے کی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ روئی اون اور ریشم سے زیادہ سستی ہوتی ہے اس لئے اس کی اہمیت ان خام مالوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہر سال روئی کی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ گانٹھیں پیدا کرتا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا کے باقی حصوں میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار گانٹھیں پیدا کی جاتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اناج کی پیداوار

مشینوں، فولاد اور قوت محرکہ کی وجہ سے بڑے بڑے شہر تو پیدا ہو گئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے لئے غذا حاصل کرنے کے واسطے امریکہ میں کیا انتظام کیا جاتا ہے؟ امریکہ کی تقریباً نصف آبادی شہروں میں رہتی ہے اور شہر کے لوگوں کو غذا پیدا کرنے کے کام سے بہت کم واسطہ ہوتا ہے لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ اس ملک میں بڑی

بڑے فارم بھی موجود ہیں لیکن امریکہ کی آبادی کا صرف ایک چوتھائی حصہ کھیتوں پر فی الواقعی کام کرتا ہے۔ باقی لوگ اور دوسرے مختلف طریقوں پر کام کرتے رہتے ہیں یعنی مشینوں پر گوداموں میں چلتی ہوئی ریل گاڑیوں میں یا چیزوں کو خریدنے اور فروخت کرنے کے کام سے لگے ہوئے ہیں پھر اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکہ کے کسان کھیتی کا کام ہاتھ سے نہیں کرتے بلکہ مشین کے ذریعہ کرتے ہیں وہ لکڑی کے ہلوں اور کھرپوں سے کام نہیں لیتے بلکہ ایسے ٹریکٹروں کے ذریعہ کام کرتے ہیں جو زیادہ کام کو تیزی کے ساتھ پورا کرسکتے ہیں۔ یہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ امریکہ میں دنیا کے رقبہ کا تقریباً ۵ فی صدی اور دنیا کی آبادی کا تقریباً ۶ فی صدی حصہ پایا جاتا ہے۔ دنیا کے مقابلہ میں غذا کی رسد کا تناسب ذیل کے اعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۸۰ کروڑ ۷۰ لاکھ بوشل گیہوں پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۳ ارب ۲۶ کروڑ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ گویا امریکہ میں دنیا کے گیہوں کا ۲۵ فی صدی حصہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے قسم کے اناج کی پیداوار ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۳ ارب ۷۰ کروڑ بشل ہے اس کے مقابلہ میں تمام دنیا میں ۱۲ ارب بشل دوسری قسم کے اناج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی دنیا کی رسد کا تقریباً ۲۵ فی صدی ہوتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کس قدر کاغذ پیدا کیا جاتا ہے

موجودہ زمانے میں دنیا کا کاغذ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ ہم اپنے مدرسوں کو کاغذ کے بغیر نہیں چلا سکتے ہمارے آباؤ اجداد کے زمانہ میں کاغذ کی رسد بہت کم تھی اور وہ اپنی تحریر کا کام تختیوں پر کیا کرتے تھے لیکن اب ہمارے اسکولوں میں کاغذ کا صرف بہت بڑھ گیا ہے۔ پھر سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے شہروں میں بھی کاغذ کا استعمال بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ خرید و فروخت کے پوری کاروبار کا اندراج کاغذ پر کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی خبروں کو بھی اخباروں پر چھاپ کر شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا کے اخباروں کے لیے جو کاغذ تیار کیا جاتا ہے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۵ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے

مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۵۰ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ پیدا کیا جاتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی کس قدر لکڑی پیدا کی جاتی ہے

کاغذ مختلف چیزوں سے بنایا جاتا ہے مثلاً گودڑ، سبائی گھاس، پھوس وغیرہ۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کاغذ کا بیشتر حصہ لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور یہ لکڑی امریکہ کے جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے لوگ جب کبھی اخبار پڑھتے ہیں تو گویا وہ اپنے جنگلات کی لکڑی کے ایک حصہ کو اپنے صرف میں لاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جس قدر لکڑی کاٹی جاتی ہے اس کے پورے حصہ سے کاغذ نہیں بنایا جاتا۔ لکڑی کے ایک بڑے حصہ سے عمارتیں، فرنیچر، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے کھمبے ریل کے سلیپر، جہاز اور بہت سی اور دوسری چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض قسم کے کپڑے بھی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں مثلاً مصنوعی ریشم کی وہ قسم جسے رے آن (RAYON) کہتے ہیں لکڑی سے ہی بنائی جاتی ہے۔ اور ایک سو سال پہلے تو تمام وہ چیزیں جو اب فولاد سے بنائی جاتی ہیں لکڑی سے ہی بنائی جایا کرتی تھیں۔ گرم کرنے اور پکانے کے لئے بھی لکڑی کو ہی ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود لکڑی کا جس قدر صرف آج کل کیا جاتا ہے پرانے زمانہ میں اس کا اتنا صرف نہیں تھا۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سالانہ ۲ ارب ۸۷ کروڑ ۵، لاکھ مکعب فٹ عمارتی لکڑی کاٹی جاتی ہے۔ دنیا کے باقی دوسرے حصوں میں ۲۲ ارب ۴۲ کروڑ ۸۵ لاکھ مکعب فٹ لکڑی کاٹی جاتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کے اظہار کا ایک اور طریقہ۔ امریکہ کی ملکیت کا تخمینہ ڈالروں کی شکل میں

اوپر کے بیان سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کا کچھ اندازہ تو ہو گیا۔ اس ملک میں زمین، کوئلہ، لوہا اور معدنی تیل کے قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں اور مصنوعہ اشیاء میں یہ ریل کی لائنیں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، کاغذ، سوتی کپڑا، عمارتی لکڑی وغیرہ کثیر مقداروں میں پیدا کرتا ہے۔ اس کے قدرتی وسائل زیادہ ہیں اور ان سے وہ اشیاء کو مصنوعہ

شکل دینے کا کام خود ہی انجام دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کی دولت مندی کے تخمینہ کرنے کا کوئی اور دوسرا طریقہ بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں روپیہ آنے پائی کی شکل میں بھی امریکہ کی دولت مندی کا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ زمین اور دوسرے قدرتی وسائل، مصنوعہ چیزیں، فیکٹریاں، گودام، کانیں اور فارم، ریل کی پٹریاں، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون، کاروبار کے لئے حکومت کے کاموں کے لئے اور لوگوں کے رہنے کے لئے جو عمارتیں استعمال کی جاتی ہیں —— یہ سب دولت ہیں اور ان سب کو روپیہ آنہ پائی کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے امریکہ میں اس قسم کا تخمینہ سنہ ۱۸۵۰ء میں کیا گیا تھا جس سے ۷ ارب ۱۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کی دولت کے اعداد حاصل ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جب اسی قسم کا تخمینہ دوبارہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ ۳ کھرب ۵۳ ارب ڈالر حاصل ہوا یعنی سنہ ۱۸۵۰ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۲۲ء میں امریکہ کی دولت ۹۴ گنا زیادہ ہو گئی۔ ہندوستانی سکہ میں اس کی قیمت تقریباً ساڑھے نو کھرب روپیہ ہوتی ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ دولت کے اس تخمینہ کی میزان میں کون کون سی چیزیں کس تناسب کے ساتھ شامل ہیں۔ کھرب کی رقموں کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ جب امریکہ میں گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں حکومت کا بجٹ ایک ارب ڈالر سالانہ کا بنا تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ ایک ارب ڈالر اس زمانہ میں اتنی بڑی رقم سمجھی جاتی

(ارب ڈالر)
۰ — ۲۵ — ۵۰ — ۷۵

مکانات فرنیچر اور ذاتی سامان
زراعتی دولت
تمام دوسرے تھوک اور خوردہ فروشی کی تجارت وغیرہ
مصنوعات اور کان کنی
ریل کی لائنیں اور پبلک افادہ کی چیزیں
سرکاری ملکیت (وفاقی، صوبائی اور مقامی)
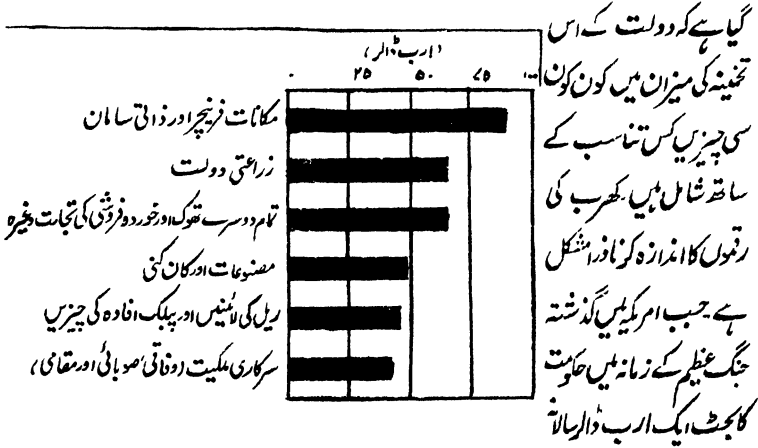
ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت یعنی مکانات، فارم، گودام، فیکٹریاں، کانیں، ریل کی لائنیں، پبلک افادہ کی چیزیں اور سرکاری ملکیت

تھی کہ اس کا کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا لیکن اب امریکہ کی قومی دولت میں سالانہ ۱۳ ارب ڈالر کا اضافہ ہو رہا ہے اور امریکہ کی حکومت تقریباً ۴ ارب ڈالر کا اپنا بجٹ بناتی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب کہ امریکہ کی دولت کا تخمینہ ۳ کھرب ۲۵ ارب ڈالر کیا گیا تھا اس وقت امریکہ کی آبادی ۱۱ کروڑ تھی۔ اس حساب سے امریکہ کی فی کس دولت کا حساب ۳ ہزار دو سو ڈالر یعنی تقریباً آٹھ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اگر امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی کو سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا تو ہر شخص کے حصہ میں جائداد اور پس انداز کئے ہوئے روپیہ کا حصہ ۸ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا اور چونکہ امریکہ کا اوسط خاندان باپ ماں اور دو تین اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے امریکہ کے ہر خاندان کی اوسط دولت کا تخمینہ ۱۳ ہزار ڈالر یا تقریباً ۳۶ ہزار روپیہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ۳۶ ہزار کی جائداد کے معنی ہیں ایک کوٹھی ضرورت کی تمام چیزیں اور کچھ تعیشات کی چیزیں۔ لیکن امریکہ میں اس سے ایک چھوٹا مکان، ضرورت کی تمام چیزیں اور تعیشات کی کچھ چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ اوپر کے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امریکہ کی دولت واقعتہً مساوی طور پر آبادی کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ اس دولت کا ایک بڑا حصہ ریل کی لائنوں، فیکٹری، کاروبار کی اونچی اونچی کوٹھیوں پر مشتمل ہے جن کی مالک انجمنیں اور کمپنیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دولت کا ⅔ حصہ یا تو حکومت کی ملکیت میں ہے یا ریل کی لائنوں، روشنی، گرمی اور قوت محرکہ مہیا کرنے والی کمپنیوں اور کانیں کھودنے والی کارپوریشنوں کی ملکیت میں ہے یا تھوک فروشی اور خوردہ فروشی کرنے والی دوکانوں کے قبضہ میں ہے۔ ان کے علاوہ جو دولت باقی بچتی ہے صرف اس میں مکانات، فرنیچر، کپڑے، لطیفت اور ان کی پیداواریں شامل ہیں۔

کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اپنے ملک میں ہی پیدا کر لیتا ہے؟

اوپر جو مثالیں درج کی گئیں ان کے مطالعہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی

ضرورت کی تقریباً تمام چیزوں کو خود اپنے ملک کے حدود کے اندر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے
غذا، کوئلہ، لوہا، لکڑی کپاس غرضکہ تمام چیزیں جس سے یہاں کی آبادی آرام اور اطمینان کی زندگی بسر
کر سکتی ہے امریکہ میں پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ دوسرے ملکوں کی پیداوار سے
بالکل آزاد ہے۔ مثلاً اگر فرض کیجیے انگلستان، فرانس، جرمنی اور جاپان ایک دن اس بات کا فیصلہ
کرلیں کہ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اپنی تجارت جاری نہیں رکھیں گے تو کیا یہ ملک
اپنے کاروبار کو حسب سابق جاری رکھ سکے گا۔ بظاہر اس قسم کا امکان بہت غیر اغلب معلوم ہوتا
ہے لیکن یہ چیز ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ، فرانس، روس، اٹلی اور ریاست ہائے
امریکہ نے جرمنی اور آسٹریا کو اس طرح محصور کرلیا تھا کہ ان ملکوں کے لئے باہر سے کچا یا بنا ہوا مال
لانا ناممکن ہوگیا تھا۔ اور ان دونوں ملکوں کو اپنی دس کروڑ آبادی کی غذا اور نگہداشت کے لئے پورے
طور پر اپنے وسائل پر ہی دارومدار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ ملک بڑی سخت تنگی
کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو اپنے تعیشات کو ترک کرنا پڑا
پھر کچھ مہینوں کے بعد اپنی آرام و آسایش کی چیزوں کو اور بعد میں فاقہ کی نوبت آگئی۔ جب جنگ
ختم ہوئی تو سینکڑوں آدمی ان سختیوں کو برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے مرچکے تھے۔ اس لئے
اس قسم کی افتاد کو ناممکن سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ آئیے اس بات کا پتہ چلائیں کہ امریکہ کن چیزوں کے لئے
دوسرے ملکوں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ مثال کے طور پر ربڑ کو لیجیے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے ربڑ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں موٹروں اور موٹر لاریوں کی بہت کثرت ہے اور ان کے
پہیوں کے بنانے میں ربڑ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ فرض کیجیے کہ ان
سینکڑوں جہازوں کا داخلہ جو ربڑ لاکر امریکہ پہنچاتے ہیں ناممکن ہو جائے تو امریکہ کے موٹر
کتنے دن تک چلتے رہیں گے؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ موٹر
کے اچھے ٹائر کتنے میل سفر کرنے کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں۔ غالباً دس ہزار میل یا غیر معمولی

حالات میں ۱۵ ہزار میل تک یہ ٹائر چل سکتے ہیں۔ پھر جب اس قدر چل کر یہ گھس جائیں گے تو کیا کیا جائے گا۔ بلا شبہ نئے ٹائروں کی ضرورت ہوگی اور ابھی تک ربڑ کے علاوہ کسی اور دوسری ایسی چیز کا علم حاصل نہیں ہو سکا ہے جسے ٹائر کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ جب ربڑ نہیں رہے گی تو مجبوراً ایسے دھات کے ٹائروں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جنھیں ربڑ کے ہوا سے بھرے جانے والے ٹائروں سے پہلے گاڑیوں اور کوچوں کے کھینچنے کے لئے استعمال کیا جایا کرتا تھا۔

پھر اس کے علاوہ ربڑ سے اور بھی بہت سی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں جنھیں ہم روز مرہ استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً ٹیلیفون میں باغوں کے پانی دینے کے نلوں میں مشینوں میں ریل گاڑیوں کے ہوائی بریک میں ربڑ کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ربڑ کہاں پیدا ہوتا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ سے معلوم کیا جا سکے گا

دنیا کے ربڑ کی پیداوار کا کس قدر فی صدی حصہ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے

کہ ربڑ کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ۹۹ فی صدی سے زائد ربڑ جزائر شرقی میں پیدا ہوتا ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غالباً مشکل سے ایک پونڈ ربڑ پیدا ہوتا ہوگا۔

مگر اس کے باوجود ربڑ کے استعمال کرنے والوں میں جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے امریکہ کا نمبر اول ہے۔ امریکہ دنیا کی پیداوار کا تقریباً ½ حصہ صرف کرتا ہے

پیدا کچھ نہیں کرتا جو پیدا تو نہ کرے اور خرچ بہت زیادہ کرے۔ ایسا ملک دوسرے ملکوں کی تجارت سے اپنے آپ کو کس طرح آزاد کر سکتا ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصوں سے امریکہ کا تعلق قطع ہو جائے تو امریکہ کے لوگوں کو اپنے رہنے سہنے کے طریقوں میں بڑی زبردست تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔
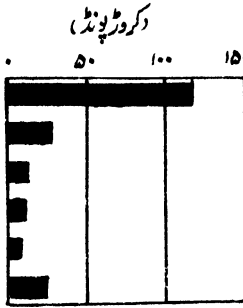
دنیا میں جس قدر کل ربڑ استعمال ہوتا ہے اس کا کتنا فی صدی حصہ امریکہ میں صرف کیا جاتا ہے

غرضکہ اوپر کے بیان سے امریکہ کی دولت مندی اور محرومی کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کو چند چیزوں کے لئے تو بلا شبہ دوسرے ملکوں پر دارومدار کرنا پڑتا ہے لیکن باقی بیشتر چیزوں کو امریکہ خود اپنے علاقہ میں پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں یہ چیز نہیں کہی جا سکتی بعض ملکوں کی دولت مندی تقریباً تمام تر دوسروں کے ساتھ تجارت کرنے پر منحصر ہے۔ بعض ملک نوآبادیوں کو اپنی سلطنت کا جزء بنا کر اپنی خوش حالی کو قائم رکھتے ہیں بعض نوآبادیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں اور اپنی موجودہ دولت مندی کو دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر دیکھتے ہیں۔ بعض اپنے قدرتی وسائل سے خود فائدہ اٹھانے کی صلاحیت یا قدرت نہیں رکھتے۔ غرضکہ ملکوں کی دولت مندی کا فیصلہ کرنے کے لئے ان تمام باتوں کو نظر کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

کاروبار کی تنظیم کی مختلف شکلیں

ابتدائی معاشی مصروفیت | کاروبار کے معنی ابتدا میں حصول معاش کے لئے مصروف رہنا ہوا کرتے تھے لیکن اب اس کے معنی نفع کے لئے مصروف ہونا ہو گئے ہیں۔ اسی
اور جرگہ یا CLAN

طرح کاروبار کی تنظیم کے معنی ابتدا میں کسی ایسی معاشی جدوجہد کے ہوا کرتے تھے جو منظم طریقہ پر کی جائے لیکن اب اس میں نفع یا توفیر کا مفہوم بھی چھپا ہوا موجود رہتا ہے۔ تنظیم کے لئے انگریزی لفظ ENTERPRISE انٹرپرائز ہے جس کے معنی ہیں تہیہ کرنا۔ جب ہم دولت کے حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ ہماری معاشی جدوجہد ہوتی ہے۔ جب ہم منظم جدوجہد کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ گویا کاروباری تہیہ یا انٹرپرائز بن جاتا ہے۔

عہد جدید میں اس قسم کی جدوجہد کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ناظم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ناظم کو انڈرٹیکر UNDERTAKER کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اب چونکہ یہ لفظ ایک خاص کاروبار[1] کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے اس لئے اب تہیہ کرنے والوں کو انٹری پرنیور ENTREPRENEUR کہنے لگے ہیں۔

نہایت ابتدائی قسم کی کاروباری تنظیم خاندان ہی کی ایک وسیع تر شکل ہوا کرتی تھی۔ لیکن خاندان بذات خود ایک طویل سلسلہ ارتقا کا ماحصل ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے خاصی وسیع شہادتیں موجود ہیں کہ انسانوں کے وحشی آباواجداد چند درجن افراد کے چھوٹے چھوٹے گلوں یا گروہوں میں ادھر ادھر گھوما کرتے تھے۔ ان کی تعداد کی کمی اور بیشی کا انحصار عموماً اس بات پر ہوا کرتا تھا کہ غذا کی

---

[1] یعنی ان پیشہ ور لوگوں کے لیے جن کا کام تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔

لئے جڑوں بوٹیوں کی رسد کتنی ہے شکار کے دستیاب ہونے کے امکان کس قدر ہیں اور پانی کی موجودگی کی کیا کیفیت ہے۔ ابتدا میں گلہ یا گروہ کے سردار کو جنسی تعلقات پیدا کرنے کا اجارہ حاصل ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں جب یہ اجارہ ختم ہوا تو جنسی تعلقات میں سخت انتشار اور بے عنوانی پیدا ہوگئی۔ لیکن آہستہ آہستہ شادی کی متعین شکلیں پیدا ہونے لگیں جن میں رشتہ داری کا شمار ماں کی طرف سے ہونے لگا۔ ماں کی طرف سے نسل کا پتہ اس لئے لگایا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں شادی کا جو جماعتی طریقہ رائج تھا اس میں کسی بچہ کے لئے اپنے باپ کا پتہ چلانا بہت مشکل تھا۔ اس قسم کے جو گروہ تاریخ کی ابتدا میں ہمیں ملتے ہیں انھیں CLAN یا جرگہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ ان جرگوں کے اراکین اپنے نسب کا سلسلہ ماں سے چلاتے تھے اس لئے انھیں رحمی مادری یا اموی قبیلوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں عورتوں کی ابتدائی زراعت یا کھرپے کی کاشت نے زیادہ اہمیت اختیار کرلی تھی یا جہاں خانگی فنون مثلاً کپڑا بننے اور کھانا پکانے کی ضرورت کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا وہاں عورتوں کی اہمیت میں ان معاشی وجوہ کی بنا پر بھی اضافہ ہوگیا اور ان جگہوں پر ہمیں جماعت کا وہ نظام نظر آتا ہے جسے MATRIARCHATE یعنی عورتوں کی حکومت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا مادری MATRIARCHAL نظام تو ہمیں کہیں کہیں ہی ملتا ہے لیکن مادری یا اموی جماعت جس کا انحصار رحمی قبیلہ پر ہوتا تھا تقریباً ہمہ گیر تھی۔

اس ابتدائی قبیلہ کی جماعتی خصوصیات کو یہاں صرف اختصار کے ساتھ ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ عہد کے خاندان کے قسم کی کسی چیز کا اس عہد میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ماں اپنے چند بہت چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ یکجا رہا کرتی تھی رشتہ کا عام تعین قبیلہ کی رکنیت کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اور قبیلہ کے افراد کے درمیان جنسی تعلق کا پیدا کرنا سخت جرم سمجھا جاتا تھا ہر قبیلہ اپنی اصل کا پتہ ایک قدیم ترین جد امجد سے لگایا کرتا تھا یہ عام طور پر کوئی نہ کوئی جانور یا پودا ہوتا تھا اور ٹوٹم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور مقدس اور لائق پرستش سمجھا جاتا تھا۔ ٹوٹم کی پرستش کس

طرح شروع ہوئی یہ بات ابھی تک ایک راز سربستہ ہے لیکن اس کے وجوہ غالباً معاشی تھے۔ ٹوٹم ابتدا میں غذا کا خاص ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں بار بڑھ کے لئے اس قدر مفید ہو گیا کہ اس کا غذا کے طور پر استعمال کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جہاں حالات آبادی کے بڑھنے کے لئے موافق ہوتی تھے وہاں جرگے ترقی کر کے بڑے قبیلے بن جاتے تھے اور ان قبیلوں میں باہم دور کی رشتہ داری پائی جاتی تھی۔ چھوٹے قبیلے اور بعض صورتوں میں بڑے قبیلے مشترکہ کھیلوں، تقریبوں اور عبادتوں کے مرکز ہوا کرتے تھے اور ان کے درمیان ایسے قبائلی مراسم پیدا ہو گئے جنھوں نے بعد میں ترقی پا کر قوانین اور اخلاقی اصول کا مرتبہ حاصل کر لیا۔

خاندان | چھوٹے قبیلوں کی معاشرت کے ختم ہو جانے کے اسباب بھی معاشی ہی تھے۔ جہاں حالات گلہ بانی کی ترقی کے لئے سازگار تھے وہاں جانوروں کے گلے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور باپ کا اقتدار ملکیت کے محافظ اور روزی فراہم کرنے والے کی حیثیت سے مسلّم ہو گیا۔ جن مقامات پر جڑ کھودنے والی اور شکاری منزل کی جگہ زراعت نے لی وہاں زمین کے جوتنے، مکان کے بنانے اور ترکہ کو قائم رکھنے میں مرد کی محنت نہایت اہم ہو گئی اور اس کے بعد سے معاشی تنظیم میں مرد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی اور اس بنا پر ابوی یا PATRIARCHAL خاندان پیدا ہو گئے۔

FAMULUS جس سے انگریزی لفظ FAMILY نکلا ہے لاطینی زبان میں ملازم یا غلام کو کہتے ہیں۔ اور اس لفظ کے معنی خاندان اس لئے ہو گئے کہ اس نئے خاندانی گروہ کے تمام اراکین اپنے باپ یا ابوالآبا کے خادم ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ خاندان کے تمام رشتے ملکیت کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔ باپ زمین، گلوں، بیوی یا بیویوں، بچوں اور غلاموں کا مالک ہوتا تھا اور ان کے علاوہ خاندان کے اور تمام رشتہ داروں پر بھی اس کا اقتدار مالکانہ ہی ہوا کرتا تھا۔ باپ کی ہی بیوی اور بیٹے کو نام ملنے لگے اور ترکہ خاندان کے ایک سردار سے دوسرے سردار کو وراثت میں ملنے لگا۔ اب زبردستی گرفتار کر کے شادی کرنے کی جگہ خرید کر شادی کی جانے لگی اور ابتدائی قبیلوں کے جماعتی رشتہ ازدواج کی جگہ تعدادِ ازدواج نے لے لی اور اخیر میں گھر کے کھیا کا صرف

ایک بیوی سے رشتہ ازدواج قائم ہونے لگا جس کی وجہ سے اس نئے خاندانی گروہ کے اتحاد میں زیادہ قربت اور اس کی تنظیم میں زیادہ مضبوطی پیدا ہوگئی اور معاشی تعلقات کی شدت کے احساس نے وہ پدرانہ اور برادرانہ تعلقات پیدا کر دیئے جنھیں اخلاقی ترقی کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ اس ابویانہ نظام کا تعلق بعض علاقوں میں تو زراعت سے تھا جیسے یونان اور روم کی ابتدائی تاریخ میں اور بعض جگہ گلہ بانی سے جیسے کہ بائبل کے پیٹریارکوں کی زندگی میں۔ لیکن بہر صورت اس جدید اور حیات پرور ابویانہ نظام میں کچھ عرصہ تک قبائلی جماعت کی ظاہری شکل باقی رہی۔ لیکن جب قبائلی نظام کی معاشی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں تو قبائلی نظام کی پوری عمارت گر پڑی۔ جہاں کہیں وسیع تر معاشی مفاد کے اشتراک نے قبیلہ کے خونی رشتوں کی جگہ لے لی وہاں قبائلی جماعت کی جگہ سیاسی جماعت پیدا ہونے لگی اور اس طرح ریاست اور منظم حکومت کی ابتدا ہوئی۔

فلسطین یونان اور روم اور اسی طرح پران تمام ملکوں میں جنھوں نے تہذیب کو اپنی ذاتی کوششوں سے ترقی دی اسی قسم کے تدریجی ارتقا کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان ملکوں میں جہاں ادنیٰ تہذیبوں کو یکبارگی اعلیٰ تر تہذیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا پڑے اس تدریجی ارتقا کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ٹیوٹن نسل کے قبیلوں کے تعلقات جب روم سے قائم ہوئے تو انھوں نے قبائلی معاشرت کو چھوڑ کر سیاسی معاشرت کو اختیار کر لیا۔ تقریباً یہی صورت آئرلینڈ پر انگلستان کے اثر کے بھی کہی جا سکتی ہے کیونکہ آئرلینڈ کے SEPTS عہد وسطےٰ میں کافی زمانہ تک قبائلی زندگی گذارتے رہے تھے اور اسکاٹ لینڈ میں تو آج سے ایک دو صدی پہلے تک قبائلی معاشرت کا زور باقی رہا۔

اوپر کی تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوی خاندان معاشی اسباب کا نتیجہ تھا اور جب تک وہ معاشی اسباب موجود رہے جنھوں نے ابوی خاندان کو معاشرتی اور سیاسی زندگی کی بنیاد بنا دیا تھا۔ ابوی خاندان بھی قائم رہا۔ لیکن صنعت و تجارت کی ترقی سے نیز خاندان کے بہت سے افراد کے لئے آزاد اور خود مختارانہ جدوجہد کے مواقع پیدا ہو جانے سے پرانے بڑے خاندانی گروہوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور اس کی جگہ جدید عہد کے مختصر خاندان پیدا ہوگئے جن میں خاندانی تعلق بہت

قریبی رشتہ داروں تک محدود ہوگیا اور اب حال میں معاشی زندگی کے جدید ترین ارتقا اور اس کی آزادی اور مقابلہ و مسابقت نے خاندانی نظم و انضباط کو اور بھی توڑ دیا۔ عورتیں آزاد ہوگئیں، طلاق کی کثرت ہوگئی، بچوں کے غیر شادی شدہ رہنے کا زمانہ برابر طویل ہوتا گیا اور اس طرح پر جدید خاندان کی زندگی کے وہ تمام اخلاقی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوگئے جن کے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

اوپر کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان کو ایک کاروباری تنظیم کے نام سے صرف اس ابتدائی مفہوم کے ساتھ موسوم کیا جا سکتا ہے جس میں محض روزی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے نفع حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ دولت کی پیدائش کا کام گھر کے اندر کیا جاتا تھا گھر کے لوگ ہی اس کام کو کرتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے لوگ بھی گھر کے ہی آدمی ہوتے تھے یعنی دولت کے پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والے دونوں خاندان کے ہی افراد ہوتے تھے خاندان کا ہر فرد سب کے لئے محنت کرتا تھا اور سب کی پیدائش کو صرف میں لاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کاروبار کو اس کے موجودہ مفہوم کے ساتھ یعنی نفع کے لئے تنظیم دینے کی پہلی کوششیں بھی خاندانی گروہ کی بعد کی شکلوں میں ہی شروع کی گئیں۔ مثلاً جمہوریت روما کی پلانٹیشنس میں جن کے اندر غلاموں کی محنت سے کام لیا جاتا تھا واضح طور پر کاروباری تنظیم نظر آتی ہے اسی طرح ان بڑے بڑے خاندانوں کی تنظیم بھی جو عہد وسطےٰ کے ابتدائی زمانہ میں ترقی پاکر دیہی جماعتوں میں منتقل ہوگئے تھے کم از کم جزوی طور پر کاروبار جیسی تھی۔ پھر ہمیں خاندان کی کاروباری تنظیم اور اشتراک عمل کی ایسی مثالیں صرف زراعت میں ہی نہیں ملتیں بلکہ تجارت میں بھی ملتی ہیں مثلاً عہد وسطےٰ کی پنچایتوں COMMUNES کے تجارتی معاملات اور لین دین کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی نیز یہ چیز صنعت میں بھی ملتی ہے جیسے روس کی آرٹل میں جو مزدوروں کی انجمن ہائے امداد باہمی کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کے لئے اگر اس کا مفہوم نفع طلبی لیا جائے خاندان کی تنظیم کچھ زیادہ موزوں نہیں تھی اور مسابقت کی زندگی کو جتنی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی اتنے ہی خاندان کے قابل و کارگزار افراد خاندان کی

تنظیم سے علیحدہ ہوتے گئے۔ زراعت پیشہ لوگوں کی قدامت پسندی کی وجہ سے زراعت میں تو یہ چیز آہستہ آہستہ پیدا ہوئی لیکن صنعت وتجارت میں یہ ترقی تیزی کے ساتھ ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ کاروبار کی اعلیٰ ترین ترقی یافتہ شکلوں کو صنعت وتجارت میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

مددگاروں یا مزدوری پر کام کرنے والوں کا نظام

جب صنعت خاندانی گروہ بندی کی حدود سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور جب حالات غلامی کی ترقی کے لیے سازگار نہیں رہتے تو صنعت کے کام میں بیرونی امداد لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور آوارہ گرد آزاد کاریگر جو گاؤں گاؤں اور گھر گھر گھومتے پھرتے ہیں خاندان کا بہت سا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بڑھی، چمار، قلعی گر، معمار، کپڑا سینے والی عورتیں اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ ان گھومنے والے دستکاروں کو ان کی خدمات کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور انھیں عارضی طور پر خاندان کا رکن بنالیا جاتا ہے۔ یہ رسم آج تک باقی ہے۔ نیو انگلینڈ (امریکہ) میں اس قسم کے کام کرنے والوں کو مددگار "HELP" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مغربی امریکہ کے کسانوں کو جو مزدور امداد دیتے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں اور انھیں مزدوری پر کام کرنے والے "HIRED MAN" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لیے اس نظام کے لیے "مددگاروں یا مزدوری پر کام کرنے والوں کے نظام" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ہر جماعت کی ابتدائی تاریخ میں اس قسم کا نظام ملتا ہے اور جو لوگ سوئٹزرلینڈ یا اسکنڈینیویا کی دیہی جماعتوں سے واقف ہیں وہ موجودہ زمانہ میں بھی اس نظام کے رائج ہونے کی شہادت دیں گے۔

مددگاروں کے نظام کو ایک درمیانی اور عبوری چیز سمجھنا چاہیے کیونکہ خاندانی گروہ کو اس نظام کے رائج ہونے کے بعد بھی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ چیزوں کو استعمال کرنے والا شخص پہلے کی طرح اب بھی کچا مال مہیا کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں اسے بنا ہوا مال مل جاتا ہے۔ محنت اور اوزار کاریگر کے ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ تبدیلی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ چھوٹا کنبہ رکھنے والے خاندان محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انھیں بیرونی امداد کی ضرورت اکثر پیش آنے لگی ہے گو یہ ضرورت بہت زیادہ سخت نہیں ہوتی اور بڑے خاندانی گروہوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ زائد مددگاروں کو رکھنا ان کے لیے

نفع بخش ہے۔ اس طرح پر لوہاروں، آٹا پیسنے والوں، نانبائیوں اور جولاہوں کے پیشے مستقل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں جو کاریگر آوارہ ادھر ادھر گھوما کرتے تھے اب وہ ایک جگہ سکونت اختیار کرتے ہیں اور مددگاروں سے بھی دست کاروں کا ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو خاندانی گروہ سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ جب یہ منزل آجاتی ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے نظام دست کاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دستکاری کا نظام | اس نظام میں کاریگر بالکل خود مختار ہوتا ہے۔ اب وہ مصرف کے گھر میں کام نہیں کرتا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔ خود ہی بازاروں میں خام اشیاء خریدنے کے لئے جاتا ہے۔ خام اشیاء کو اپنے گھر میں اپنے اوزاروں سے بناتا ہے اور بنی ہوئی اشیاء کو اپنی دوکان سے مصرف کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اب خاندانی نظام کی طرح دولت کی پیدائش خاندان کے لئے نہیں کی جاتی۔ یا مددگاروں کے نظام کی طرح خام شے اور مصنوعہ شے کا مالک مصرف نہیں ہوتا بلکہ اب کام کا ہر پہلو (آخری شے مصنوعہ کے فروخت ہونے تک) کاریگروں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔ کاریگر ہر چیز کو اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کو ہم دستکاری کے نظام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چیزیں اس سے پہلے یا اس کے بعد ہاتھ سے نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ اس سے اس حقیقت کا اظہار کرنا منظور ہے کہ اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کاریگروں کا ایک مستقل طبقہ بن جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے کاروبار کی تنظیم ذاتی طور پر کرنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ کاریگر اپنے گاہکوں کی فرمائش پر چیزیں بناتے ہیں اس لئے اس نظام کو سائی کے نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں ان کاریگروں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو پنچایتوں یا پیشوں میں منسلک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے تاریخ میں اس نظام کو پنچایتی نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے لیکن پنچایتیں سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہوا کرتی تھیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں ہمیں ایسے دستکاروں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو پنچایتوں سے منسلک نہیں تھے۔ پنچایتی نظام میں ہر کاریگر کو پنچایت کے رکن بن جانے

کی توقع رہتی تھی. کام کی ابتداً امیدوار کے درجہ سے کی جاتی تھی. پھر خلیفہ کی حیثیت سے چند سال گذارے جاتے تھے اور جب پیشہ کے جزو کل سے خوب واقفیت پیدا ہو جاتی تھی تو استاد کا درجہ مل جاتا تھا۔
اگر موجودہ اصطلاحوں کو استعمال کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دستکار آجر بھی ہوتے تھے اور تاجر بھی سرمایہ دار بھی ہوتے تھے اور مزدور بھی. طبقوں کی موجودہ تفریق اس وقت موجود نہ تھی۔ اپنے اقتدار کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پنچایتوں کو سیاسی اقتدار بھی حاصل ہونے لگا تھا۔ دستکار چونکہ اکثر شہروں میں رہتے تھے اس لئے شہری اور دستکار ہم معنی لفظ بن گئے تھے۔ دیہات اور شہر کی تقسیم عمل بھی بہت نمایاں ہو گئی تھی اور MANOR مینر کی حیثیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ وہ شہری پنچایتوں کو خام مال مہیا کیا کرتے تھے جس طرح عزلت نشین گھریلو معیشت سے صنعت کا خاندانی نظام وابستہ تھا اسی طرح تجارتی یا مقامی معیشت کے ساتھ پنچایتی یا دستکاری کا نظام وابستہ تھا۔
صلیبی جنگوں کے کئی صدی بعد تک یورپ کی صنعتی زندگی پر پنچایتی نظام حاوی رہا۔ لیکن دولت کے اضافہ سے دو نئی باتیں ترقی پاتی رہیں۔ اول تو یہ کہ پنچایتیں زیادہ خودغرض اور محدود ہوتی گئیں یہاں تک کہ وہ اجارہ دار بن گئیں۔ اور صنعتی ترقی میں معاون ہونے کی جگہ مزاحم ہونے لگیں۔ رکنیت صرف چند منتخب افراد تک محدود ہو گئی جن کے درمیان پیشہ اختیار کرنے کا حق وراثتاً منتقل ہونے لگا اور عام کاریگروں کو منافع میں شرکت کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ اور اس لئے جہاں کہیں ممکن ہو سکا انھوں نے اپنے لئے پرانے دستکاروں سے علیحدہ نئی صنعتیں شروع کیں۔ اور دوسری بات جو زیادہ اہم تھی یہ تھی کہ جب دستکاروں کے پاس دولت جمع ہونے لگی تو ان کو یہ خواہش بھی ہوئی کہ اسے نفع بخش کاروبار میں لگائیں چنانچہ صحیح معنی میں صنعتی سرمایہ پیدا ہونے لگا اور چونکہ اس صنعتی سرمایہ کو پرانے نظام کے ماتحت کاروبار میں لگانا ممکن نہیں تھا اس لئے پنچایتی یا دستکاری کا نظام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور اس کی جگہ دوسری منزل نے جسے خانگی نظام سے موسوم کر سکتے ہیں پیدا ہو گئی۔
خانگی نظام | خانگی نظام میں سب سے پہلے سرمایہ دار یعنی آجر اور مزدور کے درمیان ایک خلیج حائل ہونا

شروع ہوگئی۔ مددگاروں کے نظام میں بھی آجر ہوا کرتے تھے لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ مزدور اور مصرف بھی ہوتے تھے۔ دستکاری کے نظام میں آجر اور مصرف میں فرق پیدا ہوگیا لیکن پھر بھی آجر جزئی طور پر کاریگر کا کام کیا کرتا تھا۔ لیکن خانگی نظام میں آجر اور کاریگر میں پوری طرح تفریق پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ بنائی ہوئی چیز کے فروخت کرنے کا طریقہ بھی بدل گیا جس کی وجہ سے خانگی نظام نہ صرف مددگاروں کے نظام سے بلکہ دستکاروں کے نظام سے بھی مختلف ہوگیا۔ مددگاروں کے نظام میں پیداوار کو فروخت نہیں کیا جاتا تھا بلکہ آجر اسے اپنے صرف میں لے آتا تھا۔ دستکاروں کے نظام میں دولت کی پیدائش چھوٹے پیمانے پر اور فرمائش کے مطابق کی جاتی تھی اس لئے مصنوعہ شے کو دستکار براہ راست مصرف کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ مگر جب سرمایہ کی وجہ سے دولت کی پیدائش بڑے پیمانہ پر ممکن ہوگئی تو بازار اتنا وسیع ہوگیا کہ دستکار کے لئے ذاتی اور انفرادی طور پر حاوی ہونا ممکن نہیں رہا اور نہ اس کے لئے یہ بات ممکن رہی کہ ان خاص طریقوں کو اختیار کرے جو اشیاء مصنوعہ کو فروخت کرنے کے لئے ناگزیر ہوگئے تھے۔ سرمایہ دار ہی ان کاموں کو کرسکتا تھا اس لئے یہ سرمایہ دار ہی کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ خانگی نظام کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اوزاروں کا مالک تو کاریگر ہی رہتا ہے اور کام کو اکثر اپنے خاندان والوں کی مدد سے اور زراعتی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے گھر پر ہی انجام دیتا ہے لیکن شے مصنوعہ کی پیدائش کا کام اب دو طبقوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اول تو وہ طبقہ جو کچے مال کو خریدتا اور مصنوعہ اشیاء کو فروخت کرتا ہے اور دوسرا وہ طبقہ جو اپنے ہاتھ کی محنت سے دولت پیدا کرتا۔ اپنے اوزاروں کو خود ہی فراہم کرتا اور اپنی ہی کارگاہ میں کام کو انجام تک پہنچاتا ہے۔

خانگی نظام کی اصطلاح مفہوم کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے کیونکہ دستکاری اور پنچایتی نظام میں بھی کاریگر اپنے گھر پر ہی کام کیا کرتا تھا۔ مگر اس اصطلاح کو بعد میں آنے والے اُس نظام سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کاریگر کو اپنے گھر پر کام کرنا ترک کرنا پڑا تھا۔ خانگی نظام میں کاریگروں نے ہاتھ سے کام

کرنا جاری رکھا تھا مگر چونکہ اب ان کا اختیار دولت کی پیدائش کے پورے کام پر باقی نہیں رہا تھا اس لئے اس نظام کو دستکاری کے نظام سے بھی مختلف قرار دیا جا سکتا ہے۔ خانگی کاریگر کے لئے جو اصطلاح اس نظام کی ترقی کے زمانہ میں استعمال کی جاتی تھی وہ مینوفیکچر یعنی چیزوں کو ہاتھ سے بنانے والے کی اصطلاح تھی۔ کبھی کبھی اس کے کام کو خانگی کام کی جگہ مفوضہ کام COMMISSIONWORK سے بھی موسوم کیا جاتا تھا کیونکہ اس نظام میں سرمایہ دار جو خام شے کا مالک ہوتا تھا ایک دوسرے خود مختار شخص کے ذمہ یہ خدمت تفویض کرتا تھا کہ وہ خام شے کو مصنوعہ شکل دے کر سرمایہ دار کو واپس کر دے۔

خانگی نظام کو سترھویں صدی میں ترقی ہوئی اور انگلستان میں یہ نظام اٹھارھویں صدی میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ لیکن جیسے جیسے کاروبار کی مختلف منزلوں میں سرمایہ کا اضافہ ہوتا رہا اس میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ سب سے اہم تبدیلی پیدائش دولت کے کام میں کفایت کی تدبیریں اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں محنت کو بچانے والے طریقے اور مشینیں ایجاد کی جانے لگیں جو انسانی قوت کی جگہ مشین کی قوت سے کام لیتی تھیں اور ان کی وجہ سے کاروبار میں نفع بخش طریقہ پر سرمایہ لگایا جانے لگا۔ ۱۷۶۰ء سے قبل اس قسم کے ابتدائی تجربے پارچہ بافی کی صنعت میں شروع کئے گئے تھے لیکن ۱۷۶۰ء سے ۱۷۹۰ء تک کے زمانہ میں بہت سی بڑی بڑی ایجادیں ہوئیں۔ پھر ۱۸۳۰ء کے بعد دخانی ریلوے اور دخانی جہازوں کی استعمال کی وجہ سے مال کی منڈیاں بہت وسیع ہو گئیں۔ دوسری صنعتوں میں بھی اسی قسم کی ترقیاں ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے فیکٹری کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فیکٹری کا نظام | یہی وہ نظام ہے جس کے ماتحت جدید دنیا اپنی زندگی گذار رہی ہے۔ اس نظام میں سرمایہ دار آجر نہ صرف کچا مال مہیا کرتا ہے اور مصنوعہ مال کو فروخت کرتا ہے بلکہ کام کرنے کے طریقوں پر بھی اسے پورا اختیار و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مشین اتنی مہنگی ہوتی ہے کہ مزدور کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور چونکہ مشین آجر کی ملکیت میں شامل ہوتی ہیں اس لئے وہ عمارتیں

بھی جن میں مشینیں لگی ہوتی ہیں اور جہاں دولت کی پیدائش کا کام کیا جاتا ہے اسی کے قبضہ میں آجاتی ہیں اور انھیں فیکٹری کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔ دستکاری کے نظام کی طرح اب مزدور خودمختار نہیں رہتا۔ اب اوزار اور کارگاہ پر بھی خانگی نظام کی طرح اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اب اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اس محنت کو مہیا کرتا رہے جو سرمایہ دار کی مشینوں کو اس کی کارگاہ میں چلاتی ہیں۔ دولت کی پیدائش میں اس نئے نظام کے رائج ہونے سے جو غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اس کا اثر مزدور پر بھی دولت کے پیدا اور صرف کرنے والے کی حیثیت سے پڑتا ہے اور مزدوروں کی آبادی میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگتا ہے اور دیہات سے شہر کی طرف ایک مسلسل آمد شروع ہوجاتی ہے صنعتی جماعت کو اس کی موجودہ شکل ملنے لگتی ہے اور جماعتی آمدنی زمیندار کے لگان، مزدور کی اجرت، سرمایہ دار کے سود اور آجر کے نفع کی شکل میں تقسیم ہونے لگتی ہے مینوفیکچرر کے معنی اب دستکار کے نہیں رہتے بلکہ اب اس کے معنی اس شخص کے ہوجاتے ہیں جو دوسروں کو اپنا کام کرانے کے واسطے ملازم رکھتا ہے۔ سرمایہ کی ترقی سے مقابلہ اور تخمین میں اضافہ ہوتا ہے۔ درمیانی سرمایہ داروں کے نئے طبقے نمودار ہوجاتے ہیں اور اعتبار اور مبادلہ کے طریقے بالکل بدل جاتے ہیں۔ صنعتی سرمایہ دار اور آجر کا اقتدار اس قدر نمایاں ہوجاتا ہے کہ سارے کاروباری نظام کو فیکٹری سسٹم کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔

اس نئی منزل کا ارتقا اپنی تمام پیشرو منزلوں سے اس درجہ مختلف ہے کہ جس طریقہ سے یہ وجود میں آئی ہے اسے صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے لیکن اگر انقلاب کا مفہوم یہ ہے کہ پرانا نظام یکبارگی مکمل طور پر بدل دیا گیا تو اس نام کا انتخاب ٹھیک نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ کام تدریجی طور پر ہوا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت میں پوری طرح تبدیلی پیدا ہونے کے لئے تیس چالیس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور دوسری صنعتوں میں فیکٹری نظام خانگی نظام کی جگہ انیسویں صدی میں لے سکا۔ انگلستان سے باہر یہ تحریک اور بھی زیادہ آہستہ آہستہ چلی اور انگلستان میں آج بھی

بعض ایسی صنعتیں موجود ہیں مثلاً شیشہ کی صنعت، چھری کانٹوں کی صنعت، لوہے کی زنجیر بنانے کی صنعت جس میں فیکٹری سسٹم بہت معمولی طریقہ پر داخل ہو سکا ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کاروبار کی تنظیم کی یہ تمام صورتیں دوسری صورتوں سے نہایت واضح طور پر مختلف ہیں۔ ہر منزل میں ہمیں گذشتہ منزلوں کے باقی ماندہ آثار ملتے ہیں۔ خاندانی نظام اب بھی تمام ملکوں کے ان دور افتادہ علاقوں میں ملتا ہے جہاں جدید خیالات کی رسائی ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے مثلاً امریکہ کے جنوبی اپالیشن پہاڑوں میں مددگاروں کے نظام کا مشاہدہ مختلف قسم کی گھریلو اور دوسری خدمتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ دستکاری نظام کا نمونہ چمار اور درزی کے یہاں مل سکتا ہے خانگی نظام یورپ کے پارچہ بافوں اور جدید شہروں کے ان حصوں میں مل سکتا ہے جہاں بہت کم مزدوری قبول کر کے لوگ کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی قوم کی معاشی زندگی کی امتیازی خصوصیت کا فیصلہ نمونہ کی اور اوسط قسم کی تنظیمی شکلوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ گذشتہ نظاموں کے باقی ماندہ آثاروں سے نہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جدید کاروباری تنظیم بہت بڑی حد تک فیکٹری نظام پر منحصر ہے۔

کاروبار کی مشترکہ اور جماعتی تنظیم | اس وقت تک ہم نے کاروبار کی تنظیم کا مطالعہ منظم کی تفریق کے نقطہ نگاہ سے کیا ہے۔ اب ہمیں مشترکہ پیدائش کے نقطہ نگاہ سے اس چیز کو مختصراً بیان کرنا چاہیئے یہاں ہمیں چار منزلیں نظر آتی ہیں (۱) ایسے کاروبار جنھیں افراد کرتے ہیں (۲) ایسے جنھیں ساجھی کرتے ہیں (۳) ایسے کاروبار جنھیں کارپوریشن کرتی ہیں اور (۴) ایسے کاروبار جو ٹرسٹوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

(۱) یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ مشترکہ معاشی جد و جہد کی شکل خاندان تھی لیکن کاروباری زندگی کے ساتھ جو سخت معاشی مقابلہ اور کشمکش قریبی طور پر وابستہ ہے اس کے لئے تنظیم کی یہ شکل کچھ زیادہ موزوں نہ تھی۔ کاروباری تنظیم درحقیقت کاروباری آدمیوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور کاروباری اہلیت رکھنے والا آدمی آج کی طرح اس وقت بھی اکتساب و کوشش سے نہیں

بلکہ طبعی طور پر پیدا ہوتا تھا۔ عقل مندی، بہادری، قوت فیصلہ کی صحت اور انتظامی قابلیت ایک کامیاب تاجر کے لئے ضروری صفات ہیں۔ جس حد تک کسی فرد میں یہ قابلیتیں پائی گئیں اس نے ترقی کی لیکن جب کاروباری تنظیم کا کام پھیل گیا تو افراد کے لئے تن تنہا تمام کام کو نپٹانا مشکل ہوگیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو ملانا شروع کیا جن میں وہ صفات پائی جاتی تھیں جن کی خود ان کے اندر کمی ہوتی تھی۔

(۲) شراکت دراصل کاروبار کے کمزور پہلوؤں کو مضبوط کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اس کے ذریعہ سے مختلف اہلیتوں کے لوگ مل کر کام کرنے لگتے تھے اور کبھی کبھی سرمایہ رکھنے والوں اور اہلیت رکھنے والے لوگوں میں بھی میل ہو جاتا تھا۔ جس قدر یہ میل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی کاروباری وحدہ کی اہلیت کارگذاری میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ لیکن شراکت کی خوبیاں محدود ہیں۔ کاروبار میں شرکت کرنے والوں کے لئے ذاتی تعلقات اور ایک دوسرے پر مکمل اعتماد رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شراکت کو لازمی طور پر صرف چند افراد تک محدود رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن جب کاروبار کے لئے اتنے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہونے لگتی ہے جسے چند آدمی مہیا نہیں کرسکتے تو کاروبار کی ایک نئی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے اور اس ضرورت کو کارپوریشن پورا کرتی ہے۔

(۳) ڈیلوم DELOUME اور ویبر نے جو جدید تحقیقات کی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کمپنیاں یا کارپوریشن جمہوریت روما کے آخری دور میں بھی موجود تھیں لیکن موجودہ شکل میں ان کا ابتدائی پتہ عہد وسطےٰ کے اٹلی کے شہروں میں ملتا ہے اس کی ابتدائی شکل وہ تھی جسے غلط طریقہ پر بنک کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس میں چند اشخاص اپنے سرمایہ کو یکجا اکٹھا کر لیتے تھے اور حکومت کو اس کی آمدنی کی خاص خاص مدوں کو رہن رکھ کر قرض دے دیتے تھے اور اپنے قرضہ کے حصہ کی نسبت سے نفع میں شریک ہوا کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری قرضے اور مشترکہ کاروبار نہایت قریبی طور پر باہم متعلق تھے۔ مشترکہ سرمایہ کے اصول کی دوسری اہم

ترقی سولھویں صدی کی تجارتی کمپنیوں میں نظر آتی ہے جو ابتدا میں صرف ایک واحد بحری سفر کے لئے عارضی طور پر بنائی جایا کرتی تھی لیکن جن کو بعد میں آہستہ آہستہ ایک زیادہ مستقل شکل حاصل ہوگئی تھی۔ مگر مشترکہ کاروبار کی وہ ترقی جو جدید عہد کی امتیازی خصوصیت ہے ہمیں انیسویں صدی میں ملتی ہے جب تجارتی سرمایہ پر صنعتی سرمایہ کا اقتدار قائم ہوگیا تھا۔

کمپنی یا کارپوریشن کے معاشی فوائد تین ہیں: مشترکہ سرمایہ، محدود ذمہ داری اور دائمی زندگی کمپنی کی متحدہ ضمانت پر سرمایہ داروں کی تعداد میں غیر محدود اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جتنا جس شخص کا کمپنی میں حصہ ہوتا ہے اتنا ہی کاروبار کے انتظام میں اس کا دخل ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے حصہ کے بقدر کمپنی کے قرضوں اور ذمہ داریوں کا پابند ہوتا ہے۔ عہد جدید کی حکومتوں نے محدود ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا لیکن اب اس نظام کو معاشی زندگی کی جان سمجھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ سے وہ غلط فہمیاں اور بداعتمادیاں رفع ہوگئی ہیں جو غیر محدود ذمہ داری اور ساجھے کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھیں۔ حصوں کے فروخت اور منتقل کرنے میں بھی اس کی وجہ سے سہولت پیدا ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے سرمایہ کا وہ اجتماع اور اس کی جزئی تقسیم کا وہ امکان پیدا ہوا ہے جو ہماری معاشی زندگی کی نمایاں خصوصیت ہے پھر کمپنی کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ افراد کی طرح کمپنی سوائے اس صورت کے کہ کاروبار ختم کردیا جائے کبھی مرتی نہیں ہے۔ حصہ دار غائب ہوسکتے ہیں لیکن حصے باقی رہتے ہیں۔ اس لئے اس کو دوام اور پائداری کے تمام فوائد حاصل رہتے ہیں۔ یہ حال اور مستقبل دونوں کی لئے منصوبے بنا سکتی ہے اور اپنے ڈائرکٹروں کے مناسب انتخاب اور ان کی تجدید سے بہترین قابلیت سے فائدہ حاصل کرسکتی ہے اور بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرسکتی ہے۔

ان فوائد کے ساتھ ساتھ اس میں چند ناقابل ذکر خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کمپنی کو تین قسم کے لوگوں سے تعلقات قائم رکھنا پڑتے ہیں اول حصہ داروں سے دوسرے مزدوروں سے اور تیسرے پبلک سے اور انہی کی وجہ سے کمپنی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حصہ داروں

کی ہوشیار اور باخبر اقلیت کے مفاد کو محفوظ رکھا جائے یا بھولے اور ناواقف روپیہ لگانے والوں کی اکثریت کے مفاد کو دیکھا جائے، پھر حصہ داروں اور قرض داروں کے مفاد میں کس کے مفاد کو مقدم رکھا جائے۔ آیا ڈائرکٹروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ متولی کے فرائض کو ٹھیک طرح پر انجام دیں ـــ یہ مسائل ہیں جن کا ابھی تک کوئی مناسب حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی طرح مزدوروں اور آجروں کے تعلقات میں بھی وہ پرانی ہمدردی باقی نہیں رہی ہے جو شخصی تعلق کی بنا پر پیدا ہوتی تھی کمپنی ایک غیر شخصی ادارہ ہو گئی ہے اور اس میں خالص نفع طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کمپنی کے روح نہیں ہوتی۔ چنانچہ پبلک کے ساتھ بھی کمپنی کی طرف سے ایسا برتاؤ کیا جا سکتا ہے جس کے کرنے کی ہمت افراد کبھی نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی اخلاقی حس کو افراد کی اخلاقی حس کی سطح تک بلند کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود جدید معاشی مشاغل کے لئے کمپنی کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے۔ کمپنیوں کے بغیر دنیا کو دوبارہ معاشی تنظیم کے ابتدائی دور میں پہنچنا پڑے گا اور کثیر سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کے جو مواقع سرمایہ داری نظام میں کمپنی کے ذریعہ پیدا ہوئے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔

(۴) متحدہ سرمایہ کے فوائد جب اور زیادہ بڑے پیمانہ پر ظاہر ہونے لگتے ہیں تو پھر کمپنیوں کو متحد کرنے کا بھی ارادہ کیا جانے لگتا ہے۔ ابتدا غیر پختہ معاہدوں سے ہوتی ہے جن سے قیمتوں اور پیداوار کے طریقوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل وہ ہوتی ہے جب آمدنی متحد ہو جاتی ہے اور کمپنیاں POOLS کا نام اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد تیسری منزل میں کمپنیاں ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ قریب آجاتی ہیں اور مختلف کاروبار ایک مشترکہ سردار کی نگرانی میں آجاتے ہیں اور اسے ٹرسٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ابتدا میں اتحاد کرنے والی کمپنیاں اپنے حصوں کو ایک متولی کو سپرد کر دیا کرتی تھیں جو اس مشترکہ کاروبار کی نگرانی یکجائی طریقہ پر کیا کرتا تھا۔ جہاں اس قسم کے اتحادوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وہاں یہی کام ایک نئی اور آزاد کمپنی بنا کر کیا جاتا ہے۔ جن چیزوں کو آج ٹرسٹ

کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ حقیقتہً وسیع اور زبردست کمپنیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے ٹرسٹ
کے مسائل کمپنیوں کے مسائل سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ٹرسٹ کو اسی طرح کمپنیوں
کی ایک ترقی یافتہ شکل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جیسے کمپنی خود ساجھا کرنے والوں کی ایک ترقی
یافتہ شکل تھی یا ساجھا کرنے والے انفرادی کاروبار کی ایک ترقی یافتہ شکل تھے۔ اس ترقی کے
اسباب اور اس کے حدود کا مطالعہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کی فی الحال
گنجایش نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جدید صنعت کی غیر معمولی ترقی کے زیر اثر
سرمایہ کا جو اضافہ اور تفریق ہوئی ہے اس سے کاروبار کے طریقے روز بروز پیچیدہ ہوتے چلے
جا رہے ہیں۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آپ نے ریڈیو پر کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کا حال ایسے لوگوں کی زبانی سنا ہوگا جو خود کھڑے دیکھ رہے تھے اور اب آپ کے سامنے ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح پیش کر رہے ہیں۔ سیاست کا تماشا دیکھنے والا سب کچھ ایک ہی وقت میں نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ دکھا سکتا ہے لیکن پچھلے ہفتے جو حادثہ اچانک پیش آیا اسے سمجھنے کے لئے آپ میری خاطر فرض کر لیجیے کہ یہ کرکٹ کا میچ تھا اور مجھے اجازت دیجیے کہ جو کچھ ہوا اسے .... میں دوبارہ بیان کر دوں۔ یہ تشبیہ کچھ بے جا بھی نہیں ہے اس لئے کہ انگلستان میں پہلے آدمیوں کا فرض مانا جاتا ہے کہ اپنے معاملات میں کرکٹ کے قاعدے برتیں یعنی ایمان داری کریں اور یہ یاد رکھیں کہ کھیل کا مزہ اس میں ہے کہ آدمی اپنی بازی لے اور دوسرے کی دے۔

ہاں تو صورت سمجھئے یہ تھی کہ مسٹر چیمبرلین (BATTING) کر رہے تھے اور ہر ہٹلر گیند پھینک رہے تھے۔ مسٹر چیمبرلین بہت سنبھل کر کھیلنے والے آدمی ہیں اور ہر ہٹلر گیند کو چاہے جیسا چکر دے کر پھینکے اور وہ چاہے جہاں گذا کھائے مسٹر چیمبرلین اسے ٹھوک ضرور دیتے ایک بار گیا دیکھا گیا کہ تینوں وکٹ ہر ہٹلر کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اور اس کے ساتھی "آؤٹ آؤٹ" چلا رہے ہیں۔ اور فیلڈ میں لوگ اپنی جگہ اس طرح بدل رہے ہیں کہ گویا انھیں نئے کھلاڑی کے آکر بیٹ کرنے کا انتظار ہے۔

مسٹر چیمبرلین نے پہلے تو ذرا حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر طے کیا کہ وہ آؤٹ نہیں ہوئے ہیں۔ اور اپنا بیٹ لئے جہاں تھے وہیں ہٹ لگانے کو تیار کھڑے رہے۔ اس کھیل میں کوئی امپائر تو تھا نہیں کہ فیصلہ کرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہٹلر نے بولنگ شروع کر دی۔ ابھی کھٹ سے آواز آئی ہے مگر گیند نہیں

معلوم کہ کدھر گئی اور رن بھی ہوا یا نہیں۔

یہ حادثہ کرکٹ کے میدان میں پیش آتا تو ہم شاید اپنی رائے قائم کر سکتے سیاست کا میدان اتنا بڑا ہے کہ اس میں آدمی کی نظر ہر جگہ پہنچ نہیں سکتی اور ہمیں بہت کچھ اب سوچنا پڑتا ہے یا دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے مثلاً یہ سوال کہ مسٹر چمبرلین کے وکٹ یعنی روس نے ان کو دغا کیسے دی اور دغا بھی دی تو ہٹلر کے ہاتھ میں کیسے پہنچ گیا۔ پھر یہ سوال کہ مسٹر چمبرلین آؤٹ ہوگئے ہیں یا زبردستی کھیل کھیل رہے ہیں اور سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ اب وہ جم کر کھیلتے رہیں گے یا ہٹلر کی بولنگ انھیں مات کردے گی۔

اب ذرا اسی موقعہ کا بیان سیاست کی زبان میں سن لیجئے۔ ۲۰ اگست تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ یورپی سیاست پلٹا کھانے والی ہے ڈانزک میں ہر فورسٹر نے تقریر میں یہ کہا کہ ہم پولینڈ کے حملے کو روکنے کے لئے تیار ہیں اور جرمنی کی طرف سے معلوم ہوا کہ خالی ڈانزک کو جرمن ریاست میں شامل کرنے کے بجائے ں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں لڑائی کے بعد جو علاقے جرمنی سے چھین کر پولینڈ کو دیدیئے گئے تھے وہ سب واپس کر دئے جائیں۔ آج کل جو ایسی خبروں سے پریشان ہو جائے اس کے لئے جینا مشکل ہے چنانچہ ہم نے بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن ۲۲ کو معلوم ہوا کہ ہر فون ربن ٹروپ موسکو جانے والے ہیں روس اور جرمنی میں معاہدہ ہونے والا ہے اخباروں نے سمجھایا کہ یہ جرمن سیاست کی گیدڑ بھبکی ہے روس اور جرمنی کا اتحاد بھلا کیسے ہو سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ خبر تھی کہ برطانوی وزارت نے پھر اعلان کیا ہے کہ پولینڈ سے جو اس کا عہد و پیمان ہے وہ اس پر قائم ہے چنانچہ ہم سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگلے دن فون ربن ٹروپ ہٹلر کی دعائیں لے کر ماسکو کی طرف اڑے وہاں پہنچ کر عہد نامے پر دستخط کر آئے اور رات کو آرام سے سو کر دوسرے دن واپس جرمنی چلے گئے ہم سے کہا گیا تھا کہ عہد نامے سے پہلے لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوں گی روس جرمنی سے پوری خوشامد کرائے گا اور جتنی گالیاں اسے ہٹلر سے ملتی ہیں وہ سب کی سب بلکہ اس سے کچھ زیادہ گالیاں فون ٹروپ کو سنا پڑیں گی تب کہیں وہ معاہدے پر راضی ہوگا۔ اس کی جگہ ہمیں پتہ چلا کہ روس اور جرمنی میں پچھلی فروری سے دبی زبان میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی اور اس زمانہ میں بھی جبکہ فرانس برطانیہ اور پولینڈ کی فوج کے نمائندے ماسکو میں تھے

یہ گفتگو میں ہو رہی تھیں معاہدے کی خبر ہم تک پہنچی بھی نہ تھی کہ مسٹر چیمبرلین نے پارلیمنٹ میں (DEFENSE OF THE REALM ACT) پاس کر کے وہ تمام اختیارات حاصل کر لئے جن کی لڑائی کے زمانہ میں ہر حکومت کو ضرورت ہوتی ہے اور ادھر روس کو راضی کرنے کی آخری کوشش اس طرح کی گئی کہ پولینڈ کے نمائندوں نے مان لیا کہ جنگ ہوگی تو روسی فوجوں کو پولینڈ کے اندر آ کر لڑنے کی اجازت ہوگی مگر اس کے باوجود فوجی مشوروں کا سلسلہ بند ہو گیا اور مشورہ کرنے والے معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ کر جان بچانے کی فکر میں ہیں ۔ حالت تھی بھی بڑی نازک روس نے اچانک اپنے تیور بدلے تھے ہر ہٹلر برلن میں اپنے سپہ سالاروں سے قریب قریب رات بھر مشورہ کرتے رہے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ۲۷ اگست کو وہ (TANNA BARG) میں تقریر کرنے کے ۱۲-۱۳ گھنٹے بعد پھر اپنی فوجوں کو جو سرحد پر تیار کھڑی ہیں ۔ پولینڈ پر دوڑا دیں گے ۔ اخباروں نے یہاں تک بتا دیا کہ کونسی فوج کہاں پر حملہ کرے گی

لیکن اگر ایک طرف لڑائی کی دھوم مچ رہی تھی برطانوی شہریوں سے کہدیا تھا کہ جرمنی چھوڑ دیں اور جرمنی شہریوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ انگلستان سے چلے آئیں تو دوسری طرف مسٹر چیمبرلین کی حسب مرضی گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا ہر ہٹلر نے مشرق اور مغرب دونوں طرف اپنی سیاست کا کبوتر دوڑایا ہر فون ربن ٹروپ ماسکو گئے تو اسی کے ساتھ برطانوی سفیر سر نیولا ہنڈرسن ہر ہٹلر کا ایک پیغام لے کر پولینڈ پہنچے اس کے بعد اگرچہ ہر ہٹلر نے موسیو دلا دے اور پریذیڈنٹ روزولٹ کے کہنے پر پولینڈ سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا ۔ برطانوی جہازوں کو بحر روم اور بحیرہ بالٹک میں جانے کی ممانعت کر دی گئی ۔ جرمنی میں رشن کارڈ جاری ہو گئے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سر نیول ہنڈرسن کا لندن سے برلن اور برلن سے لندن جانا بھی ہو رہا ہے ۔

اس کا نتیجہ کیا ہوگا ابھی مسٹر چیمبرلین خود بھی نہیں بتا سکتے آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے نتیجہ کا انتظار کر سکتے ہیں، چاہیں تو اس پر غور کر سکتے ہیں کہ روسی جرمنی تعلقات نے اچانک پلٹا کیوں کھایا اور اس کا پولینڈ اور یورپ کی سیاست پر کیا اثر ہوگا ۔

روس اور جرمنی میں اب تک آپ جانتے ہیں کہ بڑی گہری تجارتی دوستی تھی مگر اس کے ساتھ ہی

کم از کم دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتنی ہی گہری سیاسی عداوت بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جب روس اور جرمنی ایک دوسرے کو اس طرح گالیاں دے رہے ہیں تو روس، انگلستان اور فرانس کو آپس میں اتحاد قائم کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لوگ اس پر تعجب کرنے لگے اور کسی نے اس میں روس اور کسی نے برطانیہ کا قصور ثابت کیا مگر اتحاد کی تجویز کا جو حشر ہوا اس کا کسی کو بھی گمان نہ تھا۔ جرمنی کی طرف سے ہر فون ربن ٹروپ نے یہ بیان کیا ہے کہ برطانیہ ہمیں گھیرنا چاہتا تھا اور ہم نے روس کو اپنے ساتھ ملا کر یہ گھیرا توڑ دیا ہے۔ روس کی طرف سے اس کایا پلٹ کا کوئی سبب نہیں بتایا گیا ہے۔ لیکن ذرا سوچیے تو ایک نہیں بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

روسی پہلے چاہتے تھے اور شاید اب بھی اس پر تیار ہوں کہ ان کا برطانیہ اور فرانس سے ایسا معاہدہ ہو جائے کہ جس کے بعد کسی مخالف کو دھونس جمانے کی ہمت نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے اور شاید برطانیہ فرانس اور پولینڈ کے انداز سے ظاہر ہوتا گیا کہ وہ ایسا نہیں چاہتے، تو روس نے اپنے لئے بہتر سمجھا کہ وہ جرمنی سے دوستی کرلے اور اس طرح ان جھگڑوں سے الگ ہو جائے جو یورپ میں آئے دن ہوتے ہیں۔ جرمنی سے دوستی کرنے میں اپنے عقیدوں کو جھٹلانے کا اندیشہ ضرور تھا اور ان بے چاروں کو دکھ پہنچانے کا خطرہ تھا جو روس کو بین الاقوامی کمیونزم کا علم بردار اور جرمنی کو کمیونزم کا سب سے کٹر دشمن مانتے ہیں لیکن یہ دکھ پہنچنا تو ایسے لوگوں کی قسمت میں لکھا تھا اور یہی سمجھتے ہوئے شاید سٹالن نے اور بھی کم تامل کیا۔ پھر اگر آپ یہ بھی سوچیں کہ روس اور جرمنی کے اس اتحاد سے وہ اینٹی کومنٹرن معاہدہ جو جاپان، جرمنی اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا خود بخود ٹوٹ جاتا ہے تو اس اتحاد میں آپ کو روس کا ایک بڑا فائدہ بھی نظر آئے گا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جاپان کی ایک وزارت ٹوٹ گئی اور جاپانی سیاست ایک آہ بھر کر بیٹھ گئی۔ برطانیہ اور فرانس سے معاہدہ کرنے میں جاپان کی طرف سے خطرہ گھٹنے کی بجائے بڑھ جاتا۔

روس اور جرمنی کے درمیان طے یہ ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے، ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہ کریں گے، ایسی فریق بندی میں شریک نہ ہوں گے کہ جس کا مقصد ان

میں سے کسی ایک کی مخالفت ہو، اپنے معاملات دوستانہ گفتگو کے ذریعے طے کرلیں گے اور ایک دوسرے کو ایسی باتوں کی خبر دیتے رہیں گے جن سے دونوں کا تعلق ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر پولینڈ خدانخواستہ لڑائی کا میدان بنا تو روس کا رویہ کیا ہوگا۔ اگر روس نے پولینڈ کی مدد نہ کی تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے خیال میں جرمنی کا پولینڈ کو فتح کرلینا کوئی حرج کی بات نہیں لیکن اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار نے یہ فرض کرکے کہ روس اب ہر لڑائی میں جرمنی کا ساتھ دے گا یہ دکھلایا ہے کہ دراصل وہ جرمنی کی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ روس کو اس کا اندیشہ ہی نہیں ہے کہ لڑائی ہوگی۔ بلکہ جرمنی نے اسے اطمینان دلایا ہوگا۔ کہ وہ اپنا مطلب بغیر لڑے حاصل کرے گا۔ ممکن ہے فرانس اور برطانیہ کے نمائندوں سے جو مشورے ہوئے انھوں نے بھی یہی بات موسیو مولوتوف اور ستالین کے ذہن نشین کردی ہو، اور انھوں نے آخر میں طے کیا ہو کہ خواہ مخواہ کے مشوروں سے یہ بہتر ہے کہ روس صاف کہدے کہ ہم آپ کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اب آپ جانئے اور آپ کا کام جانے۔ روس سے یہ کہلوا دینا جرمن سیاست کے لئے بڑی کامیابی کی بات ہے۔ اور اگرچہ مسٹر چمبرلین برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ پولینڈ کی مدد کرے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے گفتگو کا دروازہ پورا کھول دیا ہے، اور گفتگو کے ذریعے ہر ہٹلر کو معاملہ طے کرنے کا پورا موقع دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی سنا گیا ہے کہ ہر ہٹلر میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے صلح کی ایسی شرائط پیش کرنے والے تھے کہ جنھیں نہ مانا جائے تو وہ کہ سکیں کہ اب فساد کرنے کا الزام ان پر نہیں آتا اور وہ زبردستی اپنا حق وصول کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ بھی سیاست کی بڑی اچھی چال ہے۔ اور ہر ہٹلر اسے آزما بھی چکے ہیں۔

تعلیم بالغاں کی کتابیں

تعلیم بالغاں کے قاعدے:- از ڈاکٹر سعید لظفر خاں صاحب۔ قیمت حصہ اول ۔ / حصہ دوم ۰/ حصہ سوم ۰/

مدرس کا قاعدہ:- اس مختصر سے رسالے میں تعلیم بالغاں کے قاعدوں کو پڑھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ قیمت ۲/

اردو سکھانے کا آسان طریقہ:- صاحبزادہ ڈاکٹر سعید لظفر خاں صاحب نے جو ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت اچھے اور کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان ہی تجربوں کی بنیاد پر اس مختصر سے رسالے میں اردو سکھانے کا سب سے آسان طریقہ پیش کیا ہے۔ قیمت ۴/

نماز:- یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور چند مسائل جو نماز سے متعلق ہیں بتائے گئے ہیں۔ ۱۶ صفحے قیمت ۰/

حکایتیں مکمل:- اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی سادے اور پیارے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں، جو اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ قیمت مکمل ۱/

حبیب خدا:- آنحضرت کی سیرت پاک بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۳/

میونسپلٹی:- اس میں بالغوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قیمت ۰/

صدر مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی
شاخیں۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

اُردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(دو سو روپے کی بجائے ڈھائی سو روپے انعام!)

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا تھا مگر اب اسے بڑھا کر ڈھائی سو کر دیا گیا ہے۔ جن صاحبان کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا۔ انھیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق واشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں۔ اور تمام مقالے سکرٹری اردو اکادمی کے پاس ۳۰ رستمبر تک پہنچ جانا چاہئیں جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکرٹری کو مطلع کر دیں۔

استراکیت۔

نازی ازم۔

سامراج۔

وطنیت۔

سرمایہ داری۔

بحیرہ روم کی سیاست۔

بحرالکاہل کی سیاست۔

امریکہ اور سیاست عالم۔

نوآبادیوں کی تقسیم۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست۔

فاسزم۔

سکرٹری اُردو اکادمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مطبوعات امیریہ دار التصنیف و التالیف لکھنؤ

دیوانِ ثاقب۔ یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فنِ شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانچسو پچاس صفحات۔ قیمت مجلد عا غیر مجلد عا (علاوہ محصول ڈاک)۔

انیس الاخلاق۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس صاحب رضوی ایم، اے رکن امیریہ دار التصنیف و التالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصول ڈاک۔

گیس کا دفاع۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ۔ کمازکم ہوجانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت پر نظر کرکے یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۴ر (علاوہ محصول ڈاک)

مفتاح البیان۔ حصہ اول و دوم۔ مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابوالبیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جردلی مؤلف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت ہر حصہ عہ ر (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:- دفتر امیریہ دار التصنیف و التالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

نیا ادب

یہ اپنی قسم کا پہلا مجموعہ ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کیطرف سے شایع ہوا ہے۔ یہ اردو کے ترقی پسند مصنفین کا بہترین انتخاب ہے اور اس ذہنی انقلاب کا آئینہ ہے جس نے نظموں، افسانوں، ڈراموں اور تنقیدوں کی شکل میں ادبی جامہ پہن لیا ہے یہ کتاب اردو ادب کا ایک نیا رخ پیش کرتی ہے۔

ضخامت سوا دو سو صفحات ۲۲۵

قیمت ایک روپیہ (عہ/)

اس میں

منشی پریم چند	قاضی عبدالغفار	نیاز فتحپوری	جوش ملیح آبادی
ڈاکٹر محمد دین تاثیر	فیض احمد	جمیل مظہری	علی عباس حسینی
کرشن چندر	سجاد ظہیر	احمد علی	رشید جہاں

اور دوسرے ترقی پسند مصنفین کا بہترین انتخاب شامل ہے

اس مجموعہ کو ایک روپیہ میں خریدنے کے بجائے اگر آپ تین روپیہ بھیجکر رسالہ نیا ادب کے خریدار بن جائیں تو آپ کی خدمت میں گیارہ پرچہ اور پیش کئے جائیں گے جن کی مجموعی ضخامت آٹھ سو صفحات ہوگی۔

مینجر نیا ادب۔ نظیر آباد لکھنؤ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف جناب مولنا سید ابوالاعلیٰ مودودی (ایڈیٹر ترجمان القرآن)

یہ بے نظیر کتاب دو رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہی۔ اس میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک نہایت ہی جامع پرخیال اور سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہی۔ ہندوستان کے گذشتہ انقلابات نے مسلمانوں پر کیا کیا اثرات چھوڑے، اور اب جو انقلاب آرہا ہی وہ مسلمانوں کو کہاں پہنچا جائیگا۔ اس وقت ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا ہرگز نہ کرنا چاہیئے یہ اور دیگر متعلقہ سوالات ایسی حکیمانہ صحت نظر کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں۔ کہ ایک دفعہ بغور پڑھ لینے کے بعد ہندوستان کی اسلامی سیاست آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے اور ہماری قومی مسئلہ کا کوئی پہلو بھی غیر واضح نہیں رہتا۔ فاضل مؤلف کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا دعویٰ ہی کہ اس قسم کی بلند پایہ اور ٹھوس حقائق سے مملوئی دوسری تالیف اسلامی ہند کے مسائل پر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ہندو انگریز اور امریکن کی مصنفوں کی کتابوں سے بھی وسیع استفادہ کیا گیا ہی۔ اس تالیف کا پڑھنا اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانا بجائے خود ایک جہاد ہوگا اور بہت بڑے ثواب کا موجب یہ کتاب کسی تجارتی غرض سے شائع نہیں کی گئی۔ قیمت حصہ اول چار آنے ۴؍ (صفحات ۱۲۵) پانچ نسخوں کے لئے ایک روپیہ۔ پچاس نسخوں کے لئے نو روپے ایک سو نسخوں کے لئے پندرہ روپے قیمت حصہ دوم ۸؍ (صفحات ۲۳۵) پانچ نسخوں کے لئے دو روپے چار آنہ ۲؍۴ پچیس نسخوں کے لئے گیارہ روپے آٹھ آنے پچاس نسخوں کے لئے بائیس روپے اور سو نسخوں کیلئے چالیس روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن ملتان روڈ لاہور

مسلمانوں کا روشن مستقبل

از سید طفیل احمد منگوری (علیگ)

اس کتاب میں ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اقتصادی اور تمدنی تعلیمی اور سیاسی حالات کی جانچ دس بنیادی حقوق کے معیار سے کر کے انھیں آئینہ کی طرح روشن کردیا گیا ہی۔ علی گڈھ کی تعلیمی اور سیاسی تحریک، کانگریس اور مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء احرار اسلام اور خدائی خدمتگاران، نیز شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے تاریخی واقعات دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور جمہوریت انگورہ کی تطبیق ہندوستان کے حالات سے کر کے دکھایا گیا ہی کہ مسلمانانِ ہند کے انحطاط کا دور ختم ہوتا ہے اور ان کا مستقبل روشن ہی۔ کاغذ لکھائی اور چھپائی اعلیٰ حجم ۴۲۵ صفحات ٹائیٹل سہ رنگا۔ جلد مضبوط۔

قیمت علاوہ محصول دو روپے آٹھ آنہ (۲؍۸)

ملنے کا پتہ:۔ **نظامی پریس بدایوں یو۔پی**

ماہنامہ

"منزل" دہلی

کا

افسانہ نمبر

ماہِ ستمبر ۳۹ئہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

جس میں ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نگار مثلاً حضرت نیاز فتحپوری۔ علامہ مضحک دہلوی۔ پروفیسر ظفر تاباں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ ایم اسلم۔ حضرت قیسی رام پوری۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ حضرت سلطان حیدر جوش دہلوی ڈپٹی کلکٹر۔ حضرت مظہر انصاری دہلوی۔ جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی۔ حضرت اختر انصاری اور سید یوسف بخاری صاحب وغیرہم کے دلچسپ تاریخی۔ اصلاحی۔ رومانی اور تخیلی افسانے، سہ رنگی تصاویر اور دور حاضر کے ممتاز شعراء کی رومان آفریں نظمیں شائع ہو رہی ہیں۔

اردو ادب کے پرستار خصوصاً افسانہ پسند حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ وہ منزل کے "افسانہ نمبر" کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

افسانہ نمبر کم از کم سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اور قیمت صرف آٹھ آنے۔ لیکن منزل کے مستقل خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں "منزل" کا سالانہ چندہ مبلغ دو روپے (عہ) ارسال فرما کر یہ عدیم المثال "افسانہ نمبر" مفت حاصل کریں۔

منیجر منزل دہلی

پوسٹ بکس نمبر ۳ بازار بلی ماران دہلی

تفاسیر ثنائیہ

مصنفہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری

تفسیر ثنائی اردو۔ قرآن شریف کی بہت حضرات نے تفسیریں لکھیں مگر تفسیر ثنائی اردو ان سب پر سبقت لے گئی ہے۔ جسے زمانہ حاضرہ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس تفسیر میں خاص خوبی (جو اس سے پہلے کسی اردو یا عربی میں نہیں دیکھی گئی) یہ ہے کہ قرآنی مضمون مسلسل معلوم ہوتا ہے۔ ایک کالم میں آیات قرآنی ہیں جن کے نیچے اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ دوسرے کالم میں تفسیر مع ترجمہ ہے نیچے حواشی وشان نزول درج ہے مخالفین اسلام اور مخالفین سنت نبی ؑ کے خیالات کی اصلاح بھی موقع بموقع کی گئی ہے۔ مکمل تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ قیمت رعایتی فی جلد عہ/ مکمل سٹ خریدنے والوں سے صرف دس روپیہ عنہ/

تفسیر القرآن بکلام الرحمن۔ (بزبان عربی) تفسیر ہذا عربی زبان میں مفسرین کے مسلمہ اصول القرآن یفسر بعضہ بعضا پر لکھی گئی ہے۔ جسے ظاہری وباطنی خوبیوں کے باعث اہل علم حضرات نے بہت پسند فرمایا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اسکی شہرت ہوچکی ہے۔ بعض مدارس میں بطور نصاب (جلالین کی طرح) پڑھائی جارہی ہے۔ ہر آیت کی تفسیر میں قرآن مجید کی دوسری آیت سے استشہاد کیا گیا ہے۔ مصری سائز اور رنگ کے کاغذ پر اعلی کتابت وطباعت کے ساتھ طبع کرائی گئی ہے۔ ساری قرآن مجید کی تفسیر ہے ہر اہل حدیث کو ضرور پڑھنی چاہیئے۔ بلکہ ہر اہل حدیث کے گھر میں ہونی چاہیئے اصل قیمت للعہ/ رعایتی سے/

بیان الفرقان علی علم البیان۔ (بزبان عربی) قرآن مجید کی یہ سب سے پہلی تفسیر ہے جو علم معانی وبیان کی روشنی میں عربی میں لکھی گئی ہے شروع میں علم معانی وبیان کی اصطلاحات درج کرکے ان پر نمبر ڈالے گئے ہیں۔ دوران تفسیر میں جہاں کسی اصطلاح کا ذکر آیا ہے اس پر اس اصطلاح کا نمبر دیدیا گیا ہے سردست صرف سورہ فاتحہ وسورہ بقرہ کی تفسیر چھپی ہے۔

جلد منگوالیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت ۱۰/

تفسیر بالرائے۔ (بزبان اردو) اس کتاب کی تصنیف کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ اردو میں کئی ایک تفسیریں شائع ہوئی ہیں، جن میں بہت سے مقامات قابل اصلاح ہیں مثلاً بیان للناس" امرتسری بیان القرآن" لاہوری، بکڑالوی، مرزائی، شیعہ، ترجمہ قرآن بریلوی وغیرہ ان سب تفسیروں اور تراجم کی اہم اغلاط ظاہر کرکے اصلاح کی گئی ہے۔ قابل دید وشنید ہے۔ مولانا صاحب کی یہ بالکل ہی تصنیف ہے۔

قیمت صرف ۱۰/

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار "اہلحدیث" امرتسر پنجاب

اگر آپ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی تازہ ترین

خبریں اور دلچسپ مقالات

ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو آج ایک پوسٹ کارڈ لکھکر اخبار

روزہ اتحاد

کے نام ارسال فرما دیجئے یہ اخبار صوبہ بہار کا سب سے قدیم اور کثیر الاشاعت ہونے کے علاوہ صوبہ بہار میں مسلم لیگ کا ترجمان اولین ہے اور ملک کے مایۂ ناز مشہور ادیب

سُلطان القلم حضرت سُلطان احمد سہسرامی

کی ادارت میں صوبہ بہار کے مرکزی مقام پٹنہ سے شائع ہوتا ہے۔ مشتہرین کے لئے خاص رعایت ہے۔

چندہ سالانہ (۶ر) ششماہی (۳ر) سہ ماہی (عہ)

المشتہر

منیجر اخبار "اتحاد" بانکی پور۔ پٹنہ

"ہل"

دیہات سدھار کا خاص رسالہ

یہ باتصویر ماہوار رسالہ ہندوستان کے دیہاتی باشندوں اور خصوصاً کسانوں کے لئے نکالا گیا ہے۔
اور اسے صوبہ جات متحدہ کے محکمہ گاؤں سدھار کی پوری امداد حاصل ہے۔

اس کے مضامین کا انتخاب اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے کہ وہ گاؤں والوں کے لئے دلچسپ اور مفید ثابت ہوں۔ اس کی زبان اتنی سادہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اُسے بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

یہ رسالہ اُردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوتا ہے۔ اور دونوں کی زبانیں قریب قریب ایک سی ہوتی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر ہیں

ٹھاکر شری ناتھ سنگھ

اور بورڈ آف ایڈیٹرس میں مندرجہ ذیل معزز حضرات شامل ہیں۔

شری دنیکیٹش نرائن تیواری — شری شکدیو بہاری مشر

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — شری مہاویر تیاگی

شری سمترانندن پنت — شری متی تارا پانڈے

شری منوہر داس چترویدی

ضخامت ۶۰ صفحات ہوتی ہے۔ ایک سہ رنگی تصویر کے علاوہ بیشمار سادی تصویریں ہوتی ہیں۔ دیہات کے رہنے والے جو بھائی ذرا بھی پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں انھیں یہ رسالہ فوراً منگانا چاہیئے۔ آرڈر دیتے وقت اردو ہندی کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ قیمت سالانہ للعہ؍ ایک پرچہ کی قیمت ۶؍ آج ہی نمونہ مفت طلب فرمائیے۔

پتہ:۔ منیجر "ہل" انڈین پریس لمیٹیڈ الہ آباد

حیدرآباد کی علمی و ادبی چہل پہل کا واحد ترجمان

باتصویر ماہ نامہ

سب رس

یہ رسالہ حیدرآباد کے سرگرم عمل ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس میں ہر ذوق کے مضامین افسانے اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ اردو کی جملہ جدید مطبوعات و رسائل کی فہرستیں اور ان کے متعلق مفید معلومات اور تنقیدیں شائع کی جاتی ہیں۔

یہ کام خاص طور پر ادارہ کے شعبہ تنقید کے سپرد ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز اس رسالہ کے قلمی معاون ہیں۔ اردو زبان اور اس کے موجودہ اہم مسائل سے متعلق ضروری مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اگر آپ ہر موضوع اور ہر صنفِ ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو "سب رس" کا ضرور مطالعہ کیجئے۔

بچوں کا ضمیمہ "سب رس" علیحدہ طور پر شائع ہوتا ہے۔ جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

"سب رس" کا سالانہ چندہ مع محصول ڈاک چار روپیہ آٹھ آنہ للعہ

بچوں کے "سب رس" کا سالانہ چندہ مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

نمونہ کا پرچہ چھ آنے ۶ر

مہتمم سب رس ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

مملکت دکن کا پہلا اردو انگریزی فلمی رسالہ باتصویر

مووی لینڈ

زیر ادارت
ایل۔ سی۔ بھلہ (بی۔ اے)

زیر نگرانی
محمد حسام الدین خانصاحب غوری

کنگس وے۔ سکندرآباد دکن

کسی ایک ایڈیشن کا سالانہ چندہ عہ — دونوں ایڈیشن کا سالانہ چندہ للعہ

نومبر کے لئے تین آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوگی

جس میں

ہندوستان کے مقتدر انشا پردازوں اور ملک کے جلیل القدر شعرا کے گرانقدر مضامین نظم ونثر درج ہوتے ہیں۔ صنعت فلمسازی پر پُراز معلومات مقالات۔ فلموں پر تعمیری وتنقیدی مضامین مغربی شاہکاروں کے شگفتہ تراجم شہرہ آفاق ادیبوں کے دلاویز افسانے۔ دنیائے فلم کی حسین وجمیل پریوں کی حیات۔ نگارخانوں کی رومان آفرین کہانیاں دنیائے فلم کی ایجادات ومعلومات فلمی خبریں اور فکاہی مضامین کا ایک جامع ومکمل مجموعہ۔

جسکو

اُردو کے تمام مقتدر رسائل اور مایہ ناز نقادوں نے ہندوستان کا بہترین فلمی رسالہ تسلیم کیا ہے۔ ضخامت ۷۰ صفحات مع متعدد دلاویز تصاویر

ہر ماہ عیسوی کی

پہلی تاریخ کو اسکا اردو ایڈیشن اور پندرہ تاریخ کو انگریزی ایڈیشن اپنی ہنگامہ پرور خصوصیات کیساتھ شائع ہوتاہے

یاد رکھئے

"مووی لینڈ" پرنٹنگ پریس میں انگریزی اور اردو ٹائپ کی طباعت کا کام نہایت ارزاں اطمینان بخش طریقہ پر حسب وعدہ کیاجاتا ہے۔ ایک مرتبہ آزمائش شرط ہے۔

منیجر مووی لینڈ

ایجنسی کی کتابیں

اکبر الہ آبادی ۔ از طالب الہ آبادی۔ نامور ظریف اور اصلاحی شاعر کی سوانح حیات پر مصنف نے اکبر مرحوم کے تینوں دواوین کا انتخاب کرکے اسے تین دور صبح، دوپہر، اور شام میں باعتبار کلام تقسیم کر دیا ہے۔ کلام میں تصوف، علوئے نفس اور تہذیب باطن کے جواہر موجود ہیں، ادبی مذاق والوں کے لئے خوش فکری، بذلہ زبان و خیال پر قدرت، حسن زبان، صنائع لفظی و معنوی سبھی کچھ ہے۔ مجلسیوں کے لئے معاشرت و تمدن کی پیچیدگیاں سلجھائی گئی ہیں۔ بہت وقیع کتاب۔ قیمت مجلد ۵؎

بچوں کے کارنامے ۔ از مولوی سید حامد علی۔ یہ پانچ چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔ ان تمام قصوں کے ہیرو بچے ہیں۔ اس سے بچوں کے دل میں بہادری، ہمت، اپنے ملک سے ہمدردی اور بڑے بڑے کارنمایاں کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ جا بجا اخلاقی تعلیم بھی ہے۔ قیمت ۶/

بیوی کے فرائض ۔ ادیس احمد ادیب۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی دلدادہ عورتوں کی زندگیاں عموماً لیکن ناکامیاب ثابت ہوتی ہیں اور ان میں کیسے میل، محبت اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ مصنف نے بالتفصیل تمام وجوہات پیش کرتے ہوئے اس اہم مسئلہ کا حل پیش کیا۔ قیمت ۳/

بچوں کا تحفہ مکمل ۔ مولوی محمد شفیع الدین نیرؔ کی نظموں کا مجموعہ۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا دو رسات آٹھ برس کے بچوں کے لئے اور دوسرا دس بارہ برس والوں کے لئے ہے۔ نیرؔ بحیثیت معلم بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے عنوانات کی تلاش میں، بحروں کے انتخاب میں خیالات کی سادگی اور زبان کی سلاست میں بچوں کی ذہنی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہماری زبان کے تعلیمی ادب میں قیمتی اضافہ ہے۔ قیمت مکمل ۱۰/

بازیچہ ۔ از آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد۔ موصوف نے چھوٹے چھوٹے بچوں کے شوق و معلومات بڑھانے کے لئے اپنے ملک میں استعمال ہونے والی سب سواریوں کے دلچسپ حالات بچوں کی زبان میں لکھے ہیں۔ قیمت ۴/

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی، اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی صنعتیں۔ دیہی صنعتیں دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جے۔ سی کمان رپا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ۔ از زین العابدین صاحب ترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی، اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشت کاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

شہری آزادی۔ اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے۔ جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت۔ از ڈاکٹر زین العابدین صاحب۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے۔ جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

ہندوستان میں دیہی قرض۔ مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں قرضے کو اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے۔ ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ کے تیار کردہ مختلف قاعدے

تعلیم بالغان کے قاعدے از ڈاکٹر سید انظفر خاں صاحب۔ قیمت حصہ اول ۔ / حصہ دوم ۔/ ۔ حصہ سوم ۔/ ۔ مدرس کا قاعدہ نما ۲/

حرفہ کا قاعدہ بنیادی حرفہ کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے ایسی جماعتوں کے لئے تو مواد مل جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے کے طریقے سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن دشواری تو ان بچوں کے لئے ہے جو کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ موجودہ قاعدوں میں سے کسی کو لیجئے بنیادی حرفہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر "حرفہ کا قاعدہ" تیار کیا گیا ہے جو ہے تو کہانی کا طریقہ اور طریق الصوت کے اصولوں پر لیکن تمام بنیادی حرفے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں تکلی کا کام نمایاں ہے اور گنتے کا کام، سبزیوں کا کام ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا ہی سے بچہ جو کچھ کرے گا وہ پڑھ سکے گا۔ اور جو کچھ کریگا وہ کر سکے گا۔ جن مقامات پر وردھا اسکیم جاری ہے وہاں کے لئے تو ہر حیثیت سے سنگ بنیاد کا کام دے گا۔ کپاس تکلی، کھدر، دھنے پر چھوٹے چھوٹے دلچسپ سبق ہیں، نظمیں بھی ہیں۔ $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۸۰ صفحات پر دیدہ زیب اور خوشخط چھپوایا گیا ہے۔ قیمت ۳/

آسان قاعدہ جہاں تک مواد کا تعلق ہے اس میں بھی وہی چیزیں ہیں جو حرفہ کے قاعدے میں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ "حرفہ کا قاعدہ" کہانی کے طریقہ اور طریق الصوت کے اصولوں پر لکھا گیا ہے اور یہ قاعدہ صرف طریق الصوت کی بنا پر۔ ہر جگہ کہانی کے طریقے کا اہتمام مشکل ہے۔ ایسے لوگوں کی دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ بالا عنوان سے اسی کا دوسرا ایڈیشن تیار کرایا گیا ہے۔ گھروں میں نجی کے طور پر پڑھانے کے لئے بہت موزوں ہے۔ ضخامت اور لکھائی چھپائی کی تمام خصوصیات حرفے کے قاعدے کی طرح ہیں۔ قیمت بھی ۳/ ہے۔

بچوں کا قاعدہ یہ قاعدہ کہانی کے طریقہ اور طریق الصوت کے اصولوں پر لکھا گیا ہے۔ کہانی کے طریقہ کا یہ مقصد ہے کہ ابتدا ہی سے بچوں کے سامنے ایسا مواد پیش کیا جائے جو ان کی زندگی سے متعلق ہو مدرسہ اور گھر کی زندگی ملتی جلتی ہو، بچہ مدرسہ سے گھر کی طرف بھاگنے کی بجائے گھر سے مدرسہ کی طرف بھاگنے لگے کھیل کود کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے۔ لفظوں کے جوڑ توڑ اور ہجے کے لئے طریق الصوت

سے کام لیا گیا ہے۔ تاکہ آوازوں کے ذریعے جلد سے جلد لفظ پہچاننے لگے۔ پڑھانے والوں کا تجربہ ہے کہ چھ مہینے کے عرصہ میں بچہ بے تکان پڑھنے لگتا ہے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر کھلے کھلے لفظوں میں خوشخط اور دیدہ زیب چھپوایا گیا ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحے ہے قیمت ۳/ رہنمائے قاعدہ ۴/

نیا قاعدہ یہ قاعدہ لفظوں کے طریقہ اور طریق الصوت کے اصولوں پر لکھا گیا ہے۔ جس جگہ کہانی کے طریقہ کا اہتمام ہے وہاں بچوں کا قاعدہ رائج ہے۔ لیکن جو لوگ اس کا اہتمام نہیں کر سکتے ہیں ان کے لئے موجودہ قاعدے غیر تسلی بخش ہیں۔ کام کی دشواریوں اور دوسری شکایتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ ابتدا میں تصویر اور اس سے متعلق بامعنی لفظوں کے ذریعے حرف سکھائے گئے ہیں۔ پھر ہندی کے طرز پر بتدریج آوازوں کی اونچ نیچ بچوں کے سامنے لائی گئی ہے۔ اسباق کی عبارت مربوط ہے، زبان میں شیرینی ہے۔ گھروں میں نجی تعلیم کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت ۲/

ہندوستانی کی پہلی کتاب ایک اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم کا بھی ہے جن کی مادری زبان ہندوستانی نہیں۔ ظاہر ہے ان کا طریقۂ تعلیم ان کی کتابوں کا ابتدائی مواد مادری زبان والوں سے جدا رہے گا۔ فی الحال اس قاعدے کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ شروع میں سیدھے سادے طریقے سے حروف یاد کرائے گئے ہیں، اس کے بعد ان کے جوڑ توڑ بتلائے گئے ہیں۔ اسباق "قواعد اردو" کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں جو غیر مادری زبان والوں کے لئے ضروری ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان سب پابندیوں کے ساتھ دلچسپی کا عنصر شروع سے آخر تک ہے۔ قیمت ۲/

اردو سکھانے کا آسان طریقہ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب نے جو ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت اچھے کامیاب تجربے کئے ہیں، انھوں نے اپنے ان ہی تجربوں کی بنیاد پر اس مختصر سے رسالے میں اردو سکھانے کا سب سے آسان طریقہ پیش کیا ہے۔ قیمت ۴/

نئی کتابیں

مغلوں کا مدوجزر خواجہ محمد شفیع (دہلوی) نے اپنے خاص انداز میں مغلوں کے کیرکٹر سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن میں کیا خصائص تھے جو انھیں برسراقتدار لائے۔ اور بعد میں ان میں کیا خرابیاں پیدا ہوگئیں جو باعث نزول ہوئیں۔ قیمت صرف ۶ر

ناموران اسلام۔ اس میں کوئی ساٹھ مشہور بزرگوں، عالموں، صوفیوں، سپہ سالاروں اور بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔ یہ انسانیت کے وہ خادم ہیں جنھوں نے اپنے علم و عمل سے دنیا کی تاریخ بدل دی۔ قیمت ۱۲؍

کایا پلٹ۔ ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے مگر بہت ہی مزے دار۔ ایک سست اور کاہل صاحبزادے کیا کیا حرکت کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے ساتھی اور استاد انھیں کس طرح سیدھے راستے پر لاتے ہیں۔ قیمت ۳ر

دو بھائی۔ ایک بے وقوف باپ نے اپنے چالاک بھائی کے کہنے پر اپنے دو بچوں کو جنگل میں چھوڑ دیا۔ ان دونوں نے اپنے لئے خود راستہ پیدا کیا۔ اپنی جد و جہد اور سمجھ بوجھ کی بدولت شاندار کامیابی حاصل کی۔ دونوں بھائیوں کی جدائی، ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ قیمت ۱۲؍

قومی نظمیں۔ اس مختصر سی کتاب میں ایسی نظمیں ہیں جو لڑکے مدرسہ کھلنے کے وقت مل کر پڑھ سکتے ہیں۔ چند دعائیہ اور قومی گیتوں کا مجموعہ۔

استادوں کے لئے بہت کام کی چیز ہے

قیمت ۴ر

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے (آنرز) فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دَور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

ضخامت ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت ؏ر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرولباغ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ

جامع مسجد۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

لوہاری دروازہ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ

امین آباد۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ

پرنس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے

سیاست کی پہلی کتاب   قیمت   سہر

اجتماعی زندگی کی ابتداء . . . " . . عہر

ہندوستان کا دیہی قرض . . . " . . سہر

مسئلہ آبادی . . . . " . . سہر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی ۔لاہور۔لکھنؤ۔بمبئی

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۱	جولائی ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین

پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی، اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل

(از جناب ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

۲۔ نفسِ انسانی

گذشتہ[1] مضمون میں ہم مسلمانانِ ہند کے تعلیمی نصب العین سے بحث کر چکے ہیں یہ نصب العین ہے عام تمدنی مظاہر اور خصوصاً اسلامی تمدنی مظاہر کے ذریعہ نفسِ انسانی کی امکانی صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما کرنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صفاتِ ربانی کے مماثل ہو جائیں۔ نصب العین کے اس تعین ہی سے ظاہر ہے کہ ذرائعِ تعلیم میں ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم نفسِ انسانی ہے کیونکہ بغیر نفسِ انسانی کے تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک مظاہرِ فطرت جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں اور مظاہرِ تمدن جن کی انسان خود تخلیق کرتا ہے ضروری ہیں لیکن بہر صورت یہ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور نفسِ انسانی کی تعمیر کے سلسلہ میں یہ صرف مسالہ کا کام دیتے ہیں۔

نفسِ انسانی کو سمجھ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے ڈانڈے نفسِ ربانی سے جا کر ملتے ہیں۔ مَن عَرَفَ نفسَہٗ فقد عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا) اور خدا کی حکمتوں اور دانائیوں کو سمجھنا فہمِ انسانی کے لئے کچھ آسان نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کو سمجھ لینا دراصل زندگی اور اس کی ماہیتِ اصلی کو سمجھ لینا ہے اور زندگی کی اصل کو سمجھنے سے اکثر انسانی عقل عاجز رہتی ہے۔ فلاطون سے لے کر اس وقت تک برابر نفسِ انسانی کی تحقیقاتیں جاری ہیں لیکن ہنوز چند سطحی مظاہر سے زیادہ کا انسان پتہ نہیں چلا سکا ہے۔ یہ معمہ کبھی حل ہو گا بھی یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم نفسِ انسانی کے چند خاص خاص مظاہر پر نظر ڈالنے پر اکتفا کریں گے۔

---

[1] جس مضمون کی طرف اشارہ ہے وہ رسالہ جامعہ بابت اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

انسان جمادات نبادات اور حیوانات سے ترقی کرکے موجودہ منزل پر پہنچا ہے۔ اس لئے ہنوز اس کی بنیادیں جماداتی، نباتاتی اور حیوانی عناصر پر استوار ہیں۔ ان عناصر سے وہ خود کو کم از کم اس دنیا میں تو کلیتاً آزاد نہیں کرسکتا۔ انسان کو سمجھنے کے لئے دراصل ان مختلف عالموں کے اصولوں کو بھی سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان تمام عالموں کے قوانین انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہیں انسان خلاصہ ہے دنیا کی زندگی کا۔ وہ ارتقا کا انتہائی بلند نقطہ ہے جس پر اس وقت تک دنیا پہنچ چکی ہے۔ عالم جمادات کا قانون میکانکی ہے۔ یہاں مادہ صرف دوسرے کی تحریک ہی سے حرکت کرتا ہے۔ اس میں بالذات نہ نمو کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن جب جمادات ارتقا کرکے ایک منزل آگے بڑھتے ہیں تو ان میں فطری اپج اور نمو کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور یہاں وہ عالم نباتات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ عالم نباتات کا قانون نشوونما ہے لیکن یہ نشوونما بالارادہ نہیں بلکہ صرف فطری اپج کے باعث ہے۔ عالم نباتات زمین سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ خود کو اس سے آزاد نہیں کرسکتا۔ عالم نباتات اپنے ارتقا میں ایک منزل اور آگے بڑھتا ہے تو وہ حیوانات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہاں وہ اب زمین کا پابند نہیں رہتا بلکہ اس سے آزاد ہوجاتا ہے۔ وہ اب خود حرکت کرسکتا ہے۔ لیکن یہ حرکات ہنوز جبلی ہوتی ہیں اور اس میں ارادہ بہت پایا جاتا ہے یا اگر بعض ترقی یافتہ حیوانات میں پایا بھی جاتا ہے تو بہت ہی ابتدائی قسم کا۔ پروفیسر کوہلر (برلن) نے اپنے تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ بندروں میں بھی کسی قدر ذہانت پائی جاتی ہے ذہانت، ارادہ چاہے بہت ہی ابتدائی شکل میں حیوانوں میں بھی پایا جائے لیکن ہم انہیں صحیح معنوں میں عقل بالارادہ نہیں کہہ سکتے ان کے اکثر اعمال جبلت پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ عقل اور ارادہ کا اصلی ظہور دراصل انسان ہی میں ہوتا ہے جو ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ حیوان ہے۔

لیکن انسان اپنی مابہ الامتیاز خصوصیتیں حاصل کرنے کے پہلے وہ تمام منازل ارتقا طے کرلیتا ہے جو تمام کائنات اس وقت تک طے کرچکی ہے لیکن یہ منازل ارتقا اب بہت جلد طے ہوجاتی ہیں

بہت سے مسائل تو جیسا ماہرین علم جنین ثابت کر چکے ہیں انسان شکم مادر ہی میں طے کر لیتا ہے وہاں وہ مختلف حیوانوں کی سی زندگی گزارتا ہے اور پانی اس کا خاص ماحول ہوتا ہے جس سے انسانی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس پر ہم اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ پیدائش کے وقت سے انسان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم اس تحقیقات کے لیے عہد جدید کے محققین میں سے خاص طور پر پروفیسر ولیم اسٹرن (ہابرگ، جرمنی) پروفیسر جان ڈیوی (امریکہ)، پروفیسر کرشن اسٹائنر (میونخ، جرمنی) پروفیسر اشپرانگر (برلن، جرمنی) اور پروفیسر برٹرنڈ رسل (انگلستان) کے ممنون ہیں۔

نفسیاتی اعتبار سے ہم انسانی زندگی کو مندرجہ ذیل مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان کی نفسی زندگی کا سانچہ وہی ہو جو ہم پیش کر رہے ہیں بعض انسانوں میں نفسی ارتقا جلد ہوتا ہے اور بعض میں دیر سے بعض میں پختگی بہت جلد آجاتی ہے لیکن وہ مرجھا بھی جلد جاتے ہیں بعض میں عدم صلاحیت کے باعث یا مناسب ماحول نہ میسر ہونے کے باعث اُن چند صلاحیتوں کا اظہار ہی نہیں ہوتا جن کا ہم ذکر کریں گے۔ غرضکہ نفسی زندگی انفرادیت کا جامہ زیب تن کئے رہتی ہے جو بہت ہی مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ تاہم اس انفرادیت میں سے جو کچھ بھی عام قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور ان کو انسانی زندگی کے مختلف عہدوں سے وابستہ کیا جا سکتا ہے اس کو پیش کرنے کی ہم ذیل میں کوشش کریں گے۔ انسانی زندگی کے مختلف ادوار مندرجہ ذیل ہیں۔

عمر	نوعیت اعمال	غالب نفسی عنصر
۱۔ شروع کے دو برس	عہد شیرخوارگی یا جبلتوں کا عہد	(جبلت)
۲۔ تین برس سے ۷ برس تک	طفولیت یعنی کھیل کود یا بلا مقصد صلاحیتوں کی نمو کا عہد	(خواہش)
۳۔ ۷ برس سے ۱۴ برس تک	عنفوانِ شباب یعنی بالارادہ افعال کا عہد	(جذبات)
۴۔ ۱۴ برس سے ۲۵ تک	عہد شباب یعنی رجحانات کی نشوونما کا عہد	(رجحانات)

۵۔ ۲۵ برس سے ۴۰ تک آدمیت یعنی ارادہ وعقل کی نشو و نما کا عہد (ارادہ وعقل)

۶۔ ۴۰ برس سے موت تک پختگی یعنی روحانی احساس کی نشو و نما کا عہد (روحانیت)

انسانی زندگی کے ان چھ ادوار کے خصائص پر ہم ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔عہد شیر خوارگی | شیر خوارگی کا عہد عموماً بچہ کے شروع کے دو سال رہتا ہے۔ بچہ کے تمام اعمال اس عہد میں صرف جبلت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کا بچہ کو کوئی شعور نہیں ہوتا۔ اس وقت اس میں کسی قسم کی ذاتی قوت ارادی بھی نہیں پائی جاتی صرف جبلت ہی اس کو اکسائی رہتی ہے اس عہد میں خارجی تاثرات بچہ پر بہت مرتب ہوتے ہیں۔ خارجی تاثرات سے اثر پذیری کے باعث اس وقت بچہ میں کسی قسم کا رجحان نہیں پیدا ہوتا۔ چیزوں کی قدر کا احساس بچہ میں پیدا ہو جاتا ہے گو وہ صرف مادی اور لذتی قدور ہوتی ہیں۔ مثلاً بھوک و پیاس، گرمی اور روشنی کی ضرورت، ہمدردی اور نفرت کے باعث چیزوں میں ایک قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عہد دراصل ایک قسم کا حیوانی عہد ہوتا ہے جس میں صرف جبلی ضرورتوں کا غلبہ ہوتا ہے اس عہد کی خصوصیت غرضکہ جبلی طور پر اعمال کا صادر ہوتا ہے بچہ کی جبلتوں کو اس عہد میں روکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان کو اظہار کا خوب موقعہ دینا چاہیئے، مثلاً اسے خوب حرکت کرنے دینا چاہیئے اس عہد کی نفسیات پر سب سے جامع تحقیقات ولیم اسٹرن نے اپنی کتاب بچہ کی نفسیات میں پیش کی ہیں۔

۲۔عہد طفولیت | بچپن کا یہ عہد ۲ برس سے عموماً ۷ برس تک رہتا ہے بچہ کو اس عہد میں کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے تمام کام اس وقت بلا ارادہ اور بلا مقصد ہوتے ہیں۔ اس وقت بچہ کی جبلتیں ہزاروں طریقہ پر خارجی تاثرات سے گھل مل جاتی ہیں اس وقت بچہ میں اس قسم کی سینکڑوں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں جو اس کی حیوانی اور جبلی قدور پر مبنی ہوتی ہیں۔ بچہ کی زندگی پر انھیں خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اور صرف انھیں خواہشات کے ذریعہ اس کی خوابیدہ زندگی کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ کچھ کچھ اب قوت ارادی کا بھی اظہار شروع ہوتا ہے لیکن اس کا مقصد ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی مطلوبہ خواہشوں کو پورا کیا جائے۔ کسی خاص خواہش پر بچہ اپنی توجہ کو مرکوز نہیں کرسکتا بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے۔ صرف خارجی تاثرات

کے باعث ہی یہ توجہ بدلتی نہیں رہتی ہے بلکہ داخلی طور پر بھی بچہ میں بڑا انقلاب ہوتا رہتا ہے جس کے باعث اس کی خواہشوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تصورات کے ان تغیرات کے باعث بچہ ہمیشہ بہت ہی مختلف کھیلوں کا طالب ہوتا ہے وہ ایک غیر محدود خیالی دنیا میں زندگی گذارتا ہے جس میں کسی قسم کی وحدت نہیں پائی جاتی۔ اس کے تمام اعمال کا محرک کوئی خاص اعلیٰ تصور نہیں ہوتا۔ یعنی اس کا کوئی خاص ارادہ یا مقصد یا تصور نہیں ہوتا۔ وہ انھیں افعال کو قابل قدر سمجھتا ہے جو اس کی جبلت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ قدر عمل سے کلیتاً وابستہ ہوتی ہے اور بالآخر وہ لامحدود اشیا بھی جو عمل کا ذریعہ ہوتی ہیں بچہ کے لئے ایک قدر ہو جاتی ہیں۔

لیکن بچہ میں بہت جلد مقصد کا شعور بھی پیدا ہو جاتا ہے عمل کے ذریعہ بچہ میں کارکردگی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اب عمل صرف عمل کی خاطر نہیں بلکہ کارکردگی کی صلاحیت پیدا کرنے کی خاطر کرتا ہے۔ بچہ کو اب یہ علم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خود محرک ہے اور اسے اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ مقصد حاصل کرنے کے لئے خود کارکردگی کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے اب اس کے اعمال بالذات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے انجام دیئے جاتے ہیں لیکن یہ مقصد ہمیشہ ایک خواہش کو پورا کرنا ہوتا ہے اور یہ خواہش ہمیشہ ایک مادی لذت یا مسرت ہوتی ہے۔ بچوں کے کھیلوں میں بھی اب تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اب ایک قانون اور نظام کے تحت میں آ جاتے ہیں۔ اس عہد کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بچہ کے مندرجہ ذیل اعمال کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مختلف کھیل، کسی چیز کو پیش کرنے کے خیال سے نقوش اتارنا، زیت میں بغیر کسی مقصد کے چیزیں بنانا، واہمہ کے مطابق چیزیں بنانا، مقصد کو پیش نظر رکھ کر چیزیں بنانا، بڑی احتیاط کے ساتھ ایک مقصد کے مطابق چیزیں بنانا، بغیر کسی مقصد کے کودنا، اچھلنا، ناچنا وغیرہ۔ بچہ اب اس کا خیال نہیں کرتا کہ وہ کیا کرتا ہے بلکہ اس کا بھی کہ وہ کس طرح کرتا ہے۔ وہ اپنے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے مہارت کو بھی ایک ذریعہ خیال کرتا ہے لیکن اس وقت تک بچہ صرف اس قسم کے مقاصد متعین کرتا ہے جو بہت قریبی ہوں اور جو بہت جلد حاصل کئے جائیں لیکن آہستہ آہستہ جسمانی

اور نفسی ترقی کے ساتھ وہ بعید تر مقاصد بھی متعین کرنا شروع کرتا ہے۔ اب وہ ان بعید مقاصد کے حصول کے ذریعوں کی بھی ایک قدر تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ عہد عنفوان شباب | عنفوان شباب عہد شباب کا پہلا دور ہے شباب کا عہد زندگی کی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں کا عہد ہے۔ یہاں زندگی بجلی کی طرح کوندتی، بادل کی طرح کڑکتی اور بارش کی طرح برستی ہے۔ طرح طرح کے ہزارہا خود رو پھول باغ ہستی میں اگ جاتے ہیں اور کائنات کی فضا ان کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے عہد طفولیت کی معصومیت کی جگہ شباب کی نیرنگیاں لیتی ہیں۔ یہ طوفانی دبلا کا ایک دور ہوتا ہے جس میں نفس انسانی کی ہزارہا کشتیاں غرق ہو جاتی ہیں اور جو بچ کے نکل آتی ہیں وہ اکثر سکون و استقلال سے سفر کے بقایا مراحل طے کر کے ساحل مراد تک پہنچ جاتی ہیں۔ نفسی اعتبار سے یہ عہد سب سے زیادہ قابل مطالعہ ہے۔ یہاں جو تنوع، جدت، اپج، جوش نمو اور فطری ترنگ پائی جاتی ہے اس کا پتہ دوسری جگہ نہیں ملتا۔ عہد طفولیت میں اکثر بے رنگی ہوتی ہے تو عہد آدمیت میں جذبات میں سکون کے باعث یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر زندگی کی رنگا رنگی دیکھنا چاہو تو وہ صرف عہد شباب کے شب و روز ہی میں دکھائی دے سکتی ہے۔

اس عہد میں ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو مقاصد پر مبنی ہوتی ہیں اور جو ایک عرصہ تک قائم بھی رہتی ہیں۔ عہد طفولیت میں جن قدروں کا تجربہ کیا گیا تھا اور جو کلیتاً حیوانی اور جبلی تھیں، اب ان کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عملی مقاصد مثلاً اشیاء کا فراہم کرنا، مکان، راستہ اور مدرسہ کے لئے مختلف اسباب مہیا کرنا، واقعات کو تمثیل کے ذریعہ پیش کرنا، چھپی ہوئی چیزوں کو ناٹک کے ذریعہ پیش کرنا وغیرہ کا اس وقت تک استعمال کیا جاتا ہے جس وقت تک کہ وہ اس عہد میں مقرر کردہ مقاصد کے حصول میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے دوران میں اس طرح مشق کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب مہارت، فنی صلاحیت، استقلال، ضبط نفس، محنت، صبر اور اطاعت کو نوجوان قابل قدر عناصر تصور کرتا ہے بلکہ وہ بالذات مقاصد بھی تصور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح قوت ارادی اخلاقی نشو و نما کی مدد کرتی ہے اور وہ اخلاقی ذریعوں میں شوق پیدا کر دیتی

ہے یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔

(الف) شعوری اثباتِ ذات

(ب) شعوری نفی ذات

اس کے متعلق جان ڈیوی کہتا ہے کہ "جب لڑکا جان بوجھ کر اپنے کام کا مقصد متعین کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے مقاصد کے ساتھ منسوب کرنا چاہتا ہے اور ان کو دوسروں کے مقاصد سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح دوسرے سے تضاد کا شعور انسانی نفس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بلاشک اس وقت اور زیادہ جب ذاتی قوت ارادی اور اثبات ذات میں کسی قسم کی خامی ہو۔ لیکن اپنی ذات اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب سماجی قدور کا دوستی یا خاندان میں عملاً تجربہ کیا جائے۔ اس تجربہ قدر کے باعث خاندان اور دوستی کے مقاصد متعین کئے جاتے ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بچہ خود کو ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور جس حد تک سماجی قدور کا صحیح تجربہ کیا جا سکتا ہے اسی حد تک تجربہ شدہ قدر کے لئے انسان اپنی ذات پر قبضہ حاصل کرتا ہے۔"

لیکن اس زمانہ میں تمام جسم اور نفس کی نشو و نما فطری اپج کے باعث زیادہ ہوتی ہے، خارجی تاثرات کے مقابلہ میں اثر پذیری کا بھی بہت زیادہ مادہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اسی لئے بہت سی مختلف قسم کی چیزوں سے مشغولیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ قدور کا اظہار کیا جا سکے جن مقاصد کے حصول کے لئے ایک زمانہ دراز درکار ہوتا ہے وہ اس وقت ممکن نہیں ہوتے۔ اشیا کی قدر پر اس عہد میں غور و فکر نہیں کیا جاتا بلکہ اشیا اور ان کے افعال کو ماحول کے معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اصولوں کی بنا پر اس وقت تک اعمال سرزد نہیں ہوتے کیونکہ اس کے لئے تو زبردست قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس وقت مفقود ہوتی ہے۔

ارادے کے برخلاف عقل اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ مقصد اور ذرائع کے تعلقات متعین کرتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیت کی کارکردگی کی بھی جانچ کرتی ہے۔ مقاصد کے حصول

کے دوران میں ذاتی امتحان کے بہت سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ ہم اس پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس دور کے آخر میں لازماً افراد میں نظری رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ طالب العلم اپنے مقاصد کے لئے نظری قوانین بناتا ہے یہ نظری رجحان لیکن کلی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق صرف خاص چیزوں سے ہوتا ہے۔ عام طور پر اس عہد میں رجحان عملی جسمانی جد وجہد اور اس کے لئے مفید ذریعوں کی طرف ہوتا ہے۔ طالب العلم کے لئے وہ تمام مقاصد قابل قبول ہوتے ہیں جن کے حصول میں نہ صرف وہ معلومات بلکہ جسمانی مہارتیں بھی حاصل کرتا ہے اور خارجی حواس کے کاموں کے ذریعہ وہ خود اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے۔ جن مدرسوں میں جسمانی کام بھی داخل کر دیا گیا ہے وہاں اس رجحان کا بہت زیادہ پتہ چلتا ہے۔ یہاں طالب العلم بہت شوق سے اپنا کام انجام دیتے ہیں لیکن ذاتی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں دوسرے افراد اور ماحول کا بھی قوی شعور موجود ہوتا ہے۔

۴۔ عہد شباب | جوانی کا یہ عہد عموماً ۱۴ برس سے لے کر ۲۵ برس تک رہتا ہے۔ اس عہد میں کام سے زیادہ دلچسپی بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی اسی قدر زیادہ بڑھتی ہے جس قدر کہ اس کے قبل کا دور ایک موزوں ماحول میں گذر چکا ہو۔ نوجوان کو اب یہ احساس شروع ہوتا ہے کہ وہ قدر کا حامل ہے۔ اس کو اپنے علیحدہ وجود اور علیحدہ قدر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ قدر کا ایک قوی احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ماحول، چیزوں اور افراد کی تنقید کرے۔ اس کے مقاصد اب ہمہ گیر ہونا شروع ہوتے ہیں اور زبردست سماجی احساس پیدا ہو جاتا ہے اپنے خاندان اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ وہ زیادہ وابستگی محسوس کرتا ہے۔ نفسی ارتقا اس زمانہ میں بہت کافی ہوتا ہے اور نفسی قدور کا تجربہ اب نفسی ذرائع سے کیا جاتا ہے۔ اشیا میں اب بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اشیا خود نئے نئے نفسی تجربات کا باعث ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں ان کے تمام افعال ایک واحد مقصد کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ بہت سے مختلف مقاصد بیک وقت پیدا ہوتے ہیں جہاں نوجوانوں کو تربیت ادنیٰ درجہ کے ماحول میں ہوتی ہے وہاں اسے

صرف حسی اور عام طور پر صرف مادی مقاصد ہی سے دلچسپی ہوتی ہے۔

اس عہد کے پہلے دور میں نوجوانوں کی توجہ صرف عملی کاموں کی طرف ہوتی ہے اور ہر جگہ وہ اثباتِ ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔ ذاتی جذبہ کا اس پر تسلط پایا جاتا ہے بمعروضی احساس میں اس وقت بڑی خامی ہوتی ہے۔ اکثر چیزوں کو موضوعی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے بہت سی اشیا کو ان کی قدر کے اعتبار سے یا تو قبول کر لیا جاتا ہے یا رد کر دیا جاتا ہے مروجہ قدر کی اکثر مخالفت کی جاتی ہے کیونکہ ذاتی خیالات اکثر سماج کے مطالبات کے مخالف ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تعلیم ایک صحیح تعلیمی ماحول میں ہوتی ہے وہاں ہمہ گیر نفسی اشیا نوجوانوں کی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ مثلاً دوستی، اخوت، شہرت، عزت، آزادی، اخلاق ذہن، مادر وطن، جمعیت قومی، خدا وغیرہ کے تصورات نوجوانوں کی زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جہاں نفسی زندگی ماحول سے بہت زیادہ وابستہ ہوتی ہے وہاں حسی قدور مثلاً لذت، ملکیت، طاقت اور قوت نوجوان کی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ پہلے فریق کے بہترین لوگ نفی ذات اور ایثار کو اپنا اعلیٰ ترین مطمح نظر سمجھتے ہیں اور دوسرے فریق کے اکثر لوگ جسمانی لذت، مسرت، جسمانی طاقت اور دوسروں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تعلیم اچھے ماحول میں ہوتی ہے وہاں خاص خاص نفسی رجحانات کی نشو و نما ہو جاتی ہے لیکن یہ اسی وقت ہوتی ہے جب نوجوانوں میں اس کی امکانی صلاحیت بھی موجود ہو۔ افراد کے مقاصد اور قدور کے اختلافات کا اب پتہ چلنے لگتا ہے۔

خارجی تعلیم کی زبردست طاقت اب ختم ہو جاتی ہے۔ ذاتی متعین شدہ مقاصد کے ذریعہ اب تعلیم کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعلیمی اعمال کو اب خود متعین کیا جاتا ہے اور خود اختیاری کا پھر تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اگر خاص صلاحیت کے باعث نوجوان کو اپنے اصلی پیشہ کا خود بخود پتہ نہیں چلتا تو وہ اپنی داخلی صلاحیت کے پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں نوجوان کو اپنی داخلی صلاحیتوں کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ انھیں کی مناسبت سے اپنے پیشہ کا بھی انتخاب کر لیتا ہے

اور اس میں اس کا دل بھی لگ جاتا ہے وہاں نوجوان کو اپنے پیشہ کا ایک نصب العین بھی ہاتھ لگ جاتا ہے اور اب اس کے تمام اعمال اس نصب العین کے تحت آجاتے ہیں۔ اب وہ اپنا کام صرف کام کی خاطر انجام دینے لگتا ہے لیکن اس قسم کی نشو و نما صرف ایک قلیل اقلیت ہی کی ہوتی ہے اکثر نوجوان جنھیں اوائل زندگی ہی میں مجبوری کے باعث کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا جس سے انھیں داخلی طور پر کوئی مناسبت نہ تھی اس قسم کی نشو و نما سے بالکل محروم رہتے ہیں۔

ہم نے انسانی زندگی کے چار ادوار کے خصائص مختصراً بیان کر دئے یہ تصویر کرشن اشٹائنر سے ماخوذ ہے جو اس نے اپنی مشہور کتاب "نظریہ تعلیم" میں پیش کی ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں غیر یقینی اور قابل سوال ہیں لیکن ایسے بہت سے مستحکم نقطے بھی موجود ہیں جن پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن اس امر پر ہم پھر زور دینا چاہتے ہیں کہ نفس انسانی اپنی مختلف سمتوں میں بیک وقت ترقی نہیں کرتا۔ بسا اوقات نفس انسانی کا ایک پہلو بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرا پیچھے رہ جاتا ہے۔ انسان کا ماحول بھی مختلف قسم کا ہوتا ہے جو انسان پر بہت ہی مختلف تاثرات مرتب کرتا ہے اور طالب العلم کی تعلیمی صلاحیت بھی بہت ہی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔

اس وقت ہم نے انسانی زندگی کے جن دوروں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق مدرسہ کی تعلیم سے ہے۔ اس میں سے عہد شیر خوارگی اور بچپن کے چند برس کو علیحدہ کر دینا چاہیے جو بچہ ماں کی گود یا گھر میں اپنی ماں کے ساتھ بہت مربوط زندگی گذارتا ہے۔ ان ادوار میں اور اس کے بعد لڑکپن اور جوانی میں بھی انسان بہت کچھ دوسروں کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ وہ دوسروں سے علم حاصل کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے خیالات جذب کرتا ہے، وہ دوسرے لوگوں کو بحیثیت نصب العین اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اثر پذیری کا زمانہ ہوتا ہے اور اسی لئے صحیح معنوں میں تعلیم کا زمانہ ہے۔ تقریباً ۲۵ برس میں انسان کے مدرسہ کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسانی تعلیم کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ دوسروں پر نہیں بلکہ کلیتاً اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم ان ادوار کا کچھ ذکر کریں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نفسیات کے بیان کردہ علم کی روشنی میں ہم

یہاں چند تعلیمی اصول بیان کر دیں۔

۱۔ اصول پابندی ماحول | انسان کو اپنے ماحول سے یکایک علیحدہ نہیں ہونا چاہیئے اس سے اس کے نفسی توازن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ پستالوزی ماحول کی اس پابندی پر بہت زور دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر انسان اپنے ماحول کا پابند نہ رہے تو اس کی صحیح تعلیم ہی نہیں ہو سکتی۔ جدید ماحول سے مطابقت کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی اس لیئے وہ اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور قدیم ماحول سے وابستہ رہنے سے جو خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہندوؤں کی ذات پات کی طرح بہر حال و بہر صورت نسلاً در نسلاً ایک ہی آبائی پیشہ اختیار کرنا چاہیئے لیکن ایک پیشہ کی جگہ دوسرے پیشہ کو بہت ہی احتیاط سے اختیار کرنا چاہیئے اور وہ بھی جب انسان اس کی فطری صلاحیت رکھتا ہو۔ دوسرا پیشہ اختیار کرنے سے انسان کا پورا ماحول بدل جاتا ہے جس کا اثر انسان کی پوری نفسی زندگی پر مرتب ہوتا ہے وہ چاہے معاشی ہو یا اخلاقی۔

۲۔ اصول آزادی | دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر نفسی دور کے خصائص کے مطابق گذارنی چاہیئے یعنی اگر عہد شیر خوارگی کی اصل خصوصیت جبلتیں ہیں اور ان جبلتوں کے باعث ہی بچہ کے تمام اعمال سرزد ہوتے ہیں تو ان جبلتوں کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیئے بلکہ انھیں اظہار کا خوب موقعہ دینا چاہیئے۔ بچپن کے عہد کی خصوصیت کھیل کود ہے اس لیئے بچہ کے کھیل کود کے لیئے بہت اسباب مہیا کرنا چاہیئے۔ آئندہ کی تربیت یا تعلیم کے خیال سے بچہ کی فطری ارتقا میں مزاحمت نہ پیدا کرنی چاہیئے لڑکپن میں عموماً لڑکے جذبات سے معمور ہوتے ہیں۔ اس جذباتی زندگی کے اظہار کا انھیں موقعہ ملنا چاہیئے۔ البتہ ان جذبات کو خاص خاص سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔ جوانی کا زمانہ انسان کے رجحانات کی تربیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ بہتر ہے کہ نوجوان اپنے ارادے اور عقل سے کوئی کام کر کے ناکامیاب ہو بجائے اس کے کہ اسے غلطی کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ غلطی کر کے انسان پھر سنبھل سکتا ہے تاہم اس طرح اس کی قوت ارادی

عقل اور دیگر رجحانات کی تربیت ہوتی ہے۔ لیکن جو کبھی خود کوئی ارادہ ہی نہیں کرتا اس کے رجحانات کی تربیت ہی نہیں ہو سکتی۔

غرضکہ انسانی زندگی کے ہر نفسی دور میں انسان کو پورا پورا حصہ لینا چاہیئے۔ انسان کو بچپن میں بچہ کی طرح، لڑکپن میں لڑکے کی طرح اور جوانی میں جوان کی طرح زندگی گذارنی چاہیئے ورنہ اس کی زندگی میں خامی رہ جائے گی اور وہ نشو ونما کی آئندہ منزل کے لئے ناکافی مستحکم نہ ہوگا۔ جو معلمین لڑکوں میں جب کہ وہ خواہشات سے لبریز ہوتے ہیں ضرورت سے زائد عقل پیدا کرنا چاہتے ہیں اکثر ان کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں فطری صلاحیت کے خلاف عمل کرنے کا نتیجہ اکثر رد عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور لڑکا پھر کسی بھی قابل نہیں رہتا۔ غرضکہ ہر عہد کی بنیادی نفسی صلاحیتوں کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے یعنی جبلتوں، خواہشوں جذبات ارادوں اور عقل کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ ایک نفسی عہد سے دوسرے عہد میں انسان کو یکایک داخل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ یہ داخلہ تدریجی ہونا چاہیئے اور وہ بھی اس وقت جب پہلے عہد کی مکمل نفسی زندگی گذاری جا چکی ہو۔ بغیر اس فطری اصول کی پابندی کے صحیح تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اصول کلیت | نفس انسان ایک وحدت ہے۔ وہ ایک کل ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ نفس انسانی کے ہم علیحدہ علیحدہ ٹکڑے نہیں کر سکتے، جذبہ، ارادہ، عقل وغیرہ کلیتاً علیحدہ نہیں ہیں بلکہ وہ شعور انسانی کے مختلف شعبے ہیں۔ نفس انسانی کی یہ سہ گونہ تقسیم فلاطون کی وقت سے برابر چلی آرہی ہے لیکن اکثر عقلی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور نفس انسانی کے دوسرے شعبوں کو عقل کے ماتحت قرار دیا گیا ہے لیکن نفس انسانی کی کلیت کا جو تصور آج کل ہے اس سے قبل موجود نہ تھا۔ ہوسرل نے شعور کو ایک وحدت قرار دیا اور علم کی بنیاد ایک وجدانی عمل کو قرار دیا جو بیک وقت شعور انسانی سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن ہوسرل خود کو عقلیت سے کلیتاً آزاد نہ کر سکا۔ فرائڈ نے نفس انسانی کی اصل خواہشات جنسی کو قرار

دیا۔ آڈلر نے اس کے برخلاف طاقت کے جذبہ کو۔ برگساں نے ان کو اشپرانگر نے نفس انسان کو چھ شعبوں یعنی سیاسی، معاشی، سماجی، علمی، جمالی اور مذہبی میں تقسیم کیا لیکن بنیادی جذبہ مذہبی قرار دیا۔ ان محققین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ نفس انسانی کی بنیاد کیا ہے لیکن اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے کہ نفس ایک وحدت اور کل ہے اور دوسرے تمام شعبے اس بنیادی شعور (شعور سے یہاں مراد صرف عقلی شعور نہیں ہے بلکہ نفسی کلی شعور ہے) کے مظاہر ہیں۔ نفسیات کی اس بنیادی حقیقت سے یہ تعلیمی اصول مرتب ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تربیت کلی طور پر ہونی چاہیئے۔ ہم عقل کی تربیت کے لئے جذبہ یا ارادے کو قربان نہیں کرسکتے۔ ولیم اسٹرن تو اپنی تحقیقات میں سب سے آگے ہے۔ وہ نہ صرف نفس انسانی کی وحدت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ انسان کی نفسی اور مادی پہلو میں بھی کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ اسی لئے وہ نفسی قوی اور جسمانی قوی کی تفریق سے انکار کردیتا ہے اور ان کو شخصیت کے دو پہلو قرار دیتا ہے جو بیک وقت نفسی اور جسمانی دونوں ہیں۔ اس کے نزدیک نفس اور جسم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ وہ صرف شخصیت کے دو پہلو ہیں نفس باطنی پہلو ہے اور جسمانی ظاہری اور یہ بھی ایک دوسرے سے کلیتاً مخلوط۔ اسی بنا پر اسٹرن کے لئے تعلیم ایک وحدانی عمل ہے جس میں نفسی اور جسمانی تعلیم لازماً شریک ہے۔

۴۔ اصول تخلیق | سب سے آخری مگر سب سے اہم نفسی مظہر تخلیق ہے۔ اسی بنا پر تعلیم میں اصول تخلیق سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ جمادات حرکت کے خارجی محرکات کی محتاج ہیں، نباتات میں فطری نمو کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ بھی زمین کی پابند ہیں حیوانات خود بخود حرکت کرتے ہیں لیکن یہ حرکات جبلی ہوتی ہیں، صرف انسان ہی میں آکر ایک آزاد ارادہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد خود متعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع تلاش کرتا ہے ان ذریعوں سے وہ مقاصد کو حاصل کرنے کی جد وجہد کرتا ہے۔ دوران سفر میں عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرضیکہ انسان کی حرمت صرف اسی لئے ہے کہ وہ ایک آزاد اخلاقی

عقل اور دیگر رجحانات کی تربیت ہوتی ہے لیکن جو کبھی خود کوئی ارادہ ہی نہیں کرتا اس کے رجحانات کی تربیت ہی نہیں ہو سکتی۔

غرضکہ انسانی زندگی کے ہر نفسی دور میں انسان کو پورا پورا حصہ لینا چاہیئے۔ انسان کو بچپن میں بچہ کی طرح، لڑکپن میں لڑکے کی طرح اور جوانی میں جوان کی طرح زندگی گذارنی چاہیئے ورنہ اس کی زندگی میں خامی رہ جائے گی اور وہ نشو و نما کی آئندہ منزل کے لئے ناکافی مستحکم نہ ہوگا۔ جو معلم لڑکوں میں جب کہ وہ خواہشات سے لبریز ہوتے ہیں ضرورت سے زائد عقل پیدا کرنا چاہتے ہیں اکثر ان کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں فطری صلاحیت کے خلاف عمل کرنے کا نتیجہ اکثر رد عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور لڑکا پھر کسی بھی قابل نہیں رہتا۔ غرضکہ ہر عہد کی بنیادی نفسی صلاحیتوں کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے یعنی جبلتوں، خواہشوں جذبات ارادوں اور عقل کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ ایک نفسی عہد سے دوسرے عہد میں انسان کو یکایک داخل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ یہ داخلہ تدریجی ہونا چاہیئے اور وہ بھی اس وقت جب پہلے عہد کی مکمل نفسی زندگی گذاری جا چکی ہو۔ بغیر اس فطری اصول کی پابندی کے صحیح تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اصول کلیت: نفس انسان ایک وحدت ہے۔ وہ ایک کل ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ نفس انسانی کے ہم علیحدہ علیحدہ ٹکڑے نہیں کر سکتے، جذبہ، ارادہ، عقل وغیرہ کلیتاً علیحدہ نہیں ہیں بلکہ وہ شعور انسانی کے مختلف شعبے ہیں۔ نفس انسانی کی یہ سہ گونہ تقسیم فلاطون کی وقت سے برابر چلی آ رہی ہے لیکن اکثر عقلی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور نفس انسانی کے دوسرے شعبوں کو عقل کے ماتحت قرار دیا گیا ہے لیکن نفس انسانی کی کلیت کا جو تصور آج کل ہے اس سے قبل موجود نہ تھا۔ ہوسرل نے شعور کو ایک وحدت قرار دیا اور علم کی بنیاد ایک وحدانی عمل کو قرار دیا جو بیک وقت شعور انسانی سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن ہوسرل خود کو عقلیت سے کلیتاً آزاد نہ کر سکا۔ فرائڈ نے نفس انسانی کی اصل خواہشات جنسی کو قرار

دیا۔ آڈلر نے اس کے برخلاف طاقت کے جذبہ کو۔ برگسان نے وجدان کو۔ اشپرانگر نے نفس انسان کو چھ شعبوں یعنی سیاسی، معاشی، سماجی، علمی، جمالی اور مذہبی میں تقسیم کیا لیکن بنیادی جذ مذہبی قرار دیا۔ ان محققین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ نفس انسانی کی بنیاد کیا ہے لیکن اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے کہ نفس ایک وحدت اور کل ہے اور دوسرے تمام شعبے اس بنیادی شعور (شعور سے یہاں مراد صرف عقلی شعور نہیں ہے بلکہ نفسی کلی شعور ہے) کے مظاہر ہیں۔ نفسیات کی اس بنیادی حقیقت سے یہ تعلیمی اصول مرتب ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تربیت کلی طور پر ہونی چاہیئے۔ ہم عقل کی تربیت کے لئے جذبہ، یا ارادے کو قربان نہیں کرسکتے۔ ولیم اسٹرن تو اپنی تحقیقات میں سب سے آگے ہے۔ وہ نہ صرف نفس انسانی کی وحدت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ انسان کی نفسی اور مادی پہلو میں بھی کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ اسی لئے وہ نفسی قوی اور جسمانی قوی کی تفریق سے انکار کر دیتا ہے اور ان کو شخصیت کے دو پہلو قرار دیتا ہے جو بیک وقت نفسی اور جسمانی دونوں ہیں۔ اس کے نزدیک نفس اور جسم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ وہ صرف شخصیت کے دو پہلو ہیں نفس باطنی پہلو ہے اور جسمانی ظاہری اور یہ بھی ایک دوسرے سے کلیتاً مخلوط۔ اسی بنا پر اسٹرن کے لئے تعلیم ایک وحدانی عمل ہے جس میں نفسی اور جسمانی تعلیم لازماً شریک ہے۔

۴۔ اصول تخلیق | سب سے آخری مگر سب سے اہم نفسی مظہر تخلیق ہے۔ اسی بنا پر تعلیم میں اصول تخلیق سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ جمادات حرکت کے خارجی محرکات کی محتاج ہیں، نباتات میں فطری نمو کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ بھی زمین کی پابند ہیں حیوانات خود بخود حرکت کرتے ہیں لیکن یہ حرکات جبلی ہوتی ہیں، صرف انسان ہی میں آکر ایک آزاد ارادہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد خود متعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع تلاش کرتا ہے ان ذریعوں سے وہ مقاصد کو حاصل کرنے کی جد وجہد کرتا ہے۔ دوران سفر میں عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرضکہ انسان کی حرمت صرف اسی لئے ہے کہ وہ ایک آزاد اخلاقی

تاکہ وہ اشیا کا ان کی اصلی حالت میں مطالعہ کر سکے جس میں دراصل اسے کامیابی نہیں ہوتی۔

بدیہی اعیان کا پتہ انسان کو اسی عہد میں چلتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کیف وکم، وحدت، کثرت، نیکی، صداقت، حسن، اور اخلاق کے تصورات صرف انفرادی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی ایک مجموعی حیثیت ہے اور جو تمام انسانیت کے لئے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ یہ اعیان چونکہ تمام انسانوں میں یکساں پائے جاتے ہیں اس لئے انفرادی نہیں ہو سکتے بلکہ مادری انسانی ہیں۔ انفرادی نفس نے ان اعیان کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ انفرادی نفس میں وہ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ علم ریاضی خاص طور پر انسان کو ان اعیان کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ صداقت، حسن و نیکی کے اعیان چونکہ دراصل ایک ہی شعور کے مظاہر ہیں، اس لئے انسان کو ایک عمومی شعور ماننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ شعور عمومی سے ہمارا مفہوم ہیگل کی طرح صرف عقل کل نہیں ہے بلکہ نفس کل ہے جس میں عقلی عناصر کے دوش بدوش جمالی اور اخلاقی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ شعور عمومی یا نفس کلی مادہ کی پیداوار نہیں ہو سکتا کیونکہ مادہ بے حس و حرکت ہے۔ خود شعور کے باعث مادہ حرکت میں آتا ہے اس لئے وہ کس طرح ایک ایسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے جو خود فعال اور خلاق ہو شعور کی اس عام آزاد' بارادہ' فعال و خلاق دنیا کو کانٹ اس دنیا کے مقابلہ میں جسے وہ PHENOMENA عالم مظاہرات کہتا ہے (NOUMENA) عالم مادری مظاہرات کہتا ہے۔ انسان کا مادی وجود "مظاہرات" سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا نفسی وجود مظاہرات سے مادری دنیا سے۔ انسان کی جسمانی احساسات و تاثرات "مظاہرات" سے لیکن اس کی عقل وارادہ مظاہرات سے مادری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مظاہرات کی دنیا میکانکی ہے اور علت معلول کی پابند' مادری مظاہرات کی دنیا نامی ہے جس میں آزاد ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ کانٹ کی اس دوئی کو جرمن فلسفہ میں بہت جلد اس کے جانشین فشٹے نے مٹا دیا۔ نفس و مادہ دونوں ازلی عناصر نہیں ہیں بلکہ نفس نے اپنی تخلیقی قوت کے باعث مادہ کو اپنے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے۔ نفس کلی یا شعور عامہ دنیا کا

خالق ہے اور انفرادی نفوس اس کے مختلف مظاہرات فلسفیانہ یعنی عقلی غور و فکر کی یہ انتہائی بلندی ہے جس حد تک انسان اس عہد میں پہنچ سکا ہے لیکن باوجود اس تمام غور و فکر کے نفس انسانی کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ حقیقت کے لیے اپنے نفس میں ایک کسک اور ایک چبھن برابر محسوس کرتا ہے۔ کائنات کی گتھیاں اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ طرح طرح کے سوال اسے پیش آتے ہیں لیکن اس کی عقل ان کے جوابات دینے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ بالآخر حقیقت کو کلی طور پر سمجھنے کے لیے اس کو بے بضاعتی علم کا یقین ہو جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں ان لوگوں میں جن میں اس کی فطری صلاحیت موجود ہوتی ہے ایک نیا احساس بیدار ہونا شروع ہوتا ہے جو ان کے دل کو تسکین و تشفی دیتا ہے اور یہ روحانی احساس ہے۔ یہ روحانی احساس بہت ہی کم لوگوں میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ اکثر لوگ چوپایوں اور حیوانوں کی سی زندگی گذارتے ہیں اور اگر آگے بڑھتے بھی ہیں تو ان کی زندگی خواہشات و جذبات کی زندگی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یا اگر اور ترقی کی تو وہ اپنی خواہشات کے لئے عقل کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ خالص عقلی زندگی یعنی علوم و فنون کے لئے بھی زندگی گذار دیتے ہیں لیکن روحانی احساس کی بیداری تک جو نفسی زندگی کے ارتقا کا انتہائی نقطہ ہے بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

روحانی احساس کی یہ بیداری عموماً چالیس برس کے لگ بھگ میں ہوتی ہے اس لئے ہم اس پر بحث انسانی زندگی کے آخری دور میں کریں گے۔

۶۔ پختگی کا عہد | چالیس برس کی عمر میں انسان کے جذبات، قوت ارادی اور عقل میں پختگی آجاتی ہے ان تینوں قویٰ کی انتہائی ترقی انسان کو روحانیت کی سرحد پر لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ عقلی غور و فکر سے کس طرح انسان ایک عام شعور کے یقین تک پہنچ جاتا ہے اس کا مختصر تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں۔ اسی طرح جذبات کی گہرائی اور بلندی ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے

جس کے باعث انسان ایک ہمہ گیر روحانی وجود میں یقین کرنے لگتا ہے۔ پھر قوت ارادی کے مطالعے سے بھی انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسانی قوت ارادی ایک ہمہ گیر اعلیٰ ارادہ کا صرف ایک جزو ہے۔ غرضکہ شاعر اپنے وجدان، فلسفی اپنے عقلی غور و فکر اور عملی انسان اپنی اخلاقی بالارادہ جدوجہد سے ایک اعلیٰ روحانی نظام پر یقین کرنے لگتا ہے۔ انسان میں روحانی صلاحیت موجود ہے اس پر یہ تمام مظاہر شاہد ہیں۔ قرآن مجید میں ہے

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ

(ہم اپنی نشانیاں جہاں میں اور انسانوں میں دکھاتے ہیں تاکہ ان پر حقیقت ظاہر ہو)

آفاق اور جہاں کی نشانیوں یعنی فطرت کے مظاہر کا ادراک حواس خمسہ کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام کام علوم ظاہری کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے اور فطرت کے مطالعہ کے ذریعہ بھی انسان ایک ہمہ گیر روحانی نظام کا قائل ہوجاتا ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

لیکن اس طرح انسان ایک روحانی نظام کو تسلیم تو کرنے لگتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ حقیقت کے بلاواسطہ مشاہدہ کے لئے خود نفس انسانی پر غور و خوض کی ضرورت ہے

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

نفس انسانی پر غور و خوض کا آلہ خود نفس انسانی ہے۔ اس لئے اس کی تربیت و تعلیم کی بھی ضرورت ہے اسے حس باطنی بھی کہتے ہیں اسے ہم نفس انسانی یا روح بھی کہتے ہیں۔ یہ روح وہ باطنی جوہر ہے جو انسان کے جسم پر حاوی ہے اور وہ اس سے جس طرح چاہے کام لیتا ہے جس طرح عقلی اعیان کا پتہ خارجی تاثرات کے باعث نہیں چلتا بلکہ خود عقل پر غور کرنے سے چلتا ہے۔ اسی طرح نفس کو بحیثیت کلی سمجھنے کے لئے نفس انسانی پر غور و خوض کی ضرورت ہے اسی نفسی آلہ میں اس فطری صلاحیت کو ابھارنے کی ضرورت پڑتی ہے جو اس میں موجود ہے۔ اس کے لئے اسے پاک

وصاف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ صفائی مجاہدہ کے ذریعہ کی جاتی ہے جو نفس انسانی سے اس کی تمام مادی کثافتوں کو دور کر دیتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

روح میں یہ صفائی پاکی اور روشنی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خارجی تاثرات سے اپنے آپ کو جہاں تک ہو سکے آزاد کر لے اور خود اپنے نفس کی گہرائیوں میں غرق ہو جائے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے روح کی تربیت کے لئے دو بہت اچھی مثالیں دی ہیں ہم انھیں یہاں دہرانا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ روح ایک آئینہ کے مانند ہے جس پر مادی کثافت چھا گئی ہے قرآن مجید میں ہے

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

مجاہدہ کے ذریعہ آئینہ کے اوپر کے گرد وغبار اور زنگ کو دور کر دینا چاہیئے تاکہ وہ مصفیٰ ہو جائے اور حقیقت اعلیٰ کا نور اس میں دوبارہ جھلکنے لگے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ باطن میں غرق ہو کے حقیقت کا علم حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان زمین کھودے حتیٰ کہ زمین کے اندر سے پانی کے چشمے ابل پڑیں۔ اس کے برخلاف خارجی علوم کی مثال یہ ہے کہ کسی حوض میں باہر سے پانی آرہا ہو۔ صوفیا جو یہ کہتے ہیں کہ علوم ظاہری اصلی حقیقت کے احصا کے لئے حجاب ہو جاتے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ جب تک خارجی تاثرات سے انسان خود کو آزاد نہ کرے وہ باطنی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز ہی نہیں کر سکتا۔

انسان کا یہ باطنی پہلو انسانی روح ہے جس کی حقیقت بیان کرنا بہت دشوار ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ

روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ "عالم خلق جدا ہے اور عالم امر جدا جس چیز کے ناپ، اندازہ اور کمیت ہے اسے عالم خلق کہتے ہیں اس لئے کہ لغت میں خلق کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور آدمی کی روح کے لئے اندازہ اور کمیت نہیں۔ اسی لئے اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی

اگر اس کی تقسیم ہو سکتی تو اس کے ایک جانب کسی چیز کا علم ہوتا اور دوسری طرف جہل. اور یہ ایک ہی وقت میں عالم اور جاہل بھی ہوتا اور یہ باتیں محال ہیں. باوجودیکہ روح قسمت پذیر نہیں ہے اور مقدار کو اس میں دخل نہیں ہے. مگر مخلوق ہے اور پیدا کی ہوئی ہے اور جس طرح خلق پیدا کرنے کو کہتے ہیں ویسا ہی اندازہ کرنے کو کہتے ہیں پس اس لحاظ سے روح عالم خلق سے ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے عالم امر سے ہے نہ کہ عالم خلق سے. عالم امر ان چیزوں سے مراد ہے جن کے لئے ناپ اور اندازہ نہیں اور جن لوگوں نے روح کو قدیم سمجھا ہے غلط ہے اور جنھوں نے عرض کہا ہے وہ بھی غلطی پر ہیں کیونکہ عرض کے لئے خود قیام نہیں اور وہ دوسروں کا تابع ہوتا ہے روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ فرشتوں کی جنس سے ایک جوہر ہے جس کی حقیقت جاننا مشکل ہے جو ریاضت اور مجاہدہ کرے گا اس کی پہچان خود بخود اسے حاصل ہوگی"

امام غزالی کا عالم امر اور عالم خلق کانٹ کے "عالم مظاہرات" PHENOMENA اور "عالم ماوری مظاہرات" NOUMENA سے کس قدر مشابہ ہے. عالم امر اپنے ارادوں میں آزاد ہے عالم خلق محکوم و پابند ہے. روح انسانی کا تعلق دونوں عالموں سے ہے. عالم امر کے جوہر کی حیثیت سے وہ آزاد ہے اور عالم خلق کے عنصر کی حیثیت سے پابند ہے. یہاں انسانی روح کے تعلق جبر و اختیار کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس حد تک روح انسانی روح کلی کی جزو ہے وہ مجبور ہے لیکن چونکہ وہ روح کلی کے اختیار کا محل وقوع بھی ہے اس لئے آزاد ہے اس مسئلہ کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے دراصل روح کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے جس کا بہت کم علم انسان کو عطا کیا گیا ہے. مختصر یہ کہ روح کلی ناقابل تقسیم ہے اور وہ تمام کائنات کا باطنی عنصر ہے اس سے لئے جو کچھ ہے وہ اسی کا مظہر ہے اور اسی کے ارادہ سے ظہور میں آیا ہے. اسی لئے روح کلی میں مکمل اختیار اور ارادہ پایا جاتا ہے بسیط اور ناقابل تقسیم روح کے ارادہ کا اظہار تمام عالم میں ہو رہا ہے.

غرضکہ روح انسان ایک ملکوتی جوہر ہے اور نفس انسان کی یہ اعلیٰ ترین صلاحیت ہے

اس کی تربیت سے انسان نہ صرف عالم محسوسات پر مکمل دسترس حاصل کر لیتا ہے بلکہ عالم ملکوتی میں جا داخل ہوتا ہے۔ اس کے خارجی و باطنی قوٰی میں وہ غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا بیان حد امکان سے باہر ہے۔ جب انسان میں یہ باطنی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا و مافیہا کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ زمین و آسمان کے ملائک اسے دکھائی دیتے ہیں۔ مشرق و مغرب اس کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

رُوِیتُ لِی الاَرضِ مَا دَیتُ مَشَارِقھُمَا وَمَغَارِبُھَا

(پس دکھائی گئی مجھ کو زمین پس دیکھا میں نے مشرق و مغرب کو)

قرآن مجید میں ہے

وَكَذٰلِكَ نُرِیٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(اور اسی طرح دکھایا ہم نے ابراہیم کو عالم ملکوت زمین و آسمان کے)

آنحضرت صلعم سے کسی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ پانی پر چلتے تھے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر ان میں روحانی طاقت اور زیادہ ہوتی تو وہ ہوا پر اڑ سکتے تھے۔ جس طرح عقل کے ذریعہ مادی دنیا کی تسخیر ممکن ہے اسی طرح روح کے ذریعہ کل کائنات کی تسخیر ممکن ہے۔

غرضکہ نفس انسانی کو سمجھنا در اصل حقیقت اصل کو سمجھنا ہے۔

اِنَّ اللہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ

(اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ روح کی شکل میں ایزدی عنصر انسانی زندگی میں کار فرما ہے اور اسی کی نشو و نما انتہائی زندگی کا بلند ترین مقصد ہے۔ یہ ایزدی جوہر لافانی ہے اس لئے روح انسانی کو فنا نہیں ہے۔ وہ برابر ترقی کے منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ جمادات سے اس نے نباتات کی شکل اختیار کی نباتات سے حیوانات کی حیوانات سے انسان کی اور انسان سے وہ ملائکہ میں تبدیل ہو جائے گا اور ملائکہ کے بعد بھی اس کے ارتقا کے منازل کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ دنیا

دراصل ارتقا کی راہ میں ایک منزل ہے جسے عبور کر کے انسانی روح آگے چلی جاتی ہے۔ لیکن ہم جس طرح تعلیمی اصولوں میں بیان کر چکے ہیں اگر وہ اس دنیا سے چشم پوشی کرے گا اور یہاں کی زندگی بھی اسی طرح نہ گذارے گا جس طرح اسے گذارنا چاہیئے تو روح انسانی کے ارتقا میں خامی رہ جائے گی اسی لئے روح انسانی کو دنیا میں اس طرح زندگی گذارنا چاہیئے کہ وہ ارتقا کی آئندہ منزل یعنی آخرت کے لئے تیار رہے۔ یا آئندہ منزل کے ماحول سے خود کو مطابق کر سکے۔ کمزوریوں اور خامیوں کے باعث اس کا آئندہ ارتقا رک نہ جائے اور اس کا ارتقا نباتات اور حیوانات تک ہی ہوکر نہ رہ جائے۔

ہماری ان تحقیقات سے پتہ چلا کہ انسانی تعلیم کا نصب العین کہیں خارج میں وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ باطنی طور پر خود روح انسانی میں موجود ہے۔ وہ امکانی طور پر ہر نفس انسانی میں پایا جاتا ہے اسی کا پتہ چلانا اور اسی کی نشو و نما کرنا نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی انسانی تعلیم کا اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔

فان اللہ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ فاعرف نفسك يا انسان تعرف ربك

(پس پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پس پہچان اپنے نفس کو اے انسان تاکہ پہچانے اپنے رب کو)

غرضکہ انسان کے بنیادی نفسی عناصر جبلتیں، خواہشات جذبات، رجحانات، ارادے، عقل، اور روح (یعنی ولایت اور نبوت کی صلاحیت) ہیں اور انھیں کی بتدریج نشو و نما کے لئے نفس انسانی پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نفس انسانی چونکہ نفس اعلیٰ کا مظہر ہے جو خلاق و فعال، رحمٰن و رحیم، حسین و جمیل وغیرہ ہے اسی لئے یہ صلاحیتیں بھی انسانی نفس میں امکانی طور پر پائی جاتی ہیں انھیں صلاحیتوں کی نفوس انسانی اور مظاہر تمدن میں غیر محدود نشو و نما انسان کی انتہائی سعادت ہے فطری امنگ، جوش نمو اور روحانی ترنگ وہ نفسیاتی بنیادیں ہیں جن پر زندگی کا قصر تعمیر کرنا انسان کا سب سے بڑا تعلیمی فریضہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

روس کی جنگی قوت پر اندرونی حالات کا اثر

(از ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب پی-ایچ-ڈی۔ ریڈر تاریخ یونیورسٹی ڈھاکہ)

سنہ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب ہوا۔ انقلاب کے بعد ایک عرصہ تک روسی حکومت کے ساتھ ایک اچھوت کا سا برتاؤ کیا جاتا رہا۔ دوسری قومیں روس سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ اور اگر کوئی تعلق تھا تو وہ دشمنی اور عداوت کا تھا۔ مگر ادھر کچھ عرصہ سے دوسری قوموں کو روس کی بین الاقوامی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔ اور اس وقت (جون سنہ ۱۹۳۹ء) انگلستان اور فرانس خاص طور پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ روس کو کسی طرح سے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جمہوری ملکوں کا دوست بن کر جرمنی اور اٹلی کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی روک تھام کرے اور ان کی جابرانہ سیاست کا خاتمہ کرے۔

ان حالات میں یہ سوال خاص طور پر دلچسپ ہے کہ اگر جنگ واقع ہوئی تو روس کی اندرونی سیاست اور حال کی تاریخ کا اس کی جنگی قوت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس موضوع پر کچھ عرصہ ہوا رسالہ PACIFIC AFFAIRS میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ملخص ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر جنگ پیش آجائے تو روس کی جنگی طاقت کتنی ہوگی؟ اس سوال کا جواب دیتے وقت یہ ضروری ہے کہ روس کے معاشی نظام کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں پیش نظر رکھی جائیں سب سے بڑی خصوصیت روسی نظام کی یہ ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں کی آپس کی کشمکش کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس قسم کی کشمکش جنگ کے زمانہ میں بڑی دقتیں پیدا کرتی ہے اور ان کی جنگی طاقت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے یہ صحیح ہے کہ روس میں بھی اس کا امکان ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں اور بعض اقسام کے مشترکہ مزروعوں کے ارکان میں بعض مسائل مثلاً کھانے پینے کی چیزوں کی

قیمتیں مقرر کرنے پر اختلاف رائے ہو۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام میں جو مخالفت سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ہوتی ہے اس سے اس اختلاف رائے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح روس میں اشتراکی نظام کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ ملک کے تمام حصوں سے پورا معاشی استفادہ کیا جاسکے۔ روس ایک بہت بڑا ملک ہے مختلف اقوام کی تعداد جو روس میں بستی ہیں نیز رقبہ کے اعتبار سے اس کا مقابلہ یا تو براعظموں سے کیا جاسکتا ہے اور یا پھر سلطنت برطانیہ سے مگر برطانیہ اب تک قومی آزادی کے مسئلہ کو کامل طور پر حل نہیں کرسکا ہے اور نہیں معلوم کہ جنگ ہونے کی صورت میں محکوم اقوام کا کیا رویہ ہو'

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی جہاں پر اکثر قومیں ایک دوسرے میں مدغم ہوچکی ہیں حبشیوں کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ مگر روس نے سامراج کی بجائے اشتراک عمل کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے اور اس طرح کمزور اقوام کے مسئلہ کو حل کیا ہے۔ جو قوت زاری حکومت کے زمانہ میں آپس کی لڑائی میں صرف ہوتی تھی وہ اب روس کی حمایت میں لگائی جاسکے گی۔

اگر روس کے بیرونی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو خاص بات یہ معلوم ہوگی کہ روس کو دنیا میں پہلا اشتراکی ملک ہونے کی وجہ سے نہ صرف روس بلکہ دنیا کے مزدوروں اور محکوم اقوام کی ہمدردی حاصل ہے۔ اور اس ہمدردی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس سے روس کی قوت میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بعض اصول ایسے ہیں جن پر روس کی سیاست خارجہ کا دارومدار رہا ہے اور جس کا بار بار روس میں ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ روس کسی ملک کی آزادی چھیننے کی خواہش نہیں رکھتا' یا یہ کہ روس جنگ کا سخت مخالف ہے۔ ان باتوں کا عام لوگوں پر خواہ وہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں' بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ روس کے باشندہ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ اگر جنگ واقع ہوئی تو وہ اپنی حفاظت کے لئے ہوگی اور اس لئے نہیں کہ دوسروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا مقصود ہے۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روس کے عام لوگوں کے معیار زندگی پر اشتراکی نظام

کا بحیثیت مجموعی اچھا اثر پڑا ہے ۔ خصوصاً گذشتہ پانچ سال میں ان کی حالت بہت بہتر ہوگئی ہے اس سے پہلے بعض وجوہ ایسے اور بھی گذرے جب حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ معاشی نظام میں ایک انقلاب برپا تھا ۔ اور اس سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہو رہی تھیں مگر حکومت کے پیش نظر جو لائحہ عمل تھا اسے پورا کرنے کی پوری کوشش کی گئی ۔ حکومت اس معاملہ میں سمجھوتہ کے لئے تیار نہ تھی ورنہ یہ ممکن تھا کہ روس میں زاری حکومت کا خاتمہ ہونے اور مزدوروں کی حکومت کے قائم ہونے کے بعد بھی مغربی قسم کی معتدل سی جمہوریت قائم ہو جاتی جس میں دولت پیدا کرنے کے اہم ذرائع ریاست کے ماتحت آجاتے مگر اشتراکی جماعت اس پر تیار نہ تھی کہ اپنے پروگرام کو خیرباد کہدے اور روس کی جنگی طاقت کو ویسا ہی کمزور رہنے دے جیسی کہ زار کے زمانہ میں تھی ۔ اشتراکی جماعت کا پختہ ارادہ تھا کہ ملک کے اندر بے دھڑک صنعتوں کو رواج دیا جائے اور زراعت کو بڑے پیمانہ پر جاری کرنے کے لئے مشترکہ مزدوعوں کی بنا ڈالی جائے ۔ چنانچہ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے دوران میں حکومت نے جو رویہ اختیار کیا اس سے قوم کی بہت بڑی تعداد اس کی حامی بن گئی ۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ قربانی کے مطالبہ کی وجہ سے بڑبڑاتے بھی تھے مگر یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ لاکھوں انسانوں میں روس کی بدولت اشتراکی نظام سے خاص وابستگی پیدا ہوئی ۔ جس کسی نے پہلے پنج سالہ منصوبہ کی مخالفت کی اسے سزا بھگتنی پڑی ۔ سازشیں ہوئیں ضرور مگر کامیاب نہ ہوئیں اور ان کی شکست نے حکومت کو اور مستحکم کر دیا ۔

اب صورت یہ ہے کہ لاکھوں آدمی آج ایسی زندگی گذار رہے ہیں جو پہلے ان کے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتی تھی ۱۹۲۸ء سے پہلے تو یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عیش و آرام جیسی چیزیں اکثریت کے نصیب میں آسکتی ہیں اور اب بھی یہ ظاہر ہے کہ اکثریت کی ساری ضرورتیں اور خواہشیں تو پوری نہیں ہو سکتیں ۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آج عوام کی حالت گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں کیسی ہے ۔ یہ ایک نامناسب بات ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے معیار زندگی سے روس کا مقابلہ کیا جائے ۔ اب اگر روسی کسان یا مزدور اپنے آپ کو اس وجہ سے خوش نصیب

سمجھے کہ اس کے گھر میں سینے کی مشین گراموفون ریڈیو اور بائیسکل موجود ہیں تو بالکل بجا ہے۔
اسی طرح کارخانہ میں کام کرنے والی عورت جس کے پاس چند سال پہلے صرف ایک بدنما اوپری پوشاک ہوا کرتی تھی اور جو ننگے پاؤں رہتی تھی اب اگر اچھے سلے ہوئے کپڑے پہنتی ہے اور پاؤں میں پہننے کی اس کے پاس جوتیاں بھی ہیں تو وہ اپنی حالت پر جتنی بھی خوشی منائے کم ہے۔
اب سوال یہ کیا جا سکتا ہے اگر عام لوگوں کی حالت پہلے سے بہتر ہے اور مختلف قوموں اور طبقوں کی کشمکش بھی بڑی حد تک مٹا دی گئی ہے تو پھر ان تمام سازشوں، مقدموں اور سزاؤں کے کیا معنی ہیں جو بڑی تعداد میں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ روس کی حکومت کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ چونکہ روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور اس کے چاروں طرف ایسی ریاستیں واقع ہیں جو سرمایہ داری کی زبردست حامی ہیں اس لئے ایسے لوگوں کو جو موجودہ نظام سے خوش نہیں ان ریاستوں سے سازباز کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ دوسری ریاستوں کی مدد سے روس میں اشتراکیت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ آپس کی مخالفتیں انتہا کو پہنچ چکی ہوں اور اس کی ذرا وضاحت ہونی ضروری ہے۔
قصہ یہ ہے کہ جب روس اس مشکل دور سے گذر رہا تھا جبکہ ایک طرف تو صنعتوں کو رواج دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف زراعت پر مشترکہ قبضہ کی بنا ڈالی جا رہی تھی اس وقت ملک میں ایسے سیاسی لیڈر بھی تھے جن کا خیال تھا کہ یہ تجربے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اپنی پرانی عادت کے بموجب انھوں نے اس جماعت کی نکتہ چینی شروع کی جو اب برسر حکومت تھی۔ نکتہ چینی اور اعتراض کرنا گویا ان کے خمیر میں داخل تھا۔ انھوں نے بات کا بتنگڑ بنانا شروع کیا۔ اس وقت ایسے انقلابیوں کے لئے جو اس گتھی کو تشدد کی پالیسی سے سلجھانا چاہتے تھے کچھ نہ کچھ پیرو بھی مل جاتے تھے۔ خاص کر مالدار کسانوں اور ان علاقوں میں جہاں پر خالص روسیوں کے علاوہ دوسری اقوام آباد ہیں۔ باغیوں کے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ اپنے گروہ بنائیں اور دوسرے اسی قسم کے گروہوں کے ساتھ مل کر سازشیں کریں۔ یہاں تک کہ جب موقع آئے تو فوج کو بغاوت

پر آمادہ کر کے حکومت کو الٹ دیں مگر چونکہ ایسے گروہوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ملک کی اکثریت کو اپنے ساتھ کر لیں، اس لئے وہ اس فکر میں بھی رہتے کہ باہر سے مدد حاصل کی جائے، بیرونی امداد ہر وقت ان کے لئے موجود تھی چنانچہ جب ۱۹۳۲-۳۴ء کی فوجی سازشیں کی گئیں تو یہ ضروری تھا کہ غیر اقوام سے بھی مدد لی جائے۔ یہ خیال صحیح نہیں جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ کسی طرح کی سازش تھی ہی نہیں۔ یہ دعویٰ تو اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ بھی مان لیا جائے کہ روسی حکومت کے لئے یہ ممکن ہے کہ محض شخصی مخاصمتوں کی بنا پر اپنی بین الاقوامی وقار کو اتنا زبردست صدمہ پہنچا لے اور ایسے خطرہ کے وقت اپنی فوجی طاقت کو کمزور کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر اتنی بڑی تعداد میں روس کے سیاسی لیڈروں اور فوجی افسروں کا اقبال جرم کرنا بھی اپنی جگہ پر اس نظریہ کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مقدموں کے دوران میں حکومت نے پروپیگنڈے کی خاطر سازشوں کا یہ پہلو خاص طور پر نمایاں کر کے دکھایا مگر اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، واقعہ یہ ہے کہ اندرونی سازشوں کا بیرونی ممالک سے ایک منطقی تعلق ہے۔ اور جب صورت یہ ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ روسی حکومت نے سازشوں کو ختم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اس سے بجائے کمزوری کے روس کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ اگر متعدد سیاسی لیڈر اور اعلیٰ فوجی افسر مارے گئے تو بلاشبہ جنگ کی صورت میں یہ لوگ بہت نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ان کی قابلیت سے روس کو اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا ان کی سازشوں سے نقصان ہوتا۔

روس کی متوقع جنگی قوت کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے اور روس کی گذشتہ چند سالوں کی ترقی کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے جس کا بس ایک مقصد تھا یعنی روس کی قوت میں اضافہ کرنا۔ اس نکتہ پر زور اس لئے دیا جا رہا ہے کہ اکثر لوگ اس مرکزی حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں۔ روس میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو محض ایک خیال پرستی کی بنا پر موجودہ حکومت سے خفا ہیں وہ اپنے سیاسی اور معاشی نظریوں پر الیسا

کامل ایمان رکھتے ہیں کہ جہاں ذرا سا کسی کو مقرر کی ہوئی راہ سے بھٹکتا ہوا پایا اور اسے غدار سمجھا۔ بس یہ ہے راز ان سراسر ناقابل عمل کوششوں کا جو آئے دن حکومت کو تباہ کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔

لیکن اگر اوپر کے لوگوں میں اس قسم کی مخالفتیں ہیں تو ہوا کریں۔ اس لئے کہ اس کی کاٹ کے لئے حکومت کے ساتھ عوام الناس کی ہمدردی موجود ہے اور یہ چیز ہے جو جنگ کے وقت روس کے بڑے کام آئے گی۔ عوام الناس، خاص طور پر کسان طبقہ اب گرمجوشی کے ساتھ موجودہ نظام کا حامی ہے۔ حکومت پر اس کا اثر ہے۔ حکمت عملی وہی مقرر کرتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو اب تک روس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے ان سازشوں کی ناکامی کا جن کا حال اکثر سننے میں آتا ہے۔

قومی منصوبہ اور مکمل آزادی

(از پنڈت جواہر لال نہرو صدر قومی صنعتی تنظیمی کمیٹی)

ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ ہم ہندوستان کے لئے قومی منصوبہ مرتب کریں یا بہرحال اس قسم کے منصوبہ کی عام نوعیت ظاہر کردیں بعد میں وقتاً فوقتاً اس کی تفصیلات کو پر کیا جا سکتا ہے اس سے قبل کہ ہم قومی ترقی کا وہ منصوبہ مرتب کریں جو پبلک کی مادی اور تمدنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر لے گا ہمیں چاہیئے کہ ہم ان مقصدوں اور بنیادی مسئلوں کی طرف سے اپنے دماغوں کو صاف کرلیں جن کے ماتحت اس قسم کا منصوبہ مرتب ہوگا۔ یہ امر واضح ہے کہ ایک جامع قومی منصوبہ کی ترتیب اس وقت تک ذہنی کھیل ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ اس کے ذمہ دار اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ اگر اس منصوبہ کے بنانے والوں کو کوئی اختیار نہیں ہے یا ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے اور وہ محدود ہیں تو وہ منصوبہ نہیں بنا سکتے۔ اس کی یہ معنی ہوئے کہ جو قومی ذمہ دار لوگ منصوبہ بنائیں انہیں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا بھی پورا پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ اس لئے منصوبہ بنانے کے قبل اس بات کی ضرورت ہے کہ مکمل آزادی ہو۔ ملک آزاد ہو اور بیرونی نگرانی دور ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کو اپنے اقتدار بالادست کے ماتحت اس بات کا پورا اختیار حاصل ہو کہ وہ جو تدبیر اور پالیسی چاہے اختیار کرے۔ ملک اور عوام کے مفاد میں افسران با اختیار دوسرے ملکوں سے جو تعلقات بھی قائم کرنا چاہیں اس کی انہیں آزادی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی آزاد اور مساوی قوموں کے اتحاد کی صورت میں اس اقتدار بالادست کو اپنی ذاتی تنظیم اور تعاون کے مفاد میں کچھ حد تک رضاکارانہ طور پر محدود کرنا پڑے۔ لیکن اس قسم کے حالات قومی منصوبہ بنانے کے راستے میں حائل نہیں ہوں گے اگر صحیح اصول پر یہ وقوع پذیر ہوئے تو اس سے قوم کی اندرونی تنظیم تک میں مدد ملے گی۔ فی الحال ہمیں اس

مسئلہ کو زیر غور نہیں لانا چاہیئے کیونکہ اس کا امکان ابھی بہت دور ہے۔

پس مختلف پہلوؤں کو چلانے کے لئے جو ضروری اقدامات کرنے پڑیں گے ان کے لئے ابتدائی طور پر آزادی لازمی چیز ہے۔ کسی دوسری بنیاد پر منصوبہ مرتب کرنا ممکن ہی نہیں ہے موجودہ حالات میں ہندوستان کو نہ صرف قومی آزادی حاصل نہیں ہے بلکہ ہم پوری طرح بندھے اور جکڑے ہوئے ہیں۔ بے شمار پابندیاں، حدیں، تحفظات درمیان میں حایل ہیں اور ہماری تنظیم اور ترقی کے راستے کو روکے ہوئے ہیں۔

ہمیں آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے قومی ترقی کا منصوبہ مرتب کرنا چاہیئے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمیں منصوبہ والی معاشی زندگی کی ترقی کے لئے کچھ کرنے سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ہمیں موجودہ حالات میں بھی ملکی ذرائع کو ترقی دینے اور عوام کے معیار کو بلند کرنے والی تمام تدبیریں اور پالیسیاں اختیار کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور یہ تمام کوششیں اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ہونی چاہیئں جو ہم نے آزاد ہندوستان کی لئے مرتب کیا ہے۔

چنانچہ ہمیں ایک مکمل منصوبہ مرتب کرنا ہے جس کا پورا اطلاق تو آزاد ہندوستان پر ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں قومی تحریک کے مختلف شعبوں میں اس پر عمل درآمد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرایا جائے اور یہاں جمہوری ریاست قائم کی جائے۔ اس قسم کی مکمل جمہوری ریاست میں ہر فرد کو خودی کی تکمیل اور اظہار کا حق دیا جائے گا یہ ہمارے منصوبہ کا پس منظر یا بنیاد ہوگی۔

قومی معاشی تنظیم

(از جناب محمد عاقل صاحب ایم اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

(قومی معاشی تنظیم کا مسئلہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی اب اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کانگریس کی طرف سے ایک قومی صنعتی تنظیم کمیٹی کا تقرر کیا جا چکا ہے جس نے ابتدائی مشاورت سے اپنے حدود عمل کو کم و بیش متعین کر لیا ہے اور اب زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے کام کو شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس موقع پر ضروری ہے کہ قومی معاشی تنظیم کی ضرورت، اس کی گذشتہ تاریخ، مختلف ملکوں میں اس کے تجربوں، آئندہ کے لئے ترقی کے امکانات اور معاشی تنظیم کے عام اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جامعہ کی آئندہ کسی اشاعت کو پورے طور پر اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے وقف کر دیں۔ جامعہ کے اس نمبر میں ہم اس بحث کی صرف ابتدا کر رہے ہیں اور ملک کے اہل فکر حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے گراں مایہ خیالات سے قارئین جامعہ کو مستفید فرمائیں۔

اس رسالہ میں کسی اور جگہ آپ کو محمد احمد صاحب سبزواری کا اسی موضوع پر ایک مضمون ملے گا جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر انور مراد صاحب قریشی ایم اے۔ ایم ایس سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی کتاب "دی اسٹیٹ اینڈ اکانمک لائف" کی مدد سے تصنیف کیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب معاشیات میں مخالف تنظیم مسلک کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد تھے اور اب انجمن اقوام میں کسی خدمت پر مامور کر دئے گئے ہیں۔ محمد احمد صاحب سبزواری اسی سال عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے معاشیات کے امتحان میں فرسٹ ڈویزن میں اول آئے ہیں۔ سبزواری

صاحب کے اس مضمون سے قارئین کو معاشی تنظیم کے مخالفوں کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کا
موقع مل سکے گا۔
قومی معاشی تنظیم کا مسئلہ چونکہ اب ملک کی عملی سیاسیات میں داخل ہو گیا ہے
اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور
وفکر کیا جائے تاکہ جلد بازی میں ہم کوئی ایسی پالیسی اختیار نہ کریں جس سے ملک کو فائدہ
کی جگہ الٹا نقصان اٹھانا پڑے۔ مدیر)

معاشیات کے ابتدائی ماہر معاشی آزادی کے بہت بڑے حامی تھے۔ معاشی معاملات
میں حکومت کی مداخلت کو وہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ہر شخص
کو اپنے ذاتی نفع حاصل کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے از خود کل جماعت کو نفع
پہنچتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے معاشی زندگی کی مختلف تصویریں پیش کر کے کہتے تھے کہ دیکھیے
کس طرح خود بخود تمام کاروبار ٹھیک ٹھیک چل رہے ہیں۔ کوئی منصوبہ بنانے والا، کوئی نگرانی کرنے
والا، کوئی زور اور دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے لیکن پھر بھی جتنی مقدار میں جن چیزوں کی ضرورت
ہے وہ مہیا کی جا رہی ہیں۔ کھانے کی چیزوں کی جہاں جتنی مانگ ہے کھانے کی چیزیں وہاں
موجود ملتی ہیں۔ جہاں کپڑا چاہیئے وہاں کپڑا مل جاتا ہے۔ رہنے کے لئے مکان موجود ہیں۔
سفر کے لئے سواریاں چل رہی ہیں عیش و آرام کی سب چیزیں نہایت پابندی اور سلیقہ سے
ضرورت اور ذوق کا لحاظ کر کے فراہم کی جاتی ہیں۔ ہر طرح کے کام کرنے والے لوگ موجود ہیں
ان میں تقسیم عمل پائی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے کام کے پورا کرنے میں مستعدی اور جفاکشی
کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جتنی چیزوں کی ضرورت ہے اتنی ہی پیدا کی جاتی ہیں نہ اس سے زیادہ
نہ اس سے کم۔ وقتی طور پر عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے لیکن خود ہی اس میں اصلاح بھی ہو جاتی
ہے۔ کسی خارجی مداخلت کی ضرورت پیش نہیں آتی اور کام عموماً ٹھیک ٹھیک ہوتا رہتا ہے
اس لئے حکومت یا جماعت کو نہ تو پیشے کے انتخاب پر کوئی پابندی لگانی چاہیئے نہ مال کی

امداد نہ منت پر نہ اجرت ۔ لگان اور سود مقرر کرنا چاہیئے نہ قیمت نہ اشیا کی رسد کو اپنی نگرانی میں لینا چاہیئے نہ خدمتوں کی تقسیم کو۔ حکومت یا جماعت کا کام صرف ملکیت ذاتی کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے ۔ اس کے بعد ہر شخص کو پورے طور پر آزاد رکھنے سے ہی سب کی بھلائی حاصل ہو سکتی ہے ۔ غرضکہ یہ زمانہ انفرادیت اور آزادی کی تعریف، توصیف اور ترقی کا زمانہ تھا۔

اس سے پہلے حکومت یا جماعت کی طرف سے معاشی زندگی کی اصلاح کے لئے جو مداخلتیں کی جایا کرتی تھیں ان کی ناکامی اور خرابی کی ایک لانبی فہرست ان لوگوں کے پاس موجود تھی اور یہ تفصیل کے ساتھ تبلایا کرتے تھے کہ حکومت یا جماعت نے جب کبھی مداخلت کی اس سے اگر ایک خرابی دور ہوئی تو اس کی جگہ سینکڑوں نئی خرابیاں پیدا ہو گئیں مختلف پیشوں کے انتخاب اور اختیار کرنے پر جب پابندیاں لگائی گئیں تو اہل لوگوں کو پہنچنے اور ترقی پانے کا موقع نہیں رہا اور ہر پیشہ میں نا اہل اور قدامت پسند لوگوں کی کثرت ہو گئی جو اپنے ذاتی میلان اور اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض ایک خاص پیشہ کے گھر میں اتفاقی طور پر پیدا ہو جانے کی وجہ سے مخصوص پیشوں کے ساتھ عمر بھر کے لئے منسلک رہنے لگے ۔ ایسے ہی ناپسندیدہ نتائج چیزوں کی نوعیت کے معیار مقرر کرنے، سود لگان اجرت اور قیمتوں کے مقرر کرنے، افلاس زدہ لوگوں کی امداد کے لئے قوانین وغیرہ بنانے مال کی درآمد و برآمد پر پابندی لگانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ۔ غرض کہ حکومت اور جماعت کی مداخلت کی ناکامی کی اتنی کثیر مثالیں ان کے سامنے تھیں کہ کیسی حالت میں حکومت یا جماعت کی مداخلت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ ان کے نزدیک قدرتی قوانین موجود تھے جن سے انحراف یا روگردانی کرنا ممکن نہیں تھا اور جب کبھی اپنے محدود علم اور فہم کے زعم میں ان قوانین کی مخالفت کرتے ہوئے موجودہ حالات کو اجتماعی کوششوں سے بہتر بنانے کی سعی کی گئی معاملات اور زیادہ پیچیدہ اور خراب ہو گئے ۔

لیکن معاشیات کے ابتدائی ماہروں کا یہ دعویٰ کہ نظام آزاد، مقابلہ اور مسابقت کی بنیاد

پر قائم تھا۔ مقابلہ سے اس نظام میں اہلیت، مستعدی، کفایت اور جماعتی بہبود پیدا ہوتی تھی۔ ہر شخص کو دوسروں کے مقابلہ کے ڈر کی وجہ سے چاق و چوبند، مستعد و کارگزار رہنا پڑتا تھا کیونکہ ذرا اس کی طرف سے کوئی کسر ہوئی اور فوراً اس کی جگہ پر دوسرا زیادہ اہل اور کارگزار شخص قبضہ کر لیتا تھا۔ ہر مزدور کو کمترین اجرت پر انتہائی محنت، ایمانداری اور عقل مندی سے کام کرنا پڑتا تھا۔ کاریگر کو مہارت اور صفائی کے ساتھ چیزوں کو بنانا ہوتا تھا۔ دوکاندار کو کمترین قیمت پر اچھی چیز کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے وہ مقابلہ سے خارج ہو جاتے تھے اور جب تک وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے تھے ان کی چیز خریدنے کے لئے کوئی گاہک تیار نہیں ہوتا تھا اور انھیں ناکامی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ زندگی کے لئے ایک جد وجہد اور کشمکش جاری تھی اور وہی اس میں کامیاب ہوتے تھے جو سب سے زیادہ اہل ہوتے تھے۔ ہر چند ہر شخص اپنے ذاتی نفع کے لئے کام کرتا تھا اور جماعت کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بناتا تھا لیکن پھر بھی نتیجہ کے طور پر اس سے جماعت کی خدمت ہوتی تھی اور عام مرفہ الحالی میں اضافہ ہوتا تھا اور جو شخص جتنا زیادہ جماعتی دولت کے اضافہ کا موجب ہوتا تھا اتنا ہی اجرت، سود، لگان یا منافع کی شکل میں جماعت کے انعام کا مستحق قرار پاتا تھا۔ دولت کی پیدائش میں محنت کے علاوہ سرمایہ، زمین اور منتظم کو بھی شریک سمجھا جاتا تھا۔ سرمایہ کے اجتماع کو پس اندازی اور کفایت شعاری کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا اس لئے سرمایہ دار کو دولت کے صرف سے مجتنب رہنے کا انعام سود کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ لگان امتیازی فوقیت کی بنا پر ملتا تھا اور منافع میں تنظیم، خطر پسندی اور ہدایت وغیرہ کے معاوضے شامل ہوتے تھے جب کسی چیز یا خدمت کی ضرورت زیادہ اور اس کی رسد کم ہوتی اس کی قیمت از خود بڑھ جاتی تاکہ بڑھی ہوئی قیمت کے لالچ میں ضرورت کے مطابق چیزوں کے پیدا کرنے کی طرف لوگ مائل ہوں اور جب رسد زیادہ ہوتی تو قیمت از خود گر جاتی۔ تاکہ ضرورت کے مطابق رسد کو محدود کیا جا سکے مثلاً جہاں پس اندازی، اجتناب اور کفایت شعاری کی عادت یا موقع کم ہوتا تھا وہاں ان کو ترقی دینے کے لئے شرح سود کو زیادہ رکھنا

پڑتا تھا اور جہاں اس کی عادت یا موقع زیادہ ہوتا تھا وہاں از خود یہ شرح سود کم ہو جاتی۔ غرضیکہ
اس نظام میں جس قدر ممکن تھا جماعت کی ضرورتوں کو انتہائی خوبی خوش اسلوبی اور تشفی بخش طریقہ
پر پورا کیا جاتا تھا اور اس کے چلانے کے لئے نہ کسی نگرانی اور انتظام کی بالکل ضرورت نہیں تھی
یہ خود بخود چلتا رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں کچھ مصیبت زدہ لوگ بھی پائے جاتے تھے
لیکن ان کی مصیبتیں یا تو خود اپنی پیدا کی ہوئی ہوتی تھیں یا لاعلاج ہوتی تھیں اور ان دونوں صورتوں
میں خارجی مداخلت غیر مناسب تھی کیونکہ اس قسم کی مداخلت سے دولت کی مجموعی مقدار اور
اس نظام کی اہلیت اور کارگزاری پر خراب اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مثلاً اجرتیں جب ان کو قدرتی
طور پر نہ بڑھنا چاہیے تھا بڑھا دی جاتی تھیں، سود یا قیمتیں جب ان کو قدرتی طور پر نہ گھٹنا چاہیے
تھا خارجی مداخلت سے کم کردی جاتی تھیں، جب ہمدردی کے جذبہ اور انسداد افلاس کے
قوانین کی وجہ سے ان لوگوں کو جنہیں مفلس رہنا چاہیے تھا افلاس کی سختیوں سے نجات مل
جاتی تھی تو اس نظام کا توازن بگڑ جاتا تھا اور توازن کی یہ خرابی بعد میں زیادہ پیچیدہ اور تکلیف
دہ صورتوں میں کہیں نہ کہیں ظاہر ہو کر رہتی تھی۔ غرضیکہ آزاد مقابلہ کی سختیوں اور انصاف پسندیوں
سے اس نظام کی تندرستی اور اہلیت کارگزاری قائم تھی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں معاشیات کے ماہروں کے لیے اس قسم کے خیالات
وعقاید رکھنے کے لئے ایک حد تک خاصے معقول وجوہ موجود تھے۔ ان کے زمانہ کا سرمایہ دار
واقعتہً دولت کے صرف سے اجتناب کر کے سرمایہ جمع کرتا تھا۔ نہایت معمولی حیثیت سے
وہ اپنی زندگی شروع کرتا تھا اور آہستہ آہستہ اپنی ذاتی سعی، عاقبت اندیشی، دولت اندوزی
کی غیر معمولی قابلیت، بدایت اور خطر پسندی سے کام لے کر نفع کماتا تھا اور اس نفع کو خرچ کرنے
کی جگہ دوبارہ سرمایہ کی شکل میں لگا کر اپنے کاروبار کو وسیع کرتا رہتا تھا۔ پھر اسی زمانہ میں سرمایہ
داروں کے درمیان مسابقت بھی خوب پائی جاتی تھی۔ ان کے بہت سے حریف موجود ہوتے
تھے اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا ہر ایک مالک پیداوار کے صرف ایک حصہ کو تیار کرتا تھا۔

اور اپنے مال کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو اپنے گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ ہر صناع و تاجر اپنے حریف کے ساتھ مقابلہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنی اہلیت کو بڑھانے اور اپنی لاگت کو کم کرنے کے لئے مجبور رہتا تھا ورنہ اسے اپنے گاہکوں کے چھن جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ اہلیت پیدائش میں جس قدر اضافہ یعنی لاگت میں جس قدر کمی کی جاتی تھی اسی نسبت سے کم قیمت پر گاہکوں کے ہاتھ مال فروخت کیا جا سکتا تھا اور مقابلہ میں کامیابی کے امکانات کو بڑھایا جا سکتا تھا۔ سرمایہ دار کی شرح منافع میں اس کی ذاتی اہلیت اور کارگزاری کو بڑا دخل ہوتا تھا۔ رسد کو محدود کر کے زیادہ قیمت پر مال کو گاہک کے ہاتھ فروخت کرنے کا موقع اسے اکثر حالتوں میں حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ صناعوں کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے خریداروں کو چیزیں عموماً کم ترین قیمت پر مل سکتی تھیں اور جماعت اہلیت پیدائش کے اضافہ سے ایک بڑی حد تک فائدہ اٹھا سکتی تھی یہ حالات تھے جن کی موجودگی میں دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں، افراد اور جماعت دونوں کے فائدہ کو سامنے رکھ کر معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے عدم مداخلت کے اصول وضع کئے تھے اور معاشی آزادی کو بہترین پالیسی سمجھا تھا۔

لیکن جب دولت کی پیدائش بڑے پیمانہ پر شروع ہو گئی اور اکثر صورتوں میں کسی نئے شخص کے لئے چھوٹے پیمانہ پر پیدائش دولت کے کام کو شروع کرنا نفع بخش نہیں رہا تو پھر مقابلہ اور مسابقت کی آزادی ختم ہو گئی اور معاشی آزادی کے وہ تمام فائدے جن کی معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے اضافہ مقدار دولت کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس قدر تعریفیں کی تھیں غائب ہو گئے۔ اب سرمایہ داروں کے لئے اپنے مال کی رسد کو محدود کرنا، اپنے منافع کی شرح کو بڑھائے رکھنا، دولت کی مجموعی مقدار میں اضافہ کی کوشش نہ کرنا۔ سب کچھ ممکن ہو گیا۔ اب دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں یعنی سرمایہ داروں اور جماعت کے مفاد کا تصادم واضح طور پر نمایاں ہونے لگا۔

اس کے علاوہ مزدوروں کی بے بسی بھی اب خوب ظاہر ہو گئی۔ سرمایہ دار کو مزدور پر آمرانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی حیثیت مساوی نہیں رہی بلکہ مزدور محکوم بن گئے۔ قوت محرکہ سے چلنے والی بیش قیمت مشینوں نے ان دستی اوزاروں کو بے کار کر دیا۔ اب وہ آزادی کے ساتھ اپنے طور پر مال پیدا کر کے گاہکوں کے ہاتھ فروخت نہ کر سکتے تھے۔ نہ اوزاروں کے پاس رہے نہ کچا مال نہ کام کرنے کی جگہ۔ مصنوعہ مال کے صرف ایک حقیر حصے کے بنانے میں وہ شریک ہوتے تھے اور بنے ہوئے مال کو وہ اپنا بنایا ہوا نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ صرف اپنی محنت کو بازار میں فروخت کر سکتے تھے اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ بھوک اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے فوری طور پر مجبور رہتے تھے اس لئے اپنی محنت کا پورا معاوضہ وصول نہیں کر سکتے تھے۔ جن اجرتوں اور شرائط کے ساتھ بھی سرمایہ دار ان کی محنت سے فائدہ اٹھانے کے لئے آمادگی کا اظہار کرتا تھا انہیں مجبوراً ناراستی کے ساتھ ان ہی کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داروں نے اپنے اس اقتدار اور مزدوروں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ مقابلہ میں مساوات باقی نہیں رہی جو معاشی آزادی کی کامیابی کے لئے لازمی شرط ہے۔ مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر حکومت پر زور ڈالا جانے لگا کہ حکومت کو جو کمزوروں کے حقوق کی حامی ہے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مداخلت کرنا چاہیئے یعنی حکومت کو چاہیئے کہ مزدوروں سے کام کے اوقات مقرر کرے بچوں اور حاملہ عورتوں سے کام لینے کے لئے قوانین بنائے اتفاقی حادثوں کی صورت میں مزدوروں اور ان کے ورثا کو ان کے نقصان کا معاوضہ دلائے بڑھاپے کی پنشن کا بندوبست کرے کمتریں اجرتوں کا تعین کرے اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے اور دوسرے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے۔

اس کے علاوہ زراعتی ملکوں میں جہاں جدید صنعتوں نے ترقی نہیں پائی تھی اور جو معاشی آزادی کی صورت میں ترقی یافتہ صنعتی ملکوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے

تھے اور ایسے صنعتی ملکوں میں بھی جہاں کی صنعتوں کو دوسرے ملکوں کے مقابلہ سے خطرہ تھا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ ملکی صنعتوں کے تحفظ کے لئے قانون بنا کر مداخلت کرے۔

پھر ایک اور سمت میں بھی خصوصاً جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد حکومت کی مداخلت کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ ایک زمانہ تک سونا چاندی زر کے فرائض کو خاصی خوبی کے ساتھ پورا کرتے رہے اور ان کی قدر کا ثبات بھی خاصا اطمینان بخش رہا۔ چونکہ سونے چاندی کے سکوں کی قدر کا تعین ان کی قدر ذاتی کی وجہ سے از خود ہوتا تھا اور کاغذی زر اور اعتباری زر نقد پذیر تھا اس لئے زر کی ملکی اور بین الاقوامی قدر کے تعین اور زر کے انتظام کے سلسلہ میں حکومت کو بہت کم مداخلت کرنا پڑتی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد سونا چاندی کے ذخیرے اکھٹے کرنے اور اعتباری زر کے غیر نقد پذیر ہو جانے کی وجہ سے مبادلات خارجہ کے تعین کے سلسلہ میں اور قیمتوں کی اندرونی سطح کی نگرانی کے لئے حکومتوں سے مداخلت کے۔ مطالبے کئے جانے لگے۔ پھر حالیہ کساد بازاری کے زمانہ میں حکومت سے اور بھی زیادہ مداخلت کے لئے مطالبہ کیا گیا کہ وہ زر کی مناسب پالیسی اختیار کر کے ملک کی مرفہ الحالی کو دوبارہ زندہ کرے۔

غرضکہ اس طرح معاشی آزادی کے ان اصولوں میں جن کی معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے بے انتہا تعریف کی تھی خامیاں اور خرابیاں نظر آنے لگیں اور معاشیات کے ماہروں میں ایسے لوگ پیدا ہونا شروع ہو گئے جو مداخلت کے اصولوں کے حامی تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا حکومت کی مداخلت کو چار اہم سمتوں میں ضروری خیال کیا جانے لگا۔

(۱) مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۲) ملکی صنعتوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۳) دولت کے صرف کرنے والوں یعنی کل جماعت کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۴) ملک کے زر اور اعتبار کے نظام کی مناسب نگرانی کے لئے۔

معاشیات کے ابتدائی ماہر مقابلہ اور مسابقت کی فائدہ مندیوں کے بہت زیادہ قائل

تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ آزاد مقابلہ کی موجودگی میں مندرجہ بالا تینوں مفادوں کا تحفظ از خود ممکن ہے۔ رہ گیا زر اور اعتبار کا مسئلہ سو اسے بھی معیار طلا کو اختیار کرکے خوبی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے اور ان سب معاملات میں حکومت کی خارجی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کی وجہ سے مقابلہ کرنے والوں کی وہ مساوات مٹ چکی ہے جو مقابلہ کو فائدہ مندی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ طاقتور شخص بہت زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں اور کمزور بہت زیادہ کمزور اور دونوں میں مقابلہ ممکن نہیں رہا ہے۔ سرمایہ دار جو بھی اجرت دینا چاہتا ہے مزدور اس کے قبول کرنے کے لئے مجبور ہوگیا ہے۔ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے مقابلہ میں پس ماندہ ملکوں کی پرانی صنعتیں تباہ ہوجاتی ہیں اور نئی صنعتیں ترقی نہیں پا سکتیں۔ خریدار کے لئے بھی فروشندوں کے باہمی مقابلہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ہوگیا ہے۔ مال پیدا کرنے والا جیسا اور جتنا مال جس قیمت پر اور جن شرائط کے ساتھ بیچنا چاہتا ہے اسی قیمت اور شرطوں کے ساتھ خریدار کو اسے خریدنا پڑتا ہے معیار طلا کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس سے کام لینا روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے اور اس کی پرانی کارگزاریاں اب صرف ایک افسانہ ماضی بن کر رہ گئی ہیں۔

رائے عامہ کے ان تمام مطالبوں کا اثر حکومت کی پالیسی پر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے قوانین بنائے جانے لگے اور مزدوروں کی تنظیم جتنی زیادہ اچھی ہوتی رہی اتنی ہی ان کے مطالبوں کی طرف توجہ بھی زیادہ کی جانے لگی۔ لیکن یہ قوانین کسی ہمہ گیر مسلسل اور ترقی پذیر مقصد کے پیش نظر نہیں بنائے گئے بلکہ وقتی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پورا کرنے اور ناقابل برداشت خرابیوں کو رفع کرنے کے لئے بنائے جاتے رہے۔ نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی کرنا، خرابیوں کے امکانات کا سدباب کرنا، برائی کو جڑ سے اکھاڑنا ــــ یہ مقصد نظر کے سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ پیوند اور جوڑ لگا کر موجودہ نظام کو زندہ رکھنا اور چلاتے رہنا یہ حکومت کی پالیسی کا مقصد ہوگیا۔

اسی طرح غیر ترقی یافتہ زراعتی ملکوں میں جہاں نئی صنعتوں کو ترقی دینے یا پرانی صنعتوں کے تحفظ کرنے کی کوششیں کی گئیں وہاں بھی قومی صنعتوں کی ترقی کا کوئی ہمہ گیر منصوبہ نہیں بنایا گیا بلکہ مختلف صنعتوں کو انفرادی طور پر محاصل درآمد لگا کر یا امداد انعام دے کر تحفظ کیا جاتا رہا۔ اس کے باز اثر کے طور پر حریف ملکوں نے بھی اپنی صنعتوں کو تحفظ اور انھیں ترقی دینے کے لئے معاشی آزادی میں مداخلتیں کرنا شروع کیں اور تقریباً ہر ملک محاصل درآمد کی دیواروں کے درمیان محصور ہو گیا۔

پھر خریداروں کو ان طاقتور لوگوں کی غلامی سے بچانے کے لئے جو بڑے پیمانہ پر دولت پیدا کرنے کی وجہ سے (جن میں کسی دوسرے شخص کے لئے ان کا حریف بننا سہل نہیں تھا) اجارہ دار بن گئے تھے قوانین بنائے گئے۔ لیکن یہاں بھی اسی پیوند لگانے والی اور نمایاں خرابیوں کو دور کرنے والی پالیسی کو اختیار کیا گیا اور کسی واضح اور ہمہ گیر مقصد کے ماتحت معاشی زندگی کی تنظیم نہیں کی گئی۔

زر اور اعتبار کے انتظام کے سلسلہ میں حکومتوں کو جنگ عظیم کے بعد سے خاص طور پر پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ روایتی رجحان معیار طلا کی طرف دوبارہ لوٹ جانے کی طرف تھا۔ لیکن جدید حالات کی روشنی میں اس پر عمل درآمد مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس شش و پنج کی حالت میں حکومتوں کو بہت سی قلا بازیاں کھانا پڑیں۔ کبھی معیار طلا اختیار کیا کبھی چھوڑا۔ تلاش ایک ایسے نظام کی تھی جو از خود چلتا رہے لیکن زر اور اعتبار کا ایسا نظام اب عنقا ہو گیا تھا۔ حکومتوں کو مداخلتیں کرنا پڑیں لیکن یہاں بھی خیالات کی الجھنوں اور مقاصد کے عدم تعین کی وجہ سے وہ اپنی مشکلات میں اضافہ کرتی رہیں۔

اوپر جو حالات درج کئے گئے ہیں وہ برابر معاشی مفکروں کے زیر مطالعہ رہے۔ انھوں نے دیکھا کہ معاشی زندگی میں حکومتوں کی مداخلت کا سلسلہ خاصا ترقی کر چکا ہے۔ ان مداخلتوں کا اثر معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی مرکزی مقصد کوئی

منصوبہ کوئی بڑا تعمیری نصب العین موجود نہیں ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر مداخلت ناگزیر ہی ہوگئی ہے تو پھر اصول اور طریقہ کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔ موجودہ بے ڈھنگی مداخلت تو بالکل بے نتیجہ ہے۔ دوسری طرف آمران مطلق مثلاً مسولینی اور ہٹلر کے برسر اقتدار آجانے کی وجہ سے قومی زندگی ایک واحد مرکزی وجود میں مجتمع ہوگئی اور قومی زندگی کے تمام شعبے اسی سرچشمہ ہدایت سے رہنمائی کے طالب اور جویا ہوگئے۔ پھر تیسری طرف روس کی معاشی تنظیم اور اس کے پنج سالہ پروگراموں کی کامیابی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال کر اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کردیا۔ غرضکہ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتوں نے مشورہ دینے والی معاشی کونسلیں اور "ذہنوں کے اتحاد" (BRAIN TRUST) وغیرہ بنانا شروع کردیے اور حکومتوں کی طرف سے معاشی آزادی میں خوب مداخلتیں کی جانے لگیں۔ اجرتیں، قیمتیں، مال کی پیداوار، اشیاء کی نوعیت ــــ سب کا فیصلہ حکومت کی طرف سے کیا جانے لگا اور اس کام کو قومی معاشی تنظیم کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

لیکن اس کام نے مختلف ملکوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ انگلستان میں یہ مداخلت سب سے کم رہی۔ امریکہ میں اس سے زیادہ، جرمنی اور اٹلی میں سب سے زیادہ [illegible] میں پرانے نظام کا تختہ الٹ کر بالکل نئے سرے سے معاشی تنظیم کو ترقی دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان ملکوں میں جو تجربے ہو رہے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ علیحدہ مضمونوں کی شکل میں اسی رسالہ میں آئندہ درج کیا جائے گا لیکن یہاں ان نتائج کو بیان کرنے کا ارادہ ہے جو ان تجربوں کو دیکھنے سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ (باقی)

معاشی نظم

از جناب محمد احمد صاحب سبزواری، ایم اے (عثمانیہ)

معاشی نظم یا اکنامک پلاننگ آج کل فیشن کی چیز بن گئی ہے۔ جو چیز فیشن میں داخل ہوجاتی ہے عوام اس کی حقیقی اور بنیادی حیثیت پر غور کرنے کے بجائے جذبات و احساسات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ جتنا کہ سمجھا جاتا ہے اس سے بہت زیادہ اثر نفسیات کا انسانی اعمال پر پڑتا ہے۔ ایک معقول اور مدلل اپیل عوام کو اس قدر متاثر نہیں کرتی جتنا کہ زوربیان یا حب وطن کے جذبات عوام پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی چیز کے نام میں کیا اثر ہے لیکن حقیقتاً نام میں بڑی اہمیت ہوتی ہے تاریخ اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کرتی ہے جبکہ انسان نے غلط تصورات اور تخیلات کے تحت قربانیاں کی ہیں معاشی نظم، تجدید، تعقیل اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اس زمانہ میں عام ہوگئے ہیں اور خصوصیت سے ہر جگہ معاشی نظم پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ پلاننگ کی جامع تعریف کرنا بہت دشوار ہے مختلف لوگوں نے اپنے مطلب کے لیے مختلف تعریفیں وضع کرلی ہیں۔ درصل حکومت کے سخت ترین قوانین، اور کلی اقتدار کا نام پلاننگ ہے۔ اس کا آغاز روس کے پنجسالہ پروگرام سے ہوتا ہے۔ جس کا مقصد پیدائش، تعلیم، مبادلہ اور حتیٰ کہ صرف تک پر اقتدار حاصل کرکے انفرادی آزادی کا خاتمہ کرنا ہے۔ مقتدر اعلیٰ ملک کی رہنمائی کرتا ہے اور قوم کو اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ایک شخص گیہوں کی روٹی کھانے کا عادی ہے مگر پلاننگ بورڈ کا خیال ہے کہ ملک کے لئے مفید ہے کہ اس کا گیہوں زیادہ سے زیادہ مقدار میں باہر جائے اور ملک میں گیہوں استعمال کم ہو اور جوار یا دوسرے معمولی غلوں کا استعمال بڑھے۔ چنانچہ یہی ہوتا ہے کہ ملکی گیہوں باہر جاتا ہے اور ملک کے باشندوں کو جوار اور معمولی غلوں پر قناعت کرنا پڑتی ہے خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ خیر یہ تو پلاننگ کی ایک انتہائی صورت تھی لیکن ایسا ہی ہوتا ہے کہ حکومت پیدائش

کے چند شعبوں پر اقتدار حاصل کرلیتی ہے اور بقیہ عوام کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔

آج کل ہندوستان ایک نئے دور سے گذر رہا ہے۔ نئے دستور کے بعد سے ہندوستان کے صوبجاتی رہنماؤں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ دستور میں کتنی ہی خامیاں اور نقائص کیوں نہ ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے صوبہ داری خودمختاری بڑی حد تک مقامی افراد کے سپرد کر دی ہے۔ ملک اس وقت ایک نازک اور تغیر پذیر دور سے گذر رہا ہے۔ صوبجاتی حکومتوں کے علاوہ مرکزی حکومت کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان مزید ذمہ داریوں کے لئے غیر معمولی دوراندیشی دوربینی اور صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ مفوضہ فرائض کو عمدگی سے انجام نہیں دیا سکتا۔ پرانے خیالات اور تصورات نئے دور میں تبدیل ہو رہے ہیں، خود حکومت اور اس کے معنی میں تبدیلی ہو رہی ہے پہلے حکومت ایک غیر ملکی ادارہ تھا، جو گو اس ملک پر حکومت کرتا تھا مگر اپنے اعمال کا جوابدہ ملکی باشندوں کے بجائے "کسی اور کو" تھا۔ مگر اب صوبوں میں نظم و نسق کی باگ ڈور منتخبہ ارکین کے ہاتھ میں ہے اور وہ اہل ملک یا اپنے منتخب کرنے والوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ایسی صورت میں پرانی روایات کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ ہر چیز میں تغیرات ہو رہے ہیں، اور ملک کا معاشی نظام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ہندوستان کے معاشی نظام پر غور و فکر کرنے کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جس کا مقصد خود اس کے الفاظ میں یہ ہے کہ ـــ

"جماعت کی عام مرفہ الحالی میں اضافہ کرنا، بالخصوص نظم اور قاعدہ طریقہ کے ساتھ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کی کوشش کرنا، پیدائش دولت کے نئے نئے ذرائع معلوم کرنا اور ان کو اس طور پر جماعت کے افراد میں تقسیم کرنا کہ پیدا کنندوں اور صارفین افراد اور جماعت کے مفاد میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے، اور موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے مابین مختلف مفادات میں یکسانیت قائم ہو سکے۔"

کمیٹی میں سیاسی لیڈروں کے علاوہ ملک کے مشہور معاشیین بھی شامل ہیں، کمیٹی نے اپنا سوال نامہ

جو ۷۶ ا سوالات پر مشتمل ہے تیار کرکے شائع کر دیا ہے ۔ گو یہ سوال نامہ صوبجاتی حکومتوں کے لئے تیار کیا گیا تھا مگر ہندوستانی ریاستوں، تجارتی، زرعی، صنعتی اداروں، مزدوروں کی جماعتوں اور معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے افراد سے بھی یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ متعلقہ مواد بہم پہنچانے میں کمیٹی کی امداد کریں مختلف قسم کا مطلوبہ مواد فراہم ہو جانے کے بعد کمیٹی غور کرے گی کہ ملک کے لئے کوئی ایسا موزوں اور مناسب معاشی لائحہ عمل تیار کیا جائے جس سے ملک کی مرفہ الحالی اور خوش حالی میں اضافہ ہو سکے۔

اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ ہم کو اکنامک پلاننگ کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے ۔ اس نظم کا ذمہ دار کون ہوگا ، کیا حکومت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تجارتی کاروبار اور اداروں کو اسی کامیابی سے چلا سکے جس طرح کہ خانگی افراد چلاتے ہیں۔ معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوتے ہیں، مختلف ملکوں میں حکومت نے جو معاشی معاملات میں مداخلتیں کی ہیں۔ اس کے کیا نتائج رہے ہیں اور ان سے کیا سبق سیکھا جا سکتا ہے، کیا حکومت کو کسی معاشی شعبہ میں دخل نہیں دینا چاہیئے، اور اگر مداخلت کی جائے تو کن شعبوں میں اور کس حد تک، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتوں پر اس مضمون میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

پہلے دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو پلاننگ کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے، اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام اس رفتار سے کام نہیں کر رہا ہے جتنا کہ منظم معاشی نظام کر سکتا ہے ۔ لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیوں معاشی نظام اس رفتار سے کام نہیں کر رہا جتنا کہ قبل از جنگ کر رہا تھا؟ پلاننگ کے حامی کہتے ہیں کہ موجودہ مسابقتی طریق میں یہ صلاحیت نہیں ہو کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے ۔ لیکن مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالات میں تبدیلی کس طرح ہوئی اور اس تبدیلی کا ذمہ دار کون ہے؟ موجودہ کساد بازاری دو چیزوں کا نتیجہ ہے، پہلے یہ کہ جنگ کے بعد سے سیاسی مداخلتیں معاشی نظام میں رخنہ انداز یاں کرنے لگیں، دوسرے یہ رجحانات اگر بالکلیہ نہیں تو کم از کم بڑی حد تک حکومت کی پالیسی کا نتیجہ ہیں ۔ پروفیسر رابنس لکھتا ہے کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے دوران میں معاشی نظام کی یہ صلاحیت کہ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں توازن

قائم کر سکے کمزور ہو گئی، جنگ سے قبل سرمایہ دارانہ دور کا خلاصہ یہ تھا کہ بازار آزاد تھا، اس کا یہ مطلب تھا کہ اشیا کی خرید و فروخت اور عاملین پیدائش حکومت کی من مانی مداخلت، یا مستحکم اجارہ داری اقتدار کے قبضے میں نہ تھے۔ لیکن اس کے بعد ان میں سخت سے سخت رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں صنعتی اتحادات، مزدور سبھاؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت، اور حکومت کے اقتداری اثرات نے ایک ایسا معاشی نظام پیدا کر دیا جس میں قدیم مسابقتی نظام کے مقابلہ میں تبدیل شدہ حالات کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کی صلاحیتیں کم تھیں۔" سرمایہ داری طریق اس لیے ناکام نہیں ہوا کہ اس میں بنیادی کمزوریاں تھیں، بلکہ اس کی ناکامی کا باعث وہ طریقے تھے جو توازن قائم کرنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ دوران جنگ کے معاشی رجحانات نے اس نظام میں گڑبڑ پیدا کی، اجرتوں میں بست و کشاد باقی نہیں رہی اجاروں اور اتحادوں نے آزاد بازاروں کا خاتمہ کر دیا۔ مال واسباب اور خدمات کے تبادلہ پر حکومت کی جانب سے پابندیاں عائد ہونے لگیں، انفرادی طور پر ملکوں نے صنعتی اقتدار، اور صنعتی امداد کے طریقوں کو اختیار کرنا شروع کیا، در اصل ان ہی رجحانات اور پالیسی کی بدولت عارضی طور پر مروجہ معاشی نظم میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

جو لوگ معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کے قائل ہیں ان کو یہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر کساد بازاری ہوتی رہی ہیں مگر حالیہ کساد بازاری کے مقابلہ میں کوئی اتنی طویل اور شدید نہ تھی، یہ طوالت اور شدت در اصل حکومت کی مداخلت کا نتیجہ تھی پہلے کی کساد بازاریاں جو اس قدر طویل اور شدید نہ ہوتی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادانہ معاشی قوتیں خود بخود توازن پیدا کر لیا کرتی تھیں، مگر اس مرتبہ حکومت کی پالیسی کی بدولت مختلف قوتوں میں توازن قائم نہ ہو سکا۔ اجرتوں میں استقامت کی حالت باقی نہیں رہی۔ صنعت و حرفت اور زراعت کے اتحادوں نے معاشی نظام میں گوناگوں خرابیاں پیدا کر دیں، یورپین ممالک کے صنعتی اتحادوں کی وجہ سے امتناعی محاصل اور دوسرے مداخلتی اصولوں کا آغاز ہوا۔ دنیا کی حالت بہتر ہو جاتی اگر حکومت کی پالیسی ان باتوں کی شدت میں اضافہ کرنے کے بجائے ان میں تخفیف کی کوشش کرتی، پروفیسر

راجنس نے صحیح کہا ہے کہ "حکومت کی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ صنعت کے لئے ایک ایسا میدان پیدا کیا جائے جہاں کاروبار اور ذرائع میں پھر ایک مرتبہ بازار کے حالات سے تطابق پیدا ہو جائے۔

اب ہم تفصیلی طور پر ان کوششوں کا مقابلہ کریں گے جو معاشی نظم کے سلسلہ میں مختلف ممالک میں اختیار کی گئیں تاکہ ان کی روشنی میں صحیح نتائج پر پہنچنے میں مدد مل سکے۔

<u>نیوڈیل کا تجربہ</u> | ۱۹۳۳ء میں جب مسٹر ریزولٹ امریکہ کے صدر ہوئے تو اس وقت امریکہ انتہائی شدید کساد بازاری کی آفت میں تھا، ملک تاریخ کے سیاہ ترین ایام سے گذر رہا تھا، اس سے پہلے کی کوئی کساد بازاری اس قدر شدید اور طویل نہ تھی، معاشی زندگی کے ہر شعبہ پر اس کا اثر پڑا، بے روزگاروں کی تعداد ۱۲ ملین تک پہنچ گئی۔ قومی آمدنی میں گرم بازی کے دور کے لحاظ سے ۵۰ فی صدی کمی ہوگئی محاصل میں کمی ہونے لگی، سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں محاصل کی تعداد ۲۴۱۱ ملین ڈالر تھی تو ۳۳-۳۲ء میں وہ صرف ۷۴۲ ملین ڈالر رہ گئی۔ کاشتکاروں کی حالت (جو خوش حالی کے زمانہ میں بھی شکوے شکایات کے عادی تھے) اور تباہ ہوگئی۔ ان کی خام آمدنی سنہ ۳۰ میں ۹،۴۵۴ ملین ڈالر تھی تو سنہ ۳۲ء میں ۵،۳۳۱ ملین ڈالر رہ گئی۔ زمینوں کی قیمت میں تخفیف ہوئی، اس سے کاشتکاروں کی ساکھ گھٹنے لگی، اور ان کے قرضوں کے بار میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کے علاوہ زرعی پیداواروں اور مصنوعات کی قیمتوں میں عدم توازن کی صورت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے کاشتکاروں کی قوت خرید گھٹ گئی ۲۹ء کے بعد سونے کی مسلسل برآمد سے زر کی تفریط ہو کر اعتبار میں کمی اور قرضے کے بار میں اضافہ ہونے لگا۔

بنکوں کی ناکامیوں نے تباہی کی آگ میں تیل کا کام کیا، محاصل کردڑ گیری میں اضافہ ہو کر ان کی سطح تقریباً امتناعی محاصل کے برابر ہوگئی۔ جس کی وجہ سے تجارت کو زبردست نقصان پہنچا، درآمد کرنے والے ممالک نے جب یہ دیکھا کہ ان کا مال امریکہ میں فروخت نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے یہاں کی درآمد کو روکنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں، اس سے امریکہ کی برآمد کو نقصان پہنچا مختصراً یہ کہا

جا سکتا ہے کہ جب ریز ولٹ نے کرسی صدارت سنبھالی اس وقت بے روزگاری اپنے انتہائی عروج پر تھی، قیمتوں کی سطح ادنیٰ تر ہو چکی تھی، زر کی تفریط تھی، بنک ناکام ہو رہے تھے، تجارت خارجہ گھٹ گئی تھی، اور نئے صدر کو اس صورت حال کا مقابلہ کرنا تھا، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مشکلات آسانی سے رفع نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے غیر معمولی طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کساد بازاری کو دور کرنے، اور حالات کو بحال کرنے کے لئے جو مختلف تدابیر اختیار کی گئیں اور قوانین بنائے گئے ان کو "نیو ڈیل" کہا جاتا ہے یہ قوانین مختلف چیزوں مثلاً بینکاری، طلا، نقرہ، زر کاغذی وغیرہ کے لئے بنائے گئے۔ مگر اس سلسلہ کے دو قانون اہم ہیں، پہلا "قانون بحالی قومی صنعت ۳۳ء" (نیشنل انڈسٹریل ریکوری ایکٹ) اور دوسرا "قانون توازن زراعت ۳۳ء"

پہلا قانون مارچ ۳۳ء میں نافذ ہوا، اس کا مقصد بے روزگاری کو دور کرنا تھا، اس وقت لاکھوں خاندان بے روزگاری کی وجہ سے مصیبتوں میں گرفتار تھے، ۳۲ء سے پہلے امریکہ میں بے روزگاری کا بیمہ یا اور کسی قسم کے امدادی طریقوں کا رواج نہ تھا، صرف چند شرقی ریاستوں میں جہاں برطانوی اثر تھا، ملکہ الزبیتھ کے زمانہ کے قوانین مفلسی رائج تھے، یا چار ریاستوں میں حکومت افراد کی بعض معاملات میں امداد کیا کرتی تھیں، اس وقت امداد کا عام طریقہ خانگی خیرات تھا، خانگی اداری ادیتیجر اور فیاض افراد عام حالات میں مفلسوں کی قابل لحاظ امداد کیا کرتے تھے مگر کساد بازاری کے دور میں ایک طرف مفلسوں کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا اور دوسری طرف مال دار لوگوں کے حالات خراب ہونے لگے، تو خانگی اداروں یا افراد کے بس کی بات نہیں رہی کہ وہ ان کی امداد کریں۔ چنانچہ اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے حکومت نے مرکزی خزانے کو مجاز گردانا کہ وہ ۳۰۰ ملین ڈالر سے امدادی کام شروع کرے، (یہ رقم حالات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت قلیل تھی) چونکہ مرکزی حکومت اپنے دستور کے لحاظ سے براہ راست ان کی مدد نہیں کر سکتی تھی اس لئے یہ رقم ریاستوں کے سپرد کی گئی تاکہ وہ اس سے امدادی کام شروع کریں، جن لوگوں کی امداد کی جاتی تھی ان سے کام بھی لیا جاتا تھا مگر یہ کام محض اوقات گذاری تھا، کیونکہ ان کے لئے مختلف کام فراہم کرنا دشوار تھے، اگر ان سے پیدا وار کا کام لیا جاتا تھا تو ان

افراد کو شکایت پیدا ہوتی تھی۔ جو اس کام کے معاوضے میں اعلیٰ اجرتیں ادا کر رہے ہوتے تھے، کیونکہ غیر مساوی مقابلہ کی بنا پر خانگی افراد کو نقصان ہوتا تھا۔ غیر پیداوار کام محض تضیع اوقات تھا، پھر یہ دشواری بھی تھی کہ بے روزگار مختلف پیشوں کے لوگ تھے، اور ان کے لئے موزوں کام فراہم کرنا آسان بات نہ تھی، کیونکہ یہ لوگ وہی کام آسانی سے کر سکتے تھے جس کو پہلے سے کر رہے ہوں نیا کام کرنا ان کے لئے مشکل تھا، ان مختلف دشواریوں کی بنا پر ۳۵ء کے اختتام تک اس پالیسی میں تبدیلی ہوگئی، اور حکومت نے مختلف تعمیری کام مثلاً سڑکوں، پلوں، اور عمارات کی تعمیر وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔

دوسرا قانون بہت ہی جامع تھا، یہ صنعت کے ہر شعبہ پر حاوی تھا، اس نے مصنوعات کی قیمت بڑھانے اور غیر مساوی مقابلوں کے بجائے مساوی مقابلوں کو رائج کرنے کی کوشش کی، مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ اور اوقات کار میں تخفیف کی گئی۔ اوقات کار میں کمی اس لئے کی گئی تاکہ زائد مزدوروں کو کام مل سکے، بچوں سے کام لینے کی مخالفت کرنے کی بھی یہی وجہ تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصارف پیدائش بڑھ گئے۔ اور مصارف پیدائش کے اضافہ کی وجہ سے تمام صنعتی ترقی میں مشکلات پیدا ہونے لگیں۔

اس قانون کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا یہ قانون خود ہی پیچیدہ تھا مگر کمیٹی نے اس کو اور پیچیدہ کر دیا دو سال کے عرصہ میں اس قانون کے تحت ۶۴۵ قواعد اور ۱۰۵ ذیلی قواعد بنائے گئے، ہر صنعت کے قواعد الگ تھے۔ جو صنعتیں اس قانون کے تحت آ چکی تھیں وہ "نیلے عقاب" کا نشان استعمال کرتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب تجدیدی دور میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان قواعد کے اطلاق کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی ان میں صرف آجروں کے نمایندے تھے، صارفین کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا گیا، بہر حال دو سال کے عرصہ میں پتہ چلا کہ قانون کے اکثر قواعد محض کاغذی حیثیت رکھتے ہیں اور جو مروج ہیں وہ بھی اطمینان بخش طریقہ پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قانون کا نفسیاتی اثر بڑا اچھا رہا بیرون ملک اور اندرون ملک کا ہر شخص خیال کرنے لگا کہ کوئی نئی چیز وجود میں آگئی ہے، لیکن اس کے خالص معاشی فوائد توقعات سے بہت کم ثابت ہوئے اور

جب خود تہا دنیا کے حالات میں تبدیلی شروع ہوئی تو امریکہ میں بھی تغیرات ہوئے۔ گویا جو چیز امریکہ نے نیوڈیل کی کوششوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی وہ دوسرے ملکوں میں بغیر کسی قسم کی تدابیر کے حاصل ہوگئی۔

ان قواعد کا فوری نتیجہ قیمتوں کے اضافہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ قیمتوں میں اضافہ سے طلب میں تخفیف ہوئی اور بعض صنعتیں خصوصیت سے اس سے متاثر ہوئیں مگر اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس قانون کا اطلاق ہر شعبہ پر نہ تھا اس لئے یہ گمان غلط نہیں ہے کہ اگر یہ چیز شدید اور عام ہوتی تو حالت اور زیادہ ابتر ہو جاتی۔ بہرحال یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بدولت ملک کی خوش حالی میں کس قدر اضافہ ہوا، کیونکہ دوسرے اسباب مثلاً بین الاقوامی صورت حال کی تبدریج اصلاح، امریکہ میں زر کی ارزانی، اعتبار کی وسعت، زر کی قدر میں کمی، زرعی تنظیم وغیرہ بھی حالات میں اصلاح کرنے میں مدد کر رہی تھیں۔

اس قانون کے اثرات کام کرنے والوں پر بہت کم ہوئے، گو ۳۲ء کے مقابلہ میں اجرتوں میں اضافہ ہوا مگر مجموعی اجرت ۲۹ء کے مقابلہ میں ۵۰ فی صدی رہ گئی امریکن مزدور کے اوقات کار میں کمی ہوئی مگر اس کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑی بہرحال حالات کے عود کرنے میں اس قانون نے امداد کی یا رکاوٹیں پیدا کیں اس کا تعین دشوار ہے، لیکن اس سے ایک بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کسی قوم کی خرابیوں کا علاج صرف جامع قانون سازی سے نہیں ہو سکتا، تجدید خود بخود اندرونی حالات کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسا کہ ایک مریض جس کو دواؤں کا عادی بنا دیا گیا ہو، جب تک دواؤں کا استعمال جاری رہے یا اس کا اثر باقی رہے مریض تندرست نظر آتا رہے مگر اثر ختم ہوتے ہی یا علاج چھوڑتے ہی اس کی حالت خراب ہو جائے۔ طویل بیماریوں میں عارضی دواؤں سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ یہی صورت امریکہ کی تھی، وہ باوجود ان قوانین کے برطانیہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ذیل کے تقابلی اعداد سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مختلف سالوں میں ان دونوں ملکوں میں صنعتی پیداوار کی مجموعی تعداد کیا رہی۔

صنعتی پیداواریں

سنہ	برطانیہ عظمیٰ	ریاست ہائے متحدہ امریکہ (سنہ ۲۳ تا سنہ ۲۵)
سنہ ۱۹۲۴	۱۰۰	۱۰۰
سنہ ۲۵	۹۷	۱۰۴
سنہ ۲۶	۷۵	۱۰۸
سنہ ۲۷	۱۰۸	۱۰۶
سنہ ۲۸	۱۰۲	۱۱۰
سنہ ۲۹	۱۱۱	۱۱۸
سنہ ۳۰	۹۸	۹۶
سنہ ۳۱	۸۴	۸۱
سنہ ۳۲	۸۵	۶۴
سنہ ۳۳	۹۰	۷۷
سنہ ۳۴	۱۰۲	۷۹
سنہ ۳۵	۱۰۸	۹۰

جرمنی ۔ گو پہلے ہی جرمن حکومت معاشی زندگی میں مداخلت کرتی رہی تھی، بالخصوص جنگ عظیم کے زمانہ میں غلوں، گوشت اور دوسری چیزوں کی مقامی پیداوار بڑھانے کے لئے مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کی گئی مگر نازی نیشنل سوشلسٹ دور میں مداخلت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔

۱۹۲۴-۳۲ء کے درمیان زراعت کی تجدید کی کوشش شروع ہوئی اور زراعت کی امداد کے لئے متعدد قوانین بنائے گئے پہلے درآمد کو روکنے کے لئے بھاری محصول لگائے گئے اور جب اس سے کام نہ چلا تو حکومت کی توجہ منڈیوں کی جانب منعطف ہوئی، اس زمانے میں زرعی قرضہ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کی تعداد ۷،۲۰۰ ملین ریش مارک تھی تو ۱۹۳۲ء میں ۱۱،۶۵ ملین ریش مارک ہوگئی۔ سود کے بار میں الگ اضافہ ہوا، یہ سب حکومت کی مداخلت کے باوجود ہوا، گو ۱۹۳۲-۳۴ء کے درمیان ۳۰ سے زائد قانون پاس ہوئے کہ قیمتوں میں توازن قائم رہ سکے، مگر کاشتکاروں کی حالت میں اصلاح نہ ہو سکی۔

نازی پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے دوسری پارٹیوں نے کاشتکاروں اور مزدوروں کی جانب کوئی توجہ نہیں کی، کاشتکار اگرچہ نازی فلسفہ کے حامی نہ تھے مگر محض اس احتجاج کی خاطر کہ کوئی ان کی نہیں سنتا نازیوں کے ہوا خواہ بن گئے۔ نازی لیڈروں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا، وہ کاشتکاروں کا اعتماد حاصل کرنے اور اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسا پروگرام بنانا ضروری سمجھنے لگے جن سے کاشتکار خوش ہوں، انھوں نے اپنے ایک مشہور لیڈر کو کسانوں میں قومی اشتراک کی تبلیغ کے لئے مقرر کیا، اور خاص پروگرام مرتب کیا، اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ یہودیوں کی برائیوں کو اچھی طرح واضح کیا جائے تاکہ کاشتکاروں کو یقین ہو جائے کہ ان کی ساری مصیبتوں کا باعث یہودی ہی ہیں
پروگرام کی چند اہم باتیں یہ تھیں

۱۔ مروجہ طریق محصول کی وجہ سے زراعت پر صنعت کے مقابلہ میں محصول کا بار زیادہ ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جرمن حکومت یہودیوں کی مالی امداد پر چل رہی ہے، اور اس طرح یہودی جرمن قوم کو تباہ کر رہے ہیں۔

۲۔ اس وقت زراعت کی جانب سے جو لاپروائی اختیار کی جا رہی ہے وہ ملک کے لئے مضر ہے۔

۳۔ زرعی پیداواروں میں منافع کی کثیر رقمیں درمیانی آدمی وصول کر رہے ہیں، درمیانی آدمی زیادہ تر یہودی ہیں۔

۴۔ کاشتکاروں کو ان تجارتی اشیا کی جن سے زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے اور بجلی کی قیمت گراں دینا پڑتی ہے، اور یہ دونوں کاروبار کلیتہً یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

نازی پروگرام معلوم کرنے سے پہلے نازی تصوریت کو سمجھنا ضروری ہے، اس کے دو اہم اصول یہ ہیں کہ نسلی وحدت جو ایک زبان، ایک خون اور ایک تمدن سے بنی ہو معاشری، معاشی اور سیاسی ارتقائے انسانی میں ایک بنیادی عنصر ہے، غیر تمدن اور غیر خون کی آمیزش اور ملک میں باہمی مخاصمت رکھنے والے طبقوں کے وجود سے آپس میں تفریق کی خلیج پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے جرمنی قوم کی تفریق کا بڑا سبب مروجہ سرمایہ دارانہ طریق ہے جس میں افراد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور قوم میں مختلف طبقے پیدا ہو گئے ہیں جن کے مابین کوئی باہمی سمجھوتہ نہیں ہے۔ اہل دارالامان اور سود خواروں نے قوم کے اخلاق پر ذہنی معاشی اور سیاسی اقتدار حاصل کر لیا ہے۔

نازی پروگرام | (۱) جرمنی کی زمینیں جرمنی قوم کے قبضے میں رہیں گی

(۲) وہ زمین جو قانوناً جرمنوں کے قبضہ میں ہو ان کی موروثی جائداد سمجھی جائے گی

(۳) جرمنی کی زمین تخمین کا باعث نہ ہو سکے گی، اور نہ یہ بغیر محنت کے آمدنی کا ذریعہ ہوگی آئندہ سے صرف ان ہی افراد کو زمین دی جائے گی جو خود کاشت کر سکتے ہوں اس وجہ سے حکومت کو زمین کی بیع کا حق حاصل ہو گیا، زمین کی کفالت پر آئندہ سے خانگی ساہوکاروں کو قرض دینے کی مخالفت کر دی گئی۔

(۴) حکومت جرمن زمین کے استعمال کا ایک محصول وصول کرے گی، اس کے علاوہ زراعت سے اور کوئی محصول وصول نہیں کیا جائے گا۔

(۵) وراثت میں زمین کے حصے بخرے نہ ہوں گے۔

(۶) حکومت ان مالکان زمین کو بے دخل کرنے کا حق رکھتی ہے جو اس کی دانست میں ناموزوں

ہوں اور جرمن قوم کے لئے اشیائے خوراک مہیا نہ کرتے ہوں۔

(۷) زمین ان افراد کو دی جائے گی جن کے پاس زمین نہیں ہے، اور جو قوم کے مفاد کی خاطر کام کرنے پر تیار ہوں۔

نازی پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی یہ پروگرام مستقل پالیسی بن گیا، کاشتکاروں کی امداد کے لئے فوری تدابیر اختیار کی گئیں۔ مثلاً زرعی محاصل میں اضافہ ممنوع قرار دیا گیا، شرح سود میں تخفیف کی گئی ربا کے متعلق سخت قانون بنائے گئے، حکومت نے اپنے معاشی پالیسی میں زراعت کو اہمیت دی اور برآمدی محاصل لگا کر اندرونی پیداواروں کی حفاظت کی گئی عام مزدوروں کے مفادات کی ضمانت کی گئی، کسانوں کی عام سطح زندگی کو بڑھانے کے لئے تعلیم، نوجوانوں کے کلب، اور اسی قسم کے دوسرے طریقے اختیار کئے گئے۔

نازی پالیسی کے سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے جماعتی مفاد کو دوسرے تمام مفادات سے اعلیٰ قرار دیا۔ ہر قسم کے خانگی، تجارتی اور معاشی مفاد حکومت کے مفاد کے تحت ہوں گے نازی لیڈر [illegible] نے اعلان کیا "قانون کے ذریعہ سے ہر قسم کا سود [illegible] حاصل کیا جائے گا کیونکہ قوم معاشی طریق کے فوائد کی خاطر زندہ نہیں رہتی اور نہ معاشی طریق [illegible] فوائد حاصل کرنے کی خاطر ہے، بلکہ اصل سے معاشی طریق کو تقویت ہوتی ہے اور معاشی طریقیا حکومت کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔" وہ جرمنی کو ایک خود کفیل ملک بنانا چاہتے ہیں اور اس کی خاطر ملک کے تمام معاشی ذرائع کو اس طرح منظم کرنا چاہتے ہیں۔ [illegible] یہ خیال تھا کہ کاشتکار کی تباہی جرمن جنت اور جرمن قوم کو نقصان پہنچائے گی، اسی کی خاطر [illegible] کاشتکار کو اہم مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔

نازی پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے زمینداروں کی فروخت ممنوع قرار دی گئی۔ اس کے یہ معنی تھے کہ طویل قرضوں کی کفالت کے لئے کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ اس کی وجہ سے کاشتکاروں [illegible] سے نجات دلائی گئی

جو جرمن قوم کا خون چوستے ہیں۔ کاشتکاروں کو موروثی زمین بغیر کسی موروثی ذمہ داری یا بار کے ملنے لگیں، ان پر چند پابندیاں بھی عائد کی گئیں مثلاً وہ غیر آرین نسل سے شادی نہیں کر سکتے، گویا شادی اب ایک شخصی اور خانگی معاملہ نہ رہا۔ جرمن قوم کے بنیادی حیثیت سے کاشتکار کو یہ پابندی تسلیم کرنا چاہیئے۔ متعدد افراد کو محض اس وجہ سے جیل بھیجا گیا کہ انھوں نے ممنوعہ طبقوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ نازی پارٹی گذشتہ صدی کی "زمیندار شرفا" کی جماعت کے برخلاف "کسانوں کی ایک نئی جماعت" پیدا کرنا چاہتی تھی، جس طرح قدیم زمیندار بادشاہ کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے تھے اسی طرح کسانوں کی یہ جماعت قومی اور سیاسی جماعت کی ریڑھ کی ہڈی ہوگی۔ وراثت میں قانون کا لاانیت رائج کیا گیا، اور اگر وارث بیٹا بُرا کسان ثابت ہو تو زمین دوسرے وارثوں کو دے دی جاتی تھی۔ اب چونکہ قرض ملنے میں دشواریاں پیدا ہونے لگیں تھیں، اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ زراعت کی ترقی، منڈیوں کی تنظیم اور قیمتوں میں توازن قائم کرنے کی خاطر قانون بنائے جائیں چنانچہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں یہ قانون نافذ ہوا اس کی رو سے حکومت نے زرعی پیداواروں کی قیمتوں کی ذمہ داری لی، اور کارخانہ داروں کو خام پیداوار میں خریدنے کے لئے ایک مقررہ قیمت ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۹۳۳ء کے "غلہ کی تجارت کے قواعد" سے پیداواروں کی قیمتیں بالکل حکومت کے ہاتھ میں آگئیں، گو کاشتکاروں کو اس سے نقصان پہنچنے لگا مگر ان کو یہ باور کرایا گیا کہ قوم کے مفاد کی خاطر ان کو یہ نقصانات برداشت کرنا چاہییں۔

جرمنی میں معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کی وجہ سے ۱۹۳۴ء میں ۲۰۲ قوانین اور ۲۴۶ ڈگریاں جاری ہوئیں، ۱۹۳۵ء میں ان میں ۱۵۰ قوانین اور ۷۰۰ ڈگریوں کا مزید اضافہ ہوا اور ۱۹۳۶ء کا اضافہ الگ ہے۔ مزدوروں کے متعلق مختلف قانون بنائے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہر کارخانہ کے تاجر مالک، تنخواہ دار ملازم، اور مزدور قوم اور حکومت کے مفاد کی خاطر اشتراک سے کام کریں گے ہڑتال اور دربندیاں ممنوع قرار دی گئیں۔ مزدوروں کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح قوم کے لئے قربانیاں کرنے پر تیار ہونا پڑا۔ خود کفالت کی پالیسی کی وجہ سے جرمنی کے معیار رہائش میں اضافہ ہوا، مگر مزدوروں کی اجرتوں میں تخفیف ہونے لگی، مگر مزدوروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی قسمت پر قانع رہیں۔

سنہ ۳۵ میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام لوگ جو مختلف صنعتوں میں کام کرتے ہیں یہ ثابت کریں کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں ہیں، اس کا مقصد غیر موزوں اور نا اہل لوگوں کو پیشوں سے خارج کرنا تھا، تاکہ صنعتیں ترقی کر سکیں، نیز تجارتی تبلیغ، اشتہار بازی، نمائشوں، میلوں، بجلی، ریل، سڑکوں، موٹروں، دوسرے ذرائع نقل و حمل اور بنکوں کے لئے متعدد قوانین بنا کر ان سب کو حکومت کے زیر اقتدار لے آیا گیا۔

معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوئے، اور وہ اچھے تھے یا برے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ جرمن لیڈروں کے پیش نظر صرف معاشی امور نہ تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "صرف" میں تخفیف کی، نہ صرف تمدنی اور تعیشاتی اشیا میں بلکہ قومی استحکام کی خاطر اشد ضروریات میں بھی کمی کی جانے لگی۔ اجرتوں میں تخفیف اور قیمتوں کے اضافہ پر جب قوم نے ناک بھوں چڑھائی تو ان سے کہا گیا کہ اس مصیبت کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنا چاہیئے کیونکہ یہ جرمن قوم کو بیرونی خطرے اور بالخصوص اشتمالیت کے ڈر سے آزاد کر دے گی۔

ہر روڈلف ہیس نے جو ہٹلر کے نائب تھے ایک موقعہ پر کہا "اگر موجودہ معاشی لڑائی ناکام رہے تب بھی کسی کو کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ جرمنی اپنے اسلحہ کی بدولت دشمنوں (روس) پر غالب آنے کی قوت حاصل کرے گی۔ ہم کو آئندہ کم چربی، کم گوشت، اور کم انڈے صرف کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، کیونکہ یہ چھوٹی قربانیاں در اصل قومی آزادی کی قربان گاہ پر قربانی ہے۔" ایک دوسرے موقعہ پر جرمن عورتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ہر نئی توپ، نئی تباہ کن مشین اور نیا جہاز جرمن ماؤں کی حفاظت میں اضافہ کرتا ہے، اور ضمانت لیتا ہے کہ ان کے بچے آئندہ لڑائیوں میں قتل نہ کئے جائیں اور بالشویک ان کے گلے نہ کاٹ سکیں —— ایک اچھی گھر کی مالکہ کو اس بات پر ہرگز ملال نہ کرنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف کے لئے، ایک پونڈ گوشت زیادہ حاصل نہیں کر سکتی۔"

سب سے زیادہ تعجب خیز چیز یہ ہے کہ جرمن عورت ہر طرح سے اس قربانی کے لئے تیار ہو گئی ایسی صورت میں معاشیات دان کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ صورت حال اس کے قابو سے باہر ہے، مگر

جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس پالیسی کے معاشی فوائد بڑے عمدہ ہیں تو معاشیات داں حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جرمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ راز میں ہے اس قسم کے اعداد و شمار موجود نہیں جن سے نتائج نکالے جائیں۔ حتیٰ کہ دو سال سے موازنوں کے تفصیلی حسابات ہی شائع نہیں ہوئے سرکاری اداروں کی جانب سے شائع کردہ اعداد کو علمی تحقیقات کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ اس کی خامیوں کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پھر ملک میں زر کے مختلف درجے ہو گئے ہیں۔ گو اصولاً جرمنی معیار طلاء پر قائم ہے مگر عملاً ملک میں ۱۲ قسم کے ریش مارک جاری ہیں۔ جن کی قیمتیں مختلف ہیں، اس کی وجہ سے اعداد و شمار کے باوجود مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جرمنی کی پالیسی زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہی، مگر اس سے چھوٹے کاشتکاروں کو اس لئے فائدہ نہیں پہنچا کہ وہ اپنی پیداواروں کا بڑا حصہ خود ہی صرف کر لیتے ہیں البتہ بڑے کاشتکاروں کو قیمتوں کی زیادتی سے فائدہ ہوا۔ بہر حال جرمنی نے مختلف چیزوں میں خود کفالت کا درجہ حاصل کیا اور اس تخیل کے تحت مصارف پیدائش کے اضافہ کی قطعاً پرواہ نہ کی گئی۔ اب ملک میں کوئلہ، روٹی کے غلے، ترکاریاں، گوشت، آلو، شکر، جو، جئی، سوئی، صندلی کرسی، انڈے، پھل، دودھ کی اشیا، شراب، مصنوعی، پنیر، برش وغیرہ کے بال، ۱۰۰ سے ۹۰ فی صد تک ملک میں پیدا ہو رہے ہیں۔ البتہ پارچہ بافی کا خام مال، اون، روغنی تخم، نباتی تیل، روئی، ربڑ، گوند کی پیداوار کم ہے مگر ان میں بھی ترقی کی کوشش ہو رہی ہے۔ موٹر کے تیلوں کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے ربڑ، چمڑے اور کھالوں میں بھی ملک کو خود کفیل بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

جرمنی میں آزادانہ معاشی قوتیں کار فرما نہیں ہیں۔ درآمد پر سختی سے حکومت کا قبضہ ہے، ملک میں ۲۷ مرکزی بورڈ قائم ہیں جو اپنی مفید اشیا کی درآمد پر قابو رکھتے ہیں،

ہر چیز کی درآمد کے لئے بورڈ سے "درآمدی سرٹیفکٹ" حاصل کرنا پڑتا ہے، جو صرف اس صورت میں دیا جاتا ہے کہ اس کی درآمد ملک کے لئے مفید ہے۔ اس کی وجہ سے درآمد کم ہوتی جارہی ہے۔ جرمنی کی برآمد میں ۱۹۳۵ء میں ۱۹۳۴ء کے مقابلہ میں اضافہ ہوا مگر برآمد کرنے والوں

کو مجموعی قیمتیں کم ملیں۔ ذیل کے اعداد سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے

	قیمت ملین ریش مارک	مقدار میٹرک ٹنوں میں
۱۹۳۳ء	۴۸,۷۱,۴۰۵	۴,۱۸,۳۱,۶۴۴
۱۹۳۴ء	۴۱,۶۶,۸۷۸	۴,۵۲,۱۷,۷۵۹
۱۹۳۵ء	۴۲,۶۹,۶۶۷	۵,۰۱,۳۷,۳۱۰

اس غیر معمولی صورت حال کی توجیہ وہ مختلف اسباب ہیں جو اختیار کئے گئے، مگر ان میں اہم حکومت کا امدادی طریق، دوسرے نئے بازارت حاصل کرنے کی خواہش، اور تیسرے سیاسی امور تھے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حکومت کی مداخلت کی وجہ سے مصارف پیدائش میں زیادتی ہو گئی تھی، اس وجہ سے جرمنی کو بیرونی بازاروں میں ممالک غیر کے مال سے مقابلہ کرنے میں دشواریاں پیش آنے لگی تھیں، اس کا لازمی نتیجہ جرمنی کی برآمد میں تخفیف کی صورت میں ہونا چاہیئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا، اس کی وجہ وہ گراں قدر رقومات تھیں جو حکومت نے بطور امداد عطا کیں، اندازہ ہے کہ صرف ۳۵ء میں ۱۰ کروڑ ریش مارک امداد پر صرف کئے گئے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس امداد کرنے کے لئے اتنی کثیر رقم کہاں سے آئی، اس کے لئے حکومت نے مختلف طریقے اختیار کئے۔ مثلاً ۳۲-۳۳ء سے یہ رقم اس طرح حاصل کی گئی کہ تمام غیر ملکیوں کی جو رقومات جرمنی کے بنکوں میں جمع تھیں ان کو ملک سے باہر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کی وجہ سے ان کی مالیت گھٹ گئی۔ اور بیرونی لوگ اس بات کے لئے تیار ہو گئے کہ اس کے معاوضہ میں جو چیزیں بھی ان کو آسانی سے مل جائیں وہ لے لیں، چنانچہ مختلف اشیا باہر روانہ کی گئیں اور ان رقومات پر حکومت کا قبضہ ہو گیا اسی قسم کی ترکیب جرمنی کے تمسکات رکھنے والے غیر ملکی افراد کے ساتھ کی گئی۔ اور حکومت کو اس کاروبار سے بھی منافع ہوا۔ ۳۳ء میں ایک قانون کے ذریعہ جرمن باشندوں کو پابند کیا گیا کہ وہ بیرونی لوگوں کو جو رقمیں ادا کرنے والے ہیں وہ ریش مارک میں ادا کریں، غیر ملکیوں کو یہ رقم کچھ نقد اور کچھ جرمنی کے تمسکات کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں، ان

تمسکات کی مانگ بیرونی بازاروں میں بہت کم تھی' یہ پھر جرمنی میں آکر فروخت ہوتے تھے اور ان پر خاصا بٹہ کاٹ کر نفع کھایا جاتا تھا۔ جب یہ ذرائع بھی کم ہونے لگے تو "خود امداد" کے نام سے تمام مصنوعات پر ٹیکس لگایا گیا' اور اسی طرح جو رقم جمع ہوئی اس کو امدادی کاموں پر صرف کیا گیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرون ملک چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا' اور حکومت کی امداد کا اثر جرمنی مصارف پر پڑ رہا ہے واقعی جرمنی صارف کی حالت قابل رحم ہے۔

اس زمانہ میں دوسرے ممالک میں صرف کا اوسط بڑھ رہا ہے مگر جرمنی میں تعیشاتی اور تمدنی چیزوں کے علاوہ ضروری چیزوں کا صرف بھی گھٹ رہا ہے۔ یا عام معیار زندگی میں تخفیف ہو رہی ہے۔ چنانچہ ذیل کے برطانیہ کے متقابلہ اعداد سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

	انگلستان			جرمنی		
	گھی' تیل' چربی وغیرہ	انڈے	گوشت وغیرہ	گھی' تیل' چربی	انڈے	گوشت وغیرہ
۱۹۲۹ء	۳۹٫۳ پونڈ فی کس	۰	۱۳۸ پونڈ	۴۱٫۳ پونڈ	۰	۱۱۲٫۸ پونڈ
۱۹۳۲ء	۳۹٫۲ "	۱۵۰	۱۴۴ "	۴۲٫۰ "	۱۲۰	۱۰۷٫۹ "
۱۹۳۳ء	۴۱٫۰ "	۱۴۹	۱۴۵ "	۳۸٫۳ "	۱۰۱	۱۰۹٫۰ "
۱۹۳۴ء	۴۲٫۰ "	۱۵۲	۰	۳۴٫۳ "	۹۹	۱۲۰٫۷ "

انگلستان | چند سالوں سے انگلستان میں بھی زرعی پلاننگ کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے لیبر حکومت نے ۱۹۳۱ء میں قانون بازارت نافذ کیا جس کے تحت بازاری بورڈ قائم کئے۔ مگر اس سے زیادہ فائدہ اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں جبر کا پہلو شامل نہ تھا ۱۹۳۳ء میں جب نیشنل گورنمنٹ برسر اقتدار آئی تو اس میں ترمیمات کی گئیں۔ پہلے زرعی پیداواروں کی درآمد پر مقداری پابندیاں عائد کی گئیں' دوسرے اندرون ملک زرعی پیداواروں کی محدود کر دیا گیا۔ قانون میں ان لوگوں کے لئے معاوضہ کی رعایات بھی رکھی گئیں جن کو مارکٹنگ اسکیم سے نقصان ہوتا تھا' مختلف چیزیں مثلاً دودھ' اور اس کی مصنوعات' سور اور اس کا گوشت' آلو وغیرہ اس اسکیم کے تحت لائی گئیں۔ ہم اس وقت چند اہم چیزوں کا تفصیلی حال معلوم کریں گے۔

دودھ | دودھ انگلستان کی ایک اہم پیداوار تھی ۔ ۱۹۳۴ء میں اس پیشہ میں ۲½ لاکھ آدمی مصروف تھے اور ہر سال تقریباً ۵۵ ملین پونڈ دودھ پیدا ہوتا تھا۔ چونکہ سیال دودھ بڑی سریع الزوال شے ہے اس لیے پیدا کنندوں کو مقامی بازار کا اجارہ حاصل تھا۔ مگر وہ دودھ جو پینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور جو دوسری چیزیں بنانے کے لئے فروخت ہوتا تھا ان کی قیمتوں میں اختلاف تھا۔ اسی زمانے میں بیرونی دودھ والی اشیا کا مقابلہ بڑھ گیا اکثر یورپین ممالک نے اپنے غیر ممالک کی درآمد کو کم کرنے کی کوشش شروع کر دی، اس کا اثر برطانوی کاشتکار پر جو مکھن اور پنیر بناتا تھا پڑا۔ پھر سیال دودھ کی رسد میں اضافہ اور طلب قائم رہی۔ بہرحال دودھ کے متعلق جو اسکیم بنائی گئی اس سے بجائے فائدہ کے نقصانات ہوئے، چنانچہ صارفین کی کمیٹی جس کو دودھ کی تحقیقات پر مامور کیا گیا اس نے بتایا کہ دودھ کی قیمت مقرر کرنے سے اس کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر غیر لائسنس یافتہ چلمر دودھ فروخت کرنے والوں پر پابندیاں عائد کرنے سے دیہی علاقوں میں غربا ڈبہ کا دودھ استعمال کرانے لگے ہیں جس کا صحت پر خراب اثر پڑنے کے علاوہ سیال دودھ کی رسد میں بھی اضافہ کا باعث ہو رہا ہے۔ اچھا دودھ پیدا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی ہے، کیونکہ ان کو عمدہ دودھ کی اچھی قیمتیں نہیں ملتی ہیں۔ دودھ کی رسد میں اضافہ کی وجہ سے اس کی مصنوعات تیار ہونے لگیں مگر دودھ کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ بیرونی پیداواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اور حکومت کو دودھ پیدا کرنے والوں کو امداد دینا پڑی۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی امور بھی اس اسکیم پر اثر انداز ہو رہے تھے، برطانوی کاشتکار حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ دودھ کی مصنوعات کی درآمد پر پابندیاں عائد کرے مگر حکومت معاہدہ اٹاوہ کی وجہ سے مجبور تھی، اس لئے اس نے برطانوی نو آبادیوں سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی خوشی سے برآمد میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔ مگر نو آبادیات اس طرز عمل سے خوش نہیں ہوئیں، بالخصوص وہ ممالک جن کا گذر ہی دودھ کی مصنوعات پر تھا جیسے نیوزی لینڈ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ آسٹریلیا نے کہا کہ اگر اس کی دودھ کی پیداواروں کے لئے برطانیہ میں بازار نہیں ہے تو وہ اپنا قرضہ ادا کرنے

کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ ان دھمکیوں نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ اس مسئلہ پر سیاسی اور معاشی حیثیت سے غور کرے، چنانچہ اس کے پیش نظر تین امور تھے، پہلے یہ کہ برطانوی نوآبادیات برطانوی مصنوعات کا بڑا اچھا بازار ہیں اور ان بازاروں کو ہاتھ سے کھو دینا عقل مندی نہیں ہے۔ دوسرے ان نوآبادیوں میں برطانوی اصل کام کر رہا ہے۔ اور برطانوی افراد کو اس سے کافی آمدنی ہوتی ہے۔ تیسرے برطانیہ میں صنعت کے مقابلہ میں زراعت بہت ہی غیر اہم ہے۔ اس لئے صنعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زراعت کو تامین دی گئی تو مصارف پیدائش میں اضافہ ہو جائے گا اور برطانوی مصنوعات کو بیرونی بازاروں میں دوسرے ممالک سے مقابلہ کرنے میں دشواریاں ہوں گی۔

سور اور اس کے گوشت کے لئے بھی بورڈ قائم کئے گئے۔ سور کے گوشت کی درآمد کو منیسہ (Quota) کے تحت لایا گیا۔ تو اس کی وجہ سے درآمد میں کمی ہوئی مگر مجموعی قیمت پہلے کے مقابلہ میں کم نہیں ہوئی، اس کی وجہ ہالینڈ کے گوشت کی قیمت میں اضافہ تھا۔ برطانیہ کے گوشت کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوا اگر وہ خراب قسم کا ہوتا تھا اس لئے لوگ ہالینڈ کے گوشت کو ترجیح دیتے تھے پلاننگ کا مقتدر اعلیٰ صارفین کے ترجیحی استعمال پر پابندی نہیں لگا سکتا۔

مارکٹنگ بورڈ پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے صارفین کے مفادات کو نظر انداز کر دیا اور ان کے لئے قیمتوں میں اضافہ عام مشکلات کا باعث ہوا، اس کے علاوہ ان اشیا کی قیمتوں میں عدم استقامت کی حالت پیدا ہو گئی جو اقتدار سے آزاد تھیں۔ پھر دوسری مشکل یہ ہوئی کہ جب کسی خاص شے کے لئے کوئی رقبہ معین کر دیا جاتا ہے تو طاقتور کھاد یا کاشت عمیق کے دوسرے طریقوں کی بدولت معین رقبوں سے زائد پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب مصر میں روئی کی کاشت کی تحدید کے لئے قانون بنایا گیا کہ کاشتکار اپنی آراضی کے ⅓ حصہ پر کاشت کریں تو وہاں کاشت عمیق شروع ہو گئی۔

بہرحال پیداواروں کی تعداد پر پابندیاں لگانے سے صرف اسی صورت میں فائدہ ہو سکتا ہے جہاں کہ کوئی ایک فصل اہم ہوتی ہو، یا پیداوار کا بڑا رقبہ برآمد کیا جاتا ہو، لیکن ان ملکوں میں جہاں مختلف

قسم کی فصلیں ہوتی ہوں کاشتکار چھوٹے رقبوں کے مالک ہوں ان کی تعداد زیادہ ہو، وہاں اس میں کامیابی کے قرائن موجود نہیں۔

پلاننگ اور اشتراکیت | چونکہ پلاننگ کے لئے پیداوار پر قابو پانا ضروری ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ پلاننگ سرمایہ داری طریق سے زیادہ اشتراکی طریق میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ گر اس میں بھی خامیاں ہیں ذرائع پیدائش کے لئے خانگی ملکیت کے بغیر کوئی بازار پیدا نہیں ہوتا۔ قیمتوں کا تعین دشوار ہو جاتا ہے اس کے علاوہ پلاننگ کرنے کی طاقت خواہ کتنی ہی ذہین اور سمجھ دار کیوں نہ ہو اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی کہ کون سے ذرائع بیش ترین فوائد کا باعث ہوں گے، اشتراکی پلاننگ میں خانگی طور پر حضرات برداخت کرنے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور یہ کام حکومت کی جانب سے اسٹیٹ کارپوریشن کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں روس کا تجربہ بہت زیادہ قیمتی ہے، مگر اجتماعی زراعت کے سلسلہ میں وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مرکزی اقتدار کا نظریہ عملی صورت میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا، اور اب وہ انفرادی طریق کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ خود صنعت میں بھی وہ نتائج حاصل نہیں ہوئے جن کی توقعات وابستہ کی گئیں تھیں۔ اس طریقہ کی بدولت تفنیع بہت زیادہ ہوتی ہے۔

لوئیس نشر روس کے متعلق کہتا ہے کہ "شہروں اور دیہات میں پیدائش کے مسئلہ نے تقریباً بڑی عمدہ صورت اختیار کر لی ہے مگر تقسیم کا مسئلہ بالکل ناقص ہے۔ اس میں ذرائع نقل وحمل کی خرابیوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ سامان مال گوداموں میں پڑا سڑتا رہتا ہے اور صارفین اس کی تلاش میں مختلف ذخیروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کی بداعمالیاں بھی قابل لحاظ ہیں، گو ملک کے اخباروں میں برابر ذخائر کے منیجروں اور امداد باہمی کے ملازموں کی بداعمالیوں کی تفصیلات شائع ہوتی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود خرابی بدستور باقی ہے"

ہندوستانی حکومت کی مداخلت کے بڑے حامی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے حکومت کی ملکیت کے جو مختلف ادارے مثلاً پنجاب کی نہریں، ریلیں، تار، ڈاک خانہ، جل بجلی وغیرہ ہیں

ان سے کثیر منافع حاصل ہو رہا ہے۔ مگر غیر ممالک میں یہ حال نہیں ہے وہاں اکثر سرکاری کاروبار اور ادارے نقصان پر چلتے ہیں، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی حکومت اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور یہاں کے لوگ مفاد عامہ کی اختیار شدہ پالیسی میں دخل نہیں دے سکتے، لیکن جن صوبوں میں ملکی حکومت ہے جیسے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ وہاں رائے دہندے حکومت کی مقررہ پالیسی میں تغیر و تبدل کرا سکتے ہیں، اور اپنے نمائندوں سے باز پرس کر سکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام تجارتی اصولوں کے بجائے عوام کی رائے پر، اور ان میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں ہندوستان میں بھی خود مختار صوبوں میں اسی قسم کے رجحانات پیدا ہونے کے اچھے خاصے قرائن موجود ہیں۔ اس کے بعد زائد منافع کا اصل سبب بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔

حکومت کی مداخلت کے معاشی اثرات کا دائرہ جب وسیع تر ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات کو کم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس کی بڑی اچھی مثال آسٹریلیا سے ملتی ہے جس کی مصنوعات اور اشیا لندن کے بازاروں میں ارزاں نرخ پر فروخت ہوتی ہیں مگر اندرون ملک ان کی قیمتیں لندن سے زیادہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا میں اجرتیں زیادہ ہیں اجرتیں اس لئے زیادہ ہیں کہ وہاں معیار رہائش اعلیٰ ہے معیار رہائش کیوں اعلیٰ ہے کیونکہ چیزیں گراں ہیں چیزیں محاصل کروڑگیری کی وجہ سے گراں ہیں محاصل کیوں زیادہ ہیں اس لئے کہ مصارف پیدائش اعلیٰ ہیں مصارف پیدائش کیوں اعلیٰ ہیں اس لئے کہ اجرتیں اور محاصل زیادہ ہیں۔ بہرحال یہ ایک بڑا مہیب چکر ہے جو ملک کی ساری معاشی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ اسی قسم کی صورتیں کینیڈا اور آسٹریلیا میں نظر آتی ہیں۔

ایک دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ موجودہ طریق سرمایہ داری کو پیچیدہ اور غیر منظم کہا جاتا ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ طریقہ غیر منظم ہے، کیا ہم کو اس سے کسی قسم کے فوائد حاصل نہیں ہوئے یا اس میں فائدے پہنچانے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ ان سوالوں کے جوابات یہی ہیں کہ گذشتہ سو سال میں ہم نے اس طریق میں بڑی کامیابی حاصل کی، اور یہ کامیابی ایسی تھی جس کی دنیا کی تاریخ کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتی، معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے، جو چیزیں آج اشد ضروریات میں داخل ہیں وہ سو سال پہلے تعیشات سمجھی جاتی تھیں بعض چیزیں ایسی ہیں جو پہلے بادشاہوں کو بھی میسر نہ تھیں مگر آج ادنیٰ

اور غریب لوگ بھی ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تقسیم دولت کا مسئلہ اس زمانے میں شدید ہو گیا ہے اور اس کی وجہ وہ عدم توازن ہے جو تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس طریق کی برائی کی جاتی ہے۔ لیکن ہم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ رجحانات ایک بالکل حالیہ چیز ہیں، ۱۰۰ سال قبل تک تقسیم سے زیادہ پیدائش کو اہمیت حاصل تھی، اور چونکہ اس وقت پیدائش ہی ٹھیک نہیں تھی اس لئے تقسیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اور طریق پیدائش کو بڑھانے کی کوششوں میں تقسیم کے مسئلہ پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا مگر اب جب کہ پیدائش کا مسئلہ صاف ہو گیا، لازمی ہے کہ تقسیم کی طرف توجہ کی جائے کسی ایک طریق کے نقائص گنانا بہت آسان ہے مگر اس کی جگہ کوئی دوسرا طریقہ رائج کرنا بہت مشکل ہے، اس میں شک نہیں کہ اس وقت طلب و رسد کے حالات اور قیمتوں کا طریق صحیح اور متوازن اصولوں پر کام نہیں کر رہے ہیں، اگر قصور کس کا ہے یقینی طور پر یہ طریقہ کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ان مدبرین پر عائد ہوتی ہے جو قومی خود کفالت کے حامی ہیں یا ان ملکوں پر جو پلاننگ کے خواہش مند ہیں۔

"کثرت میں قلت" ایک عام ضرب المثل بن گئی ہے، اور اس کو سرمایہ داری طریق کا نتیجہ بتلایا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ چیز معاشی زندگی میں حکومتوں کی بڑھتی ہوئی مداخلتوں اور معاشی خود کفالت کے تخیلات کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی ملک میں گیہوں کی طلب موجود نہیں اور وہ وہاں پڑا سڑ رہا ہے تو دوسرے ایسے ممالک بھی ہیں جہاں گیہوں کی قلت ہے، اور وہ اپنی آب و ہوا، زمین اور ماحول کے لحاظ سے نہ گیہوں پیدا کرنے کے قابل ہیں اور نہ مسابقتی قیمت پر گیہوں پیدا کر سکتے ہیں لیکن وہ برابر اپنی پیداوار کو بڑھانے میں مصروف ہیں۔ بیرونی درآمد کو روک کر اپنے گیہوں کی قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ اور کثرت میں قلت کون پیدا کر رہا ہے۔ اگر پلاننگ کا یہی معیار ہے تو پھر دنیا سے پلاننگ کا خدا حافظ۔

ہندوستان کے لئے یہ سوال بہت ہی اہم ہے کہ حکومت کی مداخلت ملک کی آئندہ زندگی پر کیا اثر ڈالے گی، اس کا مطالعہ بالکل معاشی نقطہ نظر سے کرنا چاہیئے جذبات احساسات سے کام

نہ لینا چاہیئے کیا حکومت کی معاشی مداخلت ہماری معاشی مشکلات کو رفع کر سکتی ہے، کیا اس سے
ہماری مرفہ الحالی میں اضافہ ہو سکتا ہے کیا حکومت کے پاس کوئی ایسی جادو کی چھڑی ہے جس کے
ذریعہ سے وہ آن واحد میں ملک کے کایا پلٹ کر سکتی ہے۔ اس کے لئے ہم کو ان ملکوں پر نظر ڈالنا
ہے جنھوں نے اس طریق کو اختیار کیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح معاملات سلجھنے کے بجائے اور
الجھ گئے۔ ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کی بنا پر دنیا کا دائرہ چھوٹا ہو گیا تھا لیکن بدقسمتی سے معاشی
قومیت کے رجحانات نے دنیا کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مختلف ملکوں کے آپس کے معاشی
تعلقات خراب ہوتے جا رہے ہیں، تجارت بین الاقوام جو قوموں کی روح ہے مردہ ہوتی جا رہی
ہے۔ اور پلاننگ مشکلات کو حل کرنے کے بجائے ان میں پیچیدگیاں پیدا کرتی جا رہی ہے۔ کسی
ایک انفرادی ملک میں پلاننگ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ کلیتہً معاشی اور
معاشرتی، طور پر دنیا سے قطع تعلق نہ کرے، خود کفیل وحدتیں بغیر تھوڑی بہت تجارت اقوام کے زندہ نہیں رہ
سکتیں، یا اپنے موجودہ اعلیٰ معیار کو برقرار نہیں رکھ سکتیں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسا ملک جو
بڑی حد تک خود کفالت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے کیونکہ وہ اپنی پیداواروں کا صرف ۱۰ فی صدی حصہ
برآمد کرتا ہے مگر اس نے بھی تجارتی پابندیوں کا بار ہر طرح محسوس کیا تھا۔ انفرادی طور پر ایک ملک
کے لیے، خود کفالت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں کرنا پڑیں گی، اس کو ابتدائی تہذیبی
منازل کی طرف لوٹنا پڑے گا، ہمسایہ ممالک سے تعلقات خراب کرنا پڑیں گے، آپس میں رقابتیں
پیدا ہوں گی اور جنگ کے امکانات زیادہ قوی ہو جائیں گے ہندوستان میں اس امر پر زور دیا جا رہا
ہے کہ حکومت ایک مکمل معاشی لائحہ عمل تیار کر کے میدان میں آئے اور ملک کی تمام معاشی کمزوریوں
کا خاتمہ کر دے، پلاننگ کی کامیابی کے لئے حکومت کی مداخلت کی شدید ضرورت ہے، اگر حکومت
کی شدید مداخلت جمہوری اصولوں کے خلاف ہے، اور جس چیز کو حاصل کرنے کے لئے ہم برسوں
سے کوشش کر رہے ہیں اس کو غالباً اتنی آسانی سے کھو دینے پر آمادہ نہ ہوں گے، دوسری چیز
جس کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا اس پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا یہ ہے کہ پلاننگ کو کامیاب بنانے

گے لئے سرمایہ داری طریق کا خاتمہ ضروری ہے۔ مگر فی الحال ایسے آثار موجود نہیں ہیں، ہم اس طریقہ کے عادی ہو گئے ہیں، اور مروجہ طریقہ کے خلاف نیا طریق قبول ہونا ذرا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ "ہندوستان کا بے تاج بادشاہ" بھی اپنے پیروؤں کی ہمدردی حاصل نہیں کرسکتا اگر وہ موجودہ طریق کو بدل دینے کے لئے کوشش شروع کردے۔ ایسی صورتوں میں پلاننگ کی کامیابی کے قرائن اور زیادہ کمزور ہوجاتے ہیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت معاشی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت ہی نہ کرے بعض کام ایسے ہیں جن میں اس کی مداخلت ضروری ہے۔ مثلاً کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے پنجے سے نجات دلانا، کارخانوں میں کم عمر بچوں اور عورتوں سے زائد کام لینا مزدوروں سے طویل اوقات تک کام لینا، اتفاقی حادثات کی صورت میں ان کو مناسب معاوضے دینا، ملک کے عام باشندوں کی معیار صحت میں اضافہ، ان کی تعلیم وغیرہ کے انتظامات کرنا۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور چیز جس میں حکومت حصہ لے کر ملک کی معاشی زندگی میں انقلاب کرسکتی ہے وہ شعبہ بنکاری ہے۔ اور ہندوستان کی حکومت نے اب تک جو اس جانب غفلت کی وہ ایک مجرمانہ فعل ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ چند وہ چیزیں ہیں جن میں مداخلت ضروری ہے اور ان میں مداخلت ہی سے ملک کی عام معاشی زندگی اور معیار زندگی اور مرفہ الحالی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہوائی جہاز کی کہانی

آپ نے کبھی صبح کے وقت بیل گاڑیوں یا اونٹ کی شکرموں کو دیکھا ہے جو بھوسہ گیہوں، روئی، راب، لکڑی، کنکر، مٹی وغیرہ سے لدی ہوئی ہندوستان کی سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ ان کے بیلوں کے گلے کے گھونگرو، ان کے پہیوں کی روں راں اتنی خواب آور ہوتی ہے کہ گاڑی ہانکنے والا اپنی گڑگڑی کے کش لگاتے لگاتے بے خبر سو جاتا ہے اسے پھر اس کی فکر نہیں ہوتی کہ گاڑی سڑک کے کنارے چل رہی ہے یا بیچ سڑک پر۔ موٹر والے اس پر بہت ناراض ہوتے ہیں گالیاں سناتے ہیں لیکن اس پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوتا۔ وہ چونک کر اپنی گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے کر لیتا ہے اور پھر دوبارہ نیند کے سمندر میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب آپ اس گاڑی والے کو دیکھتے ہوتے ہیں عین اسی وقت آپ کو ہوا میں غائیں غائیں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک ہوائی جہاز چیل کی طرح تیرتا ہوا آپ کے سر پر سے گذر جاتا ہے۔ آپ کی نگاہ تھوڑی دیر حیرت، تعریف اور رشک کے مشترک جذبات کے ساتھ اس کا تعاقب کرتی ہے اور پھر وہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

پھر دوبارہ آپ بیل گاڑی کی روں راں کو سننے لگتے ہیں جسے پیچھے چھوڑ کر آپ کچھ آگے نکل آئے ہیں۔ ایک طرف بیل گاڑی کی سست رفتاری ہوتی ہے اور دوسری طرف ہوائی جہاز کی سبک خرامی۔ آپ سفر کے طریقوں کے اس فرق اور تضاد کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک طرف آپ کو ایک شخص نظر آتا ہے جو ہزاروں سال پیچھے ہے۔ دنیا

نے جس چیز کو ہزار ہا سال گذرے ایجاد کیا تھا اسی پر قائم ہے اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی اور حرکت پیدا کرنا نہیں چاہتا اور دوسرا شخص ہے کہ لحہ بہ لحہ اپنی رفتار کو تیز کرنے اپنی سواری کو مکمل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ایک شخص ہے کہ سست اور کمزور جانوروں کی مدد سے جو نقل وحمل کا ابتدائی ذریعہ تھے زمین کے سفر کی تمام صعوبتیں اور پریشانیاں، غفلت اور مدہوشی کے ساتھ گوارا کر رہا ہے۔ اپنے دماغ کو بالکل معطل رکھ کر کبھی کبھی صرف ٹخ ٹخ، دو چار گالیوں اور ڈنڈی میں لگی ہوئی لوہے کی نوک یا چمڑے کے تسمہ سے بیلوں کی خبر لیتا رہتا ہے۔ دوسرا ہے کہ بلا روک ٹوک ہوا پر شہ سواری کر رہا ہے۔ اس کا دماغ فعال، بیدار اور ہوشیار ہے۔ اسے اپنی برتری اور عظمت کا احساس ہے۔ وہ قوائے فطرت پر قادر ہے عناصر پر حکمراں ہے۔ صحیح معنی میں انسان یعنی خلیفتہ اللہ فی الارض ہے۔

ہوائی تیز رفتاری نے سڑکوں اور ریلوں اور سمندر کے سفر کی تیزی کو آج بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ کوئی جہاز، کوئی ریل اور کوئی موٹر ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتا کراچی سے لندن تک کا سفر آج کل چند گھنٹوں میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہوائی سفر کی اس ترقی کی تاریخ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

پرانے زمانہ کے جو قصے ہم تک پہنچے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڑنے کے امکانات کے بارے میں لوگ ہمیشہ غور کرتے رہے ہیں۔ مثلاً پرانے زمانے کے ایک شخص کے بارے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ اس نے موم کے ذریعہ پروں کو اپنے جسم سے چپکا کر اڑنے کی کوشش کی۔ یہ شخص اڑا لیکن بدقسمتی سے سورج کے بہت نزدیک پہنچ گیا جس سے موم پگھل گیا اور اس کے پر زمین پر گر پڑے۔

عہد وسطیٰ میں اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کا ایک طبیب تھا اس نے بھی پروں کی مدد سے اڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کام کے لئے عقاب کے پروں کو منتخب کیا کیونکہ سب پرندوں میں عقاب سب سے اونچا اڑتا ہے۔ لیکن جب اس نے پروں کا

لباس پہنا اور قلعہ کی دیوار سے کودا تو بجائے عقاب کی طرح ہوا میں اڑنے کے زمین پر آ گرا جس سے اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ کے باوجود اس کا اعتقاد پروں کے بارے میں قائم رہا اور اپنے اس گرنے کا سبب اس نے یہ بتایا کہ اس کے لباس میں عقاب کے پروں کی جگہ مرغی کے پر لگا دیئے گئے تھے اور مرغی چونکہ آسمان میں اڑنے کی جگہ زمین کی طرف گرتی ہے اس لئے وہ بھی زمین پر گر پڑا۔

پرواز کے متعلق ان افسانوں کے علاوہ ابتدائی عالموں نے اڑنے کے طریقوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مثلاً لیونارڈو ڈی ونسی (۱۴۵۲ء تا ۱۵۱۹ء) نے جو اٹلی کا مشہور سائنس داں اور مصور تھا پرواز کے متعلق کچھ باتیں لکھی تھیں۔ اپنے نظریوں کو سمجھانے کے لئے اس نے نقشے وغیرہ اور نمونہ کی اڑنے والی مشینیں بھی بنائی تھیں۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے مشہور مفکر فرانسس بیکن نے بھی اپنے اس اعتقاد کا اظہار کیا تھا کہ انسان ہوا کو ضرور تسخیر کرے گا۔

غرضکہ صدیوں تک انسان پرواز کے خواب دیکھتے رہے اور ان کے بارے میں نظریے بناتے رہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے کوئی شخص فی الواقعی تھوڑے فاصلہ تک بھی اڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکا جب تک کہ آدمیوں نے علمی طریقوں پر کاموں کو کرنا نہیں سیکھا۔ ۱۷۰۰ء میں عین اس وقت جب کہ واٹ اور ہارگریوز اور دوسرے لوگ انجنوں اور مشینوں کی ایجاد کر رہے تھے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ایسے ہوائی جہاز بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو انھیں زمین سے بلند کر کے ہوا میں لے جا سکیں۔

۱۔ ہوا سے ہلکے ہوائی جہازوں کی ایجاد (الف) پہلا قدم: آگ کے غبارے	۱۷۸۳ء میں دو بھائیوں نے جن کا نام جوزف مانٹ گالفر اور اٹینی مانٹ گالفر تھا اور جو ایک فرانسیسی کاغذ ساز کے بیٹے

تھے غباروں کا تجربہ کرنا شروع کیا۔ اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر ان کے دل میں خیال پیدا

ہوا تھا کہ ایک تھیلہ کو بھی اڑایا جا سکتا ہے اگر اس میں ہوا جیسی کوئی ہلکی چیز بھر دی جائے۔ بادلوں کو دیکھ کر غبارے میں دھوئیں کو بھرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے باپ کے کاغذوں سے ایک بڑا تھیلہ بنایا جس کا منھ پیندے میں کھلا رکھا اور اس کے نیچے پھونس کو جلا کر انھوں نے دھوآں پیدا کیا۔ جب دھوآں بلند ہوا اور تھیلا اس سے بھر گیا تو تھیلا بھی اس کے ساتھ بلند ہو گیا۔ اس سے دونوں بھائیوں کے اندر بہت جوش پیدا ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے کاغذ کا اور بڑا غبارہ بنایا جس کا گھیر ۱۱۰ فٹ کا تھا اور پہلے کی طرح اسے دوبارہ گرم ہوا سے بھرا۔ اپنے ان تجربوں سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے مقابلہ میں ہلکی ہوتی ہے۔ غبارہ دھوئیں کی وجہ سے جیسا ان کا پہلے خیال تھا بلند نہیں ہوتا بلکہ گرم ہوا کی وجہ سے بلند ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ جب پبلک کے سامنے انھوں نے اس بات کی نمائش کی تو ان کا غبارہ ۶ ہزار فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا اور جب اندر کی ہوا ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی تو آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ اس کامیابی کی وجہ سے لوگوں میں بہت جوش پیدا ہوا اور ان بھائیوں کا حوصلہ بڑھا کہ اس سے بھی بڑا غبارہ بنائیں تاکہ اس میں مسافروں کو لے جایا جا سکے۔ اپنے دوسرے غبارہ میں انھوں نے ایک چبوترہ سا بنایا اور اس پر ایک بھیڑ، ایک بطخ اور ایک مرغ کو بٹھا دیا۔ غبارہ بلند ہوا اور ہوا کے ساتھ ساتھ ایک میل تک بہتا رہا اور پھر ایک جنگل میں جا کر اترا۔ سوائے مرغ کے باقی کسی جانور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اس کو نقصان اس لئے پہنچا کہ بھیڑ نے اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد ترقی کی طرف دوسرا قدم غبارہ پر آدمیوں کو بٹھا کر اڑایا گیا۔ شاہ لوئی چہار دہم اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ آدمیوں کی زندگیوں کو اس تجربہ میں ضائع کیا جائے لیکن بعد میں اس نے فیصلہ کیا کہ ان آدمیوں کو جنھیں جیل میں موت کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ غبارہ میں بٹھا کر اڑایا جائے۔ اس بات کو سن کر ایک نوجوان پلاترے ڈی روزیر نے غصہ سے کہا اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ذلیل مجرموں کو ہوا میں پہلی بار اڑانے کا اعزاز

بخشا جائے۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا" اس کے بعد بادشاہ نے اپنا فیصلہ واپس لیا اور
روزیر کو پہلی پرواز کی اجازت دے دی۔ ایک رسی غبارہ سے باندھ دی گئی تاکہ وہ بہ کر دور نہ
نکل جائے۔ روزی ار چبوترہ پر بیٹھ گیا اور ۸۰ فٹ کی بلندی تک یعنی جتنی لانبی رسی تھی وہاں
تک پہنچ گیا۔ امریکہ کے موجد اور مدبر بنجامن فرینکلن نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اس
کے بعد روزی ار اور ایک دوسرے آدمی نے ایک آزاد غبارہ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ
زاید ایندھن اس غرض کے لئے گئے تاکہ ضرورت کے وقت غبارہ کے نیچے جو آگ رکھی
گئی تھی اس میں اضافہ کیا جا سکے۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اب وہ اتر رہے ہیں انھوں
نے آگ میں ایندھن رکھ دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بلند ہو گئے
ہیں تو انھوں نے ایک ڈوری کو کھینچ دیا جس سے تھیلہ میں ایک سوراخ کھل جاتا تھا اور گرم
ہوا باہر نکل جاتی تھی اور اس طرح پر خاصے فاصلے تک انھوں نے سفر کیا۔

دوسرا قدم: گیس کے غبارے | چونکہ مشتعل پھوس سے غبارہ میں آگ لگ جانے کا خطرہ رہتا
تھا اس لئے موجدوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ گرم ہوا کے علاوہ کسی اور دوسری ہلکی چیز کو
غبارہ میں بھرا جائے۔ اس غرض کے لئے ہائیڈروجن گیس کو جو معمولی ہوا سے ۱/۱۴ ہلکی ہوتی
ہے آزمایا گیا اور اس سے خوب کام چلا۔ تھیلے وارنش کئے ہوئے پتلے ریشم کے بنائے
گئے تاکہ کپڑے میں سے گیس نکل نہ سکے۔ پہلا مشاہدہ بارش کے طوفان میں کیا گیا۔ بارش
کے باوجود غبارہ تین ہزار فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا اور پون گھنٹہ تک ہوا میں رہا اور پھر
پندرہ میل دور ایک کھیت میں جا کر اترا۔ کھیت میں جو جاہل کسان کام کر رہے تھے انھیں
آسمان سے گری ہوئی اس عجیب و غریب چیز کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور انھوں نے
پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ آئندہ کے تجربوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بادشاہ
نے بذات خود اس بات کا حکم جاری کیا کہ بادلوں سے جو چیزیں گریں انھیں ہرگز ہاتھ نہ لگایا
جائے۔

گیس کے غباروں میں تیزی کے ساتھ اصلاح ہوتی رہی اور ۱۸۷۵ء میں ایک غبارہ نے انگلستان سے اڑکر بحر انگلستان کو عبور کیا اور فرانس میں پہنچ گیا۔ یہ سفر ایک فرانسیسی ہوا باز بلانچارڈ اور ایک امریکی ڈاکٹر جیفریز نے کیا جس نے گیارہ سال قبل بھی ہوا اور موسم کے حالات معلوم کرنے کے لئے لندن کے اوپر پرواز کی تھی۔ ان کا غبارہ کامیابی کے ساتھ اپنے وزن کے ساتھ ہوا میں اٹھا لیکن بحر انگلستان کے بیچ میں پہنچنے کے بعد وہ اتنا نیچے اتر گیا کہ ان دونوں کو اندیشہ ہوا کہ اب وہ سمندر میں گر پڑیں گے۔ اس لئے انھوں نے تمام وزنی چیزوں یعنی اپنی غذا، رسیوں اور بہت سے کپڑوں کو نیچے پھینک دیا۔ اس کی وجہ سے غبارہ کا بوجھ اتنا ہلکا ہو گیا کہ وہ پھر بلند ہو گیا اور آخر کار وہ فرانس کے ساحل پر پہنچ گئے یہاں انھوں نے ایک گرہ کھول کر ہوا کو تھیلہ میں سے آہستہ آہستہ نکلنے کا موقع دیا اور زمین پر اتر گئے جہاں ایک بڑے مجمع نے ان کا بہت پر جوش خیر مقدم کیا۔

جیسے جیسے غباروں میں اصلاح ہوتی رہی لوگ طویل سفر کرنے کے لئے باہم مقابلہ کرتے رہے ۱۸۳۶ء میں "ناسو کا بڑا غبارہ" جس میں بارہ مسافر تھے انگلستان سے جرمنی کی طرف بہایا گیا، اور اس نے تقریباً پانسو میل کی مسافت طے کی۔ سفر کا کچھ حصہ رات میں طے کیا گیا۔ لوگوں کے پاس کوئی روشنی نہیں تھی اور جہاز کی رہنمائی کے کسی اور طریقہ کا بھی انھیں علم حاصل نہیں تھا۔ وہ اس بات کا محض اندازہ کر سکتے تھے کہ ان کے نیچے زمین ہے یا پانی، کھیت ہیں یا شہر۔

ان پروازوں کی کامیابی سے لوگوں کے اس اعتقاد کو تقویت حاصل ہوئی کہ سمندروں کو غباروں کے ذریعہ عبور کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں ایک امریکی ہوا باز جان وائز نے بحر اوقیانوس کو عبور کرنے کی تیاری کے سلسلہ میں زمین پر ایک ہزار ایک سو بیس میل تک پرواز کی۔ لیکن اس زمانہ میں بحر اوقیانوس کو واقعی عبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد سے غباروں کی پرواز بہت سے پبلک تہواروں اور نمائشوں کے

موقعوں پر کی جانے لگی۔ سرکس والے لوگ آدمیوں کو ایسے غباروں پر چڑھانے لگے جنھیں رسیوں کے ذریعہ زمین سے باندھ دیا جاتا تھا۔ ورزشی جھولا جھولنے والے لوگ آزاد غباروں پر سوار ہو کر جاتے تھے اور جب تک مجمع کی نگاہ کے سامنے رہتے تھے اپنے کرتب دکھاتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے ایک کرتب دکھانے والے شخص نے ۱۶۰ دفعہ پرواز کی لیکن آخری دفعہ جھیل مشی گن کے ایک طوفان میں گھر جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اگرچہ غباروں کو قابو میں رکھنا مشکل تھا لیکن پھر بھی انھیں آہستہ آہستہ جنگ کے کاموں کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ ریاست متحدہ امریکہ میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں دشمنوں کے مورچوں کا پتہ چلانے کے لئے ہراول غباروں میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔

تیسرا قدم: انجن سے چلنے والے ہوائی جہاز | اس تمام مدت میں یعنی سنہ ۱۷۸۳ء سے انیسویں صدی کے وسط تک گول شکل کے غبارے ہوا کے بالکل رحم و کرم پر رہتے تھے اور ان کے رخ کو کسی خاص سمت میں پھیرنا یا چلانا ناممکن تھا۔ لوگوں نے بادبان، پتوار اور پیڈل والے پہیے لگا کر پرواز کی سمت کو قابو میں رکھنے کی کوششیں کیں لیکن اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔

لیکن اسی زمانے میں سڑکوں پر گاڑیوں کو پٹریوں پر ریلوں کو اور پانی پر کشتیوں کو چلانے کے لیے دخانی انجنوں کا استعمال شروع کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہوا بازوں نے سوچا کہ غباروں کو بھی کیوں نہ انجنوں سے چلایا جائے۔ بہت سے موجدوں نے انجن سے چلنے والے ہوائی جہازوں کے بنانے کی کوشش کی۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں ایک فرانسیسی انجینیر ہنری گفارڈ نے قوت متحرکہ سے چلنے والا ایک طاقتور انجن کا نقشہ سوچا اور اسے بنایا۔ اس کی شکل ہمارے موجودہ ہوائی جہازوں سے ملتی جلتی تھی یہ پہلا ہوائی جہاز تھا جس کی پرواز کی سمت کو قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ غبارہ کے نیچے جو لانبی گاڑی لٹکائی جاتی تھی اس میں گفارڈ نے ایک ایسا چھوٹا دخانی انجن رکھ دیا جو خاص کر ہوائی جہاز کے لئے ہی بنایا گیا تھا۔ اس تجربہ کو کامیاب سمجھا گیا کیونکہ غبارہ کی رفتار ساکت ہوا میں چار میل فی گھنٹہ تک ہو گئی۔

اس کے بعد اس انجن سے چلنے والے ہوائی جہازوں یعنی (" DIRIGIBLES ")
کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔ ان ہوائی جہازوں کو جہاز راں جہاز کے اندر سے بالکل اسی طرح چلا سکتا
تھا جیسے کہ ایک موٹر والا اپنی موٹر کو چلاتا ہے۔ لیکن ان میں کسی ہلکے اور طاقتور انجن کے
نہ ہونے کی وجہ سے اصلاح بہت آہستہ آہستہ ہو سکی۔ مگر گیس انجن کے بن جانے کے
بعد یہ وقت بھی رفع ہو گئی۔ جیسے ہی گیس انجن کو لایق استعمال بنایا گیا اور انھیں موٹروں کے
چلانے کے لئے استعمال کیا گیا موجدوں نے اسے ہوائی جہازوں میں بھی استعمال کرنا شروع
کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک برازیل کے رہنے والے شخص البرٹو سانٹوس ڈومانٹ نے جس
کا باپ فرانسیسی تھا، ایک ہوائی جہاز کو گیس موٹر سے چلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔
دخانی انجن کے مقابلہ میں گیس انجن نہ صرف یہ کہ ہلکا تھا بلکہ اس کے مقابلہ میں زیادہ
محفوظ بھی تھا۔ اس کی ایجاد کے بعد غبارہ میں جو ہائیڈروجن رہتی تھی اس نے دھماکے کے ساتھ
جلنے کا امکان بھی کم ہو گیا۔ غبارے کے تھیلوں میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اصلاح ہوتی
رہی۔ اب تھیلے میں کئی خانے رکھے جانے لگے اور ہر خانے کو دوسرے سے الگ رکھا
جانے لگا تاکہ اگر ایک میں سے ہوا رسنا شروع ہو جائے تو دوسرے تھیلوں کی ہوا غبارہ
کو بلند رکھ سکے۔ پھر جداگانہ تھیلوں اور بڑے تھیلے کے درمیان جس میں سب تھیلے رکھے
جاتے تھے ہوا کے لئے بھی جگہ چھوڑی جانے لگی۔ اس کی وجہ سے مختلف اونچائیوں پر ہوا
کے دباؤ کو یکساں رکھا جانے لگا۔ اس سے گیس کا نقصان بند اور مسافروں کی حفاظت
میں اضافہ ہو گیا۔

اسی زمانہ یعنی (تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء) میں جرمنی میں کاؤنٹ فرڈ ننیڈ واں زپیلین کی طرف
سے اور زیادہ اصلاحیں کی گئیں۔ کپڑے کے لچک جانے والے تھیلے کی جگہ ایک سخت
المونیم کا فریم بنایا گیا جس میں گیس کے جداگانہ تھیلوں کو رکھا جا سکتا تھا۔ اس دھات کے
فریم سے جو ہوائی جہاز بنائے جاتے تھے وہ زیادہ مضبوط ہوتے تھے اور آسانی سے

چلائے جا سکتے تھے۔ آج مسافروں کے لیے جن جہازوں کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے وہ اسی قسم کے جہاز ہیں۔

کاؤنٹ زیپلین نے جن ہوائی جہازوں (DARIGIBLES) کو بنایا تھا ان سب کی پروازیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ لیکن بعد میں یکے بعد دیگرے یہ سب طوفان میں تباہ ہو گئے۔ لیکن جرمن لوگوں کو ان تجربوں پر اعتقاد تھا اور انھوں نے نئے جہاز بنانے کے لیے ۱۵ لاکھ ڈالر چندہ اکٹھا کیا۔

جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنی نے مختلف قسم کے سو ہوائی جہاز بنائے۔ جنگ کے بعد اس نے دوسرے ملکوں کے لیے ہوائی جہاز بنانا شروع کر دیے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ بحر کے لیے جو جہاز جرمنی میں بنایا گیا تھا اس کا نام لاس انجلیز تھا۔ یہ جرمنی سے روانہ ہو کر نیو جرسی کی بیل ہرسٹ تک، جو ۵ ہزار میل سے زاید کی مسافت ہے ۸۰ گھنٹہ میں پہنچ گیا یعنی اس کی رفتار کا اوسط ۶۰ میل فی گھنٹہ رہا۔

حال میں ایک دوسری گیس یعنی ہیلیم کا پتہ چلا ہے کہ یہ ہوائی جہازوں کے لیے ہائیڈروجن سے زیادہ بہتر ہے اس گیس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ہائیڈروجن کی طرح آگ نہیں لگ سکتی۔ مگر یہ گیس بہت زیادہ لاگت کے بعد تیار ہوتی ہے اور صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں استعمال کے لیے کافی مقدار میں یہ گیس دستیاب ہو سکتی ہے۔

۲۔ ہوا سے زیادہ وزنی ایروپلینوں کی ایجاد :- جن ہوائی جہازوں کا اب تک ذکر کیا گیا ان کا نام ان کی نوعیت کے عین مطابق ہے کیونکہ یہ ہوائی جہاز ہوا میں اسی طرح تیرتے ہیں جیسے کشتیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ حتیٰ کہ موجودہ ہوائی جہازوں کے لیے بھی جن میں ٹھوس فریم لگا ہوتا ہے ہوا سے ہلکا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہوا میں بلند رہنے کے لیے ہوا سے ہلکا ہونا ضروری ہے۔ مگر ایروپلینوں کو جو ہوا سے بھاری ہوتے ہیں اپنی تیز رفتاری پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اگر کسی چیز کو ہوا میں تیزی کے ساتھ چلایا جائے گا تو اسے بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اس چیز کا مشاہدہ گتے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو ہوا میں تیر اکر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوا سے زیادہ وزنی مشینوں کے لئے تیز رفتاری نہایت لازمی چیز ہے۔ اس سے پہلے ہوا سے زیادہ بھاری مشینوں میں آدمی جو نہیں اڑ سکے اس کی وجہ یہی تھی کہ ایسے انجن موجود نہیں تھے جو ضروری تیز رفتاری پیدا کر سکیں۔

ہوا سے زیادہ وزنی بغیر انجن کی مشینیں یعنی گلائیڈرز

ابتدائی ایرپلین محض گلائیڈرز[1] ہوا کرتے تھے۔ ان میں انجن بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ان کی شکلیں بہت مختلف قسم کی ہوتی تھیں بعض کے بازو چمگادڑوں جیسے ہوتے تھے بعض کے بازو ہوا کو پکڑنے کے لئے مختلف زاویوں پر جھکے ہوئے ہوتے تھے۔ اڑنے والے کے جسم سے تسمہ کے ذریعہ گلائیڈروں کو باندھ دیا جاتا تھا اور گلائیڈروں میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی لیکن جب ہوا تیز چلتی تھی تو گلائیڈروں کی حرکت جلد ختم ہو جاتی تھی اور لوگ سو فٹ سے زیادہ بلند نہ ہو سکتے تھے۔

مگر غباروں کی طرح گلائیڈروں کا بھی لوگوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہوا میں بلند رہنے کے مسئلہ کی علمی تحقیقات کی۔ مثلاً انھوں نے اس بات کا نہایت ہشیاری سے مطالعہ کیا کہ چڑیاں کس طرح اڑتی ہیں اور انھوں نے اپنے گلائیڈروں کو اسی اصول کے مطابق پھر بنانا شروع کر دیا۔ ایک فرانسیسی ملاح نے جسے گلائیڈروں کے استعمال میں خاصی کامیابی ہوئی تھی اپنے گلائیڈروں کو قادوس (ایک بڑا دریائی پرندہ) کے بازوؤں کے نمونہ پر بنایا تھا۔

ابتدائی تجربہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ شہرت ایک جرمن آٹو لیلینتھل کو حاصل ہوئی۔ اس نے چڑیوں کے اڑنے کے بارے میں جو مشاہدے کئے تھے ان کے نتائج

---

[1] گلائیڈرز کے لفظی معنی ہیں سبک رفتاری سے گذرنے والا۔ اصطلاح میں بغیر انجن کے تھوڑی دور تک آہستہ آہستہ از خود اڑنے والی مشینوں کے لئے یہ نام استعمال کیا جاتا ہے۔

کو ایک کتاب میں جس کا نام "چڑیوں کی پرواز کو کس طرح ہوا بازی کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے" شائع کئے ہیں چڑیوں کی پرواز کے بارے میں جو علم اسے حاصل تھا اس سے اس نے گلائیڈروں کے تجربوں میں کام لیا اور ۱۸۹۱ء میں کامیابی کے ساتھ کئی دفعہ اڑا۔ لی لینتھل نے یہ معلوم کرکے کہ ہوا میں بازو والی مشینوں کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے انسانی علم میں بڑا زبردست اضافہ کیا۔ گلائیڈروں کو خاص سمتوں میں چلانا اور ان کو ایک سطح پر اس وقت رکھنا جب کہ ہوا ایک طرف کے مقابلہ میں دوسری طرف نہایت تیزی سے چل رہی ہو بہت مشکل تھا۔ لی لینتھل نے اپنے وزن کے بوجھ سے توازن کو قائم رکھنے میں بڑی مہارت پیدا کرلی تھی۔ جب ہوا گلائیڈر کی سطح سے ٹکراتی تھی تو وہ مڑکر اور بل کھاکر اپنے وزن کا بوجھ ہوا کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ڈالتا رہتا تھا۔ لی لینتھل بہت سے سالوں تک لگاتار کام کرتا رہا اور ہوا کے بارے میں نئے نئے واقعات معلوم کرتا اور اپنے گلائیڈروں کی اصلاح کرتا رہا اور ہر دفعہ اس کی پرواز پہلے کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتی رہی۔ مگر ایک دن جب وہ گھمانے کی ایک ایجاد کی آزمائش کررہا تھا گلائیڈر پر اس کا قابو نہیں رہا وہ گر پڑا اور مرگیا یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اگر وہ زیادہ زندہ رہتا تو وہ موٹروں کی آزمائش کرتا اور انجن سے چلنے والے پہلے ایرپلین کے بنانے میں کامیاب ہوجاتا۔ لیکن لی لینتھل نے ایک ابتدائی مشکل کام انجام تک پہنچادیا تھا یعنی اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ ایرپلین کو جب ہوا زور سے چل رہی ہو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

گلائیڈروں کو انجن سے چلانے کی ایجاد

لی لینتھل کے تجربوں سے پچاس سال پہلے موجدوں نے چھوٹے دخانی انجنوں سے اڑنے والی مشینوں کو چلانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً ۱۸۴۲ء میں ہنسن نامی ایک انگریز نے دخانی ایرپلین کا ایک نمونہ تیار کیا۔ اس کی شکل آج کل کے ایک بازو والے ایرپلین سے ملتی جلتی تھی۔ پبلک کی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے ہنسن کو چندہ کے ذریعہ روپیہ نہیں ملا اور وہ اپنے تجربوں کو جاری نہیں رکھ سکا۔ ۱۸۴۸ء میں ایک اور انگریز نے ایک انجن سے چلنے والا نمونہ تیار کیا۔ اس نمونہ کو جو زمین سے تھوڑے فاصلہ تک

بلند ہونے میں واقعی کامیاب ہوا تھا مصور لیونارڈو ڈا ونسی کے نقشہ کے مطابق بنایا گیا تھا سی ۔ اے ۔ پارسنس نے بھی جو دخانی ٹربائن کا موجد ہے ایک بازو والا ایک ایرپلین بنایا تھا جس کے بازو اس سرے سے اس سرے تک گیارہ فٹ لانبے تھے ۔ اس کے چلانے کے لئے اس نے بائلر اور دخانی انجن کا استعمال کیا تھا ۔ اگرچہ یہ دخانی انجن ہوائی جہاز کے لئے بہت وزنی تھا لیکن پھر بھی پارسن کے نمونہ کا جہاز ہوا میں سوگز تک ٹھیرا رہا ۔

اسی دوران میں گیس انجن کی بھی ایجاد ہو گئی ۔ ۱۸۹۲ء میں موٹروں میں گیس انجن کا استعمال کیا جانے لگا اور ۱۸۹۵ء میں ایرپلین میں اس کا استعمال شروع کر دیا گیا ۔ سیموئل پی لینگ لے ، آرول رائٹ اور ولبر رائٹ ان تجربوں کی رہنمائی کر رہے تھے ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ جنگ نے ہوائی جہازوں کو جنگ میں استعمال کرنے کے امکانات دیکھ کر لینگ لے کی امداد کی ۔ محکمہ جنگ کی طرف سے لینگ لے اور اس کے مددگاروں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں آدمیوں کے لے جانے والے اور انجن سے چلنے والے مضبوط ہوائی جہاز بنانے کے لئے روپیہ دیا گیا ۔ ان دونوں نے اپنے مطلب کے مطابق خاص قسم کا ایک چھوٹا اور ہلکا گیس انجن بنایا ۔ انھوں نے اپنی ایرپلین میں اسٹیرنگ وہیل لگایا جس سے اس کو قابو میں رکھنا آسان ہو گیا ۔

۱۹۰۳ء کے موسم خزاں تک ہر چیز آزمائش کے لئے تیار ہو گئی ۔ دو آزمائشیں کی گئیں اور لینگ لے کے مددگار نے مشینوں کو چلایا لیکن دونوں مرتبہ کوئی نہ کوئی چیز بگڑ گئی اور مشین بلند ہونے سے قاصر رہی اپنی ناکامی سے مایوس ہو کر لینگ لے نے اپنے تجربوں کو ترک کر دیا اور اس کے چند روز بعد اس کا انتقال ہو گیا ۔ باوجود اس کے کہ اس کی مشین کام نہ کر سکا لیکن پھر بھی اسے "ہوا بازی کے باپ" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے ۔

آخرکار ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو کامیابی بھی حاصل ہو گئی ۔ لینگ لے کی مشین کی ناکامی کے کچھ عرصہ بعد آرول اور ولبر رائٹ نے آدمیوں کے لے جانے والے جہاز میں پہلی دفعہ مسلسل پرواز کی

۵۹ سکنڈ تک (اور یہ مدت ایسی تھی جس کا لوگ خواب میں بھی حوصلہ نہیں کر سکتے تھے) ان کی ہوا سے بھاری مشین زمین سے اٹھی رہی اور ۲۶۰ گز کی مسافت اس نے طے کی۔

برائٹ برادران کے اس کارنامے سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ عملی کامیابی کے لئے استدائہ علمی مطالعہ اور ہوشیاری کے ساتھ تجربہ کرنا بہت ضروری ہے۔ کچھ عرصہ تک برائٹ برادران اپنی کامیاب پرواز کے لئے تیاریاں کرتے رہے۔ انھوں نے گلائیڈروں کے ذریعہ تجربے کیے اور ایرپلینوں پر ہوا کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اپنے آپ کو عادی بنایا۔ ہوا اور موسم کے جو مطالعے شائع کئے جا چکے تھے صرف ان سے ہی انھوں نے نہیں سیکھا بلکہ ایرپلین کے نمونوں پر ہوا کا جو اثر ہوتا تھا اس کے بھی انھوں نے ذاتی طور پر تجربے کئے مثلاً انھوں نے ایک چھوٹی "ہوا کی سرنگ" بنائی جو چھ فٹ لانبی اور سولہ انچ گول لکڑی کی نالی تھی۔ اس سرنگ میں انھوں نے ہوا کو ایک گھومنے والے پنکھے کے ذریعہ سے چلایا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جہازوں پر جن کے بازو مختلف چیزوں سے اور مختلف وضع کے بنے ہوئے تھے ہوا کے دباؤ کا مطالعہ کیا۔ آج بھی اگرچہ ایرپلینوں کی تعمیر کے بارے میں بہت کچھ دریافت کیا جا چکا ہے لیکن پھر بھی تجربہ کی ہوائی سرنگیں ایرپلینوں کو آزمانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ رائٹ برادران ہماری عزت کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ پہلے اشخاص تھے جنھوں نے ہوائی جہازوں کے کاموں کا مطالعہ ظن و تخمین پر بھروسہ کرنے کی جگہ علمی طریقہ پر کیا۔

رائٹ برادران نے نہ صرف گلائیڈروں پر تجربہ کرنے اور ہوا کی لہروں میں بازوؤں پر قابو رکھنے میں کئی سال صرف کئے بلکہ انھوں نے مناسب سائز اور قوت کے گیس انجن کو بھی ایجاد کیا۔ ایرپلین کے موٹر بنانا انھوں نے اس خوبی کے ساتھ سیکھ لیا تھا کہ آج بھی رائٹ موٹروں کا استعمال بہت عام ہے۔ جب ایرپلین میں کرنل چارلس۔ اے۔ لنڈبرگ ۱۹۲۷ء میں امریکہ سے پیرس اڑ کر گئے تھے اس میں بھی رائٹ کا موٹر لگا ہوا تھا۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۰۳ء کی پہلی کامیابی کے بعد رائٹ برادران نے اپنے تجربوں کو جاری رکھا اور اپنے موٹروں اور مشین کے مختلف حصوں میں برابر اصلاح کرتے رہے ۱۹۰۵ء تک رائٹ کے ایرپلین ایسے ہوگئے کہ انھیں ایک گھنٹہ سے زیادہ تک ہوا میں بلند رکھا جا سکتا تھا۔ یورپ کے ملکوں نے رائٹ برادروں کی قدر و عظمت کو فوراً تسلیم کرلیا۔ وہ یورپ کے بہت سے ملکوں میں اپنے ایرپلینوں کا تعارف کراتے اور ان کی نمائش کرتے رہے۔ فرانس میں خاص طور پر ہوابازی میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور فرانس کے کئی شہروں میں رائٹ برادران کے ورود سے دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

۱۹۰۶ء میں سانٹوس ڈومنٹ نے جو ۱۹۰۱ء تک DIRIGIBLES کا کامیاب ترین بنانے والا سمجھا جاتا تھا انجن والے ایرپلین پر سب سے پہلا سرکاری طور پر مستند یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ایک دوسرے فرانسیسی لوئی بلیریو نے انجن سے چلنے والے ایرپلین پر رودبار انگلستان کو عبور کیا۔ اس کو ایک بہت بڑا واقعہ سمجھا گیا۔ بہت سے لوگوں کو اس بات میں شبہ تھا کہ ایرپلین کے ذریعہ انگلستان کے رودبار کو عبور بھی کیا جا سکتا ہے حالانکہ ایک غبارہ کے ذریعہ یہ کام کیا جا چکا تھا۔

ریاست ہائے امریکہ کے لوگوں نے بھی آہستہ آہستہ ہوابازی کو قبول کرلیا۔ ۱۹۱۰ء میں گلین کرٹس نے سب سے پہلا پانی اور خشکی دونوں میں اترنے اور چڑھنے والا ایرپلین ایجاد کیا۔ اس کے جہاز میں پہیوں کی جگہ کشتی کی طرح پھسلنے والے بیلن (RUNNERS) لگائے گئے تھے۔ کرٹس کی اس کامیابی کو دیکھ کر موجدوں نے ایسے ایرپلین ایجاد کئے جو ہوا اور پانی دونوں پر اتر سکتے تھے۔ ایسے ہوائی جہازوں کو "جل بھومی" جہازوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پھر بھی بہت سے آدمی ہوائی جہازوں کی طرف سے کچھ بدظن سے ہی رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۱ء تک امریکہ میں صرف ۲۵ لائسنس دار ہواباز موجود تھے۔ فرانس میں اسی زمانہ

میں ۲۵۳ لائسنس دار ہواباز تھے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوابازوں کی تعداد امریکہ سے زیادہ تھی۔ امریکہ میں ایرپلینوں کو ابھی تک ایک عجوبہ چیز سمجھا جاتا تھا اور ان کو غباروں کی طرح صرف سرکسوں اور دیہات کی نمائشوں میں دکھایا جایا کرتا تھا۔

جنگ عظیم میں ہوائی جہازوں کی ترقی اس کے بعد ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ہوا کا سفر چار بڑے ذرائع نقل و حمل میں سے ایک ہوگیا۔ جنگ کی ابتدا میں بڑے ملکوں میں سے کسی کے پاس بھی بہت سے ہوائی جہاز نہیں تھے۔ لیکن جنگ کے اختتام کے وقت ہزاروں مکمل جہاز اور تربیت یافتہ جہاز راں موجود تھے۔ کم دام کے ایرپلینوں کو کثیر تعداد میں پیدا کرنے کی جب مانگ ہوئی تو اس کے جواب میں انجنیروں اور سائنس دانوں نے ان کو بہت بہتر بنا دیا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ کثیر مقدار میں ایرپلینوں کو اسی صورت میں بنایا جا سکتا ہے کہ ان کی مشینیں سادہ ہوں اور ان کے مختلف حصے معیاری وضع پر ڈھالے جائیں۔ دوسری مشین کی صنعتوں میں جو بات پہلے ہوچکی تھی وہی بات ہوا بازی میں بھی ہوئی یعنی کام کی تخصیص اور مشین کے معیاری وضع کے ہونے کو یہاں بھی رواج دیا گیا۔ ترقی جس طرح ہوئی اس کی وضاحت ذیل کی مثال سے ہوسکے گی:-

جب امریکہ ۱۹۱۷ء میں جنگ میں شریک ہوا تو محکمہ فوج نے ۳ ہزار ایرپلین کے تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس منصوبہ میں فوراً تبدیلی کرنا پڑی اور اٹھارہ مہینہ کے اندر اندر ۱۵ ہزار ایرپلین تیار ہوگئے جن کے چلانے کے لئے موٹر لگے ہوئے تھے۔ اس بڑے پیمانہ پر ایرپلینوں کے تیار کرنے میں جس چیز سے سب سے زیادہ مدد ملی وہ معیاری موٹر تھے یعنی ایسے موٹر جن کے حصے معیاری شکل اور وضع کے تھے۔ اس کا نام لبرٹی موٹر رکھا گیا تھا۔ ان کی تکمیل بہت سے ہوائی انجنیروں نے مل کر کی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اتحادیوں کے جتنے ایرپلین دشمنوں سے یورپ میں لڑ رہے تھے سب میں اسی موٹر کو لگا دیا گیا۔

جنگ عظیم کا ہوابازی پر ایک اور دوسرا اہم اثر بھی ہوا۔ اس کی وجہ سے بہت سے

نوجوان اور ذہین آدمیوں نے تربیت حاصل کر لی اور جب جنگ ختم ہوئی تو ایرپلینوں کے چلانے والے ہزاروں ماہر موجود تھے ان میں سے بہت سے تو ہوائی ڈاک کے محکمہ میں ملازم ہو گئے لیکن باقی لوگوں کو تجارتی فضائی نقل و حمل کے کام میں لگنا پڑا۔ اس کے علاوہ بہت سے فوجی ہوائی جہاز نجی طور پر لوگوں نے تفریح یا تجارت کرنے کے لئے خرید لئے۔

غرضکہ اس طرح ہوا رانی سے لوگوں کو عام طور پر دلچسپی پیدا ہو گئی۔ محکمہ جنگلات نے اپنے پریخبروں کے لئے انھیں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ محکمہ زراعت نے ان علاقوں میں جہاں فصلیں اور درخت وبائی امراض میں مبتلا ہو جاتے تھے ان کے ذریعہ دواؤں کو چھڑکنا شروع کر دیا۔ ساحل کے محافظوں نے انھیں پیٹرول کے لئے اور انجنیروں نے انھیں پیمائش اور ملک کی نقشہ کشی کے لئے استعمال کیا۔ مٹری ال آلوجی کے محکمہ والوں نے ان کے ذریعہ موسم اور ہواؤں کی رپورٹیں حاصل کرنا شروع کیں۔ سرکاری ملازموں نے ان سے فاقہ زدہ چڑیوں کو غذا پہنچائی اور منطقہ بارد کے ہرن ڈیروں کو گھیرا۔ ہیرے کی جو نئی کانیں دریافت ہوئی تھیں ان سے فائدہ کی امید رکھنے والے حریفوں نے اس تیز رفتار ذریعہ نقل و حمل کا استعمال کر کے اس علاقہ میں جلد پہنچ جانے کے لئے مقابلہ کی دوڑ کی۔ لوگوں کو دریاؤں کے سیلاب اور پہاڑوں کی برف سے اس کی معرفت نجات دلائی گئی۔ جو سائنس داں دبے ہوئے شہروں کو ڈھونڈھ رہے تھے انھوں نے ان کا محل وقوع کو ایرپلین کے ذریعہ زمین کی سطح کی غیر معمولی شکل و شباہت کو بڑی اونچائی سے مشاہدہ کر کے معلوم کیا۔

ہوائی راستے اور ہوائی جہازوں کے اسٹیشن | ہوائی جہازوں کے لئے اچھے نشان کئے ہوئے راستوں اور آسان اترنے کی جگہوں کی ضرورت ہے اور جب رات کو پرواز کی جائے تو ان راستوں کو روشن رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے ایسی روشنیاں ایجاد کی گئی ہیں جو کہرے اور طوفان کے درمیان بھی چمکتی رہتی ہیں اور ایرپلینوں اور ہوائی جہازوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔

آیئے ایک ہوائی ڈاک گاڑی کے سفر کا رات کے وقت مشاہدہ کریں۔ جہاں سے ایرپلین روانہ ہوتا ہے وہ میدان بہت روشن ہوتا ہے۔ دوڑنے کے لئے جو راستہ بنا ہوتا ہے وہ بھی بہت روشن رکھا جاتا ہے تاکہ ایرپلین چلانے والا آسانی سے اپنی گاڑی کو دوڑا کر پرواز کر سکے۔ دوسری منزل کا راستہ بتانے کے لئے روشنیاں لگی رہتی ہیں جس کی وجہ سے ایرپلین جب تک خشکی پر اڑتا رہتا ہے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر کوئی خرابی واقع ہوگی تو ہنگامی ضرورتوں کے لئے ایسے میدان موجود ہیں جہاں وہ اتر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے راستہ کے بیشتر حصہ کا انتخاب نہایت ہوشیاری اور خبرداری کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کے باقاعدہ نقشے بنا دیے گئے ہیں۔ یہ راستہ خاصی ہموار زمین پر رکھا جاتا ہے جہاں اترنا مشکل نہیں ہوتا۔ جب آدمی پہاڑ پر پہنچتا ہے تو وہاں اور زیادہ اترنے کی جگہیں بنائی جاتی ہیں اور رہنمائی کرنے والی روشنیاں اور زیادہ قریب قریب نظر آنے لگتی ہیں۔ بعض بڑی روشنیوں میں پچاس کروڑ موم بتیوں کی قوت ہوتی ہے۔ یہ روشنیاں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ ان کی شعاعوں کو ایک سو پچاس میل کے فاصلہ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی روشنیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے دس میل دور ہوتی ہیں۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک کا پورا راستہ روشن ہوتا ہے تاکہ رات کو ہوائی ڈاک حفاظت کے ساتھ لے جائی جا سکے۔ اگر موٹر کی سڑکوں کا مقابلہ ہوائی راستوں سے کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک حد تک متوازی چلتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بڑے شہروں کو جس طرح اور دوسرے وسائل آمد و رفت کے ذریعہ ایک دوسرے سے متحد کیا جاتا ہے اسی طرح ہوائی راستہ کے ذریعہ بھی متحد کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں ایرپلینوں کے اترنے کی جگہوں کو بڑے شہروں سے دور بنایا جاتا تھا کیونکہ اس کو زیادہ محفوظ سمجھا جاتا تھا لیکن اب نئے ہوائی اسٹیشن شہروں سے قریب بنائے جانے لگے ہیں۔ جو کاروباری آدمی ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنے کے لئے

ایرپلین کا استعمال کرتے ہیں وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اپنی منزل مقصود پر جس قدر جلد ممکن ہو سکے پہنچ جائیں۔ بہت سے بڑے شہروں میں جس طرح کئی ریلوے اسٹیشن ہوتے ہیں ایسے ہی ہوائی جہازوں کے اترنے کی بھی کئی جگہیں ہوتی ہیں۔ ان میدانوں میں نہ صرف ایرپلینوں کے اترنے کی سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ مسافروں کے آرام کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

یہ ہوائی اسٹیشن راستہ کو صرف روشن ہی نہیں رکھتے بلکہ ریڈیو کے ذریعہ ہوا رانوں کو ہدایت بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہر ایک ایرپلین میں ایک ریڈیو کا ریسیور لگا ہوتا ہے۔ یہ ایک نازک اوزار ہوتا ہے جس میں وہ اشارے درج ہو جاتے ہیں جو ہوائی اسٹیشن سے ریڈیو کے ذریعہ روانہ کئے جاتے ہیں۔ ان اشاروں سے ہوا ران کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے یا اس نے داہنے یا بائیں طرف اپنے ایرپلین کو زیادہ موڑ دیا ہے۔

یہ ہوائی اسٹیشن موسم کے بارے میں بھی جدید ترین اطلاعیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کو معلوم کرکے ہواران اکثر صورتوں میں جس سمت میں اس کا ایرپلین جا رہا ہے اسے بدل کر طوفانوں سے بچ سکتا ہے۔ بہت سے اسٹیشنوں میں روشنی کے تیر لگے ہوتے ہیں جن سے ہوا کی سمت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایرپلین اور ہوائی جہاز ہوا اور موسم کے اتنے ہی پابند ہوتے ہیں جیسے سمندر کے بادبانی جہاز اور ہوارانی کے لئے مہارت اور مناسب اوزاروں کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی سمندر میں جہازرانی کے لئے ہوتی ہے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ تک تیزی کے ساتھ سفر کرنے کے لئے ایرپلینوں کو آج اسی طرح کرایہ پر لیا جا سکتا ہے جیسے کہ موٹر گاڑی کو لیا جاتا ہے لیکن مسافروں کے واسطے مقررہ اوقات پر چلنے والی ہوا گاڑیاں بھی ہوائی ڈاک گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں امریکہ میں جن راستوں پر باقاعدہ ہوارانی کی جاتی تھی ان کا فاصلہ ۱۲ ہزار میل تھا اور اسی سال ہوائی اسٹیشنوں کی مجموعی تعداد تین ہزار آٹھ سو چھ تھی۔

امریکہ کے موجودہ ہوائی راستوں کی پیمائش کرنے کے لئے کرنل چارلس اے لنڈبرگ نے ۲۲ ہزار ۳۵۰ میل اور ۸۲ شہروں کا ہوائی سفر کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پڑوس میں جو اور ملک آباد ہیں ان کا سفر اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس نے واشنگٹن سے شہر میکسیکو تک جو ۲ ہزار میل کا فاصلہ ہے بغیر رکے ہوئے سفر کیا۔ اس کے بعد پھر وہ گوآٹی مالا، برطانوی ہونڈراس، ال سالوادور، ہونڈراس، نکاراگوا، کوسٹاریکا، پناما، کولمبیا اور دنی زویلا گیا اور جزائر ورجن، پیورٹوریکو، سانٹوڈومنگو، ہیتی اور کیوبا کے راستے سے ہوتا ہوا واپس آیا۔ یورپ کے جنوبی امریکہ کے ساتھ ہوائی تعلقات قائم ہو گئے ہیں اور امریکہ بھی اس براعظم کے ساتھ ہوائی ڈاک اور تجارت کے تعلقات شروع کر چکا ہے۔

مشہور پروازیں پرواز کے ریکارڈ نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے اس سے ہوائی کی ترقی کی تیزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک بغیر کہیں رکے ہوئے خشکی کے سیدھے راستے سے ہوائی سفر کرنے میں ۴۹ دن لگتے تھے جس ہوائی گاڑی میں سفر کیا گیا تھا اس کا انجن بہت مختصر تھا کئی جگہ انجن ٹوٹا اور ایندھن اور مرمت کے لئے بھی کئی جگہ اترنا پڑا۔ لیکن اس سے تیرہ سال بعد ہوائی گاڑی سے براعظم کو عبور کرنے کے لئے صرف ۲۱ گھنٹے اور ۴۸ منٹ صرف ہوئے۔ اس چھوٹی سی مدت میں انجنوں کا سائز اور ان کی اہلیت کارکردگی دس گنا بڑھ گئی۔ اس کے بعد بھی ہر سال پرواز کے اس ریکارڈ میں اور زیادہ ترقی ہوتی رہی ہے۔

اس کے علاوہ اسی زمانہ میں کچھ لوگ بحر اٹلانٹک کو عبور کرنے کی جرأت آزما کوششیں بھی کر رہے تھے۔ مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں امریکہ کے محکمہ بحری کی ایک ہوائی کشتی نے جس کا نام این۔ سی۔ ۴ تھا پانچ آدمیوں کے ساتھ کئی جگہ رک کر بحر اٹلانٹک کو عبور کر لیا۔ پہلی پرواز شہر نیویارک سے ہیلی فیکس تک کی گئی دوسری ہیلی فیکس سے جزائر ازورس تک اور پھر جزائر ازورس

سے لبسن (پرتگال) تک۔ اور یوں دخانی جہاز کے اٹلانٹک کو عبور کرنے کے ٹھیک ایک صدی بعد ایرپلین سے بھی بحر اٹلانٹک کو عبور کر لیا گیا۔ اس کے صرف ایک مہینہ بعد ۱۴؍ جون ۱۹۱۹ء کو دو انگریزوں نے بحر اٹلانٹک کو پہلی مرتبہ بغیر کہیں رکے ہوئے عبور کر لیا۔ ان کا سفر نیوفاؤنڈلینڈ سے آئرلینڈ تک جو ۲۰۰۰ میل کا فاصلہ ہے سولہ گھنٹے کے اندر پورا ہوا۔

یہ تمام پروازیں ہوا سے بھاری مشینوں میں کی گئی تھیں۔ اسی اثنا میں ہمت والے لوگ ہوا سے ہلکی مشینوں میں بھی لانبی پروازیں کر رہے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے ایک DIRIGIBLE نے اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) سے شہر نیویارک تک بغیر کہیں رکے سفر کیا اور تھوڑے عرصہ بعد حفاظت کے ساتھ گھر واپس آگیا۔ ۱۹۲۸ء کی خزاں میں گراف زیپلین نے جس میں بیس مسافر سوار تھے بغیر رکے ہوئے مسلسل سفر جرمنی سے شہر نیویارک تک کیا۔ اس نے طویل جنوبی راستہ کو اختیار کیا جو اسپین، ازورس اور جزائر بہاما سے گذرتا ہے اور جس کا فاصلہ ۶ ہزار میل ہے یہ سفر ۱۱۲ گھنٹہ میں پورا ہوا۔

اس کے بعد اور دوسرے مہم پسند ہوا باز ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ قائم کرتے رہے ۱۹۲۴ء میں تمام دنیا کے گرد یعنی ۲۶ ہزار میل کی پرواز ریاست ہائے متحدہ کے محکمہ فوج کے کچھ ہوابازوں نے ۱۵ دن میں کی ۱۹۲۶ء میں ایرپلین اور ہوائی جہاز دونوں کے بارے میں یہ بات ثابت کر دی گئی کہ انھیں منطقات بارده میں بھی چلایا جا سکتا ہے کمانڈر رچرڈ برڈ اور اس کے مددگار فلائیڈ بنٹ نے اسپٹس برگن سے قطب شمالی تک اور وہاں سے واپس ایک ایرپلین میں سفر کیا اس کو ایک مہینہ بعد ایمنڈسین۔ ایلس ورتھ۔ نوبائل کی مہم والوں نے غبارہ جہاز نورگے (NORGE) کے ذریعہ اسپٹس برگن سے چل کر قطب شمالی سے ہوتے ہوئے الاسکا تک پرواز کی۔ اس کے دو سال بعد کمانڈر برڈ نے بہت مکمل تیاری کے بعد اور علمی حساب اور نقشہ کے مطابق جنوبی قطب کے گرد جو لامعلوم زمین ہے اس کے دریافت کرنے کے لئے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم میں ایرپلین سے بہت

زیادہ کام لیا گیا۔

لیکن جس پرواز کا سب سے زیادہ چرچا ہوا وہ ۲۰ اور ۲۱ مئی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ نوجوان چارلس اے۔ لنڈبرگ نے جو پہلے ایک ڈاک کے ہوائی جہاز میں ہواباز کی حیثیت سے کام کرتا تھا تن تنہا نیویارک سے پیرس تک جو ۳ ہزار ۶۱۰ میل کا فاصلہ ہے ۳۳½ گھنٹوں میں سفر کیا۔ لنڈبرگ کو یہ نمایاں کامیابی محض اپنی ذاتی جرأت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ پرواز میں اپنی غیر معمولی مہارت اور اپنی پرواز کی پوری تفصیلات کو پہلے سے سوچنے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ کمانڈر برڈ اور دوسرے ریکارڈ قائم کرنے والوں کی کامیابی کی طرح لنڈبرگ کی کامیابی سے بھی لیونارڈو ڈاونسی کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوئی کہ "پرواز میں کامیابی صرف ریاضی کے ذریعہ حاصل ہو سکے گی" ریاضی سے لیونارڈو کا مفہوم یہ تھا کہ ہوشیاری کے ساتھ عملی طور پر تمام باتوں پر پہلے سے غور و فکر کرنے کے بعد۔

اس کے بعد سے ہر سال برداشت، اونچائی تک پہنچنے اور تیز رفتاری کو حاصل کرنے کے ریکارڈ برابر ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک فرانسیسی افسر لفٹننٹ چیمپین نے سمندر کی سطح سے سات میل کی بلندی تک یعنی مونٹ ایورسٹ کی اونچائی سے جو دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے ۹ ہزار فٹ زیادہ اونچے تک پرواز کی جس طرح بلندی تک چڑھنے کا رکارڈ قائم کیا گیا تھا اسی طرح برداشت کا ریکارڈ بھی قائم کیا گیا۔ یکم جنوری سے ۷ جنوری ۱۹۲۹ء تک ریاستہائے متحدہ امریکہ کے فوج کا ایک ایرپلین جس کا نام "سوالیہ نشان" تھا ہوا میں ہی دوبارہ ایندھن بھر بھر کر ۱۵۰ گھنٹہ ۴۰ منٹ اور ۱۴ سکنڈ تک مسلسل ہوا میں بلند رہا۔ اس کا مقابلہ جب آرول اور ولبر رائٹ کی پرواز سے کیا جاتا ہے جو ۱۹۰۳ء میں صرف ۵۹ سکنڈ تک کی گئی تھی تو اس وقت ترقی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ تیز رفتاری میں ایرپلینوں نے اور بھی زبردست رکارڈ قائم کر دئے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں ۲۸۴٫۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار کا رکارڈ قائم کیا گیا تھا اس کے بعد رفتار سوا تین سو میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔

ہم آج کل تیز رفتاری کے دور میں زندگی گذار رہے ہیں۔ زمین، پانی اور ہوا ہر جگہ تیز رفتاری کو حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ذیل میں تیز رفتاری کے چند رکارڈوں کو جو ۱۹۲۷ء تک قائم کیے گئے تھے درج کیا جاتا ہے:۔

آدمی کی دوڑ	۲۱ میل فی گھنٹہ
گھوڑے کی دوڑ	۳۹ 〃
بائیسکل کی دوڑ	۵۷ 〃
غبارہ والے ہوائی جہاز کی دوڑ	۸۱ 〃
موٹر کشتی کی دوڑ	۹۳ 〃
موٹر سائیکل کی دوڑ	۱۱۲ 〃
ریلوے ٹرین کی دوڑ	۱۲۰ 〃
موٹر کار کی دوڑ	۲۳۱ 〃
ایرپلین کی دوڑ	۲۸۲ 〃

اس فہرست میں جو رکارڈ درج کیا گیا ہے اس کے بعد بھی اور زیادہ ترقیاں ہو چکی ہیں اور آئندہ ہوتی رہیں گی۔ لیکن ہمارے ملک ہندوستان کی ۹۹ فی صدی آبادی اب بھی ان ہی بیل گاڑیوں پر بہت کچھ انحصار کرتی ہے جن کی اوسط رفتار فی گھنٹہ غالباً دو تین میل سے زیادہ نہیں ہے!

دُنیا کی رفتار

ممالکِ غیر

ہر ہٹلر اپنی تقریروں میں اکثر پارلیمنٹوں میں بیٹھنے والے نکموں کا بڑی حقارت سے ذکر کرتے ہیں اور ان کے اور سنور مسولینی کے پیرو بڑے فخر کے ساتھ اپنے حاکموں کا جو ہر معاملے کا کھٹ سے فیصلہ کر دیتے ہیں اس جمہوری طریقے سے مقابلہ کرتے ہیں کہ جس میں ہر معاملہ شیطان کی آنت بن جاتا ہے، کبھی کوئی بات طے نہیں ہوتی اور فیصلہ کرنے کی ذمے داری ایک خوب صورت مگر بہت ہی بھاری تاج پر ہوتی ہے کہ جسے کسی کو اپنے سر پر رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جمہوریت کے قدر دان اس کے جواب میں ہر ہٹلر پر تہمت لگاتے ہیں کہ انھیں خود فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں وہ صرف دوسروں کے فیصلہ کو اپنا لیتے ہیں اور جمہوری حکومتوں کی سستی کا جب ذکر آتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ سستی نہیں سوچ سمجھ کر کام کرنے کی کوشش ہے جو ان لوگوں کو جو شخصی آزادی اور جمہوریت کے آداب کی قدر نہیں پہنچانتے انتہا پسند اور جلد باز ہیں سستی اور ٹال مٹول معلوم ہوتی ہے۔

شخصی اور جمہوری حکومتوں کے عیبوں اور خوبیوں کی بحث تو سینکڑوں برس سے جاری ہے اور ہم شاید کبھی اس کا فیصلہ نہ کر پائیں گے کہ ان دونوں میں سے کس میں عیب کم ہیں یا خوبیاں زیادہ ہیں اتنی بات ضرور ہے کہ بادشاہ یا ڈکٹیٹر کسی بڑے معاملہ میں فیصلہ نہ کر پائیں تو سب اس کے کفنانے دفنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور جمہوری حکومت فیصلہ کرنے میں جتنی دیر لگائے اتنی ہی اس کی شان بڑھ جاتی ہے، ہر ہٹلر کی فلسطین پر حکومت ہوتی تو نا ممکن تھا کہ عرب اپنی جگہ پر بغاوت اور ہر ہٹلر حکومت کرتے رہتے۔ برطانیہ کی جمہوری حکومت تین برس

تک فلسطین کے مسئلے پر غور کر رہی ہے اور اگر فلسطین میں امن نہیں ہے تو اس سے برطانیہ کی شان میں کوئی فرق بھی نہیں آیا ہے بلکہ کہنے والا اس مثال کو سامنے رکھ کر یہاں تک کہہ سکتا ہے کہ جمہوری طریقے میں وہ برکت ہے کہ حکومت اور بغاوت بھی دودھ اور شکر کی طرح مل جاتے ہیں بادشاہ یا ڈکٹیٹر کو آخری اور قطعی فیصلہ کرنے کا جو اختیار رہے وہ سمجھئے ایک ننگی تلوار ہے کہ جس سے کام نہ لیا جائے تو اس میں زنگ لگ جاتا ہے۔ جمہوریت ایسے خطرناک ہتھیار رکھتی ہی نہیں اور پیسنا اور چھاننا ایسے کام ہیں کہ جو ہر چیز کے ہوا ہو جانے تک جاری رہ سکتے ہیں پھر ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ پیسنے اور چھاننے والے جتنی مستعدی دکھائیں اتنے ہی وہ محفوظ ہوجاتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف ایک ہلکا سا غبار چھا جاتا ہے اور اگر کوئی اعتراض کرنے والا ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے تو وہ آنکھیں ملتے ملتے اور چھینکتے چھینکتے حیران ہو جاتا ہے کہ منھ سے بات بھی نہیں نکلتی۔ فلسطین کے معاملے نے جمہوریت کی حکومتوں کی چکیوں میں پسنے اور چھلنوں میں چھننے کے بعد جو صورت پائی ہے وہ آپ جانتے ہیں شروع میں عربوں اور یہودیوں کے مطالبے اور برطانوی سیاست کی مصلحتیں یہ ڈلے تھے، اتنے بڑے کہ فلسطین کی برطانوی حکومت کے ہاتھوں سے گر گر جاتے تھے، اور اتنے سخت کہ ان کا ٹوٹنا مشکل تھا اس لئے یہ طے پایا کہ کمیشن کی چکی انھیں پیسے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ اس طرح بھی حل ہو سکتے ہیں یا نہیں کمیشن اس میں کامیاب نہ ہوئی تو گول میز کانفرنس کی زیادہ بڑی چکی تجویز کی گئی لیکن یہ ڈلے کچھ ایسے تھے کہ پاٹوں کے بیچ میں آکر بار بار نکل جاتے تھے آخر میں اس اصول پر عمل کیا گیا کہ جو چبایا نہ جا سکے اسے اللہ کا نام لے کر نگل جاؤ اور قدرت کی صلاحیتوں پر بھروسہ کرو اس کا نتیجہ وہ تجویز ہے جو ۱۷ مئی کو شائع ہوئی اور جس پر ایک ہفتہ بعد پارلیمنٹ میں بحث ہوئی۔

فلسطین کی گول میز کانفرنس نے چکی کا کام تو نہیں کیا اس پر جو وقت اور محنت صرف ہوئی وہ بے کار نہیں گئی کانفرنس نہ ہوتی تو یہ بات بھی نہ ثابت ہو سکتی کہ عرب اور یہودی آپس میں کچھ طے نہیں کر سکتے تھے جمہوری اصول کے مطابق وزیر نوآبادیات مسٹر میکڈانلڈ کو اس

بات کا حق پہنچتا کہ وہ برطانوی حکومت کی طرف سے کوئی فیصلہ کریں اور عربوں اور یہودیوں کو یہ شکایت رہتی کہ ان سے مشورہ کئے بغیر فیصلہ کیا گیا ہے کانفرنس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عربوں اور یہودیوں سے جو الگ الگ وعدے کئے گئے تھے انھیں پورا کرنے کی ذمہ داری برطانیہ کے سر سے ٹل گئی مسٹر میکڈانلڈ نے اپنی تقریر میں کہا کہ برطانیہ نے کسی فریق سے وعدہ خلافی نہیں کی ہے یہودیوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین اس کا قومی گھر بنایا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ برطانیہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرے گا ایسا ہوتا تو مسٹر بیلفر اور مسٹر موج جنھوں نے وعدہ کیا تھا، ہوم یعنی گھر کی جگہ اسٹیٹ یعنی ریاست کا لفظ استعمال کرتے۔ مسٹر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ ان کے بزرگوں نے خاص اس مصلحت سے کہ آگے چل کر نہ جانے کیا صورت پیدا ہو جان بوجھ کر ایسی گول بات کہی کہ ان کی گرفت نہ کی جا سکے، لیکن ایسی بات کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء سے اس وقت تک یہودیوں کو دھوکے میں رکھا گیا جس سے ظاہر ہے یہودی خوش نہ ہوں گے دوسری طرف عربوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی تفصیل بیان کرتے وقت مسٹر میکڈانلڈ اصل بات مان گئے جنرل میکموں اور عرب سرداروں میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ بحث اس وقت سے شروع کی جبکہ عربوں کو خبر ملی تھی، کہ فلسطین یہودیوں کو دے دیا جائے گا اور وہ اس سبب سے بہت بے چین اور بد دل ہو رہے تھے، عربوں سے جو پہلا اور اصل وعدہ کیا گیا تھا، اس میں یہودیوں کا کہیں ذکر نہ تھا اور اس سے منھ پھیر کر اگرچہ مسٹر میکڈانلڈ نے بڑی مشکل آسان کر لی، لیکن عرب ایسے بھولے نہیں ہیں کہ اس طرح قائل کئے جا سکیں اس سے بہت زیادہ بہتر ہوتا اگر مسٹر میکڈانلڈ کہہ دیتے کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانوی سیاست مجبور تھی کہ جس طرح بن پڑے عربوں اور یہودیوں کو اپنے ساتھ ملائے، اور اپنا کام چلائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور یہودیوں سے الگ الگ ایسے وعدے کر لیے گئے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کے خلاف پڑتا تھا۔ اب شکوہ شکایت کرنا بیچ کی بحث چھیڑنا بے کار ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا

ہم مانتے ہیں کہ مسٹر بلو کا یہ کہنا کہ عرب یہودیوں کو فلسطین کا چھوٹا سا علاقہ دے دیں تو ان کا کیا بگڑ جائے گا یا اس طرح کے فقرے چست کرنا کہ یہودیوں کے لئے قومی گھر بنانے میں ہم ایسے لوگوں کو جن کا کوئی وطن نہیں ہے۔ ایسا ملک دے رہے ہیں کہ جہاں کوئی آبادی نہیں ظاہر کرتا ہے کہ انھیں فلسطین کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اور انھیں اس کی پروا بھی نہ تھی۔ لیکن وہ اب دنیا سے سدھار چکے ہیں اور اب ان پر الزام لگانے میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے، اور برطانوی سیاست ان کی بات رکھنے کی جو تدبیریں کر سکتی تھی کر چکی رہا عربوں کا مطالبہ وہ ہمیں اپنی مصلحت اور ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے منظور ہے، ہم نے گول میز کانفرنس اس نیت سے کی تھی، کہ ممکن ہو تو عرب اور یہودی ہمارے مشورے سے آپس میں کوئی فیصلہ کر لیں جو دونوں کو مناسب معلوم ہو، مگر کانفرنس کچھ طے نہ کر سکی اس لئے ہم نے موجودہ حالت کو سامنے رکھ کر اپنی طرف سے ایک تجویز پیش کی ہے، مسٹر میکڈونلڈ نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی اس کا منشا یہی کہنا تھا۔ لیکن انھوں نے بات خواہ مخواہ پیچیدہ کر دی اور جو تجویز انھوں نے پارلیمنٹ سے منظور کرائی ہے اس میں بھی بڑے پیچ ہیں فلسطین میں عربوں کی اکثریت رہے گی اور پچھتر ہزار سے زیادہ یہودی وہاں جا کر آباد نہ ہو سکیں گے یہودیوں کو زمین خریدنے کی بھی وہ آزادی نہ ہو گی جو اب تک انھیں حاصل تھی عربوں اور یہودیوں کو ان کی آبادی کی نسبت سے حکومت کے کاموں میں اور ہائی کمشنر صاحب کے کونسل ہاؤس میں شریک کیا جائے گا اور دس برس بعد اس پر غور کیا جائے گا کہ فلسطین کی آبادی کس حد تک خود مختار جمہوری حکومت کرنے کے لائق ہے۔ لیکن اس وعدے کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی ہے کہ عرب اور یہودی دونوں برطانیہ کو ستانا چھوڑ دیں گے اور اگلے پانچ سال کے لئے طے ہوا ہے کہ موجودہ حکومت بدستور رہے گی اور فساد اور بغاوت کا سر کچلنے کی جو تدبیریں اس وقت اختیار کی گئیں ہیں ان پر جب تک ضرورت ہوئی عمل کیا جاتا رہے گا۔

اس تجویز کا یہودیوں پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اندھا دھند مار پیٹ شروع کر دی اور

برطانیہ کی سرپرستی اور مدد سے مایوس ہو کر ان کے ایک فرقے نے طے کر لیا ہے کہ عربوں سے لڑ کر اپنا حق حاصل کرے گا عربوں کی اس موڈریٹ پارٹی نے جو گول میز کانفرنس کی خبر پھیلنے پر نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گئی تھی پارلیمنٹ کی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے اور اس کا بہت ممتاز آدمی اس منظوری کا اعلان کرنے کی سزا میں مارا بھی جا چکا ہے انتہا پسند عرب جو پوری آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہیں سنا ہے کہ برطانوی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دوسرے تیسرے دن ان کے چھوٹے اور بڑے جتھے پکڑے جاتے ہیں اور انتہا پسند عربوں کی طبیعت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے اب دیکھنا ہے کہ برطانوی فوج عربوں کی طبیعت کو سدھار سکتی ہے یا نہیں برطانوی فوج نے تو فی الحال مناسب نہیں سمجھا کہ انتہا پسند عربوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے جو عرب گرفتار ہوئے ان کو چھوڑنے کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب کو فلسطین آنے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ اور اس کی امید بھی نہیں دلائی گئی ہے کہ ہائی کمشنر کو مشورہ دینے کا حق ایسے لوگوں کو بھی ہوگا جو دہشت انگریزی کے خلاف ہوں مگر فلسطین کو جلد سے جلد آزاد کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

مسٹر میکڈنلڈ نے جو تجویز پارلیمنٹ سے پاس کرائی ہے وہ بذات خود ایسی نہیں ہے کہ فلسطین والے اسے بالکل رد کر دیں۔ لیکن عربوں سے آزادی دلانے کا وعدہ کئے ہوئے کتنی برس ہو گئے ہیں اور جنرل میکموہن کے وعدے اور مسٹر میکڈنلڈ کی تجویز میں کون کہے گا کہ زمین آسمان کا فرق نہیں ہے۔ پھر اگر وعدے کے ساتھ وعدے کی تشریح کرنے کا حق محفوظ رکھا جائے تو کیا تعجب ہے کہ اب سے دس برس بعد ان وعدوں کی جو اس تجویز میں کئے گئے ہیں کوئی اور تشریح کی جائے اور عربوں کی دس برس انتظار کرنے کی محنت بے کار ہو جائے یہودیوں کا معاملہ اور بھی نازک ہے خدا نے ان پر اور انھوں نے خدا پر نہ جانے کب سے اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مدتوں سے دونوں میں بول چال بند ہے خدا نے ان کو فلسطین سے

نکال دیا۔ وہ برسوں دنیا میں لاوارث گھومتے رہے ہیں اب وہ برطانیہ کا سہارا لے کر اور اپنی دولت کے بھروسہ پر اپنے وطن کو پہنچے تھے خدا سے تو انہیں شاید امید نہ تھی کہ ان کا ساتھ دے گا لیکن اب جو برطانیہ نے طے کر لیا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور آثار اس کے ہیں کہ ان کی دولت بھی کچھ بہت کام نہ آئے گی تو وہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں ان کے اعمال اور ان کا غصہ کہ جس نے پیغمبروں کا بھی لحاظ نہ کیا یہ دو بلائیں ہیں جو ان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں عربوں کو ان کے اعمال نے بیزار کر دیا۔ اور اب ممکن ہے کہ ان کا غصہ عربوں اور انگریزوں کو ان کی مخالفت میں متحد کر دے یہ بات ایسی ہے کہ جس سے یہودیوں کی بہت سی پرانی داستانیں یاد آجاتی ہیں اور اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کا کیا حشر ہو گا۔

تنقید و تبصرہ

اندھی دنیا اور دوسرے افسانے | از جناب اختر احمد صاحب انصاری بی۔اے (آنرس)۔ کتابت طباعت دیدہ زیب جلد خوب صورت مع گرد پوش۔ متوسط تقطیع۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عمر

ناشر:۔ مکتبہ جہاں نما، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

یہ اختر صاحب کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانہ کا جو عام مفہوم ہے یعنی "عشق و محبت اور ہجر و وصل کی ایک کیف انگیز داستان" یا "تفنن و تفریح اور وقت گذاری کا ایک دلچسپ مشغلہ" —— اس اعتبار سے تو اختر صاحب کے یہ افسانے، افسانوں کے زمرہ میں شامل کیے جانے کے لائق نہیں ہیں کیونکہ ان کے پڑھنے سے تفریح نہیں ہوتی کوفت ہوتی ہے۔ دلبستگی نہیں ہوتی انتشار اور پریشان خاطری پیدا ہوتی ہے۔ سکون و راحت نہیں ملتی، درد و اذیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا بلکہ اتنا بوجھل ہو جاتا ہے کہ اٹھائے نہیں اٹھتا زخم پر مرہم نہیں رکھا جاتا بلکہ زخم کو کرید کر تازہ کیا جاتا ہے۔ خود مصنف نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ افسانے سماج کے پکے ہوئے پھوڑے اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضا پر ایک بے درد نشتر کے کچھ کے ہیں۔"

ذیل کی چند مثالوں سے مصنف کے موضوع اور انداز بیان کا ایک تصور قائم کیا جا سکے گا۔

(۱) "گرمیوں کی ایک دوپہر":۔ اس افسانے میں ایک بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان کی ستم ظریفانہ زندگی کو پیش کیا گیا ہے یہ نوجوان گرمیوں کی ایک دوپہر میں ذرا اچھے اور صاف کپڑے پہن کر گھر سے نکلتا ہے یعنی سُرمئی رنگ کی دھاری دار اچکن، سفید کنوس کا شو سفید موزوں کی جوڑی اور ایک پڑھا لکھا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی جیب خالی ہے

اس لئے یہ شہر تک پیدل جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن تانگے اور یکے والے ابتدا میں امید وارانہ کیفیت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بعد میں کھلے طور پر اپنی سواری پر بیٹھنے کے لئے اصرار اور مول تول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ غریب عاجز آکر ان سے بہانہ کرتا ہے کہ مجھے شہر نہیں جانا ہے یہیں نزدیک جانا ہے جس کے لئے تانگہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بعد میں تانگہ والا دوسری سواری کو بٹھا کر شہر کے قریب ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کی طرف ہنستی ہوئی اور مذاق اڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ پہلے جیسی امید وارانہ کیفیت نہیں تھی۔ معلوم نہیں اس نے ان کو نادار خیال کیا یا خسیس یا محض جھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ فسانہ ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوتا ہے :-

"بہرحال میرا خیال ہے اگر اس دن میں اپنا پھٹا ہوا ارکش کوٹ، پیوند لگا ہوا پاجامہ اور گھسا ہوا جوتہ پہنے ہوتا تو شاید اس ذلت اور پریشانی سے بچ جاتا"

(۲) "میں نے ایسا کیوں کیا"؛- اس افسانہ میں تعلیم کے خواہش مند غریب بچوں کو جن حوصلہ شکن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں بیان کیا گیا ہے۔ لوگ خیرات اور احسان کی شہرت حاصل کرنے کے لئے یا درخواست گذاروں کے اصرار سے عاجز آکر ایسی ذمہ داریاں قبول کر لیتے ہیں جن کو بعد میں وہ پورا نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ سے خیرات قبول کرنے والے لوگوں کو ایسی ایسی ذلتوں اور خواریوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے جو ان کی قوت برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ عزت نفس کے تحفظ اور تعلیم کے شوق میں ایک مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم عزت نفس کی قربانی کو جہالت سے زیادہ برا سمجھ کر اپنی تعلیم کو ترک کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ اسی قسم کی ایک تکلیف دہ نفسیاتی کشمکش کا مرقع ہے جس میں آخر عزت نفس کے قیام کو تعلیم سے زیادہ بہتر سمجھ کر غریب طالب علم اپنی تعلیم کو خیرباد کہتا ہے۔

(۳) "ہسپتال" میں مصنف بیماری کے ہولناک مناظر پیش کرتا ہے۔ "خدا کی پناہ! دکھی انسانوں کا یہ ہجوم! مرد عورتیں اور بچے، بیمار، پریشان اور نڈھال، تھکے ہوئے، کراہتے ہوئے، چہرے

زرد، ہونٹوں پر خشکی، آنکھوں میں حلقے، لبوں پر ہائے ہائے، کوئی نقاہت سے گرا جاتا ہے۔ کوئی لکڑی کے سہارے کھڑا ہے، کوئی لنگڑا ہے، کوئی اپاہج ہے۔ کسی کے ماتھے پر دو انگل گہرا زخم ہے۔ کسی کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی ہے کسی کی آنکھ میں ناسور ہے۔ کہیں دق ہے، کہیں سل، کہیں ہیضہ۔ کہیں سرسام، تکلیف، تکلیف، تکلیف۔ زرد زرد شکلوں والے بیمار، سفید سفید بستروں پر پڑے ہیں۔ سفید سفید چادریں اوڑھے ہوئے ہیں۔ زندگی ہے لیکن کفنائی ہوئی۔ موت سروں پر سایہ کئے ہوئے ہے اور اپنا سرد ہاتھ آگے بڑھا رہی ہے۔ سب خاموش ہیں حسرت سے ایک دوسرے کو تکتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں زبانیں بند ہیں۔ ہنگامے، شورشیں، ولولے امیدیں، آرزوئیں، ارمان، یہ چیزیں ان کی دنیا سے کوسوں دور ہیں۔ ایک مقام پر عمل جراحی ہو رہا ہے۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ اسپتال میں، بیماروں کی اس دنیا میں، کہیں حسرتناک خاموشی ہے، کہیں آہیں ہیں اور کہیں چیخیں ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یا پھر دواؤں کی بُو ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے جس سے یہاں کی ہوا کثیف ہے، فضا مسموم ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کیوں؟ کیوں؟

شام کو ناظم صاحب آئے۔ میں نے جو کچھ اسپتال میں دیکھا تھا بیان کیا۔ کہنے لگے "کوئی نئی بات نہیں ہے؟ دیکھو ظہیر! آدمی کو نظر وسیع رکھنا چاہیئے۔ محدود نظر ہونا اچھا نہیں۔ آپ ایک چھوٹے سے، معمولی سے، اسپتال میں جاتے ہیں۔ وہاں چند بیماروں کو دیکھتے ہیں اور سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں لیکن ایک اسپتال ہے جو اس اسپتال سے بہت بڑا ہے جہاں کروڑوں مریض پڑے سسکتے ہیں۔ اس اسپتال کی طرف سے آپ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ اس کا درد آپ کے دل میں نہیں ہے۔ وہ اسپتال یہی سرزمین ہے جس پر آپ رہتے ہیں۔ آپ اور آپ جیسے بہت سے مریض —— افلاس، احتیاج، جہالت، پستی، ذلت اور تعصب کے مریض۔"

اب میں کبھی سول اسپتال میں جا کر وہاں کے بدحال مریضوں کو دیکھتا ہوں تو اس بڑے اسپتال کا تصور کرتا ہوں جس میں لاتعداد مریض ہیں۔ وہ مریض جن پر زیادہ مہیب بیماریاں مسلط ہیں جن کے زخم زیادہ گہرے ہیں، جن کے ناسور زیادہ پرانے ہیں جن کے خون میں زیادہ مہلک جراثیم سرایت کئے ہوئے ہیں، جن پر موت کے آہنی پنجے کی گرفت زیادہ مضبوط ہے — بہت زیادہ!!!

غرضکہ اختر صاحب کی پوری کتاب اسی قسم کی دلدوز حسرتوں، محرومیوں، جسمانی اور روحانی بیماریوں دوسری حشر انگیز پکاروں سے معمور ہے جس میں درد اور ہمت رکھنے والے کے لئے دعوت عمل ہے اور بزدل اور کمزور کے لئے پیغام مایوسی۔

محبت کا افسانہ | از جناب لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی۔ کتابت طباعت خوشنما جلد خوب صورت مع گردپوش۔ متوسط تقطیع۔ ضخامت ۲۸۴ صفحے۔ قیمت دو روپے ناشر عظیم اطہر صاحب۔ محلہ منٹولہ۔ آگرہ۔

ہم نے اس کتاب کے تبصرہ کو قصداً اختر صاحب کی "اندھی دنیا اور دیگر افسانے" کے بعد رکھا ہے، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ اختر صاحب کے پیش کے ہوئے پس منظر میں اس کتاب کے موضوع اور فنی کمالات کا جائزہ لیں۔ ہم اس بات کا اظہار شروع میں ہی کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ل۔ احمد صاحب کی یہ کتاب حقیقتہً ایک شاہکار ہے جس پر اردو زبان بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ یہ خالص رومان ہے۔ یہ پریوں کی کہانی ہے۔ دنیا کی کثافتوں اور آلائشوں تکلیفوں اور مصیبتوں، مجبوریوں اور محرومیوں، بے کسیوں اور نامرادیوں، افلاس اور تباہ حالیوں سے دور، بہت بہت دور، فطرت کی رنگین اور پر بہار آغوش میں کشمیر کے پہاڑوں کی بلندیوں و دریائے جہلم کی پر عظمت دلفریبیوں کے درمیان اس کہانی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اسی پرکیف فضا میں پورے محبت کے افسانے کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس کا ہیرو ایک تندرست اور جفاکش انجینیر ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے زندگی کی ابتدائی کشمکشوں پر قابو پا کر اب دولت مند

اور صاحب افسر بن گیا ہے۔ وہ اپنی نامکمل زندگی کی تکمیل ازدواج کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ خوش قسمتی سے اسے اپنی مرضی کے مطابق ایک تندرست، حسین، مہذب اور شائستہ، بورژوا طبقہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی بھی مل گئی ہے۔ مرد کشمیر کے دلکش مناظر کا لالچ دے کر اسے یہاں کھینچ لانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ لڑکی شہری زندگی اور اپنے معاشری حلقہ کی جدائی کو محسوس کرتی معلوم ہوتی ہے لیکن مرد فطری مناظر کی ان تنہائیوں کو اپنے رشتہ ازدواج کی استواری کے لئے نہایت موزوں سمجھتا ہے۔ انجینیر صاحب کے شباب کا ابتدائی زمانہ چونکہ حصول کامیابی کی نذر ہو چکا ہے اور ان کے شباب میں ابتدائی بھولاپن اور بے اختیاری باقی نہیں رہی ہے اس لئے لڑکی کے اندر ان کے لئے وہ گرویدگی اور فدائیت موجود نہیں ہے جو ایک نوجوان جوڑے میں ہونا چاہیئے۔ ان موقعوں پر جہاں اس کے جذبات میں دہکتی ہوئی آگ کی گرمی ہونا چاہیئے تھی انجینیر صاحب اس کی طرف سے برف جیسی سردی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی کمی کی تلافی اپنے ہنی مون کی فضا میں رومان پیدا کر کے کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو جو کوششیں کی ہیں ان میں واقعی شعریت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اولمپیا کا کوئی دیوتا اپنی منظور نظر دیوی کو معرفت کائنات اور رموز حیات سمجھانے کے لئے فطرت کے مختلف مناظر دکھا رہا ہے لیکن اس کی کائنات صرف اولمپیا کی بلندیوں تک محدود ہے۔ ادھیڑ عمر میں شادی کرنے والے بورژوا طبقہ کے لوگوں کے لئے یہ کتاب ازدواجی زندگی کے صحیفہ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ چنانچہ مصنف نے خود بھی انہی لوگوں کے نام اس کتاب کو معنون کیا ہے جو اپنے کمال فن سے مسرت ازدواج کو تا بہ آخر برقرار رکھ سکے ہیں۔

لیکن اگر کتاب کو اس افادی نقطہ نگاہ سے نہ دیکھا جائے جس کی طرف مصنف نے "نذر خلوص" کی عبارت لکھ کر اپنے قارئین کو خاص طور پر متوجہ کرنا چاہا ہے تو اس کتاب میں خالص رومان کی اور بھی بے شمار جھلکیاں نظر آئیں گی جن میں کھو جانے کے بعد پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اختر صاحب کی "اندھی دنیا اور دیگر افسانوں" کے مناظر کو بالکل بھول جائے گا

اس قسم کے نشہ کی ضرورت کبھی کبھی ہر شخص کو پیش آتی ہے اور یہ نہ ہو تو زندگی دوبھر ہو جائے
خشک طبیعت رکھنے والے لوگوں کے لئے بھی۔ احمد صاحب کی اس تصنیف میں خاصی
جاذبیت ہے۔ البتہ جن لوگوں کی طبیعت میں جوانی کا جوش اور سرمستی ہے ان کے لئے
ہنی مون کے زمانہ میں نافعہ کی یہ موشگافیاں چاہے انھیں کتنا ہی رنگین کیوں نہ بنایا گیا ہو ذرا
ناقابل برداشت معلوم ہوں گی۔ وہ اس موقع کے لئے غالباً بے وقوفوں اور بدمستوں کی یاوہ گوئی
اور مہمل سرائی کو زیادہ موزوں خیال کریں گے۔ لیکن ادھیڑ عمر کے ایک کامیاب اور صاحب اقتدار
شخص سے ان باتوں کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟ دردانہ کو اگر اس قسم کی گفتگو کی خواہش
تھی تو اسے انجنیئر صاحب کی جگہ کسی دوسرے بے فکرے نوجوان سے شادی کرنا چاہیئے تھی
لیکن ایک دفعہ انتخاب کر لینے کے بعد اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے موجودہ حالات
سے مطابقت پیدا کرے اور نوجوانی کی بے ساختگی کی تلافی دولت اور اقتدار کی فراوانی سے
کرتی رہے اور وجود باری کی ان دلیلوں کو تسلیم کر کے جنھیں اس کے شوہر نے نہایت خوبی کے
ساتھ پیش کیا ہے مذہبی عبادات کی طرف بھی مائل ہو جائے۔

بہرحال جہاں تک خالص رومان کا تعلق ہے جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے لطیف صاحب
کا یہ افسانہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کی تکمیل پر کیا بلحاظ موضوع اور کیا بلحاظ
طرز ادا، انتخاب الفاظ اور فنی کاریگری کے ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۱۔ لکڑی کا باریک کام | مولفہ سید رضا احمد صاحب جعفری، غیر مجلد، ناشر عصمت بک ڈپو دہلی ہر
۲۔ دھلی کی دست کاری | رسالہ کی علیحدہ قیمت ۸؍ یہ رسالے سلسلہ کتب دستکاری کی دو کڑیاں
ہیں اور انھیں ماہرین کے مشوروں اور مؤلف کے ذاتی تجربوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان
لوگوں کے لئے یہ بہت مفید ثابت ہوں گے جو ان میں سے کسی دست کاری کو بطور شوقیہ
مشغلہ (ہوبی) کے یا مالی فائدہ کے لئے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ انداز بیان نہایت سلیس

اور شگفتہ ہے۔ جا بجا ضروری تصویریں بنا کر مطالب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر فن میں محنت اور مشق کامیابی کی لازمی شرط ہے لیکن اگر مبتدی پہلے کسی عملی کتاب سے مشورہ کرلے تو بعض دقتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئے بغیر جلد کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

بنیادی تعلیم کو کانگریسی صوبوں میں خوب ترقی ہو رہی ہے اور اب اس قسم کی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی ہے لکڑی کے کام اور گتے کے کام دونوں کو بنیادی تعلیم کے نصاب میں رکھا گیا ہے اور جامعہ کے ابتدائی مدرسہ اور استادوں کے مدرسہ میں یہ کام کرائے جا رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کے علاوہ اور دوسری جگہوں پر بھی جہاں ان کاموں کو نصاب میں داخل کیا جا چکا ہے یہ رسالے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

من کی بپتا | از لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے۔ چھوٹی تقطیع۔ مجلد ضخامت ۰۰ صفحات۔ قیمت ۰ ناشر ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدر آباد دکن

اس چھوٹی سی کتاب میں طبقہ متوسط کی مالی پریشانیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اور مصنفہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ ہماری گذشتہ برکت میں بڑا حصہ ہمارے بزرگوں کی سادہ زندگی کا تھا اور موجودہ نحوست میں بہت بڑا حصہ ہماری غلط معاشرت کا ہے۔

عام طور پر ایک متوسط گھر کے جو خرچ ہوتے ہیں ان کی مدوں کو حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا گیا ہے:۔

گھر سواری، خورد نوش، نوکر چاکر، کپڑا لتہ، بچوں کی ضروریات، تعلیم، اخبار رسالے، عید تہوار، نذر نیاز، مختلف چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، انعام اکرام، سیر تفریح، سینما، فیشن۔

اور پھر ان مختلف مدوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ ان میں کہاں کہاں کس قدر اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے۔

مصنفہ نے سماجی زندگی کو دو ناگزیر پہلوؤں یعنی تدبیر ملک اور تدبیر منزل میں تقسیم کرنے کے بعد بتلایا ہے کہ کس طرح عورت تدبیر منزل یا گھر کی زندگی میں تمام و کمال خود مختار اور ذمہ دار ہے۔ یہ زندگی

کی سب سے اہم منزل ہے۔ اسی منزل میں کردار بنتے ہیں۔ یہی وہ کارگاہ حیات ہے جہاں قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں، اسی لئے اس محترم منزل کی تنظیم کے لئے قدرت نے ایک ایسی ہستی بنائی جو ذات باری کی صفات کا ایک ہلکا سا مظہر ہے عورت کا یا ہر گھر کی بی بی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی معاشرت کا ایک صحیح نصب العین بنائے جس میں بے جا ظاہرداریوں کا دخل نہ ہو بلکہ ضرورت اور فرائض کا خیال رکھا جائے گھر والوں کی باقاعدہ تنظیم کے لئے چاہیئے کہ آمدنی کو خرچ کی ضروری مدوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان میں بھی نہ صرف آمد و خرچ کا توازن باقی رہے بلکہ اپنے گرد و پیش کی دنیا، اس کی ضروریات اور اس کی حیثیت کا بھی لحاظ رہے

کتاب کا انداز تحریر نہایت سلجھا ہوا موثر اور دلنشین ہے۔ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے اور اگر گھر کی عورتیں ان کی نصیحتوں پر عمل بھی شروع کر دیں تو ہمیں یقین ہے کہ متوسط طبقہ کی موجودہ مالی پریشانیاں بہت کم ہو جائیں گی اور وہ قرض کے بوجھ سے دبے رہنے کے لئے مجبور نہیں رہیں گے۔

رسالہ دینیات | از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ قیمت ۱۲ر مع محصول ڈاک۔ ناشر دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

اس رسالہ میں مودودی صاحب نے "اسلام" "ایمان اور اطاعت" "نبوت" "ایمان مفصل" "عبادات" "دین اور شریعت" اور "شریعت کے احکام" کے ابواب قائم کرکے دین اسلام کے بارے میں مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ رسالہ ہائی اسکولوں کی آخری جماعت کے لئے لکھا گیا ہے اور اس میں طالب علم کو بتایا گیا ہے کہ اسلام کیا ہے، کیا چاہتا ہے، کیوں چاہتا ہے اس کے عقائد کا انسان کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ وہ اگر تسلیم کئے جائیں تو ان کا فائدہ کیا ہے اور نہ تسلیم کئے جائیں تو نقصان کیا ہے۔ اسلام محض تحکم کے طور پر ان عقائد کو منوا لینا چاہتا ہے یا اس کے پاس ان کی صحت و صداقت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے ——— یہ سوالات ایسے ہیں جو اس عقلیت کے دور میں نوجوانوں کے ذہن میں عام طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور معقول جوابات

نہ ملنے کی بنا پر گمراہی اور بے دینی کا باعث ہوتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کتاب کو لکھ کر وقت کی ضرورت کو صحیح طور پر سمجھا ہے اور ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایمان کے بغیر احکام کی اطاعت ممکن نہیں اور ایمان صرف عقائد ہی کے ٹھیک ٹھیک سمجھنے سے مستحکم ہو سکتا ہے مصنف نے عبادات اور احکام شریعت کی حکمتیں بھی سمجھائی ہیں۔ کتاب بہت اچھی ہے اور اس لائق ہے کہ ہائی سکولوں کی اونچی جماعتوں کے دینیات کے نصاب میں داخل کی جائے۔ اور عام لوگ بھی اس کا فائدہ کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

پرچم | ایڈیٹر جناب سبط حسن صاحب۔ قیمت فی پرچہ ۱؍ سالانہ ۵؍ پتہ :۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ۔

اس نئے ہفتہ وار اخبار کے ۱۱ نمبر اب تک نکل چکے ہیں۔ اپنے خیالات کے لحاظ سے ترقی پسند ہے۔ عام دلچسپی کے مضامین کے علاوہ اس میں مسلمانوں کے مفاد اور حقوق اور ان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی پر خاص طور سے بحث کی جاتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہوتی ہے اور مشکل مضامین کو نہایت سلجھا کر سادہ زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ مسائل حاضرہ کے بارے میں بہت پر معلومات مضامین پیش کئے جاتے ہیں اور فکر میں گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے۔ اردو کے ہفتہ وار اخباروں میں اس کا شمار بلند پایہ اخبارات میں کیا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کو خوش قسمتی سے ہم خیال مضمون نگاروں کا ایک بہت اچھا حلقہ مل گیا ہے جس سے امید ہے کہ اس کا معیار گرنے نہیں پائے گا۔

من کی دنیا | از جناب رشید قریشی صاحب قیمت عہ ناشر ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن۔ یہ قریشی صاحب کے ۲۲ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانے میں زندگی اور جذبات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

میری کہانی؛ سنئے گا؟ | از جناب مولوی سید علی صاحب شاکر ایم۔ اے۔ حیدر آباد دکن قیمت عہ یہ شاکر صاحب کا بالکل نئے طرز کا افسانہ ہے۔ اس میں زندگی کے چند نہایت الیمہ مناظر دکھائے گئے ہیں اور خوش مزاجی اور ظرافت کا پردہ ڈال کر تکلیف کی گہرائی کو اور تیز کر دیا گیا ہے۔

محبت کے افسانے | از جناب الطاف حسین صاحب رشدی بیاور۔ ملنے کا پتہ: محمد سعید خاں آزاد پریس جامع مسجد بیاور راجپوتانہ۔ اس میں رشدی صاحب کے ۱۴ افسانوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

اعلان

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا ہے جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہو گا انھیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہو گا۔ اسکے علاوہ اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں اور تمام مقالے سکریٹری اردو اکادمی کے پاس ۱۵ ار ستمبر تک پہنچ جانے چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکریٹری کو مطلع کر دیں۔

فہرست مضامین

اشتراکیت۔

نازی ازم۔

سامراج۔

وطنیت۔

سرمایہ داری۔

بحیرہ روم کی سیاست۔

بحرالکاہل کی سیاست۔

امریکہ اور سیاست عالم۔

نوآبادیوں کی تقسیم۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست۔

فاسزم۔

ازطرف

سکریٹری اردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ایک سَو روپے کا انعام

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

۱۔ ہندوستان کے تمام اساتذۂ فن سے یہ درخواست ہے کہ حضرت آرزو لکھنوی کے اس شعر کی تقطیع صحیح طور پر فرماکر بتادیں کہ یہ شعر کس بحر میں ہے؟ اور اس کے ارکان میں کون کون زحاف واقع ہوئے اور ہو سکتے ہیں، آرزو صاحب کا شعر ہے ؎

کس نے ڈپٹکا پیچ کے ساغرِ موسم کی بدکیفی پر   آنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

۲۔ اسی بحر طویل (جو ایک مخصوص معرب بحر ہے) اسکے متعلق بھی کوئی صاحب آنا بتادیں کہ اس بحر میں کون کون زحاف واقع ہو سکتے ہیں مگر صدر و مطلع و عروض و ضرب اور حشو کی تعلیل کے ساتھ۔ اور اسمیں کن کن زحافات کا وقوع نادر او رمعیوب ہے، اور اس بحر کے کتنے اوزان مستعمل ہیں

یہ دونوں سوالات ہندوستان ہی کیلئے مخصوص نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر ماہرین فن بھی توجہ کر سکتے ہیں اور یہاں کے لوگ خطوط بھیجکر جواب منگوا سکتے ہیں جو صاحبان دونوں سوالوں کے جواب صحیح عنایت فرمائیں گے انکو ایک سو روپے بطریق انعام یا بطور نذر پیش کئے جائیں گے۔

جوابات کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ہم لوگوں کی تنقید کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتہ اور مولانا ریاض حسن خاں صاحب خیال رئیس رسول پور مدظلہ فرمائیں گے! جبتک جواب ہر طرح صحیح اور مکمل نہوگا انعام کا مستحق نہیں بنایا جائے گا! اگر کچھ بھی غلطی نکل آئی تو انعام کے عوض الزام! سر دست چھ مہینے کی مہلت غور و خوض کیلئے دیجاتی ہے بشرط درخواست کچھ اضافہ بھی ممکن ہے۔

اس چھ مہینے کی ابتدا رسالہ سہیل گیا میں جب یہ مضمون شائع ہوا اس کے بعد سے سمجھی جائے گی،

ہے کوئی مردِ میدانِ شعر و شاعری جو یہ انعام وصول کرے؟

تمامی اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں سے التجا ہے کہ جن کے پاس یہ اعلان کسی طرح پہنچ جائے از راہ کرم اسکی اشاعت فرماکر ارباب فن کو اس انعام کے حاصل کرانے کا موقع دیں کہ یہ بھی فن اور اہل فن کی ایک خدمت ہے۔ **جوابات:** ۔ دفتر رسالہ سہیل گھسیا ٹولہ گیا پتہ پر بھیجے جائیں

المعلنین ڈاکٹر سید عبدالعزیز عزیز بہاری، احمد ارمان ایم۔ اے۔ آروی، محمد ابراہیم نجم ندوی بی اے فاضل شمسی، مولوی محمد وارث امام قادری مجیبی پھلواری، مولوی عبدالغنی ہشمی فاضل شمسی تلامذہ حسان الہند علامہ تمنا عمادی مجیبی مدظلہ العالی

ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں

روحِ غالب ۔ غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصّوں کا انتخاب، اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمرج)، صدر المہام تعلیمات و معین امیرِ جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے پی، ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ صفحات (۲۴۰) مع تصاویر قیمت ۱۲ؔ

نظام الملک آصف جاہ اوّل ۔ اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھا جائے مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر) قیمت صرف ۴ؔ

من کی بیتا ۔ صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکتہ الآرا مشورے۔ اس دلچسپ ادبی کتاب میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں، نذر و نیاز۔ چندے مختلف رسومات، سینما، فیشن وغیرہ۔ ہر تعلیمیافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ مصنفہ محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ صفحات (۸۰) قیمت صرف ۸ؔ

نذرِ دکن ۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں مجلد باتصویر بڑی سائز صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۲ؔ

عاصمہ (ناول) ایک دلچسپ اور مفید معاشرتی ناول جس میں ڈیوڑھی کی ایک کنیز کے واقعات زندگی ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنفہ، مولوی موید الدین حسن صاحب ضخامت دو سو مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۱۲ؔ

اردو کے ممتاز ماہنامے کا شاندار اقدام

ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور

کا

ڈراما نمبر!

جو

ہندوستان کے بہترین ڈرامانگاروں | ملک کے جلیل القدر شعرا

کے شاندار ڈراموں | اور | کے وجد آور مکالموں

اردو کے مایۂ ناز نقادوں کے سیر حاصل مقالوں

کا

ایک جامع و مکمل مجموعہ ہے

ضخامت اڑھائی سو صفحات بمع متعدد رنگین و دلآویز تصاویر

قیمت صرف بارہ آنے

چندہ سالانہ

ضخیم سالنامہ ڈراما نمبر یا افسانہ نمبر سمیت صرف تین روپے آٹھ آنے

(علاوہ محصول ڈاک)

ڈراما نمبر اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

شمالی ہندوستان کا مشہور ہفتہ وار اخبار

دور جدید لاہور

جو گذشتہ دس سال سے نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

اور

اپنی ذمہ دارانہ روش، پرمتانت طرز تحریر اور بلندی اخلاق کے لئے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

معاصرین کرام کی آرا

لاہور کے ہفتہ وار اخباروں میں دور جدید ممتاز حیثیت رکھتا ہے مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور مفید ہے (معارف)

اس میں ایک ہفتہ وار اخبار کی تمام خصوصیات موجود ہیں ایڈیٹر صاحب پرچے کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں (جامعہ)

ترتیب شگفتہ مقالات پر فکر پیرائے میں صحت و ریاضت مضامین معلومات کا اچھا ذخیرہ ہوتے ہیں (النجم)

اسکی خبروں کا انتخاب پنجاب کے ہفتہ وار اخباروں میں سب سے بہتر ہوتا ہے (ہمدرد)

نہایت قابلیت سے اڈیٹ کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو مختلف اخباروں سے بے نیاز کرتا ہے (مصباح)

لاہور سے آجکل جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ روزانہ چھوڑ کر ہفتہ وار اخبار میں "دور جدید" خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ (ندیم)

دور جدید اردو کا بہترین ہفتہ وار اخبار ہے۔ (دلچسپ)

نوٹوں میں بر معقولیت اور کسی پر اعتراض کرتے وقت نہایت شرافت کو مدنظر رکھتا ہے (پیغام صلح)

بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ عام مروجہ دلچسپیوں اور مفید معلومات سے اس کا نمبر خالی نہیں ہوتا۔

سالانہ قیمت چار روپے - للعہ؎ فی پرچہ ایک آنہ ۱؎

منیجر "دور جدید" اندرون شیرانوالہ دروازہ لاہور

مطبوعات امیریہ دار التصنیف و التالیف لکھنؤ

دیوانِ ثاقب۔ یہ دیوان میرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فنِ شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانچسو پچاس صفحات قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ، (علاوہ محصول ڈاک)

انیس الاخلاق۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس صاحب رضوی ایم۔ اے۔ رکن امیریہ دار التصنیف و التالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصول ڈاک

گیس کا دفاع۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت پر نظر کر کے یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۱۲ر (علاوہ محصول ڈاک)

مفتاح البیان۔ حصہ اول و دوم۔ مؤلفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابو البیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروالی مؤلف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت:۔ ہر حصہ عہ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امیریہ دار التصنیف و التالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرول باغ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ

جامع مسجد۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

لوہاری دروازہ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ

امین آباد۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ

پرنسس بلڈنگ۔ جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳

نئی کتابیں

گئو دان - منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول، اردو میں پہلی بار منتقل ہوا ہے۔ صفحات ۱۵۶ - قیمت ع؎

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب - ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ اور وردھا تعلیمی اسکیم کا مکمل نصاب اردو میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

ہندستانی - ان چھ لکچروں کا مجموعہ جو آل انڈیا ریڈیو پر ۲۰ سے ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء تک براڈکاسٹ ہوئے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں۔ ہر ایک کی قیمت ۱۲

اجتماعی زندگی کی ابتدا - سیاست، معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

قیمت عہ

محکومیتِ نسواں - مشہور فلسفی مل کی کتاب THE SUBJECTION OF WOMEN کا اردو ترجمہ۔ قیمت عہ

جوہر اقبال - علامہ اقبال کی زندۂ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے اہل فکر حضرات کے مضامین اور پیغامات کا مجموعہ۔ قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ

جامعہ

زیرادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۶	جون ۱۹۳۹ء	جلد ۳۱

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیّہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیّہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱. سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲. مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳. ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا

۴. جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

بچہ اور تعلیم

(جناب عبدالغفور صاحب استاد دں کا مدرسہ جامعہ)

گذشتہ مضامین میں ہم نے اس بات کے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ تعلیمی عمل نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ اور انسان کے اندر سیکھنے یا تطابق حاصل کرنے کے لئے کون سے بنیادی محرکات اور جبلتیں پائی جاتی ہیں؟ اور پھر ان کی صحیح تربیت اور نشو و نما پر ہماری تعلیم کا کس قدر دار و مدار ہے؟ اس مضمون میں ہم بچہ کی انفرادی شخصیت کو اس نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیوں کر سیکھتا ہے؟ یعنی وہ سماج کے علمی سرمایہ اور طبعی ماحول کے اثرات کو کس طرح اپنی زندگی کا تار و پود بناتا ہے؟ اس کے ذہنی نشو و نما کے قوانین کیا ہیں؟ اور اس کی روشنی میں ہم بچہ کی خام صلاحیتوں اور چھوٹے موٹے تجربات زندگی کی توسیع و ترتیب کیونکہ کر سکتے ہیں؟ یہ بات ہم اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کی نفسیاتی بنیادوں کے ضمن میں ہم نے دیکھا کہ بچہ کی زندگی کا ارتقار منفی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے اپنے اندر ایجابی قوتیں رکھتا ہے، جس کے صحیح اظہار پر اس کی زندگی کی صحیح تشکیل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم تعلیم میں بچہ کو ایک ایسے نامی وجود کی حیثیت سے دیکھیں گے جو نہ صرف دوسروں کے سہارے پر جیتا ہے بلکہ خود بھی اپنی زندگی کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ معلم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عملی تشکیل میں بچہ کی مدد کرے کیونکہ بچہ عمر کی ہر ایک منزل میں نیا برگ و بار لاتا ہے، پرانی عادتیں چھوڑتا جاتا ہے اور نئی عادتیں اپنے نئے تجربوں کی بنا پر اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کی جڑیں جن کو ہم جبلت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ہمہ وقت ماحول سے اپنی خوراک حاصل کرتی رہتی ہیں۔ ان جڑوں کی صحیح کارکردگی سے زندگی میں تر و تازگی رہتی ہے اس لئے زندگی کو مختلف تجربات سے قوت پہنچتی رہتی ہے۔ زندگی کا یہ اصول ایک بنیادی تعلیمی

مسئلہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ صرف وہ چیزیں بچہ کی بڑھتی ہوئی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں جو اس کی کسی ضرورت کو پورا کرتی ہیں اس لئے پڑھاتے وقت ہمیں بچہ کے ماحول اس کی ضروریات اور اس کی کیفیات نفسی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ بچے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ جو معلومات ہم بچہ کو دیتے رہتے ہیں' وہ اس کی زندگی سے جوڑ کھاتے ہیں یا نہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بچہ کا ماحول بہت محدود ہوتا ہے۔ شروع میں اس کی سماجی واقفیت خاندان اور آس پاس کے رہنے والے چند پڑوسیوں تک محدود رہتی ہے اسی طرح مکان کے اعتبار سے گھر' مدرسہ' بازار اور زیادہ سے زیادہ گاؤں یا محلہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ غرض شروع میں اس کا ماحول بہت تنگ ہوتا ہے۔ پھر اس کی نفسی زندگی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف ان چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے جو اس کی زندگی کی ضروریات سے بالکل قریب ہوں۔ اس لحاظ سے اس کا ذہنی افق بہت تنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ جہاں بے تعلق اور دور کی باتیں شروع ہوئیں اس کی توجہ اور یکسوئی غایب ہوئی۔

اس لئے بچہ کی محدود زندگی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اس کی تعلیم کا آغاز اس کی روزمرہ کی ضروریات سے کیا جائے۔ اس لئے اگر ہم بچوں کو ان کی خوراک' پوشاک' رہنے سہنے' خاندان اور دوسرے جانے پہچانے لوگوں کے حالات سے شروع کریں۔ تو یہ طریقہ بچے کے لئے زیادہ دلچسپ اور مناسب ہے۔ اس طرح بچے کو جو معلومات ملتی ہیں' ان کو وہ خوشی سے جذب کر لیتا ہے اور ان کو سمجھ بوجھ کر روزمرہ کی زندگی میں برت کر سکتا ہے۔ ابھی تک تعلیم کو بچے کے مطابق کرنے اور آسان بنانے کے سلسلے میں جو کوشش ہوتی رہی ہے' وہ یہ ہے۔ کہ بالغوں کے تجربوں اور ان کے علمی ذخیرہ کو سادہ سے سادہ شکل میں بچوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تاکہ بچوں کو بڑوں کا علم اخذ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ چنانچہ مختلف درجوں کے بچوں کے لئے مجرد معلومات کا ایک سادہ خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ جن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چند سالوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے

کہ ہر ایک بچہ مقررہ حصہ کو اچھی طرح سے پختہ کرکے اگلی جماعت میں ترقی پانے کا مستحق ہو جائے گا۔

جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے' نئی تعلیم والے بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کو گذشتہ تمدنی سرمائے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے" کیوں کہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر آگے چلنا مشکل ہے نگران کو اس طریقہ پر ایک بنیادی اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں" کہ علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھانا بچے کی نمو پذیر زندگی سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس قسم کی بے جان منطقی ترتیب کو ایک معمار تو برت سکتا ہے۔ کہ عمارت بناتے وقت ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھتا چلا جائے اور اس طرح الگ الگ اینٹوں کی مرتب تعمیر سے ایک عالیشان عمارت تیار کرے۔ مگر معلم تو کیا کسی مالی کے لئے بھی اس طرح کا میکانکی طریقہ برتنا مناسب نہیں ہے کیونکہ مالی کو بھی پودے کی نامی ضروریات' مثلاً ہوا' پانی' روشنی' دھوپ وغیرہ کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مالی اگر پودے کو وقت سے پہلے پانی دے۔ تو اس سے پودے کے نشو و نما پر یقیناً خراب اثر پڑے گا۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ پانی دے تو پھر اس پودے کے گلنے سڑنے کا خطرہ ہے خوراک کسی نامی وجود کے لئے اس وقت فائدہ مند ہوتی ہے جب اسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے یہی خوراک پھر جسم کے ریشے ریشے میں رس بس کر اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تعلیم کی بھی یہی حالت ہے۔ کیونکہ علم تمدنی زندگی کے لئے دایہ کا کام کرتا ہے۔ اس کے دامنِ تربیت میں مستقبل کا شہری اور انسانی تمدن کا وارث پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے وہ زندگی کے رموز سمجھتا ہے اس لئے تعلیم میں بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھنا ہر معلم کا فرض ہے۔ تعلیم کا معاملہ بچے کا معاملہ ہے بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مدرس کیا پڑھاتا ہے اور کتنی مقدار میں پڑھاتا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بچہ کتنا جذب کر سکتا ہے۔ اور کن حالات میں جذب کرتا ہے۔ اگر معلم بچے کی اس نامی ضرورت کو سمجھے۔ تو پھر تعلیم و تربیت کا مسئلہ صحیح بنیادوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔

ابھی تک تعلیم کے سلسلے میں یہ جو مختلف مضامین کے پڑھانے کا دستور رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت عرصے تک تعلیم کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر ایسا کیا گیا ہے۔ بچے کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے

وہ سماجی ضرورت سے پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ بالغ اپنی سمجھ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کو آئندہ نسل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے۔

کیونکہ ہر ایک نسل گزرے ہوئے لوگوں کے تجربات کو ایک قیمتی امانت کے طور پر محفوظ رکھ کر کسی قدر نئے اضافہ اور تصرف کے ساتھ نئی نسل کے سپرد کر دیتی ہے اور اس طرح انسان کی زندگی میں تسلسل رہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہر ایک نسل جو دنیا میں آتی ہے وہ اس امانت کو جوں کا توں نہیں حاصل کر سکتی۔ کیونکہ اس میں پیدائش کے ساتھ یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ فوراً ہی امانت کے اس بوجھ کو سنبھال سکے۔ اس لئے ہر ایک نسل کے لئے یہ عملی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کس طرح نسلی تجربات کو نئی پود تک منتقل کیا جائے۔ ہر ایک زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس کا حل سوچا ہے۔ شروع میں جب علوم و فنون کا ذخیرہ اس قدر بڑھا نہیں تھا اور لوگ سادہ زندگی گذارتے تھے تو یہ بات آسان تھی کہ سماج کے کاموں میں عملی شرکت سے نئی نسل پرانی نسل کے ہنروں کو سیکھے۔ مختلف پیشہ وروں کی برادریوں کے ادارے تعلیم و تربیت کے بڑے کارآمد ادارے تھے۔ مگر چونکہ موجودہ زمانہ میں تمدنی زندگی کا معیار اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ بچہ اس طرح سماجی مشاغل میں براہ راست شرکت کرنے سے وہ مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ جو ہر ایک شہری کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کی تیاری کے لئے خاص قسم کا انتظام کرنا پڑا۔ شہری زندگی کی تیاری مدرسہ کے سپرد کی گئی۔ مدرسہ نے سماجی تجربات کا نچوڑ لے کر اس کو مختلف مضامین کے نام سے مدرسہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ چونکہ بچہ میں اس قدر صلاحیت تو تھی نہیں۔ کہ سماجی علم کو اس کی اصلی شکل میں قبول کر سکے۔ اس لئے اس کے آسان سے آسان اجزا کئے گئے۔ تاکہ وہ بچے کی سمجھ میں آسانی سے آسکیں۔ اگرچہ علم میں اس طرح کے اختصار اور سادگی سے بچوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر اس سے علم اور زندگی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اس اختصار کے عمل میں زندگی کے ان سماجی اثرات کو نظر انداز کرنا پڑا، جس کی وجہ سے علم وجود میں آیا تھا۔ اس لئے علم سے روح نکال کر اس کی بے جان لاش کو مدرسہ میں جگہ دی گئی، جس کا نتیجہ تعلیم

وتدریس کی بے لطفی اور بے حسی کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرنا اس غلط فہمی کی بنا پر تھا۔ کہ بچہ بھی چھوٹے پیمانے پر آدمی ہوتا ہے۔ اس لئے علم کو اس کے مطابق کرنا گویا اس کو مختصر کر دینا ہے۔ یہ بات بچے کی نفسیاتی کیفیت کے بالکل منافی ہے۔ بچے کے تجربات کی دنیا نہ صرف مختصر ہوتی ہے۔ بلکہ بالغ اور بچّے کی نفسی کیفیات میں بھی بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بالغ چیزوں کو منطقی ترتیب سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ ماہر خصوصی کی حیثیت سے برسوں کسی مسئلہ کی جزویات پر سوچ سکتا ہے وہ تمدنی اور طبعی علوم کے کسی مخصوص مسئلہ پر تحقیق کر سکتا ہے۔ اور اس کو اپنا مقصد زندگی بنا سکتا ہے مگر بچے کی دنیا جذبات واحساسات کی دنیا ہوتی ہے صرف شخصی تعلقات اور عملی مشاغل اس کی زندگی کو مربوط رکھ سکتے ہیں۔ وہ عملی مشاغل ہی کے ذریعے زندگی کے مربوط حقائق کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ کسی مضمون کو مضمون کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ اس لئے جہاں اسباق کو اس کی زندگی سے الگ کر دیا۔ وہاں بچے کے لئے اس کے اندر کوئی معنی نہیں رہ جاتے اس لئے اس کی علم سے وابستگی ٹوٹ جاتی ہے۔
کیونکہ معلومات کے اس قسم کے اختصار اور منطقی ترتیب سے لازمی طور پر وہ مجرد شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اس طرح کے اصطلاحی علم کا حاصل کرنا بچے کی زندگی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ طلبہ کو بالکل اصطلاحی علم پڑھایا نہ جائے۔ کیونکہ سبھی لوگ جانتے ہیں۔ کہ ہر ایک طالب علم کے ضروری نہیں ہے کہ ان لمبے چوڑے تجربات سے خود بھی گذرے جن سے گذر کر ہمارے بزرگوں نے ہم تک یہ تمدنی سرمایہ پہنچایا ہے اور نہ افراد کی تھوڑی سی عمر میں یہ بات ممکن ہے چھوٹی عمر میں عملی مشاغل کے ذریعے سیکھنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچہ اپنے تجربے کی روشنی میں علم کی ان کنجیوں کو پا سکے۔ جن کی مدد سے وہ علوم وفنون کے دروازے کھول سکے غرضیکہ بچے کے لئے اصطلاحی علم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مگر اس وقت جب کہ بچے کے پاس اتنے ذاتی تجربات ہو جائیں، جس کی بنا پر وہ اس مدون اور مرتب اصطلاحی

علم کو سمجھ سکے۔ جو یونیورسٹیوں کے کتب خانوں اور معملوں میں محفوظ رکھا گیا ہے۔

اگر ہم بچے کی شخصیت کو ایک بڑھتا ہوا نامی وجود سمجھنے لگیں۔ تو پھر ہم بچے کی تعلیم و تربیت میں ایسی بنیادی غلطی نہیں کر سکتے۔ بچے کے اندر تمدنی سرمایہ سے استفادہ کرنے کی ہر قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ بسا اوقات اپنے چھوٹے موٹے مشاغل میں وہی کچھ کرتا ہے جسے بڑے اچھے اور ترقی یافتہ پیمانے پر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جس سماجی فضا میں پرورش پاتا ہے وہ خود بھی اس کے لئے تعلیمی اثرات سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقہ پر اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ بچے کے ان چھوٹے موٹے مشاغل کو صحیح طور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان میں تعلیم و ترقی کے لئے کون کون سی ایسی قوتیں پائی جاتی ہیں جن کو فروغ دے کر ہم بچے کو آہستہ آہستہ تمدن کی بلند ترسطح پر پہنچا سکتے ہیں۔ جس طرح نصاب کے مختلف مضامین کو پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں مقصود بالذات نہیں ہے۔ اسی طرح صرف بچے کے لئے عملی مشاغل کا انتظام کرنا بھی کسی بڑے مقصد کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل وہ ذرائع ہیں جن کے بل بوتے پر ہم بچوں کو تعلیم و تمدن کی وسیع تر دنیا میں لے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کی عملی دلچسپیاں بچے کے لئے ایسا موافق ماحول پیدا کرتی ہیں جس میں بچہ نفسیاتی طور پر سیکھنے کے لئے بالکل تیار نظر آتا ہے۔ اس لئے معلم کی نظر ایک طرف نصاب یا بڑوں کے مرتب تجربات پر رہنی چاہیئے اور دوسری طرف خود بچے کی زندگی میں سے ایسے عناصر کو چنتے رہنا چاہیئے جن کو فروغ دے کر بچے کو نہایت سہولت اور قدرتی طریقہ پر بڑوں کے تجربات سے آشنا کیا جا سکے۔ یعنی بڑوں کے علم اور تجربے سے وہ حصہ بچے کے سامنے پیش کر دے۔ جو اس وقت بچے کی ذات کے لئے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔ کیونکہ صرف اسی طریقہ سے بچوں کے سادہ تجربات کے ساتھ بڑوں کے مرتب اور ترقی یافتہ تجربات کا آہستہ آہستہ پیوند لگایا جا سکتا ہے۔

نامی ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کی زندگی مربوط ہوتی ہے۔ وہ مجموعی حیثیت سے کام کرتی ہے یعنی اس میں اتنی پختگی نہیں ہوتی۔ کہ وہ مختلف شاخوں میں پھیل جائے اور اس کی زندگی کی یہ شاخیں

صاف طور پر نظر آئیں۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ عملی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے ان کو بہت مستعدی
اور انہماک سے کرتا ہے۔ اس لئے عملی مشاغل کے سلسلہ میں بچے کو جو کچھ معلومات حاصل ہو جاتی
ہیں وہی اس کے علم اور واقفیت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سرمایہ اس کے چھوٹے
موٹے تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ معلومات اگرچہ بے ترتیب اور خام شکل میں ہوتی ہیں۔
مگر اس میں بچے کے بڑوں کے پیش کردہ مرتب معلومات سے معنی کہیں زیادہ پنہاں ہوتے
ہیں۔ اگر وہ بڑوں کی دی ہوئی معلومات کو سمجھ سکتا ہے۔ تو صرف ان چھوٹے موٹے تجربوں
کی بنیاد پر سمجھ سکتا ہے وہ زندگی کی مجرد معلومات مختلف مضامین کی شکل میں الگ الگ طور پر
تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اگر معلومات بچے کی عملی زندگی سے الگ کر کے مختلف مضامین کی حیثیت
میں پڑھائی جائیں۔ تو بچہ اپنے مخصوص نفسی حالات کی بنا پر ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ سمجھنے کو ہم یہاں
وسیع معنوں میں لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے بہت چھوٹی عمر میں بھی ہزار ہزار
تک گنتی لکھ سکتے ہیں۔ مگر سمجھنے سے مراد رٹنا نہیں ہے بلکہ اخذ کی ہوئی اشیا کو اپنی زندگی
کا جزو بناتا ہے یعنی یہ کہ حاصل کردہ معلومات کو آدمی بوقت ضرورت صحیح طور پر برت سکے اور
معلومات کو آدمی اس وقت صحیح موقعہ پر کام لا سکتا ہے جب کہ عملی طور پر آدمی کو اس کا تجربہ ہو جائے
چونکہ بالکل چھوٹے بچوں کی زندگی میں اس قسم کے مواقع کم آتے ہیں جس میں وہ بڑے عدد
کا استعمال کر سکیں، اس لئے بچوں کے ذہن میں اس کا تصور مشکل سے آسکتا ہے لہذا معلم کا فرض
ہے کہ وہ بچے کی زندگی پر بحیثیت مجموعی نظر رکھے۔ ایسے تعلیمی مواقع پیدا کرے جن میں بچہ خوشی کے
ساتھ شرکت کر سکے۔ اس صورت میں وہ جہاں موقع دیکھے مختلف مضامین کے اعتبار سے
معلومات دیتا جائے تاکہ وہ اس کی مجموعی تجربی زندگی کے اجزا کا کام دیں۔ اس لئے بچے کو مختلف
مضامین پڑھانے کے لئے سب سے پہلے صحیح ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ صحیح
ماحول عملی کاموں میں براہ راست شرکت کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کے لئے
ایسے مواقع پیش آتے ہیں جن میں معلم تمام درسی مضامین کو نہایت عمدگی کے ساتھ کھپا سکتا ہے

نئی تعلیم کا یہ نظریہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی سچائی پرکھنے کے لئے ہمیں کسی خاص اہتمام اور تحقیق کی ضرورت پڑے یا بہت سے نفسیاتی اصولوں کی چھان بین کرنی پڑے۔ اگر ہم بچے کے روزمرہ مشاغل کا مشاہدہ کریں۔ ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔ کہ جس طرح عموماً ہم بچے کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح وہ نہیں سیکھتا۔ مختلف مضامین کے اسباق محض اسباق کی حیثیت سے سیکھنا بچے کی زندگی کا خاصہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پچھلی سطروں میں بتایا گیا کہ بچہ مختلف عملی مشاغل کے ذریعے اپنی معلومات فراہم کرتا ہے اور یہ تجربے یا مشاغل بچے کی مربوط معلومات کو بامعنی بنا دیتے ہیں۔ بچہ اپنے مشغلوں اور کھیلوں میں حساب سیکھتا ہے، اس طرح کہ ان میں اسے گننے، ناپنے اور تولنے کے مواقع پیش آتے ہیں۔ سائنس سیکھتا ہے، اس طرح کہ وہ اپنے طبعی اور سماجی ماحول میں پہلوؤں کی تبدیلیوں کا اثر محسوس کرتا ہے اور خود بھی اپنے مشاغل کے دوران میں وہ دنیا کی سرد و گرم، اونچ نیچ اور سخت و گرم سے براہ راست تجربہ کرتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ دنیا کے سرد و گرم سے بچانے کے لئے کن کن اشیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کون کون ان کو فراہم کرتے ہیں۔ کس طرح سے وہ ان کو فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ ان مواقع پر بچے کے لئے سماج کا سبق سیکھتا ہے پھر اگر بچہ کو یہ سمجھایا جائے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے اپنے بچاؤ کے لئے کون کون سے طریقے اختیار کئے ہیں تو پھر ہم بچوں کو انسانی زندگی کے ارتقا یا تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ کسی ایک ہی مشغلہ کے دوران میں زندگی کے ان تمام تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بچہ کہیں پر حساب سیکھتا ہے۔ کہیں ڈرائنگ سیکھتا ہے کہیں جغرافیہ اور تاریخ کا سبق لیتا ہے۔ کیونکہ بچے کے اندر اتنی ذہنی پختگی نہیں پائی جاتی کہ وہ زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر الگ الگ طور پر سوچ سکے۔ البتہ صحیح موقعہ پر ان مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور ان کو تعلیمی اغراض کے لئے استعمال کرنا معلم کا کام ہے۔ کیونکہ بچہ خود بخود ان تعلیمی حقیقتوں کا تجزیہ کر کے ان پر نہیں سوچ سکتا اور نہ اس طرح کا سوچنا سادہ زندگی کا شیوہ ہے۔ بچے تو کیا بڑے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے دور میں یہ تقسیم

نہیں کرپاتے ہیں۔ یہ دراصل متمدن اور ترقی یافتہ زندگی کی ایک ضرورت ہے کہ زندگی کے گوناگوں تجربات کو چند موٹے موٹے اصول اور کلیات کی روشنی میں سمجھا جائے۔ چنانچہ تمدنی سلسلے کی بدولت جب انسان کے پاس تجربوں کا ذخیرہ ہونے لگا۔ اس وقت کاٹ چھانٹ ترتیب وتدوین کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس وقت اصولی ضابطوں کے بغیر زندگی کے مختلف مظاہر کا سمجھنا مشکل تھا۔ اس لئے جہاں زندگی کے مختلف تجربے مختلف طبعی اور تمدنی علوم میں بٹ گئے، وہاں پر بھی ہر ایک علم کے اصول اور قواعد مرتب کرنے پڑے۔ غرض بچہ بڑوں کے برخلاف اپنی زندگی میں مضامین کو اس طرح الگ الگ کرکے نہیں سیکھتا البتہ جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھتی جائے، اور اس کا تجربہ وسیع ہوتا جائے، معلومات کو پھر منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس وقت بھی الگ الگ مضامین کے سماجی پہلو کو نظرانداز کرنا ان کو تقریبًا پھیکا اور بے معنی بنا سکتا ہے، کیونکہ معلومات بذات خود علم اور تجربات کی توسیع کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنا کہ ان کو سیکھنے کی ضرورت کا احساس ہوتا۔ تاکہ ایک تو طلبہ اس کے حاصل کرنے میں پوری توجہ مرکوز کرسکیں اور دوسرے اس بات کو سمجھیں کہ سماجی زندگی میں کسی علم وہنر کی قدر ومنزلت کیا ہے اور اس نے سماج کے بدلنے میں کیا مدد دی ہے اس طرح سے بچہ صحیح معنوں میں تمدنی ارتقا سے واقف ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ سہولت کے ساتھ موجودہ زندگی کے مسائل کو ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھنے کی اہلیت پیدا کرے گا۔

غرض بچے کی مخصوص نفسیاتی کیفیت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ کس طرح اس کے تجربات کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے؛ کس طرح وہ شروع میں بالکل اپنی شخصی تعلقات کی چھوٹی سی دنیا میں رہتا ہے اور کس طرح علم کی روشنی اس کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ پہنچتی ہے؛ اس لئے معلم کا کام یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کی ضروریات کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑوں کے تجربات کو سادہ کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ اصطلاحی شکل میں ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرے

اس طرح کی جلد بازی سے بچے کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بے مقصد طریقہ
پر پڑھانے سے اس کو مدرسہ کی پڑھائی اور استاد سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ
معلوم ہونا چاہیئے کہ بچے کی زندگی کی نازک جڑیں خود بھی سماجی زندگی سے خوراک حاصل کرنے
میں لگی رہتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس عمل میں تدریجی طور پر بچے کی مدد کریں اور سماج
کی منتخب اچھائیوں اور ہنرمندیوں سے بچوں کو اس طرح سے روشناس کرائیں کہ جو کچھ بچوں کو
پڑھایا جائے وہ ان کے روزمرہ کے تجربات اور مشاہدات سے تعلق رکھے۔ اس لئے علم
اور بچے کی زندگی کو دو متضاد چیزیں نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ سیکھنے کو بچے کی زندگی کی قدرتی نشو
نما کا ایک لازمی عمل سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی کے دوران میں تمدنی زندگی کے مختلف
تجربات میں سے کسی نہ کسی صورت سے گزرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا موجودہ تمدن جس معیار
پر پہنچا ہے اور جس تیزی کے ساتھ آگے کو بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر زندگی سے
تطابق حاصل کرنے کے لئے بچے کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ سیکھنے پر نہیں چھوڑا جا سکتا
اور اس لئے پڑھائی کے سلسلہ میں ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضرور کسی نہ کسی طرح اصطلاحی علم اور
منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ لیکن بالکل ابتدائی تعلیم میں بچے کی مربوط زندگی کو جہاں
پر وہ مجرد حقیقتوں کے ذہنی تجربے کرنے کے قابل نہیں ہوتا، الگ الگ مجرد معلومات میں بانٹ
دینا اس کی ایک اہم ضرورت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ استاد اپنے کام میں
مختلف معلومات کا کوئی واضح تصور نہ رکھے۔ بلکہ استاد کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک تعلیمی مشغلہ
کی تعلیمی قدروں کی صحیح پڑتال کر کے دیکھے کہ اس میں بچوں کے سیکھنے کے لئے کون کون سے اہم
مواقع نکل سکتے ہیں اور کون مواقع کن کن تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کئے
جا سکتے ہیں؟ اگر ہم کتاب کی بجائے بچے کو مرکز بنائیں اور صرف خاموشی سے سننے والے بچے
کی بجائے چلتے پھرتے اور کام میں مشغول بچے کا تصور کریں جو کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور کرنے
سے سیکھنا چاہتا ہے۔ تو پھر ہم کو اپنے تعلیمی نقطہ نظر میں بہت بنیادی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ پھر ہم

صحیح معنوں میں بچے کے مشاغل کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں گے۔ جان ڈیوی نے جو تعلیم میں سب سے پہلے اس خیال کے علمبردار ہیں اپنی کتاب The school and the child میں استادوں کو جو مشورہ دیا ہے۔ اس کو ہم یہاں پر اپنی راہ نمائی کے لئے درج کرتے ہیں: "اس بات کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ کہ نصاب کے مضامین بذات خود کوئی مقررہ اور بنی بنائی چیز ہیں۔ جو بچے کی زندگی سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ بھی نہ سمجھو کہ بچے کے تجربات بالکل اٹل اور جامد ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ بچے کی ان سادہ شغلوں میں لوچ، نمو پذیری اور زندگی پائی جاتی ہے اور ہمیں خیال کرنا چاہیے کہ بچہ اور نصاب تعلیم کے دو ایسے نشان ہیں جو ایک ہی عمل کے دو سروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس طرح علم ہندسہ میں دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ ایک خط کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح تعلیم بچے کی موجودہ زندگی اور درسی علوم کے باہمی رشتہ سے عبارت ہے تعلیم ایک مسلسل تعمیر نو کا نام ہے۔ جو بچے کے موجودہ تجربات سے شروع ہو کر سماج کی ان منظم حقیقتوں کے مجموعے تک پہنچ جاتی ہے جن کو ہم علوم و فنون کہتے ہیں۔"

بچے کو مرکز ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ پھر ہم مختلف مضامین کو کس طرح بچے کی مشغول زندگی میں کھپا سکتے ہیں کیونکہ نئی تعلیم اور پرانی تعلیم میں بنیادی فرق یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی پرانی تعلیم میں درسی معلومات تعلیم کا مرکز ہوتی ہیں اور نئی تعلیم میں بچے کی زندگی۔ پرانی تعلیم میں مجرد معلومات کو آسان کر کے بچوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور نئی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان معلومات کو بچے کے سامنے پیش کرنے کے سماجی مشاغل کو بطور ذریعہ استعمال کرنا چاہئے یعنی یہ کہ سماج میں طرح طرح کے مشاغل پائے جاتے ہیں۔ بعض مشاغل خام اشیاء کے کام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے زراعت، باغ بانی۔ ماہی گیری اور کان کنی وغیرہ اور بعض کام صنعت و دستکاری سے تعلق رکھتے ہیں یعنی پھر لوگ اس خاص پیداوار میں تصرف کر کے اس کو سماج کی ضروریات کے قابل بنا دیتے ہیں اور کچھ کام لین دین سے تعلق رکھتے ہیں یہی چیزیں لوگوں تک مختلف تاجروں کے ذریعے سے پہنچتی ہیں اور پھر خریداروں کو خود بھی اپنی ضروریات کو دیکھتے ہوئے مختلف

چیزوں کی خریداری کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ کون سی چیز پائیداری اور خوبصورتی کے اعتبار سے زیادہ مفید ہے اور کون سی کم۔ اس لئے ان تمام مشاغل کے سلسلے میں بعض ایسی ہنرمندیوں کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے جن کے بغیر ان ضرورتوں کو پورا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے لازماً ہر مشغلہ کے ضمن میں ہمیں تھوڑا تھوڑا کرکے ان کو کسی نہ کسی طرح سیکھنا پڑتا ہے۔ نئی تعلیم والوں کا مقصد یہ ہے کہ پڑھانے والوں کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سیکھنے کا بالکل قدرتی طریقہ ہے۔ سماجی مشاغل کے ذریعہ آدمی نے نتیجے کے طور پر یہ سارا علم سیکھا ہے اور نئی نسل بھی اسی طرح سے اس کو سیکھ سکتی ہے۔ چنانچہ پراجکٹ میتھڈ اور حرفہ کے ذریعہ پڑھانے والوں کا بنیادی خیال یہی ہے۔ بنیادی تعلیم والے بھی حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں اسی مقصد کے پیش نظر شامل کرتے ہیں۔

بچے کو مرکز مان کر نئی تعلیم والے درسی مضامین کی حیثیت کو گرانا نہیں چاہتے۔ البتہ اس کو بچے کی ہم آہنگ اور مجموعی تعلیم و تربیت کے لئے وسائل کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں پر نئی تعلیم کے مقاصد کے پیش نظر تعلیم دی جا رہی ہے، وہاں پر بھی مقررہ نصاب کو پورا کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر یہاں پر بچے کی عملی دلچسپی مقدم ہوتی ہے اور مضامین کو عملی مشاغل کے دوران میں جو سیکھنے کے مختلف مواقع آتے ہیں، ثانوی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔ اس طرح کی پڑھائی کو نئی تعلیم میں ربط مضامین کہتے ہیں۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں بھی جہاں پر استاد حرفہ کے ذریعہ تعلیم دیتا ہے۔ اپنے پروگرام کے تختے پر الگ الگ مضامین مثلاً زبان حساب، سماجی مطالعہ اور عام سائنس کے خانے قائم کرتا ہے یہ مضامین مختلف عملی مشاغل اور بچوں کے ماحول کی مناسبت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس تقسیم کا فائدہ یہ ہے کہ استاد کے ذہن میں اس بات کا تصور واضح ہو جائے کہ بچہ اپنے عملی مشاغل کے دوران میں کون کون سی ایسی منزلوں میں سے گزرتا ہے جہاں پر اس کو ان مضامین کے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا کم از کم وہ اس موقع پر خاص باتیں سیکھنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ مواقع بعض مرتبہ صاف طور پر نظر نہیں آتے مگر دیکھنے والے ان مواقع کی دھندلی سی جھلک بچے کے معمولی مشاغل، ان کے ماحول اور خود ان کی گفتگو میں دیکھ

سکتے ہیں۔ وہ اکثر ایسی چیزوں سے وابستہ نظر آئیں گے، جہاں پر ان کی دلچسپیوں کو تعلیمی کاموں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کی معلومات کو مختلف مضامین کے عنوانات کے نام سے تقسیم کرنا اس لئے ضروری ہے کہ استاد ان کی روشنی میں بچے کے تعلیمی مشاغل کی حیثیت کو جانچ سکے اور ان کی مدد سے بچے کی بالکل سادہ اور ابتدائی زندگی میں بھی ان صحیح قدروں کی آبیاری کر سکے جن پر متمدن زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم شروع ہی سے بچوں کے مشاغل میں تعلیمی اور ترقی پذیر رجحانات کا اندازہ کر سکیں، تو ہم زیادہ یقین کے ساتھ ترقی پذیر اور تسلی بخش زندگی کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

بچوں کی دلچسپیاں کئی طرح کی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن سے بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد لی جا سکتی ہے اور ایسی بھی جن میں شرکت کرنے سے کوئی تعلیمی اور تربیتی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے استاد کو اس معاملہ میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کو چاہیئے کہ مختلف مشاغل کے دوران میں وہ ایسے مواقع یا ضمنی مشاغل کی کھوج میں لگا رہے۔ جہاں سے وہ بچے کی تعلیمی زندگی کو ٹھیک راستے پر لگا سکے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ بچے ایسے مشاغل میں لگ جائیں جو ان کے لئے بذاتِ خود تو دلچسپ ہوں مگر ان سے کوئی تعلیمی فائدہ مترتب نہ ہو سکے۔ اس لئے جس طرح کسی خاص مضمون کو مقصود بالذات سمجھ کر پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی بڑا حصہ نہیں لیتا۔ اسی طرح کسی دلچسپی کو محض دلچسپی کی غرض سے پورا کرنا ہمارے تعلیمی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دلچسپی یا مشغلہ میں بچے کی مجموعی (جسمانی اور ذہنی) نشو و نما کے لئے کون کون سے جاندار عناصر موجود ہیں جن کو کام میں لا کر ہم بچے کو چند قدم آگے بڑھا سکیں یہ بات ہم اس لئے صاف کرنا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے نئی تعلیم کی نسبت جس میں کہ بچوں کی دلچسپی کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے "پڑھانے والوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ بچے کی دلچسپیوں کو پورا کرنا ہی سب کچھ ہے۔ بچے تو کیا بڑوں کی دلچسپیوں میں سے بھی ہم ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جو تعلیمی ترقی کے اعتبار سے ہرگز بارآور نہیں کہی جا سکتیں اور جن کی حیثیت دماغی عیاشی یا اوقات گزاری سے زیادہ

نہیں ہے۔ مثال کے طور پر شطرنج کو لیجئے۔ شطرنج کھیلنے والا صرف شطرنج ہی کھیل کر اپنی زندگی کو تمدنی قدروں سے مالا مال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شطرنج کھیلنے والا اس اعتبار سے کولھو کے بیل کی طرح ساری عمر ایک ہی محدود دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے اور جب آنکھوں سے پٹی اترتی ہے تو اپنے آپ کو وہیں کا وہیں کھڑا پاتا ہے۔ اس لئے تعلیمی مشاغل کے انتخاب میں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بنیادی تعلیم میں حرفوں کو متعین کر کے اس خطرے کو بہت کچھ کم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں جتنے حرفے منتخب کئے گئے ہیں، ایک تو ان کی اجتماعی قدر و قیمت اس قدر ہے کہ اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے ان میں درسی مضامین کو کھپانے کی لوچ اور وسعت موجود ہے۔ ہر ایک حرفہ ہماری تمدنی زندگی کی کسی اہم سے اہم ضرورت کی کفالت کرتا ہے۔ اس لئے ہر حرفے کے سلسلے میں ایسے ضمنی مشاغل اور دلچسپیاں نکل سکتی ہیں جو ہماری پوری درسی تعلیم کی مہارتوں کو اپنے اندر سمیٹ سکیں۔

حرفے کے ذریعے تعلیم دینے کے سلسلے میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ معلم اس کی صحیح تعلیمی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بنیادی تعلیم والوں نے حرفوں کا تعین کر کے اس بات میں معلم کی ضرور مدد کی ہے کہ وہ صرف بچوں کی دلچسپی کو مرکز مان کر ایسے غیر تعلیمی مشاغل میں نہ الجھ جائیں جن سے بچے کو کوئی تعلیمی فائدہ نہ پہنچے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان حرفوں ہی کو مقصد مان کر دستی مہارت میں خصوصیت پیدا کرنے کی خاطر بچے کی عام تعلیم سے بے اعتنائی کی جائے۔ نصاب کے دئے ہوئے حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں مرکزی حیثیت ضرور دینی چاہیئے مگر بنیادی حرفے کے سلسلے میں جو ضمنی مشاغل نکلتے ہیں اور جن کو بچے خوشی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف سے معلم کو چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو کام میں تنوع کی وجہ سے نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور حرفے کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بچے کی عام واقفیت بڑھتی جاتی ہے اور کام کی نوعیت زیادہ تخلیقی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی آزادی سے بچہ اس تنگ نظری اور یک طرفہ تربیت سے بچ جاتا جس کا معمولی دستکاری سے پیدا ہونے

کا اندیشہ ہے اور دوسری طرف ضمنی مشاغل کے دوران میں کثرت سے ایسے مواقع نکل سکتے ہیں جن کے ذریعہ درسی مشاغل کی وجہ سے طالب علم کو کام کرنے کے لئے اور درسی مضامین کو سیکھنے کے لئے ایک بہت بڑا میدان ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لئے بنیادی حرفے کو وسیع نقطہ نظر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر حرفے کے میدان کو تنگ کر دیا جائے اور صرف براہ راست اسی کے ذریعہ ہم تعلیم دینا چاہیں، تو اس طرح سے ہم اپنے تعلیمی میدان عمل کو تنگ کریں گے اور ان متنوع تجربات سے تعلیمی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جو مرکزی حرفہ کے دوران میں نکلتے رہیں گے

یہ ضرور ہے کہ استاد کو اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ کسی عمر میں بچوں کی دلچسپیوں اور تجربوں کو کہاں تک بڑھایا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ کسی خاص موقع سے مدد لے کر ہم کتنا تعلیمی مواد بچے کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں استاد کو لازمی طور پر بچوں کی استعداد کا لحاظ رکھنا ہوگا اور نصاب کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کے تعلیمی حدود متعین کرنے میں استاد کی راہ نمائی کرے۔ اس لئے نصاب کا متعین ہونا بھی استاد کو اس حق سے محروم نہیں کرتا کہ وہ مقررہ معلومات زندگی کے مختلف مشاغل کی صورت میں موقع موقع پر بچوں کو دیتا رہے البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ استاد کے دیئے ہوئے نصاب کی ترتیب کی ہو بہو پابندی بھی کر سکے کیونکہ مختلف مشاغل کے دوران میں جو جو مواقع نکلتے رہتے ہیں، ان کو پہلے ہی سے کسی مقررہ ترتیب کے ساتھ بھانپ لینا ناممکن ہے اس لئے کہ بچوں کے مشاغل میں اس قدر لوچ اور تغیر پذیری ہوتی ہے کہ ہر قدم پر نصاب کی مقررہ ترتیب کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم استاد کے ذہن میں نصاب کی نوعیت اور تعلیمی حدود کا تصور واضح ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر موقع پر نصاب کے جزویات کو بہترین تعلیمی موقعوں پر برت سکے اس لئے جن مدرسوں میں حکومت کی طرف سے مقررہ نصاب کی پابندی لازم بھی قرار دی گئی ہے وہاں بھی بچوں کو حرفوں کے ذریعہ بہت حد تک پڑھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر نصاب میں ایسی معلومات کا پڑھانا رکھا گیا ہے جو بچوں کی

زندگی سے دور ہیں تو یہ نصاب کی کمی ہے اور اس کو پورا کرنا چاہیئے۔

بات یہ ہے کہ ہم نے علم کو زندگی سے سیکھا ہے اور ہم زندگی ہی کے ذریعہ پھر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے۔ کہ یہ زندگی سے الگ ہو گئی ہے۔ اس نے نظری اور کتابی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لیے اس کی نامی خصوصیت کی جگہ میکانکی طرز تعلیم نے لے لی ہے اور میکانکی ہونے کی وجہ سے جو خرابیاں لازم آتی ہیں وہ سب اس میں آگئی ہیں۔ تعلیم کے متعلق بچوں کا رویہ تجربی ہونے کی بجائے بالکل روایتی ہو گیا ہے۔ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ رٹنے کی توقع کی جاتی ہے۔ جو کچھ انھیں پڑھایا جاتا ہے اس کی وہ ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے موجودہ تعلیم طوطے کی تعلیم کہلاتی ہے۔ درجہ میں استاد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ طالب علم کی ہستی نفی کے برابر ہوتی ہے۔ تعلیمی پروگرام میں بچے کی ذاتی اپج اور سیکھنے کی قدرتی صلاحیتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ پروفیسر جان ڈوی نے اس قسم کی رسمی تعلیم کی جو بڑی بڑی خامیاں ظاہر کی ہیں۔ ہم ان کو مختصر طور پر یہاں ذکر کرتے ہیں۔

"پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ بچے کو پڑھایا جاتا ہے اور جو کچھ بچہ دیکھتا، پسند کرتا، اور محسوس کرتا ہے۔ ان میں کوئی زندہ رشتہ نہیں پایا جاتا۔ یہ چیز بچے کی معلومات کو بالکل رسمی بنا دیتی ہے۔ البتہ جب یہ رسمی علم حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ جس کی مدد سے انسان کسی نئی حقیقت کا کھوج لگا سکے۔ تو اس وقت یہ علامات بھی اصلیت رکھتی ہیں۔ علم کی رسمی علامتیں جو باہر سے بچے پر تھوپ دی جاتی ہیں اور جن کو بچے نے اپنے ابتدائی تجربات میں ٹھوس طریقے پر محسوس نہیں کیا ہے، وہ صرف علامت ہی علامت ہے۔ اس کا سیکھنا بچے کے لئے بالکل بے روح اور غیر دلچسپ ہے۔"

"دوسری خرابی جو اس طرح کی بیرونی طور پر عائد کردہ تعلیم سے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے۔ کہ اس میں سیکھنے کے لئے بچے کے اندر کوئی آمادگی نہیں پائی جاتی۔ اس میں نہ صرف گزشتہ محسوس کی ہوئی حقیقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ نئی صداقتوں کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہاں تو سرے سے سیکھنے کے لئے خواہش، ضرورت اور بے چینی نہیں پائی جاتی۔ جب مضامین کو

نفسیاتی رنگ دیا جاتا ہے' یعنی ان کو مجوزہ رجحانات اور مشاغل کی ترقی یافتہ صورت سمجھا جاتا ہے
تو پھر یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ موجودہ مشاغل کے دوران میں بعض علمی' ذہنی اور اخلاقی مشکلات
کا اندازہ کر کے ان کو کسی متعلقہ صداقت کو سیکھنے کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اس ضرورت سے
آدمی سیکھنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ بچے کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تو پھر وہ اپنی تکمیل
کے لئے بچے کو وسائل ڈھونڈنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن جب درسی معلومات بچے کے سامنے
براہ راست اسباق کی صورت میں اس لئے پیش کی جاتی ہیں۔ کہ بچہ انہی کو مقصد سمجھ کر سیکھے۔
تو پھر مقصد اور ضرورت کے ملانے والے رشتے کا غائب ہو جانا صاف صاف طور پر محسوس
ہوتا ہے۔ جب ہم تدریس کے سلسلے میں میکانکی اور مردہ طریقہ تعلیم کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس سے
ہمارا مطلب اسی تعلیمی محرک کی کمی ہوتا ہے۔ نامی اور زندہ تعلیم نام ہے باہمی ردعمل کا جو ذہنی طلب
اور اس کی تسکین کے لئے مادی ذرائع کی رسد سے پورا ہوتا ہے۔"

تیسری خرابی یہ ہے۔ کہ نہایت مستند معلومات کو بھی اگر بہت عمدہ منطقی ترتیب کے ساتھ
بیرونی طور پر بچے کے سامنے بنی بنائی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ تو اس وقت بھی بچے کے
لئے اس میں کوئی منطقی ترتیب نہیں رہتی۔ ضرور اس میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔
کیونکہ کہیں مشکل حصوں کو نکالنا پڑتا ہے۔ کہیں ان کو ہموار کر کے آسان کرنا پڑتا ہے۔ اس
لئے خود بچے کے ذہن میں جو معلومات کی ترتیب ہوتی ہے اور جس کو بچے کی زندگی کی ضروریات
مقرر کر دیتی ہے۔ وہ قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے جب معلومات کو بیرونی طور پر بچے کی موجودہ ضروریات
سے قطع تعلق کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ تو ان میں وہ ترتیب اور قوت نہیں رہتی۔ جو ایک طرف
بچے کی گزشتہ معلومات کے ساتھ جوڑ کھائے اور دوسری طرف اس کو آگے سوچنے پر ابھارے۔

برطانیہ کی عالمگیر سلطنت

برطانوی سلطنت کیا ہے؟ دنیا کا تقریباً ایک چوتھائی رقبہ برطانیہ کی سلطنت میں شامل ہے۔ اسی طرح دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی یعنی ۴۰ کروڑ سے زیادہ نفوس برطانیہ کے ماتحت ہیں[1]۔ برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کے جو حصے شامل ہیں انہیں سامنے کے صفحہ پر نقشہ کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے بڑے بڑے علاقے حسب ذیل ہیں:-

۱- جزائر برطانیہ	۴- کناڈا
۲- ہندوستان	۵- آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ
۳- جنوبی افریقہ کا اتحاد اور افریقہ کے دوسرے علاقے	۶- ریاست ہائے ملایا

اس کے علاوہ برطانیہ کی سلطنت میں بہت سے چھوٹے جزیرے شامل ہیں جو دنیا کے ساتوں سمندروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور بہت سی عمدہ بندرگاہیں برطانیہ نے غیر ملکوں میں حاصل کر رکھی ہیں۔

بعض ملکوں کو جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنس نے یورپ کے دول کی حفاظت میں دے دیا تھا اس سلسلہ میں عراق (میسوپوٹامیا) اور افریقہ کے بہت سے ایسے علاقے جو پہلے جرمنی کے قبضہ میں تھے برطانیہ کی نگرانی میں آ گئے ہیں۔ مصر کو بھی بعض وقت برطانوی سلطنت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] یہ ماتحتی مکمل نہیں ہے سلطنت کے بہت سے حصے خودمختار ہو گئے ہیں اور اب انہیں نوآبادی کی جگہ ڈومینین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برطانوی سلطنت کا سرکاری نام بھی سنہ ۱۹۲۱ء سے برٹش کامن ویلتھ آف نیشنس "اقوام کی برطانوی دولت مشترکہ" رکھ دیا گیا ہے۔ تمام سلطنت کا سردار بادشاہ کو سمجھا جاتا ہے لیکن جملہ سیاسی معاملات میں وزیر اعظم اور اس کے ساتھی بادشاہ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور یہ لوگ برطانوی پارلیمنٹ
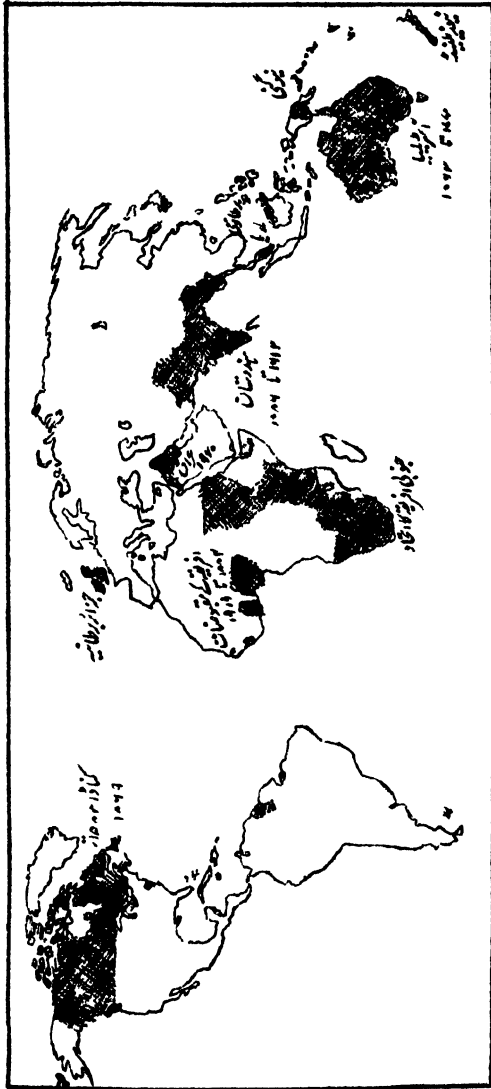
دنیا کے تمام براعظموں کی زمینیں برطانوی سلطنت میں شامل ہیں ان میں سے خاص خاص کو ان تاریخوں کے ساتھ جب وہ برطانوی سلطنت میں شامل ہوئیں نقشہ میں دکھایا گیا۔

برطانیہ عظمیٰ کا برطانیہ کی وسیع سلطنت سے مقابلہ

برطانیہ کے قبضہ میں جو خاص خاص علاقے ہیں ان میں سے کوئی علاقہ بھی برطانیہ عظمیٰ کے برابر مختصر نہیں ہے۔ کناڈا، آسٹریلیا، افریقہ کے برطانوی مقبوضات اور ہندوستان ــــ ان ملکوں کے صرف صوبوں کا مقابلہ جب برطانیہ سے کیا جاتا ہے تو ان میں سے ہر ایک کا رقبہ انفرادی طور پر جزائر برطانیہ کے رقبہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس وسیع سلطنت میں ہندوستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جزائر برطانیہ کی آبادی چار کروڑ تیں لاکھ ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ہے۔ ہندوستان کے صوبہ بنگال اور صوبہ جات متحدہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی آبادی برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے پنجاب، صوبہ جات متحدہ اور صوبہ جات متوسط ان میں سے ہر ایک برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ بڑا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ کر کے دکھلایا گیا ہے۔ اسی طرح کا مقابلہ دنیا کے نقشہ کو دیکھ کر برطانیہ کی سلطنت کے دوسرے حصوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔
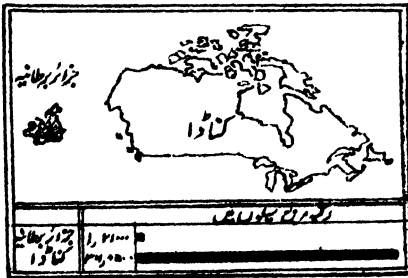
جزائر برطانیہ

کناڈا

رقبہ مربع میلوں میں

جزائر برطانیہ	[illegible]
کناڈا	[illegible]

برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ۔ کناڈا برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے

برطانیہ کیوں زمین کے اس قدر بڑے حصے پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتا ہے

اس سلطنت کو بنانے کے لئے برطانیہ کے بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں جنگ کے میدانوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں قربان کی ہیں۔ انھوں نے سردی گرمی،

(بقیہ نوٹ صفحہ   ) کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کے لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان علاقوں کا مجموعی طور پر جب ذکر کیا جاتا ہے تو انھیں "سلطنت متحدہ برطانیہ و شمالی آئرلینڈ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نام میں پہلے بہت سالوں تک پورا آئرلینڈ شامل تھا لیکن ۱۹۲۲ء سے آئرلینڈ کے جنوبی حصہ کو آئرش فری اسٹیٹ کے نام سے خود مختار ڈومینین بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کناڈا اور آسٹریلیا بھی برطانیہ کی نگرانی سے تقریباً بالکل آزاد ہیں۔

بھوک اور بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کیا ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ بہت سے وجوہ کی بنا پر کیا ہے کچھ لوگوں نے تو اپنے وطن کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اور سلطنت برطانیہ پر ناز کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ کچھ لوگ اتنے من چلے اور مہم پسند تھے کہ ان سے گھر پر چین سے نہیں بیٹھا جاتا تھا اس لئے خطرات برداشت کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ ہندوستان، آسٹریلیا یا کناڈا کو اس وجہ سے روانہ ہوئے کہ انگلستان میں آبادی بہت زیادہ ہو گئی تھی اور کھیتی کے لئے وہاں زمین موجود نہیں تھی۔ کچھ لوگ سونے کی تلاش میں روانہ ہوئے اور کچھ ریلیں بنانے کے لئے۔

لیکن سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ انگریز اپنی زندگی کو بہتر طریقے پر گزارنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے ماتحت ہزاروں انگریز بحر اٹلانٹک کو عبور کر کے شمالی امریکہ پہنچ گئے اور ہزاروں جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر بس گئے۔ غرضکہ برطانوی سلطنت کی تعمیر میں زیادہ اچھی اور زیادہ آزاد زندگی کی خواہش کا حصہ بہت اہم ہے۔

پھر سلطنت کے ترقی پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزوں کو تجارت کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ہم پچھلی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ جتنی برطانیہ کی تجارت بڑھتی گئی اتنی ہی اس کی سلطنت بھی زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ ان دونوں کی ترقی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ جیسے جیسے میں میزوں کا انگلستان جدید صنعتی برطانیہ عظمیٰ بنتا رہا ویسے ویسے برطانوی سلطنت بھی وسیع ہوتی رہی۔ اس تبدیلی کی کہانی تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ انگلستان ہی وہ پہلا ملک تھا جس میں مشینوں اور انجنوں کا استعمال شروع ہوا اور بڑے پیمانہ پر مشینوں کے ذریعہ چیزیں بنائی جانے لگیں۔ انگریزوں کی آبادی نے اپنے کھیتوں کو چھوڑ دیا اور شہروں میں کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ اس جزیرے کی آبادی بڑھتی رہی غذا کی پیداوار کم ہوتی گئی اور مصنوعہ چیزیں زیادہ تعداد میں بنائی جانے لگیں۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ تجارت کو برطانوی سلطنت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سلطنت اس لئے بنائی گئی ہے تاکہ مال کے خریدنے

اور فروخت کرنے سے نفع کمایا جائے۔ سنہ۱۵ء کے بعد سے جس علاقہ کی برطانیہ نے نگرانی شروع کی ہے وہاں اس نے تجارت کو بھی ضرور شروع کیا ہے۔

اتنی بڑی سلطنت برطانیہ کے قبضہ میں کس طرح آئی ہے

لیکن اس بات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ جیسے چھوٹے سے ملک نے کس طرح زمین کے اتنے وسیع رقبوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بارے میں بہت سی کتابیں انگریز مصنفوں نے لکھی ہیں جس میں انگریزوں کی جرأت ہمت اور خطرات پسندی کی بڑی تعریفیں کی گئی ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح خشکی اور سمندر میں لڑائیاں لڑکر اور مصیبتیں جھیل کر انگریزوں نے اپنی سلطنت کو پھیلایا۔ یہاں اس کا حال صرف مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ہندوستان کی مثال کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے کہ برطانیہ کی سلطنت کو کس طرح وسعت حاصل ہوئی۔

ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ کس طرح ہوا

انگریز یہ چاہتے تھے کہ کسی خوب آباد ملک کے ساتھ تجارت کریں۔ تین سو سال گذرے انھوں نے نہایت حقیر پیمانہ پر اپنی تجارت کو شروع کیا۔ جو انگریز تاجر مشرقی ملکوں کو ڈھونڈنے نکلے تھے انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان سے اگر گرم مسالہ دھات کی چیزیں اور کپڑے خرید کر برطانیہ میں لے جائے جائیں اور وہاں فروخت کئے جائیں تو اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے بڑی مشکلوں سے ہندوستان تک جانے والے اور وہاں سے قیمتی سامان لادکر لانے والے جہاز حاصل کئے۔ بہت سے انگریزوں کا عقیدہ تھا کہ اس کام سے بہت نفع حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے انھوں نے کمپنی کے کاروبار میں اپنی پوری دولت لگادی۔

ابتدا میں کمپنی کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں اسے خوب نفع حاصل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ کمپنی اور برطانوی حکومت نے ہندوستان میں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے متفرق جگہوں پر حاصل کرنا شروع کئے۔ لیکن پھر دونوں کی حکومت مسلسل طریقہ پر ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد پر قائم ہونے لگی۔ ہندوستانی رئیسوں اور حکمرانوں کو شکست دی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی

نے اپنی حکومت خود قائم کرلی۔ ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا اس کی ماتحتی میں بہت سے افسران برطانوی اور ہندوستانی فوج رکھی گئی اور ان کے ذریعہ سے ملک میں امن قائم کیا گیا۔

تجارت بڑھتی رہی خصوصاً اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں انگریز ہندوستان کے گیہوں اور کپاس اور دوسری غذاؤں اور کچے مال پر بہت زیادہ دارومدار کرنے لگے اپنا مصنوعہ مال فروخت کرنے کے لئے بھی انگریزوں کو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور انگلستان کی مصنوعہ چیزوں کے لئے ہندوستان ایک نفع بخش منڈی بن گیا۔

لیکن ہندوستان کے لوگوں کے رسم و رواج اور مذہب انگریزوں جیسے نہیں تھے بلکہ ان سے مختلف تھے۔ بعض صورتوں میں انگریز حکمرانوں نے کوشش کی کہ ہندوستانی یورپ کے لوگوں جیسا طرز زندگی اختیار کرلیں لیکن ہندوستانیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ غرضکہ آخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں پر حکومت نہ کرسکی تو برطانوی حکومت نے سرکاری طور پر اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنالیا۔
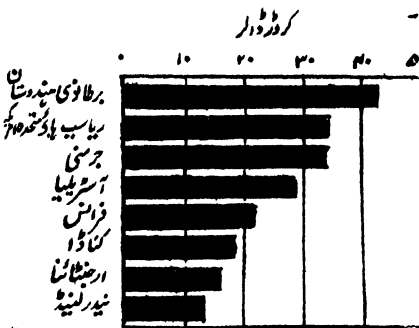
برطانیہ کے تاجر ہندوستان کے ساتھ بہت زبردست تجارت کرتے ہیں۔ اس تجارت کی سالانہ قیمت ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہوتی ہے۔ برطانیہ اتنا زیادہ مال دنیا کے کسی دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا۔ نہ امریکہ کے ہاتھ نہ جرمنی کے نہ فرانس کے کناڈا کو جتنا مال برآمد کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں یہ تین گنا ہے۔ ہندوستان کے لوگ بہت غریب ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے (برطانیہ سے تقریباً ۹ گنا) اس لئے اگرچہ ہر گاؤں انفرادی طور پر بہت کم مال خریدتا ہے لیکن بصورت

کروڑ ڈالر

۰ ۱۰ ۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰

برطانوی ہندوستان
ریاسہائے متحدہ امریکہ
جرمنی
آسٹریلیا
فرانس
کناڈا
ارجنٹائنا
نیدرلینڈ

اس نقشہ میں برطانیہ کے بہترین گاہکوں کو اور جتنی مقدار میں وہ چیزیں خریدتے ہیں انھیں دکھایا گیا ہے یہ بات دیکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستان دوسرے سب ملکوں سے زیادہ برطانیہ کا مال خریدتا ہے۔

مجموعی میزان بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں برطانیہ کی مشینیں، ویگنیں، موٹریں، لاریاں اور بھاپ کے انجن بڑی مقدار میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ پھر شہروں اور بڑے قصبوں میں چند بہت زیادہ امیر لوگ بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ٹھاٹھ اور عیش کے ساتھ رہتے ہیں انھوں نے یورپ کی زندگی کے معیاروں کو اختیار کر لیا ہے اور برطانیہ کا بنا ہوا بہت سا مال خریدتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل رکھنا اور اس کی تجارت پر نگرانی رکھنا چاہتا ہے۔

پھر ہندوستان سے برطانیہ غذا اور کچا مال بھی جو اس کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں بہت بڑی مقدار میں خریدتا رہتا ہے۔ ہندوستان سے ہر سال انگلستان کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے لئے روئی سے لدے ہوئے بہت سے جہاز روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گیہوں، چائے اور چاول، سن، اون اور چمڑا بھی بڑی مقداروں میں روانہ کیا جاتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوا کہ انگریز تاجروں کو ہندوستان سے بہت فائدہ پہنچا ہے اور انگلستان کے کارخانے اور ان کے مزدوروں کو ہندوستان کی پیداواروں اور ہندوستان کی منڈیوں پر بہت زیادہ دارومدار کرنا پڑتا ہے برطانوی سلطنت میں جتنے علاقے شامل ہیں ان سب میں تجارت کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان سب سے زیادہ بیش قیمت حصہ ہے۔

ہندوستان کا رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبے کے نصف سے زائد ہے لیکن اس کی آبادی امریکہ سے تین گنا زیادہ ہے۔

کناڈا اور آسٹریلیا برطانوی سلطنت کے تمام علاقوں میں ہندوستان کی آبادی سب سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی ہندوستان برطانوی سلطنت کا ایک مختصر

حصہ ہے۔ اس سلطنت کے جو دوسرے اجزا ہیں ان کے رقبہ بہت زیادہ وسیع ہیں۔ کناڈا، آسٹریلیا اور افریقہ کے مقبوضات سے ہندوستان کا مقابلہ کرنے سے یہ چیز سمجھ میں آسکتی ہے۔

سلطنت کے ساتھ ان دوسری نوآبادیوں کا الحاق مختلف طریقوں پر ہوا۔ ہندوستان میں تو انگلستان کو ایک پرانی اور خوب ترقی یافتہ تہذیب کو فتح کرنا پڑا اس کے بعد وہ اس کی سلطنت کا جزو بنا۔ لیکن کناڈا کا بیشتر حصہ اور آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کا پورا حصہ بالکل ویران تھا۔ جب انگریز پہلے پہل ان علاقوں میں گئے تو یورپ والوں کو ان کا علم نہیں تھا اور ان میں نیم مہذب اور قدیم ترین وضع کے دیسی لوگ آباد تھے۔ ان علاقوں کی زمین کو آباد ہونے کے بعد مفید بنایا جا سکا۔

برطانیہ کے ایسے باہمت لوگ جو گھر، دولت اور مہم کے آرزومند تھے وہ ان علاقوں میں ہر جگہ پہنچے۔ اپنے ساتھ اپنی انگریزی زبان، انگریزی لباس انگریزی قوانین، مراسم اور طرز لیاں لے گئے اور اپنے ان نئے گھروں میں انھوں نے ویسے ہی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی جیسی کہ وہ برطانیہ میں بسر کرتے تھے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یہ کام انھوں نے شمالی امریکہ میں جاری رکھا اور اپنی تیرہ نوآبادیاں بسائیں جو بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تشکیل میں برطانیہ سے آزاد ہوکر ایک الگ ریاست بن گئیں۔ اسی زمانے میں یہ لوگ کناڈا کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں بھی آباد ہوتے رہے۔ یہاں انھوں نے جنگلوں کو صاف کیا، زمین کو جوتا اور اپنے لئے مکانات تعمیر کیے کچھ بڑے قصبے اور شہر بھی بننا شروع ہو گئے چنانچہ آج کناڈا میں ۹۵ لاکھ آدمی آباد نظر آتے ہیں۔

اس کے بہت سال بعد اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ سے دوسرے لوگ دنیا کے کرہ کا نصف چکر کاٹ کر آسٹریلیا اور نیوزلینڈ کے ساحلوں پر پہنچے اور وہاں اپنی نوآبادیاں بسانے لگے۔ اس کے اور بعد انیسویں صدی میں برطانیہ کے بعض لوگ

جنوبی افریقہ کے اندرونی حصہ میں بھی داخل ہونے لگے اور یہ تمام زمینیں آہستہ آہستہ بڑی خوش حال نوآبادیاں بن گئیں۔

برطانیہ کے لوگوں نے ان نوآبادیوں میں اپنے لئے جو گھر بنائے وہ برطانیہ کے گھروں سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ جو لوگ سب سے پہلے ان نوآبادیوں میں جاکر بسے انھوں نے اپنے پرانے رواجوں، زبان، لباس اور طرز خیال کو قائم رکھا اور آج بھی مادر وطن سے بہت سالوں تک جدا رہنے اور شاید برطانیہ کو کبھی نہ دیکھنے کے باوجود کناڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور دوسری برطانوی نوآبادیوں کے لوگوں کو برطانیہ کے لوگوں اور اپنے آبائی وطن کے ساتھ بہت گہری وابستگی ہے اور جذبہ اور تنظیم کی اس یکجہتی کی بنا پر سلطنت کو "برطانوی نسل رکھنے والی قوموں کا خاندان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جب ان نئے براعظموں میں انگریز پہنچے تو انھوں نے بہت نئے اور عجیب عجیب قسم کے زندگی کے طریقوں کا مشاہدہ کیا اور اپنے نئے ماحول سے جس طرح انھوں نے مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد کی اس کو پڑھ کر بہت جوش پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جگہ انھیں مخالف دیسیوں، جنگلی درندوں اور فطرت کی پیدا کی ہوئی دشواریوں کے ساتھ جنگ کرنا اور ان کو قابو میں لانا پڑا۔ برطانوی سلطنت کے دوسرے خاص خاص حصوں کو جس طرح حاصل کیا گیا اس کا یہاں محض ایک خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہر نوآبادی کی کہانی ہندوستان سے مختلف ہے لیکن اس کا عام انداز تقریباً یکساں ہے۔ برطانوی سلطنت کے تمام حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تو ممکن نہیں ہے اس لئے یہاں صرف بحر روم اور افریقہ کے مقبوضات کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی جائیں گی۔

بحر روم اور افریقہ میں برطانوی مقبوضات — دو سو سال سے برابر برطانیہ بحر روم کے اندر اور اس کے آس پاس زمین حاصل کرتی رہی ہے۔ ایک ایک کرکے اس نے مندرجہ ذیل کو اپنی سلطنت میں شامل کیا ہے:-

۱۷۱۳ء بحر روم کے مغربی دروازہ پر جبرالٹر کا قلعہ

۱۸۱۴ء	مالٹا کا جزیرہ
۱۸۲۹ء	عدن جو بحر احمر سے نکلتے وقت شمالی ساحل پر واقع ہے۔
۱۸۷۵ء	نہر سویز کی نگرانی کا خاص حق
۱۸۷۸ء	سائپرس کا جزیرہ
۱۸۸۲ء	مصر پر قبضہ (لیکن اب مصر آزاد ہوگیا ہے البتہ اینگلو مصری سوڈان پر برطانیہ کا قبضہ ہے)
۱۸۸۴ء	بحر احمر میں عدن کے بالمقابل برٹش شمالی لینڈ

ان زمینوں کو حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کو بہت جد و جہد کرنا پڑی۔ یہ مقامات رقبہ کے لحاظ سے تو غیر اہم ہیں لیکن ان پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لئے بہت ضروری تھا۔ اول تو اس لئے تاکہ بحر روم کے زرخیز علاقہ کی تجارت پر قبضہ کرنے میں مدد ملے اور دوسرے اس لئے تاکہ ہندوستان کو اس کے جو جہاز جاتے ہیں ان کا تحفظ کیا جا سکے۔ غالباً دوسری وجہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

بحر روم کے آس پاس جو زمینیں واقع ہیں انھیں ہزاروں سال سے برابر تجارتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان علاقوں میں قدیم زمانہ میں مصر، فنشیا، کریٹ، یونان اور روم کے جہاز قیمتی مال لایا لے جایا کرتے تھے۔ پھر ایک ہزار سال بعد وینس، جنوآ اور برگس کے جہاز اسکندریہ میں اپنا مال ایشیا کے تاجروں سے تبادلہ کرنے کے لئے لایا کرتے تھے۔ بحر روم کے ساحلوں پر ہی مصریوں یونانیوں، رومیوں اور مسلم ترکوں کی وسیع سلطنتوں نے ترقی پائی۔

پھر جب صلیبی جنگیں ہو چکیں اور یورپ والوں نے مشرقی ایشیا کے ملکوں سے واقفیت حاصل کرلی تو مشرق و مغرب کی تجارت کے لئے بحر روم کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی بحر روم کے پورے علاقہ میں تجارت کی بہت زیادہ گرم بازاری پائی جاتی ہے۔ اس کے اردگرد تقریباً ۲۰ کروڑ لوگ آباد ہیں اور ان کا گذر اس طرح چلتا ہے کہ یہ باہر کی دنیا سے تجارت کرنے کے لئے جہازوں پر مال لادکر لے جاتے رہتے ہیں۔ اس کے ساحل پر فرانس، اسپین، اٹلی (ان تینوں کی افریقہ میں نوآبادیاں

ہیں) یونان، یوگوسلاویا، ترکی، شام، فلسطین اور مصر آباد ہیں۔ ان ملکوں سے دور یورپ کی اور دوسری ایسی قومیں ہیں جن کی تجارت کا دار و مدار بھی بحر روم پر ہی ہے۔ مثلاً روس کی مثال کو لیجئے کہ وہ باہر کی دنیا کو بحر روم کے راستے سے مال روانہ کرنے کے لئے بہت زیادہ مجبور ہے۔ شمالی یورپ کے تمام دوسرے ملک بھی بحر روم کی تجارت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

اس لئے بحر روم میں زمین حاصل کرنے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ برطانیہ بحر روم میں جو قومیں آباد ہیں ان کے ساتھ تجارت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دوسری زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے سمندری راستہ کا تحفظ کرنا چاہتا تھا۔

نقشہ میں بحر روم کی شکل ایک بڑی جھیل جیسی معلوم ہوتی ہے جس کی لمبائی دو ہزار میل ہے اور چوڑائی تین سو سے پانسو میل تک۔ اس کے چاروں طرف زمین ہے۔ اگر دو چھوٹے راستوں کے ذریعہ اس کا تعلق باہر کے سمندروں سے نہ ہوتا تو یہ پورے طور پر جھیل بن جاتی۔ ایک راستہ تو مغرب میں ہے جس سے بحر روم کا پانی بحر اٹلانٹک سے مل جاتا ہے۔ اس جگہ پر اسپین کے جنوبی سرے پر ایک بڑی چٹان واقع ہے جس کا نام جبرالٹر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس تنگ راستے کی محافظت کے لئے فطرت نے اس چوکیدار کو مقرر کر دیا ہے۔ غالباً دنیا میں جبرالٹر سے زیادہ مضبوط کوئی دوسرا قلعہ نہیں ہے۔ اس کی توپیں تمام جہازوں کو بحر روم کے اندر آنے اور باہر جانے سے روک سکتی ہیں۔

برطانیہ نے جبرالٹر کو ۱۷۰۴ء میں حاصل کیا اس پر قلعہ تعمیر کیا اور آج تک یہ برطانیہ کے قبضہ میں ہے۔ اس قلعہ اور برطانیہ کے بحری بیڑے کی وجہ سے برطانیہ کو جبرالٹر کی آبنائے کے راستے پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا اور اس ذریعہ سے بحر روم کے علاقہ میں اس کی تمام تجارت محفوظ ہو گئی اور آج ہندوستان جانے کا جو سیدھا راستہ ہے اس کا تحفظ بھی اسی مقام سے کیا جاتا ہے۔

بحر روم کے سب سے زیادہ جنوبی کنارے پر جہازوں کا ایک دوسرا دروازہ ہے یعنی نہر سویز

انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی راستے میں برطانوی مقبوضات
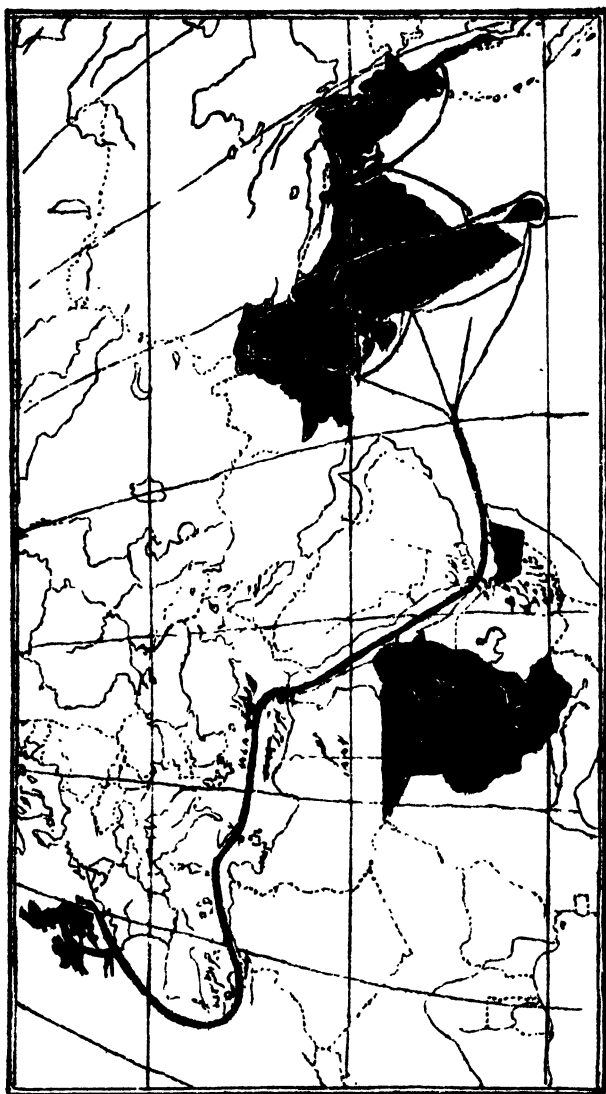
اس کے ذریعہ بحر احمر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہاں سے بحر ہند میں۔ جب تک نہر سویز نہیں بنی تھی یورپ کے جہازوں کو جنوبی افریقہ کا پورا چکر لگا کر بحر ہند میں پہنچنا پڑتا تھا۔ یہ راستہ بہت لانبا اور خطرناک تھا لیکن بہت سالوں تک اسی راستہ کو برطانیہ کے جہازوں کے لئے بہترین راستہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن برطانیہ کے تاجروں کو امید تھی کہ کسی زیادہ آسان راستہ کا پتہ لگ جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ایک فرانسیسی کمپنی نے سویز کی خاکنائے میں ایک نہر بنا کر تیار کر دی۔ یہ خیال تو نیا نہ تھا۔ تاجر مدت سے اس کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن ۱۸۶۹ء تک کوئی قوم اس خواب کو سچ کر کے نہ دکھلا سکی تھی۔

اس نئی نہر نے زمین کے اس تنگ ٹکڑے کو جو ایشیا اور افریقہ کو ملاتا تھا کاٹ کر دو جدا براعظموں میں تقسیم کر دیا۔ اس راستہ کے نکلنے کی وجہ سے مشرق بعید کے راستے میں ۵ ہزار میل کی مسافت کی کفایت ہو گئی۔ اس لئے برطانیہ کے لئے نہر سویز پر قبضہ حاصل کرنا نہایت زیادہ اہم ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء میں برطانیہ کی حکومت نے اس کمپنی سے اس کے حصے خرید لیے جس نے اس نہر کو بنایا تھا اور اس طرح برطانیہ کا بحر روم کے دونوں دروازوں پر قبضہ ہو گیا مغرب میں جبرالٹر کا قلعہ اور مشرق میں نہر سویز۔

یورپ کی دوسری تجارتی کمپنیوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ دوسری قوموں کے جہازوں کے لئے بھی نہر سویز کو کھلا رکھا جائے۔ اس لئے ۱۸۸۸ء میں کئی ملکوں نے اس معاہدہ پہ دستخط کیے کہ نہر کو "جنگ اور امن دونوں زمانوں میں ہر قسم کے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے چاہے وہ تجارتی ہوں یا جنگی بلا قومی جھنڈوں کے امتیاز کے کھلا ہوا اور آزاد رکھا جائے گا۔" لیکن برطانیہ کو چونکہ نہر سویز کا قبضہ مل گیا تھا اس لئے اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ کوئی دوسرا ملک ہندوستان کو اس آسان راستے کو اس کے لئے بند نہ کر سکے گا۔

۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے سوچا کہ اگر نہر سویز پر اسے قبضہ رکھنا ہے تو اسے مصر پر بھی قبضہ

کرنا چاہیے، اس لئے کہ نہر اس زمین میں کھودی گئی تھی جس کی مالک مصر کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ممکن ہے کوئی دوسری طاقتور قوم مصر پر قبضہ کرے اور ہندوستان کے اس مختصر راستے میں رکاوٹ ڈال دے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں برطانوی فوج نے مصر پہ حملہ کر دیا۔ مصریوں نے حملہ کا مقابلہ کیا لیکن وہ کمزور تھے اور برطانیہ مضبوط تھی اس لئے آخر میں مصر والوں نے اطاعت قبول کر لی۔

مصر کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن مصر کی تاریخ کی ایک ذرا سی جھلک دکھانا ضروری ہے۔ جب ہندوستان میں تہذیب کی ابتدا ہو رہی تھی اور یورپ میں آوارہ گرد وحشی قبائل گھومتے پھرتے تھے اس زمانہ میں مصر میں ایک نہایت طاقتور تہذیب نیل کی وادی میں موجود تھی۔ لیکن بہت صدیوں سے دنیا میں مصر کی اہمیت زائل ہو چکی تھی۔ یہ ایسے کسانوں کی سرزمین بن گئی تھی جو دریائے نیل کے کنارے بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس ملک میں لاکھوں آدمی آباد ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ گیہوں اور کپاس پیدا کرتے ہیں۔

گو مصر کوئی دولت مند ملک نہیں تھا لیکن برطانیہ نے اس پر قبضہ کرنے کے فوائد کو سمجھ لیا تھا۔ نہر سویز رکھنے کے علاوہ مصر گیہوں اور کپاس کی بڑی مقداروں کو بھی پیدا کرتا تھا جس کی برطانیہ کے لوگوں کو بڑی ضرورت تھی۔ پھر تیسری بات یہ تھی کہ مصر کے لوگ برطانوی مال کے خاصے اچھے گاہک تھے۔ آخر میں برطانیہ کے کاروباری لوگوں نے یہ سوچا کہ مصر میں روپیہ لگانے کا اچھا موقع ہے۔ ان چار وجوہ کی بنا پر بہت سے برطانیہ کے لوگ مصر کو برطانیہ کی سلطنت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی قبضہ کے زمانے میں (۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۲ء) مصر برطانیہ کے تجارتی مفاد کے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ریلوں، بنکوں اور فیکٹریوں کے سلسلہ میں برطانیہ کا ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ روپیہ مصر میں لگا ہوا ہے۔

۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ مگر یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے

کہ وہ برطانیہ کے ہندوستان یا سوڈان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ آج انگلستان کا قبضہ مصر پر نہیں ہے لیکن جس زمانہ میں چالیس سال تک برطانیہ کا قبضہ رہا اس نے اپنی تجارت کو خوب ترقی دے لی۔ چنانچہ آج بھی مصر برطانیہ سے تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں دوگنی اشیا خریدتا اور تین گنی اشیا فروخت کرتا ہے۔

وسطی اور جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے وسیع مقبوضات

برطانیہ کے جن مقبوضات کا ابھی تک ہم نے ذکر کیا ان کا رقبہ اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ابھی برطانیہ کے تمام مقبوضات کا بیان ختم نہیں ہوا ایک اور وسیع علاقہ ایسا ہے جو برطانوی سلطنت میں اٹھارویں صدی کے آخر میں شامل ہوا یعنی وسطی اور جنوبی افریقہ۔
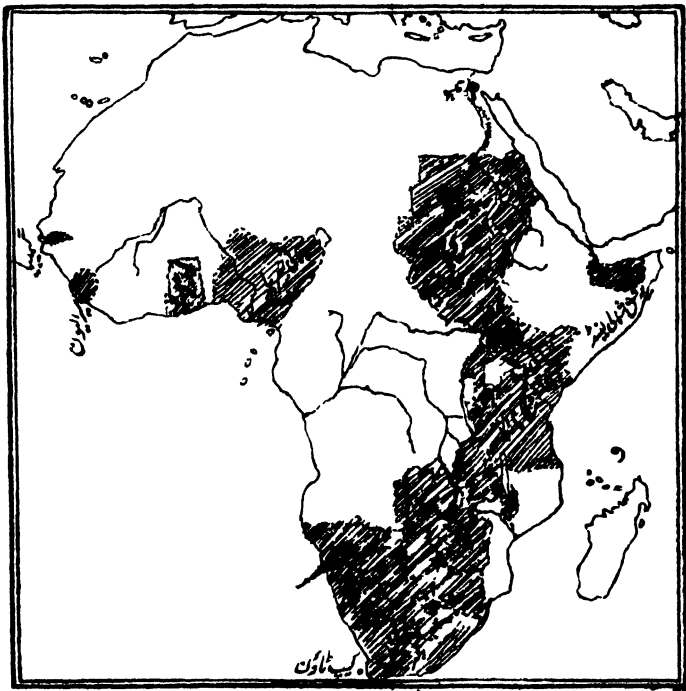
افریقہ میں برطانوی سلطنت

یورپ کے ملکوں میں تنہا برطانیہ ہی ایسا ملک نہیں ہے جس کے قبضہ میں افریقہ کی زمین ہے۔ فرانس کے قبضہ میں اس براعظم کا ایک تہائی حصہ ہے۔ اٹلی اور پرتگال کی نوآبادیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کی بڑی بڑی نوآبادیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ تقریباً تمام ملک کو یورپ کے ملکوں نے آپس میں تقسیم کرلیا ہے۔

رسالہ جامعہ کی آئندہ اشاعتوں میں ہم بتلائیں گے کہ کس طرح اس براعظم کی زمین کو باہم تقسیم کیا گیا اور کن کن قوموں نے یہ کام انجام دیا۔

افریقہ کی سرزمین میں حیرت انگیز قدرتی وسائل دولت

افریقہ کو ایک عرصہ تک "تاریک براعظم" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یہ نام اس لحاظ سے صحیح تھا کہ اٹھارویں صدی تک اس براعظم کے اندرونی حالات سے لوگ ناواقف تھے۔ گھنے جنگل، وحشی درندے، ریگستان، اور سیاہ وحشی انسان ۔ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے سفید نسل کے لوگ افریقہ کے اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہ ایک لامعلوم ملک تھا جس میں یورپ کے بہت سے لوگ جب کبھی گئے انھیں بیماری اور موت کا شکار بننا پڑا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں چند سفید نسل کے لوگ افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنے میں آخر کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی قیمتی چیزیں لے کر واپس آئے۔ ہاتھی دانت، قیمتی لکڑیاں، جواہرات اور ربڑ۔ انھوں نے تانبے، ٹین سونے اور چاندی کی بڑی معدنوں کا بھی پتہ دیا۔

سنہ ۱۸۸۰ء کے بعد سے سفید نسل کے بہت زیادہ آدمیوں نے افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنا شروع کر دیا اور ان میں سے بہت سے دولت مند ہوگئے۔ انگریز، بلجیم کے رہنے والے، فرانسیسی اور جرمن سب افریقہ کے اندر گئے اور وہاں جاکر یا تو انھوں نے فارموں اور معدنوں کے قائم کرنے میں اپنے سرمایہ کو لگایا یا پھر ربڑ کے باغات کو تنظیم دی۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے یورپ کے لوگ افریقہ کی گرم آب و ہوا میں کافی، کپاس، تاڑ کے درخت، گنے کی شکر کیلیے

اور تمباکو بویا کرتے تھے اور دوسرے براعظموں کو فروخت کرنے کے لئے جہازوں پر لاد کر روانہ کرتے رہتے تھے۔

سفید نسل کے آدمیوں میں برطانیہ کے لوگوں نے سب سے پہلے افریقہ کے اندرونی حالات کا پتہ لگایا اور اس ملک کے ساتھ تجارت کو ترقی دی۔ ہمت والے انگریزوں نے اپنی زندگی کا مطمح نظر سلطنت کو تعمیر کرنا قرار دے لیا تھا اور افریقہ کے تاریک ملک میں ان کے لئے بے انتہا جاذبیت تھی۔ وہ مصر میں اور اینگلو مصری سوڈان میں داخل ہو گئے تھے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مصر آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن اینگلو مصری سوڈان ابھی تک برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔ اس میں چرا گاہیں اور کاشت کی زمینیں بہت اچھی پائی جاتی ہیں۔ دیسیوں کی سیاہ فام آبادی اونٹوں، گایوں بھیڑوں اور بکریوں کو پالتی ہے۔ ۵ لاکھ سے زاید کسان اور گلہ بان دس لاکھ مربع میل میں بکھرے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ آب پاشی کے ذریعہ سے اینگلو مصری سوڈان برطانیہ کے لئے روز بروز زیادہ کپاس پیدا کرنے لگا ہے۔ مصر کے ساتھ اس علاقہ پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لئے بہت مفید تھا کیونکہ اس سے برطانیہ کے لئے ہندوستان کا راستہ محفوظ ہو جاتا تھا اور برطانیہ کو غذا کی اشیا بھی فراہم کی جا سکتی تھیں۔ ۱۸۵۰ء کے بعد کے پچاس سالوں میں برطانیہ نے براعظم افریقہ کے تقریباً ایک تہائی حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

آج افریقہ میں برطانیہ کے رقبہ کی میزان ۴۰ لاکھ مربع میل ہوتی ہے۔ یہ رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبہ سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس کی وجہ سے برطانوی حکومت کو ایک مسلسل علاقہ تقریباً چار ہزار میل لانبا مصر کی جنوبی سرحد سے کیپ آف گڈ ہوپ تک مل جاتا ہے۔

نقشہ میں کیپ ٹاؤن کو ڈھونڈیے۔ جنوبی افریقہ کے اس جنوبی سرے پر برطانیہ کے تاجروں نے ۱۸۱۵ء میں ایک نو آبادی بسائی تھی یہاں ہالینڈ کے لوگوں کی ایک نو آبادی

سنہ ۱۶۵۲ء سے تھی۔ سنہ ۱۸۲۰ء تک انگریز مہاجرین کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچ گئی تھی اور کیپ ٹاؤن کے مشرق میں آباد ہو گئی تھی۔

سنہ ۱۸۳۶ء میں ہالینڈ کے لوگ شمال کی طرف آرینج اور وآل دریاؤں کے قریب منتقل ہو گئے۔ ہالینڈ کے یہ لوگ جنھیں "بوئر" کہا جاتا ہے کسان تھے۔ جب برطانیہ کے لوگ براعظم کے جنوبی سرے پر بسنے لگے تو بوئر لوگ اور زیادہ شمال کی طرف بہتر زمینوں کی تلاش میں منتقل ہو گئے۔ غرضیکہ اس طرح سنہ ۱۸۵۰ء میں اس علاقہ میں ہزاروں بوئر کسان آباد ہو گئے اور انھوں نے اپنی دو آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ ایک آرینج فری اسٹیٹ اور دوسری جمہوریت ٹرانسوال۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ کے تاجر جمہوریت ٹرانسوال کے شمال کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ایک سیسل روڈس بھی تھا جو نوآبادی بسانے اور نئے ملکوں کا حال دریافت کرنے میں بہت جری اور دلیر تھا۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں روڈس نے ایک بڑی تجارتی کمپنی برٹش جنوبی افریقہ کمپنی کے نام سے بنائی۔ بہت سے انگریزوں نے اس کمپنی کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگایا جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں ملک تھا اور وہ اس پر حکومت کرتی تھی اسی طرح روڈس کی کمپنی نے بھی "روڈیشیا" کے علاقہ کو جس کا نام روڈس کے نام پر رکھا گیا تھا فتح کیا اور اس پر حکومت شروع کر دی۔ اب اس ملک میں ایک بڑا رقبہ شامل ہے جس کی وسعت تقریباً چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل ہے اور اس میں تقریباً بیس لاکھ دیسی لوگ اور ۴۴ ہزار سفید نسل کے آدمی آباد ہیں۔

جب برطانیہ کے لوگ پہلے پہل اس علاقہ میں گئے تو انھوں نے دیسی حکمران لوبنگولا کو راضی کر لیا کہ وہ اس دستاویز پر دستخط کر دے جس کے ذریعہ اس ملک میں کانیں کھودنے کا پورا حق کمپنی کو مل جائے۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی کانیں کھودیں اور نوآبادیاں اور قلعے تعمیر کیے۔

جب لوبنگولا کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی رعایا کے حقوق غیروں کو حوالے کر دیے ہیں تو اس نے انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ اس کی رعایا کی زمین واپس دلانے میں ملکہ اس کی مدد کریں اس کے جواب میں ایک خط آیا کہ روڈیشیا کے انگریزوں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ

سردار کے علاقہ میں صرف سونے کی کانیں کھودیں گے اور رعایا کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایں گے نہ ان کے گاؤں اور مزروعہ کھیتوں اور مویشیوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعرض کریں گے"

لیکن ملکہ کے اس خط کے باوجود حالات کی نوعیت خراب ہوتی گئی۔ برطانیہ کے کان کے مالکوں نے دیسی آبادی کو اپنی کانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دیسیوں نے بغاوت کی اور معاہدہ کے دو سال بعد انگریزوں کی فوج روڈیشیا پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کے لئے روانہ کی گئی۔

اس جنگ میں بہت سے دیسی لوگ مارے گئے اور لوبنگولا کو مجبوراً اطاعت کرنا پڑی۔ اس کی رعایا نے مایوس ہوکر کہا "ہمارا ملک ہم سے چھن گیا ہماری مویشی چھن گئی ہماری آبادی منتشر ہوگئی۔ ہمارے پاس زندہ رہنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا........ ہم سفید آدمیوں کے غلام ہوگئے۔ ہماری حیثیت کچھ بھی باقی نہیں رہی اور ہمیں کسی قسم کے کوئی حقوق حاصل نہیں رہے"

سونے کی کانوں کا کھودنا جاری رہا۔ پچیس سال میں یعنی ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۵ء تک روڈیشیا سے ۸۰ لاکھ آؤنس سونا نکالا گیا۔ اس ملک سے برطانوی تاجروں کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔

اسی زمانے میں ہالینڈ کے لوگوں کے علاقہ میں سونے اور ہیرے کی کانیں دریافت ہوئیں نقشہ میں کبرے کو ڈھونڈیے۔ بہت سالوں تک برطانیہ کے نوآبادی بسانے والے اور بوئر لوگ ساتھ ساتھ رہ رہے تھے لیکن ان کے تعلقات دوستانہ اور خوش گوار نہیں تھی جوں جوں زمانہ گذرتا گیا برطانیہ کے لوگوں اور بوئروں کی لڑائی بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۹۹ء میں کھلی جنگ شروع ہوگئی۔ برطانوی فوج بھیجی گئی اور تین سال کی طویل مدت گذرنے کے بعد بوئروں کو فتح کیا جاسکا۔ برطانوی حکومت نے تو اپنے تاجروں اور نوآبادی بسانے والوں کی حمایت کی لیکن برطانیہ کی رعایا نے بوئروں کی جنگ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

لیکن جب جنگ ختم ہوگئی تو برطانیہ کے رہنماؤں اور بوئروں کے رہنماؤں نے مل کر ایک

نئی حکومت بنائی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ کا اتحاد قائم ہوا۔ اس میں برطانیہ اور ہالینڈ دونوں کی نوآبادیاں شامل کی گئیں یعنی کیپ آف گڈ ہوپ، نٹال، دریائے آرنج کی نوآبادی اور ٹرانسوال ایک بوئر جنرل اس نئی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنایا گیا اور تمام بڑے افسر بوئر بنائے گئے اس وقت سے اس ملک کی آبادی اپنی مجلس قانون ساز تو خود منتخب کرتی ہے لیکن برطانیہ اس کی حکومت پر ایک عام نگرانی کرتی رہتی ہے۔

جب جنوبی افریقہ میں یہ واقعات ہو رہے تھے برطانیہ وسطی افریقہ اور سوڈان کے جنوب میں اور علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر رہی تھی۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں کینیا کی نوآبادی کو برطانیہ کے علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں اگونڈا کی نوآبادی کو۔ اس طرح برطانیہ کو شمال میں مصر سے لے کر جنوب میں راس امید تک ایک علاقہ کو چھوڑ کر مسلسل رقبہ مل گیا۔ یہ چھوٹا ہوا علاقہ خاصا بڑا تھا اور ٹانگا نائکا کے علاقے کے نام سے موسوم تھا (پہلے اس علاقہ کا نام جرمن مشرقی افریقہ تھا)، اس کو جرمنی کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور یہ جرمنی کی سلطنت میں شامل تھا لیکن جب جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تو یہ علاقہ بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں سلطنت کی تعمیر کے جس کام کو سو سال تک جاری رکھا گیا تھا وہ آخر ختم ہوا اور برطانیہ کو مصر سے راس امید تک مسلسل رقبہ مل گیا۔ اس کے علاقہ کے بہت سے حصوں میں برطانیہ کے انجینیروں نے سونے، لوہے، تانبے، ٹین اور دوسری دھاتوں اور ہیروں کو کانوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ اونچی زمینوں پر برطانیہ کے گلہ بانوں نے بھیڑوں کو پالنا شروع کر دیا۔ نیچی زمینوں پر برطانیہ کے کسانوں نے گیہوں اور دوسری کھانے کی پیداواروں کو انگلستان کے لاکھوں بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لئے پیدا کرنا شروع کر دیا۔ شمال میں یعنی مصر اور سوڈان میں برطانیہ نے دریائے نیل پر آبپاشی کے لئے بند بنانا شروع کیا اور لاکھوں ایکڑ زرخیز زمین پر کپاس کی کاشت شروع کر دی۔ کینیا اور اینگلو مصری سوڈان میں ہاتھی دانت کے لئے ہاتھیوں کا شکار کیا گیا۔ نئے نئے گاؤں بلکہ بڑے بڑے قصبے افریقہ کے بہت سے مقامات میں پیدا

رہ گئے۔

اس وسیع علاقہ کی پیداواروں کو ساحل تک لانے کے لئے اور ان کو جہازوں پر لاد کر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو روانہ کرنے کے لئے نوآبادیاں بسانے والے انگریزوں نے ریل کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بڑی اسکیم بنائی یعنی یہ کہ افریقہ کے شمالی اور جنوبی حصہ کو قاہرہ سے لے کر راس امید تک ریل کے ذریعہ سے ملادیں۔ انھوں نے صرف اسکیم ہی نہیں بنائی بلکہ ریل کی تعمیر کے کام کو شروع بھی کر دیا اور یہ کام اس قدر تیزی سے کیا جا رہا ہے کہ ہزاروں میل لانبا ریل کا راستہ بن کر تیار ہو گیا ہے اور اس کا استعمال بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

ریل کے بنانے کا یہ کام بڑی زبردست ہمت اور ارادہ کا کام ہے۔ بعض جگہوں پر ریل کو ریگستان صحرا کی ناقابل اعتماد زمین کے مشرقی حصہ سے ہو کر گذرنا پڑا۔ بعض جگہوں میں مرکزی افریقہ کے نہایت گھنے جنگلوں میں جہاں خونخوار درندے اور وحشی سیاہ نسل کے لوگ آباد ہیں ریلیں بنانا پڑیں۔

غرضکہ یہ مختصر خاکہ ہے کہ کس طرح برطانیہ نے افریقہ کے ایک تہائی حصہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس وسیع علاقہ میں بہت مختلف قسم کی زمینیں مختلف قسم کی آب و ہوائیں اور مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر ان سب کے حالات کو لکھا جائے تو اس کام کے لئے کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔

خلاصہ۔ ہم نے مختصر طور پر برطانیہ کی سلطنت کے خاص علاقوں یعنی ہندوستان، بحر روم کی زمینوں اور افریقہ کے مقبوضات کا مطالعہ کیا۔ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوتی تو ہم اور بھی دوسرے چھوٹے چھوٹے مقبوضات کا مطالعہ کرتے مثلاً ریاست ہائے ملایا کا وفاق، بورنیو کے حصے اور سمندروں میں بکھرے ہوئے اور بہت سے جزیروں کا۔ چین میں بھی برطانیہ کے قبضہ میں بہت سی بندرگاہیں اور زمین کے حصے ہیں۔ جزائر غربی ہند میں بھی اس کے مقبوضات

ہیں۔ جزائر بہاما اور برمدا بھی اس کے قبضہ میں ہیں۔ وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بھی کچھ زمین اس کی نگرانی میں ہے۔

برطانوی سلطنت کے نقشہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جزائر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ برطانیہ نے ان پر اس لئے قبضہ کر رکھا ہے کہ ان پر برطانیہ کے لڑائی اور تجارت کے جہاز مرمت کوئلہ کھانے اور دوسری رسد حاصل کرنے کے لئے ٹھیر سکتے ہیں۔
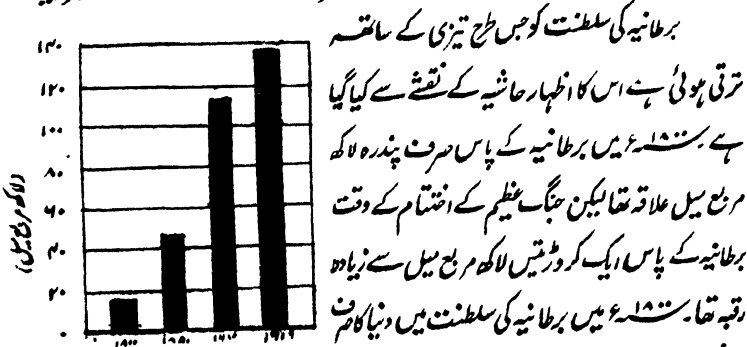
برطانوی سلطنت کی ۱۸۰۰ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان ترقی

برطانیہ کی سلطنت کو جس طرح تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی ہے اس کا اظہار حاشیہ کے نقشے سے کیا گیا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے پاس صرف پندرہ لاکھ مربع میل علاقہ تھا لیکن جنگ عظیم کے اختتام کے وقت برطانیہ کے پاس ایک کروڑ تیس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ تھا۔ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کا صرف دو فی صدی حصہ تھا لیکن ۱۹۱۹ء میں یہ رقبہ بڑھ کر ۲۵ فی صدی ہوگیا تھا۔ دنیا کے علاقہ کا ایک چوتھائی اور دنیا کی آبادی کا بھی تقریبًا ایک چوتھائی حصہ برطانیہ کے قبضہ اور نگرانی میں ہے۔

اس کے بعد برطانیہ کی تجارت اور برطانیہ کی سلطنت میں جو قریبی تعلق ہے اسے آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر برطانیہ کی تجارت کی ترقی کے اعداد کا برطانیہ کی سلطنت کی ترقی کے اعداد سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانیہ کی تجارت اور سلطنت میں ساتھ ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ جن سالوں میں برطانیہ نئی نئی نوآبادیوں کو حاصل کر رہی تھی اور تمام دنیا میں اپنی سلطنت کو وسیع کر رہی تھی انہی سالوں میں خارجی دنیا کے ساتھ اس کی تجارت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد اس بات کا سمجھنا بھی سہل ہو جاتا ہے کہ برطانیہ نے اتنی بڑی سلطنت کو

کیوں تعمیر کیا۔ جب صنعتی انقلاب پھیلنا شروع ہوا اور مشینیں ایجاد کی گئیں روز بروز زیادہ تعداد میں فیکٹریاں کھڑی کی گئیں اور لوگوں نے روز بروز زیادہ کثیر تعداد میں مشینوں کی صنعت میں کام کرنا شروع کر دیا۔ فیکٹریوں اور کانوں، ریل کی لائنوں اور گوداموں کے مالک روز بروز زیادہ روپیہ پیدا کرنے لگے۔ اس روپیہ کا کیا کیا جائے۔ اس مسئلہ نے بھی اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس کا کچھ حصہ تو انگلستان میں نئی فیکٹریاں بنانے نئی مشین لگانے، نئے مزدوروں کو ملازم رکھنے، نئی ریلوں اور نئے بجلی کے پاور اسٹیشنوں کے بنانے پر صرف کیا گیا۔ اس کا بہت کچھ حصہ تعیشات پر بھی صرف کیا گیا۔

مگر پھر بھی بہت فاضل روپیہ بچ گیا۔ پھر اس کے علاوہ برطانیہ کے لوگوں کے پاس فیکٹریوں میں جتنا مال بنایا جاتا تھا اس سب کے خریدنے کے لئے روپیہ موجود نہیں تھا اس لئے فیکٹری کے مالکوں کو برطانیہ سے باہر اپنے مال کے بیچنے اور اپنے روپیہ کو کاروبار میں لگانے کے لئے نئی جگہوں کو ڈھونڈنا پڑا۔ وہ ہندوستان، کناڈا، مصر اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں، چین میں اور دور دراز آسٹریلیا میں گئے انھوں نے اپنے مال کے لئے تمام دنیا میں منڈیاں تلاش کیں۔

ان انگریزوں نے جن کے پاس فاضل روپیہ تھا فیصلہ کیا کہ دنیا کے بعید ترین حصوں میں فیکٹریاں بنائی جائیں کانیں کھودی جائیں اور تیل کے چشمے نکالے جائیں۔ انھوں نے سونے، ہیرے، تانبے اور ٹین کو کانوں سے نکالا۔ بھیڑوں، کپاس اور گیہوں کو پیدا کیا۔ کناڈا، آسٹریلیا اور ملایا کے علاقہ میں غرضکہ دنیا کے ہر حصہ میں انھوں نے اسی طرح کے کام کیے۔ چنانچہ اسی بنا پر جنگ عظیم سے پہلے سلطنت برطانیہ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور نوآبادیوں اور برطانیہ کے درمیان تجارت کو بڑا فروغ حاصل تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر ایڈی اسیروادم، ریڈر سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

(بہ سلسلہ سابق)

اشتراکی روس روس کو اس مفہوم کے ساتھ تو قوم نہیں کہا جا سکتا جس مفہوم کے ساتھ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک قوم کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا اتحاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے روس میں کم سے کم دس علاقے ایسے تھے جو ایک دوسرے سے واضح طور پر نمایاں تھے اور جن میں کوئی قریبی تعلق نہیں پایا جاتا تھا اور ان میں مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں کے لوگ آباد تھے۔ آج ان کی جگہ ایک متحدہ حکومت (یونین) ہے اور سات ایسی جمہوریتیں ہیں جنھیں ایک حد تک خود مختاری ملی ہوئی ہے لیکن یہ سب کی سب ایک ہی پارٹی کی نگرانی میں ہیں۔

"قوموں کی کونسل" میں یونین کی سپریم کونسلوں، خود مختار جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں کی سودیٹ کے نمائندے شامل ہوتے ہیں اس میں دس نمائندے تو یونین کی جمہوریت کے ہوتے ہیں اور پانچ پانچ خود مختار علاقوں کے۔

حق انتخاب بلا امتیاز مذہب، قومیت، قیام یا جنس کے تمام شہریوں کو جن کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے اور جو دولت آفریں محنت کے ذریعہ اپنی روزی کماتے ہیں یا سرخ فوج یا سرخ بیڑہ کے سپاہی اور ملاح یا ان کے کمانڈر ہیں ملا ہوا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد مختلف قوموں کے لوگوں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے مطابق امریکہ میں دس کروڑ ۸۸ لاکھ ۶۴ ہزار ۲۰۷ سفید نسل کے لوگ تھے ایک کروڑ ۱۸ لاکھ ۹۱ ہزار ۱۴۳ حبشی تھے

اور ۲۰ لاکھ ۱۹ ہزار ۶ ۹ ۶ دوسری نسل کے لوگ۔ اس ملک میں حبشیوں کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کی پالیسیاں اختیار کی جاچکی ہیں کچھ دنوں تک حبشیوں کو ایک علیحدہ علاقہ میں رکھنے کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا پھر ان پر ہر جگہ دھونس جمانے کی پالیسی کو اختیار کیا گیا۔ لیکن یہ دونوں پالیسیاں ناکامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ البتہ جذب کرنے کی پالیسی کم سے کم جہاں تک تمدنی طور پر جذب کرنے کا تعلق ہے ـــــ آہستہ آہستہ کامیاب ہورہی ہے۔ معاشرتی حیثیت سے دونوں گروہ بالکل جدا ہیں اگرچہ سفید نسل کے بعض لائق اعتبار مشاہدہ کرنے والوں کی یہ رائے ہے کہ حبشی لوگ آخر میں سفید نسل کے لوگوں میں بالکل جذب ہوجائیں گے۔ حبشیوں کو ووٹ کا حق تو دے دیا گیا ہے لیکن جنوب کی بہت سی ریاستوں نے ایسے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن سے حبشی اپنے رائے دینے کے حق سے عملاً محروم ہوگئے ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں معاشرتی زندگی میں حبشیوں سے علیحدہ رہنے کا رواج اب بھی زوروں پر ہے۔ حبشیوں کے مدرسے، یونیورسٹیاں، گرجا گھر علیحدہ ہوتے ہیں۔ ریلوے ٹرین، ٹریم کار، تھیٹر اور سینما میں ان کی جگہیں علیحدہ رکھی جاتی ہیں۔ معاشی میدان میں بھی حبشیوں کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا شخص نہیں ملتا تب آخر میں حبشی کو ملازم رکھا جاتا ہے اور سب سے پہلے اسے ہی برطرف کیا جاتا ہے غرضکہ حبشیوں کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے اور جب تک اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نہ کیا جائے گا امریکہ کی قومیت کی بنیادیں بہت غیر استوار ثابت ہوں گی۔ دونوں نسلوں کے درمیان اتحاد عمل اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں بڑے پیمانہ پر اختیاری طور پر کی جارہی ہیں لیکن نہایت طویل زمانہ کے تعصبات کو آہستہ آہستہ ہی ختم کیا جاسکے گا۔

یورپ میں قومی اقلیتیں یورپ میں صدیوں سے جہاں کہیں نام نہاد ملکی لوگوں کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد غیر قومیں آباد ہیں وہاں ان کی وجہ سے جنگیں برپا ہوتی ہیں۔ ان اقلیتوں کو "قومی گروہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پڑوس کی کسی نہ کسی ریاست کے ساتھ ان کی نسلی، تمدنی یا لسانی وابستگیاں ہوتی ہیں اور ان اقلیتوں کے آبائی ملک سیاسی حیثیت سے جس قدر طاقتور ہوتے ہیں

اسی حد تک یہ اقلیتیں بھی اپنا زور دکھاتی ہیں ۔ ان اقلیتوں کے پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں کہیں تو یہ ماضی بعید میں نقل سکونت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور بعد کی انفرادی نقل سکونت یا ملکی الحاق یا علاقوں کی دوسری تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ان میں سے بعض اقلیتیں تو اکثریت میں آہستہ آہستہ بالکل جذب ہوگئی ہیں لیکن بعض نے اپنی غیریت اور علیحدگی کو قائم اور برقرار رکھا ہے ۔ ان میں سے اکثر کا تعلق مخالف سیاسی گروہ سے رہا ہے یعنی ایسے گروہ سے جو کسی نہ کسی زمانہ میں مستبد حکمراں کی حیثیت سے برسر اقتدار رہ چکا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ عموماً دولتمند بھی ہوتی ہیں ۔ ان دو آخر الذکر اسباب کی بنا پر ان اقلیتوں کو ستانے اور لوٹنے کو جائز سمجھا جانے لگتا ہے اور قوم کی تمام محرومیوں اور مصیبتوں کی ذمہ داری ان کے سر منڈھ دی جاتی ہے ۔ یورپ میں جس قسم کا ریاستی نظام آج کل چل رہا ہے یعنی پارلیمنٹری جمہوری نظام اس میں ان اقلیتوں کو اپنی اکثریت بنانے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہے ۔

تمام یورپ میں قومی اقلیتوں کی تعداد تقریباً ۴ کروڑ ہے اور اس میں جرمن اقلیتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ میونخ کے معاہدہ سے پہلے چیکوسلوکیا کی آبادی میں جرمنوں کی تعداد ۲۵ فی صدی تھی ۔ دوسری خاص اقلیتیں یوکرنیوں، یہودیوں، کٹیالینیوں (اسپین میں)، مگیاروں، ترکوں اور تاتاروں، بلغاریوں، اور مقدونیوں، سفید روسیوں، پولوں، روسیوں، البانیوں، رومانیوں، سلووینوں، یونانیوں، کروٹوں، سلوواکوں، چیکوں اور مراویوں، سرویوں، لیتھونیینوں، اور ارمینیوں کی ہیں ۔ جن ملکوں میں اقلیتیں خاص طور پر پائی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

پولینڈ (۳۲ فی صدی)، چیکوسلوکیا (۱۹۳۸ء تک ۳۰ فی صدی)، رومانیا (۳۰ فی صدی)، لیتھویا (۲۷ فی صدی)، یوگوسلاویا اور البانیا (دونوں میں بائیس بائیس فی صدی)، اسپین (۲۰ فی صدی)، ہنگری اور یونان (دونوں میں پندرہ پندرہ فی صدی)، اور بلغاریا (۱۴ فی صدی) ۔

یورپ کی اقلیتوں کے مسائل زیادہ تر تمدنی، نسلی اور لسانی ہیں ۔ اقلیتوں کو اپنی زبان، تمدن، رواج اور روایات کے تحفظ کا بہت زیادہ خیال ہے ۔ سرکاری ملازمتوں میں اپنے حصہ کے تحفظ

کرنے کی کوشش ان ملکوں میں افلاس زدہ ہندوستان کی طرح نہیں کی جاتی۔ یورپ کے ملکوں کی اقلیتوں کی طرح ہندوستان کی اقلیتوں کا ربط و تعلق غیر ملکوں کی اقلیتوں کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔

اقلیتوں کے ساتھ سلوک کرنے میں یورپ کی ریاستوں نے ذیل میں درج کئے ہوئے طریقوں میں سے کسی نہ کسی کی پیروی کی ہے جو ریاستیں روشن خیال ہیں انھوں نے شروع کے طریقوں کو اختیار کیا ہے اور دوسری ریاستوں نے علی الترتیب بعد کے طریقوں کو:-

(۱) اپنی نسلی، تمدنی اور اجتماعی زندگی کا انتظام کرنے کے لئے اقلیتوں کو خود مختار بنا دیا گیا ہے اور اس میں اسکولوں کے جداگانہ انتظام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۲) ریاست کی طرف سے اقلیتوں کے نسلی اور تمدنی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے خاص سرکاری ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر ڈنمارک کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے جاتے ہیں اس میں اقلیتوں کے بچوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینے کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ استادوں کا تعلق اس گروہ سے ہو جس گروہ سے کہ شاگردوں کا تعلق ہے۔

(۳) قوم کے تمام افراد کو ایک ہی طرح کے قوانین کا ماتحت بنایا جاتا ہے اور اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی کوئی خاص رعایت نہیں کی جاتی چنانچہ یوگوسلاویا میں نجی مدرسوں کا قائم کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اٹلی میں سرکاری مدرسوں کی حاضری کو لازمی قرار دیا گیا ہے ان دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے لئے مدرسوں کے جس نظام کو ایک زمانہ میں فروغ حاصل تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔

(۴) اقلیتوں کے مقابلہ میں دوسرے شہریوں کے ساتھ قانونی طور پر امتیازی سلوک کرنا۔ چنانچہ ہنگری میں ڈراما کے "ہیرو" ایسے ہی اشخاص کو بنایا جاتا ہے جن کے نام مگیاری ہوتے ہیں رومانیا میں جب کوئی ڈراما رومانیا کی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں دکھایا جاتا ہے تو اس پر ایک خاص ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ لیتھوانیا میں جہاں ابھی تک اقلیتوں کے ساتھ روشن خیالی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اب ایسے نئے قوانین بنائے گئے ہیں جن کا اثر اقلیتوں پر برا پڑتا ہے۔ اس قسم کے قوانین

دوسرے ملکوں میں بھی منظور کئے گئے ہیں اور ان سے جرمن لوگوں کو خاص طور پر نقصان پہنچا ہے۔

یورپ میں ایسی کئی اقلیتیں ہیں جن کے حقوق کا تحفظ بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدے یورپ کی ریاستوں مثلاً پولینڈ وغیرہ نے جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ابتدا میں اتحادی حکومتوں کے ساتھ انفرادی طور پر کیے تھے اور بعد میں یہی معاہدے انجمن اقوام کے ساتھ کئے گئے تھے یہ معاہدے زیادہ تر ان نئی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے تھے جو جنگ کے خاتمہ پر وجود میں آئی تھیں اس کے علاوہ ان چھوٹی ریاستوں کے ساتھ بھی یہ معاہدے کئے گئے تھے جن کے رقبے کو روس اور دوسری شکست خوردہ دول کا علاقہ چھین کر بڑھا دیا گیا تھا۔ نیز شکست خوردہ ریاستوں کے ساتھ بھی (جرمنی کو علیٰحدہ کرنے کے بعد) اسی طرح کے معاہدے کئے گئے تھے۔ اس وقت سترہ ایسے معاہدے اعلانات اور معاہدوں کے خاص ابواب موجود ہیں جن کے ذریعہ بین الاقوامی تحفظ کی ضمانت کی گئی ہے۔ اتحادی دول مثلاً فرانس اور اٹلی اور وہ ریاستیں جنھوں نے جنگ عظیم میں حصہ نہیں لیا تھا مثلاً ڈنمارک ان بین الاقوامی معاہدوں کے پابند نہیں ہیں۔ جن ملکوں میں ان معاہدوں پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ عموماً چھوٹی ریاستیں ہیں۔ بڑی ریاستیں بالکل مطلق العنان اور خود مختار ہیں۔ عام طور پر شمالی ریاستوں نے معاہدے کی شرائط کو جنوبی ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ایمان داری کے ساتھ پورا کیا ہے۔

ان تمام معاہدوں کے ذریعہ سے قومی اقلیتوں کو ایسے حقوق مل گئے ہیں جو ریاست کے اقتدار مطلق کے منافی نہیں ہیں یہ حقوق حسب ذیل ہیں:- (۱) قومیت کا حق یا تو ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا بعض شرائط کے ماتحت مستقل سکونت کی بنا پر مکمل تحفظ کے لئے اس حق کا حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ (۲) قانون کی نگاہ میں مساوات اور سول اور سیاسی حقوق میں بلا امتیاز نسل زبان اور مذہب مساوات (۳) جان کا مکمل تحفظ اور ہر طرح کے مذہب یا اعتقاد کی پیروی کرنے کی مکمل آزادی بشرطیکہ اس آزادی سے انتظام عامہ اور اخلاق عامہ میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ (۴) نجی تبادلہ خیال، تجارت، مذہب، صحافت، یا کسی چیز کے طبع کرنے یا عام جلسوں اور عدالتوں کے سامنے جس زبان کو چاہیں اس کے بولنے کا حق (۵) سرکاری ملازمتوں تقرریوں اور اعزازات

یا پیشوں کو چلانے کے سلسلے میں کسی امتیازی سلوک کا نہ ہونا۔ (۶) اقلیتوں کی ایسی زبانوں میں جو سرکاری زبانیں نہیں ہیں تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں دینا (۷) خیراتی، مذہبی، معاشرتی ادارے، مدرسے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے، ان کے انتظام کرنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا حق اور اس کے ساتھ ان کے اندر اپنی زبان اور اپنے مذہب کو آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کا حق۔ (۸) ان ضلعوں میں جہاں اقلیتیں مجتمع ہوں ریاست کی آمدنی کا ایک مناسب حصہ تعلیمی مذہبی اور خیراتی اغراض کے لئے دینا۔

سیاسی اور معاشرتی اقلیتوں کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا ہے۔

ان حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار لیگ آف نیشنس کی کونسل بنائی گئی ہے۔ جب ان معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا ان کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہوتا ہے تو صرف کونسل کا ممبر کونسل کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔ کونسل کے ممبروں کے علاوہ دوسرے لوگ جن میں اقلیتیں بھی شامل ہیں عرضی کے ذریعہ کونسل تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں لیکن ان عرضیوں کی حیثیت محض ذرائع معلومات جیسی ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عرضیاں معقول طریقہ پر لکھی جائیں ان کے لکھنے والے ذمہ دار لوگ ہوں اور ان کا موضوع ایسا مسئلہ ہو جس کے بارے میں کوئی تازہ فیصلہ نہ سنایا جا چکا ہو اور جس ملک سے اقلیت کا تعلق ہے اس سے علیحدگی کا مطالبہ ان عرضیوں میں موجود نہ ہو لیگ کا سکریٹری جنرل ان شرائط کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ درخواست قابل غور ہے یا نہیں۔

جب اس سوال کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو درخواست کونسل کے پریسیڈنٹ کے پاس بھیجی جاتی ہے اور وہ معمولی معاملات میں کونسل کے دو ممبروں کے ساتھ اور استثنائی صورتوں میں کونسل کے چار ممبروں کے ساتھ جنھیں وہ خود نامزد کرتا ہے اس پر کارروائی شروع کرتا ہے۔ یہ کمیٹی یہ فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے یا متعلقہ ریاست سے غیر رسمی طور پر معاملہ طے کر سکتی ہے یا پوری کونسل کو اسی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ غیر رسمی طور پر معاملہ کو اقلیتوں

کے شعبہ کے سکریٹریٹ کے ذریعہ سے طے کرنا ایسا طریقہ ہے جس کی تائید میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے
اس سے بدنامی اور تشہیر نہیں ہوتی اور حکومت متعلقہ کے ساتھ تعلقات خراب نہیں ہوتے۔
جب عملی کارروائی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اس وقت پہلا کام یہ کیا جاتا ہے کہ شکایت کی
نقل حکومت متعلقہ کو کیفیت بھیجنے کے لئے روانہ کردی جاتی ہے۔ حکومت متعلقہ یہ اعتراض کرسکتی
ہے کہ یہ درخواست قابل غور نہیں ہے جب یہ صورت ہوتی ہے تو معاملہ جیسی ضرورت ہوتی ہے
اسی کے مطابق کونسل کی تین یا پانچ کی کمیٹی کے فیصلہ کے لئے پیش کردیا جاتا ہے۔ حکومت متعلقہ کو
تین ہفتے اس بات کا جواب دینے کے لئے دیے جاتے ہیں کہ آیا وہ الزام کا کوئی جواب دے گی یا نہیں اور دو مہینہ
کی مہلت اصل جواب کے لئے دی جاتی ہے۔ عرضی گذاروں کو جواب کے دیکھنے یا جواب کا جواب
الجواب دینے کا موقع نہیں دیا جاتا کیونکہ ایسا کرنے سے قومی اقتدار مطلق کے اصول کی نفی ہوتی
ہے جھگڑا لیگ کونسل اور حکومت کے درمیان سمجھا جاتا ہے حکومت اور عرضی گذاروں کے
درمیان نہیں۔

جن معاملات کے بارے میں قانونی مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے انھیں بین الاقوامی عدالت
کے مستقل کورٹ کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے اور معاہدہ کے حدود کے اندر قانون اور واقعہ کے
بارے میں عدالت کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے معاملات میں اس کے فیصلہ کی نوعیت
محض مشورہ جیسی ہوتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ بہت کچھ اخلاقی اور قانونی وزن بھی شامل ہوتا ہے۔
کونسل کا کوئی ممبر اگر چاہے تو کونسل کے اس طریقہ کار کے علاوہ مستقل عدالت سے اس
قسم کا فیصلہ بھی حاصل کرسکتا ہے جس کی پابندی اس ریاست کے لئے جس نے اقلیتوں کے معاہدہ
پر دستخط کئے ہیں لازمی ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال کی ایک مثال وہ ہے جب جرمنی نے مستقل
عدالت کے سامنے جنوری ۱۹۲۸ء میں پولینڈ کے معاملہ کو پیش کیا تھا جس میں بالائی سلیشیا
کی اقلیتوں کے حدود کا مسئلہ زیر بحث تھا۔
کونسل کی اکثریت کی منظوری کے بغیر اقلیتوں کے کسی معاہدہ میں کوئی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ

موجودہ طریقہ اس پرانے طریقہ سے بہتر ہے جس میں ایک طاقتور ریاست ایک شاکی اقلیت کی طرف داری کے سلسلہ میں مداخلت کیا کرتی تھی لیکن پھر بھی اس سے مسئلہ کا کوئی قابل اطمینان حل نہیں ہوتا لیگ کی اس کارروائی کی حیثیت ایک سیاسی پنچایتی فیصلہ کی سی ہوتی ہے اس لئے کونسل کا کوئی ممبر ریاست کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ریاست طاقتور ہوتی ہے آمادہ نہیں ہوتا۔ کونسل کے سامنے جو سینکڑوں درخواستیں پیش کی جا چکی ہیں ان میں سے صرف چند کے بارے میں قابل اطمینان فیصلہ دیا گیا ہے۔ اکثر کو محض ضابطہ کی عدم تکمیل کی بنا پر خارج کر دیا گیا اور بہت سوں پر کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ لیگ کونسل چونکہ ایک سیاسی جماعت ہے اس لئے سیاسی مصلحتوں کا اسے بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معاملہ کا فیصلہ قانونی ماہروں اور جغرافیہ دانوں اور معاشیات کے ماہروں کے مشورے کے مطابق کیا جائے پھر لیگ کی کونسل مقامی زیادتیوں کا تدارک کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں بھی نہیں ہے۔ اس کی مشین بہت بھاری ہے اور مشکل سے حرکت میں آتی ہے۔ جب شکایت کرنے والی اقلیت مضبوط ہوتی ہے اس وقت تو کام کا یہ طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض ایسے معاملوں میں جہاں صورت حال بہت خراب تھی اور جن میں انفرادی طور پر ظلم و زیادتی کی گئی تھی ان کے تدارک کرنے میں لیگ ناکامیاب ثابت ہوئی۔ جن جگہوں میں فسادات اکثر اور سخت قسم کے ہوتے رہتے ہیں وہاں لیگ کے مقیم نمائندے کچھ عرصے کے لئے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوگا کہ مخالف فریقوں کے نزدیک رہیں اور ان میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں ایک مستقل کمیشن مثلاً ابتدائی کمیشن بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جو اقلیتوں کے ساتھ جو زیادتیاں کی جاتی ہیں ان سب پر غور کرے اور معاہدے کے ماتحت جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انھیں پورا کرے اس کام کے لئے ایک قانونی جماعت کے کامیاب ہونے کا امکان ایک سیاسی جماعت کے مقابلہ میں زیادہ ہے[۱]۔ اس لئے مستقل عدالت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ایک "مساواتی

---

[۱] یہ تجاویز سر گلبرٹ مرے کی ہیں

کمیشن" بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جس میں ریاست اور اقلیت کے مساوی نمائندے متنازعہ فیہ مسائل پر اولین ٹریبونل کی حیثیت سے فیصلہ صادر کریں۔

اقلیتوں کو اپنی جگہ پر اپنے اس فرض کو محسوس کرنا چاہیئے کہ ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ وفادار ہم قوم ہونے کی حیثیت سے جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہیں اور ان کو یہ ہرگز نہ چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو قومی اقلیتوں کی ان انجمنوں سے وابستہ کریں جو تمام یورپ کی خاص خاص اقلیتوں کو باہم منسلک کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں اور جن کی وجہ سے فرقہ وارانہ ذہنیت کا شعلہ ہمیشہ بھڑکتا رہتا ہے مثلاً ایسی انجمنیں جیسی کہ یورپ میں جرمنی نسل رکھنے والے گروہوں کی انجمن یا پولینڈ کے ان لوگوں کے لئے جو باہر رہ رہے ہیں وارسا کانگریس آف پولس یا رِیگا کی اتحاد روسی کی کانگریس کیونکہ جیسا کہ آلوٹھنگمن نے کہا ہے "کسی ریاست کے بنیادی مفادات کو اقلیتوں کے مسئلہ کے حل کرنے کے طریقہ سے نقصان نہ پہنچنا چاہیئے"

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ اپنی خراب ترین شکل میں موجود ہے اور اس کا کوئی پائدار حل ابھی سیاست پر نظر نہیں آتا۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷۷۸ ہے۔ اس آبادی میں ۲۳ کروڑ ۹۱ لاکھ ۹۵ ہزار ۱۴۰ یعنی ۶۸ فی صدی ہندو ہیں ۷ کروڑ ۷۶ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۴۵ یعنی ۲۲ فی صدی مسلمان ہیں ۶۲ لاکھ ۹۶ ہزار ۷۶۳ یعنی ۱٫۷۷ فی صدی عیسائی ہیں اور ۴۳ لاکھ ۳۰ ہزار ۷۷۱ سکھ ہیں۔ ۷۷ فی صدی آبادی خود مختار ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور ۲۳ فی صدی ہندوستانی ریاستوں میں۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ ہندو مذہب کیونکہ فی الاصل تبلیغی مذہب نہیں ہے اس لئے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی وجہ سے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سکھ چونکہ صرف پنجاب تک محدود ہیں اس لئے ان کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے ہندوستانی عیسائیوں کی وجہ سے بھی کسی ناقابل حل مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ان میں ہندو اور مسلمان دونوں اصل کے لوگ شامل ہیں اور ان کے سیاسی نقطہ نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے

خاص اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے جو تمام ہندوستان میں مختلف تناسب کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص خاص صوبوں میں مختلف مذہبوں کے پیرودؤں کا جو تناسب پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جا سکے گا:-

صوبہ	فرقہ	تعداد	فی صدی
بنگال	ہندو	۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۴۰۷	۳۴ فی صدی
	مسلم	۲ کروڑ ۷۴ لاکھ ۹۷ ہزار ۶۲۴	۵۵ "
مدراس	ہندو	۴ کروڑ ۱۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۳۷۰	۸۹ "
	مسلم	۲۳ لاکھ ۵ ہزار ۹۳۷	۷ "
	عیسائی	۱۷ لاکھ ۷۴ ہزار ۲۷۶	۳ "
بمبئی	ہندو		۷۶ "
	مسلم		۲۰ "
پنجاب	ہندو	۶۳ لاکھ ۲۸ ہزار ۵۸۸	۲۷ "
	مسلم	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار ۴۶۰	۵۷ "
	سکھ	۴۰ لاکھ ۷۲ ہزار	۱۳ "
سرحدی صوبہ	ہندو	ایک لاکھ ۴۲ ہزار ۹۷۷	
	مسلم	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار ۳۰۳	
سی۔پی		زیادہ تر ہندو	
سندھ	مسلم		۷۳ "

ہندو زیادہ تر جنوب اور وسط ہند میں چھائے ہوئے ہیں۔ مدراس کے صوبہ میں یہ ۸۸ فی صدی سے کم نہیں ہیں، آسام، بہار اور اڑیسہ، یو۔پی، وسط ہند کے علاقوں راجپوتانہ اور بمبئی میں ان کی اکثریت ہے۔ سرحدی صوبہ بلوچستان اور کشمیر پر مسلمانوں کا اجارہ ہے اور پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں ان کی خاصی بڑی اکثریت ہے آسام میں ان کی تعداد ۳۲ فی صدی یو۔پی میں ۱۵ فی صدی

اور حیدر آباد میں ۱۱ فی صدی ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے بھی ہندوستان بہت زیادہ منقسم ہے بولی کی زبانوں کو چھوڑنے کے بعد بھی ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں پائی جاتی ہیں لیکن ہندوستانی جو ہندی سے علیحدہ ایک چیز ہے ہندوستان کی مشترک زبان بنتی جا رہی ہے۔

معاشرتی رواجات۔ مراسم اور طریقہ ہائے زندگی کے لحاظ سے بھی بہت گہرے فرق پائے جاتے ہیں۔ مسلمان گوشت کھاتے ہیں ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نباتی غذا کھاتی ہے۔ مسلمانوں میں خاصی بڑی حد تک مساوات پائی جاتی ہے لیکن ہندو ذاتوں میں منقسم ہیں۔ ذات اس حد تک تو ختم ہو گئی ہے کہ مختلف بڑی ذاتوں کے درمیان معاشرتی تعلقات میں رواداری پیدا ہو گئی ہے لیکن ابھی تک باہم مل کر کھانا کھانے کا رواج عام نہیں ہوا ہے اور باہمی شادی تو ضمنی ذاتوں کے درمیان بھی نہیں ہوتی۔ ہندوؤں میں کم سے کم جنوب کے ہندوؤں میں پردے کا رواج نہیں ہے لیکن مسلمان ملک کے بڑے حصہ میں پردے کے پابند ہیں۔ لباس اور بالوں کے کترواںے کے سلسلہ میں بھی ہندوں کا اور مسلمانوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا روحانی وطن مکہ ہے اور اس حد تک ان کی وابستگی ہندوستان کے ساتھ زیادہ گہری نہیں ہے ایسے مسلمان کثرت سے ملتے ہیں جو افریقہ، مصر، عرب یا ایران کے مسلمانوں کے ساتھ تو بہت جلد گھل مل جاتے ہیں لیکن اپنے ہم قوم غیر مسلم ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ اتحاد اسلام کی تحریک بھی مسلمانوں کے لئے ایک خاصی کشش رکھتی ہے۔

مذہبی معتقدات اور مراسم کا جہاں تک تعلق ہے مسلمان توحید پرست ہیں اور ایک خدا اور ایک پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے برعکس ہندو مذہب میں جہاں ایک طرف ادنیٰ ترین حیوان پرستی اور معبودوں کی کثرت کی گنجائش ہے وہاں دوسری طرف ہمہ اوست کا فلسفہ بھی موجود ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کو اگر ایک نقطہ نگاہ سے اس کی قوت سمجھا جا سکتا ہے تو دوسرے

نقطہ نگاہ سے یہ اس کی بڑی کمزوری بھی ہے۔ چونکہ ہندو مذہب میں مختلف بلکہ متضاد مذہبی خیالات و مراسم رکھنے والے لوگوں کی گنجائش ہے اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف اور تحدید کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ہمہ گیری نے اس کی شکل کو غیر متعین کر دیا ہے۔ بہر صورت یہ اسلام کے برابر صاف اور واضح نہیں ہے۔ چونکہ ہندو ایک ہمہ گیر مذہب کے ماننے والے ہیں اس لئے ان کے واسطے مذہبی رواداری آسان ہے اگرچہ بعض موقعوں پر یہ رواداری مذہبی بیگانگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ہندوؤں میں مذہب کے ماننے والے جو بہترین لوگ ہیں وہ غور و فکر میں منہمک رہتے ہیں اور ایثار اور خود گذاری کی ان منزلوں پر پہنچے ہوئے ہیں جن تک دوسرے مذہب کے پیروؤں کی مشکل سے رسائی ہو سکتی ہے۔ عام طور پر ہندو نرم اور منکسر المزاج صابر اور غیر تشدد پسند ہوتے ہیں اور ناانصافی کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتے ہیں اور بعض وقت ان کا رویہ جارحانہ اور بے صبری پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تبلیغ کا جذبہ مسلمانوں میں ہندوؤں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہندو مسلمانوں سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک عرصہ تک اپنے آپ کو مغربی اثر اور تعلیم سے علیحدہ رکھا۔ پردہ کے رواج کی وجہ سے مسلم عورتوں میں بھی تعلیم کم پھیل سکی ہے۔ کتابی علم میں ہندوؤں نے اپنے آپ کو زیادہ موزوں ثابت کیا ہے۔

معاشی مفاد میں ہندو مسلمانوں میں زیادہ واضح فرق نہیں پایا جاتا۔ ہندو بھی کسان کاشتکار زمیندار، مزدور اور تاجر ہیں اور مسلمان بھی۔ شہروں میں مسلمانوں کا خاصا بڑا تناسب تجارت میں مصروف ہے۔ مہارت کے کاموں میں مثلاً صنعت اور دستکاری میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دیہی علاقوں میں دونوں فرقوں کے لوگ غریب ہیں۔ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی معمولی اکثریت ہے وہاں بیان کیا جاتا ہے کہ دولت کے نقطہ نگاہ سے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے ہیں کیونکہ بہت سے زمیندار اور ساہوکار ہندو ہیں۔

مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پورے طور پر باہمی یگانگت پیدا نہیں ہوئی۔ خود غرض سیاسی لیڈر ان اختلافات کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ ایک مشہور سیاسی لیڈر نے ابھی حال میں کہا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق اس جماعت سے نہیں ہے جس سے دوسرے ہندوستانیوں کا تعلق ہے۔ ان کی بالکل ایک جداگانہ قوم ہے اور انہیں فرقہ کی جگہ قوم کے نام سے موسوم کرنا چاہیئے اور انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ملنا چاہیئے۔" ایک اور مسلمان نے یہ کہا ہے کہ حیدرآباد کے لوگ بجائے خود ایک قوم ہیں ان کا بادشاہ اور ان کا قومی جھنڈا بالکل الگ ہے۔ یہ بیانات نہ صرف واقعہ کے اعتبار سے غلط ہیں بلکہ ان سے نہایت خراب اثر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

پھر ہندوؤں کے درمیان بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ۶ کروڑ اشخاص کم از کم جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے باقاعدہ طور پر ہندوؤں کے زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔ سوورن ہندوؤں میں بھی برہمنوں اور غیر برہمنوں، مرہٹوں اور غیر مرہٹوں کے اختلافات پایا جاتا ہے۔

علاج | ہمارے سامنے جو حل طلب مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح ان متصادم مفادوں اور گروہوں کو متحد کیا جائے اور ان میں قومی اتحاد اور ایک جہتی کی روح پھونکی جائے۔ ہندوستان نے ابھی تک یہ سبق نہیں سیکھا ہے کہ "اتحاد میں ہی طاقت ہے" جب تک ہندوستان میں خانہ جنگی جاری رہے گی اس وقت تک باہر کے لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ پہلا سبق جسے ہندوستان کو پڑھنا چاہیئے وہ باہمی ہمدردی، باہمی احترام اور ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کے سمجھنے کا سبق ہے۔ اس رواداری کے ساتھ قلب کی اس وسعت کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے جو دوسروں کی "اچھائی" کو دیکھ سکتی اور اس کی قدر کر سکتی ہے۔ اختلافات کے معنی لازمی طور پر کم تری یا برتری کے نہیں ہوتے۔ ہر مخلص ہندوستانی محب وطن کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے "ضروری باتوں میں اتحاد، مشتبہ باتوں میں آزادی اور سب باتوں میں فیاضی۔"

جب اس مناسب روح اور رویہ کا عام طور پر رواج ہو جائے گا تو پھر مجالس قانون ساز اور

ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال کی اہمیت زائل ہو جائے گی۔ اگر فرقوں کے تعلقات میں پوری دوستی اور صاف دلی ہو تو چند نشستوں یا عہدوں کی کمی یا زیادتی کی طرف کوئی شخص بھی کبھی متوجہ نہیں ہوگا۔

علیحدگی اور متوازی اداروں کے قائم کرنے کی پالیسی بہت ناپسندیدہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف فرقے اس قدر ملے جلے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان کو معاشرتی، تمدنی یا جغرافی طور پر علیحدہ کرنا نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔ ہم کو اپنی تمام کوششوں کو اس عقیدہ کے ساتھ شروع کرنا چاہیے کہ ہم باہمی سمجھوتہ اور رواداری ہم آہنگی اور اتحاد کے ساتھ ضرور رہ سکتے ہیں۔ ہم کو اپنا نصب العین یہ بنانا چاہیے کہ ہر فرقہ کو معقول حدود کے اندر رہتے ہوئے معاشرتی تمدنی اور مذہبی آزادی اور تمام فرقوں کے لیے ایک واحد ریاست۔ ہم نہ ہندو راج چاہتے ہیں نہ مسلم راج نہ برطانوی راج نہ ان کا کسی قسم کا ایک مشترکہ راج بلکہ ہم ہندوستانی راج چاہتے ہیں۔ اگر اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور انھیں اپنا طرفدار بنانا منظور ہے تو پہلی بات جو ہمیں کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ان کے دل میں اکثریت کے خلوص اور نیک نیتی کی طرف سے اعتماد کی کیفیت پیدا کی جائے خوف، شبہ اور بے اعتمادی کے تمام اسباب کو دور کرنا چاہیے۔ دستور میں بنیادی حقوق کو رکھنے اور عدالتوں کی طرف سے ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرانے سے یقیناً صحیح سمت میں قدم اٹھایا جا سکتا ہے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس وقت بنیادی حقوق کا مسئلہ موجود ہے۔ حال میں بنیادی حقوق کے بارے میں جو قرارداد اس نے منظور کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

"مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم خط کا تحفظ کیا جائے گا

"کسی شخص کو اس کے مذہب، ذات عقیدہ یا جنس کی وجہ سے، سرکاری ملازمت یا قوت واعزاز کے کسی عہدہ کے حاصل کرنے یا کسی تجارت اور پیشہ کو اختیار کرنے کے لیے نااہل نہیں سمجھا جائے گا۔

"تمام مذاہب کے بارے میں ریاست غیر جانبدار رہے گی۔

رائے دینے کا حق تمام بالغ آبادی کو ملا ہوا ہوگا۔

"ہر شہری کو آزادی ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں جہاں چاہے نقل وحرکت کرے، جس حصہ میں چاہے سکونت اختیار کرے، جائداد پیدا کرے جس تجارت اور پیشہ کو چاہے اختیار کرے ہندوستان کے ہر حصہ میں تحفظ یا قانونی کارروائی کے وقت اس کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔"

ان میں سے بہت سے حقوق وہ ہیں جو یورپ کی اقلیتوں کے معاہدوں میں موجود ہیں ان سے مذہبی اعتقاد و مراسم کی آزادی کی ضمانت، تمدن، زبان اور رسم الخط کا تحفظ سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے مساوی مواقع، سرکاری مذہب کا عدم قیام، سب بالغوں کو حق رائے دہی اور تمام ہندوستان میں نقل وحرکت اور سکونت کی آزادی مل جاتی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان بنیادی حقوق میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے حق کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ قومی اتحاد اور فرقہ دارانہ مفاہمت کے پیش نظر تبدیل مذہب کی ناجائز کوششوں کو بند کرنا بہت ضروری ہے ——————

—————— تبدیل مذہب کی ان کوششوں کو نہ اخلاقی وجوہ کی بنا پر جائز سمجھا جا سکتا ہے نہ روحانی وجوہ کی بنا پر لیکن جو لوگ سچے دل سے مذہب کو بدلنا چاہیں ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ تبدیل مذہب کی جائز اور ناجائز صورتوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔[۱] ہم میں جو بہتر ین

---

[۱] اس مضمون میں جن خیالات کا اب تک اظہار کیا گیا ہے یا جن کا آئندہ اظہار کیا جائے گا ان سے مدیر کا اتفاق خیال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں اور ان کے لئے مضمون نگار خود جواب دہ ہیں (مدیر)

لوگ ہیں ان کے کاموں میں بھی بعض اوقات اچھے اور برے دونوں قسم کے محرکات عمل موجود ہوتے ہیں۔ جب صورت یہ ہے تو جو لوگ مختلف محرکوں اور مصلحتوں کے پیش نظر اپنا مذہب بدلتے ہیں ان کی حالت پر بھی ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ بہرحال جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب پر قانون کی کوئی نگرانی قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ رائے عامہ اور مذہبوں کے باہمی سمجھوتہ سے اس کام کو کیا جا سکتا ہے۔ ہر مذہبی فرقہ کو ذاتی طور پر خود اپنے اوپر یہ پابندی عاید کر لینا چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کو جو محض خود غرضی کی بنا پر ان کے حلقہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں اپنے مذہب میں داخل نہ کریں گے۔ غرضکہ اس طرح ایک مناسب رائے عامہ کو پیدا کرنا چاہیئے جو ہر قسم کی ناجائز تبدیلی مذہب کا تدارک کر سکے۔ مہاتما گاندھی کا وہ رویہ صحیح نہیں تھا جب انھوں نے جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب میں فرق کرنے سے انکار کر کے یہ کہا تھا کہ میں برسر اقتدار آ گیا اور عیسائیوں نے اپنے آپ کو صرف معاشرتی اور انسانی ہمدردی کے کاموں تک محدود نہیں رکھا تو میں ان کا بوریا بدھنا بندھوا کر انھیں ہندوستان سے نکال دوں گا۔

تبدیلی مذہب کے کام میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے بھی جو ہندوستان کی سیاسی نظام میں نہایت مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکے ہیں بہت تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ جب دو سال ہوئے ڈاکٹر امبیدکر نے ہندو مذہب کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا تھا اور دبی ہوئی ذاتوں کے لوگوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ من حیثیت الجماعت کسی دوسرے مذہب کو قبول کر لیں تو ملک میں یہ مکروہ منظر دکھائی دیا تھا کہ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے رہنماؤں نے اپنے مال کو منڈی میں بیچنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر امبیدکر عقلمند آدمی تھے انھوں نے اظہار تعلق تو سب کے ساتھ کیا لیکن کسی کے ساتھ مستقل رشتہ قبول نہیں کیا۔ جب تک ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی باقی رہے گی تبدیل مذہب کی کوششیں بھی جاری رہیں گی۔ مسلم لیگ کے جوش سے ہندو مہاسبھا کا جوش بھی بڑھا اور آریہ سماج کا تبدیلی مذہب کا جذبہ تو بھڑک اٹھا۔ ہندو مذہب کی مشکلات سے عیسائیوں، سکھوں یا مسلمانوں کو کبھی ناجایز فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔

بنیادی حقوق کے اس کانگریسی رزولیوشن میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ایک دفعہ صوبہ پرستی کے خلاف بھی موجود ہے لیکن اس سے مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ جو لوگ سکونت اختیار کر چکے ہیں انھیں سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا حق بھی دے دیا جائے۔ صوبہ پرستی کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی سے بھی زیادہ ہندوستان کے اتحاد کی دشمن ثابت ہوگی۔ اگر اس کا تدارک جلد نہیں کیا گیا تو اس سے بے انتہا نقصان پہنچے گا۔ "بہار بہاریوں کے لئے ہے" "اندھرا دیش اندھرا والوں کے لئے ہے"۔ ایک خاص حد تک تو یہ نعرے جائز سمجھے جا سکتے ہیں لیکن اگر اس حد سے آگے بھی ان کو بڑھایا گیا تو اس سے ہندوستانی قومیت کا تخیل کمزور ہو جائے گا۔

بنیادی حقوق اس میں شک نہیں بہت قیمتی چیز ہیں لیکن ان کے اثر اور فایدے کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھیں کس قدر ایمانداری اور پابندی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یورپ کی قومی اقلیتوں کے بارے میں ایک مصنف نے حال میں بالکل ٹھیک لکھا ہے "ہو سکتا ہے کہ جہاں قانونی مساوات موجود ہو وہاں حقیقتاً عدم مساوات پائی جائے" اسی مصنف کا قول ہے کہ یوگوسلاویا نے ڈکٹیٹر شپ کے قائم ہو جانے کے بعد سے اپنے معاہدے کی پابندیوں کو نہایت کھلے بندوں پامال کیا ہے۔ اس نے اقلیتوں کے نجی مدرسوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور اقلیتوں کے پریس پر نہایت سخت سنسر شپ قائم کر دی ہے۔ اجتماع کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اقلیتوں کے خود مختار ادارے بند کر دئے گئے ہیں۔

مجالس قانون ساز اور سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کی نمایندگی کا مسئلہ پچھلے کچھ دنوں سے بہت نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا انتظام سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو رفارم کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کو وسیع اور گہرا کر دیا گیا ہے اور ان کے چھوڑنے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لارڈ منٹو نے تو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اقلیتوں کے حق کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا لیکن ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے ذریعے نہ صرف قانونی اقلیتیں بنائی گئی ہیں بلکہ قانونی اکثریتیں بھی بنا دی گئی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی فرقہ پروری کو داخل کر دیا گیا

اس حقیقت کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ملک بہت سے بند کمروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے تنگ گروہ بندیوں کو ترقی حاصل ہوتی ہے پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بحث طلب رہے گی کہ آیا اس سے خود اقلیتوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ میرے ایک طالب علم نے فرقوں کے حساب سے پنجاب کی آبادی کی تقسیم پر جو عملی تحقیقات کی ہے اس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے بغیر بھی اتنی ہی نشستیں مل سکتی ہیں جتنی اب انھیں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی صورت میں مل رہی ہیں اور اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب سے چنے جائیں گے انھیں سب فرقوں کا اعتماد حاصل ہوگا۔ مختلف فرقوں کی نشستیں آج کل جس طرح مقرر کی جاتی ہیں اس میں صوبہ وار مختلف مذہبی فرقوں کی مجموعی تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ان مختلف انتخابی اضلاع کا ہوشیاری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جہاں سے مختلف فرقوں کے نمائندوں کے منتخب ہونے کی معقول وجوہ کی بنا پر امید کی جا سکتی ہے اگر اس مطالعہ سے یہ ظاہر ہو کہ اقلیتیں بغیر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اختیار کیے ہوئے اپنے تناسب کو قائم رکھ سکیں گی تو اس سے مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی تحریک کو بہت تقویت پہنچے گی یا کم سے کم تحفظ نشست کے ساتھ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے قائم ہونے کا امکان پیدا ہو سکے گا۔

کیونکہ ادلالڈ ہندوؤں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہندوؤں کو ووٹ دیں اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو ووٹ دیں۔ اس سے ان فرقوں کے ترقی پسند لوگوں کے ساتھ جو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قومی اور جمہوری اصول کے خلاف سمجھتے ہیں اور جو ایک عام حلقہ انتخاب میں ووٹ دینا چاہتے ہیں۔ سخت ناانصافی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہ راستے کا ایک بڑا روڑا ہیں اور اگر ہندوستان کو آزاد متحد اور جمہوریت پسند خود مختار

قوم بنناہے تو ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔

اگر امیدواروں کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر جاری رکھا جائے تب بھی مجلس قانون ساز میں پہنچنے کے بعد انھیں اس بات کی آزادی حاصل ہونا چاہیے کہ جس پارٹی کے ذریعہ وہ اپنی رائے میں سمجھیں کہ ملک کے بہترین مفاد کو ترقی حاصل ہو سکتی ہے اس میں وہ شامل ہو سکیں عیسائیوں کے تمام ان نمایندوں سے جن کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوا ہے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ہر مسئلہ پر متحدہ طور پر ووٹ دیا کریں غیر ضروری ہے۔ تمام دوسرے فرقوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ترقی پسند، اعتدال پسند، قدامت پسند کمیونسٹ، سوشلسٹ اور انفرادیت پسند لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو طبعی طور پر دوسرے فرقوں کے ان لوگوں کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ تمام مسلمانوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر پارٹی کے نظام کو جو جمہوریت کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے صحیح طریقہ پر ترقی کرنا ہے تو اسے سیاسی اور معاشی پروگرام پالیسی اور طریقہ کار کی بنیاد پر ترقی کرنا چاہیے نہ کہ پیدائش اور مذہبی وابستگی کے اتفاقی حالات کی بنیاد پر۔

یہ بات بہت خوش آیند ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ پر پوری توجہ کر رہی ہے۔ کانگریسی صوبوں کے وزیروں کے لئے ایک کانگریسی ہدایت نامہ تیار کیا جا رہا ہے اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وزراکو اس کے ذریعہ یہ ہدایت کی جائے گی کہ وہ اقلیتوں کو ملازمتوں میں مناسب نمایندگی دیں ان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے تعلیمی سہولتوں کو وسیع کریں اور اقلیتوں کے تمدن زبان اور مذہب کی حفاظت کریں۔ گاؤکشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کے سوال پر رواج کا احترام کیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے ابھی حال میں یہ اعلان کیا ہے کہ اتفاق رائے نہ ہونے کی صورت میں وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کسی عمارت پر ترنگا جھنڈا نصب کیا جائے۔ جہاں تک بندے ماترم کا تعلق ہے ابھی حال میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف ابتدائی دو بندوں کو جو بے ضرر معلوم ہوتے ہیں اور جن میں کسی ہندو دیوی یا دیوتا کو مخاطب نہیں کیا

گیا ہے قائم رکھا جائے۔

اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ہمارا خیال ہے کہ کانگریسی حلقوں میں موجودہ رجحان مصالحت اور مفاہمت کی طرف ہے۔ اقلیتیں بھی اگر اس کا جواب ایسا ہی دیں گی تو بہت اچھا ہوگا۔ اگر اکثریت نے بہت سی صورتوں میں سرکاری ملازمتوں پر اجارہ قائم کرکے اور اقلیتوں پر نازیبا پابندیاں عاید کرکے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو اقلیتوں نے بھی موقع ملنے پر کچھ ان سے زیادہ بہتر کام نہیں کیا ہے۔

ہندوستان کے مختلف فرقوں میں سرکاری ملازمتوں میں اپنا تناسب بڑھانے کے لئے اکثر جھگڑا ہوتا رہا ہے کچھ سالوں سے حکومت ہند اس پالیسی پر عمل کر رہی ہے کہ جو ملازمتیں اس کی نگرانی میں ہیں ان میں سے ۲۵ فی صدی مسلمانوں کو دی جائیں اور ⅓ ۸ فی صدی دوسری اقلیتوں کو۔ ملازمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ سے بلاشبہ خود غرض نہ مفادوں اور پارٹیوں کو ترقی پانے کا موقع مل رہا ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ سرکاری عہدوں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور بھتوں کو کم کر دیا جائے۔ مالی مشکل کی وجہ سے یہ کام اس وقت بھی شروع ہوگیا ہے اور یہ بات نہ صرف محصول گذار کے لئے ایک برکت ثابت ہوگی بلکہ قومی تحریک کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اہلیت کے کم ترین معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب فرقوں کو مختلف سرکاری ملازمتوں میں خدمت کرنے کا مساوی موقع دینا چاہیئے۔ ابتدا میں تقرر کرتے وقت فرقہ وارانہ تفریق کا خیال رکھا جا سکتا ہے لیکن ترقی میں صرف اہلیت کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیئے کیونکہ نااہل افسروں سے ٹھونسا کیے جانے کا حق ہر شہری کو ملنا چاہیئے وہ چند آدمیوں کے اس حق سے زیادہ وقیع ہے کہ انھیں اپنی ملازمت کے زینہ کی آخری سیڑھی پر صرف اس لئے پہنچنے دیا جائے کہ ان کا تعلق اس فرقہ یا اس فرقہ سے ہے۔ فرقہ داری کی جو برائیاں ہیں انھیں رشوت ستانی، بد اطواری اور سرپرستی کے مواقع کو ختم کرکے بھی کم کیا جا سکتا ہے۔

فرقہ وارانہ تعلقات کے بہتر بنانے کی دوسری تجویزوں کو بھی ذیل میں مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے

(۱) صوبہ کی حکومتوں اور مقامی حکومتوں کو جہاں تک ممکن ہے مناسب انتظامی کارروائیوں اور پالیسیوں کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیئے کیونکہ اقلیتوں کے تحفظ جیسے معاملہ میں انتظامی کارروائیاں، قانون سازی اور عدالتوں کے فیصلے کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ بہترین قوانین کو بھی طریقۂ انتظام میں بے ایمانی سے کام لے کر ناکام بنایا جاسکتا ہے محاصل کے بار کو مساوی طور پر تقسیم کرنا چاہیئے، مختلف قسم کے ٹیکس کو لگاتے وقت اس بات کی طرف سے احتیاط برتنا چاہیئے کہ کسی خاص تجارت یا پیشہ کو جس میں کسی ایک فرقہ کے لوگوں کی اکثریت ہو کوئی امتیازی نقصان نہ پہنچ جائے۔ کانگریس گاؤں کی پنچایتوں کو زندہ کر کے اور انہیں مقامی کاموں کے لئے ایسے محاصل کو حوالہ کر کے جو مقامی طور پر اکھٹے کئے جاتے ہیں ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی ختم ہو جائے گی جب ایک ہی گاؤں کے وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اپنے اوپر آپ حکومت کرنے لگیں گے اور حکومت کے کام کے لئے کل جماعت میں سے بہترین آدمیوں کو منتخب کریں گے اور اس انتخاب کے وقت اس بات کو نہیں دیکھیں گے کہ انتخاب کے امیدوار کی ذات یا مذہب کیا ہے۔

(۲) قانونی نظائر اور مجلس قانون ساز کے مستقل احکامات کو اس طرح پیدا کرنا اور ترقی دینا چاہئیے کہ جس سے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور ان کے اعتماد کو حاصل کیا جا سکے۔

(۳) اجازتی قاعدوں اور کارروائیوں کے ذریعہ اونچے ذات والوں کی نگرانی کرنی چاہئیے کیونکہ ہم ایک طرف تو فرقہ پرستی کی مذمت اور دوسری طرف ذات کی حمایت نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ذات کا نظام اگر فرقہ پرستی کی جڑ نہیں ہے تو ایک طرح کی فرقہ پرستی ضرور ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذات کے نظام کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جاسکتا جب تک ہندوؤں کے طرز زندگی کو بنیادی طور پر نہ بدلا جائے۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندو مذہب میں ذات کے بغیر بھی اتنی سچائی اور زندگی موجود ہے کہ ذات کے ختم ہو جانے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ذات کے نظام کے بارے میں مسلسل عمل اور پروپیگنڈے سے نقطہ نگاہ اور ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے

ہمیں اس ذہنیت سے نجات حاصل کرنا چاہیئے کہ میری ذات یا گوت کا آدمی میرے ہم قوم ہندوستانی کے مقابلہ میں مجھ سے زیادہ قریب ہے جب تک ہندوستان کی تمام سوسائٹی میں باہمی شادیوں کا رواج نہیں ہوگا فرقہ پرستی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گی ہندوستان کو تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ انسانی برادری اور خدا کی الوہیت کا درس دیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ مدراس کی وزارت نے چھوت چھات کو تمام سرکاری جگہوں سے ختم کرنے کے لئے کارروائی کو شروع کر دیا ہے۔ ملابار کے داخلہ مندر کے قانون کو اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے دوسرے قوانین صوبہ اور ملک کے دوسرے حصوں کے لئے بھی بنائے جائیں۔

(۴) ہمیں اس قسم کے امکانات کی بھی تلاش کرنا چاہیئے کہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے لوگ کس طرح ایک ہی گھر میں رکھے جا سکتے ہیں۔ چین اور جاپان میں تو یہ چیز بہت عام ہے لیکن ہندوستان میں ذات کے نظام اور غذا، لباس اور معاشرتی مراسم کے اختلاف کی وجہ سے یہ چیز مشکل معلوم ہوتی ہے بہرحال اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۵) فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ترقی دینے کے لئے ایسے آدمیوں کی مستقل کمیٹیاں بنا دینی چاہئیں۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی کرتے ہوں اور جن کا کام یہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے گروہوں کے لئے وکیل کا کام کریں بلکہ جن کا کام یہ ہوگا کہ وہ مخالف جماعتوں کے تعلقات کو خوشگوار رکھیں۔ ان کمیٹیوں کے کام میں یکجہتی پیدا کرنے کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک صوبہ جاتی ڈپارٹمنٹ بنا دینا چاہیئے۔ ان کمیٹیوں کے ممبر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی ہمدردیاں وسیع ہوں جو تعصب سے خالی ہوں اور جنھیں پڑوس کے ہر شخص کا اعتماد حاصل ہو۔

جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کی ابتدا ہمیشہ غیر مصدقہ رپورٹوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ کوئی شخص یہ خبر مشہور کر دیتا ہے کہ ایک ہندو لڑکی کو ایک

مسلمان بھگا لے گیا یا کسی ہندو نے ایک مسلمان کے چھرا بھونک دیا اور جب فساد ایک دفعہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اس کو روکنے کے لئے تیزی کے ساتھ باا ثر عاملانہ کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مدراس کی حکومت نے اپنے ضلع کے مجسٹریٹوں کو فرقہ وارانہ فسادات کو دبانے کے لئے پورے اختیارات دے رکھے ہیں اور ان کے ان اختیارات کی اپیل عدالت میں نہیں بلکہ حکومت سے کی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کو جو فرقہ وارانہ فساد شروع کرتے ہیں عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ ایسے لوگوں کو آسانی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں کے غنڈوں کی جتھہ بندی کو توڑنے کی ضرورت ہے۔

(۶) گاؤ کشی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کے سلسلہ میں معقول نظائر کے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اچھے شہری ہونے کے نقطۂ نگاہ سے فرائض کو حقوق سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر گاؤ کشی مسلمان چھوڑ دیں تو یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف سے نہایت زبردست ایثار ہوگا۔ اس سے ہندوؤں کی دائمی دوستی کو نہایت یقینی طور پر حاصل کیا جا سکے گا۔ حیدرآباد کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں گاؤ کشی بہت سالوں سے منع کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر گاؤ کشی کو جاری رکھنا ضروری ہو تو اس کام کو جتنی انسانیت کے ساتھ عام پبلک کی نگاہ سے دور رہ کر کیا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی طرح اگر ہندو مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں کے قریب اپنے گھنٹے اور ناقوس بانا چھوڑ دیں تو اس سے فرقوں میں باہمی ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ لیکن اگر گانا اور بجانا ضروری ہو تو اس کو ایسے وقت ہونا چاہیے جو مسلمانوں کی عبادت کا وقت نہیں ہے اور ان اوقات کا تعین کر دینا چاہیئے۔

(۷) روشن خیال پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں کے پیدا کرنے کے کام میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ پجاری اور ملا ہندوستان کے مذہبوں کی ایک بڑی لعنت ہیں۔ اکثر

صورتوں میں انہی کی وجہ سے مذہبی دیوانگی اور تعصب پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے مذہبی رہنماؤں کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہوں کہ انصاف، رحم اور پاکبازی خدا کی نگاہ میں مراسم مذہب کی پابندی سے زیادہ پسندیدہ چیزیں ہیں۔ خدا ظاہری رضاجوئی نہیں چاہتا بلکہ وہ دل کی حضوری نیاز اور تسلیم چاہتا ہے۔

(۸) فرقہ وارانہ مدرسوں کی جگہ قومی مدرسے قائم کرنے چاہئیں۔

(۹) بچوں کو بہترین اخلاقی تعلیم دینے کے لئے اگر ہندوستان کی مختلف مذہبی کتابوں اور ان کی دعاؤں اور مناجاتوں اور مختلف مذہبوں کے عظیم المرتبت مردوں اور عورتوں کی زندگی کے حالات سے مدد لی جائے تو اچھا ہے۔

(۱۰) قومی لباس، قومی رواجات اور قومی تہواروں کے بارے میں بھی تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے مسلمان بھائی ہمارے ترنگے جھنڈے میں ہلال کو بھی شامل کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کسی مذہب کے پیروؤں کے لئے کسی خاص قسم کے لباس یا ذات کے نشان یا کسی اور ظاہری علامت سے اس بات کا اعلان کرتے رہنا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہیں فضول سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہر ہندوستانی بچے کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی مقامی زبان کے ساتھ ساتھ قومی زبان (ہندوستانی) کو بھی سیکھنا چاہیئے۔

(۱۱) ہندوستان کی بیکاری کے کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس سے فرقہ وارانہ ذہنیت کے رفع کرنے میں بہت مدد ملے گی کیونکہ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نہایت خراب معاشی حالات کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کو باعزت روزی کمانے کا موقع نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ رقابتیں اور سرکاری ملازمتوں کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر ہمت بڑھتی ہے کہ اس وقت بھی معاشی تقسیموں نے فرقہ وارانہ تقسیموں کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں فرقہ پروری کا جذبہ بہت مضبوط تھا مسلمانوں کے

غریبوں نے امیروں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے غریبوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔
کانپور میں جو ابھی مزدوروں کا اسٹرائک ہوا تھا اس میں مسلم مزدوروں کو ہندو مزدوروں کے ساتھ
لڑانے کی خود غرضانہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔

(۱۲) ہمیں مختلف فرقوں کے صاحب فکر مردوں اور عورتوں کے حلقے ملک کے طول و عرض
میں بنانا چاہیں تاکہ ہم آہنگی اور ایک جہتی کو ترقی ہو اور تمام فرقوں کے نوجوانوں کی خدمات حاصل کی
جا سکیں اور پھر یہ لوگ مختلف فرقوں میں مفاہمت اور مصالحت پیدا کرانے کے کام کو تبلیغی جوش
و خروش کے ساتھ شروع کر سکیں۔

انقلاب ایران

(جناب احمد خاں صاحب)

مثل مشہور ہے کہ ہر کمالے را زوالے۔ ہر سلطنت کے لئے ترقی اور تنزل لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ جب تک خاندان کو حکومت کرتے کرتے کچھ زمانہ گذر جاتا ہے تو اس کے جانشینوں میں مختلف قسم کے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ عیش وآرام میں پڑ کر مفاد عامہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امرا اور وزرا بھی جو صحیح معنوں میں حکومت کے کل پرزے ہوتے ہیں ان ہی کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور اس عام لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے ملک میں ایک عام بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ حکومت کا یہ رنگ ڈھنگ رعایا کو بالکل نہیں بھاتا اور حکمراں طبقے کے خلاف بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس بغاوت سے اکثر ان لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو بہتر قابلیت اور حسن... رکھتے ہیں اور سلطنت ان کے قدم چومتی ہے۔ اس کا نام انقلاب ہے۔

یورپ کی صنعتی ترقی کے بعد وہاں کے ممالک کو دو چیزوں کی ضرورت ہوئی۔ ایک تو خام اشیا کی اور دوسرے مصنوعہ مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی ہندوستان میں ان کی یہ دونوں ضرورتیں پورا کرنے کی اہلیت شاید زیادہ تھی۔ اس لئے اس پر تقریباً ہر سلطنت کی نظریں پڑتی ہیں اور آخرکار انگریز اس پر قابض ہوئے۔ ہندوستان کا مقام ایسا ہے کہ اس پر خشکی کی طرف سے صرف مغرب ہی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے ہندوستان کی مغرب میں ایران اور افغانستان ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں کے علاوہ انگلستان کی ایک ہم سر سلطنت یعنی روس سے ملتے ہیں لہذا سلطنت برطانیہ کے لئے ضروری ہو گیا کہ اگر وہ ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہتی ہے تو ان دونوں ممالک پر اثر رکھے۔ اس اثر کو قائم رکھنے کی کوششوں نے جو کشمکش پیدا کی وہ انقلاب ایران کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب ایران میں ناصرالدین شاہ تخت نشین تھا۔ یورپ کے
سب سے بڑے مدبر اور سپہ سالار نپولین کو عروج ہوا۔ یورپ میں خاصا غلبہ حاصل کرنے کے بعد
اس کی نظر ایشیا اور افریقہ پر پڑی۔ ایشیا میں ہندوستان اور افریقہ میں مصر چنا گیا۔ اور قرب کی وجہ
سے اس نے پہلے مصر پر حملہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کا راستہ بھی صاف کرنا شروع کر دیا۔
اس رستے کی صفائی میں ایران بھی آگیا۔ فرانس سے فوجی مشن ایران بھیجے جانے لگے۔ تاکہ ایرانی
فرانسیسیوں کی فوجی صلاحیتوں سے مرعوب ہو جائیں۔ مگر ان مشنوں کا زور کم کرنے کے لئے روسی
اور انگریزی مشن بھی ان کے تعاقب میں آئے۔ اسی اثنا میں نپولین کو شکست ہوئی اور فرانسیسی مشن
آنے بند ہو گئے۔ اور ایران میں روس اور برطانیہ مقابلے پر آ گئے۔ اس طرح ایران یورپی سیاست
کے بھنور میں آگیا۔

خاندان قاچار ایران پر تقریباً ایک صدی حکومت کر چکا تھا اور اب ناصرالدین کے رنگ ڈھنگ
سے اس خاندان پر زوال آتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ملک میں اس بے جا غیر ملکی مداخلت نے حکومت
کی غفلت کو دور نہ کیا۔ اور حکومت کی بے پروائی دیکھ کر ملک میں ایک عام بے چینی اور بدنظمی پھیل
گئی اس بدنظمی سے بابی تحریک نے جو اس زمانے میں زور پکڑ رہی تھی اثر لیا۔ اور حکومت کو اس کی
لاپرواہی کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ مگر ناصرالدین شاہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ خود اس کی رعایا اس پر نکتہ
چینی کرے۔ چنانچہ اس نے بابی تحریک کے خلاف نہایت ہی سخت کارروائی کی اور اس تحریک
کو تقریباً مٹا دیا۔ بابی تحریک بادشاہ کے رستے میں آخری رکاوٹ تھی۔ اب راستہ صاف پا کر بادشاہ
تیزی کے ساتھ عیش و آرام کی طرف بڑھا۔ اور وزرا بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
خزانہ جو کہ خاص رعایا کا مال ہوتا ہے گنتی کے چند لوگوں پر صرف ہونے لگا۔ تعیش کی زندگی میں
جتنی دولت ہو کم ہوتی ہے۔ چنانچہ عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار ہوئی۔ جس کے بوجھ سے عوام بالکل دب گئے
اسی زمانے میں بادشاہ کو یورپ جانے کی سوجھی۔ روپے کی قلت کی وجہ سے غیر ملکیوں سے قرضہ
لینا پڑا جس کے بدلے میں ان پر تجارتی رعایتوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس طرح ایرانی تجار

مغربی ممالک کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہاں جو غیر ملکی آئے انھوں نے یہاں کی بدنظمی کو دیکھ کر آہستہ آہستہ حکومت کے مختلف شعبوں کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا اور اب ایرانیوں کے لئے سوائے زراعت کے پیٹ پالنے کا کوئی اور ذریعہ نہ رہ گیا۔

اس دور میں سید جمال الدین افغانی اور ملکوم خان کی شخصیتوں کو ایران کے لئے غیبی مدد سمجھنا چاہیے یہی دو حضرات ہیں جنھوں نے ایرانی قوم میں انقلاب کی روح پھونکی اس موقعہ پر بہتر ہے کہ ان اصحاب کے متعلق بھی کچھ بتا دیا جائے۔

سید جمال الدین افغانی، افغانستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پہلے تعلیمات اسلامیہ کا درس حاصل کیا اور اس کے بعد اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ مصریوں کو بیدار کرنے میں آپ نے نہایت ہی نمایاں حصہ لیا۔ اور خاص طور پر نوجوانوں کو تو آپ ہی نے جگایا۔ ۱۸۸۶ء میں ناصرالدین شاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی۔ آپ ایران تشریف لے گئے۔ وہاں کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر مولانا سے نہ رہا گیا اور آپ نے وہاں اصلاحات کا سلسلہ جاری کیا۔ ایران میں آپ نے دو سال تک قیام فرمایا اور اس عرصہ میں ایک بہت بڑا گروہ شاگردوں کا اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ آپ نے رعایا کی حالت بہتر کرنے کے لئے بادشاہ سے چند مطالبات کئے جس کے سبب سے بادشاہ کے اور آپ کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی اور آخر کار آپ کو ایران چھوڑنا پڑا۔ آپ کے ایران چھوڑ دینے سے آپ کے اثر میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ اب آپ کے شاگرد مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک نئی پود تیار کی جو آزادی کو اپنا نصب العین سمجھتی تھی اور شاہی حکومت سے نفرت کرتی تھی۔

اس دور کی دوسری شخصیت ملکوم خان کی ذات تھی۔ آپ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ طہران میں ایک معمولی استاد کی حیثیت سے آئے تھے۔ مگر اپنی قابلیت اور ہمت کی وجہ سے حکومت ایران کی طرف سے سفیر مقرر ہوئے اور لندن بھیجے گئے۔ یہاں سے آپ نے ایران کی حالت کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت کی۔ اور چند اصلاحات کی تجویز بادشاہ کو بھیجی۔ جب آپ کی طرف

کوئی توجہ نہیں کی گئی تو آپ نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ جس میں حکومت ایران کے اس نامنصفانہ رویے کے خلاف مضامین شائع ہوئے۔ آپ نے اس اخبار کے ذریعہ ایران میں اصلاحات کے لیے زمین تیار کی۔

عوام میں اب عام بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنا لیڈر مولویوں کو بنایا۔ یہ مولوی اکثر وہی تھے جو سید جمال الدین صاحب سے استفادہ حاصل کر چکے تھے ان لوگوں نے استبدادی حکومت سے چھٹکارا پانے کے لئے بے حد قربانیاں کیں اور آزادی کی راہ میں بے دریغ جانیں تک قربان کر دیں۔

ناصر الدین شاہ کے ظلم و ستم کی جب کوئی حد نہ رہی تو ایک ایرانی نوجوان نے اسے قتل کر دیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ سید جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھا۔ اس پر ان کے دوسرے شاگردوں کو بھی تلاش کیا گیا۔ مگر صرف تین اشخاص ہی مل سکے اور وہ قتل کرا دیے گئے۔ اس طرح ناصر الدین شاہ کا خاتمہ ہوا۔ اس نے اپنی عمر میں ایران کے لیے صرف ایک کام کیا اور وہ کاسک بریگیڈ کا قیام تھا۔ اس فوج نے آئندہ چل کر ایران کی سیاست میں بہت بڑا کام کیا۔ ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد جو بدلہ سید جمال الدین صاحب کے شاگردوں سے لیا گیا اس نے عوام میں ایک بے چینی پیدا کر دی اور وہ حکومت سے بدلہ لینے پر تل گئے۔

ناصر الدین کے بعد مظفر الدین تخت نشین ہوا۔ یہ آدمی نرم دل اور طبیعت کا بہت کمزور تھا اس کمزوری سے غیر ملکیوں نے کافی فائدہ اٹھایا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی اس کمزوری سے قومیت پسند طبقے کو بھی بہت تقویت پہنچی۔ مظفر الدین کا زمانہ صحیح معنوں میں قومیت پسندوں کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی روس اور برطانیہ دونوں بادشاہ کو اپنے اثر میں لانے کے لیے زور لگانے لگے۔ مگر بادشاہ نے ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں بگاڑی بلکہ دونوں کو خوش رکھنے کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔

عوام میں بھی اب کافی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ قومی لیڈروں نے بھی بادشاہ کی اس کمزوری

کو سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف اصلاحات اور دستوری ساسی کا مطالبہ کیا
پہلے پہل کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس پر عوام نے طہران کو چھوڑ دیا۔ اور وہ قریب کے شہروں میں چلے
گئے۔ تب بادشاہ کو جھکنا پڑا۔ اور ان کے مطالبات پورے کئے گئے۔ بڑے مطالبات دو تھے
ایک تو یہ کہ عین الدولہ وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔ دوسرے ایک
مجلس (پارلیمنٹ) قائم ہو جس میں عوام کے نمائندے ہوں اور بادشاہ ان کے مشورے سے
حکومت کرے۔ چنانچہ ۵ راگست ۱۹۰۶ء میں مجلس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور ۷ اکتوبر
۱۹۰۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ مجلس میں ارکین کی کل تعداد ۱۵۶ تھی جن میں سے ۶۰ نمائندے
امرا کے تھے۔ اور باقی عوام کے جو مختلف صوبوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ اس طرح بادشاہ عوام
کے نمایندوں کے مشوروں کا پابند ہو گیا۔ شاہی مسند کے لئے یہ تمام پابندیاں پیدا کر کے مظفرالدین
راہیٔ ملک عدم ہوا۔ اور اس کا بیٹا محمد علی بادشاہ ہوا۔

محمد علی شاہ کے زمانے میں ملک میں بہت بدامنی رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ آدمی
ذرا غیور تھا۔ کسی کا پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے آپ کو مختلف
قسم کی پابندیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ اس نے ان پابندیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کیں۔
مثلاً اس نے سب سے پہلے مجلس میں شاہی حقوق کا مسئلہ پیش کیا۔ وہ کہتا تھا کہ بادشاہ کو مجلس کے
مشورے کا بالکل پابند نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو کم ازکم اتنی آزادی ضرور ملنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی موقعہ
پر کسی وجہ سے مجلس کے مشورے پر عمل کرنا نہ چاہے یا اس مشورے کو برا سمجھے تو وہ اپنے اختیارات
سے کام لے سکے۔ جب مجلس میں اس کے ان مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تو اس نے عوام میں اپنا اثر
قائم کرنا چاہا۔ مگر عوام مجلس کے اثر کو قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ لے دے کے
صرف عدالتی پارٹی نے اس کا ساتھ دیا۔ یہ پارٹی بہت مختصر تھی جس سے اس کا کام چلتا نظر نہ آتا تھا
چنانچہ اس کو کسی اور رفیق کی تلاش ہوئی۔ اور جب ہر طرف سے ناامیدی ہو گئی تو اس کی نظر روس اور
برطانیہ پر پڑی۔ یہ دونوں تو چاہتے ہی تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہم ایران کی سیاست پر حاوی ہو جائیں

چنانچہ دونوں طرف سے بادشاہ کو بس میں کرنے کی کوشش ہوئی اور روس کامیاب ہوا۔ بادشاہ کو روس ایک ایسا رفیق ملا جیسا وہ چاہتا تھا۔ اور روس نے بھی یہ دوستی آخری وقت تک نباہی۔

بادشاہ مجلس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یہ سوچا کہ مجلس کی عمارت کو گرا دیا جائے اور اراکین کو منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے عدالتی پارٹی کا جلسۂ عام کیا جس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عدالتی پارٹی کے لیڈروں نے مجمع میں اپنی تقریروں کے ذریعے بہت جوش پیدا کر دیا۔ اور انھوں نے چند روسی سپاہیوں کے ساتھ مجلس کو بہت نقصان پہنچایا مگر عمارت کو گرا نہ سکے۔ مجلس کے اراکین نے شہر کی جامع مسجد میں عام جلسہ کیا جس میں بادشاہ کی اس حرکت پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور بادشاہ کو یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ مجلس کا مطیع ہو کر رہے گا مگر اس واقعہ سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگی اور اسی ہفتے کے اندر اندر اس نے طہران چھوڑ دیا اور شہر کے باہر روسی حفاظت میں ایک باغ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے ایران پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کی۔ ایک دن تار وغیرہ کٹوا دیئے گئے تاکہ طہران کی خبریں دوسرے صوبوں تک نہ پہنچ سکیں اور روسی مدد سے طہران کا محاصرہ کر لیا۔ اراکین مجلس نے اپنے آپ کو بالکل بے بس پا کر صلح کا پیغام بھیجا اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ دوسری صبح کو تڑکے، شاہی فوج کے ایک ہزار سپاہی شہر میں داخل ہوئے اور مجلس کی عمارت کو آگ لگا دی اور اراکین مجلس کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ بعض کو قید خانہ نصیب ہوا اور بعض پوشیدہ طریقے سے قتل بھی کرائے گئے۔ اس طرح پھر ایک دفعہ استبدادی حکومت قائم ہوگئی اور اس کا سلسلہ تقریباً ۱ مہینے تک رہا۔ مختلف صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کو روسی مدد سے فرد کرنے کی کوشش کی گئی۔ کاسک بریگیڈ اس زمانے میں بادشاہ کی طرف تھا۔ اس سے بہت کام لیا گیا۔ اول اول تو قومیت پسند اپنے اپنے صوبوں میں لڑتے رہے پھر ان کی فوجیں مل گئیں اور انھوں نے طہران پر حملہ کیا۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۰۹ء کو بختیاری اور قومی فوج طہران میں داخل ہوگئی اور کاسک بریگیڈ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ان تمام واقعات کے بعد بھی بادشاہ نے ہمت نہ ہاری وہ روسی پناہ میں چلا گیا اور کوشش کرتا رہا کہ ایران کو فتح کرے چنانچہ روسی مدد سے اس نے پھر حملہ کیا۔ اول اول تو کاسک بریگیڈ جو اب قوم کے ساتھ تھا پیچھے ہٹتا چلا آیا۔ مگر ایک مقام پر اس نے جان لڑا کر مقابلہ کیا اور بادشاہ کو شکست دی۔ یہ بادشاہ کی آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد وہ معزول کر دیا گیا اور اس کے لڑکے احمد شاہ کو جس کی عمر ۱۲ سال کی تھی بادشاہ بنایا گیا اور حکومت صحیح معنوں میں مجلس کے ہاتھ میں آ گئی۔

ابھی تک خانہ جنگی کی وجہ سے مجلس پورے طور پر اصلاحات عمل میں نہ لا سکی تھی۔ اب اس کو بالکل آزادانہ موقع ملا اور اس نے ملک کی بہتری کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہی فضول خرچیوں کی وجہ سے عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ مجلس نے مالیات کے محکمے کو چلانے کے لئے امریکہ سے مدد لی اور وہاں سے شسٹر چند مددگاروں کے ساتھ اسی کام کے لئے آئے۔ مسٹر شسٹر بہت ہی مخلص آدمی تھے۔ آپ نے آتے ہی عوام پر سے بے جا ٹیکسوں کو ہٹایا اور امرا پر جائز ٹیکس لگائے۔ امرا کا طبقہ ایسا تھا جس نے تقریباً ایک صدی سے کبھی ٹیکس کا نام بھی نہ سنا تھا یکایک یہ حالت دیکھ کر وہ بدکا۔ دوسری طرف مسٹر شسٹر نے غیر ملکی تاجروں پر ٹیکس لگائے تاکہ ایرانی تجارت کو فروغ ہو۔ مگر روس اور برطانیہ یہ ٹیکس گوارا نہ کر سکے اور ان ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مسٹر شسٹر کو ایران سے نکالا جائے اور یہ کام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک مجلس میں اکثریت نہ حاصل کی جاتی۔ چنانچہ مجلس کے دوسرے سیشن میں ان دونوں بیرونی حکومتوں اور ایران کے امرا نے مل کر مجلس میں اکثریت حاصل کر لی شسٹر کو نکال باہر کیا۔ اور پھر جو قانون جی میں آیا پاس کر دیا۔ ملک کی حالت پھر بدتر ہو گئی اور عوام مجلس سے بھی بدظن ہو گئے۔

اسی اثنا میں روس میں انقلاب ہوا جس کی وجہ سے ایران میں روسی زور کم ہو گیا۔ مگر اس انقلاب سے ایران نے بہت اثر لیا۔ خاص طور سے شمالی ایران میں اشتراکیت کا بہت زور شور سے پروپیگنڈا

کیا گیا۔ کاسک بریگیڈ میں بھی انقلاب ہوا جس کی وجہ سے کچھ بدامنی کا اندیشہ ہوا۔ اور رضا خاں کاسک بریگیڈ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ اس طرح ایک ایسی شخصیت کو عروج کا موقعہ ملا جس نے بعد میں آکر ایران کو ترقی کے موجودہ معراج پر پہنچا دیا۔

اس زمانے میں مجلس نے تیل کے چشموں کا اجارہ برطانیہ کی ایک کمپنی کو دے دیا جس سے ایران کو بہت سخت اقتصادی نقصان پہنچا اور عوام میں مجلس کا اعتبار جاتا رہا۔ ایران پر برطانیہ کا اثر غالب تھا۔ طہران میں ایک برطانوی فوج تھی اور ہر طرح کے تجارتی مراعات برطانیہ کو حاصل تھے۔

رضا خان بیدا معز زآدمی تھا۔ وہ ایران کو کسی غیر قوم کے اثر میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مجلس سے بھی خفا تھا اور رعایا سے بھی۔ مجلس سے اس لئے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے مشکلوں کے ساتھ اور تکلیفیں برداشت کر کے جو اختیارات حاصل کئے تھے اب ان کو استعمال میں نہیں لاتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان اراکین میں سب لوگ مخلص ہیں اور رعایا کا دل سے بھلا چاہنے والے ہیں۔ مگر لیڈر کی کمی ہے جو ان کو کام بتائے کہ اب یوں کرو اور اب یوں۔ وہ عوام سے اس لئے خفا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مجلس کو پورے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ مگر وہ اسے کچھ کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی بنا پر اس نے ۲۰ فروری ۱۹۲۱ء کو کاسک بریگیڈ کے ۲½ ہزار جوانوں کے ساتھ طہران پر حملہ کیا برطانوی فوج کے کمانڈر نے شہر سے باہر رضا خاں سے ملاقات کی اور بغیر کسی کشت و خون کے رضا خاں کی فوج شہر میں داخل ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجلس کی طرف سے رضا خاں وزیر جنگ مقرر ہوئے۔

وزیر جنگ ہوتے ہی رضا خان نے ایران کی فوجی قوت بڑھانا شروع کی اور آذربائیجان کی ۱۹۲۳ء کی شورش میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایران کے پاس ۴۰ ہزار مسلح اور تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ لیکن ایران کا وزیر اعظم سید ضیاء الدین، رضا خاں کی اس ترقی کو دیکھ کر بہت کڑھتا تھا اس نے کئی مرتبہ رضا خاں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کوئی موقعہ نہ ملا۔ اور آخر کار ایک

دن وہ خود ہی طہران چھوڑ کر چلا گیا جس سے مجلس کا منتخب شدہ کابینہ ٹوٹ گیا۔

اب رضا خان نے اپنا کابینہ مرتب کیا۔ مگر خود وزیر جنگ کا عہدہ ہی لیا۔ اس لئے کہ وہ عہدے وغیرہ حاصل کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔ وہ ایران کی ترقی چاہتا تھا اور اپنا سب کچھ اسی ایک مقصد میں صرف کر دینا چاہتا تھا۔ اسی سال ایک شخص امریکہ سے اس مقصد کے لئے بلایا گیا کہ وہ یہاں کی اقتصادی اور مالی حالت میں اصلاح کرے۔ اس کابینہ میں جو رضا خان نے مرتب کیا تھا جب وزیر اعظم کا کام کسی سے نہ سنبھالا جا سکا تو پھر اس نے خود ہی یہ عہدہ لے لیا۔ اسی سال احمد شاہ قاچار، ایران سے چلا گیا اور اس نے پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اس طرح قاچار خاندان کا ایران میں بالکل خاتمہ ہو گیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مجلس نے اعلان کیا کہ رضا خان کو ان کی خدمات کے صلے میں بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء کو آپ کی تاج پوشی کا جشن منایا گیا۔ اس طرح رضا خان، رضا شاہ پہلوی بن گئے۔

بادشاہ ہوتے ہی رضا شاہ نے قوم کو آزادی کا وہ میٹھا پھل چکھانا شروع کیا۔ جو بہت سی مصیبتوں اور دقتوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ یعنی عوام کی ترقی کے لئے مختلف قسم کی اصلاحات کیں مثلاً تعلیم عام کر دی، ملک والوں میں دو بڑے مذہبی فرقے شیعہ اور سنی تھے۔ جن میں ہمیشہ لڑائیاں جھگڑے رہتے تھے۔ ان کو ختم کر دیا اور آمد و رفت کے لئے ریلوں کا انتظام کیا۔ ان سب کاموں سے بڑا کام یہ کیا کہ انھوں نے برطانوی اور روسی اثر کو ملک سے دور کیا اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران بھی ایک ایسا ملک ہے جو آزاد ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

نازیت کا پس منظر

(خواجہ احمد فاروقی، بی ۔اے)

پچھلے زمانہ کا ایک قصہ مشہور ہے کہ سرد ملک کا ایک بڈھا برف گاڑی[1] میں بیٹھا ہوا اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ جنگل میں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بھیڑیا ان کا پیچھا کرنے لگا بڈھے نے گھوڑے کے ہنٹر پر ہنٹر رسید کئے۔ اور آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن بھیڑیا نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا۔ بالآخر بڈھے نے کچھ کھانے کا سامان اس کے آگے ڈالا لیکن اس سے بھوکے بھیڑیے کی نیت نہیں بھری وہ اور بھی تیزی کے ساتھ پیچھا کرتا رہا اتنے میں گھوڑا ہانپنے لگا اور تھکن کی وجہ سے اس کی وہ تیز رفتاری بھی نہیں رہی۔ آخرکار وہ بھیڑیا برف گاڑی کے اتنا قریب آگیا کہ بیوی اور بچے اس کی خونی آنکھوں کو دیکھ کر لرزنے لگے۔ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ بس اب ایک لحہ کے اندر وہ موت کے منہ میں ہوں گے بڈھے نے یہ دیکھ کر کہ اب گھر والوں کے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ایک جست کی اور اپنے آپ کو بھیڑیے کے سپرد کر دیا۔ بھیڑیا اس کے کھانے میں مصروف ہو گیا اور بچے محفوظ جگہ پہنچ گئے۔

اس بڈھے کو گذرے ہوئے زمانہ ہو گیا لیکن اس کے ایثار و قربانی کی مثال آج بھی روشن ہے۔ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہیں کی اور گھر والوں کو حملہ کی زد سے بچا لیا۔

لیکن آج ہمیں تہذیب اور جمہوریت سرنگوں نظر آتی ہے جب ہم یورپ کے میدان سیاست میں اس مثال کی صریح خلاف ورزی دیکھتے ہیں۔ اس وقت وہ ضعیف العمر اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہے اور اپنی مدافعت کے لئے اس نے گھر والوں کو ایک ایک کر کے بھیڑیے کے سپرد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج برطانیہ اس عالم کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نازیت کی تسکین اشتہا

---

[1] بغیر پہیوں کی گاڑی جس پر سوار ہو کر برف پر سفر کرتے ہیں۔

کے لئے مختلف دول یورپ کی قربانیاں پیش کیں لیکن ہٹلر کے جوع البقر میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی بھوک بالکل اس خونخوار بھیڑیے کی طرح ہے جس کی معمولی قربانیوں سے سیری نہیں ہوتی بلکہ اسی طرح اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور اس کے حملہ کی شدت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ رائن، آسٹریا، زیکوسلوویکیا اور میمل ایک ایک کرکے اس قربان گاہ پر چڑھا دئے گئے۔ لوکارنو، ویلز اور میونک کے مواثیق و معاہدات کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اڑادی گئیں لیکن پھر بھی امن عالم کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ایک جمہوریت پسند مفکر نے سیاسیات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے بڑے مزہ کا فقرہ کہا تھا:۔

"اگر میرا بس چلے تو میں تمام نیلگوں آسمان پر جلی اور خونی حروف میں صرف ایک لفظ ـــــ نازیت ـــــ لکھ دوں"

اس میں شک نہیں کہ آج نازیت نے یورپ کے توازن ملکی کو برباد کرنے اور امن عالم کو معرض خطر میں ڈالنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کی کتاب سیاست میں ایفائے وعدہ کوئی چیز نہیں۔ وہاں طریقہ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے لیکن آخر یہ نازیت ہے کیا؟ جس کے طنطنہ اور ہمہمہ کے آگے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں نے سر عجز خم کردیا ہے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شکست خوردہ قوم اپنی ہار کے چودہ یا پندرہ سال کے زمانہ میں بہت زیادہ وطن پرست ہوجاتی ہے اور اسی بنا پر جرمنی میں بھی اشتراکیت قومی کا قیام ہوا۔ عام انگریزوں کے نزدیک ہٹلر کی ہتم بالشان کامیابی کا راز صرف اس میں پوشیدہ ہے کہ اس نے جرمنی کی ان حیات کو بیدار کرنا چاہا جو جنگ عظیم میں بری طرح پامال ہوچکی تھیں۔ اور جن کی تباہی اور بربادی کو آئین ورسیلز نے مکمل کردیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ نازیت اس احساس کمتری کی پیداوار ہے جو تمام جرمن قوم پر ایک اعصابی مرض کی طرح مسلط تھا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہٹلرازم مجرد ہی کا ایک دوسرا نام ہے جو محض ایک عارضی اور ہنگامی چیز ہے۔

اس بحث میں اگر کچھ سچائی ہے تو صرف اتنی کہ اس سے ہمیں ہٹلر کی انتقامانہ ذہنیت اور معاندانہ انداز تقریر کا تھوڑا بہت نفسیاتی جواز مل جاتا ہے لیکن یہ تمام کی تمام حقیقت نہیں ہے ہٹلر کے مسلک اور تحریک کو ہنگامی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی تمام تاریخی کڑیوں سے ناواقف ہیں بہت سے لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر ازم ہاؤسٹن اسٹورٹ[1] (Houston Stewart) اور گابنیو[2] (Gobineau) کی تحریروں کا محض ہے اور بس لیکن یہ صحیح نہیں ہے جرمنی میں ان خیالات کو اس وقت نشو و ارتقا حاصل ہوئی جب فتح مندی و کامرانی بسمارک کی فوجوں کے قدم چوم رہی تھی۔ اور اسے ڈنمارک، اسٹریا، اور فرانس پر پورا تصرف حاصل ہوتا جارہا تھا۔ اس وجہ سے ہم کہ سکتے ہیں کہ نازی مسلک کسی شکست خوردگی یا کمتری کے احساس کی ہنگامی پیداوار نہیں ہے بلکہ اگر اس کے پس منظر کا صحیح مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جرمنی کی تاریخی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ہنرش وان ٹرٹشک (Heinrich Von-Treitschke) کے نظریۂ ریاست اور مین کیمف' (Mein Kampf) کے خاص خاص اصولوں کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ ان میں کس قدر حیرت انگیز تطابق اور مماثلت ہے۔ ہٹلر کی جہاد فرمائی یہود دشمنی، مطالبہ مستعمرات، اور پان جرمن ازم غرض اس کے تمام بڑے بڑے اصول سب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی جرمن پروفیسر سے مستعار ہیں۔ اس کے بعد آپ ہٹلر اور جرمن شہنشاہوں کی تقریروں کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ان میں خیال کی کس قدر یکسانیت ہے۔ اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ نازیت ماضی کی تفسیر حال ہے۔

ٹرٹشک (Treitschke) ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۵ء میں انتقال کر گیا۔

---

(۱) و (۲) دو مصنفوں کے نام ہیں جن میں سے پہلا انگریز اور دوسرا فرانسیسی۔ یہ دونوں اپنے خیالات کی "نجونیت" کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ (خ۔ ا۔ ف)

اس نے آرنٹ اور ڈلمان (Dahlmann) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور ۱۸۵۹ء میں اپنی مشہور کتاب "ریاست" تصنیف کی جس کو اس نے بعد میں اور بڑھایا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کی وجہ سے اس نے مستقل شہرت حاصل کرلی۔ ۱۸۷۴ء میں وہ برلن میں شعبہ تاریخ جدید کا صدر مقرر ہوگیا اور مرتے وقت تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں سروش غیبی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور مرنے کے بعد تو اس کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے۔ جنگ عظیم کے قبل تک لوگ اس "ارسطوئے ثانی" کے نام کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔

ٹرٹشک نے اپنا نظریہ ریاست حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"ریاست، طاقت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کا اولین فرض جنگ کرنا ہے بغیر جنگ کے کسی ریاست کا تصور ناممکن ہے .... فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسے اپنی خودی کو ایک بڑے کل میں جذب کردینا چاہیئے۔ خیر عمومی کے آگے خیر انفرادی بالکل بے معنی شے ہے۔ اگر اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے تو پھر جنگ کی عظمت بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی ...... جنگ سیاسی تصوریت کا اقتضا ہے۔ مادیت اسی سے برسرپیکار رہی لیکن سب سے زیادہ قابل ملامت اخلاق کی وہ کجروی اور کمزوری ہے جو انسانیت سے شجاعت ہی ختم کردینا چاہتی ہے۔"

اس کے مقابلہ پر ہٹلر کہتا ہے، "کسی حکومت کو اپنے ارادہ اور منشا کو دوسری حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں کردینا چاہیئے۔ اس کا جب جی چاہے لڑائی کرے اور جب جی چاہے پچھلے معاہدوں کو منسوخ کردے"

صلح نامۂ ورسلیز کے متعلق ہٹلر کے یہ الفاظ بہت مشہور ہیں کہ "اس کی حیثیت "لوح مزار" سے زیادہ نہیں ہے" اسی طریقہ سے وہ دوسری حکومتوں کے مابین کسی ایسے معاہدہ کو "جس کا مقصد لڑائی کرنا نہیں ہے" کوئی وقعت نہیں دیتا۔ جمہوریت پرستوں کو وہ "پارلیمانی دوا فروشوں"

سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اگر ان کے اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ ہوگا تو وہ صرف حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہوگا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں"

ہٹلر طاقت اور قوت پر پورا بھروسہ رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آفرینش آدم سے لے کر اس وقت تک قوت ہی نے حکومت کی ہے اور یہی چیز "نئے زمین و آسمان کی تخلیق" میں مددگا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح وہ قوت اور طاقت کے ساتھ ساتھ تعصب اور تشدد کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

ہٹلر امتیاز نسل کے معاملہ میں بھی ٹرٹشک سے بالکل متفق ہے۔ موخر الذکر اپنی مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ آریہ قوم بڑی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ تمام نسلوں سے زیادہ بہادر اور شجاع ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کی تلوار سے حفاظت کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے جس کو وہ اپنی روحانی جد و جہد سے حاصل کرتی ہے۔ ہٹلر کے نزدیک نسل کی بقا ذاتی آزادی کے تحفظ سے زیادہ ضروری اور اس کی یہود دشمنی کا بھی ایک بڑا سبب یہی آریہ پرستی ہے۔

ٹرٹشک نے ایک مرتبہ سامی نسل کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا:۔

"اب آریہ لوگ روپیہ پیسے کا انتظام کرنے کے اہل ہو گئے ہیں اس لئے یہودیوں کی کوئی ضرورت نہیں...... اس کے علاوہ اس سامی نسل کی تمام خرابیاں منصہ شہود پر آ رہی ہیں اور اس طرح وہ ہمارے لئے روز بروز خطرہ کا سبب بن رہی ہے"

ہٹلر نے یہودیوں کی "ضرورت" قطعاً بھی تسلیم نہیں کی ہے، نازی جرمنی نے ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک برتا ہے اور جس طرح ان کی زندگیوں کو یکسر آہ اور کراہ بنادیا ہے، وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ہٹلر عورتوں کے باب میں بھی ٹرٹشک کا بالکل ہمنوا معلوم ہوتا ہے۔ برلن کے اس حکیم دماغی کے نزدیک بھی عورت کی زندگی صرف گھر اور بچہ سے متعلق ہونا چاہیئے اور ہٹلر بھی یہی سمجھتا ہے کہ عورت کا اہم ترین فریضہ تدبیر منزل سے باخبر ہونا ہے ٹرٹشک اور ہٹلر دونوں اسی بات سے خواہاں ہیں کہ عورتوں کو ایک مضبوط قوم پیدا کرنا چاہیئے۔ آمر جرمنی کے نزدیک شادی کا مقصد "نصف

انسان اور نصف بوزینہ قسم کے جانور" پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی تندرست و توانا قوم پیدا کرنا ہے جو اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے لحاظ سے اقوام عالم کو زیر و زبر کر سکتی ہو، وہ ایسی عورتیں نہیں چاہتا "جو نہ صحیح معنوں میں عورت ہیں اور نہ مرد بلکہ ایک تیسری جنس ہیں جس کو خود مردوں کے اعمال نے پیدا کیا ہے"

ٹرٹشک نے ہٹلر پر جو احسان کیے ہیں اس کی فرد بہت طویل ہے۔ فوج کی شدید تابع داری کے معاملہ میں بھی جرمنی کا آمر ٹرٹشک کا خوشہ چین نظر آتا ہے۔ موخرالذکر کا خیال ہے کہ فوج اپنی کوئی منشا اور رائے نہیں رکھ سکتی۔ اس کو ریاست کے حاکم اعلیٰ کا اسی قدر فرمانبردار ہونا چاہیئے جس طرح ایک غلام آقا کا ہوتا ہے۔ ٹرٹشک نے ان خیالات کا اظہار ۱۸۹۲ء میں ایک لکچر کے سلسلہ میں کیا تھا۔ ہٹلر نے غالباً اسی اصول کے ماتحت جون ۱۹۳۴ء میں ان تمام لشکریوں کو نکال باہر کیا جو اختیارات کے طلب گار تھے۔ جنرل وان شلیشر (Von Schleicher) کا قتل اور بہت سے خاکی پوشوں کا ختم کیا جانا اسی قبیل کی چیز ہے۔

نازی جرمنی کا مطالبہ مستعمرات بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مطالبہ محض خام پیداوار کے حصول کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ٹرٹشک کہتا ہے کہ اس مطالبہ کی نوعیت تاریخی، نفسیاتی، سیاسی، اور معاشیاتی ہے اور جس طرح بھی ہو" اس ضرورت کو پورا کرنا چاہیئے۔ ہٹلر کا بھی راسخ عقیدہ ہے کہ" ہماری کھوئی ہوئی نوآبادیاں پارلیمانی الفاظ سے نہیں بلکہ صرف چمکدار تلوار اور خوں ریز جنگ سے حاصل ہو سکتی ہیں"

ٹرٹشک نے لکھا ہے کہ آئندہ جرمنی کے بلند مرتبہ کا انحصار ان لوگوں کی تعداد کثیر پر ہوگا جو جرمن بولتے ہوں گے۔ نازی جرمنی بھی اس بات کا خواہش مند ہے کہ جرمن کلچر کو فروغ اور وسعت دی جائے۔ اور جہاں جہاں اس کے اثرات موجود ہوں، انھیں باقی رکھا جائے۔ وہ اسی بنا پر خود قراری (Self Determination) کے اصول کا بڑا علمبردار ہے۔ برزیل (Brazil) میں جرمن زبان، جرمن اخبارات، اور جرمن اسکولوں کو قائم رکھنے

کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی ہے۔ اور یہی عمل سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ میں کیا گیا ہے لیکن اس کوشش کی سب سے زیادہ عملی صورت سوڈیٹن، موریویا، بوہیمیا، سائیلیسیا، ڈینزگ اور میمل میں نظر آتی ہے اس لئے کہ ان میں سے بہت سے علاقے آج جرمن ریشاغ میں شامل ہو چکے ہیں۔

جرمنی کی موجودہ سیاست کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اس کے ماضی سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے۔ نازیت سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کے ماضی کی عملی تفسیر۔ جو لوگ اس کی بنیادیں حال اور صرف حال ہی کی ہنگامی فضا میں تلاش کرتے ہیں وہ حقیقتاً ایک بڑی تاریخی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمیں نازیت کی صحیح تشریح کے لئے جرمنی کی پرشین پالیسی، بسمارک کی تمناؤں اور جرمن شہنشاہوں کی ۱۸۷۱ء، ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۲ء کی حکمت عملیوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور سب سے زیادہ توجہ ہمیں ان ذہنی پیشواؤں کی طرف مبذول کرنا چاہیئے جن کے خیالات نے جرمنی کو موجودہ قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی روشنی میں نازیت کی جو شکل مرتب ہوگی وہ بہت زیادہ کریہہ المنظر اور ہیبتناک معلوم ہوگی لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ آج اس نے جرمنی کو یورپ کی سب سے بڑی قوت بنا دیا ہے اور اتنے وسیع[1] رقبہ پر حکومت عطا کی ہے جو اسے ولیم ثانی کے زمانہ میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ آج اس کی عسکری قوت روس سے بھی زیادہ ہے اور ہوائی طاقت فرانس اور انگلستان دونوں سے بہتر ہے، تجارت کے میدان میں بھی جرمن مسابقت بڑی اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے اور اس کے معاشی وسائل میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔

---

[1] قیصر ولیم ثانی کے زمانہ میں جرمنی کا رقبہ ۲۰۸۰۰۰ مربع میل تھا اور آج زیکوسلواکیا شامل ہو جانے کے بعد اس کا رقبہ ۲۹۵۴۴۲ مربع میل ہے۔ (خ۔ا۔ف)

پریوں کی کہانیاں

(۱)

" اگلے زمانے میں" میں نے کہنا شروع کیا۔" بہت پرانے زمانے میں جب
زندگی بالکل انگھڑ اور ناتراشیدہ تھی، جب تمدن کی بنا نہیں پڑی تھی اور کہیں کسی قسم کے
کارخانے کا کسی کو بعیدی خیال بھی نہ ہوا تھا، لوگ خوش اور مطمئن تھے! کیونکہ حق وصداقت
پر جستجو و تلاش کی گمراہیوں کے اتنے پردے نہ پڑ گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ بصیر تھے
فطرت عالم کو دیکھتے اور خدا کو پہچانتے تھے! ان کو یقین تھا کہ خدا اسی عالم ایجاد کے اندر ہے! ا
آج کی طرح وہ اسے عرش نشین و کرسی مقام نہ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ہواؤں کے اندر
چلتا ہے، پانی کے اندر بہتا ہے، اور زندگی کا ہر مظہر قطع نظر اس سے کہ وہ کیا ہے اور کہاں
ہے، خدا کا مظہر ہے، خدا ہے! انھیں کامل یقین تھا کہ یہ عالم آب و گل ہی اس کی جلوہ گاہِ
ناز ہے، کہ وہ بس ایک جلوہ ہی تو ہے، وہی تو جلوۂ حیات ہے! تمہاری، میری اور سب
کی روحیں اسی کے جلوۂ نور کا ایک جزو ہیں۔

" میں کیا کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ کس طرح گر انھوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا اور
اس کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کی باتیں سادہ تھیں اور ان کے خیالات غیر ملوث تھے! انھوں نے
بتا دیا کہ چاند اور سورج کی چمک ان کی روح ہے، ہواؤں اور پانیوں کی قوت روانی ان کی
روح ہے! یہ ان کا بس انداز بیان تھا: مطلب یہ تھا کہ کائنات میں کوئی شے روح سے خالی
نہیں! انھوں نے ہر چیز میں زندگی کا احساس کیا تھا، کیونکہ یہ ایک صداقت تھی: ان کی کہانیاں
اسی صداقت کے بیان اور تمثیلیں ہیں!"

حیرت زدہ دردانہ مجھے تکتی رہی۔

"تم اس کا احساس ویقین نہیں کرتیں؟" میں نے پوچھا۔ "اس تمام منظرِ نور و رنگینی کو دیکھو کہ وہ کس طرح ندی کے گیت کی سنگت بنا ہوا ہے! کیا تم اس سب کو مردہ کہہ سکتی ہو جو صفات وجود کی تکمیل میں لگا ہوا اس ذات کو نمایاں کر رہا ہے؟"

"نہیں میں محسوس کر رہی ہوں!" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"ان لوگوں کے بعد ان سے بھی بڑے لوگ آئے؛ انھوں نے وحدتِ وجودی کو سمجھا" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اور انھوں نے بتایا کہ ہر شے میں روح ہے مگر وہ روحیں جداگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی روح ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے! وہ جو روشنی کے اندر ہے، جو ہواؤں کے اندر ہے جو سبزہ و برگ کے اندر ہے، اور جو حیوان و انسان کے اندر ہے، ایک ہی شے ہے! ہر چند مظاہر لاتعداد ہیں مگر مظہر ایک ہی ہے: وہ آئینہ خانہ کی شمع ہے کہ ہر چھوٹے بڑے صاف اور دھندلے شیشوں میں ضو انداز ہوتی ہے! اور وہ ذات واحد، وہ روحِ عالم، جس نے کائنات بنائی، اپنی اسی کائنات کے اندر سکونت رکھتا ہے، جس طرح تمہاری روح تمہارے اندر رہتی ہے؟"

میں سانس لینے کو رکا تو دردانہ نے کہا۔

"کہے جاؤ!"

"یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ روح، یہ خدا، محبت ہے ——— محبت جو لازوال ہے! محبت کا وہ شمہ بھی جسے انسان محسوس کرے خدا ہے اور باقی ہے! اور وہ اپنے لباس کو اپنے لئے موزوں و خوب صورت بناتا رہتا ہے! ہماری روحیں نورِ الٰہی کا جزو ہیں اور یہ سب کائنات بھی اسی نور کا جلوہ ہے ——— اور اس لئے کہ اس کا جلوہ فنا نہیں ہو سکتا یہ دنیا ہمیشہ کے لئے ہے اور ہماری دنیا ہے؟"

"تو پھر دنیا نے اتنی بیّن اور حیرت ناک حقیقت کو کیوں نظر انداز کر دیا؟" دردانہ نے سمجھا اور سوال کیا۔

"فطرت کے پیامبروں نے اسی صداقت واحدہ کو دنیا پر ظاہر کیا تھا۔ مگر ان کے بعد مذہب ذریعہ معاش بن گیا اور ان پیشہ ور مذہبوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈالا تاکہ ان کا اپنا تفوق قائم رہے: انھوں نے اس کی حقیقت کو نہ سمجھا، نہ مانا، اور مٹایا۔"

"تو کیا صداقت مٹائی بھی جا سکتی ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"نہیں صداقت باوجود اپنے مخالفوں کے مٹائی نہیں جا سکتی: وہ ہر ایسی کوشش کے بعد تازہ دم اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ رونما ہوتی رہی ہے! جب اور جہاں اس پر خاک ڈالی گئی ہے، تب اور وہیں شدید قوت و تجلی کے ساتھ جلوہ فگن ہوئی ہے! وہ مٹتی نہیں ایک قلیل وقفے کے لئے دھندلی کر دی جائے۔ سلا دی جائے، مگر وہ پھر تابندہ و بیدار ہو جاتی ہے!"

"میرے صاحب! میں اس روشنی کے لئے بہت ممنون ہوں! مگر میرا دماغ اب بالکل تھک گیا ہے!" یہ کہہ کر دردانہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ اس کے دل کی تڑپ کو میں نے اپنے دل کے اندر محسوس کیا اور اس کی تابش میرے اندر سرایت کر گئی!

میں نہیں سویا: میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ اس صداقت کے خیالات کا جو اتنی بین اور اتنی سادہ ہے! انسان کی حماقت آمیوں کے خیالات کا! مذہبی پیشوا اس کو مستور و مدفون کرتے ہیں کہ فی المعنی خدا کی کرسی ان کو مل جائے! اس بے ایمانی کے خیالات سب مجھے حیرت میں ڈال رہے تھے!

میں سوچ رہا تھا کہ سائنس داں بھی اسی کوشش میں رہے ہیں۔ اس کا سبب میں نہیں جانتا۔ شاید بے بصیرت ہونے کے باعث! لیکن وہ اگر اپنے علم کی واقعیت کا احساس کر سکتے ہیں تو ان پر اس حقیقت کو بھی ضرور منکشف ہونا چاہیئے۔ ورنہ ان کے نظریے غور و فکر کا نتیجہ نہیں محض اتفاقی امور ہیں؛ عالم کے ارتقاء کا ایک نظام مرتب کیا جاتا ہے جو اپنی تفصیلات میں کم و بیش درست ہے۔ لیکن اس کے ماننے اور منوانے والے نہیں دیکھتے کہ اثبات

ارتقائے عالم کے لئے جو استدلال وہ پیش کرتے ہیں وہی دلائل و براہین اس بات کو بھی ثابت کر رہے ہیں کہ اشیائے عالم کے اندر ایک اور تنہا روح جاری و ساری ہے"! ایک مقصد کی تکمیل کی طرف حرکت پیہم" اس کا نام ارتقا ہے! کیا یہ کام محض توانائی کا انجام دے سکتی ہے؟ توانائی کا عمل اور ردعمل تو مساوی و یکساں ہے: توانائی کا قانون بس یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پھیلائے اور منتشر کرے، تاکہ جہاں نہ حرارت ہے نہ برودت نہ نور ہے نہ ظلمت، جہاں کچھ بھی نہیں، وہاں اعتدال پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ قوت جو اس بات کی جانچ پڑتال کرتی ہے جو ترازو کا پاسنگ دیکھتی ہے، اور توانائی کی مکرر ترکیز کرتی ہے، وہ حیات ہے: یہ کام حیات کے سوا کوئی دوسری قوت انجام نہیں دے سکتی۔ پھر اگر ناقابل شمار قرنوں کے بعد بھی آفتاب روشن ہے، پانی بہ رہا ہے، ہوائیں چل رہی ہیں، تو اس کی علت غائی کیا ہے؟ وہ حیات ہے! چنانچہ اس سے بڑی صداقت کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی نامعلوم طریق پر حیات اشیائے عالم میں جاری و ساری ہے، ان کے اندر مکین ہے: اسی سے کائنات کی تخلیق ہوئی اور وہی ان کو قائم رکھتی ہے۔

یہ علمائے سائنس اتنے خفاش چشم کیوں ہیں کہ وہ خود اپنے نظریوں کے ناقابل ابطال نتائج کو نہیں دیکھ سکتے؛ وہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ پرانے قصے، پریوں کی کہانیاں ہفوات نہیں بلکہ صداقتوں کی صداقت ہیں؟

پیشوایان مذہب اور سائنسداں اس بارے میں دونوں برابر ہیں۔ وہ سامنے کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے؛ اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی جرأت اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ چوندھیا جائے گی! مذہبی پیشوا تو خدا کو غائب کر دیتے ہیں، اور علمائے سائنس اس کا انکار کر دیتے ہیں! لیکن خدا اسی عالم میں ہے، وہ کائنات کی روح ہے اور اشیا اس کا جسم ہیں جو موت کے عمل سے ہمیشہ درست یا جوان رہتا ہے ـــــ یہاں تک کہ تکمیل بعید کا خواب پورا ہو! یعنی اس دنیا میں زندگی خدا ہے اور خدا غیر متغیر محبت!

دوسری قوموں کی طرح قدیم یونانیوں نے بھی، اس سے قبل کہ وہ بصیرت سے محروم ہوں، اس حقیقت کی جھلک دیکھی تھی اور اسے بڑی خوبی سے بیان بھی کر گئے ہیں۔ مگر آج ان کے اساطیر کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ خود ہم میں سے وہ صداقت مفقود ہے جو ان اساطیر کے اندر چھپی ہوئی صداقت کی گونج ہو سکے! بایں ہمہ یہ تمثیل غور طلب ہے:۔

ٹیٹنس (Titans) اوشینس (Oceanus) اور ٹی تھیز (Tithys) یعنی خالص عنصری قوتیں سمندر پر حکمراں تھیں مگر الہ البحر نیپچون (Naptune) اور الہتہ البحر ایمفی ٹرائٹ (Amphitrite) نے ان کو فتح کیا تو سمندر میں ایک روح دوڑ گئی! تحت بحر میں دیکھنے والا آج بھی دیکھ سکتا ہے، جس کی آنکھوں میں نور ہے اور کان گنگ نہیں، اب بھی دیکھ اور سن سکتا ہے کہ :۔

"اے خدائے بزرگ و برتر! میں کسی فرسودہ مذہب کی پیروی میں ریاکارانہ و بے خلوص نماز یا پوجا نہ کروں گا! میں منکر کہلایا جا کر بالائے کوہ اور سر ساحل تیرے وہ جلوے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں جو مجھے اس وسیع کائنات میں اپنی بے بسی بھلا دیتے ہیں!"

من خدا را دیدم آنجا بے حجاب! کوہ و دریا و غروب آفتاب

(۲)

"موت فی الواقع ہولناک ہے!" میں نے تائیداً کہا: "یہ خیال کہ آگے پیچھے یہ سب خوبصورت پرند کسی نہ کسی طریق پر فنا ہو جائیں گے، سخت دلدوز خیال ہے! اور ہر چیز ہم سب بھی باقی نہ رہیں گے!"

"ہاں، ہم ——— ہم سب بھی!" وردانہ نے دوہرایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے: "ہر چیز فنا ہو جاتی ہے؟ موت کا وجود کیوں ہے؟ ہم سب کیوں نہیں جیتے؟"

ایسا معلوم ہوا کہ آفتاب کی پر مسرت تجلیوں میں یک بیک تاریکی داخل ہو گئی ہے،

اس کی زندگی کی آب حرارت میں دفعتاً ٹھہر شامل ہوگئی ہے۔ ایک خوف سے دن کی شان تجلی کو ناقص کر دیا ہے۔

"تم اس کی کیا توجیہ کرتے ہو؟" اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "اس کی تفریح میں کوئی پریوں کی کہانی نہیں!"

"پریوں کی کہانی!" میں نے متحیرانہ دہرایا۔

"جی ہاں، یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی تمام گتھیاں اب سے مدتوں پہلے پریوں کی کہانیوں میں سلجھا دی گئی ہیں۔" دردانہ نے بتایا۔ "اور دنیا اب اگر پھر ان معموں میں الجھی ہوئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس لئے نہ تو وہ ان کہانیوں کی تاویلوں کو سمجھ سکتی ہے اور نہ ان کے حل کو نئی تمثیلات کے اندر بیان کر سکتی ہے۔"

میں نے جمالی کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن کے اشارے سے اعتراف کیا۔

"اس راز کی بھی کہ موت کیا ہے اور کیوں ہے توجیہہ کی جا چکی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" جمالی نے جواب دیا۔

"تو وہ کہانی ضرور سناؤ!" میں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جمالی کچھ پس و پیش کرتا نظر آیا۔

"اپنے شوہر سے کہو کہ وہ کہانی ضرور سنائیں۔" میں نے دردانہ سے ہنس کر کہا۔

اس نے جمالی کی طرف دیکھا اور مسکرائی، وہ بھی جواب میں ہنسا۔

"بہت اچھا۔ مگر شرط یہ ہے کہ دخل نہ دینا!" جمالی نے کہا۔

جمالی کے حکم کی تعمیل میں ملاح نے شکاری کو سایہ دار کنارے پر کھڑا کر دیا جہاں شاخیں ہمارا منہ چوم رہی تھیں اور ہوا خاموش تھی۔

"مجھے امید ہے کہ کہانی غم انجام نہ ہوگی۔" میں نے اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

"پریوں کی کہانیاں کبھی المناک نہیں ہوتیں، کیونکہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں؛" جمالی نے جواب میں کہا۔ "وہ حقیقت جو غیر مبتدل ہے۔ گر متغیر شکلوں کے اندر مستور رہتی ہے ہمیشہ حسین و پرمسرت ہے!"

"موت کی حقیقت بھی!" میں نے سوال کیا۔

"جی، موت کی حقیقت خاص طور پر ہے!" جمالی نے جواب دیا۔

"ٹھتونس (Tithonus) کو معبودۂ سحر (Dawn) کے ساتھ محبت تھی" جمالی نے کہنا شروع کیا۔ اس کے چہرے سے کمال مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ٹھتونس کون تھا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"ہر انسان ٹھتونس تھا، ہے، اور ہوگا ــــــ سب مرد عورت اور عورتیں، تم اور میں ٹھتونس ہیں!"

"اسے نمودِ سحر (Dawn) سے محبت کیوں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں نمودِ سحر سے عشق نہیں؟ صبح استعارہ ہے اشیاء کے اٹھان سے، اس کے درمیان سے سبب ہر چیز کمال دلکش ہوتی ہے۔ ہمارا عنفوان بھی نمودِ سحر ہے کہ اس وقت کائنات زیادہ حیرت ناک اور امید و آرزو کی ترقی پذیر روشنی سے منور ہوتی ہے؛ صبح کی روشنی میں ہم ہر چیز کو دیکھ لیتے ہیں، وہ صبح حیات ہے، گلزار بہاراں ہے، کلیوں کی اب کشائی ہے۔ بیدار محبت طائروں کی پہلی الاپ ہے! نمودِ سحر کی انگلیاں گلاب رنگ ہیں، وہ جس کو چھو لیتی ہیں جوانی کے رنگ سے رنگ جاتا ہے!" وہ چپ ہو گیا اس کے الفاظ سے پیدا شدہ خیالات نے میرے دل اور روح کو چھپا لیا۔ "ٹھتونس موت سے ڈرتا تھا ــــ تم اور میں ٹھتونس ہیں!" وہ پھر خموش ہو گیا اور سکوت و خوف کو جو اس کے الفاظ سے پیدا ہوئے تھے اپنی کہانی کہنے کے لئے چھوڑ دیا۔

پانی کی ہلکی لہریں جو کشتی پر آجانا چاہتی تھیں خموش ہو گئیں۔ گہرے اور سنہرے سکوت میں

کوئی آواز مخل نہ تھی جماکی کے الفاظ یا ان کا اثر اس سکوت پر چھا گیا۔

"ٹِتھونس نے نمودِ سحر سے آرزو کی کہ اس کو غیر فانی بنا دے ٹِتھونس تم ہو' میں ہوں اس نے جو مانگا وہ مل گیا؛ اب وہ مر نہ سکتا تھا۔ مگر بوڑھا ہوتا جا رہا تھا ـــــ اسی طرح ہم سب بوڑھے ہو جائیں گے۔ مگر نمودِ سحر ہمیشہ نوجوان ہے؛ ظلمات موت کے غسل سے ہر صبح تازہ وشاداب' جلوہ گر ہوتی تھی: نمودِ سحر کو موت کا خطرہ نہیں؛ موت کو علم ہے کہ سحر غروب آفتاب اور رات کی تاریکی کے اندر سے ہر روز نیا ریعان لے کر نمودار ہوتی ہے ـــــ کہ اصل میں موت وحیات ایک ہی ہیں!"

ٹِتھونس کا کیا حشر ہوا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"وہ اتنا ضعیف ہو گیا کہ موت کی آرزو کرنے لگا۔ اگرچہ وہ امر ہو چکا تھا مگر اب زندگی سے عاجز تھا اس نے سحر سے پھر التجا کی کہ اسے موت یعنی دائمی شباب مل جائے' کیونکہ اس کا غیر فانی ہونا اب اجیرن ہو رہا تھا؛ اگر ہم تم غیر فانی بنا دیئے جائیں تو یہی حالت ہو گی ـــ نمودِ سحر ایک غیر فانی مخلوق کو موت نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس نے ٹِتھونس کو ٹڈے کا چولا دے دیا۔ اب وہ صبح کے وقت سحر کے گیت" گاتا رہتا ہے؛ وہ اب بقائے دوام کی آواز ہے جو سحر کے حضور مناجات گاتی رہتی ہے موت باب الحیات ہے تنہا دروازہ ہے! اور یہی مناجاتِ سحر ہے!"

"اور موت کی مناجات کیا ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"موت کی مناجات بھی وہی ہے ـــــ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں!" اس نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی تھی سو ہو چکی! اب آپ اور کیا سننا چاہتی ہیں؟" وہ کہنے لگا۔

"کچھ نہیں!" میں نے جواب دیا۔

شام ہوتے ہم لوگ واپس ہوئے سورج اپنی شانوں کے ساتھ غروب ہو چکا اور دن کا بادشاہی دربار ختم تھا۔

جمالی اور دردانہ صبح ہوتے رخصت ہوئے اور اپنی ناؤ پہ چلے گئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ ہمارے مہمان ہوئے اور ان سے مکرر ملنے کا اشتیاق ہے۔ تاکہ ان کی شادی کا انجام معلوم کرسکوں میرا خیال ہے کہ نتیجہ اگر اچھا ہوا تو بہت اچھا ہوگا اور برا ہوا تو نہایت برا؛ یہ دونوں اتنے توانا اتنے جذباتی اور اتنے فطری ہیں کہ دونوں میں ایک بھی ادھوری شادی کو منظور نہ کرے گا — اور نیم شادی منجملہ اور رواجوں کے ایک عام رواج ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود کل کا طالب ہوگا یا پھر بالکل کچھ نہ لے گا؛ یا تو دونوں کو ایک روحی وحدت ہونا چاہیئے یا پھر وہ جدا ہو جائیں گے؛ یہ مجھ پہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہے؛ مگر دونوں میں کون سی صورت وقوع پذیر ہوتی ہے، مجھے اس کی تلاش ہے؛

صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار

(اقبال)

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آدمی پر طاقت اور جثے کا خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے چونکہ پہلوان سمجھے جانے کا اتنے ہی فائدے ہیں جتنے پہلوان ہونے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کشتی لڑنے والے پہلوان ہوتے ہیں وہاں ایک قسم ایسے پہلوانوں کی بھی ہوتی ہے جو دنگل سے بچنے میں گھر گھی شکر دودھ میدہ کھا کھا کر ایسی صورت شکل بنا لیتے ہیں کہ انھیں چیلنج دینے کی کسی کو ہمت ہی نہیں ہوتی اور مصلحت انھیں ایسے گر سکھا دیتی ہے کہ وہ داؤں پیچ کریں یا نہ کریں جیت انھیں کی رہتی ہے۔

یورپ والوں کی نظر میں امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ اسی قسم کے پہلوانوں کی حیثیت رکھتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ یورپ کی جمہوری ریاستیں امریکہ کی ہمدردی اور مدد کو اپنا خاص حق سمجھتے ہیں اور یورپی سیاست میں جو فرقہ بندیاں ہوتی ہیں ان میں یہ چاہتی ہیں کہ امریکہ والے ان کے ساتھ مل کر اس کا پلہ بھاری کر دیں امریکہ والے یہ نہیں مانتے کہ وہ دنیا میں اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ یورپی سیاست کی ترازو میں وزن بڑھانے کی ضرورت پیدا کر دیں اور جب یورپ کی جمہوری ریاستیں ان سے ملاقات بڑھانے کی کوشش کریں تو انھیں فوراً شبہ ہوتا ہے کہ انھیں دھوکا دے کر ان سے کوئی کام نکالا جائے گا یہ شبہ سچا نہیں ہے اسی وجہ سے اسے دور کرنا بہت مشکل ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ کی سیاست امریکہ میں نصب کرنے کا شوق اور امریکی سیاست یورپ میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دیتی ہے لیکن سیاست میں مزاج کو غرض کا غلام بن کر رہنا پڑتا ہے اس لیے جب کبھی امریکہ والے اپنی کسی غرض سے یا خالی اخلاقی جوش میں یورپ اور ایشیا کے جھگڑوں میں حصہ لینے پر آمادہ نظر آتے ہیں تو یورپ کی جمہوری ریاستوں میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور مشورے کی ہر مجلس میں امریکہ کے نمائندے کے لیے صدارت کی کرسی خالی کر دی جاتی ہے پچھلی جنگ عظیم میں پریذیڈنٹ ولسن کی جو عزت برطانیہ اور

فرانس میں کی گئی اس کا حال آپ جانتے ہونگے مگر اس عزت افزائی کا نتیجہ جو نکلا وہ شاید آپ بھول گئے ہوں
مگر امریکہ والوں کو وہ اچھی طرح یاد ہے اور اسی سبب سے وہ اب یورپی سیاست کی چھاچھ کو بھی پھونک پھونک
کر پیتے ہیں۔

پچھلے چار پانچ برس کے واقعات کچھ ایسے تھے کہ امریکہ والے چپ نہ رہ سکے تھے نیویارک کے
Moyar اور مار دیا نے کبھی مسٹر کورڈل ہل اور کبھی خود پریذیڈنٹ روزولٹ نے کوئی ایسی بات
کہہ دی کہ جس سے یورپ میں کوئی خفا ہوا کسی کو امید ہوئی کہ امریکہ میں عام رائے یا حکومت کرنے والوں کو
اپنی مصلحت امریکہ کو یورپ کے قریب لے آئے گی اور جمہوری حکومتوں کو ایک بڑا سہارا ملے گا لیکن سچ
پوچھئے تو امریکہ کے لیڈروں نے پچھلے چار پانچ سال میں جو کچھ کہا اس کا تعلق یورپ کی سیاست سے نہیں
تھا۔ بلکہ امریکہ کے اندرونی معاملات سے تھا اور یورپ کی سیاست میں تو امریکہ والوں نے قسم کھائی ہے کہ کبھی
نہ لڑیں گے ان کے لئے مناسب بھی یہی ہے جرمنی ترقی کرلے اور آدھے یورپ پر قبضہ کر بھی لے تو اس میں
ان کا کوئی نقصان نہیں وہ اپنے الگ اور محفوظ بیٹھے رہیں گے تجارت کو دیکھئے کہ اس میں اب تک اس کا
اصل مقابلہ جرمنی سے نہیں بلکہ انگلستان سے ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک طرف برطانیہ یورپی سیاست میں اس کا
سہارا چاہتا ہے اس بنا پر کہ وہ آزاد اور جمہوری حکومت کا علمبردار ہے تو دوسری طرف جنوبی امریکہ کی تجارت
میں وہ ان کی جڑ کاٹتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار ملک وہی ہے سیاست
اور تجارت پر اخلاق اور مذہب کا رنگ چڑھانے میں خود امریکہ اتنا ہوشیار نہیں ہے جتنا کہ انگلستان والے ہیں
اور اب جو وہ ایک بار بڑی دھوم دھام سے بے وقوف بنائے جا چکے ہیں تو وہ اور بھی چوکنا ہو گئے ہیں انہیں
اپنی آزادی بہت عزیز ہے لیکن وہ دوسروں کو اپنی طرح آزاد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے وہ جمہوریت کو حکومت کا سب
سے اچھا طریقہ مانتے ہیں لیکن کبھی اگر یہ طریقہ چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے تو انہیں دکھ بھی نہیں ہوتا وہ
اطمینان سے رہنا اور اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہیں ہیں کہ فسطائی حکومتوں کے تیور دیکھ کر ڈر جائیں
اس لئے کہ ان کے اپنے ہاں ان حرکتوں کا خاصا رواج ہے جس کا الزام فسطائی حکومتوں پر لگایا جاتا ہے یعنی یورپ
کی حالت خراب تو امریکہ والے افسوس کریں گے، وعظ کہیں گے، مگر سدھار کی تدبیریں سوچنا یورپ والوں ہی

پر چھوڑ دیں گے اور اگر خدانخواستہ لڑائی چھڑ گئی تو وہ یورپ والوں کو خود لڑ کر فیصلہ کر لینے دیں گے!

۱۶ر اپریل کو پریذیڈنٹ روزولٹ کا ڈکٹیٹروں کے نام جو پیغام پہنچا اور ۲۸ر کو ہر ہٹلر نے اس کا جواب دیا۔ اسے سمجھنے کے لئے ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے آپ کو پریذیڈنٹ روزولٹ کا پیغام پڑھتے ہی خیال ہوا ہوگا کہ انھوں نے ایک ایسے بزرگ کی زبان اور انداز میں گفتگو کی ہے جنھیں نصیحت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، جو تفصیلی معاملات میں الجھنا نہیں چاہتے بس اخلاق اور تہذیب کا نام روشن رکھنا چاہتے ہیں یہ انداز پریذیڈنٹ روزولٹ اس لئے اختیار کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی قوم کا انداز ہے۔ لیکن ہر ہٹلر کی طرف سے نہیں بلکہ ایک غیر جانب دار کی طرف سے اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی، اٹلی نے تہذیب کی جو خدمت کی ہے اس کا امریکہ والے بھی مدتوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے اور اگر آپ خوبیوں کے گننے کی جگہ عیبوں پر نظر کرکے انصاف کرنا مناسب سمجھتے ہوں تو اس لحاظ سے بھی آپ امریکہ والوں کو دوسروں سے بہتر نہ پائیں گے پریذیڈنٹ روزولٹ نصیحت صرف اس لئے کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں کہ ان کے ملک میں سرمایہ افراط سے ہے اور اسے کسی دشمن کا خوف نہیں۔ لیکن دنیا کی حالت ایسی ہے کہ خطرہ اچانک پیدا ہو جائے تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ اس لئے امریکہ کے رہبر چاہتے ہیں کہ قوم کو بیدار رکھیں اور سامان جنگ میں روپیہ لگانے پر تیار کریں۔ یورپ میں اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ کہنا پڑتا ہے امریکہ میں پریذیڈنٹ یا اس کے کسی سکریٹری کی تقریر ہو جاتی ہے۔

پریذیڈنٹ روزولٹ نے ڈکٹیٹروں کو کہا ہے کہ آپ حضرات تین چار آزاد قوموں کا خون کر چکے ہیں اور پندرہ بیس کو اسی طرح ڈرا رہے ہیں کہ ان کی جان نکلی جا رہی ہے، یورپ کی جمہوری ریاستوں میں یہی بات طرح طرح سے کہی جا رہی ہے، مسٹر روزولٹ بہت پہلے ڈکٹیٹروں کو اس کی دعوت دے چکے ہیں کہ گفتگو اور سمجھوتے کے ذریعے کام کو آسان بنائیں اور جنگ جیسی وحشیانہ چیز کا استعمال قطعاً نہ کریں۔ اسی وجہ سے ہر ہٹلر نے ۲۸ر اپریل کو پریذیڈنٹ روزولٹ کے جواب میں کہا کہ انھیں پریذیڈنٹ روزولٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ ہر جنگ دنیا کی تباہی کا سبب ہوگی۔ ہر لڑائی کا عالمگیر ہو جانا نہیں ہے لیکن ہر لڑائی بے شک دنیا کو مبتلا کر دے گی اگر قومیں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے معاہدہ کرتی رہیں اور اپنے

برائے سب کی سلامتی کا ذمہ اپنے اوپر لے لیں۔ یہاں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر ہٹلر برطانیہ سے باتیں کر رہے ہیں اگرچہ منھ اس کا امریکہ کی طرف ہے اور یہ بھی آپ سمجھ جائیں گے کہ برطانیہ سے یہ باتیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ ہر ہٹلر جواب دینے میں بڑے تیز ہیں اور اگر آپ جمہوری اخباروں سے اثر لے کر پہلے ہی سے ان کی ہر بات کو غلط اور برا نہ سمجھ لیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے ہر معاملہ میں اگر اپنی صفائی نہیں کی ہے تو دوسروں پر اتنے الزام لگا دئے ہیں کہ کوئی برا کہنے یا برا بن کر نصیحت کرنے کا حقدار نہیں رہتا۔ لیکن ان کی تقریر کا یہ حصہ اگرچہ بحث کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ نئی بات انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانیہ کا سامراج پھیلا ہوا ہے ویسے ہی جرمنی کو سامراج پھیلانے کا موقع دینا چاہئے۔ انگریزوں کا سامراج ایک کارنامہ ہے اور ہر ہٹلر نے صاف کہا ہے کہ یہ سامراج اس بات کا ثبوت ہے کہ اینگلو سیکس قوم میں دنیا کو آباد کرنے اور تہذیب کی روشنی کو پھیلانے کی بڑی صلاحیت ہے جس کی وہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ جرمن سامراج دریائے رہائن سے بحر اسود Black Sea تک اور بحر شمالی سے بحر روم تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ سامراج اپنی کمزوری کے سبب سے قائم نہ رہ سکا۔ اسی دوران میں جبکہ جرمنی اندرونی فساد میں مبتلا تھا انگریز دنیا بھر میں پھیل گئے مگر اب جو جرمنی متحد اور طاقت ور ہو گیا ہے تو اسے اپنے پرانے سامراج کو اسی شان کے ساتھ قائم کرنے کا حق پھر سے ہو گیا ہے اور ہر ہٹلر کے نزدیک یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ اسے اپنا حوصلہ پورا کرنے سے روکا جائے۔ یعنی جب ہر ہٹلر دل پر ہاتھ مار کر بطنز سے کہتے ہیں کہ آپ کو دولت عزت اور سامراج مبارک ہو تو برطانیہ کو بھی ان سے کہنا چاہئے کہ آپ کو بھی آپ کی حکومت استبداد اور طاقت مبارک ہو اور خدا کرے اب ہمارا جیسا سامراج قائم کر کے ہماری طرح نام پیدا کریں اور دنیا میں تہذیب کی رونق پھیلائیں۔ ہر ہٹلر کو بڑا دکھ ہے کہ برطانیہ جتنی خوشی سے مبارک باد دینے کی جگہ پولینڈ رومانیہ اور روس سے معاہدہ کر رہا ہے اور اسی فکر میں ہے کہ جرمنی کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کے پڑوسیوں کے حوالے کر دے اسی دکھ میں انھوں نے اس معاہدہ کو جو ۳۵ء میں برطانیہ سے کیا تھا چاک کر ڈالا ہے۔ مگر وہ اب بھی برطانیہ سے دوستی اور اتحاد عمل کرنے پر تیار ہیں اور برطانیہ کو انھوں نے

یقین دلا دیا ہے کہ وہ اس سے لڑنا نہیں چاہتے برطانیہ سے ان کا کوئی جھگڑا ابھی نہیں ہے سوائے ذرا سے معاملے کے لیکن وہ بھی ایسا نہیں ہے کہ لڑ کر طے کیا جائے تو سمجھئے ہر ہٹلر نے برطانیہ سے کہا ہے کہ ہم آپ سے کسی حالت میں لڑنا نہیں چاہتے اور اگر آپ رشک یا حسد یا ضد سے کام نہ لیں اور اپنے اخباروں کو تاکید کر دیں کہ وہ بدتمیزی نہ کریں تو انشاءاللہ کبھی بھی لڑائی کی نوبت نہ آئے گی ہمارا میدان عمل مشرقی یورپ ہے جس سے ان کی تجارت اور سیاست کو بھی ذرا واسطہ نہیں اور ادھر کی جو حکومتیں ہیں اگر آپ نے ان سے معاہدہ کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہمارا مقابلہ کریں تو پھر جو فساد ہو گا اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی آپ یہ ذمہ داری خواہ مخواہ اپنے سر لے رہے ہیں ہم نے جیسے آسٹریا اور چکوسلواکیا پر بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے قبضہ کر لیا ویسے ہی ہم پولینڈ اور رومانیہ پر بھی قبضہ کریں گے ہمارے حوصلے پورے ہو جائیں اور پھر آپ دیکھئے گا کہ ہم دنیا بھر کے ساتھ کس نرمی سے پیش آتے ہیں اور خاص طور سے آپ کے ساتھ کیسا محبت کا برتاؤ کریں گے۔

معلوم نہیں گفتگو کے اس انداز کا برطانیہ کی سیاست پر کیا اثر پڑا، بہرحال ہر ہٹلر نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے کہ اس کا کام رکنے نہ پائے اپنی تقریر میں پولینڈ سے انھوں نے جو معاہدہ کیا تھا وہ توڑ ڈالا ہے، پولینڈ کی سرحد کے پاس جرمن فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور خیال یہ ہے کہ جون تک اتنی جمع ہو جائیں گی، کہ سیاست کے مہروں کو آگے بڑھانے میں وہ بے زور نہ ہوں، ادھر برطانیہ اور فرانس معاہدوں کا جو مورچہ بنا رہے ہیں وہ جرمن گرد ایک طرف سے دوسری طرف گراتے جاتے ہیں اور اس کا جو حصہ قائم اور مضبوط ہے وہ شاید زمین کی سطح کے نیچے ہے، اس لئے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا، اس سلسلے میں جو آخری حادثہ ہوا ہے، وہ روسی سفیر کا استعفیٰ ہے، اگر اس کا سبب یہ ہے کہ اسٹالین کو برطانیہ سے اور فرانس سے معاہدہ کرنا منظور نہیں، تو پھر پولینڈ کا خدا ہی حافظ ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۷۷ء جو زائرین بیت اللہ کو فریضہ حج ادا کرانے کے لئے اولیں اور معتمد ترین لائن ہے

مغل لائن سے حج کیجئے!

کمپنی کی ایک خاص حج سروس ہے جس کے جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ جہاز عازمانِ حج کو بمبئی، کراچی اور کلکتہ سے عدن پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں۔

جہازوں کے نام

ایس۔ایس" اکبر" ...... ۴۰۴۳ ٹن — ایس ایس" جہانگیر" ..... ۳۵۶۶ ٹن ۔ ایس ایس
ایس۔ایس "علوی" ...... ۲۵۶۶ ٹن — ایس ایس "خسرو" ..... ۴۰۴۳ ٹن "رضوانی"
ایس۔ایس "اسلامی" ..... ۵۸۰۹ ٹن — ایس ایس "رحمانی" ..... ۵۲۹۱ ٹن ۔۔ ۵۲۷۰ ٹن

مال اور مسافروں کو لیجانے کے لئے دوسری سروسیں حسب ذیل ہیں

بمبئی اور کراچی سے شہر مکلہ، عدن، بربرہ، جبوتی، مسووا۔ بندر سوڈان۔ اور جدہ کو ہر پندرھویں دن۔

بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی ماریشس کو ہر دوسرے مہینے۔

جگہ تمام جہازوں سے کیبن اور ڈک درجہ کے مسافروں کے لئے جگہ کا انتظام۔

تمام جہاز میں ہر مذہب و ملت کے لئے بہترین اقسام کے کھانوں کا لاجواب انتظام ہے۔

تفصیلات حسب ذیل پتہ سے معلوم کیجئے

ٹرنر مارسین اینڈ کو لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس:۔ ۱۶۔ بینک اسٹریٹ بمبئی"، تار کا پتہ "مغل" بمبئی

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں نئے طلبا کا داخلہ ۱۵ جولائی ۱۹۳۹ئ سے ۲۵ جولائی ۱۹۳۹ئ تک ہوگا۔ درخواست داخلہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۹ئ تک پرنسپل صاحب طبیہ کالج کے دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے اور دفتر کی جانب سے مقرر کی ہوئی تاریخ پر امیدوار کو کالج میں حاضر ہونا چاہیئے۔

تعداد مقررہ کے پورا ہونے کے بعد کسی طالب علم کا داخلہ نہ کیا جائے گا۔ قواعد داخلہ مفت طلب کئے جاسکتے ہیں۔

عطاء اللہ بٹ

پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

اعلان

"کلیم" کے دفتر کو چونکہ ملیح آباد تبدیل کر دیا گیا ہے اور ڈکلریشن وغیرہ کے سلسلے میں ابھی کارروائی مکمل نہیں ہوسکی ہے اس لئے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ پرچہ مشترکہ مئی جون ۱۹۳۹ئ کا شائع کیا جائے گا۔

قارئین کرام آئندہ سے مندرجۂ ذیل پتے پر مراسلت فرمائیں۔

مدیر کلیم۔ دفتر کلیم۔ ملیح آباد۔ لکھنؤ

سہ روزہ اخبار صرف (۳؍۸) سالانہ میں

"انصاری" کا عظیم الشان رعایتی اعلان

دارالحکومت دہلی کا مشہور و معروف قدیم اخبار سہ روزہ "انصاری" جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی خدمت انجام دے رہا ہے اور فخر قوم زعیم ملت ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم و مغفور کی زندہ یادگار ہے بڑے سائز کے دس صفحات پر زیر ادارت جناب ہلال احمد صاحب زبیری (ایم اے) میونسپل کمشنر دہلی ہفتہ میں دوبارہ پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے،

"انصاری" کا عملہ ادارت لائق و فاضل اصحاب پر مشتمل ہے اس کے انتظامات نہایت باقاعدہ اور قابل اعتماد ہیں، ممالک اسلامیہ کی خبریں، ایڈیٹوریل مقالات، نکات و لطائف، احکام اسلام، سیاسی مضامین اور تین دن کی خبریں اپنے خریداروں کو وقت پر پہنچا دیتا ہے۔ مہینہ میں آٹھ اشاعتیں ہوتی ہیں۔

"انصاری" کے عملہ ادارت نے ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا چندہ سالانہ کچھ عرصہ کے لئے صرف تین روپے آٹھ آنہ کر دیا ہے، جو دوسرے سہ روزہ اخبارات کے سالانہ چندوں سے تقریباً نصف ہے آپ اس رعایت سے آج ہی فائدہ اٹھایئے اور ۳؍۸ کا منی آرڈر بھیج کر سہ روزہ انصاری سال بھر کے لئے اپنے نام جاری کرا لیجئے۔

سالہائے ماسبق میں بھی "انصاری" نے رعایتی اعلانات کئے تھے اور جن لوگوں نے ان اعلانات سے فائدہ اٹھایا وہ پورے سال تک "انصاری" کی خوبیوں کا اندازہ لگا کر اب انصاری کے مستقل اور قدیم خریدار ہو گئے ہیں اور انہیں ہمیشہ کے لئے بجائے چھ روپے اور پانچ روپے کے صرف ۳؍۸ سالانہ میں اخبار کا خریدار بنا لیا ہے اسی طرح اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے بھی ہمیشہ تین روپے آٹھ آنہ میں انصاری خرید سکیں گے۔

خریداری کی درخواستوں میں پتہ صاف ہونا چاہئے اور منی آرڈر کے کوپن پر "رعایتی اعلان" کے الفاظ ضرور لکھدینے چاہئیں

منیجر سہ روزہ "انصاری" بلیماران دہلی

ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں

روح غالب۔ غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمرج) صدر المہام تعلیمات و سینیر امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ صفحات (۲۴۰) مع تصاویر قیمت ۸/ ۱ر

نظام الملک آصف جاہ اول۔ اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھا جائے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر) قیمت صرف ۳/ر

من کی بیتا۔ صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکۃ الآرا مشورے۔ اس دلچسپ ادبی کتاب میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں۔ گھر، سواری اسباب نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں، نذر و نیاز، چندے مختلف رسومات، سینما، فیشن وغیرہ۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ مصنفہ محترمہ نصیف النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے صفحات (۸۰) قیمت صرف ۸/ر

نذر دکن۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں۔ مجلد با تصویر بڑی سائز صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۲/ ۱ر

عاصمہ (ناول) ایک دلچسپ اور مفید معاشرتی ناول جس میں ڈیوڑھی کی ایک کنیز کے واقعات زندگی ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنفہ مولوی موید الدین حسن صاحب ضخامت (۲۰۰) مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۱۲/ ۱ر

من کی دُنیا۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ رعنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت مجلد عہ

مرقع دکن۔ اس میں قدیم عہد سے لے کر موجودہ دور تک کی دکن کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اکثر تصاویر نادر اور نایاب ہیں جو پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہیں۔ مضامین نظم و نثر بلند پایہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اس کی تیاری پر ہزاروں روپیہ کی لاگت آئی ہے اس سے بہتر دکن کی تاریخی معلومات کا ذخیرہ ایک کتاب میں شائع نہیں ہوا۔ صفحات (۱۹۸) تصاویر (۸۰) قیمت صرف دو روپے

مدراس میں اُردو۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

محرم نامہ۔ سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ۔ آج تک ایسا محرم نامہ شائع نہیں ہوا۔ مرثیہ گو شعراء اور مجالس کی نایاب تصویریں شامل ہیں۔ قیمت مجلد عہ

سرگذشت غالب۔ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مکمل سرگذشت جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ غالب کی تصویر بھی شائع کی گئی ہے۔ قیمت عہ

اخبار اتحاد پٹنہ کیلئے زبردست اپیل

انجمن ترقی اردو ہند کی جو مجلس انتظامیہ ۲۸-۲۹ اگست کو پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی، اس نے ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل اپیل شائع کی۔

"اتحاد" صوبہ بہار میں زبان اردو کا پرانا اخبار ہے جو عرصہ سے قومی اور ملی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ وہ اتنی مدت کی مستقل اشاعت کے باوجود اس وقت تک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکا ہے اگرچہ خیالات کے اعتبار سے ممکن ہے وقتاً فوقتاً طبقہ و خیال کی نمائندگی باحسن وجوہ پوری نہ کر سکا ہو لیکن زبان کی خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اردو زبان کا یہ ترجمان قائم و جاری رہے اس لئے ہماری خواہش ہے کہ بہار کے تمام اردو خواں بلا کسی لحاظ و خیال کے محض زبان اردو کی بقا و ترقی کیلئے اخبار اتحاد کے قائم و جاری رکھنے میں کوشاں ہوں جسکی سب سے آسان صورت یہی ہے کہ اسکی توسیع اشاعت میں جہانتک ممکن ہو ہاتھ بٹایا جائے۔

مرثیۂ اقبالؒ

از

جناب اسد ملتانی

حضرت علامہ اقبالؒ کی وفات پر جس قدر نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں اس مرثیہ کو اہل نظر نے بہترین قرار دیا ہے یہ درد انگیز نظم محض مرثیہ نہیں بلکہ اس میں حضرت علامہ کی شخصیت اور تعلیم کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے خاص پیغام کی طرف بہت موثر طریقے سے توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کا مطالعہ علامہ اقبال مرحوم کی یاد تازہ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہوگا۔

عمدہ کاغذ۔ اعلیٰ لکھائی چھپائی۔ قیمت ۳؍ تین آنے مع محصول ڈاک

ملنے کا پتہ :- **دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر**

قیمتوں میں انتہائی تخفیف

رباعیات حکیم عمر خیام مطبوعہ شرکت کاویانی برلن یہ مجموعہ رباعیات جرمنی کے مشہور ڈاکٹر فریڈرک روزن نے قدیم نسخوں کی مدد سے تحقیق کرکے مرتب کیا ہے۔ طباعت نہایت صاف اور روشن ٹائپ۔ قیمت پہلے دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ؍) تھی اب ۱۲؍ ہے

گلستان سعدی شیراز یہ نسخہ بھی شرکت محدودہ آفتاب برلن نے شائع کیا ہے جسے مستند اور صحیح ترین نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ طباعت نہایت صاف اور روشن ٹائپ قیمت پہلے عہ اب عہ ہے۔

فردوس الحکمت یہ کتاب فن طب پر عربی زبان میں ابن الحسن علی بن ابن الطبری نے متوکل علی اللہ کے زمانہ میں تصنیف کی پوری کتاب سات حصوں میں تقسیم ہے جس میں تیس مقالے اور تین سو ساٹھ باب ہیں طباعت نہایت روشن اور صاف ٹائپ قیمت پہلے چودہ روپیہ تھی اب آٹھ روپیہ ہے

دستور عشاق فتاحی نیشاپوری ایک ایرانی شاعر کی نیم مجازی اور نیم حقیقی عشقیہ مثنوی ہے جو مطبع آفتاب برلن سے شائع ہوئی مصنف پورا قادر الکلام شاعر ہے جس نے اپنی ادبیت اور شعریت کا ایک قابل داد ہفت خواں کارنامہ دستور عشاق کی شکل میں پیش کیا ہے۔ طباعت نہایت روشن اور صاف ٹائپ۔ پہلی قیمت للعہ ر اب عہ ہے۔

بدائع سعدی یہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی غزلیات کا مجموعہ ہے جسکو کاویانی پریس نے نہایت اہتمام سے نمبروار بحور کے اوزان دیکر شائع کیا ہے۔ کاغذ و طباعت عمدہ ٹائیٹل خوبصورت رنگین، قیمت پہلے چار روپیہ اب عہ ہے بدائع سعدی کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جس کی قیمت پہلے ﷲ روپیہ تھی اب عہ ہے۔

وجہ دین عقائد فرقہ اسماعیلیہ پر حکیم ناصر خسرو کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں اس فرقہ کے عقائد پر نہایت شرح و بسیط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے قیمت پہلے للعہ تھی اب عہ ہے

منتخب لطائف یہ آٹھویں صدی کے مشہور ہجو گو اور ظریف شاعر خواجہ عبید زاکانی کے لطیفوں اور چٹکلوں کا مختصر مجموعہ ہے جسکا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ قیمت پہلے عہ تھی ۸؍ ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

مطبوعاتِ امیریہ دار التصنیف و التالیف لکھنؤ

دیوانِ ثاقب یہ دیوان میرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے. ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے. کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے. طباعت نفیس ہے. تصاویر بھی ہیں حجم پانچسو پچاس صفحات قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ (علاوہ محصولڈاک)

انیس الاخلاق میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس صاحب رضوی ایم۔ اے رکن امیریہ دار التصنیف والتالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت ۵ علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہوجانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی رعایا کو گیس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا. یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت پر نظر کر کے یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۸ (علاوہ محصولڈاک)

مفتاح البیان حصہ اول و دوم۔ مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین، ابو البیان، مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروِلی مولف جواہر البیان وغیرہ

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید کتاب ہے۔

قیمت:۔ ہر حصہ عہ (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امیریہ دار التصنیف والتالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں اُن میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور اُن کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔ اُن کی قیمتیں ۵۰ فی صدی سے ۷۰ فی صدی تک کم کر دی گئی ہیں۔

اُمید ہے کہ اربابِ ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ لاہور اور لکھنؤ سے مکمل فہرست طلب کرکے ممنون فرمائیں گے

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

نئی کتابیں

گئودان ۔ منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول، اُردو میں پہلی بار منتقل ہوا ہے۔ صفحات ۵۱۰۔ قیمت عـ۲

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب ۔ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ اور وردھا تعلیمی اسکیم کا مکمل نصاب اردو میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت عـہ

ہندستانی ۔ ان چھ لیکچروں کا مجموعہ جو آل انڈیا ریڈیو پر ۲۰ سے ۲۵ فروری ۳۹ء تک براڈکاسٹ ہوئے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں۔ ہر ایک کی قیمت ۱۲

اجتماعی زندگی کی ابتدا ۔ سیاست، معاشرت اور دوسرے علوم اجتماعی کی معلومات کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔

قیمت عہ

محکومیتِ نسواں ۔ مشہور فلسفی مل کی کتاب **THE SUBJECTION OF WOMEN** کا اردو ترجمہ۔ قیمت عـہ

جوہرِ اقبال ۔ علامہ اقبال کی زندۂ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے اہلِ فکر حضرات کے مضامین اور پیغامات کا مجموعہ۔ قیمت مجلد عـہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

نمبر ۵	مئی ۱۹۳۹ء	جلد ۴۱

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر ایڈی اسیر وادم، ہیڈ سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

ہندوستان آج جن مسئلوں سے دوچار ہے ان میں بلاشبہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ مسئلہ آل انڈیا فیڈریشن اور آزادی کامل کے مسئلوں سے بھی جن پر آج کل بہت بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اس کے ماننے میں غالباً کسی کو تامل نہیں ہوگا کہ اگر ملک کے اندر خانہ جنگی اور نااتفاقیاں موجود ہوں تو بہترین سیاسی ادارے بھی کامیاب نہیں ہوسکتے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک قومی اتفاق پیدا نہ ہو جائے ہمیں آزادی کی جدوجہد کو ملتوی کردینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا امکان بہت قوی ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول اور قیام کے لئے جو جدوجہد کی جائے گی وہ بذات خود خوشگوار تعلقات اور باہمی سمجھوتہ کی ان مخفی قوتوں کو پیدا کرنے کا موجب ہوگی جس سے ایک متحد اور مضبوط قوم تعمیر کی جاسکے گی۔

مہاتما گاندھی کو آج ہندوستان کے زندہ لوگوں میں سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ہمارے اندر قومی وقارِ نفس کا ایک زبردست احساس پیدا کرادیا ہے لیکن وہ شخص مہاتما گاندھی سے بھی بڑا ہوگا جو قومی اتحاد کے لئے ایک پائدار حل نکال سکے گا۔ آئندہ نسلیں ایسے شخص کو موجودہ ہندوستان کا سب سے بڑا مصلح سمجھیں گی۔ جب تک قومی اتحاد مفقود ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے ہم غلام بنے رہیں گے اور باہر کی دنیا ہمارا مذاق اڑاتی رہے گی۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کی مذمت کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان اختلافات کو ایک دن کے اندر مٹایا جاسکتا ہے یا یہ کہ ہندوستانی جماعت کے مختلف عناصر کو ہر حیثیت سے ایک ہی نمونہ اور سانچے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہیئے۔ اختلافات تو ایک عرصہ دراز تک جاری رہیں گے اور بذات خود ان کے جاری رہنے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ اختلافات میں

برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال برتری اور کم تری کا پیدا ہونے لگتا ہے اور اس سے شک و شبہ اور بے چینی کی نہایت تلخ فضا پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ایک خاندان کے افراد قدرتی طور پر آپس کے تعلقات میں زیادہ یگانگت محسوس کرتے ہیں اور کچھ باتوں میں دوسرے خاندانوں سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھتے ہیں اسی طرح ان لوگوں میں بھی جو ایک ہی قسم کے خیالات اور نصب العین رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح کے مذہبی اعتقادات رکھتے ہیں ہم جنسی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسری جماعتوں کی طرف سے ان کے دل میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ اختلاف کا یہ خط اتنا نمایاں ہو جائے کہ معاشری، معاشی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جائے فرقہ وارانہ تنظیم کو جہاں تک معاشری میل جول اور تمدنی ترقی کا تعلق ہے وہاں تک تو جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ سے ایک قوم مخالف سیاسی اور معاشی گروہوں میں منقسم ہونے لگے تو اسے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ عہد جدید کی ریاست ایک دنیوی ادارہ ہے اور اس میدان میں وہ اپنے شہریوں سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ معاشی اور سیاسی پروگراموں، پالیسیوں اور طریقوں کے مطابق تو پارٹیاں بنانے کی اجازت دے سکتی ہے اور اسے دینا چاہیئے لیکن اگر ہر مذہبی فرقہ اور جماعت، ہر نسلی گروہ، اور ہر لسانی اقلیت کو ریاست اپنے سے جدا ہونے کی اجازت دیتی رہی تو اس کا نتیجہ اس کے حق میں خودکشی ثابت ہوگا۔ اگر انتشار پسند قوتوں کو حاوی ہونے کا موقع دے دیا جائے تو نہایت زبردست سلطنت بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

یہ دیکھ کر سخت تکلیف اور افسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ تمام نیک نیت ہندوستانی قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس سمت میں ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ اس کا سبب عقل کی کمی نہیں ہے بلکہ اتحاد باہمی کے ارادہ کی کمزوری ہے اور اس کمزوری کا سبب وہ خوف، بدگمانی اور سخت بد اعتمادی ہے جو ہر فرقہ کے دل میں دوسرے کی طرف سے پائی جاتی ہے مسلمانوں میں سے اکثر اور دوسری اقلیتوں میں سے کچھ لوگوں کو خوف ہے کہ سوراج کے معنی ہندو راج ہوں گے۔ اپنے اس خوف کے ثبوت میں وہ شہادت کے طور پر اس بات کو

پیش کرتے ہیں کہ سرکاری دفتروں تعلیم گاہوں وغیرہ میں جو شخص برسر اقتدار ہو جاتا ہے وہ خالی جگہوں پر صرف اپنی ذات اور برادری کے لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس جانب داری کو جایز قرار دینے کے لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دوسرے فرقوں میں ضروری قابلیت رکھنے والے لوگوں کا فقدان ہے۔ یہ بات پہلے تو ممکن ہے صحیح رہی ہو لیکن اب ہر فرقہ میں تعلیم کے ترقی پا جانے کے بعد یہ عذر صحیح نہیں رہا ہے۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ ہندوستان سے اس وقت تک نااتفاقی ختم نہ ہوگی جب تک ہم بڑے پیمانہ پر فیاضی، برادرانہ سلوک، رواداری اور ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سیاسی دستور اور تحفظات اور ضمانتیں ایسی حالت میں جب دل کے اندر دشمنی باقی رہے محض کاغذی کارروائی بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھگڑے ہمیشہ باقی رہیں گے اور اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ اپنے معاشری، معاشی اور سیاسی انتظامات کو فرقہ وارانہ اصول کے ماتحت سلجھانے کی کوشش کی جائے تاریخ کے اسباق سے روگردانی کرنا ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اسی قسم کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انھوں نے حالات کے زیر اثر جزوی یا مکمل طور پر ان مسائل کو حل کر لیا ہے۔ جو کام دوسرے لوگ کر سکے ہیں ہندوستانی بھی کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں اپنے مذہب کی تعلیمات کی روح کی طرف رجوع کریں اور اپنے فرائض پر بھی اتنا ہی زور دیں جتنا کہ وہ اپنے حقوق پر دیتے ہیں یہ بات بہت زیادہ قابل افسوس ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں مذہبی جذبہ بہت قوی ہے اور جہاں مذہبی جوش و خروش مکمل ترک دنیا کی صورت بھی اختیار کرتا رہتا ہے پھر بھی مذہب سے لوگوں کو ملانے کی جگہ ان کو جدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ مذہب کو ہی سرے سے ختم کر دیا جائے بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ مذہب کے تصور کو بدل دیا جائے۔ مذہب ہندوستان کی لعنت نہیں ہے بلکہ ہماری مصیبتوں کا اصل سبب مذہب کا غیر مذہبی اور ناجایز تصور ہے۔ کوئی مذہب رقابت، نفرت، شک، بے اعتمادی یا خود غرضی (چاہے وہ انفرادی

صورت میں ہو جاتا ہے جماعتی صورت میں نہیں سمجھاتا۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کے ختم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے لئے اتنی ہی تربیت دی جائے جتنی کہ انھیں اپنے حقوق کے حاصل کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ جس دنیا میں آج کل ہم رہ رہے ہیں اس میں ممکن ہے یہ بات ناقابل عمل معلوم ہو لیکن بہرحال ہمیں کوشش کرکے ضرور دیکھنا چاہئے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جس شخص کے پاس جتنی زیادہ چیزیں ہوتی ہیں اتنی ہی اور زیادہ چیزیں حاصل کرنے کے لئے اس کی حرص بڑھ جاتی ہے لیکن جب ہم چیزوں کو دینا شروع کر دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو شریک کرنے لگتے ہیں تو خود ہماری زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں ایک بے فکری اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ فرقہ پرستی کا سبب روحانیت کی بنیادی کمی اور سیرت کی خرابی ہے جس کی وجہ سے ادنیٰ مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لی جاتی ہے۔ فرقہ پرستی شہریت کے اعلیٰ جذبہ کے منافی ہے اور اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے اچھا شہری ہونا نہایت ضروری ہے لیکن جن لوگوں کو اچھا شہری بنانا ہو پہلے ان کی سیرت کو اچھا بنانے کی ضرورت ہے۔

اس عام بحث کے بعد اب ہم فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو مختلف تجربے دوسرے ملکوں میں کئے گئے ہیں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض ہمارے لئے ہندوستان میں مفید اور سبق آموز ثابت ہوں۔

سوئٹزرلینڈ | سوئٹزرلینڈ ایسا ملک ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات کو اس خوبی کے ساتھ حل کیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا ہے اس ملک کے لوگوں کا تعلق کسی ایک نسل سے نہیں ہے۔ جرمن نسل کے لوگ ۷۰ فی صدی ہیں فرانسیسی نسل کے ۲۰ فی صدی اور اٹلی کی نسل کے ۶ فی صدی۔ ان کی کوئی ایک قومی زبان بھی نہیں ہے۔ اکثر لوگ جرمن زبان بولتے ہیں اور بقیہ فرانسیسی اور اٹالین۔ مذہبی اعتقاد کے لحاظ سے بھی اسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے ۵۷ فی صدی لوگوں کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب کے مختلف فرقوں سے ہے ۴۱ فی صدی کا رومن کیتھلک

ہے۔

لیکن نسل، زبان اور مذہب کے اس اختلاف کے باوجود کم از کم گذشتہ چھ سو سال سے سوئٹزرلینڈ ایک متحد ملک رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ اس کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ یورپ کے تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان خصوصیات کے پیدا کرنے میں جن اسباب نے خاص طور پر حصہ لیا ہے وہ حسب ذیل ہیں (الف) ملک بہت مختصر اور اس کا علاقہ پہاڑی ہے (ب) اس ملک میں مدافعت کے قدرتی ذرائع موجود ہیں (ج) لوگ نہایت وطن پرست اور عقل سلیم پسند ہیں (د) دولت کی تقسیم نسبتاً مساوی ہے (ہ) ملک کی حفاظت ہر شخص کا فرض سمجھا جاتا ہے (و) مذہبی اور سیاسی آزادی کی روایات موجود ہیں جن پر لوگ فخر کرتے ہیں اور جن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور (ز) ایک سادہ قابل فہم اور معقول طرز حکومت موجود ہے۔

ان طاقتور پڑوسیوں کی موجودگی نے بھی سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو متحد رکھنے میں بہت مدد دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب ہندوستان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو دل میں بعض وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے ایک طویل عرصہ تک جس طرح امن و امان کو قائم رکھا ہے اور لوگوں میں اعتماد کو پیدا کر دیا ہے اور بیرونی حملہ آوروں سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے انگلستان انتہائی کوشش کرتا ہے کہیں یہ چیز تو ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و جنگ کے جاری رکھنے کا سبب نہیں ہے اگر ہندوستانی لوگ اپنا تحفظ اپنی ذاتی کوشش سے کرنے کے لئے مجبور ہوتے اور اگر وہ یہ سمجھتے کہ نااتفاقی کی صورت میں تباہی لازمی ہے تو انھوں نے ضرور ان ذرائع اور وسائل کو ڈھونڈھ نکالا ہوتا جن سے فرقہ وارانہ اختلافات کو ہم آہنگی کے ساتھ مٹایا جا سکتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں فیڈرل نظام حکومت کا رواج ایک عرصہ سے ہے اس کی وجہ سے بھی اتحاد اور پائداری کے پیدا ہونے میں بہت مدد ملی ہے۔ اس کی وجہ سے فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو بہت بڑی حد تک مقامی خود مختاری مل گئی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی سرزمین کو بے شمار چھوٹے چھوٹے خود مختار ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ضلعوں میں اکثر و بیشتر مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور ہر ایک

کے اندر اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم پائی جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے لیے اس قسم کا حل ہندوستان کے واسطے بھی بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اگر صوبوں کو بڑی حد تک خودمختار کر دیا جائے اور مقامی حکومتوں کی قوت میں اضافہ کر دیا جائے تو ہندوستان کے مختلف فرقوں کو اپنی قوتوں اور اہلیتوں کے استعمال کرنے کے لیے ایک بڑا میدان مل جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر صوبوں اور مقامی قسمتوں کا انتظام اس طرح پر کیا جائے کہ مختلف اقلیتوں کو ان کے حدود کے اندر پورا اقتدار حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

سوئٹزرلینڈ کی مثال سے جو ایک دوسرا قیمتی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں سیاسی جماعتیں عام طور پر نسلی، لسانی یا مذہبی اختلافات کی بنا پر نہیں بنائی جاتیں۔ یہ صحیح ہے کہ کلریکل جماعت کو بڑی قوت کیتھلک صوبوں سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس جماعت کے علاوہ دوسری جماعتیں مثلاً زراعت پیشہ لوگوں کی جماعت، انڈپینڈنٹ ڈیماکریٹس کی جماعت اور سوشل ڈیماکریٹس کی جماعت بھی ہیں جو نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کی جماعت پر انحصار نہیں کرتیں سوئٹزرلینڈ میں پارٹی کا جذبہ بہت قوی نہیں ہے اور لوگوں کے اندر جاہ اور منصب طلبی کی خواہش بھی اتنی بڑھی ہوئی نہیں ہیں جتنی کہ ہندوستان میں ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں سوئٹزرلینڈ میں مساوات اور آزادی کے تصور کو خوب ترقی حاصل ہو گئی ہے۔ ضمیر اور مذہب کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ کسی شخص کو کسی ایسی عبادت گاہ کا خرچ پورا کرنے کے لئے جس کا وہ خود ممبر نہ ہو کوئی محصول ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اس بات کا ہندوستان سے مقابلہ کیجئے جہاں انگلیکن چرچ کے بعض پادریوں کا خرچ اس قومی آمدنی سے پورا کیا جاتا ہے جو غیر عیسائیوں سے وصول کی جاتی ہے۔ نظام حیدرآباد نے بھی جن کے ملک میں ۹۰ فی صدی ہندو اور گیارہ فی صدی مسلمان ہیں محکمہ کلیسا قائم کر کے برطانوی ہندوستان کی پیروی کی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے علاقہ کے اندر کوئی بشپ کا علاقہ بغیر عہدیہ (کانفیڈریشن) کی منظوری کے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

تمام صوبوں میں ابتدائی تعلیم مفت ہے۔

کناڈا | یہ دوسرا ملک ہے جس نے اپنے نسلی اور لسانی مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کر لیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برطانوی اور فرانسیسی نسل کے لوگ کناڈا میں امن و امان کے ساتھ رہ رہے ہیں اور ان میں نااتفاقی کا کوئی سخت مظاہرہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ فرانسیسی زیادہ تر کیوبک کے صوبہ میں آباد ہیں ان کے مقابلہ میں برطانوی لوگ تمام مملکت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیوبک ۱۷۵۹ء سے برطانیہ کے قبضہ میں ہے اور کناڈا کا کل علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں ۱۷۶۳ء میں آگیا تھا

۱۹۲۱ء میں کناڈا کی کل آبادی ایک کروڑ ۸۷ لاکھ ۸۷ ہزار ۹۴۹ تھی جس میں ۴۸ لاکھ ۶۸ ہزار ۷۳۸ تو برطانوی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ۲۴ لاکھ ۵۲ ہزار ۷۴۳ فرانسیسی نسل سے۔ برطانوی نسل کی بیشتر آبادی کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب سے تھا اور فرانسیسی نسل کے لوگوں کا کیتھولک مذہب سے لیکن اس اختلاف کے باوجود دونوں نسلوں کے لوگ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

کیوبک میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں طرح کے ابتدائی مدرسہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں ایک ہی محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں اور مشترکہ محصول سے چلائے جاتے ہیں اگرچہ ان کا انتظام پوری آزادی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ پورے ملک کی تعلیم صوبہ کی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا خرچ مقامی محاصل سے پورا کیا جاتا ہے اور امداد صوبہ کی حکومت کی طرف سے بھی ملتی ہے۔ کیوبک کے صوبہ کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہے اپنی تعلیم کے انتظام میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ صوبہ کی کیتھلک آبادی کے لئے مونٹریل اعلیٰ تعلیم کا مرکز ہے۔ کناڈا کے فرانسیسیوں کو اپنی زبان بہت زیادہ عزیز ہے اور وہ برابر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اس میں سے متروک اور اینگلیکن اصل کے الفاظ کو خارج کرتے رہیں۔

برطانیہ عظمیٰ | عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جزائر برطانیہ ایک اہم آہنگ ملک ہے اور اس میں کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کبھی موجود نہیں رہا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ فرض کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انگریزوں، ویلس کے رہنے والوں اور اسکاٹ لینڈ کے رہنے والوں کا تعلق ایک ہی نسل سے نہیں ہے۔ ان کا خون مختلف ہے، ان کے قومی رواج مختلف ہیں اور ایک حد تک ان کی زبان

بھی مختلف ہے لیکن پھر بھی ان تینوں گروہوں نے مل کر رہنا سیکھ لیا ہے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کا کوئی باشندہ یہ کہے کہ انگریز اس پر ظلم کر رہے ہیں تو سب لوگ اس بات پر ہنسیں گے کیونکہ جتنا ان کا واقعی حصہ ہونا چاہیے تھا اسکاٹ لینڈ کے اس سے زیادہ لوگ برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدہ پر رہ چکے ہیں۔ برطانوی تجارت اور صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت اچھا رہا ہے اور اگرچہ یہ بات مذاق میں کہی جاتی ہے کہ "برطانوی سلطنت کو آئرلینڈ والوں نے حاصل کیا اور انگریز لوگ اسکاٹ لینڈ والوں کے فائدہ کے لئے اس پر حکومت کر رہے ہیں لیکن اس میں بہت کچھ صداقت موجود ہے۔

ایک زمانہ میں مذہبی اختلافات کی وجہ سے انگلستان میں ایک مصیبت نازل رہتی تھی لیکن اب یہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ اب ایک دوسرے کو جلاتے اور قتل نہیں کرتے کیونکہ اب ایک دوسرے کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہے۔ جب خوف ہوتا ہے اسی وقت مذہب کے نام پر سزا دینے کا کام اور اس کے جواب کے طور پر انتقامی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ آج کل بھی کبھی کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ اسکاٹ لینڈ والوں اور ویلس کے لوگوں کو ہوم رول ملنا چاہیے لیکن اس مطالبہ کی نوعیت کبھی سنجیدگی کی حد تک نہیں بڑھتی اور اس کی وجہ انگریزوں کا وہ رواداری کا سلوک ہے جو وہ اپنے ملک کے دوسرے عناصر کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

آئرلینڈ آئرلینڈ ابھی تک اپنے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا ہے۔ جیمس اول کے دور حکومت کا نتیجہ ایں شمالی آئرلینڈ (السٹر) میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے آدمی ترک سکونت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ یہ سب کے سب پروٹسٹنٹ تھے اور ان کی وجہ سے آئرلینڈ دو غیر مساوی مذہبی فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جس سے بعد میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور آج تک یہ لوگ آئرش فری اسٹیٹ کے ساتھ جس کو ۱۹۲۲ء میں دستوری آزادی مل گئی ہے متحد نہیں ہو سکے ہیں۔

اس دستور کے اندر جن حقوق کا اعلان کیا گیا ہے انہیں السٹر کے لوگوں نے اپنے لئے کافی نہیں سمجھا اس لئے وہ آئرش فری اسٹیٹ میں شامل نہیں ہوئے۔ اعلان حقوق میں اس بات کی تعریف کی گئی ہے کہ کن کن لوگوں کو آئرلینڈ میں شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ اس میں آئرلینڈ

کی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے لوگوں کے جسم اور ان کی جائداد کو ناقابلِ دست اندازی قرار دیا گیا ہے ضمیر عبادت، بیان اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کسی مذہب کی امداد نہیں کی گئی ہے اور "مختلف مذہبی فرقوں کے انتظام میں جو مدرسے ہوں گے ان کو سرکاری امداد دیتے وقت کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا حق نہیں دیا گیا ہے۔"

تمام شہریوں کو ابتدائی تعلیم مفت دئے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے لئے بنیادی حقوق کیا ہوں۔ اس مسئلہ پر ایک عرصہ تک بحث کی جا چکی ہے اور بحث و مباحثہ کے بعد انہیں ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اب اس سوال کو از سر نو زندہ کر رہی ہے۔

جنوبی افریقہ جنوبی افریقہ نسلی اختلافات کا دنگل رہ چکا ہے۔ اس ملک میں ڈچ، برطانیہ کے لوگ، نیگرو، رنگ دار (یعنی مخلوط نسل کے) لوگ اور ہندوستانی آباد ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جنوبی افریقہ کی آبادی کا تخمینہ جنوب مغربی افریقہ کو ملا کر ۹۹ لاکھ، ۴ ہزار ۵۰۹ کیا گیا تھا جس میں ۲۰ لاکھ ۴۳ ہزار ۲۴۵ تو یورپ کے لوگ ہیں اور ۵، لاکھ ۱۳ ہزار ۱۶ غیر یورپی ہیں۔ مردم شماری میں برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کے اعداد اس وجہ سے الگ الگ نہیں دیے جاتے کہ اس سے ان دونوں فرقوں کے اختلاف کے مستقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر ہندوستان میں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیاد پر حکومت اور انتظام کے ہر شعبہ میں اعداد رکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار بھی بجائے یہ لکھنے کے کہ زید نے بکر کو مار ڈالا تقریباً ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ "ایک ہندو نے ایک مسلمان کو مار ڈالا یا ایک مسلمان بگڑ بیٹھا وغیرہ"

یورپ کے لوگ افریقہ میں آباد ہونے کے لئے آئے تھے اور رنگین نسل کے لوگ ان کی رعایا رہ چکے تھے۔ پہلا مسئلہ جس کے حل کرنے کی ضرورت پڑی وہ برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کا تھا جس کا انجام آخر میں جنگ بوئر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۰۵ء کے قانون نے جمہوری قوتوں کو آزادی کے ساتھ نشو و نما کا موقع دے کر ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع فراہم

کر دیا۔ لیکن اب بھی دونوں مکمل طور پر ایک دوسرے سے نہیں ملے ہیں۔ ڈچ لوگوں کے اندر ایک حد تک شکست خوردہ لوگوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تمدن برطانیہ کے برابر اچھا نہیں ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ کے لوگ اپنے آپ کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں اور اس بات کو ڈچ لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ برطانیہ کے لوگوں میں تخیل کی کمی ہے اور وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ بوئر لوگ کیوں سلطنت برطانیہ کی برکات کی تعریف اتنی ہی شد و مد سے نہیں کرتے جتنی کہ برطانوی نسل کے لوگ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آیندہ کے فسادات کے لئے ذہنی فضا تیار ہو رہی ہے۔

لیکن اس کے اثر کو زایل کرنے والے اور دوسرے اثرات بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ انگریزی اور افریقی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملازمتیں جن میں کچھ عرصہ کے لئے برطانوی نسل کے لوگوں کا اجارہ سا قائم ہو گیا تھا اب دونوں نسل کے لوگوں کے لئے کھل گئی ہیں۔ برطانوی افسر جو پہلے افریقی زبان سیکھنے سے انکار کرتے تھے اب انھیں لازمی طور پر اس زبان کو سیکھنا پڑتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی یونین کے وزیر اعظم ہمیشہ بوئر نسل کے لوگ ہوتے ہیں آپس کی شادیوں اور دو زبان بولنے والے خاندانوں کی وجہ سے اختلافات مٹتے جا رہے ہیں۔

جنرل بوتھا "ایک دھارے کی پالیسی" کا علمبردار تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے دونوں نسلیں ایک متحدہ جنوب افریقی قوم میں جذب ہو جائیں۔ لیکن یہ چیز بڑی حد تک ناقابل عمل ثابت ہوئی ہے۔ جنرل ہرٹزاک کی پالیسی "دو دھاروں کو قائم رکھنے والی پالیسی" ہے جس کی وجہ سے دونوں نسل کے لوگوں کے فرق کو قائم رکھا جاتا ہے لیکن مشترکہ مفاد کے کاموں میں شرکت کرنے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جدا کرنے والے جو رجحانات ہیں ان میں کمی اس اندیشہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر سفید نسل کے لوگوں کے اختلافات قائم رہے تو رنگین نسل کے لوگ ان پر حاوی ہو جائیں گی۔

جنوبی افریقہ میں سیاسی پارٹیوں کی تنظیم زیادہ تر نسلی بنیاد پر رہی ہے سیاسی خیالات پر نہیں۔ مگر ۱۹۳۴ء سے دو جماعتوں یعنی جنوبی افریقہ پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی کو ملا کر جنوبی افریقہ کی ایک متحدہ پارٹی بنا دی گئی ہے۔ سیاسی اصولوں اور پالیسیوں کی بنیاد پر بھی پارٹیاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گو مردم شماری میں دونوں نسل کے لوگوں کے اعداد الگ الگ نہیں دیے جاتے لیکن پھر بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ دونوں نسل کے لوگوں کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ نٹیال کے صوبہ کو چھوڑ کر باقی سب صوبوں میں ڈچ لوگوں کی تعداد برطانوی نسل کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ڈچ زیادہ تر کسان ہیں اور دیہات میں رہتے ہیں لیکن برطانوی نسل کے لوگ زیادہ تر صنعت کا کام کرتے ہیں اور شہروں میں رہتے ہیں۔ اگر اتحاد کے عناصر کافی قوی نہ ہوئے تو اندیشہ ہے کہ معاشی مفاد کے اس اختلاف کی وجہ سے آیندہ تصادم کے امکانات پیدا ہوں گے۔

ملک کے اصل باشندوں اور رنگین نسل کے لوگوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں جو سلوک کیا جاتا ہے اس کے لئے جنوبی افریقہ کافی بدنام ہوچکا ہے۔ تمام جنوبی افریقہ میں اگرچہ جس قسم کے سلوک کو عام طور پر روا رکھتے ہیں اسکے مقابلہ میں کیپ کے صوبہ میں اصل باشندوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نسبتاً بہتر ہے کیپ کی نوآبادی میں دیسی لوگوں کو لیجسلیٹو کاؤنسل میں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق ملا ہوا ہے۔ یونین کے ادنیٰ اور اعلیٰ ایوان میں انھیں "سنہ ۱۹۳۶ء کے دیسی لوگوں کی نمایندگی کے قانون" کے مطابق نمایندگی ملی ہوئی ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے دیسی لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ سینیٹ کے لئے چار ممبر اور ہاؤس آف اسمبلی کے لئے تین ممبر منتخب کرسکیں۔ اور یہ اراکین اس صورت میں بھی جب کہ ایوانوں کو برطرف کردیا جاتا ہے پانچ سال تک اپنی نشستوں پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک سخت پابندی یہ ہے کہ دونوں ایوانوں کے اراکین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ یورپی نسل کے برطانوی رعایا ہوں۔ دیسی لوگ جن چار سینیٹروں کا انتخاب کرتے ہیں ان کے علاوہ گورنر جنرل چار سینیٹروں کو دیسی مفاد کی نمایندگی کے لئے نامزد کرتے ہیں۔

پرانے بوئر لوگوں کی روایت یہ رہی ہے کہ دیسی لوگوں کو گرجا اور ریاست میں برابر کا مرتبہ نہ دیا جائے۔ لیکن موجودہ پالیسی انتہاپسندی کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ سیل روڈس نے جس پالیسی کی حمایت کی تھی وہ یہ تھی کہ "زیمبسی کے جنوب میں جتنے مہذب آدمی ہیں ان سب کو مساوی حقوق دئے جائیں" لیکن اس پر عملدرآمد ابھی تک نہیں کیا جاسکا ہے۔ سفید نسل کے لوگ دیسی لوگوں کو

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب دینے کے بھی مخالف ہیں۔

چونکہ کھلے طور پر دبانا اور جذب کرنا دونوں مشکل ہیں اس لئے آج کل جس پالیسی کی تبلیغ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں الگ رکھا جائے اور ان کے لئے متوازی ادارے علیحدہ قائم کیے جائیں اس پالیسی کے مطابق کچھ علاقے تو ایسے ہوں گے جن میں سفید نسل کے لوگوں کو اقتدار حاصل ہوگا اور رنگین نسل کے لوگ محض اجرت پر کام کرنے والے لوگوں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ لیکن دوسرے ایسے علاقے ہوں گے جن میں رنگین نسل کے لوگوں کو قانون سازی اور انتظام سلطنت کے اختیارات ملے ہوئے ہوں گے۔

متوازی اداروں کی پالیسی کے سلسلہ میں "دیسیوں کو نمائندگی دینے والی ایک کاؤنسل" قائم کی گئی ہے۔ اس کاؤنسل میں چھ سرکاری ممبر ہوتے ہیں چار گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں اور بارہ منتخب شدہ دیسی ممبر یعنی ہر انتخابی حلقہ سے تین تین ممبر۔ اس کونسل کا کام یہ ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرکے رپورٹ پیش کرے (الف) مجوزہ قانون پیش کرنا جہاں تک ان کا اثر دیسی آبادی پر پڑتا ہو (ب) کوئی اور معاملہ جس میں وزیران کی رائے طلب کرے (ج) کوئی اور دوسرا معاملہ جو عام طور پر دیسیوں کے مفاد پر اثر ڈالتا ہو۔

عدالت کے سلسلہ میں دیسی کمشنروں کی عدالتیں مخصوص علاقوں میں قائم کی گئی ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ تمام سول مقدمات اور دیسیوں کے مابین جو معاملات ہوتے ہیں ان کی سماعت کرتی ہیں ان عدالتوں کی اپیل دیسی اپیل کی عدالتوں میں کی جاتی ہے اور ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے سوائے اس صورت کے کہ یہ عدالت اس پر راضی ہو جائے کہ اس مسئلہ کے بارے میں جس کی یہ عدالت صراحت کردے گی سپریم کورٹ کی اپیل کی عدالت میں معاملہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ فوجداری کا اختیار بھی جو مجسٹریٹ کی عدالت کے مساوی ہوگا دیسی کمشنروں کی عدالت کو دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فوجداری کا ایک محدود حد تک اختیار دیسی سرداروں کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کے معاملات کے لئے دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے اداروں کو نہ تو ہندوستان کی اکثریت

پسند کرے گی نہ اقلیت جن فرقوں کے لئے یہ قائم کئے جائیں گے۔ ان کی کمتری کے بارے میں ہمیشہ کے لئے مہر توثیق ثبت ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک متحدہ قومی جماعت نہیں بنائی جا سکے گی۔

علیحدہ کرنے کا خیال چاہے وہ جزوی علیحدگی ہو یا مکمل علیحدگی ایک باطل خیال ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وسائل آمد ورفت کی ترقی کی وجہ سے دنیا روز بروز ایک دوسرے کے قریب آتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ابراہیم لنکن نے کہا تھا "اگر ہم کالے آدمی کو باہر رکھنے کے لئے ایک دیوار بنائیں گے تو ہمیں سفید آدمی کو باہر رکھنے کے لئے سات دیواریں بنانا پڑیں گی" جہاں تک عملی سیاست کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے دیسیوں کی نصف سے زیادہ تعداد سفید نسل کے لوگوں کے علاقہ میں رہتی ہے اس لئے ان سب کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے ان کی علیحدگی سے یہ ضروری ہو جائے گا کہ ان کے لئے جتنی زمین اس وقت مخصوص کی گئی ہے اس سے زیادہ زمین مخصوص کی جائے اور دیسی مزدوروں کی جگہ سفید رنگ کے مزدوروں سے کام لیا جائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں نے اکثر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث ومباحثہ کیا ہے کہ اپنے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ حبشیوں کو دوبارہ افریقہ بھیج دیں لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا ہے۔

ہندوستان میں بھی بعض وقت یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ ملک کو دو ہندوستانوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک ہندوؤں کا ہندوستان ہو اور دوسرا مسلمانوں کا ہندوستان اور پھر ان کی ایک مشترکہ وفاقی حکومت ہو۔ مسلم ہندوستان میں افغانستان، بلوچستان، کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور سندھ شامل ہوں گے کچھ حوصلہ مند حضرات یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک مسلمانوں کی سو میل چوڑی پٹی پنجاب اور بنگال کو ملانے کے لئے بنا دی جائے تاکہ یہ احاطہ بھی مسلم علاقہ میں شامل کیا جا سکے۔ دوسرے حضرات کی یہ خواہش ہے کہ اس فہرست میں حیدرآباد کو بھی اس بنا پر شامل کر لیا جائے کہ یہاں کے حکمراں مسلمان ہیں اگرچہ یہاں کی ۹۰ فی صدی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ تمام ہندوؤں کو ان مسلمانوں کے لئے جو مندرجہ بالا علاقوں سے تعلق نہیں رکھتے حیدرآباد کو چھوڑ دینا ہوگا۔ ان تجویزوں کا ناقابل عمل ہونا بالکل ظاہر ہے پھر ڈیڑھ سو سال کے اندر اتحاد کا جو کام ہوا ہے اس کے ختم کرنے کے لئے اس

سے زیادہ یقینی طریقہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس سے اتحاد ہند کے تخیل پر ایسی ضرب کاری لگے گی کہ جس کے بعد وہ ہرگز جاں بر نہ ہو سکے گی۔

جنوبی افریقہ کے لئے اور بھی تجویزیں نسلی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ کابینہ کے طرز کی جماعت عاملہ کو منسوخ کر دیا جائے اور اس کی بجائے امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کے طرز کی جماعت عاملہ قائم کی جائے دوسری تجویز یہ ہے کہ سینٹ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہاؤس آف اسمبلی میں جب ایسے مسودات قانون منظور ہوں جو دیسیوں کے حق میں مضر ہوں انھیں مسترد کر دے تیسری تجویز یہ ہے کہ مستقل بورڈ اور کمیشن مقرر کیے جائیں تاکہ ان کے ذریعہ غالب اکثریت رکھنے والی پارلیمینٹ کی زیادتیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ اس آخری تجویز کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ دیسی معاملات کا کمیشن اس کام کو پہلے سے ہی کر رہا ہے لیکن اس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ اس کو دیسی مفادوں کی صحیح نمائندگی کا موقع دینے کے لئے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کمیشن کے ارکان کو ایک آل افریقہ دیسی کونسل منتخب کرے اور جب کبھی حکومت واضح طور پر دیسی لوگوں کی مخالفت کی پالیسی پر عمل درآمد کرے تو اسے مداخلت کے زیادہ اختیارات دے جائیں۔

لیکن ہمیں نہ تو دوسری تجویز معقول معلوم ہوتی ہے نہ تیسری۔ دوسری تجویز سے تو عوام کا ایوان کمزور اور بے اثر ہو جائے گا اور تیسری تجویز سے پارلیمینٹ کا اقتدار ایک قانون سے بالا ادارہ کے قائم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا۔ جس کام کا کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ ایک اقلیتوں کی کونسل یا اسٹینڈنگ کمیٹی بنائی جائے جو ان تمدنی اور معاشری مسائل پر جن سے اقلیتیں متاثر ہوتی رہتی ہیں غور کرے۔

باقی ماندہ برطانوی افریقہ جب افریقہ کی برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہاں بھی حالت اس سے زیادہ بہتر نظر نہیں آتی۔ جنوبی روڈیشیا کو ذمہ دار حکومت ۱۹۲۳ء میں دی گئی تھی لیکن ابھی تک دیسی لوگوں کو روڈیشین پارلیمینٹ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی ہے۔ جنوبی روڈیشیا

کی پالیسی دیسیوں کے ساتھ بالکل جنوبی افریقہ کی یونین جیسی ہے۔ شمالی روڈیشیا اور نیاسالینڈ کی لیجسلیٹو کاؤنسل خالصتہً سفید نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

کینیا میں مختلف نسلی گروہوں کی نمائندگی کو ان کی تعداد سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیجسلیٹو کانسل میں گیارہ ایکس آفیشو ممبر ہوتے ہیں، نو نامزد کیے ہوئے سرکاری ممبر، گیارہ منتخب کئے ہوئے یورپین، پانچ منتخب کئے ہوئے ہندوستانی، ایک منتخب کیا ہوا عرب اور دو نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبر دیسی لوگوں کے مفاد کی نمائندگی کرنے کے لئے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے یورپین لوگوں کی تعداد صرف ۱۸ ہزار ۲۶۹ ہے۔ ایشیا کے لوگوں کی ۴۱ ہزار ۸۳۵، ۶ عربوں کی ۱۴ ہزار ۵۹۸ اور دیسیوں کی ۳۱ لاکھ ۹۶ ہزار ۷۶۹۔ غیر یورپینوں کی تعداد یورپینوں سے زیادہ ہے لیکن ان کی نمائندگی نصف سے بھی کم ہے۔ یہ لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے شور مچا رہے ہیں لیکن سفید نسل کے لوگ ان کے مخالف ہیں۔

ٹانگانیکا کی لیجسلیٹو کاؤنسل ۱۳ سرکاری ممبروں، دس نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبروں (اگرچہ عموماً صرف ۶ کو نامزد کیا جاتا ہے)، ۵ یورپینوں اور دو ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ یوگانڈا کی لیجسلیٹو کاؤنسل میں ۶ سرکاری اور ۶ غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں عموماً دو ہندوستانی بھی ہوتے ہیں۔

(باقی)

سرمایہ داری اور فسطائیت

(از جناب محب الحسن صاحب بی۔ اے (آنرز) لندن پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر)

یہ سمجھنے کے لئے کہ فسطائیت[1] کیا ہے؟ اور کیوں وجود میں آئی۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہم سرمایہ داری نظام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں اس لئے کہ وہ اس کا ایک دور اور اسی کی ایک منزل ہے۔ سرمایہ داری اور فسطائیت کوئی مختلف اور متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی بنا یکساں اصولوں پر ہے۔ دونوں میں دولت آفرینی عوام کے نکتہ نظر سے نہیں کی جاتی بلکہ نجی فائدہ کے لئے اور دونوں میں ذرائع پیداوار پر قبضہ سماج کا نہیں ہوتا بلکہ افراد کا۔ یہ ضرور ہے کہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ جو کہ سرمایہ داری کے گہوارے ہیں اور جہاں اس نے نشو و نما پائی ابھی ایک حد تک جمہوریت کے ڈھانچے کو قائم کئے ہوئے ہیں اور شاید اس بات سے لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ سرمایہ داری اور فسطائیت دو مختلف چیزیں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سرمایہ داری اپنی بقا کے لئے دوسرا روپ اختیار کر لیتی ہے تو اس کو ہم فسطائیت کہتے ہیں ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں صرف ظاہری شکل و صورت کا۔ انگلستان اور فرانس میں جمہوریت کا نام و نشان ابھی اس وجہ سے باقی ہے کہ وہاں سرمایہ داری کو اتنا دھکا جنگ عظیم کے بعد نہیں لگا جتنا کہ جرمنی میں وہ فاتح ملک تھے ان کے پاس وسیع نو آبادیاں اور مقبوضات تھیں اور اس کی لوٹ سے وہ مزدوروں کو ایک حد تک راضی رکھ سکتے تھے۔ اس وجہ سے مزدوروں نے جنگ کے بعد کبھی موجودہ معاشی نظام کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس لئے سرمایہ داروں کو اس کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ

---

[1] یہاں پر فسطائی اور نازی الفاظ ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور جو نظام جرمنی اور اٹلی میں قائم ہے اس کو فسطائیت کہا گیا ہے۔ نازی (NAZI) نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (NATIONAL SOCIALIST GERMAN WORKERS PARTY) کا مخفف ہے اور اس کا سرکاری نام N S D A P ہے۔ اس کی بنیاد ۲۰-۱۹۱۹ میں پڑی۔ اٹلی میں فسطائی (FASCIST) پارٹی صاحب اقتدار ہے۔ یہ لفظ فاشیو (FASCIO) سے نکلا ہے جس کے معنی جماعت یا اتحاد کے ہیں۔ یہ ۱۹۱۴ میں قائم ہوئی۔

حکومت مطلق قائم کریں۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ جتنا سرمایہ دارانہ نظام پر زوال آرہا ہے اتنا ہی فرانس اور انگلستان میں فسطائی قوتیں ترقی پذیر ہو رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کی داخلی اور خارجی پالیسی اس کا مظہر ہیں۔ دونوں ملکوں میں مزدوروں کی جماعت پر جبر و تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اور آزادی خیال و بیان پر سخت پابندیاں عائد کی جارہی ہیں اس کے علاوہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کا رویہ چین، حبش، چیکوسلواکیہ اور اسپین سے ایسا رہا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فسطائیت کو جمہوریت پر ترجیح دیتی ہیں اور اس کی کوشاں ہیں کہ فسطائی قوتوں کا ہر جگہ یورپ میں بول بالا ہو جائے۔

سرمایہ داری کی سب سے پہلے بنیاد انگلستان میں پڑی یہیں اس کو عروج ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ہم کو چاہیئے کہ اس وقت کے دوسرے یورپین ممالک کے حالات پر ایک سرسری نظر دوڑائیں۔

پندرھویں صدی میں اہل پرتگال و ہسپانیہ یورپ میں ایک بہت منظم منضبط اور مہم پسند لوگ تھے یہ اس کشمکش اور جد وجہد کا نتیجہ تھا جو ان کو آزادی حاصل کرنے کے لئے موروں (MOORS) کے خلاف کرنا پڑی اور جب آزادی نصیب ہوگئی تو کامیابی کے نشہ سے مخمور ہو کر انھوں نے بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ کولمبس نے نئی دنیا تلاش کی اور واسکوڈیگاما نے ہندوستان کے جانے کا نیا راستہ معلوم کیا۔ اہل پرتگال نے فن جہاز رانی و جہاز سازی میں اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کی تمام بحری تجارت پر جو کہ عربوں اور اہل وینس وجینوا کے ہاتھوں میں تھی قابض ہو گئے۔ ہسپانیہ والوں کے حصہ میں نئی دنیا اور اس کی سونے کی کانیں پڑیں اور سولہویں صدی میں یہ دونوں قومیں دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی تھیں۔

لیکن سترھویں صدی سے ان پر زوال آنا شروع ہوا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں ہالینڈ اور انگلستان نے اشتراک کرکے ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا۔ پرتگال اور ہسپانیہ خود بھی اپنی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے۔ جاگیرداری نظام اور مذہبی تعصب نے دونوں ملکوں پر ایسی جمود کی کیفیت طاری کر دی کہ وہاں کوئی ایسا طبقہ نہ پیدا ہو سکا۔ جو کہ نئی ترقیوں اور نئے اصولوں کا علمبردار ہوتا۔ ہسپانیہ قرونِ وسطیٰ کے نظام کی زنجیروں سے ابھی تک جکڑا ہوا تھا۔

سترھویں صدی سے ہالینڈ کا عروج شروع ہوا۔ لیکن برطانیہ سے تجارتانہ رقابت اور جدو جہد کا نتیجہ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ ایک چھوٹا ملک تھا۔ اس لیے وہ انگریزوں سے مقابلہ نہ کر سکا۔ اس صدی کے آخر سے اس کا زوال شروع ہوا اور انگلستان اس کا قائم مقام بنا۔ فرانس نے بھی سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں بہت ہاتھ پیر پھیلائے۔ تجارت کے لیے کمپنیاں بنائیں۔ نئی دنیا میں نوآبادیاں قائم کیں۔ اور ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے انگلستان سے بڑی بڑی معرکہ آرائیاں کیں۔ لیکن فرانس کو اس تجارتی دوڑ میں شکست ہوئی۔ وہ بھی اسپین کی طرح جاگیرداری اور مذہبی تعصب کا شکار بن گیا۔

انگلستان کی تاریخ نے ان ممالک کے برخلاف بالکل دوسرا ہی پہلو اختیار کیا۔ یہاں بارھویں اور تیرھویں صدی سے ایک ایسا درمیانی طبقہ پیدا ہونے لگا جس نے اون کی تجارت کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی شروع کر دی۔ ٹیوڈر حکمرانوں نے باغی امرا کی سرکوبی کے لیے ان سے تعاون کیا۔ جس سے ان کی قوت میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب خاندان اسٹوارٹ کا دور دورہ ہوا اور اس نے تجارت پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں تو اس نئے طبقے نے مقابلہ پر کمر باندھ لی جس کا نتیجہ ۱۶۴۲ء کی خانہ جنگی تھی اور آخر کار اس نے شاہی استبدادیت اور جاگیرداری کو شکست دی اور ۱۷۰۰ء سے خود برسر اقتدار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی تجارت نے خوب ترقی ہوتی گئی۔ اور ایسے قوانین و ضوابط بن گئے جس سے اس کو اور مدد ملی اس کے علاوہ انگریز فرانسیسیوں اور جرمنوں کے مقابلہ میں پہلے ایک متحدہ قوم بن گئے۔ وہ بڑی حد تک اور ملکوں کی مذہبی جنگوں سے محفوظ رہتے اور دوسروں کے مقابلہ میں مذہبی رواداری بھی قائم کر دی۔ پھر ملک کی آب و ہوا اور اس کا (ATLANTIC OCEAN) بحر اوقیانوس میں واقع ہونا ایسی باتیں تھیں جس سے یہاں کے تجارتی طبقے نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی دولت خوب بڑھا لی۔ اس کی مدد سے کارخانے قائم ہونے لگے تاکہ دوسرے ملکوں کو (اور خاص کر امریکہ کی انگریزی نوآبادیوں کو) مصنوعات بھیجی جائیں لیکن چونکہ ان کارخانوں میں صرف ہاتھ سے کام ہوتا تھا۔ اس لئے نہ صرف انگریزی نوآبادیوں کو ان کی ضروریات کا سامان پہنچانا مشکل تھا۔ بلکہ ذرائع

آمدنی بھی بہت محدود تھے۔ اس وقت یہ لازم تھا کہ دولت آفرینی کا کوئی دوسرا طریقہ وجود میں آئے چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر سے ایجادات و اختراعات ہونا شروع ہوئے۔ اور ہاتھ کے بجائے مشین سے اشیاء بننے لگیں۔ یہی وہ حیرت انگیز چیز ہے جس کو ہم صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ گویا کہ انگلستان کی جغرافیائی معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے سب سے پہلے صنعتی انقلاب وہیں آیا۔ اور موجودہ معاشی نظام جس میں ہم سب رہتے ہیں اور جس کو سرمایہ داری کہا جاتا ہے اسی صنعتی انقلاب کا سبب ہے۔ اس صنعتی انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام دنیا انگلستان کی منڈی بن گئی۔ لیکن اس کے راز زیادہ عرصہ تک دوسرے ملکوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے فرانس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے ذریعہ سے جاگیرداری نظام سے چھٹکارا حاصل کر کے صنعتی ترقی شروع کر دی۔ جرمنی نے بھی انیسویں صدی کے وسط سے جبکہ وہاں قومی اتحاد قائم ہو گیا صنعت و تجارت کے میدان میں قدم رکھا۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر اس صنعتی انقلاب کے دنیا پر کیا اثرات ہوئے۔ سب سے پہلا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دست کاروں کو اپنا کام بند کر دینا پڑا اس لئے کہ مشین کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ بھوک اور تنگ دستی سے بچنے کے لئے ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ ملوں میں جا کر اپنی "محنت" بہت قلیل اجرت پر بیچ ڈالیں اور بجائے مالک رہنے کے سرمایہ داروں کے غلام بن جائیں اس انقلاب کا اثر کاشتکاروں پر بہت تباہ کن ہوا۔ اول تو کسان کھیتی کے علاوہ دست کاری سے بھی کچھ کما لیتے تھے لیکن مشینوں نے یہ ذریعہ آمدنی بالکل بند کر دیا۔ دوسرے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کو کاشتکاری بھی ترک کرنی پڑی۔ تیرھویں صدی ہی سے انگلستان میں زمینداروں نے اپنی زمینوں کو کاشتکاروں کے قبضہ سے نکال کر احاطہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس میں وہ بھیڑیں پالتے تھے۔ کیونکہ ان کے لئے اون کی تجارت کھیتی کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش تھی۔ لیکن اس احاطہ بندی کی وجہ سے ہزاروں کسان بے روزگار ہو گئے اور شہروں میں تلاشِ معاش کے لئے پھرنے لگے صنعتی انقلاب نے ان کی حالت کو اور ابتر بنا دیا کیونکہ احاطہ بندی کی تحریک زیادہ شدید ہو گئی اور بڑے بڑے زمینداروں نے زراعت مشینوں کی مدد سے شروع کر دی۔ بیچارے کاشتکاروں کو بے روزگا

ہو کر اور دیہات کی آزاد اور تندرست زندگی کو خیرباد کر کے ملوں میں غلامی کرنے کے لئے شہروں میں آنا پڑا۔

اس زمانے میں نہ کوئی فیکٹری کے متعلق قانون تھے اور نہ مزدور اتنے بیدار اور منظم تھے کہ وہ اپنے حقوق کی پاسبانی کر سکتے۔ سرمایہ دار ان سے مثل جانوروں کے برتاؤ کرتے تھے۔ کام بہت لیتے تھے لیکن اجرت اتنی بھی نہ دیتے کہ وہ اپنا پیٹ پال سکتے۔ پانچ چھ برس کے بچوں سے لے کر حاملہ عورتوں تک سے سینکڑوں گز نیچے کانوں کے اندر اتنی محنت اور مشقت کے کام لیے جاتے تھے کہ ان کا حال سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں سے چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور ان کو رہنے کی جگہ مرغیوں کے دربے سے مکانوں میں دی جاتی۔ ایک چھوٹے سے گندے اور کثیف کمرے میں پورے پورے خاندانوں کو زندگی بسر کرنا پڑتی۔ مارکس ایک country مجسٹریٹ کا مزدوروں کی حالت کے متعلق حوالہ دیتا ہے جس کو میں یہاں درج کرتا ہوں۔ "اکثر چھوٹے بچے اپنے گندے بستروں سے دو تین یا چار بجے صبح کو اٹھا دئے جاتے تھے اور رات کے دس گیارہ یا بارہ بجے تک ان سے بہت ہی معمولی اجرت پر کام لیا جاتا تھا۔" یہاں پر میں ایک بیس سالہ لڑکی کا دردناک واقعہ جس کا نام میری عین وا کلے تھا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ ایک بڑے اور معزز عورتوں کے کپڑے سینے کے فرم میں ملازم تھی اس کو روزانہ ساڑھے سولہ گھنٹے اور بعض اوقات تیس گھنٹے متواتر کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی لاغر تندرستی اور گھٹتی ہوئی طاقت میں قہوہ اور شراب سے جان ڈالی جاتی تھی۔ آخرکار ایک مرتبہ ایک شاہی رقص کے سلسلہ میں اس کو اعلیٰ طبقہ کی خواتین کا لباس بنانے میں ساڑھے چھبیس گھنٹے کی مسلسل محنت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس کو ایسے کمرے میں سونے کو جگہ ملی جس میں تقریباً تیس اور لڑکیاں تھیں اس میں نہ ہوا کا گذر تھا اور نہ کوئی آرام کا سامان۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری دو دن بیمار رہ کر مر گئی۔ اس واقعہ کو استثنائی نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ نمونہ ہے ان لاکھوں مزدوروں کی زندگی کا جن کو افلاس اور غم و الم کے سوا کبھی آرام و آسائش سے سابقہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں تو درکنار جو سب سے زیادہ ہیبت ناک مصیبت ان کے سر پر منڈلایا کرتی

تھی۔ وہ خوف بے روزگاری تھا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ مغربی یورپ کی صنعتی ترقیوں سے کساد بازاری کا آنا لازم تھا۔ سرمایہ داری نظام میں پیدائش کی خاکہ اور تخمینہ سے ترقی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اندھا دھند طریقہ سے سرمایہ دار لوگوں کی ضروریات مدنظر نہیں رکھتے بلکہ اپنی ذاتی منفعت کو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ نئی ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ جاری رہا جس سے کہ پیدائشی قوتیں بھی ترقی کر گئیں سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا اور نئے نئے ذرائع پیدائش قائم ہوتے گئے اس وجہ سے اشیاء ان کی طلب سے کہیں زیادہ پیدا ہونے لگیں جس کی وجہ سے قیمتیں کم ہو جاتیں اور چونکہ فائدہ کی گنجائش کم ہو جاتی اس لئے سرمایہ دار اپنی فیکٹریاں بند کر دیتے اور اس طرح ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جاتے۔

ان دشواریوں کا حل یوں ہو سکتا تھا کہ اول تو پیدائش ایک خاکہ اور نظام کے ساتھ کی جاتی اور یہ مدنظر رہتا کہ اس میں اور عوام کی ضروریات میں ایک توازن قائم رہے دوسرے یہ کہ مزدوروں کو اتنی کافی اجرت دی جاتی کہ وہ اپنی تمام ضروریات زندگی کا سامان خرید سکتے۔ اس طرح مال کی کثرت اور خریداروں کی کمی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ کساد بازاری کا آنا بھی بند ہو جاتا۔ لیکن اس اسکیم پر سرمایہ دار کب عامل ہو سکتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے اصولوں کے منافی ہے۔ اس کے اختیار کرنے کے یہ معنی تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے خود اپنے پیروں پر کلھاڑی ماریں۔

چنانچہ سرمایہ داروں نے اپنی مشکلات کا حل یوں کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ تاکہ ان پر سیاسی اثر یا اقتدار قائم کر کے ان کو اپنے مال کی منڈیاں بنائیں۔ انگلستان نے ہندوستان کو اس کی صنعت و حرفت کو ختم کر کے اپنی مصنوعہ اشیاء کی منڈی بنا لیا اور اسی لئے اپنے اثر کا جال دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں برطانیہ عظمیٰ۔ فرانس بلجیم اور جرمنی نے افریقہ میں بڑی بڑی نوآبادیاں حاصل کیں اور تقریباً اس کے ۹/۱۰ حصے پر قابض ہو گئے لیکن باوجود اس کے سرمایہ دار ممالک کو سیری حاصل نہ ہوئی۔ ان کی حالت عمر عیار کی زنبیل کی سی تھی

جس میں جو کچھ آیا وہ ہضم ہو جاتا۔ چونکہ سرمایہ بڑھتا رہا۔ نئی ایجادات ہوتی رہیں اور پیداوار کی تو تیں اضافہ ہوتا گیا۔ اس لئے جو نو آبادیاں اور مقبوضات ان کے پاس تھے وہ ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ پرانی تقسیم تسلی بخش ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز سے مغربی یورپ کے ممالک میں ایک دوسرے کے دائرۂ اثر کو اس سے چھیننے کی جدوجہد شروع ہوئی۔ جرمنی نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے صنعتی میدان میں انگلستان اور فرانس کے بعد قدم رکھا اور اس لئے اس کے ہاتھ بہت کم نو آبادیاں لگیں۔ لیکن اس نے اتنی تیزی سے ترقی شروع کر دی کہ اس کو نو آبادیاں کی کمی بہت جلد محسوس ہونے لگی۔ جرمنی کو ایسے خطہ کی ضرورت تھی جہاں سے اس کو اپنی فیکٹریوں کے لئے مال دستیاب ہو سکتا اور بدلہ میں وہ اپنی مصنوعہ اشیا بھیج سکتا۔ چنانچہ جرمنی انگلستان اور فرانس کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ فرانس اور انگلستان بھی جرمنی کی صنعتی ترقیوں اور بحری اور بحری قوت کو دیکھ کر حسد کرنے لگے اور اس کی تباہی کے درپے ہوئے چنانچہ ان ممالک کے آپس کے مفاد کے تصادم کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ تھی۔

لیکن اس جنگ سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس لئے کہ اب سرمایہ داری کا آخری دور آ پہنچا تھا۔ کسادبازاری جو ایک میعادی بیماری تھی اب مستقل مرض بن گئی اور وہ تمام تضاد جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اب نمایاں طریقہ سے اپنا اثر دکھلانے لگے۔ تجارتی رقابتوں۔ انتقامی محاصل۔ اور نو آبادیوں کی از سرِ نو تقسیم کی جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سرمایہ دار ملک پھر دوبارہ جنگ کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ یہ اس کے فطری نقائص اس کو تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور عنصر تھا جو اس کی فنا کا کوشاں تھا۔ یہ مزدور تھے جو محسوس کرنے لگے کہ سرمایہ داروں کی تباہی اور بربادی میں ان کی نجات اور بہبودی کا راز پنہاں ہے۔ ان میں اتنا سیاسی شعور اور اتنی بیداری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سمجھنے لگے کہ سماج کا معاشی نظام بہت ناقص ہے اور اس کا مقصد صرف تباہی۔ جنگ۔ بے روزگاری اور افلاس کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے تنگ آکر انھوں نے اس کا ارادہ کر لیا کہ سرمایہ داری کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے ایسا نظام قائم کریں

جس میں ذرائع پیداوار افراد کی نہیں بلکہ تمام قوم کی ملکیت ہوں۔ پیدائش کی بنیاد ذاتی منفعت پر نہیں بلکہ ضرورت عامہ پر ہو۔

سرمایہ داروں کے سامنے ان حالات میں تین صورتیں تھیں۔ اول تو کچھ دے دلا کر مزدوروں کی تالیف قلوب کر لیتے اور اس طرح سے ان کو باغیانہ رویہ سے باز رکھتے۔ انیسویں صدی میں وہ اس اصول پر ایک حد تک عامل رہے اس لئے کہ اپنی نوآبادیوں کی لوٹ کے مکلف دستر خوان سے وہ چند سوکھے ٹکڑے مزدوروں کو بھیک دے سکتے تھے لیکن بیسویں صدی سے ان مقبوضات اور نوآبادیوں کی قومی تحریکوں اور صنعتی ترقیوں نے اس امر کو مشکل بنا دیا۔ اس کے علاوہ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں کامیابی کی یہی صورت ہے کہ مزدوروں کو جتنی ہی کم اجرت دی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن مزدور اس پر کب راضی تھے وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اس وقت سرمایہ داروں کے سامنے دو طریق کار تھے یا تو وہ مزدوروں سے بغیر مقابلہ کئے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیتے اور اپنی تباہی کو قبول کرتے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا اس لئے کہ کوئی جماعت بغیر قوت آزمائی کئے ہوئے اپنے مفاد کو نہیں چھوڑتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مزدوروں کی قوت بالکل ختم کر دی جائے کیونکہ یہی ان کے پہلو میں سب سے بڑا خار تھا۔

جرمنی۔ اٹلی اور آسٹریا کے سرمایہ داروں نے اسی اصول پر عمل کیا اور اپنی بقا کے لئے ایک ایسی مطلق العنان حکومت قائم کر دی جس کا مقصد مزدوروں کی طاقت کو فنا کر دینا تھا۔ اس استبدادی نظام کو ہم فسطائیت کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ممکن ہو گیا کہ سرمایہ داری کی بوسیدہ عمارت کچھ عرصہ کے لئے جبر و ظلم کے کمزور ستونوں کے سہارے پر رک سکے۔ گویا کہ فسطائیت اس وقت وجود میں آئی جبکہ سرمایہ داری نظام اپنے خلقی نقائص۔ تضاد اور مزدوروں کے حملوں کی وجہ سے اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے آکر اس میں ذرا جان ڈال دی۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اشتراکی لیڈروں نے اپنی کمزوری۔ مصالحت پسندی اور غداری سے فسطائی تحریک کو کس قدر تقویت دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور مزدوروں کی صحیح رہنمائی کرتے تو آج جرمنی اور اٹلی میں اشتراکیت

کا بول بالا ہوتا۔ لیکن ان کی حماقتوں سے سماجی انقلاب ناکامیاب ہوا اور اس کا جواب سرمایہ داروں نے فسطائیت سے دیا۔

اگر یورپ کے جنگ عظیم کے بعد کے واقعات پر ایک نظر دوڑائی جائے تو نہ صرف سرمایہ داری اور فسطائیت کے رشتہ پر روشنی پڑ سکتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ فسطائیت کو جرمنی، آسٹریا اور اٹلی میں کیوں فتح ہوئی اور انگلستان اور فرانس میں کیوں نہ ہوئی۔ میں اس مضمون کی ابتدا میں فرانس اور انگلستان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وجہ سے اب میں اپنے کو جرمنی اور اٹلی ہی کے حالات تک محدود رکھوں گا جرمنی کو جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے جنگ عظیم میں شکست ہوئی۔ فاتح ملکوں نے اس کی تمام افریقہ کی نوآبادیوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ یورپ میں الساس اور لورین Alsace and Lorraine جو کہ ۱۸۷۱ء سے اس کے قبضہ میں تھے۔ فرانس کو واپس دلا دیے گئے۔ اس پر کئی ارب پونڈ کا تاوان لگایا گیا، اور جب وہ دے نہ سکا تو ۱۹۲۳ء میں فرانس نے روہر Ruhr کی کوئلہ کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے جرمنی کے معاشی نظام کی چولیں ہل گئیں۔ بین الاقوامی کساد بازاری کے اثرات یہاں اور ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ شدید پڑے۔ اس لیے یہاں کے سرمایہ داروں کے سامنے اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ وہ کسی ایسے نظام کو قائم کریں جو ان کو نوآبادیاں دلائے۔ جو جرمنی کو دنیا میں پھر ایک طاقتور ملک بنا دے اور جو سب سے زیادہ اہم بات تھی وہ یہ کہ وہ مزدوروں کی طاقت کو ختم کر دے۔

جرمنی میں مزدور بہت باشعور اور منظم تھے اور لڑائی کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ ان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہیئے جو کہ واقعتاً ان کی حکومت ہو اور جو ان کے حقوق کی پاسبانی کر سکے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ۱۹۱۸ء کا انقلاب کیا اس کے بعد ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۹ء میں پھر انھوں نے اشتراکی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے لیڈروں کی غداری کی وجہ سے یہ تحریکیں ناکامیاب رہیں۔ مگر اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کا

(۱) یہ جرمنی کی اشتراکی پارٹی تھی جس کی بنیاد کارل مارکس Karl Marx اور اینگلس Engels نے ڈالی تھی۔ بیسویں صدی سے اس میں رجعت پسندی کا نشوونما شروع ہو گئی اور ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اپنے اصولوں کے خلاف قیصر Kaiser جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی مرتبہ اشتراکی حکومت قائم کرنے کا موقع ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۲ء تک جرمنی میں اس کا اقتدار

اثر کم ہونے لگا اور مزدور کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہونے لگے۔ سرمایہ دار یہ حالت دیکھ کر کب چین سے بیٹھ سکتے تھے۔ جب تک کہ اشتراکی پارٹی اُن کے لئے مفید تھی انھوں نے اس کی اور مزدوروں کی رواداری کی۔ لیکن جب مزدور اس کی قیادت سے منکر ہونے لگے اور بغاوت کے علم بردار ہوئے تو وہ ناتزیوں کے ذریعہ سے ان کو پسپا کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اگر ہم جرمنی کی ناتزی NAZI پارٹی کی تاریخ دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی نشو ونما میں سرمایہ داروں نے کس قدر مدد دی ہے جب ۱۹۲۳ میں ہٹلر نے بویریا Bavaria کی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو لیوڈنڈارف Ludindorff نے جو جنگ عظیم میں سپہ سالار رہ چکا تھا اس کی سازش میں بڑا حصّہ لیا۔ ڈیوک دلیم آف بویریا۔ Bavaria۔ ڈیوک آف برنزوک BRUNSWICK کرپس KRUPPS اور ماندس Monds وغیرہ جو کہ بہت زبردست سرمایہ دار تھے نازیوں کی برابر مالی اور فوجی امداد کرتے رہے۔

اٹلی میں بھی فسطائیت انھیں وجوہات سے قائم ہوئی جیسے کہ جرمنی میں۔ اس وجہ سے یہاں پر اس کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ فرق ہے وہ مقامی حالات کی بنا پر ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کی فتح ہوئی اس لئے کہ وہ ایک حد تک شکست خوردہ قوم کے جذبات کی نمایندگی کرتا تھا۔ لیکن مسولینی نے یہ نعرہ بلند کیا کہ اگرچہ اٹلی نے جنگ میں فتح پائی ہے لیکن صلح میں اس کو شکست ہوئی۔ اٹلی کو لندن کے پوشیدہ صلح نامے میں شہر فیوم اور علاقہ ڈالیشار DOLMESIA کا دعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ورسائی .... کے صلح نامے میں انگلستان فرانس اور امریکہ نے اس کا ایفا نہ کیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسولینی نے قومیت اور قومی عزت واہمیت کے جذبات ابھار کر اپنی پارٹی کی قوت کو بہت بڑھا لیا۔ لیکن فسطائیت جرمنی اور اٹلی دونوں جگہوں میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ مزدوروں کی طاقت

اور اثر رہا لیکن اس کی غفلت اور حماقتوں سے ناتزی پارٹی ترقی کرتی رہی۔ ان حالات کو دیکھ کر ۱۹۱۰ میں مزدوروں کے باشعور طبقے نے کمیونسٹ پارٹی (Communist Party) کی بنیاد ڈالی۔

کو برباد نہ کردیں گے تو اشتراکیت کی فتح ہوگی۔ اسی لئے انھوں نے ایسی پارٹی کی جو ان کی مطلب براری کرے بنیاد ڈالی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ دار بغیر مسولینی اور اٹلی کی رائے کے تصرف نہیں کرسکتے اور چونکہ ان ڈکٹیٹروں اور سرمایہ داروں میں کبھی کبھی داخلی اور خارجی پالیسی پر اختلاف ہو جاتا ہے اس لئے ان ملکوں میں سرمایہ داری نظام نہیں ہے۔ یہ رائے بالکل غلط ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ سماج کے اور پیدائش نجی فائدہ کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ عوام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ یہ ضرور ہے کہ فسطائیت سرمایہ داروں پر پابندیاں عائد کرتی ہے لیکن یہ بھی ان کے فائدہ کے لئے۔ سرمایہ دار نوآبادیاں چاہتے ہیں جہاں سے ان کو کچا مال مل سکے اور اس کے بجائے اپنی مصنوعات بیچ سکیں۔ لیکن نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایک زبردست مسلح فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ پر بغیر ہٹلر اور مسولینی کی رائے کے تصرف نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ جرمنی اور اٹلی کی دولت کا بیشتر حصہ اسلحات جنگ بنانے میں صرف کیا جائے اور یہی جرمنی اور اٹلی میں ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ عوام کے آرام و آسائش کے لئے روپیہ صرف کیا جائے فسطائی ایک تباہ کن جنگ کے لئے سامان بنانے میں مشغول ہیں۔ باوجود ان باتوں کے جرمنی اور اٹلی کے موجودہ حالات یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں سرمایہ داروں کی آمدنی برابر بڑھ رہی ہے لیکن مزدوروں کی اجرت برابر کم ہوتی جاتی ہے اور اسی وجہ سے ان کا معاشرتی معیار بھی گرتا جارہا ہے۔

بعض لوگ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ چونکہ انگلستان اور فرانس جیسے سرمایہ دار ملکوں میں جمہوریت ہے اس لئے فسطائیت اور سرمایہ داری میں یقیناً کوئی بنیادی فرق ہوگا لیکن یہ تجزیہ غلط ہے۔ سرمایہ دار جمہوریت کا ڈھونگ اس وقت تک رچاتے ہیں جب تک کہ ان کے ذاتی مفاد معرض خطر میں نہ ہوں۔ وہ اعتراضات اور تنقیدات سے نہیں گھبراتے لیکن جب اپنی حالت کو خطرے میں پاتے ہیں تو استبدادیت قائم کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ مزدور

سبھائیں توڑ دی جاتی ہیں۔ چنانچہ بالکل ایک رسمی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ قانون ساز جماعتیں برائے نام قائم رہتی ہیں اور آزادی خیال و بیان پر طرح طرح کی سختیاں اور پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔
لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جرمنی اور اٹلی کے عوام ان مظالم کو کیوں برداشت کرتے ہیں اس کا جواب تو یہ ہے کہ فسطائی مزدوروں کے باشعور طبقہ کو جبر و تشدد سے دبائے رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی چالوں کو پہچانتے ہیں۔ دوسروں کے لئے جن میں سیاسی بیداری کم ہے اور جو حالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے سرمایہ داروں کے فسطائی ایجنٹ ان کو راضی رکھنے کے لئے نئے نئے جذباتی اور دل خوش کن نظریئے ایجاد کرتے ہیں۔ کبھی ان کو سوشلسٹ۔ کمیونسٹ اور یہودی کی نفرت کا نشہ پلایا جاتا ہے تاکہ اس میں وہ اتنے محو ہو جائیں کہ اپنی پریشان حالی کا احساس نہ کر سکیں اور کبھی اسی لئے ان کی توجہ بیرونی فتوحات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔
اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ داری نے اپنی بقا کے لئے یہی طریقے اختیار کئے۔ انگلستان میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے استبدادی نظام کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جتنا ہی اس کا معاشی نظام کمزور ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی وہاں فسطائی رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

ہندوستان اور بین الاقوامی تجارت

(از جناب ریاض الحسن صاحب)

یورپ کے دور جدید کی تاریخ میں دو چیزیں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو قومی ریاستوں کا تصور اور ان کا قیام، اور دوسرے صنعتی انقلاب۔ موجودہ زمانے کی قومیت کا نظریہ ہم کو انھیں قومی ریاستوں کی ترقی اور بقا کی کوششوں میں ملتا ہے۔ قومیت کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے لیکن عام تعریف یہ کی جاتی ہے کہ قومیت ایک خاص جغرافیائی حد بندی کے اندر اس خطہ کے لوگوں کا آپس میں خیال و عمل کی یکسانی اور یک رنگی پیدا کرنا ہے۔ اس یکسانی سے جو ریاست بنےگی وہ قومی ریاست ہوگی اور وہ اپنی حدود کے اندر کامل طور پر خود مختار ہوگی۔

انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب بدنظمی پھیلی تو نپولین نے بڑی ہوشیاری سے تمام قوتوں کو سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد فرانس کے تخت پر قبضہ کر بیٹھا۔ اس زمانے میں اس کی برابر یہ کوشش رہی کہ فرانس کی کھوئی ہوئی طاقت کو از سر نو حاصل کیا جائے اور یورپ پر فرانس کا سکہ دوبارہ بٹھایا جائے۔ نپولین کے اس فعل سے یورپ کی دوسری قوموں میں غم و غصہ کا جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ لوگ جوابی کارروائی پر تیار ہو گئے۔ منجملہ اور کئی چیزوں کے، اس جوابی کارروائی نے بعد کو قومیت کا رنگ پکڑا جس سے آپس میں دشمنی اور رقابت کی آگ اور تیز ہو گئی۔ یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ اٹلی نے اپنے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنا شروع کیا اور مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر آخر کار ایک قومی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں ایک نیا فلسفہ تعلیم رائج ہوا جس سے جرمنی کی مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملا کر جرمنی قوم کی یک رنگی اور وحدت پر زور دیا جانے لگا۔ ساتھ ہی وہ تمام تدبیریں سوچی جانے لگیں جو رکاوٹوں کو ہٹا کر ایک واحد جرمن قوم کے بننے میں مدد دیں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان سے ایک دوسرے قسم کے انقلاب کی لہر اٹھی جو قومیت

کی طرح رفتہ رفتہ یورپ کے تمام ملکوں پر کم وبیش پھیل گئی۔ یہ صنعتی انقلاب کی لہر تھی جس نے سماج کے بہت سے پرانے بندھنوں کو توڑ دیا اور بہت سے نئے رشتے پیدا کر دئیے۔ بھاپ سے چلنے والا انجن ایجاد ہوا۔ پھر اس کی مدد سے بہت سے تپلی گھر بن گئے۔ لوہے کے بڑے بڑے کارخانے کھلے اور ریل اور جہاز خشکی اور پانی پر سفر کرنے لگے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان جو اپنا بیکار وقت چوپالوں میں بیٹھ کر کھیل تماشا یا گپوں میں گزارتے تھے رفتہ رفتہ مزدور بن گئے اور کارخانہ کی سیٹی اور انجن کی بھک بھک کے منتظر رہنے لگے۔ ان نئے نئے طریقوں سے دولت کی پیدائش میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

انیسویں صدی میں ساٹھ ستر سال کے اندر یہ صنعتی انقلاب انگلستان سے نکل کر براعظم یورپ پر اپنا اثر دکھانے لگا۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد فرانس میں ریلوں کا جال بچھنا شروع ہوا اور لوہے اور دوسری مصنوعات کے کارخانے کھلنے لگے۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد جرمنی اسی راستہ پر چلنے لگا اور اس صدی کے آخر میں تو روس اور جاپان بھی اسی صف میں شامل ہو گئے۔ جس طرح انقلاب فرانس اور نپولین کی بڑھتی ہوئی طاقت نے یورپ میں قومیت کی روح کو ابھارا تھا اسی طرح انگلستان سے جو صنعتی انقلاب کی لہر اٹھی اس نے قومیت کو معاشی رنگ میں رنگ دیا۔ قومیت نے جب صنعتی ترقی کا لبادہ اوڑھا تو وہ لوگ جو جنگ کے وقت پرانے قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے اب عمدہ قسم کی توپوں، بندوقوں، بموں اور دیگر آلات جنگ کا استعمال کرنے لگے۔ اس ہنگامہ سے قوموں میں جو نفسی نفسی کی کیفیت پہلے سے پیدا ہو گئی تھی اس کو تقویت پہنچی اور ہر ملک کے پیش نظر بس یہی خیال تھا کہ لڑائی کے وقت بچاؤ کی بہترین ترکیب کیا ہو گی اور وہ کون سا حربہ ہو گا جس سے دشمن کو زیر کر کے قومی وقار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے لوہے کے بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے، مصنوعات کو فروغ دینے اور آلات جنگ کے سستے اور بڑی تعداد میں بنانے کا راستہ دکھایا۔ فرانس اور جرمنی نے اس انقلاب سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو زک دینے کی پوری کوشش کی۔

سائنس کی ترقی نے صنعت کی دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا تھا اس کا اثر زراعت پر بھی پڑا۔ اول

تو وسائل آمد و رفت کی ترقی سے جو غلہ پہلے دوسرے ملکوں سے نہ آسکتا تھا، وہ اب یورپ کی منڈیوں میں آکر بکنے لگا۔ دوم سائنس کی مدد سے کھیتوں کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ زمین نے اپنی دولت اگلنی شروع کر دی۔ اس سے بعض ملکوں میں غلہ اور بعض میں مصنوعات کی کثرت نظر آنے لگی۔ شروع کے پچاس برسوں میں تو یورپ کے ملکوں میں تجارت کی خوب گرم بازاری رہی۔ جہاں جہاں مقامی محصول یا چنگی تھی وہ اٹھا دی گئی۔ اور بڑے بڑے ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھانے اور درآمد پر محصول کو گھٹانے کے لئے معاہدے بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ملک بالکل صنعتی بننے لگے اور بعض بالکل زراعت پیشہ۔ چنانچہ انگلستان میں کھیتی باڑی کا کام تقریباً ختم ہو گیا اور لوگ کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ برطانوی مصنوعات کی دنیا میں مانگ بڑھی کیونکہ اس وقت برطانیہ ہی صنعتی زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ گو امریکہ میں کسی قدر پابندیاں تھیں مگر دنیا کے بازار برطانیہ کے کارخانہ داروں کے واسطے کھلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سستی سے سستی کچی پیداوار خریدتے اور پھر ان کو کارخانوں میں بنا کر نفع کے ساتھ بیچ دیتے۔ یہ گویا آزاد تجارت کا اصول تھا جس کی رو سے جو چیز جہاں سستی سے سستی ملے وہاں سے لی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد تجارت کا یہ طریقہ اس صورت میں کہ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوں اور قومی و نسلی منافرت اور کمزور ملکوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہش نہ ہو بہت اچھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ بیماری انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

آزاد تجارت سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو ملک پکی چیزیں نہیں پیدا کر سکتے ان کو پکی چیزیں سستی مل جاتی ہیں۔ کچی چیزیں پیدا کرنے والے ملکوں کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بڑے بڑے کارخانے کھل جاتے ہیں اور ان میں وہ حسب ضرورت سامان جنگ بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس سے دوسری قوموں پر ان کا اثر و رعب قائم ہوتا ہے اور لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ کچی پیداوار والے ملک بے بس ہو جاتے ہیں اور کسی آفت کے وقت بجائے اپنی طاقت کے دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جنگ کے وقت جب آمد و رفت کا سلسلہ کٹ جاتا ہے تو صنعتی ملک والوں کو بھی فاقہ کشی کا خطرہ ہوتا ہے۔

آزاد تجارت کا اصول تمام دنیا کو ایک بڑی منڈی تصور کرتا ہے اور کسی قسم کی انسانی پابندی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس طرز کا سب سے بڑا مفکر انگلستان کا مشہور معاشی آدم اسمتھ گزرا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ذاتی طور پر ہر شخص اپنا نفع نقصان پہچانتا ہے اس لئے ہر شخص کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے نفع کی خاطر تجارت کرے۔ اس صورت میں مقابلہ سخت تو ہوگا لیکن نفع وہی کمائے گا جو اچھے سامان پیدا کرے گا۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے ریاست کو آزاد تجارت میں کبھی دخل نہ دینا چاہیئے کیونکہ دخل اندازی سے دولت کی پیدائش میں جو تجارت کا عین مقصد ہے، کمی ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے معاشیات کے ماہروں نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سب سے مشہور جرمنی کا معاشی فریڈرک لسٹ (FREDERICK LIST) ہے۔ لسٹ کا خیال ہے کہ ہر قسم کی معاشی تحریک کو اول ملک اور قوم سے وابستہ ہونا چاہیئے اور اس کا مقصد بجائے دولت کی افزائش کے ملک اور قوم کی ترقی ہونا چاہیئے۔ آدم اسمتھ کی طرح وہ بھی آزاد تجارت کا قائل ہے مگر کہتا ہے کہ آزاد تجارت اس وقت ہو جب تمام ملکوں میں مقابلہ کی طاقت یکساں طور پر پیدا ہو جائے۔ اگر ایک ملک قدرتاً کمزور ہے اور اس میں معاشی ذرائع کم ہیں تو وہ مضبوط اور معاشی ذرائع رکھنے والے ملک کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اور تباہ ہو جائے گا۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے وہ بیرونی تجارت پر پابندی عائد کرنے کے حق میں ہے تاکہ اس پابندی کے سایہ میں ملک معاشی ترقی کر سکے اور جب کمزوری دور ہو جائے تو آزاد تجارت قائم ہو جائے۔ آدم اسمتھ اور لسٹ میں فرق یہ ہے کہ آدم اسمتھ تمام دنیا کو ایک ہی تجارتی حلقہ شمار کرتا ہے اور مضبوط اور کمزور ملکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ برخلاف اس کے لسٹ قوموں کی معاشی ترقی کی بنیاد ان کی ذاتی حیثیت اور ان کی مخصوص ملکی کیفیت پر رکھتا ہے تاکہ جب سب قومیں اپنی اپنی جگہ ترقی کر لیں تو ان میں اتحاد ہو سکے۔

لسٹ نے اپنی کتاب "علم المعیشت کا قومی نظام" ۱۸۴۱ء میں شائع کی اور تھوڑے دنوں بعد جرمنی کو اس کی صداقت کا احساس ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب

یورپ میں غلہ سستا ہونے لگا تو جو ملک غلہ سستا نہیں پیدا کر سکتے تھے ان کو بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔کسان بھوکوں مرنے لگے۔کھیت ویران ہو گئے کیونکہ بازار میں دام کم ہو جانے سے کسان کھیتی چھوڑ کر دوسرے پیشوں میں لگ گئے۔ان کسانوں کی روزی کا معاملہ بہت سخت تھا خاص کر ان ملکوں کے لئے تو اور بھی سخت تھا جہاں فوجی بھرتی کا دار و مدار کسانوں پر تھا۔جرمنی اور فرانس مدتوں سے ایک دوسرے کے حریف چلے آتے تھے اور ان کی فوجوں میں سپاہی یہی کسانوں کے لڑکے ہوتے تھے اس لئے یہ دونوں ملک کسی طرح بھی آزاد تجارت پر چل کر کسانوں کی تباہی برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ آزاد تجارت کو ختم کرنے کے لئے پہلا قدم جرمنی نے اٹھایا اور یہ قدم جیسا کہ ظاہر ہے محض معاشی غرض سے نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ اس میں فوجی اور سیاسی غرض بھی چھپی ہوئی تھی۔یہ گویا معاشی قومیت کی ابتدا تھی۔سنئے ذوق کے ایک شعر میں عشق اور تجارت کو کس طرح نبھایا گیا ہے۔کہتے ہیں:

اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

تجارت میں نقصان کا افسوس اور پھر دل کو بازار سے اٹھا لینا کیا چیز ہے؟ ذوق کا یہ فعل بالکل معاشی قومیت ہی کے انداز میں تو ہے جس کا اشارہ انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

بیرونی تجارت پر محصول لگا کر پابندی عائد کی جاتی ہے۔یہ محصول دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک محصول تو وہ ہوتا ہے جو صرف ملک کے بجٹ میں آمدنی بڑھانے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اس کی شرح بہت معمولی ہوتی ہے۔دوسرا محصول وہ ہوتا ہے جو ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور نئی نئی صنعتوں کو قائم کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے۔اس کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں تو سو فی صدی سے بھی اوپر جاتی ہے تاکہ کسی خاص چیز کا داخلہ ملک میں رفتہ رفتہ کم ہو جائے۔فرانس اور جرمنی کی ۱۸۷۰ء والی لڑائی نے دونوں ملکوں میں فولاد کے کارخانوں کی اہمیت بہت بڑھا دی اور ان کارخانوں کی ترقی کے ذریعے سوچے جانے لگے۔۱۸۷۹ء میں جرمنی میں پہلے پہل بسمارک کی تحریک سے ایک نیا قانون منظور ہوا جس کی رو سے باہر سے آنے والے غلہ اور تمام سامان تجارت پر محصول لگا دیا گیا۔دو برس بعد فرانس میں بھی ایسا ہی محصول جاری

ہوا یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ ۱۹۱۰ء تک سوائے انگلستان کے یورپ کے تمام بڑے بڑے ملکوں نے درآمد پر حفاظتی محصول لگا کر آزاد تجارت کو ختم کر دیا۔ انگلستان جو آزاد تجارت کا قلعہ سمجھا جاتا تھا وہاں بھی تحریک ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں سیاسی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں تقریباً ہر ملک کی یہی کوشش رہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی وقار اور جنگی قوت کو بڑھائے اور دنیا کے بازاروں پر قبضہ حاصل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ اس کوشش نے پرانی رقابتوں کو خوب بھڑکایا جس کا نتیجہ جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جنگ عظیم نے رہی سہی آزاد تجارت کو ختم کر دیا جنگ کے زمانہ میں تمام ملکوں نے اپنی پرانی صنعتوں کو ترقی دی اور بعض نئی صنعتیں قائم کیں۔ جنگ کے بعد اپنی ترقی یافتہ صنعتوں کی حفاظت کے لئے ہر ملک میں محصول درآمد پر اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۱۹ء کے بعد سے تو دنیا میں ہر طرف حفاظتی محصولوں کی اونچی اونچی دیواریں نظر آتی ہیں جنہوں نے تجارت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ خود برطانیہ میں ۱۹۲۲ء میں قانون تحفظ صنعت منظور ہوا لیکن اس تجارت کی بندش سے دنیا کے لوگ تنگ آ گئے مگر کوئی ملک پہلے محصول کم کرنے کو تیار نہ تھا بہرحال اس حالت کو دور کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ ابھی یہی گو مگو کا عالم تھا کہ ۱۹۲۹ء میں معاشی بدحالی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سے حفاظتی محصولوں میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ ہر ملک ایک تجارتی حصار کے اندر بند ہے البتہ کہیں کہیں چند ملک آپس میں تجارتی معاہدہ کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے مال پر رعایتیں کرتے ہیں۔ اس سے محصول میں کمی تو ضرور ہوئی مگر برائے نام۔ ان حالات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں آزاد تجارت کا دور شاید اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

یہ تو آپ نے دنیا کی تجارت کا حال سنا۔ اب ذرا ہندوستان کی بیرونی تجارت کا حال سنئے۔

۱۸۵۸ء میں ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی سے نکل کر برطانوی حکومت کے قبضہ میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگلستان میں ہر طرف آزاد تجارت کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ اس کا اثر ہندوستان کی

تجارت پر بھی پڑا۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے ہندوستان کی بیرونی تجارت آزاد تھی البتہ بعض چیزوں پر برائے نام محصول آمدنی کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حکومت کو کافی رقم خرچ کرنا پڑی بجٹ کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۵۹ء میں سوتی کپڑوں پر محصول درآمد ۵ فی صدی سے بڑھا کر ۱۰ فی صدی کر دیا گیا لیکن تین برس بعد یہ گھٹا کر پھر ۵ فی صدی کر دیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ ۵ فی صدی محصول بھی اٹھا دیا گیا اور برائے نام محصول نمک، شراب، اسلحہ اور افیون پر رہ گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد برما میں لڑائی چھڑ گئی اور سرحد پر بھی فوج کشی ہوئی جس سے حکومت کو کافی خرچ برداشت کرنا پڑا اور روپیہ سال بہ سال بڑھتا گیا تا آنکہ ۱۸۹۴ء کے بجٹ میں ۳ ½ کروڑ کا گھاٹا ہوا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے سوائے سوتی کپڑوں کے تمام اشیاء درآمد پر ۵ فی صدی کا عام محصول لگا دیا لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتی کپڑے پر بھی ۵ فی صدی محصول لگانا پڑا۔ اگر حکومت نے ساتھ ہی دیسی ملوں کے مال پر بھی ۵ فی صدی کا ٹیکس لگایا جو دو برس بعد گھٹا کر ۳ ½ فی صدی کر دیا گیا یہ صورت جنگ عظیم تک جاری رہی۔ جنگ کے زمانہ میں بیرونی وسائل آمد و رفت کے کم ہو جانے سے ہندوستانی صنعت و حرفت کو کافی ترقی ہوئی۔ بہت سی نئی نئی صنعتیں کھل گئیں اور پرانی صنعتیں چمک اٹھیں۔ کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ۱۶ء میں عام محصول درآمد کی شرح بڑھا ۷½ فی صدی کر دی گئی اور چھ برس بعد جب مزید آمدنی کی ضرورت ہوئی تو یہ شرح ۱۵ تک پہنچ گئی۔

اب تک ہندوستان آزاد تجارت کے اصول پر چلتا رہا۔ مگر جنگ نے جو سبق دیا اس سے معلوم ہوا کہ صنعت کی ترقی ازبس ضروری ہے۔ ۲۲ء میں حکومت نے انڈین فسکل کمیشن مقرر کیا اور اس سے ہندوستانی صنعت، تجارت اور اس کی حفاظت کے لئے رائے طلب کی۔ کمیشن نے بیرونی تجارت کو محفوظ اور محصول درآمد میں موثر اضافہ کا مشورہ دیا اور بتایا کہ ایک ٹیرف بورڈ قائم کیا جائے جس کا فرض یہ ہو کہ وہ ہر اس صنعت کی تحقیقات کرے جس کو محفوظ کرنے کا مطالبہ کیا جائے اگر تحقیقات کے بعد ثابت ہو جائے کہ فلاں صنعت کو حفاظت کی ضرورت ہے تو ٹیرف بورڈ کی سفارش پر حکومت محصول بڑھا دے۔ حکومت نے کمیشن کی رپورٹ منظور کر لی۔ اب ہندوستان گویا آزاد

تجارت سے نکل کر محفوظ تجارت کے اصول پر چل رہا ہے۔

اس کمیشن کی سفارش کے مطابق جو ٹیرف بورڈ بنا اس کے سامنے لوہے، فولاد، روئی، شیشہ اور شکر وغیرہ کے کارخانوں کی تحقیقات اور ان کو محفوظ کرنے کے مطالبے ہوئے۔ تحقیقات کے بعد اس قسم کی باہر سے آنے والی چیزوں پر محصول بڑھا دئے گئے۔ اس کی وجہ سے تمام صنعتوں کو ترقی ہوئی خصوصاً شکر سازی نے تو بہت ترقی کی کروڑوں روپے کے بجائے اب صرف ساٹھ ستر ہزار کی باہر سے آتی ہے اور ملک اپنی ضرورت آپ پوری کر لیتا ہے اسی طرح لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کافی ترقی ہوئی۔ روئی کے کارخانوں کو تو کچھ لڑائی سے فائدہ ہوا اور کچھ حفاظتی محصول سے۔ آج کوئی ۳۵۰ سے اوپر ملیں چل رہی ہیں جو ساٹھ فی صدی سے زیادہ ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن صنعت کی ترقی میں ایک چیز کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اور وہ ہماری سودیشی تحریک ہے اس تحریک نے لوگوں کے رجحان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ دیسی کپڑے اور دیسی چیزوں کا استعمال بڑھ گیا۔ جس سے ملکی صنعت کو بہت فروغ ہوا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سنہ ۱۹۲۹ء کی معاشی بدحالی نے بین الاقوامی تجارت کو بہت نقصان پہونچایا۔ اس نقصان کو کم کرنے کے لئے سنہ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے اوٹاوا میں ایک تجارتی معاہدہ مرتب کیا جس میں ہندوستان، برطانیہ اور برطانوی نوآبادیاں شریک تھے۔ اس معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ اور برطانوی شاہنشاہی کے تابع جو ملک ہیں ان کی آپس کی تجارت کو بڑھایا جائے مثلاً اجنبی ملکوں سے مال کے مقابلہ میں ان ملکوں میں ایک دوسرے کا مال کم محصول پر داخل ہو سکے گا۔ اس رعایت سے بعض ملکوں کی تجارت کو کسی قدر فائدہ ضرور ہوا۔ ہندوستان میں اس معاہدہ کی رو سے برطانوی مال کم محصول پر آتا ہے اور اسی طرح ہندوستان کے مال کو انگلستان میں بہ نسبت غیر ملکوں کے ترجیح دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے محصول درآمد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر شرح ۱۵ فی صدی سے شروع ہو کر ۵۰ فی صدی تک پہنچتی ہے۔ اوٹاوا کا عہد نامہ اسمبلی نے رد کر دیا اور اب علیحدہ علیحدہ دوسرے ملکوں سے تجارتی معاہدہ کرنے کی رسم پڑ چکی ہے

جاپان سے ایک معاہدہ ہو چکا ہے اب انگلستان سے گفت وشنید ہو رہی ہے۔

آپ نے ہندوستان اور یورپ کی تجارتی واقعات کی ایک مختصر روداد سن لی۔ آج دنیا میں چیزوں کی کمی نہیں۔ اگر تجارت پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں اور لوگ انسانوں کی طرح برتاؤ کرنے لگیں تو دنیا کی کتنی آفتیں کم ہو جائیں مگر دنیا کا مرض بڑی حد تک سیاسی ہے اور جب تک سیاسی گتھی نہ سلجھ جائے معاشی سکون وآرام محال ہے۔

حکومت اور تعلیم

(از جناب سید وقار عظیم صاحب الہ آباد)

کسی ملک یا قوم کی تعلیم پر عموماً تین چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی حالت، اس کی سوسائٹی (جس کے وسیع مفہوم میں مذہبی جماعتیں، سیاسی تحریکیں اور خود حکومت سب چیزیں شامل ہیں) اور تیسرے وہاں کا کلچر۔ اقتصادی حالت اور ضرورت کے مطابق مختلف قسم کے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، ان کے درس، ان کا انتظام، ان کے مدرس اور ان کا سامان، سب چیزیں ایسی ہیں جن پر مالی حالت کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ سوسائٹی، اس سے بھی زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مذہب جو کچھ چاہتا ہے، سیاسی تحریکیں جس چیز کی طالب ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ خود حکومت جو کچھ پسند کرتی ہے، تعلیم کے ذریعہ سے وہی بچوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور انھیں ان خارجی اثرات کے رنگ میں ڈبو کر زمانہ کے مطابق نئی نئی شکلوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ ہاں کلچر، تو حقیقت میں تعلیم پر سب سے نمایاں اثر اسی کا ہونا چاہیئے۔ ملک کی قدیم روایات، گزری ہوئی نسلوں کے جمع کئے ہوئے بیش بہا تجربے، ان کے خیالات کے انمول خزانے، ادب، تاریخ، فلسفہ، طرز معاشرت، رفتار و گفتار کے طریقے، اچھائیوں اور برائیوں کا معیار، ان سب چیزوں کی گہری رنگ آمیزی، ملک اور قوم کے تعلیمی نصاب اور نظام پر ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ پہلی دو چیزیں خارجی ہیں اور تیسری داخلی۔ داخلی اثرات زیادہ دیرپا، مستحکم اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے زیر اثر آنے والا آدمی، ان سے مستقل طور پر متاثر ہوتا ہے۔

یہ بات محسوس سب نے کی لیکن اس پر جس طرح عمل ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہوا۔ اور قریب قریب ہر زمانہ میں تعلیم پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر رہا، وہ حکومت تھی۔ چونکہ حکومت، بظاہر ان تینوں چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہے۔ اس لئے اس نے اپنی ضرورتوں کو پیش نظر

رکھ کر تعلیم کے نصاب و نظام مرتب و منضبط کئے اور باقی اثرات غیر محسوس طریقے پر پس پشت پڑ گئے
نپولین کو تعلیم کی قوت کا احساس تھا جب اس نے کہا کہ ایک تعلیمی جماعت قائم کرنے سے میرا مقصد یہ ہے
کہ ملک کے سیاسی اور اخلاقی تخیل کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آ جائے۔" اور یہی احساس تھا جس نے
دنیا کے ہر ملک میں حکمرانوں کی رہبری کی انھوں نے اپنے اپنے مقصد کے مطابق تعلیم کے نظریئے بنائے
انھیں رائج کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور اس طرح اپنی سلطنتوں کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنا لیں۔
چین اور یونان میں مذہبی پیشواؤں اور خاندان کے بزرگوں کا دور دورہ تھا اس لئے تعلیم نے اس بات
پر زور دیا کہ دیوتاؤں اور گھر کے بڑے بوڑھوں کی پرستش کی جائے۔

یورپ میں مذہب کا دور دورہ ہوا تو تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ لوگوں کو مذہب اور اس کی
تبلیغ کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کا بنایا جائے۔ انگلستان کے موجودہ دور سے پہلے تعلیم کی مدد سے
قوم کے بچوں کو زیادہ مہذب اور سوشل بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ باہر سب کچھ اور اندر کچھ نہیں۔ اسی
طرح امریکہ اور جاپان کو لیجئے۔ جاپان نے تعلیم کی مدد سے اپنی قومی عظمت بڑھانے کی کوشش کی۔ امریکہ
نے اس سے قومی اتحاد و اتفاق کا سبق پڑھانا چاہا غرض یہ کہ ہر ملک اور ہر قوم کے سامنے ہمیشہ
سے مختلف مقاصد رہے اور ان سب کے حاصل کرنے میں ہر ایک نے تعلیم ہی سے سب سے
زیادہ مدد لی۔

لیکن جوں جوں تہذیب اور تمدن میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، حکومت اور
تعلیم کا رشتہ بھی زیادہ پیچیدہ اور اہم ہوتا جا رہا ہے۔ آزادی اور احساس کی ایک لہر ساری انسانی
دنیا پر دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اور اس لئے ہر ملک اور ہر قوم میں ہزاروں نئی نئی تحریکات
پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک تحریک دوسری پر غالب ہونا چاہتی ہے ایک قوت، دوسری کو دبانا چاہتی
ہے اور ان میں سے ہر ایک کا مقصد ہے کہ اس کا پروگرام اور لائحہ عمل دنیا میں سب سے آگے رہے یا
وہ امام ہو اور دوسرے مقتدی۔ وہ رہبر ہو اور دوسرے رہرو۔ اس لئے اس کشمکش کے زمانہ میں کسی
ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو ان سب پر غالب ہو۔ جس کے سامنے سب بظاہر اپنی اپنی راہوں

پر چلتے ہوئے معلوم ہوں، لیکن کوئی کسی دوسرے کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے اور ایک وقت ایسا آئے کہ سب کے سب جا کر ایک مرکز پر مل جائیں۔ راستے مختلف، لیکن منزل سب کی ایک۔ ان مختلف قوتوں کو یکجا کرنے والی سب سے بڑی قوت حکومت ہے۔ لیکن حکومت بھی مجبور ہے۔ صرف اس کی موجودگی، مخالف قوتوں کو ایک جگہ نہیں جمع کر سکتی۔ صرف اس کا ہونا ہی اسے سب سے بڑا نہیں بنا سکتا۔ اسے ضرورت ہے کسی ایسی سحر آفریں کشش کی جس کی مدد سے وہ سب کو اپنی طرف کھینچ لے۔ زور اور طاقت کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب اگر اس سے کام لیا جا سکتا ہے تو صرف اسی حالت میں جب دنیا غافل ہو۔ سوتے ہوؤں کو مار دینا آسان ہے، لیکن جاگتے ہوئے کی طرف قدم بڑھانا بھی دشوار۔ دنیا اب بیدار ہے، اس لئے جب کوئی حکومت صرف زور اور طاقت سے کام لینا چاہتی ہے تو پہلے فضا کو خمار آلود بنا دیتی ہے۔ لوگ اس نشے میں ڈوب کر غافل ہو جاتے ہیں اور ظالم کا داؤں چل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی حکومت خواہ وہ نرمی سے رعایا کو اپنا ہم خیال بنانا چاہے، خواہ سختی سے بغیر کسی بیرونی مدد کے ایسا نہیں کر سکتی۔ اور یہ مدد جتنی زیادہ تعلیم سے مل سکتی ہے کسی اور چیز سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے پیچیدہ نظام کو ضرورت ہے ایک زبردست طاقت کی جو مخالف قوتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دے، اور یہ زبردست طاقت ہے، حکومت اور دوسری طرف حکومت کو ضرورت ہے، کسی ایسے آلے کی جس کی مدد سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ یہ آلہ ہے تعلیم دنیا حکومت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی اور حکومت تعلیم کے بغیر

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت، تعلیم کے ذریعہ سے کسی محدود ذاتی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کا سوال ہی نہیں باقی رہا۔ کسی مقصد کو محدود اور ذاتی ہونے کے باوجود بھی کافی وسیع ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی رفتار بہت تیز ہے اور جو ملک یا قوم اس تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا، اسے دوسری قومیں کچلتی اور پامال کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ کسی کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ہر شخص کو خود اپنی حالت سنبھالنی مشکل ہے، پھر بھلا کسی دوسرے کی مدد کے کیا معنی۔ اس لئے اس مقابلہ کی دنیا میں ہر قوم کو اپنے ذاتی مقاصد کو بھی

اس حد تک وسیع بنانا پڑتا ہے کہ وہ قومی وقار اور عظمت کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکیں۔ مثال کے لئے جاپان، جرمنی، ترکی، اٹلی اور روس موجود ہیں۔ ہر ملک کے سیاسی اصول جداگانہ ہیں، دوسرے سیاسی نظام کی بنیاد، کہیں نازیت اور فاشیت پر ہے، کہیں اشتراکیت اور قومیت پر، اور کہیں صرف قومی وقار عظمت اور بیداری کے احساس پر۔ لیکن ان میں سے ہر ایک ایک لحاظ سے ہم خیال ہے اور وہ یہ کہ ہر ملک کو ایک بیدار، متحدہ اور باعمل قوم کی ضرورت ہے۔ ہر ملک اچھے شہری بنانا چاہتا ہے۔

اچھے شہری کا کیا مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کی بحث کرنے سے پہلے صرف ایک بات کا اندازہ کر لینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آج کل دنیا میں عموماً دو طرح کی حکومتیں ہیں — جمہوری یا شخصی۔ جمہوری حکومتوں میں، سلطنت کی باگ ڈور رعایا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ رعایا اپنے کچھ نمائندے چنتی ہے اور یہی نمایندے رعایا کی آواز بن کر ملکی اور قومی مفاد کے ہر معاملے کو، حکومت کی فضا میں پھیلاتے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے اور ملک میں خوش حالی رہتی ہے شخصی سلطنتوں میں، رعایا کی آواز نسبتاً دھیمی اور ہلکی ہوتی ہے۔ لیکن آمر یا شخصی حکمراں چونکہ اپنی سلطنت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے اس ہلکی آواز کا بھی اثر ہوتا ہے۔ کچھ اپنی سیاست کے جادو سے، اور کچھ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرکے، وہ انہیں اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اسے کچھ ایسے منتر یاد ہوتے ہیں کہ ان کے پھونکتے ہی سب اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور حکومت کا پہیہ بغیر کسی روک ٹوک کے چلتا رہتا ہے۔ چونکہ تعلیم کے بغیر نہ جمہوری حکومتوں کا کام نکل سکتا ہے، نہ شخصی حکومتوں کا، اس لئے اس کا دور دورہ دونوں جگہ رہتا ہے دونوں کو اچھے شہری پیدا کرنے کی دھن ہوتی ہے لیکن یہ کہ دونوں کے نزدیک اچھے شہری کون ہیں؟ یہ بالکل اضافی چیز ہے۔

رسل (RUSSEL.) نے اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر شہریوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک شہری وہ جو جمہوری حکومتوں میں ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو شخصی حکومتوں میں۔ پہلے قسم کے شہری کو رسل نے تخلیقی (CREATIVE.) شہری کہا ہے اور دوسرے قسم کے شہری کو میکانک (mechanic) اس

کا خیال ہے کہ ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کم سے کم پانچ خوبیاں ہوں۔ فکر کی قوت، لیڈر بننے کی صلاحیت، ڈسپلن، شرکت عمل کا احساس اور رواداری۔ اس لئے کہ جمہوری حکومتوں میں ملک اور قوم کی بھلائی، ترقی اور عظمت میں ہر شخص کو الگ الگ اور اجتماعی حیثیت سے حصہ لینے کی ضرورت ہے ہر شخص اپنے مخصوص فکر اور عمل سے قوم کی مجموعی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ یہ بات پہلی دو صفتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ انفرادی حیثیت سے فکر اور عمل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود بھی کوئی شخص ملک اور قوم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اس لئے اسے ایک منظم جماعت کا فرد ہونا چاہئے وہ جو کچھ کرے صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پورے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے۔ اس کے لئے تیسری اور چوتھی صفت ضروری ہے۔ اور اس سے زیادہ ضرورت ہے رواداری کی۔ چونکہ ہر شخص کو خیال اور عمل کی آزادی حاصل ہے اس لئے ہر شخص میں دوسرے کے خیال کو صبر سے سننے اور اس پر غور کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ دوسرے کے خیال، نقطۂ نظر اور جذبہ کا احترام بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر شرکت عمل ممکن نہیں۔

دوسرے قسم کے شہری جنہیں شخصی حکومتوں کا شہری بننے کی تعلیم دی جاتی ہے، اس شہری سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ چونکہ آمر (DICTATOR) کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی رعایا کا ہر شخص اس کے بنائے اصول اور قانون کو اپنے لئے ایمان سمجھے، اور اس پر بغیر چون و چرا کے عامل ہو، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام شہری خیال اور جذبہ میں یکساں ہو — جو کچھ ان سے کہا جائے، اسے وہ اپنی قومی اور ملکی بہبودی سمجھ کر اس پر عامل ہوں۔ ان کا ہر عمل، اسی مخصوص ذہنیت کے رنگ میں ڈوب کر نکلے۔ ان کے لئے آمر نے ایک سانچہ بنا دیا ہے اور آدمی جب اس سانچے میں ڈھل کر باہر نکلتا ہے، تو وہ شہری کہے جانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس شہری کی حیثیت بالکل مشین کی سی ہے جو چلتی ہے تو ایک خاص انداز اور رفتار سے اور اگر نہیں چلتی۔ تو بالکل نہیں۔ اس میں اپنی گردش کو بدلنے کی صلاحیت نہیں۔ اسی طرح یہ شہری جس سانچے میں ڈھال دیا گیا، اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس میں آزادیٔ فکر و عمل کا جذبہ نہیں ہوتا، وہ لیڈر بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ اسے بدلتی

ہوئی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلنا نہیں آتا۔ اس کی فطرت میں لچک نہیں۔ ڈسپلن اور شرکتِ عمل اس کے لئے بھی ضروری ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ کہ جمہوری اور شخصی دونوں حکومتیں اچھے شہری بنانا چاہتی ہیں اور دونوں کے نزدیک "شہریت" کا معیار جداگانہ ہے۔ تعلیم دونوں جگہ دو مختلف فرائض انجام دیتی ہے۔ 'تخلیقی شہری' بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور مشین نما شہری بھی۔ تعلیم سے دو مختلف موقعوں پر دو الگ الگ کام لئے گئے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا تقاضا بھی یہی ہے' جو جمہوری حکومتوں کا۔ اس لئے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فطرت کے قریب ہونا چاہیئے۔ فطرت انسان کی بہترین معلّم ہے تہذیب کے جال کے پھیلنے سے پہلے' بچہ فطرت ہی کی گود میں تعلیم پاتا تھا۔ وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر' انھیں چھو کر' ان میں شریک ہو کر' فکر اور عمل کی آزادی کے ساتھ' ان سے نئے نئے سبق سیکھتا اور اپنے تجربات کی دنیا کو وسیع کرتا رہتا تھا۔ اس لئے ضرورت ہے اب بھی اسے فطرت کے اسی ماحول کی گود میں پالا جائے۔ تاکہ اس کی مخصوص فطرت زیادہ سے زیادہ ترقی کرے اور کائنات کے وسیع تنوع میں کوئی فرق نہ آئے۔ شخصی حکومتیں فطرت کے اس ماحول کو نظر انداز کرتی ہیں اور جمہوری حکومتوں میں غیر ارادی طور پر اسی پر عمل ہوتا ہے۔

لیکن فطرت صرف یہیں تک محدود نہیں۔ فطرت کا ایک مقصد ہے انسان کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی دینا۔ لیکن یہ انتہائی ترقی اصل میں اس جماعت یا سماج کی ضرورت کے لئے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ترقی کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان اپنی مخصوص صلاحیت کے مطابق اپنی جماعت' سماج یا قوم کی ترقی اور بہبودی میں حصہ لے۔ اس لئے تعلیم کو اس خاص جماعت کی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیئے' جس میں انسان رہتا ہے۔ ہر جماعت یا سماج کا کلچر' دوسری سماج سے مختلف ہے۔ یہ ایک دو سال میں نہیں بن جاتا۔ بلکہ کلچر مجموعہ ہے' ان تمام تجربات کا جو نسلاً بعد نسلاً کسی قوم تک پہنچتے ہیں۔ ادب' تاریخ' فلسفہ' رسم و رواج' تہذیب و تمدن' کھانا پہنا' رہنا سہنا' بول چال' زبان اور فن' اور ان سب چیزوں کے مختلف نظریے مل کر کسی خاص جماعت کا کلچر کہے جاتے ہیں

اور یہ غیر محسوس طریقے پر انسان کے خمیر کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس لئے جو تعلیم فطرت سے قریب ہونا چاہتی ہے' اس کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ وہ قوم کے کلچر اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہو۔ صحیح تعلیم وہی ہے جو ہماری داخلی فطرت کے مطابق ہو' جس میں ایسے رجحانات ہوں جو ہمارے خمیر میں بسی اور رچی ہوئی چیزوں سے مل کر بنے ہوں۔

اس لئے فطری تعلیم کے حقیقت میں تین جزو ہوئے۔ انفرادی۔ سماجی اور مثالی انفرادی نقطۂ نظر سے انسان کی فطرت کے مطابق اس کی انتہائی ترقی۔ سماجی نقطۂ نظر سے کسی مخصوص جماعت کی ضرورتوں کا لحاظ' اور مثالی نقطۂ نظر سے اس جماعت کے کلچر کا عکس۔ یہ تینوں چیزیں ہر اچھی تعلیم کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے ہر حکومت کا فرض ہے کہ تعلیم کو ان تینوں حیثیتوں سے مکمل بنائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا' تعلیم نہ افراد کے لئے کام کی ہو سکتی ہے اور نہ سماج' ملک اور قوم کے لئے۔ ملکی تعلیم کے نصاب کی تدوین اور نظام کی ترتیب کرتے وقت ہر حکومت کو یہ تین سوال پیش نظر رکھنے چاہئیں کہ۔

۱۔ تعلیم پڑھنے والوں کو شخصی اور انفرادی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ترقی دے۔

۲۔ وہ جماعت یا سماج کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔

۳۔ وہ سماج کے کلچر اور روایات کی آئینہ دار ہو۔

ان اصول کے مطابق نصاب کی ترتیب کے بعد حکومت کو اس کی تفصیلات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملکی اور قومی ترقی ہو اور یہ بغیر اچھی تعلیم کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ تعلیم کو ہر حیثیت سے بہتر بنائے۔ اور اس کے ایسے اصول بنا دے جن پر عمل کرنے کے بعد' بہترین نتائج کی امید ہو سکے۔ مدرسے اپنی ضرورتوں کے مطابق تفصیلوں میں جو تبدیلیاں چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف اصول بنا دینے ہی سے حکومت کا کام ختم نہیں ہوتا۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ ان اصولوں اور ضروریات کے مطابق ملک میں کافی مدرسے ہیں یا نہیں' انہیں کافی کامیابی سے چلانے کے لئے سرمایہ موجود ہے یا نہیں اور ان صورتوں میں مقررہ اصول پر عامل ہو سکتے ہیں

یا نہیں۔ اس لیے حکومت کو مدرسوں کی مالی امداد بھی بڑی حد تک اپنے ذمہ لینی پڑے گی۔

بظاہر مشورے دینا آسان ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان اصولوں کے مطابق ہم کس حد تک تعلیم دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یوں تو ہر کام میں اور ہر قدم پر مختلف قسم کی دقتوں کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن سوال ان دقتوں کے حل کرنے کا ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک جو تعلیم جاری ہے وہ شاید فطرت کے تینوں اصول کے مطابق نہیں۔ نہ اس میں افراد کو شخصی ترقی حاصل کرنے کا موقع ہے نہ اس میں سماج کی ضرورتوں کا حل ہے، اور نہ وہ ہمارے کلچر کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے یقینی طور پر ہمیں اس نظام میں شدید انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی احساس کے بعد ہمارا دشوار کام شروع ہوتا ہے۔

عوام میں تعلیمی دلچسپی، اور اس کے بلند مقاصد کا صحیح احساس پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انھیں تھوڑی بہت تعلیم دی جائے۔ اس لئے حکومتوں کے سامنے اس وقت سب سے پہلا یہ سوال ہونا چاہیے کہ کس طرح ملک کا بچہ بچہ پڑھا لکھا ہو جائے۔ شکر یہ ہے کہ اس خیال نے اب عملی شکل اختیار کرنی شروع کر دی ہے اور ملک کی مقتدر تحریکیں اب جہالت کو مٹانے کا بیڑا اٹھا چکی ہیں۔ حکومت اس سلسلے میں بہت مدد کر سکتی ہے۔ اسے چاہیے کہ ملک بھر میں لازمی تعلیم کا قانون نافذ کر دے اور ہر شخص کو بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ ملک کے بچے بچے کو تعلیم اور اس کی ضرورت سے آگاہ کر دینے کے بعد دوسرے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

پہلے تو یہ کہ تعلیم ایسی ہو جس میں افراد کو اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی کا موقع ملے اس قسم کی تعلیم صرف وہ تعلیم ہو سکتی ہے جہاں بچے صرف کتابوں سے پڑھ کر نہیں، بلکہ "کچھ کر کے" سیکھیں مدرسے کی فضا آزاد ہو۔ ہر بچے کی فکر کو عمل کا موقع دیا جائے۔ وہ سب کے ساتھ مل کر کام کرے۔ ایثار، محبت، شرکت عمل، رواداری، اپنی جماعت کی محبت، اور اس کی عزت کا احساس اس میں پیدا ہو۔ یہ مقصد صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ہم مدرسوں کو بچوں کی ایک چھوٹی سی دنیا بنا دیں جہاں انھیں اپنی دلچسپی کے مطابق ہر چیز سیکھنے ہر کام میں حصہ لینے، اور ہر جذبہ کے احساس و اظہار

کا موقع ملے۔ اس طرح کے مدرسے یورپ اور امریکہ میں کافی ہیں اور ان سے نکلنے والے بچے انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے قوم اور ملک کے سرمایۂ ناز رکن بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس طرح مدرسوں سے دوسرا مقصد خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہر بچہ وہ کام سیکھے گا، جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے اور اس لئے ذاتی شخصیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ، اس میں ملک اور قوم کا ایک مفید رکن بننے کی قوت بھی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اپنے مخصوص کام سے سوسائٹی کے نظام زندگی میں ایک خاص حصہ لے گا۔ اس کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی اور سوسائٹی بھی اس کے کاموں سے فائدہ اٹھائے گی۔ چونکہ ہر شخص اپنی دلچسپی کا کام کرے گا۔ اس لئے کام میں اس کا جی لگے گا۔ اس کی زندگی بھی اچھی ہوگی اور کام بھی اچھے سے اچھا ہو سکے گا۔ سوسائٹی کے اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا ہر فرد اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن اور خوش حال ہے اور دوسرے یہ کہ ہر کام جو ہو رہا ہے، اسے اس کا ماہر کر رہا ہے اس لئے کام کی اچھائی پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

اب رہا تیسرا سوال کلچر کا۔ کلچر کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا کلچر مختلف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک ہی جماعت میں کچھ پڑھے لکھے اور زیادہ بے پڑھے لکھے لوگوں کے معاشرت، تمدن اور نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے تعلیم کی بنیاد کلچر پر کس طرح رکھی جا سکتی ہے؟ بظاہر یہ سوال بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ کلچر کے اختلافات ہمیں اپنے زمانہ میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ زمانہ گذر جانے کے بعد ان اختلافات میں سے ایسے حصے نکل جاتے ہیں، جن کا تعلق لوگوں کی چند وقتی ضروریات سے ہوتا ہے۔ اور ہر زمانے کی معاشرت کا ایک مستقل حصہ، آئندہ آنے والی نسلوں تک، اس عہد کے کلچر کی صورت میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اب سے ایک صدی پہلے بھی کلچر کے یہاں اختلافات تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اختلافات کے غیر مستقل جزو مٹتے گئے اور ان کے مستقل حصے باقی رہ کر ہم تک پہنچے۔ یہی حال موجودہ کلچر کا ہوگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علم و جہل کا جو فرق اس وقت اتنا نمایاں ہے، اسے کوشش کر کے رفتہ رفتہ

مٹایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد خود بخود ملک میں کلچر کے اختلافات میں کمی ہوتی جائے گی۔ بلکہ لوگوں کو ہم مذاق بنا دینے کے بعد، معاشرت اور زندگی میں بھی انھیں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب کر دے گا۔ اس لئے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے عمل اور امید کی ——— حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں آنے کے بعد دشواریاں، خود بخود آسانیاں ہوجائیں گی۔

ہندوستانی صنعتوں کو تحفظ کی ضرورت

(از جناب عبداللہ زمانی ایرانی صاحب متعلم جامعہ)

صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے | کسی شے کو نقصان پہنچانے والی شے سے بچانا تحفظ کہلاتا ہے جماعتی زندگی میں عدل وانصاف کو رواج دینے کے لئے انسان مجبور ہوا کہ اپنے اوپر اور اپنی جماعت کے دوسرے افراد پر باہمی تحفظ کی غرض سے کچھ پابندیاں عاید کرے۔ یعنی اس نے ریاست ایجاد کی اور ریاست کو حق دیا کہ اگر کوئی اس کے حق کو چھیننا چاہے یا وہ خود دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا چاہے تو سزا پائے۔ یہ تو سیاسی تحفظ کا عام مفہوم ہوا۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے روسو جیسا فطری آزادی کا حامی فلسفی بھی اس بات کے ماننے پر مجبور ہوا تھا کہ چونکہ بعض انسان دوسروں کی بہ نسبت ضعیف ہوتے ہیں اس لئے ان کا تحفظ ضروری ہے اور اسی تحفظ کے لئے ریاست وجود میں آتی ہے۔ بالکل یہی حالت صنعتوں کی بھی ہے۔ بعض ممالک کی صنعتیں ترقی پر ہیں ان کے لئے خام پیداوریں معدنیات اور دیگر لوازم صنعت بکثرت ہیں اور ایسے زمانے میں ترقی کی ایک خاص منزل تک پہنچ بھی چکی ہیں جب کہ ان کا کوئی رقیب نہ تھا۔ اب اگر کوئی ملک صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تو جب تک طاقتور اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے مقابلے سے اس کا تحفظ نہ کیا جائے تو وہ ترقی نہ کرسکے گا۔ اس لئے حکومت مجبور ہوتی ہے کہ اس ملک کی صنعتوں کے تحفظ کا سامان کرے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ تحفظ کی تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ تحفظ کمزور ابتدائی صنعتوں کو قوی اور ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت سے بچانے کا نام ہے۔

تحفظ پر اعتراض | اوپر کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صنعتوں کے تحفظ کی کیوں ضرورت ہے مگر اس کے لئے کچھ تفصیل کی حاجت ہے۔ لیکن اس سے قبل تحفظ کے مخالفوں کا نقطہ نظر پیش کردینا زیادہ بہتر معلوم

ہوتا ہے۔ وہ دلائل جن پر وہ زیادہ زور دیا کرتے ہیں یہ ہیں۔

(۱) تحفظ سے داد و ستد کی کامل آزادی باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے محنت اور اصل ان جگہوں پر نہیں پہنچ سکتے جہاں کہ ان کی اشد ضرورت ہے۔ بلکہ جہاں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے وہاں ممکن ہے کہ یہ بہت کم ہوں اور جہاں کم ضرورت ہے وہاں بہت زیادہ تعداد میں ہوں۔ اس لئے یہ ایک غیر فطری اور ناپسندیدہ رویہ ہے کہ ایسی پابندی عائد کی جائے جس سے فطری توازن تجارت بگڑ جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے دنیا کی پیداوار گھٹ جائے گی اور دولت بھی کم ہو جائے گی۔

(۲) یہ کہ عدم تحفظ کی صورت میں ہر شخص آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنی قوتوں کو کام میں لا کر اپنا سامان تو مہنگے سے مہنگا بیچ ڈالے اور دوسروں کا سستے سے سستا خریدے اور اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی ہمت بلند ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرے گا اور اپنے دل و دماغ سے کام لے کر ہر ہر لحہ نئی نئی صورتیں اور راستے تلاش و ایجاد کرے گا تاکہ اپنی چیز زیادہ سے زیادہ دلکش بنائے اور دوسروں کی چیزیں سستے سے سستے داموں پر حاصل کرلے۔ اس سے نہ صرف دنیا کی مجموعی پیداوار اور دولت بڑھے گی بلکہ اشیا کی نفاست اور گوناگونی میں بھی ترقی ہوگی اور خریدار اور فروشندہ کا حوصلہ بھی بڑھ جائے گا اور ہر ملک اس طرح پر انتہائی ترقی حاصل کر سکے گا۔

(۳) انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ خود غرضی ایک بہیانہ اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس لئے تحفظ اس اخلاقی زاویۂ فکر سے بھی کوئی پسندیدہ اور بہترین چیز نہیں ہے۔

(۴) تحفظ درحقیقت تحفظ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے صنعت کی بعض قسموں کو تو فائدہ پہنچتا ہے اور بعض کو نقصان۔ یعنی تحفظ کا مقصد صرف ایک ناپسندیدہ حیثیت سے پورا ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے بالکل مضر اور نقصان رساں ہے۔

(۵) اس سے صنعتی کارخانوں میں جو جماعتیں کام کر رہی ہیں ان کی اخلاقی حالت پر برا اثر پڑتا ہے۔

(۶) اس سے سرمایہ دار تو مستفید ہوتے ہیں لیکن غریب طبقہ کو جو کہ ان صناعوں کی اشیا صرف کرتا ہے نقصان پہنچتا ہے۔

(۷) چونکہ تحفظ کے لئے حکومت کو صنعت اور تجارت میں دخل دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اس سے بسا اوقات برے سیاسی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۸) اس سے قوموں میں ایک قسم کی دشمنی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(۹) تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا مشکل اور ملک کی سیاسی و معاشی حالت پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔

تحفظ پر اعتراضات کا جواب | یہاں تک تو تحفظ کے مخالفین کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا اب اس سے پہلے کے ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا مختصر جواب دے دیا جائے۔

(۱) یہ کہ تحفظ سے محنت اور اصل اپنی فطری روانی سے رک جائے گی۔ اس لئے غلط ہے کہ عدم تحفظ کی صورت میں بھی اس کا نہ صرف امکان ہے بلکہ عملاً اس کا وجود پایا گیا ہے اور پایا جاتا ہے کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ملکوں کی پالیسئ تحفظ اختیار کرنے سے پہلے سب ملکوں کی محنت در اصل حسب ضرورت کام میں آئی ہے اور یا اپنی اپنی لیاقت کے برابر ہر ملک اپنی تجارت و صنعت کو ترقی دے سکا ہے؟ اس کا جواب نفی میں اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لئے ذرا بھی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(۲) یہ کہ ہر ملک یا ہر شخص کو آزادی ہو کہ اپنی اپنی چیزوں کو بہتر سے بہتر بنا کر بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت کرے اور سستے سے سستے سامان اپنے لئے فراہم کرے۔ یہ اعتراض بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ہم نے مثال دے کر بتایا ہے کہ بعض صنعتیں ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور جب تک موجودہ حالات ان کے لئے ناموافق ہیں اور انھیں

سہارا نہ مل جائے۔ کمزور انسان کی طرح قوی کے مقابلہ میں، ترقی یافتہ صنعتوں کے مقابلہ کی استعداد نہیں رکھتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اگر ان کو تحفظ نہ دیا جائے تو وہ بالکل ختم ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ حکومت اور تحفظ پر اعتماد کر کے ہمیشہ تحفظ ہی کے بل پر کھڑی رہنے کے قابل ہوں گی یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ یہ تحفظ تو ابتدائی کمزوری یا بیماری کی حالت میں ہر شے کے لئے ضروری ہے مثلاً انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کیا اس کو اس اندیشہ کی بنا پر سہارا نہیں دینا چاہیئے یا گود میں نہیں لینا چاہیئے یا اس کا تحفظ نہیں کرنا چاہیئے کہ آئندہ اپنا تحفظ خود نہ کر سکے گا اور ہمیشہ ماں کی گود اور خبرگیری کا محتاج رہے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح انسان نہ صرف حالت طفولیت میں ماں باپ کے سہارے کا محتاج ہے بلکہ کمزوری اور بیماری کی حالتوں میں بھی۔ اس طرح وہ صنعتیں بھی تحفظ کی محتاج ہوں گی جو اگرچہ وہ وجود میں عرصہ سے آچکی ہیں لیکن پست حالت میں ہیں۔

(۳) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی تحفظ اس لئے کوئی بری چیز نہیں ہے کہ کوئی ملک اپنی صنعتوں کو ترقی دے کر دوسروں کو ایسا کرنے سے نہیں روکتا۔ ہر ملک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تحفظ کو پسند کرے یا نہ کرے۔

(۴) یہ کہنا کہ تحفظ یافتہ صنعتوں کے حق میں اگر مفید ہے تو اس کے علاوہ دیگر صنعتوں کے حق میں مضر ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکومت کی نظر میں جن صنعتوں کو تحفظ نہ دینے سے تحفظ دادہ صنعتوں کے مقابلہ میں نقصان کا خطرہ ہو حکومت ان کو بھی تحفظ دیگی۔ اور اگر ایک ملک کی پالیسیٔ تحفظ سے دوسرے ملک کی صنعتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کا جواب اوپر دے دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بھی اپنی صنعتوں کو تحفظ دے کر ہر قسم کے نقصان سے بچا سکنے میں آزاد ہے۔

(۵) یہ کہ صناع طبقہ کے اخلاق پر تحفظ سے برا اثر پڑتا ہے اس کو کوئی باور نہیں کر سکتا۔ مثلاً کیا امریکہ والوں کے اخلاق جو کہ تحفظ میں انتہا پسند ہیں انگریزوں کے اخلاق سے جو کہ آزادیٔ تجارت میں انتہا پسند ہیں، پست ہیں؟

(۶) یہ کہ تحفظ سے سرمایہ دار کو فائدہ، اور غریب طبقہ کو نقصان پہنچے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یا حکومت خارجی رقابت اور نقصانات سے اپنی صنعت کو بچا سکتی ہے۔ غریب طبقہ کو سرمایہ دار کی دستبرد سے نہیں بچا سکتی؟ پھر یہ کہ تحفظ سے رعایا پر بہت بار پڑتا ہے؟ یہ قربانی وقتی ہے اور آئندہ چل کر جلد ہی اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

(۷) یہ کہ تحفظ سے سیاسی ناخوشگوار واقعات ونتائج پیدا ہوتے ہیں؟ یہ بھی ایک بے دلیل اعتراض ہے اب ساری دنیا میں تحفظ کا نظام جاری ہے یہاں تک کہ انگلستان سا علمبردار آزادی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے؛ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان تمام ممالک میں محض تحفظ کی وجہ سے سیاسی خلفشار یا خوشگوار نتائج پیدا ہوئے ہیں؟ اگر منطق سے کام لے کر اثبات میں کوئی جواب بھی دیا جائے تو کیا آزاد پالیسی سے کوئی ایسا سیاسی نتیجہ نہیں پیدا ہوتا ہے؟

(۸) قوموں میں اگر تحفظ کی وجہ سے دشمنی پیدا ہوتی ہے؛ تو اس کے جواب میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ متمولوں کے اپنی دولت کی حفاظت کرنے سے بھی چوروں کے دل میں ان کی نفرت پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان کو دوسروں کا مال چرانے اور غصب کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوموں سے اس لئے دشمنی پیدا کرے کہ انھوں نے اپنی دولت کے تحفظ کا سامان کیا ہے اور اس کی زیادتی سے اپنے مفاد کو بچانے کی کوشش کی ہے تو اس کا کیا علاج!

(۹) یہ کہ تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا قوم اور ملک کے لئے مضر ہوتا ہے اور ملک کے مالیات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، وغیرہ۔ یہ بھی ایک لایعنی اعتراض ہے اس لئے کہ تحفظ جب ہٹایا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو اور جب اس کی ضرورت باقی رہی تو ظاہر ہے کہ اس کے دور کرنے ہی میں ہر طرح کا فائدہ ہے۔ اور اس کا باقی رکھنا یا تو بے سود ہوگا یا نقصان رساں۔

<u>تحفظ کے فوائد</u> اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی ضرورت پر بحث کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان فوائد تحفظ کا ذکر کر دیا جائے جن کی وجہ سے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ہر ملک اس کا حامی نظر آتا ہے اور اسے نہ صرف مفید بلکہ ضروری سمجھتا ہے اور یہ فوائد موجودہ زمانے میں خاص

طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر دنیا کو آج ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔ اٹلی کا حبشہ پر قابض ہو جانا۔ اسپین کی یہ طول و طویل جنگ۔ جاپان و چین کا یہ میدان کارزار اور ابھی ابھی آسٹریا پر جرمنی کا یکایک قبضہ وغیرہ وغیرہ ایسے حالات ہیں جن کو کوئی محتاط حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی بلکہ اپنے مستقبل کے لئے معاشی، سیاسی اور دیگر قسم کے بچاؤ کا سامان اسے کرنا پڑے گا اور چونکہ آج کل جنگ کی سب سے بڑی وجہ۔ معاشی معاملات ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جنگ اس لئے ہوتی ہے کہ یا تو کسی ایسے ملک پر قبضہ کیا جائے جہاں معدنیات اور مواد خام کے ذخائر کافی موجود ہوں یا اس ملک کو اپنے کارخانہ جات کی مصنوعہ اشیا کے لئے بیع منڈی بنایا جا سکتا ہو۔ اس لئے تحفظ مصنوعات کا مسئلہ اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ یہاں اس بات کا بتانا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہمارا مقصد تحفظ سے صرف تحفظی محاصل برآمد عاید کرنا یا صنعتی کارخانوں کو مدد دینا نہیں بلکہ ان تمام ذرائع کو اختیار کرنا مراد ہے جن کو ملک کی صنعت کی ترقی کے لئے حکومت ضروری سمجھتی ہو مثلاً علاوہ تحفظی محاصل کے حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اشیائے درآمد کی مقدار محدود کر دے یا بعض چیزوں کو بالکل ممنوع قرار دے دے۔ وغیرہ تحفظ کے حامی اپنی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) جو صنعت ابھی وجود میں نہیں آئی ہے یا بالکل ابتدائی حالت میں ہے یا وجود میں تو عرصہ ہوا کہ آ چکی ہے مگر ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت کی وجہ سے خراب حالت میں ہے۔ ان سب کو تحفظ دینا لازمی ہے۔ تاکہ وہ تحفظ کے سہارے پر ترقی پا کر اپنے انتہائی نشو و نما کو پہنچ سکیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بلا تحفظ مقابلہ کی تاب نہ لا کر ختم ہو جائیں گی۔ مثلاً شکر کو لیجئے اگر جاوا کی شکر پر تحفظی محصول عاید کر کے اس کی درآمد کو کم نہ کیا جائے تو ہندوستان میں باوجودیکہ گنے کی کاشت بخوبی ہو سکتی ہے نیز ضروری سامان فراہم کیا جا سکتا ہے شکر کی صنعت ترقی نہیں کرنے پائے گی۔

(۲) آج کل دنیا کے ہر گوشے میں ہر ہر لمحہ جنگ کا خطرہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نازک وقت میں سامان جنگ یا اور اشیا کے لئے دوسرے ممالک کا دست نگر ہونا اور خاص کر اگر بدقسمتی سے دشمن کا ملک ہو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے دوراندیشی کے نقطۂ نظر سے ہر ملک کو

چاہیئے کہ وہ ہر حیثیت سے جہاں تک ممکن ہو دوسروں سے آزاد رہے اور اپنی احتیاجات خود فراہم کرے۔

(۳) بسا اوقات تحفظی محاصل کے نہ ہونے سے درآمد کا پلہ برآمد سے اتنا بھاری رہتا ہے کہ تجارت کا توازن بگڑ کر ملک ہمیشہ یا کم از کم عرصہ دراز کے لئے قرضہ کا زیر بار ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ملک کے تمام طبقوں پر اس کا نہایت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ طاقتور حکومتوں نے اس طرح پر کمزور حکومتوں کو اپنا مقروض بنا کر ان کے ملکوں پر قبضہ تک کر لیا ہے اس سے درآمد اور برآمد میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی تحفظ ناگزیر ہے۔

(۴) بعض ملکوں میں بعض چیزوں کے پیدا کرنے کی خاص صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کا جوٹ۔ تحفظ کے مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ ہر ملک کو چاہیئے کہ صرف وہ چیزیں پیدا کرے جن کی صلاحیت اس میں زیادہ ہو۔ اور جن چیزوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت دوسرے ملکوں میں زیادہ ہو تو یہ کام ان کے سپرد کردے۔ پھر آپس کے مبادلہ سے ہر ملک اپنی ضروریات حاصل کرے۔ لیکن حامیان تحفظ اسے ٹھیک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان مکمل طور پر اس وقت صحیح اور سالم مانا جا سکتا ہے جبکہ اس کی تمام قوتیں مناسب طور پر نشوونما پائی ہوئی ہوں۔ نہ یہ کہ بعض قوتیں تو انتہائی ترقی پر پہنچائی جائیں اور بعض بالکل ناگفتہ بہ حالت میں چھوڑ دی جائیں۔ جیسے کہ کوئی طالب علم کہ اس کو پڑھنے میں تو کافی مشق ہو مگر اس کو لکھنا نہ آتا ہو۔ یا کوئی دماغی حیثیت سے تو قوی ہو لیکن جسمانی حیثیت سے کمزور۔ یا بالعکس۔ اس طرح ہر ملک کو چاہیئے کہ اپنے تمام ذرائع ثروت سے فائدہ اٹھائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی ضروریات خود مہیا کرے جس کے لئے تحفظ شرط اولیں ہے۔

(۵) اگر کوئی ملک صنعتی ملک بننا چاہتا ہے یا صنعتی تو پہلے ہی سے ہے مگر اپنی صنعت کی ترقی کا خواہاں ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحفظ کو اس لئے اختیار کرے تاکہ سرمایہ دار کی اصل جس کی کثرت اس مقصد کے پورے ہونے کے لئے شرط اولیں ہے معرض خطر میں نہ

پڑسے اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنی اصل کو کام میں لا سکے۔

(۶) چاہیئے کہ تحفظ کے ذریعے سے ملک کا بازار ملک ہی کی پیداوار اور مصنوعات کے لئے محفوظ کیا جائے۔

(۷) تحفظ سے مزدوروں کی اجرت بڑھتی ہے ان کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔ امریکہ کے مزدور اس کی بہترین مثال ہیں۔

(۸) تحفظ سے ملکی صنعتوں کو استقلال حاصل ہوتا ہے۔

(۹) تحفظ سے ایک قسم کا جذبۂ خودی پیدا ہوتا ہے جو کہ قومیت کی تعمیر میں نہ صرف بہت زیادہ مفید ہے بلکہ بہت ضروری بھی ہے۔ پھر یہ کہ تحفظ دیئے جانے کے بعد صنعت میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کی ہمت افزائی ہونے کی وجہ سے ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار بہت سرگرمی سے انجام دیئے گئے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسی بیداری قوم میں پیدا ہوتی جو کہ ملک کی سیاست میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تحفظ کی حمایت میں لکھا جا سکتا ہے لیکن عدم گنجائش اور تنگی وقت کے خیال سے ان چند باتوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے تحفظ کے متعلق ایک عام بحث کی ہے۔ اب ہم صرف ہندوستان کے مسئلے کو لیتے ہوئے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو کن وجوہ کے لحاظ سے تحفظ کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہندوستان کی خاص صلاحیتیں | ہندوستان کو وسعتِ رقبہ، اس کی وسیع آبادی اور مختلف و کثیر پیداوار کے لحاظ سے نہ صرف ایک ملک بلکہ اسے ایک برِاعظم سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان کا ایک ایک صوبہ یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے۔ ہندوستان کو تحفظ دینا اس لئے اور زیادہ ضروری ہے کہ اس کے مختلف صوبوں میں وہ تمام وسائل دولت موجود ہیں جو کہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کے لئے لازمی ہیں۔ چنانچہ محکمۂ اراضیات کے ناظم مسٹر ٹامس ہالینڈ نے صنعت و حرفت کی کانفرنس

کے روبرو سنہ ۱۹۰۸ء میں جو مضمون پڑھا تھا "اس واقعہ کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ اگر کافی اصل میسر ہو، کاروبار میں اولالعزمی بڑھے اور صنعت وحرفت کی تعلیم بھی حاصل ہو جائے تو معدنیات کی قسم سے شاید ہی کوئی چیز ہو جو یہاں دستیاب نہ ہو سکے" ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "اب موقع آگیا ہے کہ لوہا اور فولاد خود ہندوستان میں تیار کیا جائے" اور یہی دو چیزیں ہیں جن کی قیمت معدنیات کی برآمد میں سب سے زیادہ بڑھی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کا عہد ماضی بھی شاہد ہے کہ یہاں کی صنعت شہرۂ آفاق رہ چکی ہے اس سلسلے میں ایک فاضل کا قول نقل کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے انگریزی حکومت کے آنے کے بعد سے اپنی صنعت میں کیسی معکوس ترقی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "صنعتوں میں اہل ہنود نے بہت پیشتر کے زمانے میں غضب کا کمال حاصل کیا تھا حتیٰ کہ روم کے شاہی دربار ہندوستان کے طلائی اور نقرئی بافتوں سے زرق برق بنے رہتے تھے آج سے صدیوں پہلے ڈھاکے کی ململ تمام مہذب ممالک میں مشہور تھی۔ یہاں کے پارچے کہ جن کی نفاست دنیا بھر میں بے مثل تھی۔ یہاں کے مشجر کہ جن میں جگمگاتے ہوئے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ بیش قیمت زردوزیاں کشیدے کم خواب، زربفت اور تاش بادلے، عجیب وغریب بوقلموں قالین، نہایت درخشاں میناکاریاں، وہ نازک بچہ کاریاں کہ بڑی بڑی خوردبینوں سے کہیں باریک اجزا کا پتہ چلے تو چلے۔ ساز وسامان پر نہایت ہی عمدہ بڑے اہتمام کا نقش ونگار۔ طرح طرح کی شکل و صورت کی نہایت عمدہ ضمیر کی تلواریں۔ یہ سب چیزیں اب بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں بھی صنعتوں نے کیا کمال حاصل کیا تھا"

مسٹر مارٹین اپنی کتاب سلطنت ہند میں لکھتا ہے کہ "جس زمانے میں برطانیہ کے وحشی باشندے اپنے جسم رنگتے تھے۔ تارعنکبوت کی سی باریک ڈھاکہ کی ململ، کشمیر کی نفیس شال، دہلی کے کارچوب، ریشم، قیصر روم کے دربار میں بڑے بڑے نازنین وحسین زیب تن کرتے تھے۔ دھات کا بنا ہوا سامان، ہاتھی دانت، آبنوس اور صندل پر ایسے خوشنما نقش ونگار اور گل کاریاں کیسی

خوش رنگ چھینٹیں، ہیرے جواہرات اور بدلی نفاست سے جڑے ہوئے، زر دوز مخملیں اور قالین، کیا پختہ فولاد، نہایت عمدہ چینی اور اعلیٰ درجہ کا بحری سامان کشتی اور جہاز وغیرہ صدیوں دنیا کی مہذب قومیں ہندوستان کی ان مصنوعات پر عش عش کرتی تھیں اور جب کہ لندن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ ہندوستان دنیا کا سب سے ہرا بھرا بازار تھا" سر ولیم ہنٹر کے یہ جملے بھی نقل کے قابل ہیں۔ وہ کہتے ہیں" ہندوستان کی قدرتی دولت اور اس کے وسیع بحری ساحل سے کہیں زیادہ اس کے باشندوں کی صنعت گری میں خداداد ذہانت اور قابلیت اس کو ایشیا بھر کا تاج بنائے ہوئے تھے"

ہندوستانی صنعتوں کے اسباب زوال | ذیل کے مختلف وجوہ سے ہندوستان کی صنعتوں کو زوال ہوا۔

(۱) صنعتی انقلاب نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ جوں جوں انسان کو فطرت پر غلبہ حاصل ہوتا گیا اور بجائے ہاتھ پیر یا جانوروں کے اس نے بھاپ اور بجلی کے ذریعہ مشین سے کام لینا شروع کیا ووں ووں پرانی دستی صنعتوں کا زوال شروع ہوا۔

(۲) ہندوستان کی صنعتوں کو جس چیز کی وجہ سے سب سے زیادہ صدمہ پہنچا اور اس کے لئے کچھ تفصیل کی بھی ضرورت ہے وہ انگریزی حکومت ہے۔

سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسی چالیں چلیں اور ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے یہاں کی دستی صنعتیں بے دست و پا ہو کر رہ گئیں اور اس کے بعد سے اب تک حکومت برطانیہ کھلم کھلا دیسی صنعتوں کو ہر طریقے سے فنا کرنے یا کم از کم ترقی نہ ہونے دینے کی کوشش کرتی رہی ہے اس کے اسباب گو کہ مختلف ہیں لیکن مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ عمل محض انگلستان والوں کو فائدہ پہنچانے پر مبنی ہیں۔ سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں اور ان کا یہ بیان ایک واقعی دردانگیز کہانی ہے۔

"ہندوستان پر انگلستان کی عنایت ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں پر بڑھا بڑھا کر محصول درآمد لگانے سے بھی کام نہ چلا تو ان کی درآمد ہی روک دی، اور اس طرح ہندوستان

کے کپڑوں کا انگلستان میں آنا ممنوع قرار پایا" اس کے بعد بھی برطانیہ تھا کہ جب تحفظ کی بدولت اپنی صنعت و تجارت کو کمال ترقی پر پہنچا چکا' سارے اسباب بحری حمل و نقل پر قبضہ کر چکا اور اپنے کارخانوں کے لئے مواد خام کا محتاج ہوا اور اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی ضرورت پڑی تو آزاد تجارت کا علمبردار بنا اور تحفظ کی پالیسی پر انگلستان والوں نے طرح طرح کی نکتہ چینیاں شروع کیں۔ اور بدقسمتی سے ہندوستان بھی اس کے قبضہ میں آگیا انگریز اس کے سوا کیا چاہتا تھا۔ ع

یک گلے می خواستم یک گلستاں یافتم۔ ایک بہترین اور زرخیز ملک ہاتھ آگیا جس کی خام پیداوار بہت کافی' بازار بہت وسیع اور اس پر طرہ یہ کہ رعایا جاہل' یعنی جس طرح چاہے وہ اسے اپنا آلہ کار بنائے۔

لیکن ہندوستان کا موجودہ وسیع بازار بھی ناکافی سمجھا گیا اور جو کچھ صنعت و حرفت ہندوستان میں باقی رہ گئی تھی اس کے خاتمہ کی کوشش شروع کی گئی۔ جو صنعتی اور تجارتی قوانین بنائے گئے وہ ہندوستانیوں کے مفاد کے خیال سے نہیں بلکہ انگلستان والوں اور خاص کر لنکاشائر کے کارخانے داروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لحاظ سے بنائے گئے۔ حکومت آمدنی کی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے کہ ۳ ½ فی صدی درآمد کا محصول عاید کرے تو اس خیال سے کہ ممکن ہے اس سے لنکاشائر والوں کی صنعت برآمد کو نقصان پہنچے اور اس قلیل محصول سے ہندوستانی صنعت کو تحفظ مل جائے۔ ہندوستانی مصنوعات پر بھی اتنا ہی محصول عاید کیا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے تحفظ مضر ہے اور اس کی برآمد پر تحفظ سے برا اثر پڑے گا یعنی یہ کہ جب ہندوستان اپنی صنعت کو تحفظ دے گا تو ہندوستان سے دیگر صنعتی ممالک جو موادِ خام وغیرہ منگاتے ہیں وہ نہیں منگائیں گے یا ہندوستان سے اپنی درآمد کم کر دیں گے۔ یہ بات بھی صرف ایک خودغرضانہ دلیل ہے ورنہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہندوستان کی داخلی مصنوعات پر محصول عاید کیا جائے۔

تحفظ کے مخالفین کی تمام دلیلیں ہم نے پیش کردیں اوران کے جواب بھی۔ نیز تحفظ کے فوائد کا بھی ذکر کردیا ہے۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہ دلائل تو نظری اور علمی بحث سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عملاً اگر دیکھا جائے تو تحفظ کی اور تائید ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں موجودہ زمانے میں ہر ملک میں اسی کا راگ گایا جاتا ہے۔ چنانچہ جرمنی ۱۸۷۹ء سے اب تک تحفظ پر عامل ہے فرانس نے ۱۸۸۱ء اور جاپان نے ۱۸۹۹ء میں تحفظ کی پالیسی کو اختیار کیا نیز جاپان نے تو ۱۹۱۱ء میں تحفظی پابندیوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ امریکہ تو تحفظ کا علمبردار رہے ہی۔ دنیا جانتی ہے کہ امریکہ کا تمول تحفظ ہی کی بدولت ہے۔ ورنہ وہ بھی ہندوستان کی طرح مفلس ہوجاتا اور دور کیوں جائیں خود انگلستان کی صنعتوں کی ابتدا جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے تحفظ ہی کے سایہ میں ہوئی۔ مصنوعات کی درآمد پر ۵۰ فی صدی تحفظی محصول عاید کیا گیا۔ اسی طرح انگلستان کے کپڑوں کے کارخانوں کو مختلف ترکیبوں سے تحفظ دیا گیا اور جنگ عظیم کے بعد سے موٹر کی درآمد پر ۳۳ فی صدی محصول درآمد عاید کیا گیا۔ قانون تحفظ کارخانہ جات پاس ہوا۔ شکر پر سے محصول آبکاری اٹھایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیا دنیا بھر کے لئے تحفظ مفید اور صرف ہندوستان کے لئے مضر اور نقصان رساں ہے؟ آج کل تمام بڑے صنعتی ممالک تمام کے تمام بلا استثنا تحفظ کی بدولت اپنی اپنی انتہائی ترقی پر پہنچ چکے ہیں پھر ہندوستان کی صنعتوں میں کونسی نرالی بات ہے؟ جس کے لئے تحفظ بہت نقصان دہ بتایا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر ہندوستان برطانیہ کا محکوم نہ ہوتا اور بالکل آزاد ہوتا تو ان جھگڑوں کی ضرورت پیش ہی نہ آتی بلکہ تحفظ اختیار کئے ہوئے اسے کافی عرصہ بھی گذر چکا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ایسا نہیں ہے انگلستان اپنی رعایا کو چھوڑ کر ہندوستان کے مفاد کا خیال کیوں کرے اور کس طرح کرسکتا ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ دنیا کی نظروں میں بھی بدنامی نہیں چاہتا نتیجہ یہ کہ براہ راست محض قوت سے کام لے کر اپنی مقصد براری کرنے کے بجائے سیاسی مکاریوں، دھوکہ بازیوں اور

خودغرضانہ دلیلوں کے ذریعہ سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس قوت نہ ہوتی تو ہندوستان ان مکاریوں میں کبھی نہ آتا۔ کیونکہ اب ہندوستانی بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ان کی بھلائی کس میں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ "دست شکستہ بارگراں"۔ جس طرح کہ کسی نے لکھا ہے"۔ ہندوستان کی صنعتوں کے لئے تحفظ اتنا ضروری ہے اور اس کے فوائد اتنے لازمی اور بدیہی ہیں کہ ان کے لئے کسی بحث و استدلال کی ضرورت ہی نہیں کیا کوئی منصف اور بے غرض شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ساری دنیا تحفظ کا دامن تھام کر اپنی داخلی وخارجی، سیاسی ومعاشی، کمیوں کو پورا کرنے میں منہمک رہے اور ہندوستان اس سے محروم رہے اور دنیا کے لئے لنگرخانہ بن کر ان کی من مانی چیزیں مہیا کرے اور خود مفلس رہ کر سخاوت کا دروازہ دوسروں ہی پر کھلا چھوڑ دے کیا ہندوستان نے اپنی عظمت پارینہ کو بھلا دیا اگر اس میں اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور یقیناً ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنی بے بسی کا احساس دل میں لے کر میدان میں نکلے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہاں تک کہ اپنا مقصد حاصل کرکے سانس لے۔

اس مختصر بیان سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ ورنہ ہندوستان کے لئے تحفظ کے ناگزیر ہونے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔

تحفظ کی نوعیت: یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی بہرحال تحفظ ہندوستان کی صنعت کی ترقی کے لئے لابدی شے ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تحفظ کی نوعیت کیا ہو۔ فسکل کمیشن نے اختصاصی طریق تحفظ کی سفارش کی تھی یعنی صرف ان صنعتوں کو تحفظ دینا چاہیئے جو کہ اس کے بغیر ترقی نہ کرسکیں ان کے لئے اور ہر قسم کی ضروریات مہیا ہوں۔ تحفظ کے بعد ایک خاص مدت کے اندر اندر اس قابل ہو سکیں کہ باہر کی صنعت کا مقابلہ کرسکیں اس کے علاوہ ہندوستانی معاشیین نے بھی کچھ تنقیدیں اس پر کی ہیں مثلاً یہ کہ تحفظ کی چند خرابیاں جو ہیں وہ

یہاں کے تحفظ میں نہیں ہونی چاہییں۔ اس میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہندوستان میں اس وقت بڑی بڑی صنعتوں پر اکثر و بیشتر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے اور چونکہ تحفظ کا بار اشیاء کے صرف کرنے والوں کے طبقہ پر پڑتا ہے اور اس کا فائدہ براہ راست مصنوعات کے پیدا کرنے والے سرمایہ دار کو اس لئے اس کا بھی کسی نہ کسی طرح علاج کرنا چاہیئے۔

(۲) ہندوستان میں اصل کی کمی ہے اس لئے یہ لازمی ولابدی ہے کہ غیر ملکی اصل سے کام لیا جائے لیکن اس کے معنی یہ نہ ہونے چاہییں کہ اس اصل کے ذریعہ سے تحفظ کی بدولت جو کچھ فائدہ یا نتیجہ ہو وہ بھی یہ غیر ملکی سرمایہ دار اینٹھ لیں۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ سارے کارخانے دار آپس میں ساز باز کر کے تحفظ سے ناجایز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو لوٹ لیں۔ اس کی پیش بینی بھی کرنی چاہیئے۔

اس طرح اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا خیال تحفظ دیتے وقت از حد ضروری ہے لیکن تحفظ کی نوعیت کا فیصلہ خود ہندوستانیوں کو کرنا چاہیئے نہ کہ برطانوی حکومت کرے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحفظ کی بدولت ہندوستان اپنی دفاعی قوت کو ترقی دے سکتا ہے اور اپنی معاشی زندگی کا معیار بلند رکھ سکتا ہے ۱۹۲۲ء سے ہندوستان میں تحفظ کی پالیسی پر عمل شروع ہوا ہے مگر اس قسم کے تحفظ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ یہ بھی محض ہندوستانی سرمایہ دار اور کارخانہ دار کو بہلانے کے لئے دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ کوئی منظم پالیسی نہیں ہے۔ بلکہ انگلستان اور دیگر غیر ممالک کے سرمایہ داروں (جن کا ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتوں اور منابع ثروت پر قبضہ ہے) کے مفاد کا خیال کر کے یہ تحفظ دیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ تحفظ لازمی ہے اور اس کی نوعیت وغیرہ کا فیصلہ خود ہندوستانی کریں گے اور اس کے علاوہ تمام تلبیس آمیزانہ بحث و مباحثہ بیکار ہے۔

اقبال کا نوجوان

(از جناب نورالحسن ہاشمی صاحب ایم اے)

(بسلسلہ سابق)

نہ صرف زبان ہی سے علامہ اقبال نوجوانوں کی تعمیر سیرت پر زور دیتے ہیں بلکہ وہ عملاً بھی اسی قسم کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے چند نوجوان طلبا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک جلسہ مشاعرہ کی صدارت کے لئے درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا خیر میں صدارت تو کرتا نہیں لیکن شاعری تم لوگوں کے لئے بہت مضر ہے اور پھر اس کے بعد موجودہ شاعری اور اس کے بے فائدہ ہونے پر اس قدر شدت سے لیکچر دیا کہ ان جوانوں کا تمام جذبہ شعری یک لخت ٹھنڈا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ ہم نوجوانوں کی جو حالت ہے یعنی یورپ کی کورانہ تقلید۔ احساس غلامی غائب خود پر بھروسہ نہیں اعتماد نہیں۔ تعلیم کو محض ذریعہ معاش یا ذریعہ وجاہت سمجھنا۔ "کالج میں بیٹھ کر محض ڈینگیں مارنا" ظاہر کو اصل حقیقت جاننا۔ خودغرض اور اپنی ہی فکر ہونا اس لئے آپس میں نفاق۔ مادہ اور حواسی چیزوں پر یقین رکھنا اس لئے بیدینی لامذہبی۔ تن کی پرورش اور روح کی تربیت سے ناآشنا محض۔ عیاں ہے کہ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہوگا اس قوم کی بقا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب جبکہ قومیں زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور عرصہ کائنات میں فنا و بقا کا سخت معرکہ گرم ہے جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے یا جو نرم بستر کا جویا ہوا یقینی اس کو دوسری قومیں کچلتی ہوئی اور روندتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ کیا مسلمان قوم اس قابل ہے کیا اس میں زندگی کی اس قدر قوت ہے کہ وہ موجودہ تنازعہ اللبقا کی گرما گرمیوں کی تاب لا سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اب وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں رہا۔ اب مسلمان اور مسلمان بچے جیسے رہ گئے ہیں ان کی صورت ان کی حالت یہ ہے۔

مومن و پیش کساں بستن نطاق! مومن و غداری و فقر و نفاق!

با پشیزے دین و ملت را فروخت | ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت
لا الہ اندر نمازش بود و نیست | ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
زور در صوم و صلوٰۃ او نماند | جلوہ در کائنات او نماند
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ | فتنۂ او حب مال و ترس مرگ
رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور | دین او اندر کتاب و او بہ گور
صحبتش از عصر حاضر در گرفت | حرف دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد | آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات | رفت جاں از پیکر صوم و صلوٰۃ
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی | از چنیں مرداں چہ امید بہی

از خودی مرد مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است | بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود | در ہوا آشفتہ گردد ہم چو دود
ایں زماں از سر بزیری ہیچ نیست | اندر و جز ضعف پیری ہیچ نیست
آں شکوہ ربی الاعلیٰ کجاست | ایں گناہ اوست؟ یا تقصیر ماست
ہر کسے بر جادہ او تند رو | ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

صاحب قرآں و بے ذوق طلب
العجب ثم العجب ثم العجب

(جاوید نامہ)

اپنے گذشتہ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ حال کی کیفیتوں اور زار حالتوں کو دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آئندہ کے ہولناک نتائج رہ رہ کر اپنا بھیانک چہرہ ہم کو دکھلاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ بےفکر و لاپرواہ بیٹھے ہیں۔ ہم کو اپنے میں اعتبار نہیں رہا۔ خود میں زور اعتماد

نہیں رہا۔ فنا (ویدانت اور بدھ مذہب والی) کو ہم بقا سمجھنے لگے ہیں اور اپنی کشتی موجوں کے تلاطم میں بغیر کسی پتوار یا ناخدا کے ڈال رکھی ہے۔ ہم خود قرآن کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اپنا راستہ تاریکیوں میں بھلا بیٹھے ہیں ایسے حالات میں اقبال کی آواز پر لبیک نہ کہنا گویا موت کو قطعی دعوت دینا ہے۔ اقبال کی بانگ کہ اپنی خودی میں یقین رکھو۔ ناامیدی بھول جاؤ۔ دل میں درد اور تپش پیدا کرو دل کو بلند اور روح کو سربلند کرو۔ فقر کو جادۂ راہ بقا سمجھو۔ راہ حق اور راہ دین میں گامزن ہو۔ یہ ایسی بانگ درا ہے کہ سونے والوں کو بغیر چونکائے نہیں رہ سکتی اور مست اور نیند کے متوالوں کو ایسا ہلا دے گی ایسا جھنجھوڑے گی کہ وہ لامحالہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نوجوان عملی ہے یا محض خیالی یعنی یہ کہ وہ نوجوان جو اقبال کے دل و دماغ میں ہے کیا دنیا میں واقعی طور پر ایسا ہونا اور ایسا تربیت اور تعلیم سے بن جانا ممکن ہے؟ بجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جوانی جس میں کہ شباب فطرتاً جوش اور نمائش خودی پر بہت مائل ہوتا ہے کیا اقبال کے فقر کی تلقین دل پر رکھ سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دنیا اور علائق دنیا سے اپنے دل کو الگ کر سکتا ہے جبکہ ہر ہر قدم پر اس کے لئے لغزش کے لئے سامان موجود رہتے ہیں۔ کیا وہ اس دنیا سے جس کو وہ بہت رنگین دیکھتا اور سمجھتا ہے یوں دل برداشتہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی رہے اور اس سے الگ بھی رہے۔ باہمہ اور بے ہمہ کا اصول اہل شباب کے لئے ناممکن ہی سا معلوم ہوتا ہے دل میں فقر پیدا کرنا۔ جوانی میں اپنے دل کو بڈھا بنا لینا ایک دماغی بیماری کہی جا سکتی ہے نہ کہ اس کا صحیح استعمال۔

اقبال کے پیغام فقر کی غلط تشریح ہوگی اگر اس سے اس قسم کے شکوک پیدا ہوں۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نوجوان اپنے احساسات یا جذبات یا خیالات میں کسی طور پر بڈھا ہو جائے بلکہ وہ تو ایک ابدی شباب جوش اور ذوق عمل کی تلقین کرتا ہے۔ یہ صحیح کہ زمانۂ شباب تمام و کمال رنگینیاں اور دلچسپیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے باہر کی دنیا بھی رنگین

دلچسپ دیکھتا ہے لیکن وہ یہ تو کہیں نہیں کہتا کہ اس رنگینیٔ تخیل کو مار دو۔ یا برہمچریوں کی طرح نفس کے فنا کرنے کی ترغیب نہیں دیتا (بلکہ وہ اس کے سخت خلاف ہے ملاحظہ ہو واقعہ بریچلری چند گھنٹہ علامہ اقبال کے ساتھ۔ معارف ستمبر ۱۹۳۸ء) بلکہ وہ البتہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ثانوی چیز ہے اول شئے حق کی راہ میں جد وجہد۔ اور اپنی خودی کی تعمیر ہے اور اپنے کردار و سیرت کی تربیت

مصارف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

لیکن شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہونے سے پیشتر مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرنا اول شرط ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کا نوجوان خیالی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اول تو اقبال کی تلقین جد و جہد جوش و سرگرمی کے ساتھ میں فطرت شباب کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ طبیعت میں استغنا و ہمت و پامردی اور خود اعتمادی کا پیدا کر دینا بھی جوانی کی نفسیات کے بالکل مناسب ٹھیرے گا۔ اس لئے کہ جوانی ہی میں آدمی اپنے میں زور و سوز محسوس کرتا ہے جوانی ہی میں وہ تمام دکمال پر فتح کرنے اور ہر شئے پر قدرت حاصل کرنے کا طامع ہوتا ہے اور جوانی ہی میں اپنی محنت و کوشش کے اعتماد پر اپنے میں آسانی سے شان استغنا پیدا کر سکتا ہے۔ بڑھاپا ضعف قویٰ کا زمانہ ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرص دنیا اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اپنے میں وہ شان بے نیازی نہیں پیدا کر سکتا جتنا کہ ایک نوجوان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے اور اسی شان بے نیازی کا دوسرا نام فقر ہے۔ اپنے نظریہ فقر کی اقبال مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی!
روشن اس سے خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بوعلی و رازی!
حاصل اس کا شکوہ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل — رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی

ہے اس کی نگاہ عالم آشوب　　در پردہ تمام کارسازی!
یہ فقر غیور جس نے پایا　　بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری　　(جاوید سے۔ ضرب کلیم)

اقبال کا پیام عمل اور اقبال کی صلاح جد و جہد نوجوانوں کے خون کو گرم کرتی ہے اور چونکہ گرمی شباب کا تقاضا ہے اس لئے کسی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کا پیغام جوانوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے رہی وہ باتیں جن کی تربیت اقبال نے بتلائی ہے وہ ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اس لئے ذرا سی تربیت سے ان خصائص کو غیر معمولی طور پر ترقی دی جا سکتی ہے مثلاً کون جوان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں حوصلہ مندی عزم و ہمت کے جذبات نہیں ہوتے۔ اسی جذبۂ حوصلہ مندی کو اقبال اور بھی اکسانا چاہتے ہیں اس قدر کہ زمین و آسمان پر اس کو مالک بنانا چاہتے ہیں بلکہ ذوق طلب اس قدر بڑھا دینا چاہتے ہیں کہ کسی مقام پر رک جانا یا کسی خاص جگہ کو منزل قرار دے دینا وہ نوجوان کے ذوق کی تشنگی و حوصلہ کی پستی قرار دیتے ہیں

تو رہ نورد شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!　　لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز　　ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

جوانوں کو اس قسم کی تلقین ظاہر ہے ان کی فطرت کے کس قدر مطابق ہے اور کیونکر تخیلی کہی جا سکتی ہے

اقبال کے اس نوجوان کے متعلق ایک دوسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وہ شعائر و روایات اسلامی کے مطابق ہے؟ صوفیا و کرام تو اس سے قبل ذات کو فنا کر دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور قرآن سے اس کی تاویلیں بھی پیش کرتے تھے۔ جبر کو اصول زندگی مانتے تھے اور خود کو مٹا کر خدا پر تکیہ کرنا شرائط ایمان میں سے سمجھتے تھے۔ یہ آخر اقبال نے کیوں اور کیسے خود کی بقا اور خودی

کی قدرت کے اصول قرآن سے استنباط کرلئے

در حقیقت ایران کا تصوف یعنی خودی کا بطلان کا اصول ویدانت اور بدھ مت کے اصولوں کے موافق تھا اور جیسا علامہ اقبال نے اپنے مقالہ ایران کے فلسفہ میں ثابت کیا ہے اور اکثر خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ طریقہ تفکر ایران میں انھیں مذاہب کے پیروں کی تعلیم سے وہاں پہنچ چکا تھا اس لئے وہاں کے تفکر و تخیل پر جاری وساری ہوگیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ چیز سامی نسلوں میں قطعی موجود نہ تھی اور یوں بھی یہ آریائی قوموں کی چیز ہے۔اور اپنے اس خیال میں اقبال کو رومی سے بہت کچھ مدد ملی جس نے جبر و قدر کے مسئلہ کو دو لفظوں میں بالکل واضح کردیاکہ

بال بازاں را سوئے سلطان برد
بال زاغاں را بہ گورستان برد

اس کے علاوہ یہ بات قرآن سے بھی ظاہر ہے کہ فرماتا ہے لیس الانسان الا ما سعیٰ۔نہیں ملتا کسی کو مگر اتنا جتنے کے لئے وہ محنت کرے۔اور بالکل یہی چیز ہے جو رومی نے بتلائی ہے کہ جس میں جتنی ہمت وجرات ہوتی ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے ورنہ یوں زاغ اور باز دونوں کے پر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ خودی کی فنا و بقا کے متعلق قرآن شریف کا صاف حکم موجود ہے کہ لا تحزن ولا تقنطو۔ظاہر ہے جب یہ حکم دیا جائے گا کہ نہ غم کرو اور نہ ناامید ہو تو اس سے کبھی یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ اپنی خودی کو مٹادو اور اپنی خودی کا مٹانا تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب زندگی اور دنیا کو ہر طرح ہیچ سمجھا جائے اور یہی بدھ مذہب کا خاص پرچار ہے کہ چونکہ زندگی جینے کے لائق نہیں اور دنیا فانی ہے اور دکھ اور فساد سے بھری اس لئے اس میں جی لگانا بے کار ہے زندگی بدھ ازم کے مطابق فقیری ہیں اور بھکشو بن کر گذارنا چاہیئے خود کو فنا اور بے کار محض سمجھ کے۔اسلام نے اس قسم کی رہبانیت کی کبھی تعلیم نہیں دی لارھبانیۃ فی الاسلام۔اسلام نے مادہ کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا اور

نہ اس سے الگ رہنے یا بھاگنے کی کبھی تعلیم دی. ہاں مادہ سے اپنی ذات اور روح کو بلند رکھنے کی البتہ تلقین کی ہے۔ مادیات کو مقصد بالذات نہیں بنایا روح کو مادہ میں زندگی کرنے کو کہا لیکن یہ بھی کہا کہ اپنے دیدہ و دل دار رکھے اور محض مادہ ہی میں نہ متوجہ رہے اور اسی کو اقبال فقر کہتے ہیں۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب — حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن — نگاہش بر شعاع آفتاب است

ان دلائل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اپنے نوجوان کو جو خودی کی تعمیر کی اور بے خوفی کی تعلیم دیتا ہے وہ سراسر قرآں کے احکام کے مطابق ہے۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون اس کی تلقین میں جاری و ساری ہے رہا یہ امر کہ انھوں نے صرف مسلمان نوجوانوں کو کیوں مخاطب کیا کیا دوسرے جوانوں میں اس قسم کی کمزوریاں نہ تھیں جو مسلمان نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں یا کیا یہی تعلیم دوسری جوانوں کے لیے مفید ثابت نہ ہوگی۔ اس امر کا شافی جواب ان کے ایک خط میں مل سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک معترض مسٹر ڈکنس کے متعلق لکھا ہے جو کہتا تھا کہ ان کا تخاطب مسلمانوں ہی سے صرف ان کے محبت اسلام کی وجہ سے ہے

"یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنس کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے بلکہ دراصل میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے

تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم"

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی موجودہ مسلم نوجوان کی بیماری کی تشخیص صحیح ہے اور کیا ان کا طریقہ علاج جو انھوں نے بتایا ہے وہ مفید ثابت ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کیا اقبال

کا نوجوان موجودہ تنازعۃ البقا اور کشمکش کو سر کرنے کے لائق اور اس میں کامیاب ثابت ہوگا۔ اور اس قدر کامیاب کہ وہ دوسروں سے بازی لے جا سکے گا:۔

یہ تو بالکل عیاں ہے کہ مسلمان من حیثیۃ القوم آج کل بہت پستی کی حالت میں ہیں دوسری قومیں ان سے بہت آگے بڑھ چکی اور بڑھ گئی ہیں۔ مسلمان بالکل جمود کی حالت میں ہیں۔ اس لئے کہ کوئی راہ عمل ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ ہر قوم کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں اور تکتے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ آپس میں نفاق الگ۔۔ افراد کے سردار الگ بے ذوق و پست۔ نہ ارادوں میں زور نہ ولولوں میں شور اس تمام پستی کی اصل وجہ کیا ہے؟ محض یہ کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے، دوسری وجہ یہ کہ غلط تعلیم و تربیت

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کس قسم کے نکلیں گے

یہ بتاں عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں ۔۔۔ نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

یا

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ۔۔۔ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

غرضکہ مسلمان اور مسلمان نوجوانوں کی جو حالت آج کل ہے اس کی تشخیص اور نبض شناسی اقبال نے بالکل صحیح کی ہے۔ اب رہا طریقۂ علاج! اقبال نے پہلے جڑ ہی کی حالت درست کرنا مناسب سمجھا اور اس کی درستی کے لئے ان کا پہلا اور اصلی گر خودی کی تلقین ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو صحیح راستہ پر اور مضبوط خیال کرنا شروع کرے گا تو ظاہر ہے اس کی وہ تمام قوتیں برسر کار آ جائیں گی جو اس میں پنہاں ہیں اور یہی تخلیق کا مقصد ہے کہ ہم اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اس طرح فطرت کے عطایا کا صحیح اور جائز استعمال ہو سکے۔ جب دل سے کمزوری کا احساس جاتا رہا اور نگاہ میں گرمی آنا شروع ہوئی تو ایسا نوجوان جو نہ کچھ کر ڈالے عجب نہیں

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار ۔۔۔ شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار ۔۔۔ ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اور ایسا نوجوان جس کی خودی بیدار ہو گئی ہو اس کی زندگی کا کیا کہنا

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال کا دوسرا گر فقر کی تلقین ہے اور درحقیقت یہ بہت بڑا اور اہم اصول ہے۔ دنیا میں رہنا لیکن دنیا کو مقصد بالذات نہ سمجھنا خاک سے اور خاک میں پیدا ہونا لیکن کرۂ خاکی سے آپ کو سربلند رکھنا درحقیقت عزم و ہمت و حوصلہ کی بہترین تربیت ہے اور خصوصاً مسلمان کے لئے آج کل جب کہ ان کی اپنے نصب العین سے ناواقفیت ان کو مختلف غلط راستوں پر ڈال دینے کے لئے آمادہ ہے۔ ہر طرف زر و مال و خوں ریزی و جہانگیری حرص و طمع کے جال پھیلائے ہوئے ہے اور مسلمان کے قدم اس کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے اور اس غلط راستہ پر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اقبال کے یہ بانگ فقر نہایت خوش آیند کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے کہنے کا طرز بھی کچھ کم موثر نہیں۔ جوش و روانی۔ زور و شور کے ساتھ جوان کا اپنا ذاتی ڈھنگ ہے اور خون نوجوان کے لئے بہت موزوں ہے۔ وہ مسلمان نوجوان کو گذشتہ کی بھی یاد دلاتے ہیں اور گذشتہ کی حالات بتا کر اسے اکسانا اور آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ (تاریخ کی تعمیری قوت سے وہ بخوبی واقف ہیں ان کے نزدیک سر زند از ماضی تو حال تو خیزد از حال تو استقبال تو)

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ — وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

طنز سے بھی موقعہ موقعہ سے کام لیتے ہیں

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

یا

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں — کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

غرضکہ ہر طرح سے وہ مسلم خوابیدہ کو بیدار کر دینا چاہتے ہیں۔ درد دل میں ہے اس لئے انھیں

اپنی غایت اور اس غرض سے کام ہے کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو جائیں ورنہ طریقہ بیداری ان کی شاعری کا جزوِ عملی نہیں

اب رہی یہ بات کہ ایسا نوجوان موجودہ دنیا میں اپنا کیا درجہ رکھے گا سو ظاہر ہے کہ جب خود میں اتنا زور پیدا ہو جائے گا اور اپنے میں اس قدر اعتماد ساتھ ہی دل میں وسعت نگاہ میں بلندی اور جان میں سوز تو ایسے نوجوان کے راستوں میں کونسی رکاوٹیں حایل ہو سکیں گی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ موجودہ حالات زندگی کے موافق اپنے آپ کو بنا سکے گا بلکہ اپنی قوت روحانی کی بدولت وہ مصاف زندگی میں اس قدر طاقتور ثابت ہوگا کہ اپنے حالات اپنے خارجی واقعات پر پورا پورا قبضہ وقدرت حاصل کر سکے گا۔ وہ محض اپنے زمانے اور وقت کی پابندی نہ کرے گا بلکہ اپنے زمانہ اور وقت کو اپنا پابند بنائے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ اقبال نے روح کی تربیت فرمائی ہے اس لئے ایسے نوجوان محض کسی خاص زمانہ اور خاص عہد ہی کے لئے موزوں اور مناسب نہ سمجھا جائے بلکہ تمام آنے والے عہدوں اور زمانوں کے لئے کسی خاص مقام یا جغرافی چار دیواری کے لئے نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ کے لئے۔ مختصراً یہ کہ ایسا نوجوان ہمیشہ کے لئے مثالی رہے گا۔ اس لئے کہ روح کے لئے صحیح تعلیم اور صحیح راستہ کا مل جانا شرط ہے۔ گامزن تو وہ ہو ہی جائے گی۔ مسلمان قوم اب تک محض اس وجہ سے دوسروں کا منہ دیکھتی رہی اور دوسروں کی تقلید کرتی رہی کہ اسے خود اپنا جادہ نہیں معلوم تھا اس کے علاوہ صوفیا نے انھیں غلط راستہ پر ڈال دیا تھا۔ اب جب کہ انھیں ایک درویش اور دانائے راز نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم پھر گذشتہ کی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں سربلند اور ممتاز نظر آنے لگے

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کیا مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر نوجوان یا مسلمان نوجوان (یا کسی نوجوان) کے لئے اس سے بہتر تعلیم ممکن ہے؟ بہتر و برتر ایک اضافی کلمہ ہے جو ہر زمان و مکان میں مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ کی موجودہ حالت اور دنیا کی نئی زمانہ رنگ کشمکش دیکھتے ہوئے صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے نوجوان کا تصور مکمل۔ باعمل اور

بہترین ہے اور اس کے ساتھ اتنا بھی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے بہتر بھی کوئی مثالی نوجوان ممکن ہوا اور ساتھ ہی وہ عملی بھی ہوا تو اس کا بھی تخیل اقبال ہی کے نوجوان کی داغ بیل پر ڈالا جائے گا اور اسی کی محض ایک ترقی یافتہ صورت ہوگی نہ کہ اس مختلف النوع۔

آخر میں بس اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر کرائیں کیونکہ ان اصول کا منبع و مخرج قرآن ہے اور انھیں پر عمل کرنے سے وہ پھر دنیا میں سربلند اور نیک نام ہو سکتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نور بصیرت عام کر دے

برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا؟

قدیم زمانے میں اس جزیرہ کا نام برٹین تھا اور اس میں نیم وحشی لوگ آباد تھے۔ اس لی
جنوبی بندرگاہوں میں جو اس زمانے میں دنیا کا انتہائی شمالی کنارہ سمجھی جاتی تھیں رومی تاجر آیا کرتے
تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں ٹین ملتا تھا جس کی برونز (یعنی تانبہ اور ٹین کا مرکب) بنانے میں
ضرورت پیش آتی تھی۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو لوہے کا زیادہ علم حاصل نہیں تھا اوزار اور ہتھیار بنانے
کے لئے برونز کو سخت ترین دھات کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں آج جس علاقہ کا نام کارنوال ہے وہاں
جولیس سیزر کے زمانے (۵۵ ق م) سے پہلے ٹین کی کانوں کو کھودنا شروع کر دیا گیا تھا اور رومی جہاز
اسے اٹلی لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان ابتدائی تجارتی تعلقات کے باوجود انگلستان ایک تجارتی قوم نہیں
بن سکی تھی۔

امریکہ کی نئی دنیا کے دریافت ہونے سے پہلے جزائر برطانیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ واقع
تھے۔ اس زمانے میں جس دنیا کا لوگوں کو علم تھا اس کا مرکز بحر روم تھا اور جیسے وینس، اسکندریہ
بغداد اور دمشق دنیا کے تجارتی شہر سمجھے جاتے تھے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں جہاز بحر روم میں تیرا کرتے تھے
اور قیمتی سامانوں سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے مشرقی یورپ سے مغربی ایشیا کا مسلسل سفر کرتے
رہتے تھے۔

لیکن برطانیہ کے پاس تاجروں کو دینے کے لئے کچھ زیادہ مال نہیں تھا اور اس کا محل وقوع بھی تجارت
کے لئے موزوں نہیں تھا۔ رومی اور دوسرے قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ برطانیہ پر سطح زمین کی حد ختم ہو جاتی
ہے اور چونکہ زمین کی گولائی کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اس سے آگے بڑھنے
کے معنی یہ ہیں کہ فنا کے اتھاہ گڑھے میں کود جائے۔ قدیم اسکندریہ اور یورپ میں دنیا کے جو نقشے عہد وسطیٰ
میں بنائے جاتے تھے ان میں برطانیہ کو دنیا کے شمال مغربی سرے پر جگہ دی جاتی تھی۔ دوسرے مہذب

ملکوں سے چونکہ اس کے تعلقات بہت کم تھے اس لیے اسے یورپ کے وحشیوں اور غیر مہذب لوگوں کا تاریک ملک سمجھا جاتا تھا۔

بعد کے زمانے میں بھی تاجروں کو برطانوی بندرگاہوں تک پہنچنے کے لئے جن کی آبادی چھوٹے قصبوں سے زیادہ نہیں تھی ساحل اٹلانٹک تک سفر کرنے کا کوئی خاص شوق پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسے زیادہ پسند کرتے تھے کہ بحر روم کے ان شہروں کا سفر کریں جو نزدیک تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت مہذب بھی تھے۔ یہاں تاجروں کو تفریح و دلبستگی کا خوب موقع ملتا تھا۔ اگر جینوآ کا کوئی تاجر خرید و فروخت کرنا چاہتا تھا تو چند روز کا سفر کرکے وہ مارسائی یا اور زیادہ نزدیک کے شہروں مثلاً فلورنس اور وینس تک چلا جاتا تھا۔ اسکندریہ تک بھی وہ جا سکتا تھا جہاں اسے ہندوستان، چین، ایران اور عراق عرب کے تاجروں سے مال کے مبادلہ کا موقع مل سکتا تھا اور اگر وہ اپنا گھر چھوڑنے کے لیئے مایل نہ ہوتا تھا تب بھی گھر بیٹھے بہت سے ملکوں کا مال اسے مل جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اٹلی دنیا کے کاروبار کا مرکز تھا۔

لیکن بیچارہ انگریز تاجر اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔ کیونکہ جنوآ، وینس اور بروگس کے جہاز محض کبھی کبھی انگلستان کی بندرگاہوں کی طرف آ نکلتے تھے۔ جس علاقہ کو آج بلجیم کہا جاتا ہے خصوصاً اس کا شہر بروگس تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کی تجارت کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ بروگس کے کپڑے کے تاجر انگریزی اون خریدتے تھے اور اس کے معاوضہ میں اٹلی کا بنا ہوا سامان دیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر غریب انگریز تاجروں کو اپنا مال بیچنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو جانا پڑتا تھا اور انھیں بڑی مشکلوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے لئے بحری سفر بہت طویل اور خطرناک ہوتا تھا۔ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ان پر اکثر حملے کر دیا کرتے تھے اور ان کے مال پر قبضہ کرکے ان کے جہازوں کو ڈبو دیتے تھے۔ جب کبھی یہ بےچارے منزل مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جاتے تھے تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے مال کی طرف کوئی متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

نئی دنیا کا انکشاف | لیکن ۱۴۹۳ء کے بعد سے حالات نے ایک نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا کہ کرسٹوفر کولمبس نے جو

اٹلی کا ایک جہاز راں تھا غیر معلوم سمندروں کا سفر کیا اور انگلستان کے مغرب میں نئی سرزمین کو دریافت کیا جس کا نام بعد میں امریکہ رکھا گیا۔ اس کے بعد اور لوگوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور بہت جلد سمندر پار دو سنے براعظموں یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ کو دنیا کی حدود میں شامل کر لیا گیا۔

انگریزی جہاز رانوں نے بھی اس نئی سرزمین کو دیکھنے کے لئے مغرب کا سفر کیا۔ انگریزوں کے بادشاہ کی ملازمت میں وینس کا ایک جہاز راں جان کیبٹ تھا اس نے ۱۴۹۷ء میں نیوفاؤنڈلینڈ کو دریافت کیا۔ انگلستان کے غریب بادشاہ نے اسے اس کارگزاری کے صلہ میں دس پونڈ یعنی ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا! لیکن انگلستان کے لوگوں نے دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ بہت سے آدمی آئندہ کے بحری سفر میں اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔

ان انکشافات کی وجہ سے یہ ملک کی تجارت کی رفتار تیز ہو گئی۔ اسپین اور پرتگال نے جن کا شمار اس وقت کی بڑی تجارتی قوموں میں کیا جاتا تھا سونا اور دوسری دولت کو لانے کے لئے دریافت کرنے والوں اور فتح کرنے والوں کو روانہ کرنا شروع کر دیا اور ان ملکوں کی دولت بہت تیزی کے ساتھ بڑھ گئی۔ اس کے بعد واسکوڈے گاما نے جو پرتگال کا ایک حوصلہ مند جہاز راں تھا افریقہ کے گرد چکر لگایا اور یہ معلوم کیا کہ تاجروں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ پورا راستہ پانی پر طے کر کے اپنا مال ہند شرقی، چین اور ہندوستان تک لے جائیں۔ بحر روم کے تاجر شرقی ملکوں کی تجارت میں اپنا حریف کسی کو بنتا نہ دیکھ سکتے تھے اس لئے انھوں نے مشکلات پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تاکہ مغربی یورپ کے تاجروں کو مکمل بحری راستہ نہ مل سکے۔ مگر اب ایسا راستہ ہند اور ماورائے ہند کا دریافت ہو گیا تھا جس پر ان کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

یہ اہم خبر ایک جہاز راں سے دوسرے جہاز راں تک، ایک شہر سے دوسرے شہر تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیلتی رہی۔ انگلستان کو ایشیا سے اپنی تجارت بڑھانے کا بہت شوق تھا اس نئے بحری راستہ کے دریافت ہو جانے کے بعد اس نے بھی تجارت کی اس تگ و دو میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ انگریزی ملاحوں نے پرتگیزی جہازوں پر ملازمت کرنا شروع کی تاکہ اس بحری راستہ کے

رموز کا پتہ چلائیں جو افریقہ کے گرد جاتا ہے۔ انگریزی تاجروں نے دور دراز علاقوں مثلاً ترکی، روس، گائنا اور افریقہ کے شمالی ساحل سے بھی تجارتی تعلقات شروع کر دیے اور انگلستان نے اس کا بھی پورا ارادہ کر لیا کہ مغرب میں جو نئی زمینیں دریافت ہوئی ہیں ان کی تجارت میں بھی اپنا واجبی حصہ حاصل کرے۔

سنہ ۱۵۰۰ء میں برطانوی بندرگاہیں تجارت کے خوش حال مراکز بن گئیں

یورپ کے ملکوں میں جہاں جہاں تجارت کی جاتی تھی وہاں کشتی سازی اور ملاحی نے اہم پیشوں کی حیثیت اختیار کرلی۔ برطانیہ کے نو عمر لڑکے ملاح بن کر سمندر کے سفر کرنے لگے۔ برطانوی تاجر خوشی کے ساتھ اپنے جان اور مال کو دنیا کے بعید ترین گوشوں سے تجارت کرنے کے لئے خطرہ میں ڈالنے لگے۔ انگلستان کے جری سپاہیوں نے جنھیں "ایلزبتھ کے سمندری کتوں" کے نام کو موسوم کیا جاتا تھا یعنی ڈریک، ریلے، ہاکنس اور گلبرٹ نے حریف ملکوں کے جہازوں کے سفر کو بہت خطرناک بنادیا۔ اسپینی جہازوں کی دولت کو یہ لوگ اکثر لوٹ لیا کرتے تھے جس کا یہ اثر ہوگیا تھا کہ برطانوی جھنڈے کو دیکھ کر غیر ملکی ملاح کانپنے لگتے تھے ان لوگوں نے بہت سے سالوں تک اسپین کی تجارت کو لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان جہازوں کے مال کو اپنے وطن لے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ غلاموں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ افریقہ سے غلاموں کو خریدتے تھے اور ہند مغربی کے اسپینی نوآبادی بسانے والوں یا اسپین کے دولتمند لوگوں کے ہاتھ انھیں فروخت کر دیتے تھے۔

یہ لوگ اس قدر دلیر تھے اور اسپین کے جہازوں کو اتنا نقصان پہنچاتے تھے کہ آخر میں مجبور ہو کر اسپین نے انگلستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس جنگ میں اسپین ناکامیاب رہا۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کا شاندار بیڑہ یعنی آرماڈا جو انگلستان کی بڑھتی ہوئی بحری قوت کو تباہ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ختم کر دیا گیا۔ اور اس طرح انگلستان کا ایک نہایت طاقتور حریف مقابلہ کے میدان سے خارج ہوگیا۔ انگلستان کے لوگوں کی ہمتیں اور حوصلے بڑھ گئے، اور انھوں نے کل دنیا کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی توجہ کو مرکوز کرنا شروع کر دیا۔

غرضکہ اس چھوٹے سے جزیرے کی تجارت دنیا کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اب دنیا میں اس کا محل وقوع بدل چکا تھا۔ اسپین اور پرتگال کے علاوہ یورپ کے باقی تمام ملکوں کے مقابلہ میں امریکہ سے اس کا فاصلہ کم یا برابر

تھا۔ اس کے پاس بہت سی اچھی بندرگاہیں اور عمدہ جہاز تھے۔ اس کی قوم کے لوگ ماہر جہاز ران بن گئے تھے اور انھیں تجارت کے فائدہ کا بھی پوری طرح علم تھا۔

چنانچہ اب انگلستان کا مقابلہ غیر ملکی تاجروں کے ساتھ بہت سخت قسم کا ہو گیا تھا۔ زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے انگلستان کے لوگ بڑے خطرے برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اپنے لدے ہوئے مال کو حفاظت کے ساتھ پہنچانے کے لئے انگلستان کے سمندری کپتان طوفانوں کے موقع پر دشمن کے جہازوں کی لڑائی کے وقت اور دوسرے خطرات کے موقعوں پر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ خوفناک بحری ڈاکو اب بھی ساحلوں پر گھات میں لگے رہتے تھے۔ جہاز بہت مختصر اور نازک ہوتے تھے اور اگر موجودہ معیار سے انھیں جانچا جائے تو بڑے سمندروں کے خطرات کے مقابلہ کرنے کی اہلیت ان میں بہت کم تھی۔

ملک کے اندر جو لوگ انگلستان کی تجارت کے کام میں مصروف تھے ان کی جانیں تو خطرے میں نہ ہوتی تھیں لیکن وہ اپنا مال خطرے میں ڈال رہے تھے۔ دولتمند خواتین اپنے زیور گروی رکھ کر تجارتی مال سے جہازوں کو لدوا کر تی تھیں۔ بیرونی تجارت سے نفع کمانے اور اپنی دولت کو کئی گنا بڑھانے کے لئے لوگ اپنا سارا روپیہ خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ اس زمانے میں صرف قیمتی مال جہازوں پر لادا جاتا تھا اور جب یہ مال ایک دفعہ ملکی بندرگاہوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ جاتا تھا تو اسے بہت بڑے نفع کے ساتھ فروخت کیا جا سکتا تھا۔ لوگ نفع کو ہی اپنے سامنے رکھتے تھے اور نقصان کا خیال اور اس اندیشہ کو کہ ممکن ہے جہاز ڈوب جائے، اور کبھی واپس نہ آئے دل میں جگہ نہ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ برابر ہوتا رہتا تھا کہ بہت سے آدمی دولتمند ہو جاتے تھے اور بہت سے بالکل تباہ و برباد۔ کاروباری لوگ بڑی بڑی بازیاں لگاتے تھے اور جہازوں کے واپس آنے کا دیر دیر تک انتظار کرتے رہتے تھے۔

برطانوی تاجروں کی تجارتی کمپنیاں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی

کسی ایک آدمی کے لئے دولتمند بن جانا بہت مشکل تھا۔ دو سال کی طویل مدت کے سفر کے لئے جو جہاز نکلتے تھے ان کے لئے سامان کوئی ایک آدمی تنہا فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تن تنہا جہاز کو حملہ آور ڈاکوؤں یا دوسرے ملکوں کے حریف جہازوں کے بالکل رحم و کرم پر رہنا پڑتا تھا۔ تاجروں نے اس مسئلہ کا حل کمپنیاں بنا کر کیا۔ یہ کمپنیاں جہازوں کا ایک بیڑہ

بناتی تھیں۔ ان کو چلانے کے لیے ملاحوں کو ملازم رکھتی تھیں اور طویل سفر کے لیے جس قدر غذا اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان سب کو فراہم کیا کرتی تھیں۔ ان کا نام تجارتی کمپنیاں ہوتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ان تجارتی کمپنیوں کی بہت مشہور مثال ہے۔ اس کے جو اراکین سمندر کا سفر کرتے تھے اگر وہ ڈوب نہ جاتے تھے یا ایشیا کے ویران ساحلوں پر بخار میں مبتلا ہو کر نہ مرتے تھے تو ایسے بے حساب دولت مند ہو جاتے تھے۔ اس کمپنی کی ابتدائی تاریخ مسلسل اور پیہم خطروں، جرأت، ہمت، عزم، استقامت، کامیابی اور ناکامی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ عرصہ تک باقی رہی اور اس کو منافع بھی زیادہ حاصل ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سنہ ۱۶۰۰ء میں ان انگریزی تاجروں نے بنایا تھا جنھوں نے ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان اور انگلستان کی تجارت کے اجارہ کا پروانہ حاصل کرنا چاہا تھا۔ ملکہ نے انہیں پروانہ دے دیا تھا۔ ۱۶۰۱ء میں چار جہاز جو اس کمپنی کی پہلی تجارتی مہم تھی انگلستان سے روانہ ہوئے تھے اور ڈھائی سال بعد یہ جہاز سیاہ مرچ سے لدے ہوئے واپس آئے تھے۔ کمپنی نے انھیں بیچ کر بہت نفع کمایا تھا۔

اس کے بعد اور زیادہ سرمایہ جمع کیا گیا۔ سنہ ۱۶۰۴ء میں یہی چاروں جہاز دوبارہ روانہ کیے گئے۔ ایک تو تباہ ہو گیا لیکن تین واپس آئے اور اپنے ساتھ سیاہ مرچ، لونگ، جائفل اور جوتری لاد کر لائے۔ کمپنی کے اراکین میں اس کی آمد پر بڑی ہماہمی اور ہنگامہ ہوا تھا۔

سنہ ۱۶۰۷ء میں تین اور جہاز بھیجے گئے لیکن ان کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں دو جہاز اور بھیجے گئے لیکن دونوں ضائع ہو گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۶۰۹ء میں ایک جہاز بھیجا گیا اور اتنا قیمتی مال واپس لایا کہ کمپنی کے شرکا کو دو سو فی صدی منافع تقسیم کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس کامیابی کی جب خبر پھیلی تو سرمایہ اکٹھا کرنا بہت آسان ہو گیا۔

سال گزرتے رہے اور کمپنی کی قسمت بھی پلٹے کھاتی رہی۔ بعض سالوں میں اسے نفع ہوتا تھا اور بعض میں نقصان۔ جب جہاز انگلستان واپس آنے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو مال کی ہر طرف سے مانگ رہتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں جو مال آتا تھا وہ موجودہ زمانے کے مال سے بہت مختلف ہوتا

تھا۔ آج کل کی طرح لوہے، کوئلے، گوشت، گیہوں، تیل وغیرہ سے جہاز لدے ہوئے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں تیس لاکھ پونڈ سیاہ مرچ، ۲ لاکھ پونڈ جوتری   پندرہ لاکھ پونڈ شورا ہوا کرتا تھا۔ تانبے اور ٹین کی بھی مانگ رہتی تھی۔ اسی طرح کافی، چائے، ادرک، بانس بنگالی ریشم، سوت اور رنگین رومالوں کی بھی مانگ تھی۔ جب کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز واپس آتے تھے تو لوگ بڑے ذوق اور شوق سے ان چیزوں کو خریدا کرتے تھے۔

لیکن رفتہ رفتہ جہاز رانی محفوظ ہوتی گئی۔ زیادہ جہاز مال سے لدے ہوئے انگلستان واپس آنے لگے اور کمپنی نے آہستہ آہستہ روپیہ پیدا کرنا شروع کیا۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں اور کمپنیاں بنائی گئیں۔ کچھ لوگوں نے وہیل مچھلی کا شکار کرنے کے لئے جہاز بنائے اور بعض گرین لینڈ کے سمندروں میں بھیجنا شروع کردیا۔ وہیل کے شکار کی صنعت بھی اتنی ہی غیر یقینی تھی جتنی مشرق بعید کی تجارت۔ بعض سالوں میں کمپنی کامیاب ہوجاتی تھی اور بعض سالوں میں بالکل ناکام رہتی تھی لیکن ان کمپنیوں کی ناکامی کے باوجود انگریز تاجر اپنا روپیہ ان کمپنیوں میں لگاتے رہے۔ ان کے جہاز کرہ زمین کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے رہے اور انگلستان کی تجارت جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے برابر بڑھتی رہی۔

سنہ ۱۶۱۳ء تا سنہ ۱۷۵۰ء میں انگلستان کی تجارت کی ترقی	
سنہ ۱۶۱۳ء	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر
سنہ ۱۷۰۰ء	۶ کروڑ ۲۰ لاکھ "
سنہ ۱۷۵۰ء	۱۰ کروڑ ڈالر

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کی حالت میں کس طرح تبدیلی واقع ہوئی۔ ابتدا میں انگلستان مہذب دنیا کے بالکل سرے پر آباد تھا لیکن بعد میں وہ دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ اس کے مناسب محل وقوع اس کی عمدہ بندرگاہوں اور اس کی حوصلہ مند آبادی نے اسے تجارتی رہنمائی کا اہل بنا دیا۔ انگریز قوم کو سمندر سے اور تجارت کے کاروبار سے ہمیشہ انسیت رہی ہے۔

اس غیر ملکی تجارت سے برطانیہ کی صنعتوں کو بھی ترقی ہوئی۔ دور کے ملکوں کی عمارتی لکڑی، گرم مسالے

اور نیا اس کو جب انگلستان نے حاصل کرنا چاہا تو اسے اس کے بدلے میں اپنی بنی ہوئی چیزوں کو روانہ کرنا پڑا۔ انگلستان کے کاریگروں نے لوہے کا مال، اونی اور سوتی مال، مٹی کے برتن، گھر کے استعمال کی چیزیں روز بروز زیادہ مقداروں میں بنانا شروع کیں اور انھیں انگلستان کے تاجروں نے ان ملکوں میں بیچنا شروع کیا جہاں سے وہ کچا مال حاصل کرنا چاہتے تھے۔

برطانیہ کے لئے ایک بڑے تجارتی بیڑہ کی تعمیر | چونکہ برطانیہ بہت سی چیزیں درآمد اور برآمد کرتی تھی اس لئے انگریز تاجروں نے مال کو لانے اور لیجانے کے لئے خود اپنے جہاز تعمیر کرنا نفع بخش سمجھا۔ تجارتی کمپنیاں تو اس کام کو پہلے ہی سے کر رہی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو جہاز ابتدا میں بنائے اس میں جس اصول کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا وہ یہ تھا کہ جہاز چاہے سست رفتار ہوں لیکن ہونے چاہئیں مضبوط اور مستحکم۔ یہ بہت پختہ ہوتے تھے ہوا اور خراب موسم کا مقابلہ کر سکتے تھے اور بحری ڈاکوؤں کو پسپا کرنے کے لئے خوب مسلح ہوتے تھے۔ لیکن یہ سپاٹ اور چوکور ہوتے تھے اس لئے ان کی رفتار تیز نہیں ہوتی تھی۔ انگلستان سے ہندوستان تک سفر کرنے میں دو سال بلکہ اس سے بھی زائد لگ جاتے تھے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی کے پورے زمانہ میں ایسی سست رفتار لیکن محفوظ جہازوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں "ٹی کلیپرس" کی تعمیر | ابتدا میں چائے کا شمار تعیشات میں ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۶۶۴ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قیمتی تحفہ انگلستان کے بادشاہ کو دینا چاہا تو اس نے دو پونڈ چائے کے ایک بنڈل کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔

سترھویں صدی میں انگلستان کے لوگوں نے چائے کو پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ سنہ ۱۸۰۰ء تک مشرق بعید کی تجارت کا یہ ایک اہم جز بن گئی تھی لیکن مال کے جہازوں کی سست رفتاری کی وجہ سے اس کی تجارت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ چین سے انگلستان تک آنے میں جو ایک سال صرف ہوتا تھا اس میں چائے کا سارا ذائقہ ختم ہو جاتا تھا۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں نئے نمونہ کے بادبانی جہازوں نے جو امریکہ میں بنائے جاتے تھے انگریزی جہازوں کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ یہ جہاز پتلے اور ترشے ترشائے ہوتے تھے تقریباً ایک ایکڑ کے رقبہ میں

ان کے سفید بادبان پھیلے ہوئے ہوتے تھے اور جب ان میں ہوا بھر جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرند اڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ان کا نام "ٹی کلیپرس" تھا۔ انگلستان کو مشرق کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے ان کی نقل اتارنا پڑی۔

ان جہازوں کے تیز رفتار اور قابلِ اعتماد ہونے کا پتہ ان کی انتہائی کارگزاریوں سے چلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ پانچ "ٹی کلیپرس" چین کے فوچو مقام سے ایک ہی روز روانہ ہوئے اور انگلستان کے دریائے ٹیمس میں چند گھنٹوں کے فصل سے ۱۲۰ دن بعد پہنچ گئے۔ اس طرح پر انگلستان کے "کلیپر" جہازوں کے بیڑے نے رفتار کی تیزی کے مسئلہ کو حل کر دیا۔

ان "کلیپر" جہازوں کو اس زمانہ میں ایک بڑی حیرت انگیز چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چلانے کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی تھی اور جو کپتان انھیں چلاتے تھے وہ حریف جہازوں کے ساتھ اپنے مقابلہ کا تذکرہ فخر کے طور پر کیا کرتے تھے۔

فولاد کے بنے ہوئے دخانی جہاز

لیکن تمام بادبانی جہاز جس میں "کلیپرس" بھی شامل تھے ہوا اور موسم کے پابند ہوا کرتے تھے چار مہینے کے اندر چین سے انگلستان تک کا سفر نہایت موافق حالات میں کیا جا سکتا تھا لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہوا اور طوفان کی وجہ سے انھیں دیر ہو جاتی تھی بلکہ راستہ بھٹک جاتا تھا اس لئے جہازوں کی کمپنیاں زیادہ قابلِ اعتماد ذرائع سفر کی ضرورت بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھیں۔

سنہ ۱۸۰۰ء کے ابتدائی سالوں میں دخانی انجنوں سے چلنے والے جہازوں کی افواہ مشہور ہوئیں رابرٹ فلٹن کے جہاز کلیرمونٹ نے دریائے ہڈسن پر چلنا شروع کر دیا اور دریائے اوہیو اور میسیسپی پر بھی دخانی کشتیاں چلنے لگیں۔ جہاز بنانے والوں نے سوچنا شروع کیا کہ دخانی جہاز سمندروں پر بھی کیوں نہ چلائے جائیں تاکہ سفر میں تیزی اور باقاعدگی پیدا ہو جائے اور ترقی پسند جہاز سازوں نے مسافروں اور مال کے لیے ایسے جہاز بنانا بھی شروع کر دئے۔

سنہ ۱۸۳۸ء میں ایک انگریزی جہاز "گریٹ ویسٹرن" بحر اٹلانٹک کو پار کر کے محض دخانی قوت سے نیو یارک پہنچ گیا۔ انگلستان کو واپس ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ ۶۸ مسافر اور ۲۰ ہزار خطوط لایا۔ اور

پندرہ دن کے اندر اس نے اپنا سفر پورا کر لیا۔ اس سے جہاز بنانے والی کمپنیوں کو دخانی جہازوں کے فائدہ کا یقین ہو گیا۔ بادبانی جہاز بالکل تو ختم نہیں ہوئے۔ بادبانوں کی قوت کے استعمال کرنے میں خرچ کم تھا اور اس سے سفر خاصی تیزی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا اسی لئے آج بھی بہت سے بادبانی جہاز سمندر کا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔

لیکن دخانی انجنوں نے بادبانوں کی جگہ لینا شروع کر دی اور پرانے اور لکڑی کے جہازوں اور ترشے ہوئے "کلیپرس" کی جگہ فولاد کے بنے ہوئے جہاز استعمال کئے جانے لگے۔ اس سے برطانیہ کو سمندروں پر اپنی برتری قائم رکھنے کا موقع مل گیا ورنہ کلیپرس کے ذریعہ سے امریکہ نے برطانیہ کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوہے اور فولاد کو برطانیہ نے امریکہ سے پہلے بنانا شروع کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ برطانیہ فولاد کے جہاز امریکہ کے مقابلہ میں سستے بنا سکتا تھا۔
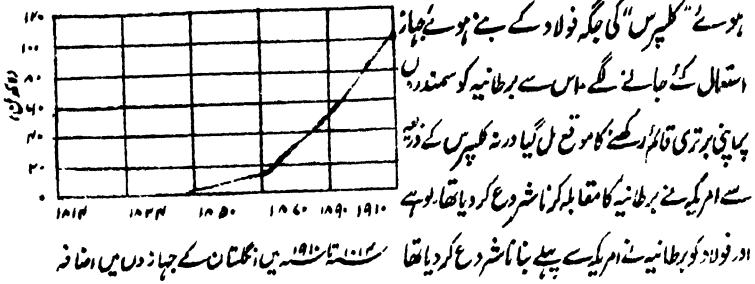
۱۲۰
۱۰۰
۸۰
۶۰
۴۰
۲۰
۰
(لاکھ ٹن)
۱۸۱۴ ۱۸۲۴ ۱۸۵۰ ۱۸۶۰ ۱۸۹۰ ۱۹۱۰

۱۸۱۴ء تا ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے جہازوں میں اضافہ

چنانچہ جتنی فیکٹریاں بڑھتی رہیں کوئلہ کو جتنی کانوں سے نکالنے کا کام ترقی پاتا رہا اور زیادہ فولاد اور ریل کی پٹریاں بنائی گئیں اتنی ہی جہازوں کی طلب، کارخانوں اور کانوں کی پیداوار کو انگلستان سے باہر اور غذا اور کچے مال کو انگلستان کے اندر لے جانے کے لئے بڑھتی رہی۔ انگلستان کے تجارتی بیڑہ کو ترقی ہوتی رہی اور سمندروں پر اس کا اقتدار مسلم ہو گیا۔

۱۸۵۰ء کے بعد سے انگلستان کے دخانی جہازوں کا بیڑا قوت اور حجم میں بڑھتا رہا۔ جنگ عظیم سے بہت پہلے انگلستان کے جہازوں کا وزن کل دنیا کے جہازوں کے وزن کا ایک تہائی ہو گیا تھا اور یہی صورت کم و بیش آج تک قائم ہے۔ ۱۹۲۸ء میں دنیا کے دخانی

دنیا کی میزان = ۶,۵۱,۵۹,۰۰۰
برطانیہ عظمی اور برطانوی مقبوضات ۲,۲۵,۰۴,۰۰۰
ریاست ہائے متحدہ امریکہ = ۱,۲۵,۰۰,۳,۰۰۰
جاپان = ۴۰,۳,۰۰۰
جرمنی = ۳۶,۲۶,۰۰۰
فرانس = ۳۲,۵۶,۰۰۰
تمام دوسرے ملک = ۱,۴۵,۱۸,۰۰۰
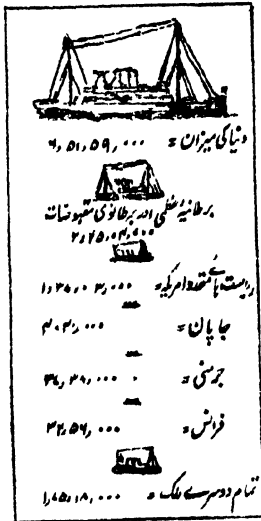
اس نقشہ میں دنیا کے دخانی جہازوں اور موٹر جہازوں کے وزن کو ٹنوں میں مجموعی طور پر اور مختلف ملکوں کے لئے الگ الگ دکھایا گیا ہے یہ اعداد ۱۹۲۶ء کے ہیں۔

اتنے آدمیوں نے کھیتی کا پیشہ چھوڑ کر شہر کی فیکٹریوں میں کام کرنا شروع کیا ہوتا۔ برطانیہ میں کوئلہ کی کثیر رسد کی وجہ سے یہاں کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو بھی ترقی ہوئی کوئلہ کی قوت سے جہاز چلائے گئے کوئلہ کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا کہ انگلستان کے جہاز جاتے وقت اور واپس آتے وقت دونوں موقعوں پر مال سے لدے ہوئے رہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ برطانیہ میں جو مال درآمد کیا جاتا تھا مثلاً لوہا گیہوں عمارتی لکڑی وغیرہ۔ یہ تو حجم میں زیادہ ہوتا تھا اور جگہ زیادہ گھیرتا تھا لیکن برطانیہ سے جو مال جاتا تھا مثلاً کپڑا اور دوسری مصنوعی اشیا وہ جگہ کم گھیرتی تھی۔ جہاز کے مالک چاہتے تھے کہ جاتے وقت اور آتے وقت دونوں موقعوں پر ان کے جہاز مال سے لدے ہوئے رہیں کیونکہ اگر جہاز خالی رہے تو اس سے روپیہ کے نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس لئے برآمد کے وقت جہاز کا جو حصہ خالی رہتا تھا اس میں کوئلہ بھرا جاتا تھا۔ ارجنٹائنا اور ہندوستان کوئلہ خریدنا چاہتے تھے برطانیہ کے بحری مرکزوں کے لئے جو جزیروں پر واقع تھے کوئلہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس لئے جاتے وقت جب جہاز کم حجم کا مصنوعہ مال لے جاتا تھا اس میں کوئلہ بھی لادا جا سکتا تھا۔ جاتے وقت ہلکی مصنوعہ چیزیں اور کوئلہ اور آتے وقت بڑا حجم رکھنے والا کچا مال مثلاً لوہا عمارتی لکڑی، روئی اور غلہ۔ غرض دونوں وقت وزن برابر رہتا تھا۔ اور برطانیہ کے لئے جہاز رانی بہت نفع بخش ہوتی تھی۔

برطانیہ کا صنعتی انقلاب کے بعد غذا کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار

اس نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ برطانیہ نے شہروں کی آبادی کے لئے غذا کہاں سے کتنی مقدار میں حاصل کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۸۰۱ء کے بعد سے برطانیہ کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا۔ اس وقت آبادی ایک کروڑ ۵ لاکھ تھی۔ سو سال بعد آبادی ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ ہوگئی۔ لیکن صنعتی انقلاب کے شروع ہونے کے بعد سے انگلستان کے لوگوں نے کھیتی کے کام کو چھوڑنا اور شہروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے باوجود اس کے کہ لوگوں کی تعداد

تیزی سے بڑھ رہی تھی پھر بھی انگلستان میں غذا کی پیداوار برابر کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا صحیح اندازہ رقبہ زیر کاشت سے کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۸۷۱ء تک تو زیر کاشت زمین میں کمی نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے کھیتی کم زمینوں پر کی جانے لگی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں صرف ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ایکڑ پر کاشت کی جاتی تھی گویا سنہ ۱۸۷۱ء کے مقابلہ میں ۲۲ فی صدی کی کمی ہو گئی تھی۔

گیہوں کی کاشت میں اور بھی حیرت انگیز کمی ہوئی۔ اور حیرت انگیز اس لئے کہا گیا کہ انگلستان کے لوگ زیادہ تر گیہوں کی روٹی کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں ۴۰ لاکھ ایکڑ زمین پر گیہوں بویا جاتا تھا۔ لیکن چالیس سال بعد جتنے رقبہ پر گیہوں بویا جاتا تھا وہ ۵۰ فی صدی گھٹ گیا تھا۔ جَو، جئی، آلو اور دوسری خاص خوردنی اجناس کی کاشت میں بھی ایسی ہی کمی واقع ہو گئی تھی۔ ایک طرف تو اجناس خوردنی کی کاشت ۵۰ فی صدی گھٹ گئی تھی اور دوسری طرف آبادی ۵۰ فی صدی بڑھ گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز صورت حال تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک جب کہ جنگ عظیم شروع ہوئی اتنے لوگوں نے کھیتی کے کام کو ترک کر دیا تھا کہ انگلستان کے صرف ۷ فی صدی کام کرنے والے کھیتی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے شہروں کے ہزاروں بھوکے لوگوں کا پیٹ انگلستان کے کسان نہیں بھر سکتے تھے۔ غذا اور دوسرے کچے مال کو انگلستان میں باہر کے ملکوں سے لانے کی ضرورت تھی۔ کھیتی کے کام کو چھوڑنے اور صنعتی ملک بن جانے کی وجہ سے انگلستان اپنے غذا کے ایک بڑی حصہ کے لئے باہر کی دنیا پر انحصار کرنے لگا

گوشت	۱،۷۴،۱۰،۲۴۰ ڈالر	
	۲۲۳،۳۴،۸۰،۱۲۰ ڈالر	
مکھن اور اس کے بنے کی چیزیں	۱،۵۶،۳۳،۴۲۰ ڈالر	
	۱۲،۵۳،۰۵،۲۸۰ ڈالر	
پنیر	۶،۰۰،۷۰،۱۴۰ ڈالر	
	۲۶،۲۵،۲۳،۷۲۰ ڈالر	
کچے پھل	۳،۰۰،۷۷،۵۴۰ ڈالر	
	۴،۴۰،۹۴،۷۸۰ ڈالر	

سالانہ متوسط
سنہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۶۲ء
سنہ ۱۹۰۵ تا ۱۹۱۱ء

گیہوں کے علاوہ اور دوسری خاص غذاؤں کی درآمد ان تختیلوں سے سالانہ درآمد کے اوسط کا اظہار سنہ ۱۸۵۶ تا سنہ ۱۸۶۲ء اور سنہ ۱۹۰۵ تا سنہ ۱۹۱۱ء کے سالوں کے لئے کیا گیا ہے۔

تھا۔ اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے تقریباً ربع صدی قبل غیر ملکوں پر یہ انحصار اور بھی بہت زیادہ تھا۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں برطانیہ میں ۱۳۵ پونڈ گیہوں فی شخص درآمد کیا جاتا تھا اور سنہ ۱۹۰۵ء میں

۲۶۲ پونڈ گیہوں فی شخص۔ برطانیہ میں جو گیہوں استعمال کیا جاتا ہے اس کا ۲/۵ حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور ارجنٹائنا سے منگایا جاتا ہے۔ دوسری بنیادی غذاؤں کے لئے بھی برطانیہ کا دارومدار دوسرے ملکوں پر ہے۔ جنگ سے پہلے بھی گوشت کا ۴۰ فی صدی حصہ باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ ہر سال انڈوں اور مکھن پنیر وغیرہ کی بیشتر مقدار دوسرے ملکوں سے حاصل کی جاتی ہے۔

کچے مال مثلاً روئی، خام لوہا، ربڑ وغیرہ کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر دارومدار

سنہ ۱۸۰۰ء سے پہلے بھی انگلستان کے کاتنے اور بننے والے اونی کپڑے کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑا اپنے گھروں پر بنایا کرتے تھے۔ لیکن برطانیہ کی سرد مرطوب آب وہوا میں روئی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے انگلستان کے پارچہ بافوں کو دور دراز ملکوں سے روئی حاصل کرنے کے لئے اپنے جہاز روانہ کرنا پڑتے تھے دنیا کے تین اہم روئی کے مرکزوں یعنی ریاست ہائے امریکہ کی جنوبی ریاستوں، ہندوستان اور مصر سے سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد روئی کی کثیر مقدار لائی جانے لگی۔ سوتی کپڑے کی صنعت نے خوب ترقی پائی دستی بنائی کی جگہ مشین کی بنائی نے رواج پالیا اور انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی کا دارومدار غیر ملکوں سے روئی کے فراہم کرنے پر ہوگیا۔

انگلستان کی فیکٹریوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی تھی کہ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں بھی کاتنے والوں اور بننے والوں کو مصروف رکھنے کے لئے دنیا میں کافی روئی پیدا نہیں کی جاسکتی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ روئی کے پھل کو توڑنے اور صاف کرنے کا کام اتنی تیزی سے نہیں ہوتا تھا جس سے بے کار مزدوروں اور مشینوں کو مصروف رکھا جاسکتا۔ دور کے ملکوں میں سیاہ رنگ کے لوگ گرم سورج کے نیچے ہاتھ سے کپاس کو توڑا کرتے تھے۔ کپاس سے بنولے علیحدہ کرنے کا کام بھی ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ یہ کام اتنا سست اور صبر آزما ہوتا تھا کہ کپاس کے سینکڑوں کھیتوں کے مزدور انگلستان کی بھوکی مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی روئی تیار نہ کرپاتے تھے۔

سنہ ۱۷۹۳ء میں امریکہ کے ایک اسکول ماسٹر ایلی وہٹنی نے انگلستان کے کاتنے اور بننے والوں

کو ان کی پریشانی سے نجات دلائی۔ اس نے روئی اوٹنے کی مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے بنولے نکالنے کا کام ہاتھ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ کیا جانے لگا۔ اس اہم ایجاد کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقہ میں انگلستان کی فیکٹریوں کے لئے زیادہ مقدار میں روئی پیدا کی جانے لگی یہاں تک کہ امریکہ سے انگلستان کے استعمال کے لئے ۵۰ فی صدی روئی مہیا کی جانے لگی۔ پچاس سال کے اندر انگلستان کی مشینوں میں اتنی اصلاحیں کی جا چکی تھیں کہ برطانیہ کی فیکٹریوں کے لئے روئی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہندوستان اور مصر یہ تین ملک سب سے زیادہ روئی پیدا کرتے ہیں اور ان ہی تین مقامات سے برطانیہ سب سے زیادہ روئی منگاتا ہے۔ ان دو بائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں مختلف ملکوں کے لئے کپاس کی پیداوار کے تناسب کے ملکوں پر سو سال پہلے کی طرح آج فی صدی کو دکھلایا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں دنیا کے مختلف ملکوں بھی انگلستان کے مزدوروں کی زندگی کی کپڑے کی پیداوار کے فی صدی تناسب کو دکھایا گیا ہے۔

کا دار و مدار ہے۔ کاتنے اور بننے والی فیکٹریوں کو مصروف رکھنے کے لئے روئی کی رسد بہت ضروری ہے۔ جب کسی وجہ سے ان علاقوں میں روئی کی پیداوار کم ہو جاتی ہے مثلاً روئی میں کیڑا لگ جاتا ہے یا بارش کی کمی اور زیادتی کا فصل پر اثر پڑتا ہے تو انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ان کے لئے روئی کی کثرت کے معنی غذا، کپڑے اور مکانوں کی کثرت کے ہیں۔

خام لوہے کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار

انگلستان میں کچھ خام لوہا تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے انگلستان کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی لوہا موجود تھا۔ اس کی ضرورتیں زیادہ تر . . . . . . اوزاروں اور ہتھیاروں کے لئے لوہے کی ضرورت ہوتی

تھی۔ لیکن مشینوں کی ایجاد اور انگلستان کے صنعتی ملک بن جانے کے بعد انگلستان کی ضرورت لوہے اور دوسرے کچے مالوں کے لئے جو فولاد بنانے میں کام آتے ہیں بہت بڑھ گئی۔ بغیر فولاد کے نہ ریلیں بنائی جا سکتی ہیں نہ جہاز، نہ فیکٹریاں کھڑی کی جا سکتی ہیں نہ مشینیں۔ برطانیہ کو اب خام لوہا حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ دوسرے ملکوں خصوصاً سویڈن اور اسپین پر دار و مدار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ فولاد کے بنانے کے لئے جن دوسرے کچے مالوں کی ضرورت ہے ان کے لئے بھی اسی اور دوسرے ملکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ فولاد کے بنانے میں دوسری دھاتوں مثلاً کرومیم، ٹن اور نکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ برطانیہ میں یہ چیزیں کافی مقدار میں موجود نہیں ہیں اس لئے برطانیہ کی بندرگاہوں میں نکل کناڈا سے، کرومیم اور لوہا اسپین، ایشیائے کوچک اور ہندوستان سے وینیڈیم جنوبی امریکہ سے اور اس طرح دوسرے سامان دوسرے ملکوں سے آتے رہتے ہیں۔

ربڑ کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار

جب یہ عہد کی صنعتی دنیا ربڑ پر سفر کر رہی ہے۔ برطانیہ میں بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر ٹھیلے چلتے ہیں۔ اگر ان کے ٹائروں اور دوسرے حصوں کے لئے ربڑ موجود نہ ہوتا تو سفر ناممکن ہو جاتا۔ انگلستان کی ریل گاڑیوں میں جو ہوائی بریک لگائے جاتے ہیں ان میں بھی ربڑ لگایا جاتا ہے۔ نقل و حمل اور خبر رسانی کا دار و مدار ربڑ پر ہے۔ جماعتوں کی زندگی ربڑ کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ لیکن برطانیہ میں ایک پونڈ ربڑ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ برطانیہ جتنا ربڑ استعمال کرتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ سیلون، ریاست ہائے ملایا، جاوا، بورنیو اور منطقہ حارہ کے دوسرے جزیروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ انگریز ربڑ کے ان باغات کے مالک ہیں اور ان میں دنیا کے ربڑ کی مجموعی پیداوار کا ۳/۵ حصہ پیدا ہوتا ہے۔ ربڑ پیدا کرنے والی بیشتر زمین سلطنت برطانیہ کی حدود میں شامل ہے۔

معدنی تیل کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار

صنعتی قومیں کوئلہ کے بعد جس ایندھن کا بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں وہ معدنی تیل ہے۔ حال کے سالوں میں برطانیہ نے معدنی تیل کا استعمال بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ برطانیہ کے فوجی بحری جہازوں کا ۹۰ فی صدی حصہ اور اس کے تجارتی

جہازوں کی خاصی بڑی تعداد تیل استعمال کرنے والے انجنوں سے چلائی جاتی ہے۔ برطانیہ کی سڑکوں پر بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر ٹھیلے تیل سے چلائے جاتے ہیں۔ اس کی فیکٹریوں کے بہت سے انجن بھی تیل سے چلنے لگے ہیں۔ برطانیہ دنیا کے ان ملکوں میں ہے جن میں تیل کا صرف بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انگلستان میں یہ تمام معدنی تیل پیدا نہیں کیا جاتا۔ کچھ تیل تو سینکڑوں سالوں سے انگلستان کے کنوؤں اور چشموں سے نکالا جا رہا ہے لیکن دنیا کے نقشہ میں تیل کے جن اہم کھیتوں کو دکھایا جاتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی برطانیہ میں واقع نہیں ہے۔ تیل کے لئے برطانیہ کو ریاست ہائے امریکہ، میکسیکو، روس، ایران، ڈچ جزائر ہند مشرقی، وینی زوایلا، رومانیا اور میسوپوٹامیا پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہی آٹھ علاقے دنیا میں ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ معدنی تیل پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے کچے مالوں کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار گنجایش کی کمی کی وجہ سے ان تمام اشیاء غذا اور کچے مالوں کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے جن کے لئے برطانیہ دوسرے ملکوں پر انحصار کرتا ہے۔ انگلستان کے لوگ چائے اور کافی بہت پیتے ہیں۔ چائے کے لئے انھیں چین، جاپان، سیلون ہندوستان اور مشرق بعید کے دوسرے مقامات پر انحصار کرنا پڑتا ہے ان کی کافی برازیل، وسطی امریکہ، میکسیکو اور جزائر ہند غربی سے آتی ہے۔ انگلستان کے لوگ شکر کا بھی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور تقریباً تمام شکر یورپ یا جزائر ہند غربی یا دوسرے دور دراز مقامات سے لائی جاتی ہے۔

انگلستان کے دسترخوان کو لیگ آف نیشنس کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے کیونکہ انگلستان کے لاکھوں گھروں میں وہ غذائیں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں دنیا کے مختلف ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی زندگی کا معیار بلند ہے۔ ان کو بہت سے ایسے کھانوں کی عادت پڑگئی ہے جو برطانیہ میں پیدا نہیں کئے جاسکتے۔ مثلاً انھیں انجیر، کھجوریں، لیموں، کیلے، ناریل، کوکو، چاکلیٹ، بادام، چلغوزہ، کاجو، اخروٹ، زیتون اور سینکڑوں دوسری چیزوں کی ضرورت رہتی ہے جو سب دور دراز ملکوں سے درآمد کی جاتی ہے۔

انگلستان کے لوگوں کی آمدنی جتنی انیسویں صدی میں بڑھتی رہی ہے اتنی ہے آرام اور عیش کی چیزوں

کے لئے اُن کی طلب میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کے کپڑوں میں بہت تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ دوسرے علاقوں کے نئے نئے سامان استعمال کیے جاتے ہیں۔ گھر کے برتن اور سامان کی تعداد اور تنوع میں بھی اضافہ ہوگیا ہے اور ان میں سے اکثر ایسی چیزوں سے بنائے جاتے ہیں جنھیں ایشیا افریقہ شمالی امریکہ غرضکہ ہر براعظم سے حاصل کیا جاتا ہے مختصر یہ کہ جتنا برطانیہ کے معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے اتنا ہی اس کا انحصار دوسرے ملکوں پر زیادہ ہوگیا ہے۔

خلاصہ:۔ برطانیہ چار بڑے وجوہ کی بنا پر دنیا کی تجارت کا مرکز بن سکا۔

۱۔ جدید دنیا سے تجارت کرنے کے لئے برطانیہ کا محل وقوع مناسب تھا

۲۔ برطانیہ پہلا ملک تھا جس نے بڑے پیمانہ پر مشینوں سے چیزوں کو بنانا شروع کیا

۳۔ برطانیہ نے جہاز رانی کی صنعت کو خوب ترقی دی

۴۔ اپنے جہازوں اور فیکٹریوں کو قوت مہیا کرنے کے لئے اور دوسرے ملکوں کو فروخت کرنے کے لئے اس کے پاس کوئلہ کے بڑے ذخیرے موجود تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر انگلستان دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔

انگلستان پہلے ایک ایسا ملک تھا جو دنیا کے بالکل سرے پہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اب اس کا محل وقوع دنیا کے لوگوں سے چیزوں کا مبادلہ کرنے کے لئے بہت موزوں ہے۔

پہلے یہ ایک ایسا زراعتی ملک تھا جس میں ابتدائی طرز کی زندگی بسر کی جاتی تھی لیکن اب کوئلہ کی کان کنی اور چیزوں کو مصنوعہ شکل دینے میں اس کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔

پہلے یہ سب سے جدا اور اپنی ضرورتیں خود آپ پوری کرتا تھا لیکن اب دنیا کے بعید ترین ملکوں پر اسے اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے انحصار کرنا پڑتا ہے۔

پہلے یہ منتشر کھیتوں اور چھوٹے قصبوں کا ملک تھا لیکن اب گنجان آباد شہروں کا ملک بن گیا ہے۔

پہلے اس کی آبادی کو زندگی کی محض انتہائی ضروری چیزیں دستیاب ہو سکتی تھیں لیکن اب یہ ایک دولتمند ملک ہوگیا ہے اور اس کے لوگوں کا معیار زندگی امریکہ کو چھوڑ کر باقی سب ملکوں کے مقابلہ میں بہت

زیادہ بلند ہے۔
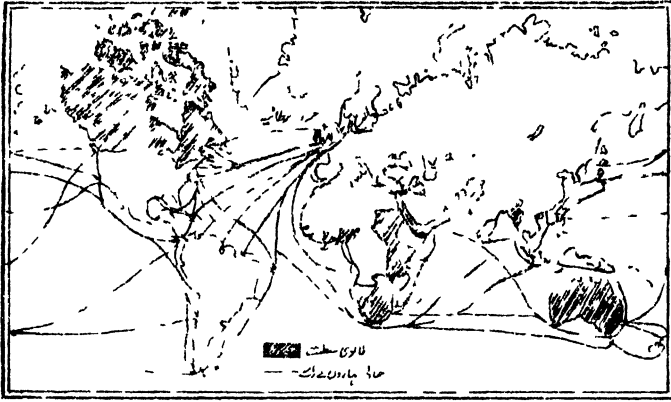
دنیا کے سمندروں میں تجارت کی راہیں

دنیا کی تجارت کا ایک نقشہ بنا کر موجودہ صورت حال کو اچھی طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس نقشہ سے برطانیہ کی مرکزیت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ ہاتھ کی انگلیوں کی طرح تجارت کے بہت سے راستے انگلستان سے نکلتے ہیں اور سمندروں کو عبور کرتے ہوئے دنیا کے بعید ترین ملکوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اپنی ان انگلیوں کے ذریعہ برطانیہ دنیا کی ہر قسم کی پیداوار لو اپنی مٹھی میں بند کرتی رہتی ہے اور اس کے معاوضہ میں اپنے مال کو باہر بھیجتی رہتی ہے۔ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان جو تجارت کا سلسلہ جاری ہے اس کا اظہار موٹی لکیر سے ہوتا ہے۔ دوسری موٹی لکیر اسپین کا چکر لگاتی بحر روم اور نہر سویز سے ہوتی ایشیا اور افریقہ کے درمیان سے گزرتی مشرق بعید تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے مختلف علاقوں کو جو راستے جاتے ہیں وہ بھی خاصے موٹے ہیں۔

ان راستوں کے ذریعہ برطانیہ کی تجارت جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں اتنی کثیر تھی کہ درآمد اور برآمد کی مجموعی مقدار تقریباً ، ارب ڈالر ہوتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آج کل کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی قتل ہو جاتا ہے تو پولس مردے کی لاش کا معائنہ کراتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ موت اس طرح واقع ہوئی اور اس سے قتل کا جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ قاتل پکڑا نہ گیا ہو تو اس ذریعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے، اور اسے گرفتار کرنے کی تدبیریں بھی کی جا سکتی ہیں۔ چیکوسلواکیا کا خاتمہ کوئی تین ہفتے پہلے ہو چکا ہے اور زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے سمجھیے کہ خاصی مدت گذر چکی ہے، لیکن یہ مردہ ابھی تک بے نام و نشان نہیں ہو گیا ہے اور اس کا معائنہ کرنے سے پہلے اس سیاست کے بڑے بڑے بھید کھولے جا سکتے ہیں جو اس جرم کا اصل سبب ہیں۔

یہ تو نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ قتل کی ترکیب انوکھی تھی۔ چیکوسلواکیا کی پہلے تو کھال کھینچی گئی، اور پھر اس بنا پر کہ جس کی کھال کھینچی گئی ہے وہ زندہ نہیں رہ سکتا، مارنے والے نے چیکوسلواکیا کو جان سے مار ڈالا۔ جرم کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ کھال کھینچنے میں پولیس مجرم کے ساتھ تھی اگرچہ اس نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ضرورت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اس کے بعد مجرم بھی پولیس کو چیکوسلواکیا کو سلامت رکھنے میں مدد دے، مجرم نے وعدے کے خلاف چیکوسلواکیا کی جان لے لی، جس پر پولس چلا رہی ہے کہ بڑی ہتیا ہو گئی، یورپ کا دھرم نشٹ ہو گیا، اخلاق کی جڑ کٹ گئی۔

ہمارے ملک میں ایسا کوئی حادثہ ہوتا تو آپ ضرور کہتے کہ پولس جرم میں شریک تھی، اس لئے اس پر بھی قتل کا الزام لگتا ہے، لیکن قومیں جب ایسا جرم کرتی ہیں تو انھیں سزا دینے والا کوئی

نہیں ہوتا، لوگ خدا کو یاد کرکے رہ جاتے ہیں اسی وجہ سے ہوشیار قوموں کو چاہیئے کہ وہ ایسے حادثوں پر غور کرتی رہیں اور اپنے آپ کو مجرموں سے نہیں بلکہ ہمدردوں سے اور مددگاروں سے بچائے رکھیں، جو پولس کی وردی پہن کر مجرموں کا کام آسان کرنے کو پہنچ جاتی ہیں، اس لحاظ سے دیکھئے تو چیکوسلواکیا پر جو دوسرا دار کیا گیا، وہ اور بھی سبق آموز ہے۔

پچھلے اکتوبر میں جب سوڈیٹن علاقے جرمنی کو دے دیئے گئے، یعنی چیکوسلواکیا کی کھال کھینچی گئی تو خاص سلواکیا میں آزادی کی ایک تحریک جس کے بانی پادری ملسکا تھے، اور جس کی فوج ملسکا گارڈ کہلاتی تھی، خاصی ترقی کر چکی تھی اور اب تو یہ بات پھیل گئی ہے، کہ سلواکیا کی اس تحریک کو جرمنی کا روپیہ چلا رہا تھا، اکتوبر تک باہر کے لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا، کہ جرمنی کو اس تحریک سے ہمدردی ہے، اس ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو سڈٹین علاقے ملے اور ادھر سلواکیا نے سوراج مانگا چیک حکومت اس مطالبے کو منظور نہ کرتی تو اور کیا کرتی مگر منظور کرنے سے اس کو فائدہ نہ ہوا، سلواکیا میں برابر فساد ہوتا رہا، اور ہر ہٹلر اس فساد کی ذمہ داری چیک حکومت پر ڈالتے رہے آخر سلواکیا نے چیک حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی وزارت کو بدلے اور قریب قریب اسی وقت سلواکیا کے وزیر اعظم سیو ہر ہٹلر کے پاس مشورہ کرنے پہنچے ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اس کے بعد چیکوسلواکیا کے صدر ڈاکٹر ہافا سے کہلوایا گیا کہ وہ اپنے وزیر خارجہ فوالوفسکی کو لے کر برلن آئیں۔ ڈاکٹر ہافا کو دعوت قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، ۱۵ مارچ کی شام کو برلن پہنچے ان کا بڑی شان سے استقبال کیا گیا مگر بہت جلد ہر ہٹلر کے پاس پہنچا دیئے گئے، وہ خود ربن ٹروپ اور ڈاکٹر گورنگ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، اور میز پر ایک تحریر رکھی تھی، جو ڈاکٹر ہافا کو پڑھ کر دستخط کرنے کو دے دی گئی تھی، وہی اعلان تھا جو ۱۶ مارچ کی صبح کو شائع ہوا اور جس میں ڈاکٹر ہافا کی طرف سے کہا گیا، کہ وہ اپنے ملک کو ہر ہٹلر کے سپرد کرتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جرمنی میں شامل ہو جائے پہلے تو کچھ دیر انھوں نے انکار کیا، مگر ہر ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے پہلے ڈاکٹر ہافا کو سمجھایا، تو پھر ڈرایا دھمکایا اور جب

وہ اس طرح نہ مانے ان سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے نہ ماننے سے آپ کا کام نہ بنے گا، جرمن فوجیں
چکوسلواکیا میں داخل ہو گئی ہیں اور چھ سو ہوائی جہاز تیار کھڑے ہیں، حکم ملتے ہی پراگ پر جا کر بم
برسا دیں، ڈاکٹر ہاشا غریب کو پہلے بھی کئی مرتبہ غش آ چکا تھا، اس خبر کو سنتے ہی وہ بے ہوش ہو گئے،
میزبان کے انتظام کو دیکھئے کہ وہ مہمان کی اس کمزوری کو بھی جانتے تھے، اور پاس ہی کمرے میں ایک
ڈاکٹر مناسب انجکشن دینے کے لئے بیٹھا تھا، انجکشن کے بعد ڈاکٹر ہاشا کو ہوش آیا، اور پھر انھوں نے
اعلان پر دستخط کر دیے، اس اعلان میں چیک فوجوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جرمن فوجوں کا مقابلہ نہ کریں
بلکہ انھیں ملک پر قبضہ کر لینے دیں، اور اس حکم کی وجہ سے جرمن فوجیں بغیر فوجی نقصان اٹھائے چیکوسلواکیا
کی راجدھانی میں گھس گئیں بارہ گھنٹے بعد ہر ہٹلر بھی وہاں پہنچ گئے، چکوسلواکیا پر ہر ہٹلر کی حکومت
ہو گئی کہتے ہیں کہ کوئی ڈیڑھ دو ہزار چیک سپاہیوں اور شہریوں نے غلامی کو موت پر ترجیح دی
مگر ان غیرت مندوں کا خون بہنا بھی تو کسی نے نہیں دیکھا اور ہر ہٹلر کو یہ کہنے کو ہو گیا کہ
انھوں نے بغیر خون بہائے جرمن سیاست کا ایک اور مقصد پورا کر لیا، تہذیب اور اخلاق کے
ان دونوں چوکیداروں یعنی برطانیہ اور فرانس کی کارگزاری بھی سن لیجئے، انھوں نے یورپ کو جنگ سے
بچانے کی خاطر جرمنی کو چکوسلواکیا کی کھال کھینچ لینے دی، اور پھر ایسے بھولے بن گئے گویا کہ کچھ
ہوا ہی نہیں، لطف یہ ہے کہ خاص انھیں دنوں جب برلن میں چکوسلواکیا پر قبضہ کرنے کے
منصوبے ہو رہے تھے، برطانیہ میں سرکاری نہیں تو قریب قریب سرکاری طور پر یقین دلا دیا گیا
تھا کہ اب یورپ کا آسمان صاف ہے اور جسے کوئی اور فکر نہ ہو وہ چین سے سو سکتا ہے، جب جو
کچھ ہونا تھا ہو چکا تو اس کی پوچھ گچھ ہونے لگی کہ آخر ایسی بے بنیاد خبر کس نے مشہور کی، وزارت
خارجہ کے دفتر والوں نے کہا کہ ہم ایسے ناواقف نہیں ہیں کہ خطرے کے وقت اعلان کریں کہ
اب خطرہ نہیں ہے، یہ خبر سڑک کی دوسری طرف سے یعنی وزیر اعظم کے گھر یا دفتر سے نکلی ہو گی عقلمند
آدمی اپنی حماقت تسلیم نہیں کرتے جہاں سب عقلمند ہوں وہاں اسی پر تعجب کیا جا سکتا ہے کہ ایسی
حماقت کی بات کون کر سکتا ہے، اور برطانیہ میں اس پر تعجب کیا جاتا رہا۔ اور باہر لوگ اس بات پر

حیرت کرتے رہے کہ برطانیہ اور فرانس نے اخلاق اور تہذیب کے چوکیدار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کس طرح ہر ذمہ داری سے بری سمجھ لیا، پچھلے اکتوبر میں ان دونوں اور جرمنی اور اٹلی میں طے ہوا تھا کہ سب چکوسلواکیا کی حفاظت کریں گے، ہم آپ مل کر ایسا وعدہ کرتے تو ہر شخص دوسرے کو اس کی پابندی پر مجبور کرتا، اس کا سبب یہ ہوتا کہ ہم وہ داؤں پیچ کر ہی نہیں سکتے، جو برطانوی سیاست کو قدرت نے سکھائے ہیں، مسٹر چیمبرلین نے چکوسلواکیا کے خاتمہ کی خبر سنتے ہی کہدیا کہ چونکہ ہر ہٹلر نے اپنے وعدہ کی پابندی نہیں کی ہے اس لئے ہم پر بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یعنی چکوسلواکیا مر گیا اس کا افسوس ہے ہم کیا کرتے مارنے والے نے ہم سے صلاح مشورہ کیا نہیں جو ہم اس کو روکتے، یہ جواب ایسا تھا کہ جسے سن کر ہر ہٹلر نے شمال میں لیتھونیا کو الٹی میٹم دے کر میمل کا شہر حاصل کر لیا اور جنوب میں رومانیہ کو اسی طرح الٹی میٹم دے کر ایک تجارتی معاہدہ رومانیہ سے کیا جس کی بدولت جرمنی کا رومانیہ پر تو نہیں مگر اس کی زمین اور تجارت اور سرمایہ پر قبضہ ہو گیا ہے، کہنے کو تو رومانیہ آزاد ہے لیکن جرمنی نے اسے اب اس طرح پکڑ لیا ہے کہ وہ جرمنی کے پنجے سے نکل نہیں سکتا۔

اب کسی کو اپنی سلامتی کا بھروسا نہیں رہا ہے ایسی حالت میں لوگ اندھا دھند لاٹھی چلاتے ہیں اور ناحق چوٹ کھاتے ہیں لیکن آپ غور کریں تو، اصل میں یہ سب ریاستیں ایسی تھیں کہ ان ریاستوں کو جنھوں نے مل کر لیگ کو دنیا میں حیثیت اور عزت بخشی تھی لیکن اب برطانیہ اور فرانس نے اپنے رویہ سے سب کو بدظن کر دیا ہے اور اس طرح لیگ کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا، مسٹر بولڈون نے پچھلے الکشن کے وقت کہا تھا کہ ہمیں ووٹ دو اس لئے کہ ہم اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ یورپ میں ہر قوم کی سلامتی کا ذمہ، باقی تمام قوموں پر ڈال دیا جائے اور اس طرح لڑائیوں کا خطرہ دور کیا جائے لیکن الکشن کے بعد وہ پالیسی اختیار کی گئی کہ جس نے لیگ کو ختم کر دیا اور ہر ریاست کو اب اپنی فکر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہر ہٹلر نے تو سیاست پر احسان کیا برطانیہ اور فرانس نے غلط فہمیوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اسے کاٹ کر پھینک دیا۔ اور اب آئندہ کوئی ریاست، چکوسلواکیا کی طرح آخر وقت تک دھوکا نہیں کھائے گی، فرق صرف اتنا ہے کہ ہر ہٹلر کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے وہ طریقے نہیں آتے جو برسوں

کے تجربے نے برطانیہ اور فرانس کو سکھائے ہیں یا اگر انھیں آتے ہیں تو وہ انھیں برتنا نہیں چاہتے اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں ان کی سیاست اب ڈنکے کی چوٹ پر انھیں ارادوں کا اعلان کر رہی ہے جو انھوں نے اب سے دس برس پہلے اپنی کتاب میں بیان کئے تھے یعنی یہ کہ یورپ میں جرمن سامراج قائم ہو جائے گا جو باقی قوموں پر حاوی ہو جائے گا۔ دنیا میں جرمن تہذیب کی رونق پھیلائے گا لیکن اگر یورپ پر جرمن سامراج چھا بھی گیا، تو کون سا اندھیر ہو جائے گا اس میں یورپ اور دنیا کے لئے وہ کون خطرہ ہے جو کسی دوسرے سامراج میں نہ تھا بلکہ غور کیجئے تو زیادہ خطرہ اسی میں ہے کہ برطانیہ فرانس اپنی موجودہ حیثیت اور طاقت کو قائم رکھنے کی کوشش میں جرمن سیاست کی اور بے جا مخالفت کریں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دوست بن کر اس طرح ڈبو دیں جیسے چکوسلواکیا کو مشرقی یورپ میں ڈبو دیا تھا فرانس کی نہ بڑے پیمانہ پر صنعت ہے اور نہ تجارت نہ کوئی سیاسی اثر جرمنی کو ادھر بڑھنے کا موقعہ ملے تو برطانیہ اور فرانس کا اس میں ذرا نقصان نہیں ادھر کی ریاستوں کو جرمن کا سہارا مل گیا تو وہ کسی طرح کا دکھ اٹھانے کی بجائے بہتیری مصیبتوں اور دشواریوں سے نجات پائیں گے۔

برطانیہ نے یہ بہانہ کرکے کہ فیصلہ بہت جلد کرنا ہے کانفرنس میں بہت دیر لگے گی، روس کی اس تجویز کو کہ امن پسند قوموں کی کانفرنس کی جائے نامنظور کر دیا ہے اس کی جگہ پولینڈ اور رومانیہ سے علیحدہ علیحدہ معاہدے کئے گئے ہیں برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے روس میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے وہ بے بنیاد نہیں کہ یہ جرمنی کو ڈانزک اور شمالی پولینڈ کو بغیر لڑے دے دینے کی ترکیب ہے برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ اور رومانیہ کو جس طرح دھوکے میں ڈالا ہے اور ہر ہٹلر کو للکارا ہے کا نتیجہ یہ تو ضرور ہو جائے گا کہ مسٹر چیمبرلین اگلے الکشن میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس سے یورپ کی بے چینی بڑھے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ مار پیٹ ہو جائے۔

صحافت کے ذریعے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیرادارت:۔ شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بہ تازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپے (ستے) ششماہی تین روپے (سے)

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۵؍ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر "کلیم" بہ جانتی نواس دریا گنج دہلی

مضامین محمد علی

مرتبہ جناب محمد سرور صاحب بی اے (آنرز) فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علیؒ کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست، چندہ اور ریاست
۲۔ مسائل ملی: سنتِ ایدیہ اور سنتِ محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیتِ ہند
۴۔ مسلمان اور کانگریس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی۔
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات:۔ حکیم اجمل خاں، داس
۹۔ مسلمان اور آزادی
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہو رہی تھیں اُن میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لیے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور اُن کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بمشکل خرید سکتے تھے۔ اُن کی قیمتیں ۲۵ فی صدی سے ۴۰ فی صدی تک کم کردی گئی ہیں۔

اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اور تاجرانِ کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ لاہور اور لکھنؤ سے مکمل فہرست طلب کرکے ممنون فرمائیں گے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

باہتمام مسٹر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن، محبوب المطابع پریس دہلی

زیر ادارت :۔ پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	اپریل ۱۹۳۹ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل

(از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی)

ہمارا زمانہ صحیح معنوں میں ایک تعلیمی انقلاب کا زمانہ ہے۔ تقریباً ہر صوبہ میں تعلیم کی قدیم عمارت کو ڈھایا جا رہا ہے اور اس کی جگہ نئی عمارت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ اس وقت تک کئی کمیٹیاں اور کمیشن بیٹھ چکے ہیں جنھوں نے اس تعلیمی انقلاب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تجاویز پیش کیں۔ بعض صوبوں میں ان تجاویز پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ مسلمان اس انقلاب سے بیحد پریشان و سراسیمہ دکھائی دیتے ہیں اس انسان کی طرح جو گہری نیند میں سو رہا ہو اور جسے یکایک کوئی جھنجھوڑ کر جگا دے۔ اس نیم خوابی کی حالت میں اسے سوجھائی تو کچھ نہ دے لیکن وہ دوسروں کو اپنے غم و غصہ کا نشانہ ملامت بنائے اسے اس پر نہایت غصہ آئے کہ دوسرے کیوں اس سے جلد بیدار ہو گئے ہیں اور منزل مقصود کی طرف چلنا بھی شروع کر دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بھی اپنا سامان سفر درست کرے اور منزل کی طرف بڑھے اس کی تمام طاقت غم و غصہ کی ہی نذر ہو جائے اور وہ پھر دوبارہ تھک کر محو خواب ہو جائے۔

بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ وہ برابر دوسروں کی تعلیمی اسکیموں اور تجاویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ شور و ہنگامہ بپا کر رہے ہیں مگر بحیثیت قوم اب تک جدید زمانہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر انھوں نے اپنے تعلیمی مسائل پر غور نہیں کیا ہے اور نہ کوئی عملی لائحہ عمل اس کے لئے پیش کیا ہے۔ انفرادی طور پر ضرور ان مسائل پر اظہار خیال ہو رہا ہے لیکن ہمارے مسلم مفکرین ابھی تک یکجا ہو کر نہیں بیٹھے کہ وہ بالآخر مسلمانانِ ہند کے لئے کوئی تعلیمی لائحہ عمل پیش کریں۔ اس مسئلہ کا حل ممکن ہوتا اگر۔ علیگڈھ۔ دیوبند۔ ندوہ۔ جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہرین

تعلیمات یکجا مسلمانوں کی دینی و دنیوی تعلیمی مسائل پر غور و فکر کرتے اور ایک مکمل پروگرام قوم کے سامنے پیش کرتے۔ یہ مضمون اس ضرورت کی طرف بزرگان قوم کی توجہ مبذول کرانے کے لئے لکھا جارہا ہے ورنہ اس کا مقصد کوئی قطعی حل پیش کرنا نہیں ہے۔

مسلمانوں کے تمام تعلیمی مسائل سے تو اس وقت بحث نہیں کی جاسکتی البتہ صرف چند اہم مسائل پر روشنی ڈالنا مد نظر ہے۔ مثلاً

۱۔ مسلمانان ہند کا تعلیمی نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

۲۔ نصب العین کن ذریعوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ جدید تعلیمی رجحانات کے متعلق مسلمانوں کی کیا روش ہونی چاہیئے؟

۴۔ مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی ادارے مثلاً علیگڈھ۔ دیوبند۔ ندوہ جامعہ عثمانیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ کس طرح اس نصب العین کے حاصل کرنے میں مدد پہنچا سکتے ہیں؟

۵۔ مسلمانوں کا اپنی ہمسایہ قوم ہندوؤں سے کیا تعلیمی رشتہ ہونا چاہیئے؟

۱۔ مسلمانان ہند کا تعلیمی نصب العین مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ جب تک منزل مقصود صحیح طور پر متعین نہ ہو اس تک پہنچنے کا راستہ بھی ٹھیک طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا خیالات میں اس وقت جو خلفشار ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہمارا نصب العین ہمارے سامنے واضح طور پر موجود نہیں ہے۔ جن مفروضات پر ہم اپنے خیالات کی بنیاد رکھتے ہیں وہ ہی جب مختلف ہیں تو اس پر جو عمارت کھڑی ہوگی وہ لازماً مختلف ہوگی۔ اس حصہ کو واضح کرلینا اس لئے وقت کی سب سے بڑی تعلیمی ضرورت ہے۔

اس وقت مسلمانوں میں اس سلسلہ میں کئی قسم کے خیالات رائج ہیں مثلاً بعض حضرات صرف معاشی محرکات کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ قوم کے بچوں کی تعلیم صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر ملک کی معاشی دولت میں اضافہ کرسکیں وہ مذہبی اور روحانی قدروں کے

مخالف ہیں اور انھیں اس کی مطلق بھی پرواہ نہیں ہے کہ ہمارے بچے آگے چل کر اسلامی تہذیب وتمدن کے حامل ہوں۔

یہ حضرات اس امر کو کلیتاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ نفس انسانی میں جہاں معاشی محرکات موجود ہیں وہاں روحانی۔ مذہبی۔ اخلاقی اور جمالی محرکات بھی ہیں۔ نفس انسانی کی مکمل نشو و نما صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان تمام صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے نہ کہ نفس انسانی کے صرف ایک پہلو پر اس کی دوسری تمام نفسی زندگی کو قربان کر دیا جائے۔ انسان دراصل حیوانی اور ملوتی عناصر کا مجموعہ ہے۔ معاشی صلاحیتیں اس کے حیوانی عنصر سے قریب تر ہیں چونکہ ان کا مقصد ان کی حیوانی زندگی کو برقرار رکھنا ہے تاکہ اس پر اس کی ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی زندگی کی تعمیر ہو سکے۔ صرف معاشی صلاحیتوں کو تربیت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم انسان کو پھر حیوانیت کے درجہ میں گرا دینا چاہتے ہیں۔ لاکھوں برسوں میں انسان ارتقا کے ذریعہ حیوانیت سے نکل کر انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے۔ کیا ہم اس تمام نشو و نما کو بے کار کر دینا چاہتے ہیں؟ انسان کو 'عروج' کی طرف لیجانے کی بجائے کیا ہم پھر اس کو زوال کے گڑھے میں دھکیل دینا چاہتے ہیں؟ 'روٹی' کے مسئلے سے بھی انکار نہیں ہے تمام نفسی زندگی کے لئے بھی حیوانی بنیادوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ خوشنما پھولوں کی پیدائش کے لئے بھی سیاہ مٹی کی ضرورت ہے مگر مقصود بالذات بہرصورت خوشنما پھول اور میٹھے پھل ہیں سیاہ مٹی نہیں ہے۔ عمارت کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے کیچڑ اور پتھر سب ہی کی ضرورت ہے مگر مقصد بہرحال وہ عالیشان خوشنما عمارت ہے جو اس پر کھڑی کی جاتی ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادبہاری کا

کثافت کسی قدر ضروری ہے مگر مقصود بہرحال لطافت ہے۔ زنگار سے انکار نہیں مگر مطلوب اصلی تو بادبہاری ہی ہے۔ مختصر یہ کہ "خوردن برائے زیستن" ہے نہ کہ "زیستن برائے خوردن"

ہمارے اشتراکی بھائی اسی آخرالذکر مسلک کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات نہ ہونی چاہیئے کہ انسانیت کبھی بھی صرف اپنی حیوانی ضروریات کے پورے ہونے پر قانع نہیں ہو سکتی جب اس کی یہ ضروریات پوری ہو جاتی ہیں تو اس کے نفس کی دوسری صلاحیتیں اپنا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ خود روس میں دیگر تمدنی قدروں کی طرف اب کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ کلیسا کے بے جا ظلم و تشدد کے باعث وہاں جو ردعمل ہوا تھا اور عام طور پر مادیت الحاد اور دہریت کا دور دورہ ہو گیا تھا وہ دیرپا چیز نہیں ہے۔ انسانیت بہرحال اپنی اصلی روحانی بنیادوں سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتی اور شاید اسی سرزمین میں پھر دوبارہ اصلی مذہب اور روحانیت کا آغاز ہو۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی ہندوستان میں غلط راستہ اختیار کریں اور شروع ہی سے ہمارے تمدنی تعلیمی نصب العین کو صحیح بنیادوں پر کیوں نہ استوار کریں۔

دوسرا تعلیمی نصب العین جو ہندوستان میں پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں لہذا ہمیں ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جانا چاہیئے اگر ہندوستانی تہذیب کے یہ معنی ہیں کہ وہ دو مختلف تمدنوں یعنی ہندو تمدن اور ہندی مسلم تمدن کے مجموعہ کا نام ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا چونکہ ہم ہندی مسلم تمدن کے حامل ہیں جو ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ لیکن دراصل اس تحریک کا یہ مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا تو مقصد ہے کہ ہم ہندو تہذیب میں اپنے آپ کو جذب کر دیں۔ وہ ہندوستانی تمدن اس تمدن کو کہتے ہیں جو اس ملک کی اکثریت کا تمدن ہے۔ اور اکثریت ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی ہے۔ اس نقطۂ نظر کو ہم کئی وجوہ سے تسلیم نہیں کر سکتے۔ اولاً تو یہ کہ ہمارے اسلامی تمدن کے چند خصائص ہیں۔ اگر وہ خصائص برباد ہو جائیں تو ہمارا قومی نفسی وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں اپنے وجود سے اسی قدر محبت ہے جس قدر کہ کسی دوسری قوم کو اپنے وجود سے ہے۔ پھر ہماری قومی زندگی کے اصول مثلاً توحید۔ جمہوریت۔ مساوات۔ اخوت۔ آزادی۔ رواداری۔ خدمت خلق۔ اجتماعت الانسانیت کا نصب العین وغیرہ ایسے ہیں جو نہ صرف ہماری نشو و نما کے لئے ضروری

ہیں۔ بلکہ اس سے ہندوستان کی قومی زندگی اور انسانیت کو عظیم الشان فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ ہماری قومی نفسی زندگی اگر فنا ہو جائے تو اس سے نہ صرف ہمیں نقصان پہنچے گا بلکہ ہندوستان کی قومی زندگی اس کے بغیر غریب ہو جائے گی۔ ہماری آمد سے ہندوستان کی تمدنی زندگی ان قدروں سے مالا مال ہوئی اور ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم خود ان قدروں کے حامل رہے تو وہ ہمیشہ مالا مال ہوتی رہے گی۔

ہمارے ہندی مسلم تمدن کی بنیاد عرب کی مذہبی اور اخلاقی قدروں پر استادہ ہیں اور اس میں ایران کے جمالی اور ادبی عناصر آکر شامل ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں آکر اس نے وسعت اور گہرائی حاصل کرلی ہے۔ بحیثیت تمدن کی ایک مثال کے یہ ہندوستان کے دوسرے تمدنوں سے اعلیٰ ہے۔ انسانیت کے نصب العین سے وہ زیادہ قریب ہے۔ وہ زمانہ کی ضروریات کو زیادہ بہتر طریقہ پر پورا کر سکتا ہے۔ اور زمانہ کی محرکات کے ساتھ کامیابی کے ساتھ تطابق پیدا کر سکتا ہے۔ ان حالات میں اس کا برقرار رکھنا ضروری ہے ہندو قومیت میں فنا ہو جانے کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم خود کو ہندوستان کو اور انسانیت کو نقصان پہنچائیں۔ ایک زندہ اور نامی چیز کے وجود سے خود ہندوستان کے دوسرے تمدن میں زندگی اور گرمی پیدا ہوگی اور ہم مشترکہ طور پر انسانیت کے نصب العین کے لئے جد وجہد کر سکیں گے۔

اس قسم کا ایک تیسرا تعلیمی نصب العین اور ہے۔ جو مغربی خیالات و افکار کی اندھی تقلید کرنا چاہتا ہے۔ مکالے کے زمانے سے یہ تحریک شروع ہوئی اور اس کے جو مضر نتائج مرتب ہوئے وہ اب ہمارے سامنے ہیں، ایک عظیم الشان قوم جس کے اپنے اعلیٰ اصول زندگی تھے۔ جو عظیم الشان تاریخی روایات کی حامل تھی جو عہد جدید کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کر سکتی تھی۔ محض بندر کی طرح نقالی پر قانع ہو گئی۔ اپنے مذہب۔ تہذیب و تمدن کو تو فراموش کرنے کے باعث جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہوا ہی لیکن مغربی علوم و فنون میں بھی دستگاہ پیدا نہ کر سکے۔ مغرب میں اسی نظام تعلیم کے باعث بڑے بڑے حکما۔ سائنسداں۔

صناع اور سیاست داں پیدا ہوئے لیکن یہاں "بابو" کے سوا کچھ پیدا نہ ہو سکا چاہے اس کے مدارج مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کا سبب صاف ظاہر ہے۔ مغربی نظام تعلیم مغرب کی نامی زندگی کا مظہر تھی جو اس کو قوی اور مکمل بنانا چاہتی تھی۔ یہاں اس نظام تعلیم کا تعلق قوم کی نفسی زندگی سے نہ تھا۔ وہ ایک محدود مقصد کے لئے اوپر سے قوم کی زندگی پر لاد دی گئی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی نظام قومی زندگی کے سوتوں سے سیراب نہ ہو سکا اور بالآخر خشک ہو کر رہ گیا۔ کچھ تھوڑا بہت فائدہ اس مغربی تعلیم سے بھی پہنچا اسی قدر جس قدر کہ نقل سے انسان کو پہنچتا ہے مگر یہ ہمارے مرض کی دوا نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی اور نہ اس کے بانیوں کا یہ مقصد تھا کہ اس کے ذریعہ ہماری قومی زندگی سرسبز و شاداب ہو۔ علیگڈھ نے کلکٹر تو بہت پیدا کئے لیکن قومی زندگی کے معمار بہت کم۔ اور جو اپنے فطری استعداد کے باعث پیدا ہوئے وہ غدار کہلائے جس زمانے میں ہم نے مغربی تمدن کی نقل شروع کی وہ اس وقت ایک ذہنی تمدن تھا۔ اس لئے کم یا زائد ذہنی اعتبار سے بھی ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا لیکن اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے کے اعتبار سے تو یہ محض ناکامیاب رہا۔ عموماً زرطلبی جاہ طلبی۔ آرام طلبی غیر متنقل مزاجی۔ مصائب سے خوف۔ آزادی عمل کی کمی غلامی پہ قناعت جیسی اخلاقی خرابیاں انگریزی نظام تعلیم کے باعث ہمارے طالب العلموں میں عام طور پر سرایت کر گئیں۔

اب تک تو ہم نے ان تعلیمی تصورات سے بحث کی ہے جن کا مقصد اسلامی تہذیب و تمدن کو یا تو کلیتہً برباد کرنا ہے یا ان کو بحیثیت تعلیمی قدور کچھ زیادہ وقعت دینا نہیں ہے اب ہم ان تعلیمی نظاموں کا ذکر کریں گے جو شعوری طور پہ اسلامی مذہب اور تمدن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں سب سے اول لازمًا ہماری توجہ اس عربی نظام تعلیم کی طرف جاتی ہے جو عام طور پہ ہمارے ملک میں رائج ہے۔ جس میں درس نظامیہ رائج ہے اور جس کا سب سے بڑا نمائندہ مدرسہ دیوبند ہے عہد متوسط میں جب اس نظام تعلیم کی بنیاد پڑی تو اس زمانہ کی اسلامی قومی ضروریات کو یہ نظام تعلیم پورا کرتا تھا۔ اس وقت کی مسلمانوں کی مذہبی فکری اور علمی دنیا کا وہ مظہر تھا

تفسیر، حدیث و فقہ اس نظامِ تعلیم کی اساس قرار پائیں اور اس زمانہ میں جو علوم و فنون رائج تھے
وہ درس کا جزو قرار دیے گئے۔ یونانی علوم و فنون اس وقت عام طور پر رائج تھے اس لئے وہ شریک
درس کر لئے گئے چنانچہ یونانی منطق۔ فلسفہ، ریاضی۔ ہیئت وغیرہ سب درس کا جزو ہو گئے۔ یہ نظام
تعلیم اس وقت تک مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتا رہا جب تک کہ وہ واقعتاً مسلمانوں کی قومی ضروریات
پوری کرتا رہا۔ ان علوم و فنون میں اس وقت تک زندگی رہی جب تک کہ وہ حقیقت کے ترجمان
رہے۔ زمانہ کی رفتار برابر بڑھتی رہی۔ قومی ضروریات میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ علوم و
فنون میں نئے نئے انکشافات ہونے شروع ہوئے لیکن زوالِ بغداد کے بعد مسلمانوں میں
کچھ ایسی ذہنی پستی آگئی کہ انھوں نے اپنے نظامِ تعلیم میں ذرا بھی تبدیلی پیدا نہ کی۔ نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے۔
جس نظامِ تعلیم نے پہلے بڑے بڑے عالم، فقیہ، ادیب اور سیاست داں پیدا کئے تھے وہ اب
سوائے مسجد کے ملاؤں کے اور کچھ پیدا نہ کر سکا بعض بعض عظیم المرتبت ہستیاں اپنی فطری
استعداد کے باعث ضرور پیدا ہوئیں مگر ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ بحیثیت مجموعی قوم میں انقلاب
نہ پیدا کر سکی۔ آزادیٔ فکر کی جگہ اندھی تقلید نے جگہ لے لی۔ جدید غور و فکر کی بجائے قدما کی تصانیف
پر متن پر متن اور حاشیہ پر حاشیہ چڑھائے گئے۔ غزالی۔ رازی۔ ابن سینا۔ ابن رشد۔ امام ابو حنیفہ
امام شافعی کا ڈھونڈے سے بھی کہیں پتہ نہ لگتا تھا۔ غور و فکر، فطرت کا آزاد مطالعہ جس کی تلقین قرآن
نے بار بار کی تھی اور جس کے باعث علوم فطرت کی مسلمانوں میں بڑی ترویج ہوئی تھی۔ ممالکِ اسلامیہ
میں مفقود ہو گیا۔ یہی چیزیں جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و تمدن کا طرۂ امتیاز تھیں اب
مغرب میں سرسبز ہونا شروع ہوئیں۔ اسلامی اثرات کے تحت میں پہلے یورپ نے آزادیٔ
فکر اور فطرت کے مطالعہ کو سیکھا۔ علوم و فنون کے عربی اثر کے تحت میں راجر بیکن نے
استخراجی نہیں بلکہ استقرائی طریقہ کو پسند کیا۔ ان تمام اثرات کے باعث یورپ میں نئی زندگی
پیدا ہوئی۔ نئے علوم و فنون کے انکشافات کئے گئے۔ نئی دنیا کا پتہ چلا یا گیا۔ نئی حکومتیں قائم
کی گئیں۔ منطق اور فلسفہ کی تدوین کی گئی لیکن پھر عالم اسلامی سینکڑوں برسوں تک خواب

غفلت میں گرفتار ہو گیا۔ ذہنی غلامی و جمود کا نتیجہ بہت جلد سیاسی و معاشی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوا اور عالم اسلامی مغرب کی تازہ دم زندہ اقوام کی حرص و آز کا شکار بن گیا ہماری اس غلامی میں ہمارے اس فرسودہ مذہبی نظام تعلیم کا کچھ کم اثر نہیں ہے۔ جس وقت یورپ کا نظام تعلیم اپنے طلبا کے قوی ذہنی و اخلاقی کو ابھار رہا تھا ہمارے ملا اندھی تقلید اور ترک دنیا کی تعلیم دے رہے تھے۔ ترکی اور ایران میں اسلامی تعلیمات کے خلاف اس قدر شدت سے ردعمل نہ ہوتا، اگر وہاں کے ملا اسلام کو ایسی مکروہ شکل میں پیش نہ کرتے جو ہر قسم کی آزادی فکر و عمل کو سلب کر لیتا ہے۔ جس کا مقصد قوم کے معاشی۔ سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کا حل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ محض یہ طے کرنا کہ گھٹنے کے اوپر پاجامہ ہو جانے سے جسم کا کس قدر حصہ دوزخ میں جائے گا۔ یا زکوٰۃ کی اس طرح تقسیم کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ حصہ خود مولوی صاحب کی جیب میں چلا آئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کی تمام قومی زندگی ہی خطرہ میں آگئی۔ اس مذہبی نظام کے ذریعہ دوبارہ اس گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے بے شک یہ فائدہ تو ہوا کہ مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی قدر بہت حد تک باقی رہ گئیں۔ علوم اسلامیہ جو ممکن تھا کہ کلیتاً فنا ہو جاتے موت کے منھ سے بچائے گئے۔ مگر یہ نظام تعلیم بہر صورت اس زمانہ سے سینکڑوں برس کے نظام تعلیم کی نقل تھی اس لئے نہ قوم کی ضروریات پوری کر سکتا تھا اور نہ ان میں زندگی کی نئی روح پیدا کر سکتا تھا۔ اپنی فطری صلاحیت کے ماتحت بعض عظیم المرتبت ہستیاں ضرور پیدا ہو گئیں مگر بحیثیت مجموعی اس نے سوائے مسجد کے کوتاہ نظر ملاؤں کے کچھ نہ پیدا کیا۔ ایک طرف امت اسلامیہ کا وجود ہی خطرہ میں تھا اور دوسری طرف ہمارے یہ علمائے کرام رفع یدین یا آمین بالجہر کے جزدی مسائل پر آپس میں دست و گریباں ہو رہے تھے نہ انھیں زمانہ کی ضروریات کی خبر تھی اور نہ امت اسلامیہ کے معاشی۔ سیاسی اور دیگر تمدنی مسائل سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ زمانۂ جدید کے

علوم وفنون کی ترقی سے یہ محض ناواقف تھے اور چونکہ ہر چیز سے لاعلم تھے اس لئے تمام دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ رواداری اور وسعت قلب ان میں مفقود ہو گئی اور ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لئے آمادہ ہو جانا۔ ان کا وطیرہ ہو گیا۔ غرضکہ اس گزشتہ نصف صدی میں تھوڑا بہت فائدہ مذہبی شکل میں اس نظام تعلیم سے ضرور مرتب ہوا مگر بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے تعلیمی مسئلہ کو حل نہ کر سکا۔

قوم کے ذہنی قویٰ بیدار کرنے اور نشو ونما دینے میں تو یہ نظام تعلیم بہت ناکامیاب ثابت ہوا البتہ اخلاقی قدور پیدا کرنے میں یہ انگریزی نظام تعلیم سے زیادہ کامیاب رہا۔ قناعت۔ جفاکشی سادگی جیسی خوبیاں اس نے اپنے طالب العلموں میں پیدا کر دیں۔ مگر ساتھ ہی ان کو کوتاہ نظر متعصب اور لاعلم بھی بنا دیا۔

مسلمانوں کی قومی زندگی کی ابتری دیکھ کر بطور رد عمل ایک دوسری تمدنی اور تعلیمی تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ جس کا مقصد ہے کہ قرون اولیٰ کے اسلام کا احیا کیا جائے۔ عبد الوہاب نجدی جیسے زبردست مصلح نے اس کو علامہ ابن تیمیہ کی تعلیمات کے زیر اثر شروع کیا۔ یہ چیز ہندوستان میں بھی پہنچی اور اس نے مسلمانان ہند کو ایک نئی دعوت عمل دی۔ اس کے باعث ہماری بہت سی قومی خرابیاں بھی دور ہوئیں اور ایسے مدارس کی بنیاد پڑی جن کا مقصد صرف قرآن وحدیث کی تعلیم دینا تھا اور جو قرون اولیٰ کی زندگی کو بجنسہٖ دوبارہ واپس کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک اسلامی اخلاق کو دوبارہ زندہ کرنے کا تعلق ہے ان حضرات کی کوششیں بڑی ہی قابل ستائش ہیں کیونکہ بغیر اس کے واقعتاً قومی زندگی کی عمارت ہی کھڑی نہیں ہو سکتی اور ان اخلاق کے لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم اور صحابۂ کرامؓ سے زیادہ اور کون ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

لیکن یہ حضرات جوش اصلاح وتجدید میں قومی زندگی کے ایک بنیادی اصول کو بالکل ہی فراموش کر گئے۔ یعنی یہ کہ فرد کی طرح قومی زندگی میں بھی برابر نشو ونما ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی اپنے بچپن۔ لڑکپن۔ شباب۔ ادھیڑپن اور کہولت کے زمانے طے کرتی ہے۔ جس طرح آپ

ایک نوجوان انسان کو لوٹا کر بچہ نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح آپ قومی زندگی کو اس منزل سے جس میں کہ وہ پہنچ گئی ہے ہٹا کر پیچھے بھی نہیں لیجا سکتے۔ جس طرح ایک فرد اپنی زندگی کے تمام دور طے کرنیکے بعد بھی وہی فرد باقی رہتا ہے جو بچپن میں تھا۔ اسی طرح ایک قوم بھی تمام منازل ارتقا طے کرنے کے بعد بھی وہی قوم باقی رہتی ہے۔ فرد کی زندگی میں سر رشتہ کا کام نفس انفرادی دیتا ہے اسی طرح قومی زندگی میں وہ سر رشتہ جو قومی زندگی کو باہم استوار کئے رہتا ہے۔ مذہبی۔ اخلاقی اور تاریخی احساس ہے۔ لیکن ترقی کے منازل طے کرنے کے معنی یہ نہیں کہ قوم قوم باقی نہیں رہتی۔ قوم کے نفسی وجود کو باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو دوبارہ عہد طفولیت میں واپس کر دیا جائے یا آج تک اس نے جو سفر طے کیا ہے وہ سب بیکار قرار دیا جائے اور اس کو دوبارہ سفر کی پہلی منزل پر کھڑا کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے انسانیت کی نشو و نما کے لئے ایک روحانی۔ مذہبی اور اخلاقی سر رشتہ فراہم کر دیا ہے جس پہ انسانی تمدن کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اس بنیاد کا باقی رہنا ہر وقت ضروری ہے۔ چونکہ بغیر اس کے عمارت استادہ بھی نہیں کی جا سکتی۔ مگر ان روحانی و اخلاقی عناصر پر جو عمارات کھڑی ہوں گی وہ ہر ملک میں اس کی آب و ہوا۔ جغرافیائی حیثیت تاریخی روایات۔ قومی و نسلی خصوصیات کے اعتبار سے ضرور مختلف ہوں گی۔ زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے۔ تمدنی زندگی شروع میں ہمیشہ سادہ ہوتی ہے مگر ترقی کے ساتھ اس میں بھی تنوع پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس طرح زندگی میں نشو و نما کے باعث مرکزیت کی بجائے لامرکزیت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اسی طرح تمدن میں بھی۔ البتہ ایک تمدن اسی وقت کامیاب کیا جا سکتا ہے جب وہ باوجود انتہائی نشو و نما کے بھی اپنے مرکز سے وابستہ رکھے۔ بعینہٖ یہی اسلامی تمدنی زندگی میں بھی پیش آیا۔ رسول اللہ نے تمام انسانیت کی تمدنی زندگی کے لئے روحانی اخلاقی سر رشتہ فراہم کیا۔ مگر اس پر جو تمدنی زندگی استادہ کی گئی اس میں عربی مسالہ سے کام لیا گیا۔ چنانچہ آنحضرت اور صحابۂ کرام نے جو تمدنی زندگی بنا لی اس میں اسلامی روح کار فرما تھی۔ مگر اس کا ڈھانچہ عربی تھا۔ پھر رسول اللہ کے زمانے میں تمدنی

زندگی سادہ تھی۔ مدینہ میں ایک شہری ریاست قائم کی گئی۔ آنحضرتؐ خود ایک مذہبی پیشوا، حاکم اور قاضی تھے۔ مگر تمدن کی بڑھتی رو کے باعث خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سادگی باقی نہ رہ سکی۔ خلیفہ کے مشورے کے لئے ایک مجلس شوریٰ عمل میں لائی گئی جس کے مشورے سے خلیفہ تمام کام انجام دیتا تھا۔ عہدہ قضا علیحدہ کر کے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا گیا غرضکہ تمدنی زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر مسلمانوں کو دوسرے تمدنوں کے اچھے عناصر اپنی تہذیب میں جذب کرنے سے ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ وہ جہاں گئے انھوں نے اس ملک کے تہذیب و تمدن کے اچھے عناصر کو قبول کر لیا بلکہ ان کے باعث مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن نے فروغ پایا۔ خود عرب جاہلیت جس کے خلاف اسلام ایک بغاوت تھی اسلام کے باعث زندہ ہو گیا۔ عرب جاہلیت کے شعرا کا کلام جمع کیا گیا اور وہ اسلامی نظام تعلیم میں اس طرح شامل کر لیا گیا جس طرح کہ فقہ و حدیث۔

بنی امیہ کا زمانہ تو تسخیر ممالک میں گذرا اس لئے اصلی تمدنی کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہ ہو سکی لیکن بنی عباس کا زمانہ اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک زرین زمانہ ہے۔ اس وقت اسلامی تمدنی زندگی اپنے عہد شباب میں داخل ہوئی۔ بچپن کے زمانہ کو انسان دوسرے کے احکامات کے سہارے گذارتا ہے مگر جوانی میں وہ خود غور و فکر کرنا چاہتا ہے۔ اپنے زندگی کے اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ یہی حال بعینہٖ اسلامی تمدن میں بھی پیش آیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں جو اسلامی تہذیب و تمدن کا لڑکپن کا زمانہ تھا احادیث جمع کی گئیں چونکہ قوم خارجی احکامات کے سہارے زندگی گذارنا چاہتی تھی مگر بنی عباس کے زمانے میں زندگی کے تمام اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا گیا اور علم الکلام کی تدوین شروع ہوئی۔ یونانی منطق، فلسفہ بطور نقالی قبول نہ کئے گئے بلکہ وہ مسلمانوں کو اب اس لئے بھانے لگے کہ وہ اب ان کی ترقی یافتہ نفسی ساخت کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ ابتدا میں جوانوں کے جوش میں چاہے کچھ بے عنوانیاں رہی ہوں اور بعض باتوں کو بغیر تنقید کے بھی تسلیم کر لیا گیا ہو مگر اسلامی دماغ نے بہت جلد

اپنا توازن قائم کر لیا۔ بالآخر امام غزالی نے ملت اسلامیہ کے لئے ایک ہمہ گیر تمدنی و تعلیمی نصب العین پیش کیا۔ اس نصب العین کی بنیادیں اسلام کی روحانی و اخلاقی بنیادوں پر استوار کی گئیں مگر ہمیں یونانی فلسفہ۔ حکمت۔ منطق اور ہیئت کو بحیثیت تمدنی عناصر کے استعمال کیا گیا۔ امام غزالی نے اس تضاد کو جو تمدنی نشو و نما کے باعث ایمان و عقل۔ مذہب و فلسفہ۔ دین و شریعت میں پیدا ہو رہا تھا دور کیا اور ایک ہمہ گیر روحانی تمدنی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسلامی دنیا میں اس کے کچھ برگ و بار ان سے شروع ہی ہوئے تھے کہ فتنہ تاتار نے سینکڑوں برسوں کے لئے مسلمانوں کے آفتاب تمدن کو غروب کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی شمعیں ادھر ادھر جلتی رہیں مگر بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب کی روح غائب ہو چکی تھی۔ اور یہ زندگی کی رو مغرب میں جا کر اپنے کرشمے دکھانے لگی۔

ان تمام مباحث کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلامی روح جامد اور ساکن نہیں ہے بلکہ فعال اور متحرک ہے اس نے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں میں مختلف رنگ و بو اختیار کئے ہیں۔ عرب میں وہ مذہبی و اخلاقی قدروں کی حامل رہی تو ایران میں اس کے حسن و جمال کے باعث اس نے زیادہ تر جمالی ادبی رنگ اختیار کر لیا۔ ترکی میں وہ عسکری اور نظامی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ہندوستان میں زیادہ تر صوفیانہ رنگ میں اس کا اظہار رہا۔ غرضکہ اس وقت ہندی مسلم تمدن میں اسلام کی گذشتہ تیرہ سو سالہ زندگی کے روحانی۔ اخلاقی جمالی اور صوفیانہ عناصر شامل ہیں۔ اس کا گوشت و پوست و خمیر ان تمام عناصر سے مل کر بنا ہے جو وہ سینکڑوں برسوں میں مختلف ممالک سے اپنی ترقی کے دور میں بطور غذا اپنے جسم میں جذب کرتا آیا ہے اس لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان عناصر کو کلیتاً ترک کر دیا جائے؟ پھر عہد جدید اور اس کی ضروریات سے کس طرح چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ مستقبل اور مستقبل کو بنانے والی قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرضکہ وہ حضرات جو "رجوع ماضی" کا سادہ نسخہ پیش فرما دیتے ہیں وہ در اصل فرد۔ قوم۔ انسانیت کائنات بلکہ خدائی کے زندگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ تمام زندگی میں ارتقا ہو رہا ہے اور ہمارے تمدنی و تعلیمی نصب العین کو اس ارتقا کا ترجمان ہونا چاہیئے نہ کہ اور اس کی راہ میں حائل ہونے کی

لاحاصل کوشش کرنا ہے البتہ اسلامی روحانی مذہبی اور اخلاقی بنیادوں پر اس ارتقا کا کمل طور پر ساتھ دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اسلامی روح ہی در اصل اس قانون ارتقا کی ترجمان ہے۔ اسلام فرسودہ تہذیب و تمدن۔ اخلاق و عادات کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ وہ ایک انسانیت کا زبردست انقلابی پیغام تھا اور بجنسہ اس کو اس انقلاب کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اسلام در اصل نام ہی ان اصولوں کا ہے جن اصولوں کے تحت ہیں کائنات کا ارتقا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب بھی اس وقت یہ ہے کہ وہ ان اصولوں سے نا واقف ہو گئے ہیں۔ حرکت و عمل کی بجائے سکون و بے عملی کو اپنا طرہ امتیاز بنائے بیٹھے ہیں۔ مستقبل کی طرف بڑھنے کی بجائے ماضی کے سرمائے پر قانع ہو گئے ہیں۔

جنگ عظیم کی خون آشامیوں نے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے اکثر آزاد قومی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں اور جہاں نہیں ہیں وہاں جد وجہد جاری ہے علوم و فنون کے اکتساب کی خواہش تیز تر ہو گئی ہے۔ ہر جگہ اس نئی روح کا اظہار اسلامی تمدن میں ہو رہا ہے۔ اس نئی زندگی کے ساتھ ایک نئے تعلیمی نصب العین کو بھی متعین کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک یہ تصور دھندلا ہے اور ملت اسلامیہ پر اس کا اثر ہمہ گیر نہیں ہے۔ ہم مسلمانان ہند کے اس تمدنی و تعلیمی نصب العین کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور ان عناصر کو بیان کریں گے جن کی ترکیب سے یہ نصب العین بن سکتا ہے۔

الف۔ اولاً اس نصب العین کو اسلامی روحانی قدروں کا حامل ہونا چاہیئے۔

ب۔ دوم اسلامی تمدن نے اپنے ارتقا کے دور میں جو مخصوص خصائص اختیار کرلئے ہیں اسے ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

ج۔ سوم اسے عہد جدید کی سیاسی و معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

د۔ اسے زندگی کے اصول ارتقا کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے اور مستقبل کی تشکیل کرنے والی قوتوں کا اسے حامل ہونا چاہیئے۔

(الف)

اسلام کے روحانی تصور کو ہمارے تمدنی زندگی کی بنیاد ہونی چاہیئے اور اس طرح اسے ہمارے تعلیمی نصب العین میں اولین جگہ حاصل ہونی چاہیئے۔ اس پر اب زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اسی تصور کے باعث ہم بحیثیت ایک مسلم قوم دنیا میں موجود ہیں۔ جدید سائنس نے اب خود مادیت کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ آنسٹائن جیسا ریاضی داں روحانیت کا قائل ہے ایڈنگٹن جیسا سائنس داں دنیا کی اصل روح کو قرار دیتا ہے۔ مادیت کی اساس اس خیال پر نہیں تھی کہ دنیا کی اصل ذرات ہیں (ATOMS) اور یہ ذرات مادی ہیں۔ مگر اب ان ذرات کو توڑا جا سکتا ہے۔ اور وہ در اصل انرجی (قوت) کا مجموعہ ہیں۔ انرجی مادی چیز نہیں ہے۔ بلکہ لا مادی چیز ہے اور شعور اور انرجی باعتبار خاصیت کے ایک ہی چیز ہیں۔ روحانیت چنانچہ عہد جدید میں صرف ایک مذہبی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ سائنس کی تمام تحقیقات بھی اسی تصور کی طرف راہ نمائی کرتی ہیں پھر اسلامی تصور کے مطابق مادہ روح سے کلیتاً متضاد چیز نہیں ہے جس طرح عیسائی کلیسا کا تصور ہے۔ اسلام میں روح و مادہ کو ایک دوسرے سے متضاد نہیں ٹھیرایا گیا ہے۔ بلکہ حقیقت اصلی کے دو پہلو حقیقت کے باطنی پہلو کو روح کہتے ہیں اور اس کے خارجی پہلو کو جو وہ اپنی تشکیل کے لئے بنا لیتی ہے مادہ۔ اسلام میں روح و مادہ دین و دنیا۔ حال و مستقبل غرضکہ دونوں پہلوؤں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً .

بلکہ دین و دنیا۔ روح و مادہ کی مکمل نشو و نما ہی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ دونوں کی ترقی مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو۔

اس ہمہ گیر روحانیت کا نتیجہ اسلام کا وہ اخلاقی تصور ہے جو انسانیت کے نصب العین کا حامل ہے۔ جب انسانوں کی اصل ایک ہے۔ زندگی کی اصل ایک ہے۔ تو زندگی کے تمام مظاہر کو ارتقا کا مساوی موقع ملنا چاہیئے۔ کسی ایک جزو کی مکمل نشو و نما نہ ہونے کے باعث کل کی نشو و نما

میں بھی خامی رہ جائے گی۔ اس بنا پر اسلام انفرادی وجود کے احترام کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ آزادی مساوات اور جمہوریت کا قائل ہے۔ لیکن انفرادی وجود بھی اس وقت تک اپنی نشو و نما کو انتہائی بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتا جب تک جماعت بحیثیت مجموعی نشو و نما نہ کرے اسی لئے وہ اخوت۔ اجتماعیت اور انسانیت کا بھی نصب العین پیش کرتا ہے۔ دراصل سچی انفرادیت اور سچی اجتماعیت میں کوئی تضاد نہیں ہے چونکہ بغیر ایک دوسرے کے وہ مکمل ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاست۔ معیشت۔ قانون اور سماج کے تمام کاموں کو اسلام اخلاقی قوانین کا پابند رکھنا چاہتا ہے اور اس کا مقصد انسانیت کی نشو و نما ہے

(ب)

ہمارے تاریخی ارتقا کے دور میں ہم نے اپنی تہذیب و تمدن کے ذریعہ اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی ہم اپنی کوشش میں زیادہ کامیاب ہوئے کبھی کم۔ اس کا انحصار مختلف اقوام کی فطری صلاحیتوں اور خارجی اسباب پر تھا مثلاً ہماری اسلامی روح کا اظہار بھی ہمارے قوانین۔ ہمارے رسوم و عادات اور ہمارے علم و ادب میں ہوا ہے۔ اگر یہ اس وقت ہماری راہ ترقی میں حائل نہیں ہیں تو ہم انھیں ضروری برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہمیں کوئی اس سے بہتر نئی چیز نہ حاصل ہو جائے ہم اپنے گذشتہ کارآمد ذخیرہ کو کیوں خیرباد کہلائیں ؟ ہمارے تمدن کے یہ مخصوص خصایص انسانیت اور جمہوریت کی روح کے حامل ہیں اور ان سے دنیا کو فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے نقصان نہیں لیکن اس کے ساتھ بہت سا کوڑا کرکٹ بھی ہماری زندگی میں جمع ہو گیا ہے ہمیں اسے جلد از جلد صاف کر دینا چاہیئے۔ خصوصاً مسلمانان ہند کی تمدنی زندگی میں تو اس گندگی کی بہتات ہے۔ ہماری تعلیم کا یہ اولین مقصد ہونا چاہیئے کہ وہ اسے صاف کر دے۔

مسلمانان ہند کی نفسی زندگی کا اظہار تو شروع میں فارسی زبان کے ذریعہ ہوا۔ لیکن اس وقت تک ہم پر ایرانی اثرات بہت غالب تھے اس لئے وہ مسلمانان ہند کی آزاد نفسی زندگی نہیں کہی

جا سکتی۔ دراصل اردو ہی مسلمانان ہند کی قومی نفسی زندگی کی ترجمان ہے۔ جب سے اردو عالم وجود میں آئی اسی وقت سے ہم نے اپنا ادبی وجود علیحدہ محسوس کرنا شروع کیا شروع میں ہم پر اس طرح ایرانی اثرات غالب رہے جس طرح بچے پر اس کے والدین کے اثرات غالب رہتے ہیں لیکن بالآخر ہم نے اس محکومیت سے خود کو آزاد کر لیا۔ ہماری شاعری میر و غالب کی شاعری کے دور سے گزر کر اقبال کی پرجوش و روح پرور شاعری میں اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ ہماری نثر میں ہنوز ابھی تک وہ پختگی نہیں آئی ہے لیکن زمانہ کے تھپیڑے اسے بھی شاند جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ پھر سماجی اداروں اور فنون لطیفہ یعنی فن تعمیر۔ مصوری۔ موسیقی وغیرہ میں بھی ہماری قومی خصایص کا اظہار ہے اور جس نے بحیثیت مجموعی ہندوستان کی تمدنی زندگی کو مالا مال کر دیا ہے۔ بلا وجہ اس تمام سرمایہ کو ترک کر دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں البتہ جدید زمانہ کے رجحانات کا اس کو ضرور آئینہ بردار ہونا چاہیئے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ اس کی ہر اچھی چیز بھی برباد ہو جائے۔ بہرصورت یہ وہ تمدنی سرمایہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ صرف بدھنے کی لوٹنی۔ ٹخنہ سے اوپر پاجامہ اور ڈاڑھی ہی ہماری تہذیب کی نشانی نہیں ہے جس طرح پنڈت جواہر لال جی ارشاد فرماتے ہیں۔

(ج) سوم ہمارے تعلیمی نصب العین کو مسلمانان ہند کی سیاسی معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تعلیمی نصب العین سیاسی و معاشی مقاصد کو پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ اور تعلیمی نظام زیادہ سے زیادہ ان مقاصد کے حصول کے لئے طلبا کو تیار کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی تعلیمی نظام ان مسائل کو کلیتاً حل نہیں کر سکتا اور نہ تعلیمی نظام کا یہ کام ہے یہ مسائل تو کسی قوم کی مکمل زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور خصوصاً سیاسی زندگی سے انکا گہرا واسطہ ہے۔ اس لئے ان کی حل کے لئے قوم کے تمام سماجی اداروں خصوصاً سیاسی ادارے یعنی ریاست کو کوشش کرنی چاہیئے۔ تعلیم کے مقصد کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض حضرات تعلیمی اداروں کو صرف معاشی ادارے بنا دینا چاہتے۔ وہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتے ہیں یا اس سے خاص قسم کے سیاسی مبلغین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تعلیم کا مقصد تو صرف

انسان کے قومی نفس کی ترقی ہے گو سیاسی اور معاشی قدر اس مقصد کے لیے بطور وسیلہ کے ضرور استعمال کیے جاتے ہیں۔ گاندھی جی نے شروع میں جو تصور تعلیم پیش کیا اس سے یہی خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مدرسوں کو صرف اس لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی قومی معاشی دولت میں اضافہ ہو۔ گویا مدرسے مدرسہ نہ رہیں بلکہ کاموں کے لیے کارخانے ہو جائیں۔ ملک میں بجا طور پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ لیکن بالآخر جو رپورٹ آل انڈیا ایجوکیشن کمیٹی نے وردھا اسکیم پر غور و خوض کے بعد پیش کی ہے وہ صحیح تعلیمی اصولوں پر مبنی ہے۔ وہاں ہاتھ کا کام صرف اس لیے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے کہ اس سے مطلوب فوری معاشی فائدہ ہے بلکہ انسانی شخصیت کی مکمل نشو و نما کے لیے جسمانی اعضا کی نشو و نما اور تربیت بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ نفسی قویٰ کی۔ پھر نفسی اور جسمانی قویٰ میں کچھ ایسا گہرا باطنی رشتہ موجود ہے کہ ایک کی مکمل نشو و نما دوسری کی نشو و نما کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ہم ذہن انسانی کی تربیت چاہتے ہیں تو اس کے لیے جسمانی تربیت کی اسی قدر ضرورت ہے۔ ہاتھ سے کام کی اس لیے ضرورت ہے کہ انسان کی تخلیقی قوتوں میں ترقی ہو۔ طلبہ کے اعمال جب تک تخلیقی نہ ہوں نہ وہ اسوقت تک انسانی شخصیت کے صحیح ترجمان ہو سکتے ہیں اور نہ اس کی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں ان مسائل پر ہم تفصیل سے بعد میں "جدید تعلیمی تحریکات" کے عنوان کے تحت میں بحث کریں گے۔ غرضکہ تعلیمی نقطہ نظر سے بھی ہمارے لیے سیاسی و معاشی عناصر کو اپنے تعلیمی نصب العین میں شریک کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا اہم سیاسی مسئلہ مسلمانان ہند کے لیے اس ملک کو غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ سیاسی غلامی کے باعث ہماری تمدنی زندگی کچھ ایسی سوکھ کر مرجھا گئی ہے کہ وہ اپنے شایان شان برگ و بار نہیں لا سکتی۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

آزادی تمام نفسی زندگی کی ترقی کے لیے شرط اولین ہے۔ قومی تمدنی زندگی کے لیے یہ اصل بنیاد ہے۔ گذشتہ دو سو برس میں سیاسی غلامی کے باعث ہم بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں بھی

مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور جب تک ہم اس سیاسی غلامی سے نجات نہ حاصل کریں گے ہماری تمدنی زندگی کا پودا کبھی بھی تناور درخت نہیں بن سکے گا۔ اس کے سائے میں نہ ہم اس وقت تک سکون سے زندگی گذار سکتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو راحت دے سکتے ہیں۔ اور ہمارے لئے باہر کی جھلس دینے والی ہواؤں اور فنا کر دینے والی دھوپ میں کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

آزادی ہند کا مسئلہ اب اس قدر مسلم الثبوت ہے کہ اس پر زائد بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زبانی طور پر تو اس مقصد کو اب ہم بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے مدرسوں میں ہنوز آزادی کی بجائے غلامی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یورپ میں بچپن سے ہر بچہ کے دل میں وطن کی محبت اور جذبۂ آزادی پیدا کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کو غلامی پر قانع رہنا سکھایا جاتا ہے۔ اور نفرت۔ کوتاہ دلی اور تعصب ان کی گھٹی میں پلائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ بڑے ہو کر بجائے اس کے کہ اپنی جد و جہد ملک کی آزادی کے لئے صرف کریں ان کی تمام طاقتیں ایک دوسرے ہی کی گردنیں کاٹنے میں صرف ہوتی ہیں۔

آزادی ہند کا نصب العین جہاں مستقل بالذات اپنی حیثیت رکھتا ہے وہاں وہ ہمارے بہت سے تمدنی مسائل کے حل کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ مثلاً آزادی کے ذریعہ ہم میں وہ طاقت پیدا ہو جانی چاہیئے کہ ہم اپنے معاشی مسئلہ کو حل کر سکیں ہندوستان کی تقریباً نوے فی صدی آبادی دیہاتوں میں زندگی گذارتی ہے اور ان میں بیشتر کسان ہیں۔ ان کسانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ قابل بیان نہیں ہے۔ شہروں میں بھی غریبوں کی اس سے بہتر حالت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ انھیں روٹی کا ٹکڑا میسر آتا ہے تو دوسری مرتبہ نہیں یہ لوگ موت کے قریب آ لگے ہیں۔ ان کی صحتیں برباد ہو چکی ہیں۔ وہ صرف زندہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے ہیں۔ جہالت کا یہ عالم ہے کہ انھیں دنیا کی کسی چیز کا پتہ نہیں ہے۔ تقریباً ننانوے فی صدی ان میں معمولی لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے۔ ہر کوئی انھیں اپنی ذاتی اغراض کے لئے جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ ذہنی پستی کے ساتھ ساتھ اخلاقی پستی بھی ان میں برابر بڑھ رہی ہے۔

یہ تمام خرابیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب ان کی بے روزگاری کو دور کیا جائے۔ وہ اس قدر کما سکیں کہ خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی آرام سے گزار سکیں۔ ہندوستان کی غلامی جہالت اور غربت کی بدقسمتی میں مسلمان برابر برادران وطن کے ساتھ شریک ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں تو انہیں اپنے حق سے بھی زائد پاسنگ حاصل ہے۔ ہمارا تعلیمی نصب العین ملک کی ان شدید ترین ضروریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بچوں میں شروع سے آزادی کا جذبہ پیدا کریں۔ اپنے مفلوک الحال جاہل ہم وطنوں کے ساتھ ان میں ہمدردی کا مادہ پیدا کریں اور اسے اس قدر پختہ کر دیں کہ بعد میں ہمارے طالب العلم چاہے کسی شعبہ حیات میں کام کریں مگر ملک کو وہ غلامی جہالت اور غربت سے نکالنے کی انتھک کوشش کرتے رہیں۔

(د) غرضکہ مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین کے اجزائے ترکیبی۔ روحانی مذہبی۔ اخلاقی تاریخی۔ لسانی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور معاشی ہوں گے ان تمام اجزا میں روحانی عنصر ایک سررشتہ کا کام دے گا۔ ہمارے نظام تعلیم کا مقصد ہوگا کہ ہم نفس انسانی کی ان تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کریں اور ان کی اس نصب العین کے تحت میں نشو و نما کریں جو خود ان قویٰ میں امکانی طور پر موجود ہے (POTENTIAL)۔ عملاً ان مقاصد کے حصول کے لئے ہم روحانی و مذہبی راہ نما۔ سائنسدان فلسفی۔ شاعر۔ ادیب ماہرین فنون لطیفہ۔ قانون داں سیاسی مدبر۔ صناع اور کاشتکار وغیرہ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اچھے معلم پیدا کرنا بھی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہوگا چونکہ ان کے ذریعہ ہی ہم آئندہ نسلوں کی اپنے نصب العین کے تحت میں تربیت کر سکیں گے۔

ہمارے اس تعلیمی نصب العین کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دائمی و ابدی ہے اس نصب العین کو ہمیشہ زندگی اور زندگی کے اصولوں کا ترجمان و حامل ہونا چاہیئے ورنہ وہ فرسودہ اور بے کار ہو جائیگا اگر وہ زندگی کے دھارے کا ساتھ نہ دے گا اور اپنے میں ضروری تبدیلیاں پیدا نہ کرے گا تو وہ ہماری قوم کے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوگا۔ اسی طرح مضر جس طرح آج سے چھ سو برس کا قدیم

مذہبی نظام تعلیم جو اس وقت ہماری تمدنی ضروریات پوری نہیں کر رہا ہے ہمارے لئے مضر ثابت ہو رہا ہے۔ یا مغربی نظام تعلیم جو ہماری قومی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا اور وہ بھی ڈیڑھ سو برس قدیم ہو گیا ہے اور ہمارے لئے اس وقت باعث ہلاکت ہو رہا ہے۔

زندگی میں برابر ارتقا ہو رہا ہے۔ مادی زندگی کے ارتقا سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان نے فطرت کی سینکڑوں قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے اور ان کو وہ اپنے اغراض کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ ذہنی اعتبار سے بھی انسان برابر بلند ہو رہا ہے۔ ہم اپنے آباؤ اجداد سے عقلی اعتبار سے بدرجہا بلند ہیں ہمارے حیوانی آباؤ اجداد کو تو چھوڑئے کہ ان میں اور ہم میں اب بیّن فرق موجود ہے مگر ہم ابتدائی انسانوں سے بھی عقلی اعتبار سے بلند تر ہیں۔ ہمارے منطقی و فلسفیانہ تصورات میں اب زیادہ وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے اخلاقی و مذہبی اعتبار سے بھی ہم نشو و نما کر رہے ہیں، اخلاقی و مذہبی تصورات شروع میں قبیلی۔ پھر خاندان۔ پھر قبیلہ کے تصورات پر مبنی تھے۔ انسانوں کے دیوتا قبیلوں کے سرداروں کی طرح آپس میں لڑتے تھے۔ ان میں بغض و عداوت بھی ہوتا تھا مگر اب ہمارا مذہبی و اخلاقی تصور بہت بلند ہو گیا ہے۔ گو انسانیت کا بین الاقوامی قانون ہنوز اقوام کے تصور پر مبنی ہے۔ ابھی تک وہ وحشت اور بربریت کے دور سے نہیں نکلا ہے۔ لیکن انسانیت کا تصور خصوصاً رسول اللہؐ کی بعثت کے زمانہ سے برابر قوت حاصل کر رہا ہے تاریخ کا موضوع چونکہ انسان ہیں جن میں جذبات کی بڑی کارفرمائی ہے اس لئے عمل اور ردعمل ہوتا لازمی امر ہے لیکن باوجود اس کے بھی انسان کا اخلاقی تصور وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اب تو نظری اعتبار سے انسانیت کے تصور سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے چاہے وہ عملاً اس پر کاربند نہ ہو۔

اسی طرح مذہبی اور روحانی تصور بھی وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ رسول اللہؐ نے ایک نہایت ہی بلند و بالا روحانی تصور دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ روح جو کہ کائنات کی اصل ہے ارتقا کی پابند ہے۔ اس لئے کائنات کے ہر ذرہ کو اسی اصول کا پابند ہونا چاہیئے۔ ہمارا تمدنی

وتعلیمی نصب العین اسی حد تک زندہ نامی اور حرکی (ORGANIC AND DYNAMIC) ہو سکتا ہے جس حد تک کہ وہ ارتقا کے اس اصول کا پابند ہو۔ اگر وہ ساکن و جامد رہے گا تو زندگی کی رو آگے بڑھ جائے گی اور وہ بے کار ہو جائے گا۔ زندگی خود اپنے لئے مقاصد اور نصب العین کی تشکیل کرلے گی حقیقت کی اصل زندگی ہے۔ اور زندگی نام ہے پھیلنے۔ پھولنے۔ نشو و نما پانے آگے بڑھنے اور ارتقا کا جب تک ہمارا تعلیمی نصب العین نشو و نما کرتا رہے گا۔ زمانہ کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ مستقبل کی تشکیل دینے والی قوتوں کا حامل ہوگا وہ باقی رہے گا ورنہ موت اس کا خاتمہ کر دے گی۔

اگر مذہبی اصطلاح میں گفتگو کی جائے تو کہا جائے گا کہ امکانی طور پر روحانی۔ اخلاقی۔ جمالی سیاسی معاشی۔ قوتیں نفس انسان میں موجود ہیں۔ عینی طور پر یہی قوتیں خدا کی ذات میں موجود ہیں جو اس کی صفات کہلاتی ہیں۔ مثلاً ربوبیت، رحمٰنیت۔ رحیمیت ملوکیت۔ رزاقیت۔ خلاقیت جمال۔ عدل۔ وغیرہ۔ انسان کی انھیں امکانی ایزدی قوتوں کو اس طرح نشو و نما دینا کہ وہ خدائی صفات کے مماثل ہو جائیں اسلامی تعلیم کا نصب العین ہے۔ مختصر یہ کہ

تخلقو باخلاق اللہ

مسلمانوں کی تعلیم کا نصب العین ہے۔ اب عینی طور پر خدا انسان کے روحانی اخلاقی جمالی سیاسی و معاشی نصب العین کا حامل ہے اس لئے انسان کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے تمدنی اداروں کو اس بلند و بالا نصب العین کی روح سے لبریز کرنے کی کوشش کرے۔ جس قدر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگا اسی قدر وہ اپنے تعلیمی فریضہ کو ادا کرے گا۔

پھر اسلام کا خدا ارسطو کے خدا کی طرح جامد و ساکت نہیں ہے بلکہ فعال و خلاق ہے۔ اسی لئے فعالیت اور تخلیق ہمارے تعلیمی نصب العین کا سب سے بڑا طرہ امتیاز ہوگا۔ ہمارا تعلیمی نصب العین بھی جامد و ساکت نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمیشہ متحرک ہوگا۔ اور تخلیق اس کی خاص صفت ہوگی۔

نصب العین بغیر ذرائع کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نصب العین کے حصول کے ذرائع

نفوس انسانی ہیں۔ آئندہ مضمون میں ہم نفس انسانی کی صلاحیتوں اس کے نشو ونما کے قوانین ان صلاحیتوں کا نصب العین سے تعلق اور ان صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے تمدنی قدورؔ کی ضروریات سے بحث کریں گے۔ نصب العین اور ذرائع کی بحث کے بعد ہم ہندوستان کی جدید تعلیمی تحریکات اور مسلمانوں سے ان کے تعلق پر بحث کرسکیں گے۔

اقبال کا نوجوان

(از جناب نور الحسن ہاشمی صاحب ایم اے)

گذشتہ جنگ کے اختتام نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں اور اپنی اندرونی قوتوں کا دوبارہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ موجودہ طوفان خیز موجوں میں اپنی کشتی کسی سمت یا کسی طرح کامیابی سے چلا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا (اور اب بھی ہے)۔ سلطنت ترکی جس پر مسلمانوں کو خاص طور پر اور بجا طور پر ناز تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھی ایران کی حالت الگ زبوں تھی اور وہ اپنی زندگی کے لئے روسی اور انگریزی قرضوں کا پابند تھا۔ عرب میں نااتفاقی تھی اور اس لئے بیشتر غیر اقوام کا شکار کابل غریب تھا۔ ہندوستان غلام چین بے بس۔ ایسی حالت میں یقیناً مسلمانوں کے لئے ظاہراً صرف یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ ہر مسلمان ملک اپنے اپنے حدود میں محصور ہو کر اپنی بھلائی اور بہبودی کی ترکیبیں سوچنے لگے لیکن ایک اس سے بھی بہتر صورت تھی وہ یہ کہ پہلے مسلمان خود غور کریں کہ وہ مذہبی۔ تعلیمی۔ معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے دیگر اقوام کے مقابلہ میں کیا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ اسی سوال کا حل سوسائٹی اور دنیا کی زمینوں میں ان کی زندگی کے لئے جگہ مقرر کر سکے گا۔ اب تک جو مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی وہ مختصراً یہ کہ توہم پرست۔ گذشتہ میں یقین رکھنے والے۔ تقدیر پر پڑے رہنے والے۔ تدبیر و محنت سے جی چرانے والے۔ علم و عمل کی دنیا سے دور بھاگنے والے۔ اسلام کی روح سے بے خبر ظاہری باتوں اور فضول کی روایات پر ایمان رکھنے والے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ زمانہ نے انھیں بہت جلد دکھا دیا کہ اب وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لائق نہیں رہے۔ ان کی تلواریں اب زنگ آلودہ ہو گئیں اتفاق ان سے اٹھ گیا۔ ایمان ان سے جاتا رہا ان کی تہذیب پرانی ہو گئی اس لئے بہتر یہی ہے کہ اب اس دنیا میں وہ کوئی اپنا حق نہ سمجھیں بلکہ ان لوگوں کے لئے جگہ چھوڑ دیں۔ جو ان سے بہتر ہیں اور زندہ

رہنے کے لئے ان سے مستحق تر۔ یہ حالت و کیفیت تھی جس میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو پایا۔ لیکن اصلاح کی کوشش کون کرتا۔ ہمت کون کرتا۔ وہ جس کے دل میں درد ہوتا یا وہ جس کے ہاتھ میں طاقت طاقت مصطفٰے کمال کے ہاتھ میں تھی اور درد اقبال کے دل میں۔

چنانچہ جب مسلمانوں کی اس پستی کی طرف نظر پڑی تو اقبال روئے بغیر نہ رہ سکا۔ طاقت تو تھی نہیں کہ ایک دم زبردستی مار گھسیٹ کے لوگوں کو صراط مستقیم پر لا ڈالتا۔ صرف درد تھا جس کی بدولت وہ مسلمانوں کے زوال پر پیچ و تاب کھاتا ہے اور انھیں جوش دلاتا ہے کہ وہ اپنی اس گئی گزری ہوئی حالت کو سدھاریں طرح طرح سے اکساتا ہے کہ وہ قوت۔ عمل اور جد و جہد کے اصول کو سمجھیں۔ اس پر عمل کریں تاکہ ترقی کر کے دوسری اقوام کے صرف دوش بدوش ہی نہ چلنے لگیں بلکہ ان سے گوئے سبقت لیجائیں اور اس طرح ان کی گزری ہوئی حالت پھر سدھر جائے اور ان کا روشن گذشتہ پھر دوبارہ عود کر آئے۔

علامہ پیام مشرق کے دیباچہ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور ان کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے .... مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو......... اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالا تر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔" غرضکہ علامہ نے قرآن کریم کے اس سادہ اصول کو مانتے ہوئے کہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (کوئی قوم نہیں بدلتی جب تک اس کے افراد کے دلوں میں تغیر نہ ہو) مسلمانوں کی ذہنیت کو جو عرصہ سے پست ہو گئی ہے بدلنے کی کوشش کی ہے اور یہاں پر ہم ان کے اس پیغام سے بحث کریں گے جو انھوں نے

مسلمان نوجوانوں کو دیا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کی حالت کیا ہے اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو واقعی پتہ چلتا ہے کہ سوائے تن آسانیوں کے ہم لوگوں کی اور کوئی غایت اور غرض نہیں ہوتی۔ لاپروائیاں۔ مذہب سے ناآگہی مذہب کے اصولوں سے بالکل بے خبری۔ مقصود حیات محض ذاتی عظمت۔ فرنگی تعلیم اور مغربی فیشن سے محبت۔ خود اپنی حالت درست کرنے کی نہ خواہش نہ رغبت

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں — کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

ظاہر ہے کہ استغنا کیسے ہوتا جب دل میں نہ وسعت ہے نہ اطمینان۔ اور اصلی جڑ تمام خرابیوں کی بھی دل کی بے سروسامانی ہے جس کی تعمیر کی اقبال کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل ٹھیک نہیں ہوتا خارجی معاملات بھی نادرست ہی رہیں گے۔ آپس میں نفاق۔ غریبی۔ غداری۔ نہ سجدوں میں تڑپ۔ نہ نگاہ میں ذوق۔ قومیت سے بیگانہ اس لئے فرد بھی منتشر اور قوم بھی تباہ۔ دوسروں کے آگے دریوزہ گری۔ اپنی غلامانہ حالت کو باعث وقار سمجھنا یہاں تک کہ خود احساس غلامی کا مٹ جانا نتیجہ یہ کہ ظاہر محض نمائش اور دل محض تاریک۔ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس قوم کی بقا معلوم۔ فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر۔

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ — شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں، منکر ز خود مومن بہ غیر — خشت بند از خاک شاں معمار دیر

موجودہ تعلیم سے اقبال نالاں ہیں اور بجا طور پر کہ نہ صرف الحاد پیدا کرتی ہے بلکہ ہم کو بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیتی ہے اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصود۔ یہ صحیح ہے کہ دماغ کو روشن کرتی ہے لیکن دل کو مار دیتی ہے روح اور اس کی تمام اعلیٰ صفات کو بے کار کر دیتی ہے۔ نہ دل میں سوز رہتا ہے:

روح میں تڑپ۔ ہم مادیت اور محض شکم میں یقین رکھنے لگتے ہیں۔ روح کی اعلیٰ خوبیاں ہماری نگاہ سے دور ہو جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے میں یقین نہیں رہتا اور جب اپنے میں یقین نہ رہا تو ظاہر ہے کہ دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ حضرت اقبال مسلمان نوجوانوں کی اسی زار حالت کی شکایت پیغمبر صلعم سے یوں کرتے ہیں۔

این مسلمان زادۂ روشن دماغ   ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر   آرزو در سینۂ او زود میر
این غلام ابن غلام ابن غلام   حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود   از وجودش این قدر دانم کہ بود
این ز خود بیگانہ این مست فرنگ   نان جو می خواہد از دست فرنگ
نان خرید این فاقہ کش با جان پاک   داد ما را نالہ ہائے سوزناک
دانہ چیں مانند مرغان سرا است   از فضائے نیلگوں ناآشناست (مسافر)

ایک دوسری جگہ یوں فریاد کرتے ہیں

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر   لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم   کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما   لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو   کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

عصر حاضر کی تعلیم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی   اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر   چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا   آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو   پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اور اس ناپختہ تعلیم اور اس سے اثر پذیری کی ذمہ داری محض نوجوانوں ہی کے سر نہیں تھوپ دیتے بلکہ ان اساتذہ سے بھی نالاں ہیں جو خود نہ تعلیم کا مقصد سمجھتے ہیں نہ اس علم میں غائر نظر رکھتے ہیں جس کا وہ درس دیتے ہیں

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر	از مقام او نداد او را خبر
آتش افرنگیاں بگداختش	یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
مومن وازرمزِ مرگ آگاہ نیست	در دلش لا غالب الا اللہ نیست
تا دل او در میان سینہ مرد	می نیندیشد گراز خواب و خورد
از فرنگی می خرد لات و منات	مومن واندیشۂ او سومنات
قُم باذنی گوے وا ورا زندہ کن	در دلش اللہ ھو را زندہ کن
ما ہمہ افسونیٔ تہذیب غرب	کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جام اوشکست	وانما یک بندۂ اللہ مست
تا مسلماں باز بیند خویش را	از جہانے برگزیند خویش را (مسافر)

یا ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست	تا بجذب اندرونش راہ نیست
نور فطرت را زجانہا پاک شست	یک گل رعنا ز شاخ او نرست
خشت را معمار یا کج می نہد	خوئے بط با بچۂ شاہیں دہد (جاوید نامہ)

غرضکہ اس تعلیم نے جس نے مسلمان نوجوانوں کی دماغی ذہنیت اور روحانی فطرت کو یوں بدل دیا ہو اسے اقبال کس طرح پسند کر سکتے ہیں

من آں علم وفراست باپر کاہے نمی گیرم	کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ کسی طرح مسلم نوجوانوں کے ذہنوں میں انقلاب پیدا ہو جائے تاکہ انھیں اپنی رفعت کی حد اپنی حیات کا مقصد اور اپنی روحانی طاقتوں کا احساس ہو سکے

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیر یاب
انقلاب

انقلاب۔ اے انقلاب

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب
انقلاب

انقلاب۔ اے انقلاب (زبورِ عجم)

لیکن وہ ایسا انقلاب محض ظاہری اور وقتی نہیں چاہتے بلکہ دل کا اور روح کا۔ اور یوں بھی انقلاب کی تلقین اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ایک دوسرا لائحہ عمل پیش نظر ہو۔ یہ دل و نظر کا انقلاب اقبال کے خیال میں صحیح مذہبی تعلیم میں پنہاں ہے۔ کیونکہ اسی سے دل و نظر کی تعلیم یعنی اخلاق کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ موجودہ تعلیم گو نہایت اعلیٰ سہی مگر جب تک اس سے ذہنی و فکری بلندی نہ نصیب ہو اس وقت تک تعلیم کا مقصد حل نہیں ہو سکتا

مرید ہندی :۔ چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی :۔ علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی :۔ پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومی :۔ دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مرید ہندی:۔ علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوزِ درد و داغ

پیر رومی:۔ علم و حکمت زاید از ناں حلال
عشق و رقت آید از نان حلال (بال جبریل)

مسلمان نوجوانوں اور ان کی تعلیم کا کیا صحیح اندازہ کیا ہے

عقلہا بے باک دلہا بے گداز | چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل | زوج زوج اندر طوافِ آب و گل
آسیا آں مرز و بوم آفتاب | غیر بیں، از خویشتن اندر حجاب
قلب او بے وارداتِ نو بنو | حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر | ساکن و یخ بستہ و بے ذوق سیر!
صید ملایاں و نخچیر ملوک | آہوے اندیشۂ او لنگ و لوک
عقل و دیں و دانش و ناموس و ننگ | بستۂ فتراک لُردان فرنگ (جاوید نامہ)

یا دوسری جگہ

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق | آں یقین آں رنگ و بو، آں ذوق و شوق
عالماں از علم قرآں بے نیاز | صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز!
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست | کو جواں مردے کہ صہبا در کدوست!
ہم مسلمانان افرنگی مآب | چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِ دیں اند ایں ہمہ | اہل کیں اند اہل کیں اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام | دیدہ ام صدق و صفا را در عوام
اہل دیں را باز داں از اہل کیں | ہم نشیں حق بجو با او نشیں
کرگساں را رسم و آئین دیگر است | سطوت پرواز شاہیں دیگر است (جاوید نامہ)

غرض اس اہل کلیسا کے نظام تعلیم کو دین و مروت کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے طالب علم کی پہلی اندرونی اصلاح کرنا چاہتے ہیں

شاخ گل پر چہک ولیکن ۔۔۔ کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ۔۔۔ ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ
غافل منشیں نہ وقت بازی ست ۔۔۔ وقت ہنر است و کار سازی ست

اور یہ کہ ۔۔۔ منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر ۔۔۔ کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو ۔۔۔ ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب ۔۔۔ سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یا یہ کہ

سینے میں اگر نہ ہو دل گرم ۔۔۔ رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست ۔۔۔ آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آب حیات اسی جہاں میں ۔۔۔ شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقت حقیقی ۔۔۔ غیرت سے ہے فقر کی تمامی

خودی کی تربیت اقبال کی نظر میں پہلا زینہ ہے جس پر کسی نوجوان کو قدم رکھنا ہے جو کوئی اس اصلی اصول سے ناواقف ہے اس کی تربیت غیر مکمل اور اس لئے اس کی زندگی بے کار۔ خودی کی پرورش تربیت پہ موقوف ہے کہ مشت خاک میں آتش ہمہ سوز پیدا ہو سکے ۔

یہی ہے سر کلیمی ہر اک زمانے میں ۔۔۔ ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

اور حالانکہ وہ ہندی مکتبوں سے ناامید ہیں کہ محکوم کے حق میں موسیقی و صورتگری و علم نباتات ہی کی اچھی سمجھی جاتی ہے ۔ ساتھ ہی شیخ مکتب کے طریقوں سے بھی کسی طرح کی امید نہیں رکھتے کہ وہ کشاد دل' نہیں رکھتے پھر بھی طالب علموں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کیونکہ دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور یہ ذوق خراش کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظر سے ۔ یہ فیضان نظر ہی کی دولت تھی جس نے ابراہیم کو آداب فرزندی سکھائے ۔

صد کتاب آموزی از اہل ہنر — خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر — مست می گردد بانداز دگر!

از دم باد سحر میرد چراغ — لالہ زاں باد سحر مے در ایاغ

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش — گرد خود گردندہ چوں پرکار باش!

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر — پاک شو از خوف سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ — قصد در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است، تاویلے مجو — جز بقلب خویش قندیلے مجو

حفظ جانہا ذکر و فکر بے حساب — حفظ تن ہا ضبط نفس اندر شباب

حاکمی در عالم بالا و پست — جز بحفظ جان و تن ناید بدست

لذت سیر است مقصود سفر — گر نگہ بر آشیاں داری مپر

ماہ گردد تا شود صاحب مقام — سیر آدم را مقام آمد حرام!

زندگی جز لذت پرواز نیست — آشیاں با فطرت او ساز نیست

رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور — رزق بازاں در سواد ماہ و ہور (جاوید نامہ)

یعنی ہم لوگ آپس میں محبت پیدا کریں۔ قہر و غضب کی حالت میں بھی عدل کو ہاتھ سے نہ دیں اطمینان و بے فکری و عیش میں بھی دیدۂ دل وا رکھیں۔ ضمیر کو پاک اور دل کو بلند اور وسیع بنائیں۔ جوانی میں نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ اور آخر یہ کہ پرواز سے کبھی غافل نہ رہیں اس لئے کہ توکل اور استغنا جمود کے ہم معنی ہیں۔ ایک زندگی یوں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کہ دریوزہ گری کی جائے یعنی دوسروں کی محنتوں پر کتوں کی طرح جیا جائے ایک زندگی یہ کہ شاہین و زاغ کی طرح اپنی زندگی کے لئے خود جد و جہد کی جائے اور ہر روز اپنے اوپر خود اپنے رزق کے لئے اعتبار کیا جائے :

علم بغیر سوز دل کے بالکل بے کار ہے اگر دل کی تربیت نہ ہوئی اور علم اس کو نہ سنوار سکا اس کی تربیت نہ کر سکا تو کرم کتابی کی طرح ابو سینا و فارابی کی ورق گردانی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا علم اگر زندگی کو نہ بنا سکے تو ایسے علم سے کیا حاصل ؟ اور علم زندگی کو اسی وقت بنا سکتا ہے جب دل میں سوز و تپش پیدا ہو جائے۔ ورنہ یوں کتابیں تو اتنا کور ذوق بنا دیتی ہیں کہ صبا سے بوئے گل کا بھی سراغ نہیں مل پاتا :

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے   کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

(پیام مشرق)

پھر آگے تلقین کرتا ہے کہ ایک نوجوان میں ادب و آدمیت ہونا چاہیئے۔ انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ کافر ہو یا مومن برابر کی شفقت کرنا چاہیئے۔ بری صحبتوں سے بچنا چاہیئے کہ ... راستہ یہی ہے۔

دین در اصل کیا ہے محض طلب و ذوق و شوق میں جلنا۔ اور یہ طلب ادب و احترام سے پیدا ہوتی ہے جس کا انجام عشق ہوتا ہے۔ ادب و احترام کا نوجوان میں پیدا ہونا اس کی اندرونی اصلاح کے لئے پہلا اور ضروری سبق ہے

دیں سراپا سوختن اندر طلب　　انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست　　بے ادب بے رنگ و بو بے آبروست!
نوجوانے را چو بینم بے ادب　　روز من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا　　یاد عہد مصطفیٰ آید مرا!
از زمانِ خود پشیماں می شوم　　در قروں رفتہ پنہاں می شوم
ستر زن یا زوج یا خاک لحد　　ستر مرداں حفظ خویش از یار بد
حرف بد را بر لب آوردن خطاست　　کافر و مومن ہمہ خلق خداست!
آدمیت احترام آدمی!　　باخبر شو از مقام آدمی!
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن　　بر طریق دوستی گامے بزن!
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق　　می شود بر کافر و مومن شفیق!
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل　　دل اگر بگریزد از دل، وائے دل! (جاوید نامہ)

یا

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی　　خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی　　خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ! (بال جبریل)

تیسرا سبق وہ نوجوان کو یہ دیتے ہیں کہ خواہ تو کہیں کا بادشاہ کیوں نہ ہو لیکن فقر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے دل کو الگ رکھنا باہمہ و بے ہمہ رہنا۔ دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے درد و سوزِ دل کے۔ نعمت و فراوانیِ اسباب تعیش انسان کو اندھا بنا دیتا ہے اس کے دل میں سوز نہیں رہتا۔ وہ علائق دنیوی میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اس کو اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر دکھ۔ مصیبتیں اور تکالیف روحانی شروع ہو جاتی ہیں اس لئے اقبال ہم نوجوانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنے اعلیٰ مراتب دنیوی پر کیوں نہ پہونچ جائیں لیکن دل درویش رہنا چاہئے

آدمی وہی ہے جو دولت حاصل کر کے اس پرست ہو جائے۔ جو ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق رکھے نہ کہ مال و دولت قارون و فکر افلاطون"

گرچہ باشی از خداوندان ده | فقر را از کف مده، از کف مده
در جہاں جز درد دل سامان مخواہ | نعمت از حق خواہ و از سلطان مخواہ
اے بسا مرد حق اندیش و بصیر | می شود از کثرت نعمت ضریر
کثرت نعمت گداز دل برد | ناز می آرد نیاز دل برد!
من فدائے آں کہ درویشانہ زیست | وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

اس کے ساتھ ہی اس بات کی صلاح بھی ہے کہ چونکہ یہ زمانہ ایسا آلگا ہے جس میں لوگ جسم کو جان پر فوقیت دیتے ہیں اور جسم کی خبرگیری کرتے ہیں جان کی نہیں اس لئے مسلمان نوجوان کو یہ بھی چاہیئے کہ کسی ایسے مرد حق کی پیروی کرے جو اس کے زمانہ میں ہو کیونکہ ایسا شخص

او دل اندر نار خود سوزد ترا | باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ با سوز او صاحب دلیم | ورنہ نقش باطل آب و گلیم

اور ایسا شخص اپنے اپنے زمانہ میں کبھی کلیم کہلاتا ہے کبھی مسیح کبھی خلیل اور کبھی محمدؐ۔ لیکن اگر ایسا شخص تجھ کو نہ مل سکے یا کسی ایسے ہی مرد حق کی باتوں سے تو واقف نہ ہو سکے تو پھر گذری ہوؤں میں سے کسی ایسے کو اپنا راہبر بنا جو تیری روح کو رقص میں لے آوے تاکہ تجھ میں سوز۔ تپش۔ ہمدردی اور ذوق و شوق پیدا ہو سکے

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں | در بدن غرق است و کم داند ز جاں
گر نیابی صحبت مرد خبیر | از اب و جد آنچہ من دارم بگیر!
پیر رومی را رفیق راہ ساز | تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست | پائے او محکم فتد در کوئے دوست
رقص تن از حرف او آموختند | چشم را از رقص جاں آموختند

رقص تن در گردش آرد خاک را | رقص جاں برہم زند افلاک را
رقص جاں آموختن کارے بود | غیر حق را سوختن کارے بود
تا ز نار حرص و غم سوزد جگر | جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر
ضعف ایمان است و دلگیری است غم | نوجوانا! نیمۂ پیری است غم
می شناسی؟ حرص، فقرِ حاضر است | من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب | تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب (جاوید نامہ)

ظاہر ہے جب جان رقص میں آجائے گی اور اس میں سوز و گداز پیدا ہو جائے گا تو یہی زندگی دین کی زندگی ہوگی ایسی زندگی مضبوط زندگی ہوگی اور اب اگر وہ لاالٰہ کہے گا تو زمین و آسمان گردش میں آجائیں گے ورنہ یوں خالی ہونٹوں سے کہہ دینا محض ایک ذرا سی محدود ہوا کو حرکت دے دینا ہے

در رہ دیں سخت چوں الماس زی | دل بحق بربند و بے وسواس زی
سرِّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال | خلوت و جلوت تماشائے جمال
لاالٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں! | تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں!
مہر و مہ گردد ز سوزِ لاالٰہ | دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ!
ایں دو حرف لاالٰہ گفتار نیست | لاالٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است | لاالٰہ ضرب است و ضربِ کاری است!

ظاہر ہے اقبال کا ایسا نوجوان کس قدر با محبت، کس قدر بلند ہمت۔ کس قدر سخت کوش اور زندگی کی جد و جہد کے لئے کس قدر پامرد با امید اور تیار نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایسا جوان آزاد ہوگا غلام نہیں

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں | نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے | امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر | تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

جاوید کو اپنے ایک خط میں یوں نصیحت کرتے ہیں

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر | نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو | سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں | سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے | خودی نہ بیچ۔ غریبی میں نام پیدا کر

یا محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
یا اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت | دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

ضرب کلیم میں محراب گل افغاں کے افکار میں اپنا مثالی نوجوان یوں پیش کرتے ہیں

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا | شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر | اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز | کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی | کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو | یہ بے کلاہی ہے سرمایہ کلاہ داری

یہی نہیں بلکہ خدا سے دعا بھی کرتے ہیں کہ

جگر سے وہی تیر پھر پار کر | تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | مرا عشق۔ میری نظر بخش دے

اقبال کے نزدیک وہ جوان ہنگامۂ پیکار کے لائق نہیں جو نالہ مرغانِ سحر سے مدہوش ہو جائے عیش اور اطمینان جوانوں کے لیے جمود اور موت ہے۔ طلبا علیگڑھ کالج کو متوجہ کرتے ہیں

آئی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون | کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

سر سید کو بھی سمجھاتے ہیں

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

موجودہ گروہ اساتذہ کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے کہ جوانوں کی تعلیم ان کے سپرد کی جائے کیونکہ وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں انھیں خود راہ کی خبر نہیں ہے اگر جب خود انھیں خبر نہ ہوگی تو وہ کسی دوسرے کو راستہ کیونکر بتا سکیں گے۔

"پیش خورشید بر مکش دیوار
خواہی ار صحن خانہ نورانی"

(شیخ مکتب سے۔ بال جبریل)

یا

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (ضرب کلیم)

فلسفہ کو وہ نوجوانوں کے لئے مفید نہیں سمجھتے اس لئے فلسفہ حرکت کو فنا کرتا ہے اور بے حرکتی موت ہے

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

دیں مسلک زندگی کی تقویم
دیں سر محمد و براہیم

دل در سخن محمدی بند
اے پور علی ز بو علی چند

(باقی آئندہ)

تعلیم اور جبلتیں

(از جناب عبد الغفور صاحب استاد دکا مدرسہ جامعہ)

انسان کی زندگی کا نظام عمل اس قدر ہمہ گیری اور تنوع رکھتا ہے۔ کہ چند نفسی سانچوں میں اس کی خانہ بندی کرنا ممکن نہیں اور نہ اس قسم کی کوشش سے ہمیں انسان کی تعلیم و تربیت میں براہ راست کوئی مدد مل سکتی ہے۔ تاہم انسانی زندگی کو سمجھنے کے لئے بعض علمائے نفسیات نے زندگی کے بعض اہم اور نمایاں محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے (بحیثیت معلم ہمیں ان کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ زندگی اور تعلیم کا عمل ایک ہے۔ اس لئے اگر ہم کو زندگی کے محرکات اور اثرات سے واقفیت پیدا ہوگئی۔ تو تعلیم کے عمل کو بھی ہم اسی کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ جائیں گے کیونکہ زندگی کے دھارے سے باہر علم کوئی وجود نہیں رکھتا)۔ ان کا خیال ہے۔ کہ اگر انسان کے جذبات عمل کو سادہ سے سادہ شکل میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ تو بعض اہم محرکات ایسے نظر آئیں گے۔ جو بجا طور پر انسان کی زندگی پر حاوی سمجھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض ماہرین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق انسانی محرکات یا جبلتوں کی تقسیم کردی ہے۔ اس تقسیم میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ لوگ اس بات کو مانتے ہیں۔ کہ انسان زندگی کے لئے چند مشترک رجحانات رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض نفسی رجحانات یا محرکات کو تھوڑی سی تشریح کے ساتھ لکھا جاتا ہے تاکہ ہمیں ان کی صحیح تعلیمی حیثیت سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو۔ اس مشکل مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم پروفیسر جان ڈیوئی صاحب کے خیالات کو اپنی مشعل راہ بناتے ہیں۔ کیونکہ پروفیسر موصوف نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس مسئلے پر اپنی کتاب HUMAN NATURE AND CONDUCT میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "پہلے تو سرے سے اس بات کی کوشش ہی غلط ہے۔ کہ قدرتی مشاغل کو چند مخصوص اور مستقل

جبلتوں میں بند کر دیا جائے۔ اور اس خیال کے عملی نتائج تو یقیناً مضر ہیں البتہ جبلتوں کی تقسیم جس قدر ضروری ہے۔ اتنی قدرتی بھی ہے۔ زندگی کی نیرنگیوں کو ذہن اس طرح سمجھ سکتا ہے۔ کہ ان کو خاص خاص عنوانات کے ماتحت چنا جائے۔ اور چند مشترک صفتوں کی روشنی میں ان کی تقسیم کر دی جائے۔"

اس طرح مختلف واقعات کی گتھیوں کو ایک ایک کر کے سلجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح دنیا میں علمی تحقیقات کسی مقصد سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کام کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہیئے۔ اور کسی مقصد کا پورا ہونا ہی اس تقسیم کا جواز ہو سکتا ہے۔ اگر عام طور پر دیکھا جائے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے واقعات اور غیر معمولی افراد کے ساتھ تطابق کرنے میں سہولت ہو۔ مگر جب ہم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہماری جبلتوں کی تقسیم بندھے ٹکے قدرتی رجحانات کی حیثیت رکھتی ہے تو ہم بجائے انسانی زندگی کے واقعات کو سمجھنے کے اس کو اور دھندلا کر دیتے ہیں۔ ہم ایسے خیال کے مدعی ہو جاتے ہیں۔ جس پر قدرت ہم کو فوراً سزا دیتی ہے ہم اسی لئے تو قدرت اور سماج کی نیرنگیوں اور باریکیوں کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں ہمارا خیال اٹل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی کے حقائق بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیالات سخت اور منجمد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ زندگی میں لوچ اور تبدیلی پائی جاتی ہے۔"

چونکہ ہر ایک جبلت کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے اس لحاظ سے انسان کے اندر جبلی محرکات کا بھی کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی میں جتنے مواقع آتے ہیں۔ انسان کے اندر ان سے تطابق کرنے کے لئے مختلف صلاحیتیں اور محرکات موجود ہیں۔ ہر موقع کے لئے الگ الگ محرکات یا رجحانات کارفرما ہوتے ہیں۔ کوئی خطرے کا موقع آیا آدمی چوکنا ہو گیا اور اپنی حفاظت کے لئے تدابیر سوچنے لگا۔ کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوئی۔ آدمی پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور سدباب کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات پر بچپن میں غصہ آئے وہ جوانی میں بھی آدمی کو بھڑکائے۔ یا جس بات پر جوانی میں آدمی چراغ پا ہو۔ وہ بڑھاپے

میں بھی آدمی کو مشتعل کر دے۔ بلکہ تبدیلی کے لئے اس قدر زمانہ گزر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک ہی وقت میں جو تحریک آدمی کو کسی جوابی عمل کے لئے اکساتی ہے۔ دوسرے روز اس کا وہ اثر نہیں ہوتا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اثر کم ہی ہو جائے بلکہ ممکن ہے کہ اس تحریک کا اثر زیادہ ہو جائے۔ اس لئے خود ایک قسم کی تحریک کی شدت میں وقت بوقت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لئے محرکات کو الگ الگ طور پر دیکھنا نہ علمی طور پر صحیح ہے اور نہ عملی طور پر مفید کیونکہ کسی جبلی تحریک کا بہت کچھ اثر ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔ اور جس ماحول میں آدمی رہتا ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ اس لئے اس کا جوابی عمل بھی آدمی کے پاس ایک سا نہیں ہوتا۔ ماحول کے اعتبار سے ایک ہی جبلت مختلف روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر ڈیوی اس بات کو 'خوف' کی مثال سے یوں سمجھاتے ہیں۔ "اندھیرے کا خوف' عام رسوائی کا خوف' دندان ساز کا خوف' جن اور بھوت کا خوف چمگادڑ کا خوف اور ریچھ کا خوف ہرگز برابر نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح بزدلی' گھبراہٹ' احتیاط اور ادب کو خوف کے اقسام میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر ایک کی کیفیت دوسرے سے جداگانہ ہے"۔ مختصر یہ ہے کہ جبلتیں نئی عادتوں کے لئے محور کا کام کرتی ہیں۔ عادتیں خود ان جبلتوں کی تربیت سے بنتی ہیں۔ اور پھر جب کسی نئی ضرورت سے عادتوں کی تشکیل نو کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو پھر یہی جبلتیں عدم تطابق کی حالت کو دور کرنے اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کام آتی ہیں۔ اور اگر وسیع معنوں میں دیکھا جائے' تو تعلیم بھی دراصل عادتوں کی مسلسل تشکیل نو سے عبارت ہے۔ اس لئے جبلت کی جو حیثیت تعلیم میں ہے۔ وہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

۱۔ خوف: معلم یا مربی دانستہ اور نادانستہ طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس جبلت یا محرک سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کے دقتی اثرات کو بھی جانتے ہیں۔ جب کوئی بچہ بڑوں کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کرتا ہے۔ تو بڑے اس کو طرح طرح سے ڈراتے' دھمکاتے اور ملامت کرتے ہیں۔ وہ مجبور ہو کر دوسروں کی مرضی پر چلنا سیکھ لیتا ہے۔ اکثر والدین بچوں

کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔ بات بات پر سزا دیتے ہیں۔ اور قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ خوف ہی ایک ایسا آلہ ہو سکتا ہے۔ جس کے ذریعے بچوں کو سدھارا جا سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ بچے ڈرانے دھمکانے سے مطلوبہ کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر تعلیم و تربیت میں ایک بیرونی دباؤ کے طور پر اس کا برتنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچے محض استاد یا مربی کے ڈر کے مارے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آخر میں جا کر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ بچے پڑھ تو جاتے ہیں۔ مگر زندگی میں دبو کمزور اور پست ہمت ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ ایسے بچے ہمیشہ سے دوسروں کے دھکیلنے سے کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی اُپج سے کوئی کام نہیں کر پاتے ان کو کسی کام کے کرنے سے وہ تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ جس کا کوئی کام کرنے والا قدرتاً حقدار ہوتا ہے۔ عام طور پر تعلیم کے ساتھ چند ایسی تکلیف دہ صورتیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ جن سے بچنے کے لئے چار و ناچار بچے کو پڑھنا پڑتا ہے۔ ایک طرف استاد کا 'بید' اور والدین کی 'ملامت' ہوتی ہے دوسری طرف سبق 'پڑھنا' اور 'رٹنا' ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچہ کم سے کم تکلیف دہ صورت کو اختیار کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض ناعاقبت اندیش والدین بچوں کو باہر جانے یا کسی اور کام سے روکتے ہیں۔ تو ان پر جن اور بھوت پریت کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ اس قسم کا ڈرانا بھی بچوں کے لئے بہت برا ہوتا ہے۔ اس سے بچے توہم پرست ہو جاتے ہیں۔ قدم قدم پر وہ ایک نامعلوم خطرے سے خائف و ہراساں رہتے ہیں۔ لیکن اگر اسی 'خوف' کو صحیح مواقع پر استعمال کیا جائے۔ تو بچوں میں احتیاط اور دور اندیشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور بغیر بیرونی دباؤ کے مناسب طریقہ پر سمجھانے سے بہت سی باتیں سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

بچہ ویسے بھی جب نیا نیا دنیا میں آتا ہے۔ تو اس کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے بہت سی چیزیں اس کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ دوسروں کے ذرا سے خوف دلانے سے بدکنے لگتا ہے۔ اس لئے خصوصیت سے ان کو ہمت دلانے اور ان کے منشا کے مطابق ان سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور وہ جلد سے جلد اپنے پیروں

پر کھڑا ہونا سیکھ جائیں۔ اس لئے چھوٹی عمر میں پولس کا خوف، چور، ڈاکو کا خوف اور جن بھوت وغیرہ کا خوف بچوں کے دل میں ہرگز نہیں جمنے دینا چاہیئے۔ بلکہ حسب ضرورت خطرے کے مواقع کو بھی بہت سمجھ بوجھ کے ساتھ ان کو سمجھانا چاہیئے۔ تاکہ وہ ڈرپوک ہونے کی بجائے محتاط ہونا سیکھیں۔

'خوف بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ حفظ نفس کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ سے آدمی اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اور یہ زندگی کے ٹھوس تجربات سے سبق حاصل کرنے کے لئے بہت بڑا محرک ہے۔ لیکن اگر یہ محرک ناجائز موقعوں پر برتا گیا۔ تو یہ ہمیں بجائے دلیری اور دور اندیشی کے بزدلی اور پست ہمتی کی طرف لے جائے گا۔

۲۔ سماجی تحریک:۔ بچہ نہ صرف ڈر کی وجہ سے کوئی کام کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی زندگی میں بڑوں کی طرح سماجی محرکات سے بھی اثر قبول کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے محبت کریں۔ اس کے کام کو اچھا کہیں۔ خود بھی وہ دوسروں سے محبت کرتا ہے۔ ان کی باتوں کو اچھا جانتا ہے۔ قدم قدم پر ان کی نقل کرتا ہے۔ بات بات میں وہ ان کی شاباش اور تحسین چاہتا ہے۔ اس لئے اگر بچے کو خوف کی بجائے محبت اور ہمدردی سے سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس میں معلم کو بڑی کامیابی ہو سکتی ہے۔ جب شاگرد استاد کو اپنا ہمدرد تصور کرنے لگے گا۔ تو پھر وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے گا۔ کہ اس کی کسی حرکت سے استاد کو شکایت پیدا نہ ہو۔ اور اگر کبھی استاد ناراضگی کا اظہار بھی کرے گا۔ تو شاگرد کے ذہن میں اس کی اہمیت زیادہ ہوگی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سماج ہی کے ذریعے چیزوں کی قدر و منزلت کو پہچانتے ہیں۔ اسی کے ذریعے آدمی علم و ہنر سیکھتا ہے۔ اچھے برے کی پہچان پیدا کرتا ہے۔ خوب صورت اور بدصورت میں تمیز کرنے لگتا ہے سماج کے سایہ تلے انسان زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک انسان سماجی زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے اندر لازمی طور پر سماجی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اور ان کو سماج ہی میں رہ کر وہ پورا کر سکتا ہے۔ سماج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آدمی طرح طرح

کے جتن کرتا ہے۔ کہیں خدمت کرتا ہے۔ کہیں خوشامد کرتا ہے۔ اور کہیں دولت خرچ کرتا ہے کیونکہ وہ سماج ہی میں رہ کر اپنی خوبیوں کو چمکا سکتا ہے۔ اور اس کی کسوٹی پر اپنی اچھائیوں کو پرکھ سکتا ہے۔

جس طرح بڑوں پر اپنی برادری کی رائے اور خیال کا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح بچوں پر بھی استاد کے اثر سے زیادہ اپنے ساتھیوں کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے مدرسہ چھوٹے پیمانے پر سماج کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ جہاں بچے مل جل کر کام کریں۔ دکھ درد میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ خوشی کے موقعوں میں باہم شریک ہوں۔ مشترک مقاصد کے لئے مل کر کام کریں اپنے اندر مدنیت کی خوبیاں احساس ذمہ داری، جذبہ تعاون اور جذبہ خدمت پیدا کریں۔ ایک دوسرے کے کاموں کی قدر کریں۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے مدرسہ کی زندگی کو سماجی زندگی کا نمونہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ مدرسہ اور درجہ کی تنظیم و ترتیب میں طلبہ کی عملی شرکت حاصل کی جائے۔ تاکہ خارجی دباؤ کے اثر سے آزاد ہو کر وہ اپنی اندرونی تنظیم کر سکیں۔ مدرسہ کے طلبہ کو بعض انتظامی ذمہ داریاں دی جائیں۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو حقیقی طور پر محسوس کرنا سیکھیں۔

اس لئے مدرسہ کی فضا ایسی ہونی چاہیئے۔ جہاں بچہ کتاب کی بناوٹی فضا کی بجائے اصلی سماجی فضا میں زندگی گزارے اور اپنے اندر وہ سماجی خوبیاں پیدا کر سکے جو بڑے سماج میں اس کے کامیاب بنانے میں مدد دیں۔ اس قسم کی کوشش کوئی جبری کوشش نہیں ہے۔ بلکہ یہ سماجی رجحانات خود بچے کی سرشت میں پائے جاتے ہیں۔ بچے کا گھر بھی اس کا چھوٹا سماج ہوتا ہے۔ وہ پہلے دن سے سماج سے آشنا ہوتا ہے۔ مدرسہ ذرا بڑا سماج ہوتا ہے۔ یہاں آکر بچے کو نسبتاً زیادہ تطابق حاصل کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مدرسہ کا ماحول گھر کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے جس بیج کو گھر کی محدود زمین میں بویا گیا ہے۔ اس کو مدرسہ کے وسیع تر باغ میں ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس طرح سے بچے کی زندگی کو تدریج پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے گا۔ تو وہ آئندہ جا کر سماج کی بڑی دنیا میں آسانی سے اپنی حیثیت قائم کر سکے گا۔ بچہ اپنے کاموں میں بہت نقال ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے۔ وہاں کے عام مشغلوں کو وہ اپنے طور پر کرنے

کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے جو استاد بچوں کی تعلیم میں ماحول کے مشاغل کو جگہ دے گا۔ وہ بچوں کی تعلیمی دلچسپی میں بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے۔ اگر استاد میں ایسی خوبیاں یا مہارتیں پائی جاتی ہیں جن سے بچوں کو لگاؤ ہو ۔ تو وہ بہت آسانی کے ساتھ بچوں کی راہ نمائی کر سکتا ہے۔ کیونکہ بقول جمیز "بہت سے استاد اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہ ان میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کو بچے پسند کرتے اور بڑی خوشی سے نقل کرتے ہیں"

۳۔ خودی کی جبلت۔ انسان نہ صرف سماجی فضا سے متاثر ہو کر اپنے عملی مشاغل میں سماج کے برتاؤ کی نقل کرتا ہے بلکہ وہ بجائے خود ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اور طرح طرح سے اپنی حیثیت کو دوسروں سے منوانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ اپنے خیالات کو دوسروں سے تسلیم کرائے۔ اپنی قوت کو دوسروں کے خلاف آزمائے۔ معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرے۔ لوگ اس کی باتوں کو سنیں اور ان کی قدر کریں۔ بچے میں بھی یہ احساس بہت قوی ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ کمزور ہوتا ہے۔ مگر اپنی ہستی تسلیم کرانے کی اسے بھی فکر رہتی ہے۔ اس میں غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ وہ اس لئے روٹھتا ہے کہ اس کی بات نہیں مانی جاتی۔ وہ درجہ میں اس لئے عجیب وغریب سوال کرتا ہے۔ کہ استاد اس کی طرف متوجہ ہو۔ وہ دوسروں کی باری پر بن پوچھے اس لئے بول پڑتا ہے کہ استاد اور ہم جماعت اس کی لیاقت کو تسلیم کریں۔ یہ سب باتیں خودی کے جذبہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ بچے میں اظہار نفس کے لئے کس قدر تڑپ پائی جاتی ہے۔ اور معلم کہاں تک اس سے اپنے تعلیمی پروگرام میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

خودی کا جذبہ انسان میں 'کام کرنے' اور 'آگے بڑھنے' کا بہت بڑا محرک ہے۔ یہ ہمیشہ آدمی کی 'کام کرنے کی صلاحیت' کو زندہ و بیدار رکھتا ہے۔ اس کے مرجانے سے انسان کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ معلم کو چاہیئے کہ بچے کی 'خودی' کی قدر کرے اور اس کی تربیت کے لئے ایسے تعلیمی مواقع ڈھونڈے۔ جن میں بچہ اپنی ذات اور شخصیت کی تکمیل کر سکے۔ اس لئے بچوں کی تعلیم میں حرفتی کام کو خاص طور پر جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ بچہ اپنے کام کا خود اندازہ کر سکے۔ اس

میں اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ اپنی قوت ارادی کی تربیت کر سکے۔ اور جسم و دماغ کی متوازن تربیت سے اپنی سیرت کو پختہ بنائے۔

ڈرانے دھمکانے کی بجائے اگر استاد طلبہ کے خودداری کے جذبہ کو قائم رکھے۔ ان میں اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی صفت پیدا کرے۔ تو بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد مل سکے گی۔ بچے کو خود بخود اپنی حیثیت قائم رکھنے کا خیال پیدا ہو گا۔ اور اس کو یہ چیز درجہ اور اپنے ساتھیوں میں چمکنے کے لئے زیادہ محنت کرنے کے لئے ابھارے گی۔ اس صفت کو پیدا کرانے کے لئے استاد اور والدین کو شروع شروع میں خاصی محنت کی ضرورت ہو گی۔ مگر جب بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھے گا۔ پھر اس کی بنی ہوئی شخصیت ہر موقع پر ان کے کام آئے گی۔ اور وہ زندگی کی مشکلات کو نہایت استقلال اور ہمت کے ساتھ سہار سکے گا۔ لیکن اگر اس کے برخلاف ہر موقع پر بچے کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری کی گئی۔ تو اس کا اثر اس کی مضبوط اور ترقی پذیر زندگی میں بڑی رکاوٹ پیدا کرے گا۔ بچوں کی مدد صرف ایسے موقعوں پر کی جائے جہاں واقعی ان کو ضرورت ہو۔

مروجہ تعلیم جو بچوں کی زندگی کی عام روسے الگ وجود رکھتی ہے۔ بچوں کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس کے ذریعے وہ اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے اس لئے مجبوراً استاد بچوں پر سختی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بچے کے اندر خودی کا مادہ دب جاتا ہے۔ بات بات پر اٹکتے ہیں۔ اپنے خیال اور ارادے کے اظہار سے گھبراتے ہیں۔ پٹتے پٹتے وہ آپ اپنی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ بعض بچے سخت سست سن کر ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے استاد یا والدین کے کہنے کا ان پر اثر باقی نہیں رہتا۔ بعض بچے بڑوں سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اور آئندہ جا کر تلخ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ سرکشی اور ضد کرنے لگتے ہیں۔ بات بات پر چڑتے ہیں۔ اور اگر حس باقی ہے۔ اور اس کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ تو اس پر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کی زندگی کو زنگ لگ جاتا ہے۔ پس مدرسہ زندگی کا سچا نمونہ ہونا چاہئے۔

جس میں بچے مختلف انفرادی اور سماجی مشاغل کی مدد سے اپنی شخصیت کو آزادانہ طور پر فروغ دے سکیں۔

۴۔ چیزوں کو برتنے کی جبلت:۔ بچے میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا کا قدرتی مادہ ہوتا ہے وہ بڑوں کی نقل میں طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ ہر ایک چیز کا کھوج لگانا اس کی گھٹی میں داخل ہے۔ وہ چیزوں کے دیکھنے بھالنے پر بس نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق برتنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ گھر، باغ، مدرسہ میں بڑوں کی آنکھ بچا کر وہ اس پاس کی چیزوں کو اٹھاتا اور بڑوں کی تقلید میں ان کو برتنے لگتا ہے۔ کہیں دیواروں پر تصویریں بناتا ہے۔ کہیں چاقو سے گھر کا سامان کاٹتا ہے۔ کہیں قینچی سے کتاب کے ورق کترتا ہے۔ غرض بچوں کو جو کچھ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ کام کرنے کی نوعیت بدلتی جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے بچے سے لے کر ایک ماہر انجنیر ایک قابل ڈاکٹر، ایک محقق سائنسداں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہر ایک آدمی اپنی قوت فعالی کو مختلف طریقوں سے برتتا ہے۔ اپنے اپنے نہج پر اپنے تخلیقی منشا کو پورا کرتا ہے۔

بچہ شروع شروع میں اپنی تخلیقی قوت کو کھیل کود اور دوڑ دھوپ کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقی قوت کو باقاعدہ طور پر دنیائے آب و گل میں تشکیل کر دیتا ہے۔ بچے میں مجرد تصورات قائم کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ ان کو جو کچھ دنیا کا علم ہوتا ہے۔ وہ اشیا کے ساتھ براہ راست تعلق سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی زندگی بالکل شخصی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قریب ترین ماحول کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ وہ اشیا کی خاصیت ان کے برتنے ہی سے پہچان سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سیکھنے کا دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ عملی مشاغل پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ بعد میں جب بچے کا تجربہ بڑھ جاتا ہے۔ تو وہ مجرد تصورات کو بھی قوانین کی شکل میں سمجھ سکتا ہے۔

۵۔ جستجو۔ سیکھنے کے لئے انسان کو قدرت نے یہ ایک عجیب و غریب صلاحیت

بخشی ہے ۔ وہ ہمیشہ نئی چیزوں کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے ۔ نئے نئے تجربے کرتا ہے ۔ نئے نئے علاقے دریافت کرتا ہے ۔ نئی چیزوں کی تلاش اور کھوج میں وہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتا۔ ہر ایک نئی حقیقت کے دریافت ہونے پر انسان کے دل کو تسکین ہوتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ زندگی کے حقائق اس کے لئے متاع گم گشتہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جس کی تلاش میں وہ ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہتا ہے ۔ بچہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ جذبہ قوی ہوتا ہے ۔ وہ ہر قدم پر کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا ہے ۔ اگرچہ شروع شروع میں چیزوں سے اس کی دلچسپی اور وابستگی وقتی سی ہوتی ہے ۔ مگر جیسے جیسے بچے کے قویٰ ترقی پانے لگتے ہیں ۔ ویسے ویسے اس کی یکسوئی بڑھتی جاتی ہے وہ اپنے ماحول کو زیادہ گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھنے لگتا ہے ۔ بچے کا یہ محرک استاد کو سکھانے کے لئے بچے کی طرف سے ایک قسم کی دعوت ہے ۔ ایسے موقعوں کو غنیمت جان کر وہ بچے کی بہترین خدمت کر سکتا ہے ۔ اور اپنے فرائض کو اچھی طرح سے پورا کر سکتا ہے اس لئے جو لوگ اس بات کی شکایت کرتے ہیں ۔ کہ بچے کچھ سیکھنا نہیں چاہتے ۔ بچے کی ایک ایسی صلاحیت سے انکار کرتے ہیں ۔ جو روز روشن کی طرح واضح ہے ۔ استاد کو اس بات کی ضرورت ہے ۔ کہ بچوں کی دھن کا پتہ لگائے اور اپنے تعلیمی پروگرام میں اس سے کام لے ۔

جس طرح انسان کے دیگر محرکات اور تجربے بدلتے ہیں ۔ اسی طرح یہ محرک بھی عمر کی مختلف منزلوں میں مختلف نوعیتوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۔ ابتدائی عمر میں بچے کی دلچسپی اس کے ماحول کی مختلف اشیا میں بٹی رہتی ہے ۔ وہ تتلی کی طرح ہر جاذب نظر چیز کی طرف لپکتا ہے ۔ تھوڑی دیر بعد اگر کوئی دوسری انوکھی چیز مل جاتی ہے ۔ تو اس سے چمٹ جاتا ہے ۔ غرض بچہ بہت ندرت پسند ہوتا ہے ۔ اس کے کئی اسباب ہوتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ بچے کے لئے اپنے ماحول کی کئی چیزیں نئی ہوتی ہیں ۔ دوسرے یہ کہ بچے کی دلچسپی سطحی ہوتی ہے ۔ وہ چیزوں کی گہرائی تک نہیں جا سکتا تیسری یہ کہ شروع میں بچے کی نظر میں چیزوں کا افادی پہلو نہیں ہوتا ۔ تاکہ کسی خارجی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک مشغلہ پر دیر تک سوچ سکیں ۔ چوتھی بات یہ ہے ۔ کہ بالکل بچپن کا زمانہ بچے کے

تیز نشو و نما کا وقت ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ مسلسل اچک پھاند سے اپنی طبعی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے بچے دیر تک کسی ایک کام میں دلچپی نہیں لے سکتے۔ اس لئے چھوٹے بچوں کی پڑھائی میں بہت تنوع کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان کے پڑھائی کے وقفے بھی بہت مختصر ہونے چاہیئیں۔ البتہ بڑی عمر کے بچوں کو اشیا کی تفصیل میں لے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اشیا اور مشاغل کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی قابلیت پیدا کر لیتے ہیں۔

شہوت کی جبلت | اگرچہ شہوت کا مسئلہ چھوٹے بچوں کے استاد کے لئے زیادہ قابل توجہ نہیں ہے۔ تاہم اسے سمجھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض بچوں میں غیر معمولی جنسی بیداری ماحول کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ عام حالات میں یہ محرک عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر اس کو صحیح راہ پر لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر شروع میں بھی اس کا خیال رکھنا ضروری ہے عام طور پر والدین چھوٹے بچوں کے بعض حساس حصوں کو مختلف مواقع پر جیسے سلانے کے لئے یا پاخانہ پیشاب کرنے یا نہلانے کے لئے چھوتے ہیں۔ اس سے بچے کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ بڑے ہو کر بھی اپنے طور پر پیدا کرنے کی بری عادت ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے اسی طرح بچوں کے سامنے وقت سے پہلے جنسی تحریکات کے متعلق باتیں کرنا برا ہے۔ البتہ جب بچے میں قدرتی طور پر جنسی بیداری پیدا ہو جائے۔ تو اس کا وقت موقع بموقع ان کو صاف طور پر سمجھانا ضروری ہے۔ یہ تو لازمی بات ہے۔ کہ بچے ایسے موقعوں پر نئی زندگی کے آغاز میں خاص قسم کے تجربات سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے متعلق مزید معلومات بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جن ذرائع سے بچوں کو معلومات مل جاتی ہے۔ ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ذرائع بہت اشتعال انگیز ہوں۔ اور بجائے نوجوان کی مدد کرنے اور صحیح راستے پر ڈالنے کے اس کو گمراہی کی جانب لے جائیں۔ اس لئے اگر اس کی خیر خواہی اور ہمدردی کے طور پر ان کو اس کے متعلق صاف طور پر جدید اصول حفظان صحت کی روشنی میں معلومات دی جائیں۔ تو اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس ضرورت سے چشم پوشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی

ضرورت ہے۔ ایک مشہور سائنسداں کا قول ہے۔ کہ دنیا میں ۹۹ فی صدی لوگ ایسے ہوتے ہیں
جو جنسی بیداری کے زمانے میں غیر فطری طور پر جنسی ہیجانات پیدا کرنے میں مبتلا ہیں اور باقی ایک
صدی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس طنز یہ مقولے میں کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہو۔ لیکن سچائی بھی اس
میں کسی حد تک پائی جاتی ہے۔

موجودہ تمدنی زندگی اور خود نسلی بہتری کا خیال اس بات کے لئے مجبور کر رہا ہے کہ عمر کا ایک
خاص حصہ تعلیمی کاموں اور فنی مہارتوں میں صرف کیا جائے۔ اور ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد
ہی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھے پر اٹھایا جائے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت
ہے۔ کہ بچوں کو ایسے تخلیقی کاموں سے آشنا کیا جائے۔ جس کے ذریعے وہ اپنے فرصت کے اوقات
کا خوشی اور انہماک کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ اس کا اثر ایک طرف تو ان کی عام زندگی پر بہت اچھا ہوگا
کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عموماً وہ نوجوان جنسی بے اعتدالیوں کے شکار ہو جاتے ہیں جن کو ایسے
مشاغل کا چسکا نہیں ہوتا۔ جس میں وہ اپنی زندگی کی جسمانی اور جذباتی ضروریات کو تسکین دیں۔ اور
دوسری طرف وہ ان تخلیقی مشاغل کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ ان نوجوانوں
کو مختلف جسمانی کھیلوں اور مقابلوں کی عادت ڈالی جائے۔ تو وہ اس کے ساتھ ساتھ بہت کچھ
اعتدال کے راستے پر چل سکیں گے۔ غرض یہ محرک بھی زندگی میں اپنے اثرات کے اعتبار سے بہت
اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کا صحیح اظہار سماجی زندگی کی خوش حالی کے لئے کافی وزن رکھتا ہے
کیونکہ نسل انسانی کا تسلسل اور خاندان جو سماجی زندگی کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہے۔ اسی جبلت
کا نتیجہ ہے۔ اس کی صحیح تربیت سے ہماری سماجی زندگی میں بہت استواری آ سکتی ہے۔ ان
محرکات کے علاوہ انسان کی زندگی میں اور بھی کئی بنیادی محرکات یا جبلتیں پائی جاتی ہیں جیسے غصہ
یا پرورشس کا جذبہ جن کو یہاں پر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔

محض قدرتی جبلتیں قوت عمل کا ماٰخذ نہیں ہیں:۔

جبلتوں کے مفہوم کے سلسلہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ کہ یہ جبلتیں کسی طرح بھی انسان

کی زندگی پر حاوی نہیں سمجھی جا سکتیں۔ اوّلاً تو یہ کہ ایک ہی جبلت کی کیفیت کبھی دو مرتبہ یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے جوابی عمل میں فرق ہونا ضروری ہے۔ اسی لحاظ سے زندگی میں جتنے مواقع آتے ہیں۔ ان کا جوابی عمل مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ تجربے کی وجہ سے جبلتوں کی کیفیت میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ جبلتوں کی جو اس طرح تقسیم کی جاتی ہے۔ اس سے زندگی کے موٹے موٹے نفسی رجحانات کا پتہ لگانا مقصود ہوتا ہے۔ تیسری بات جو ان دونوں کے مابین پائی جاتی ہے اور جو عملی اعتبار سے زیادہ صاف اور مفید ہے۔ یہ ہے۔ کہ انسان محض چند نفسی محرکات کی وجہ سے کام نہیں کرتا۔ بلکہ جب آدمی کسی نہ کسی ضرورت سے کسی مشغلہ میں لگ جائے۔ تو پھر اس مشغلہ کی انجام دہی میں بذات خود اس قدر دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ بغیر ختم کئے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ وڈس ورتھ کہتا ہے کہ "یہ چند موٹے موٹے نفسی رجحانات کسی پیچدار گھڑی کے بڑے بڑے پرزوں کی مانند نہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی پرزہ گھڑی کو ہر وقت چلاتا رہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ محرکات سب خوابیدہ ہوں اور پھر بھی آدمی کام کرتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت کام کرنے والے کو نہ بھوک ہو نہ پیاس۔ نہ وہ ڈرتا ہو اور نہ اس وقت جنسی میلان محرک ہو۔ لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو۔ اگر کسی آدمی کا مشغلہ اچھی طرح سے چالو ہو گیا تو پھر اس کا ختم کرنا ہی اس کو کام پر مجبور کرے گا۔"

جبلت عادات بننے میں کیا مدد دیتی ہے | دنیا میں آدمی جو کچھ کرتا ہے۔ بیشتر عادات کی رو میں کرتا ہے۔ عادات کو یہاں ہم اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں سوچنے، کام کرنے اور جذباتی پہلو کو بھی شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح آدمی ٹائپ کرنے کے لئے خاص قسم کی میکانکی عادات اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح دقیق سے دقیق مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی کاوش بھی عادات کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھے اشعار، اچھے گانے اور عمدہ مصوری کی قدر کرنے کے لئے آدمی کو خاص قسم کی جذباتی مشق و مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر یہ ذوق بھی میکانکی سا ہو جاتا ہے۔ جب یہ حاصل کردہ عادات رسم و رواج کی صورت میں آدمی پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ تو پھر آدمی جو کچھ سوچتا، سمجھتا، محسوس کرتا اور عمل میں لاتا ہے۔ ان سب پر وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر ضرور خوبی رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے افراد اور سماج کی سیرت میں پختگی، ہم آہنگی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے حالات کبھی ایک نہج پر نہیں رہتے۔ اور قومی عادات اور رسم و رواج نئی ضروریات کا ہمیشہ ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے لازمی طور پر بڑے بڑے ہنگامے اور سماجی انقلابات رونما ہو جاتے ہیں۔

یہی حال انفرادی تطابق کا بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا سے جب عادتیں نئی نئی بنتی ہیں تو وہ بھی جبلت پر اپنا سنگ بنیاد رکھتی ہیں۔ مگر عادات پھر اس قدر قوت پکڑ لیتی ہیں۔ کہ وہ کسی نئی تبدیلی کی تاب نہیں لاسکتیں۔ یہاں پھر انسان کی جبلت بیدار ہو جاتی ہے اور نئی تبدیلی کو محسوس کر کے تطابق کا راستہ ڈھونڈتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس کی پشت پر گزشتہ تجربہ برابر کام آتا ہے۔ اور گزشتہ عادات اور تجربے ہی کی روشنی میں آدمی نئی اور سنگلاخ زمینوں کو ہموار کرتا ہے۔ اس لئے آدمی کی زندگی کا رشتہ کبھی یک دم نہیں ٹوٹ سکتا۔ بلکہ جس طرح گذشتہ تجربے کی روشنی میں آدمی نئے حقایق دریافت کرتا ہے اسی طرح نئی تحقیق کی روشنی میں گزشتہ علم و تجربے میں جان آجاتی ہے۔ غرض جبلت انسان کی زندگی میں نئے حالات کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کے لئے لوچ پیدا کرتی ہے۔ یہ اس کشمکش سے آدمی کو بچاتی ہے۔ جو پرانی عادتوں اور نئے ماحول میں عدم تطابق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قومی زبان

(از مولوی بدر الحسن صاحب بی اے (جامی))

قوم کی تعمیر اور تخلیق میں زبان کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔ انسانوں کی جماعت کے درمیان جذبات کی ہم آہنگی، رجحانات کی یک رنگی اور اپنے برے بھلے کے یکساں احساس کے زیر اثر جو چیز رشتہ' ارتباط قائم کرتی ہے، وہ زبان ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھیے، جیسے ایک مشین تمام کل پرزوں سے درست بغیر ایک محرک کے نہیں چل سکتی جو اس کے اجزائے ترکیبی کو باہم ملاکر اس میں حرکت پیدا کر دے، ٹھیک اسی طرح ایک قوم اپنے تمام لوازم کے ساتھ زبان کے بغیر اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔ پھر زبان اس کی مدنی زندگی کے ارتقا کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کی نفسی تحقیقات اس کے ذہنی رجحانات اور مدنی تنظیمات کا مطالعہ مقصود ہو تو اس کی زبان کا مطالعہ کیجیے۔ اس لئے کہ تاریخ محض ظاہری واقعات سے بحث کرتی ہے اس کا ان محرکات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ان محرکات کو سمجھنے کے لئے ہمیں زبان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مذہب کے بعد اگر کوئی اور شے باہمی رشتہ' اخوت و اتحاد استوار کرنے میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ زبان ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کو........ جو محض جغرافیائی حدود کے لحاظ سے مختلف نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں........ ایک مرکز پر اگر جمع کر سکتی ہے تو وہ زبان ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جو مذہب اور وقتی لڑائیوں کی پرواہ نہیں کرتا اس لئے کہ جن دلوں کے درمیان محبت والفت کی نامہ بری زبان کے ذریعہ ہو۔ وہ ایک مرتبہ جڑ کر الگ نہیں ہو سکتے۔ اس محبت کا نظارہ پنجاب اور گجرات سے باہر کیجیے۔ برما اور کلکتہ میں پنجاب کے سکھ اور مسلمان گجرات کے

مسلمان اور ہندو محض لسانی یکجہتی کی وجہ سے جس خلوص سے ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ مسجد شہید گنج اور منڈل کی قسم کے جھگڑے انسان کی قلبی گہرائیوں پر اتنا اثر نہیں ڈالتے جتنا زبان کے ذریعہ سے ملے جلے ہوئے رشتے۔ غرض متحدہ قومیت کی تعمیر میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برّاعظم ہے جہاں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے زیر اثر مختلف زبانیں بولنے والے بستے ہیں۔ یہاں تو ایک مشترک زبان کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ پھر اور کس چیز کے ذریعے ایک صوبہ دوسرے صوبہ سے تعلقات قائم کرسکتا ہے۔ اور وہ اتحاد و یکجہتی جو متحدہ قومیت کی روح ہے کس طرح پیدا ہوسکتی ہے تجارت کاروبار عدالتوں کے کام، جلسوں اور کانفرنسوں میں لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کس طور پر ہوسکتی ہے اور تو اور ہمارے قومی تمدن کی تشکیل کیونکر ہوسکتی ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دیگر پیچیدہ مسائل ہیں جن کے حل کے طور پر ایک مشترک زبان کے لئے ہندوستان کا ہر مفکر بے چین و مضطرب نظر آتا ہے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیئے۔ کہ ہر قدم پر روڑے اٹکا رہا ہے اگر کوئی خلوص کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا بھی ہے تو قوم و ملک کے بدخواہ اپنے تعصب کے زہریلے اثر سے رہے سہے قومی اتحاد کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

اردو کی ابتدا | یوں تو ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے۔ جہاں چپہ چپہ کی زبانیں مختلف ہیں۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں تقریباً دوسو۲۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس خیال میں مبالغہ کو دخل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ کی زبان مختلف ضرور ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض زبانیں ایسی ہیں جو کم وبیش ملک کے بڑے حصہ میں بولی یا کم سے کم سمجھی ضرور جاتی ہیں۔ ان میں دو زبانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک اردو دوسری ہندی۔ سب سے پہلے ہمیں اردو پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے کہ یہ زبان کیسے بنی۔ اور کن لوگوں نے اس کے بنانے میں حصہ لیا۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے وقت سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا

ہے جس میں زبان، تمدن اور معاشرت سب کی قلب ماہیت ہو گئی۔ اول اول یہاں کے باشندے مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، زبان اور خود ان کے وجود سے متنفر رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تنفر دور ہو گیا۔ اور آپس میں اتحاد و اخوت یکجہتی اور رواداری کے رشتے استوار ہوتے گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کیا مسلمانوں نے انھیں حکومت کے معاملات میں اپنا شریک بنایا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات قائم کئے۔ بعضوں نے تو ایک متحدہ قومیت کے جنون میں ایک ایسے مذہبی نظام کی تبلیغ و اشاعت کرنی چاہی جو ہندوستان کے ہر طبقہ و ملت کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہو۔ لیکن اس جدت کا اثر سب سے پہلے زبان پر ہوا۔ کیونکہ اس کے بغیر دوسرے کے قلبی تاثرات کی ترجمانی ناممکن تھی۔ آپس میں دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے واقف ہوتے۔ اس ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونوں نے اپنی اپنی زبان میں ایک دوسرے کو اپنے خیالات سمجھانے کی کوشش کی۔ اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے الفاظ سمجھنے لگے۔ اس طرح الفاظ کے خلط ملط ہونے سے ایک نئی زبان عالم وجود میں آئی، جسے ہم اردو یا ہندوستانی کہتے ہیں۔ جہاں جہاں مسلمان پہنچے یہ زبان بھی پہنچی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کرلی۔ یہی وہ زبان ہے جو مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے طبقوں کی مشترکہ کوششوں اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم میں حاکم و محکوم دونوں برابر کے شریک تھے۔ ہندوستانیوں نے اس کو ہمیشہ اپنی زبان سمجھا اور اس پودے کو اپنا سمجھ کر پروان چڑھایا اس کی خدمت کی۔ اور واقعہ تو یہ ہے۔ کہ اس زبان پر دوسری قوموں کے احسانات مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ جب اردو زبان ایک متحدہ قومیت کی پیداوار اور ایک متحدہ تمدن کی آئینہ دار ہے، ہندوستان کے تمام فرقوں کے اتحاد کا مرقع ہے، ان کی انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے، تو پھر اس کے خلاف اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہے۔ آئیے اس کے اسباب پر بھی غور کریں۔

ہندی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز عہدہ داروں کو ہندوستانی زبان سکھائی جائے چنانچہ اس سلسلہ میں کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ جن سے ہندوستانی زبان میں اچھا خاصہ اضافہ بھی ہوا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ کالج ہندوستانی کے عروج کے حق میں سم قاتل بھی ثابت ہوا۔ زبان کے معاملہ میں جو کشاکش آج ہندوستان میں جاری ہے۔ اس کا بیج سب سے پہلے اسی کالج میں بویا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے ہندو منشیوں کو یہ مشورہ دینا شروع کیا۔ کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کی رسم الخط میں لکھیں۔ کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوستان کے لئے بدیسی ہے۔ اور جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول کے باوجود جداگانہ معاشرت رکھتے ہیں، ان کا رسم الخط بھی جدا ہونا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیلنے لگی اور فورٹ ولیم کالج کے نکلے ہوئے نوجوانوں نے اس خیال کو بھی اپنی سیاسی اور سماجی تحریک کے پہلو بہ پہلو رواج دیا۔ انھوں نے ہندو قوم کو بتایا کہ "ہم ہندو ہیں ہمیں بدیسی چیزوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔ فارسی رسم الخط بدیسی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا فرض ہے کہ ہندی رسم الخط اختیار کریں" دوسری طرف ہندوؤں کی سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی ترقی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اس کا جو انجام ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستانی کے مخالف مسلمانوں کے آٹھ سو سال کے اثرات کو حرف غلط کی طرح مٹا کر آریائی تمدن کا پرچار کرنا چاہتے ہیں اس زبان کو جو دونوں کے اتحاد ارتباط کی جاگتی تصویر تھی، مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال تھی، جس کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جاسکتی تھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس قابل احترام بنیاد کو سرے ہی سے ڈھا دینا چاہتے ہیں، جو ہمارے اسلاف کے مبارک ہاتھوں ڈالی گئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے۔ کہ اردو ہندی کے اس آئے دن کی کشاکش کی ذمہ داری صرف انگریزوں اور ہندوؤں پر ہی نہیں بلکہ خود ہمارے اوپر بھی ہے مسلمانوں کی ایک جماعت نے سرسید مرحوم کی قیادت میں مسلمانوں کو قومی تحریکات سے الگ

رکھنے کی کوشش کی۔ اور اس قسم کی تحریکوں کا ہر طرح بائیکاٹ کیا۔ متعصب قسم کے ہندو مسلمانوں کے اس طرز عمل سے چراغ پا ہوئے۔ اور انھوں نے ہماری رہی سہی میراث کو بھی مٹا ڈالنے کی کوشش شروع کی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا۔ کہ خود مسلمانوں نے اس مشترک زبان میں عربی فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرور جماعت کے ایک خاص طبقہ نے بھی فرقہ پرست جماعت کا ساتھ دیا۔ اور ہندی کی ترقی کے لئے ہر طرح تیار ہو گئے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے قومی تحریکوں کا بائیکاٹ کیا، مشکل الفاظ استعمال کرنے لگے، تو کیا اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ متحدہ قومیت کی اس آخری یادگار کو ختم کر دیا جائے۔ اور پھر ایسی صورت میں کہ مسلمانوں نے اپنی ان غلطیوں کا اعتراف بھی کر لیا ہے اور ان کا ایک بہت بڑا طبقہ اس تدارک پر آمادہ بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکا ہے کہ ہماری قسمت یہیں کے باشندوں کے ساتھ وابستہ ہے یہیں اسے جینا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ وہ یہ دل سے چاہتا ہے۔ کہ ہماری ایک قومی زبان ہو، جس کی اساس میں دونوں تمدنوں کا برابر کا حصہ ہو۔ لیکن وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے سروں پر ایک آریائی تمدن مسلط کر دیا جائے۔

ہمیں اس طرز عمل سے قطعاً شکایت نہ ہوتی۔ اگر یہ آوازیں ہندو مہا سبھا کے پلیٹ فارم سے آتیں۔ جو ہندوستان میں متحدہ قوم کی بجائے ایک آریائی تمدن کا غلبہ چاہتی ہے۔ لیکن رونا تو اس کا ہے۔ کہ یہ صدائیں اس جماعت کی طرف سے اٹھ رہی ہیں۔ جو متحدہ قومیت کی علمبردار ہے کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندہ ہے۔ ہندوستان کا وہ محبوب رہنما جس نے کبھی اسی قومیت کی خاطر اپنی جان تک کو قربان کر ڈالنا چاہا تھا اور جو بغیر مسلم قوم کے "جنت میں بھی جانے پر تیار نہ تھا" آج اس جماعت کی حمایت پر آمادہ ہے جو اردو کی دشمن ہے۔ اور ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتی ہے۔

اس شکایت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ہندی کی ترقی سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ ہندی کو عروج ہو رہا ہے، خدا کرے اور ہو۔ آریائی تمدن کا احیا ہو رہا ہے تو وہ اور پروان چڑھے

سیاسی، سماجی، معاشی میدان میں کوئی آگے نکلتا ہے تو شوق سے نکلے۔ ہمیں اس سے قطعًا دکھ نہ ہوگا۔ ہم کسی کی ترقی کے راستے میں روڑا اٹکانے کی بجائے کامیابی کے خواہش مند ہیں لیکن ہم اپنے تمدن کو بھی مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ آخر اس میں کیا قباحت اور معصیت ہے۔ کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول پر عمل کیا جائے۔

اس مسئلہ کا حل ہم سب ہندوستانیوں کو سوچنا ہے۔ اس لئے کہ ہم سب کو اسی ملک میں رہنا ہے۔ ملکی سیاسیات کا تقاضا ہے کہ ہم سب لوگ خواہ کسی طبقہ یا ملّت کے افراد ہوں۔ آپس میں میل ملاپ سے رہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نظرانداز کرکے قوم و ملک کا بھلا نہیں کرسکتا۔ اس وقت کوئی ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں چاہتا۔ تو ہمیں خود آگے بڑھ کر اس کا حل تلاش کرنا ہے۔ اور ایک ہندی مسلم تمدن کی بنیاد رکھنی ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر جرأت بیباکی اور عالی ہمتی سے کام لیا تو وہ زمانہ دور نہیں کہ جو لوگ ہم کو اپنی منزل پرے جانا چاہتے ہیں، خود ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔

ہر زبان کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک عام بول چال کا دوسرا علمی۔ عام بول چال کا معیار جمہور کی طرف سے قائم ہوتا ہے اور اس میں اکثر انھیں کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے زبان کا فطری پہلو بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ جمہور زبان کو بنانے میں ارادے سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ ماحول کے اثر سے خود بخود ایک زبان پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ان کو اکثر اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہاں البتہ اس زبان کی وسعت اور تنگی سے پتہ چلتا ہے کہ جس طبقہ کی وہ زبان ہے وہ زندگی کی کس منزل میں ہے۔ اس لئے کہ زبان ضروریات کے احساس سے بنتی ہے۔ اور ضروریات کی وسعت عبارت ہے انسان کے سماجی ارتقا سے ہندوستان تعلیمی حیثیت سے بہت پیچھے ہے، مگر پھر بھی زبان تو رکھتا ہے، جو عالموں اور ادیبوں کی زبانوں سے بالکل مختلف ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسی زبان کے سہارے ہم ایک مشترکہ زبان پیدا کرسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس زبان سے ہم فرقہ وارانہ مسائل سے بالکل الگ ہوکر تعلق پیدا کریں۔ حسن اتفاق سے اس

زبان تک پہنچنے کے وسائل موجودہ سیاسی مسائل نے پیدا کر دیے ہیں۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ ہم ان سیاسی مسائل سے الگ نہ رہیں۔ یہ زبان عوام الناس کی وہ زبان ہے۔ جو صدیوں سے ان میں رائج ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت سی خامیاں بھی ہیں لیکن وہ محض عارضی ہیں۔ اور اب تک اس لئے باقی ہیں۔ کہ ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی۔ آج کل قومی تحریک خواص کے طبقہ سے نکل کر عوام میں مصروف کار ہے۔ زبان کے معاملہ میں ہمیں کسی پروپیگنڈے یا اہتمام کی ضرورت نہ ہوگی یہ تحریک عوام الناس کے میل ملاپ سے خود بخود ایک صاف ستھری زبان پیدا کر دے گی۔ جس پر نہ سنسکرت کا غلبہ ہوگا۔ نہ عربی فارسی کا تسلط۔ عوام کی وہی سیدھی سادھی زبان ہوگی۔ جس کو سیاسی رہنماؤں کا مہذب مذاق اس میں شیرینی پیدا کرکے دلکش بنا دے گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول کتنا صحیح ہے۔ کہ آج کل ہندوستان میں جتنے اختلافات نظر آرہے ہیں۔ سب ایک خاص طبقہ کی دماغی عیاشیوں کے نتائج ہیں۔ جو ضروریات زندگی کی طرف سے مطمئن ہیں۔ ہندوستان کی صحیح حالت کا پتہ اس خاص طبقہ کو دیکھ کر نہیں چل سکتا۔ بلکہ اس کی اصلی حالت کا آئینہ عوام ہیں۔ جو محض روٹی اور کپڑا چاہتے ہیں۔ بالکل یہی حل زبان کے مسئلہ کا ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا محض خواص تک محدود ہے عوام میں جائیے تو ایک سیدھی سادھی زبان ملے گی، جسے ہندو مسلمان سبھی بغیر کسی اختلاف کے یکساں طور پر بولتے ہیں جس طرح سیاسی آزادی کا حل عوام سے میل کرنے میں ہے، اسی طرح زبان کا مسئلہ بھی طے ہو سکتا ہے۔

ایک تجویز ہماری خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت موجود ہے۔ جو متحدہ قومیت کی دعوے دار ہے۔ اور جس کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جسے پریم کا دیوتا کہیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ وہ بہادر ہے جری ہے، اور تعصب کی آلودگیوں سے پاک ہے۔ ہم اس جماعت کے پہلو بہ پہلو چل کر سیاسی پیچیدگیوں ہی کا نہیں بلکہ سماجی ناخوشگواریوں کا حل بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس جماعت نے اپنا پروگرام عوام میں رکھا ہے۔ اس لئے جو لوگ

وہاں کام کریں گے۔ انھیں مجبوراً انھیں کی زبان بولنی پڑے گی اور یہ چونکہ مصلح اور معلم کی حیثیت
سے جائیں گے، اس لئے قدرتاً عوام کی معاشرت پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ ان کا مذاق شستہ
ہوگا۔ اس لئے زبان کا وہ بھونڈا پن دور ہو جائے گا جو عوام کے مذاق کی وجہ سے پیدا
ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک دلکش اور میٹھی زبان خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے
لئے یہ موقع نادر ہے۔ خوش قسمتی سے خود کانگریس نے اتحاد کی دعوت دی ہے۔ اگر اس
دعوت کو ٹھکرا دیا گیا۔ تو بس ہماری باتیں ہی باتیں رہ جائیں گی۔ اور لوگ بقول حضرت
اکبر" کام کر جائیں گے اس وقت ہماری شکایتیں بھی بے وقت کی راگنی
سے زیادہ اہمیت نہ رکھیں گی۔ صدر کانگریس کا وہ بیان جس میں انھوں نے ماتحت کمیٹیوں کو مسلمانوں
میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے اردو زبان اختیار کرنے کا حکم دیا ہے بہت نیک اور ہمت افزا
ہے۔ اگر ہم نے اس مشورہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو ہم سیاسی حیثیت سے تو غلام ہیں ہی۔ ہماری
معاشرت اور زبان کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ اس دعوت اتحاد کو نظرانداز کرنے کے یہ معنی
ہوں گے۔ کہ دو الگ الگ ماحول پیدا ہو جائیں گے۔ اور زبان اپنے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر
دو جدا جدا روپ اختیار کرے گی۔ ایسی صورت میں زبان بھی وہی مشترک تسلیم کرلی جائے گی۔
جس کی پشت پر سیاسی وسماجی طاقت ہوگی۔ اور اس بحرانی کیفیت میں ایک کو دوسرے کے
مقابلے میں فنا ہونا پڑے گا.......... پھر ظاہر ہے فنا ہونے والی کونسی زبان ہوگی۔

عام بول چال کا مسئلہ تو اس طرح حل ہو جاتا ہے۔ اب باقی رہتا ہے زبان کے علمی
پہلو کا مسئلہ۔ سو بجائے خود کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جب عام بول چال کی زبان پیدا
ہو جائے گی۔ اس وقت علما کا طبقہ اسی زبان میں سے علمی نظریوں کے لئے اصطلاحیں وضع کریگا۔
کچھ اصطلاحیں نئے علوم کے ماخذوں سے لے کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔ اور کچھ خود
ایجاد کرے گا۔ اور اسے رواج دے کر مفید مطلب بنائے گا۔ لیکن اصطلاحات کے بنانے میں
اس کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا۔ کہ اصطلاحات کے سبب زبان پر برا اثر نہ پڑنے پائے جیسا کہ

آج کل ہندی اور اردو دونوں میں ہو رہا ہے۔ ہندی کے حامی جب اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انھیں سنسکرت سے اور اردو زبان کے حامیوں کو زبان عربی سے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علوم زیادہ تر عربی اور سنسکرت ہی میں ہیں۔ لیکن جب انقلاب پیش نظر ہے تو قدامت کی طرف دستِ سوال بڑھانے کے کیا معنی۔ عربی اور سنسکرت کے علماء نے اصطلاحیں بناتے وقت کس چیز کا سہارا پکڑا ہوگا۔ پھر ہمیں کسی دوسرے کا سہارا لینے کی کیا ضرورت خود اپنی زبان سے اصطلاحیں کیوں نہ بنائی جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح جو اصطلاحیں بنیں گی وہ غیر مانوس ہوں گی۔ مگر کثرت استعمال سے جب ہمارے کان ان سے آشنا ہو جائیں گے تو وہی فصیح سمجھی جائیں گی۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے انشا پردازوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ مسلمان انشا پرداز اپنی تحریریں صرف مسلمانوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور ہندو اپنی قوم کو۔ اس لئے یہ لوگ ایسی تحریریں نہیں لکھتے جو دونوں قوموں کے لئے مفید ہوں۔ لیکن یہ اختلاف سیاسی اتحاد اور اس زبان کے پیدا ہو جانے سے جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے خود دور ہو جائیگا۔ ہم سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے لگیں گے، تو یہ انشا پرداز خود بخود مجبور ہوں گے۔ کہ وہ ایسی زبان لکھیں جسے ہر شخص سمجھ لے۔ اس کے لئے ہمیں کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہمارے انشا پرداز خود عوام کے رجحانات کا لحاظ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور اس طرح عوام اور انشا پردازوں کے اشتراک عمل سے ایک ایسی زبان تیار کر سکیں گے، جو سب کی زبان ہوگی۔ اس میں نہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ہوں گے اور نہ عربی فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اس میں عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ ہوں گے۔ وہ ہندوؤں کی میراث ہوگی نہ مسلمانوں کی۔ بلکہ وہ دونوں کی مشترکہ زبان ہوگی۔ وہ اردو کہلائے گی نہ ہندی۔ بلکہ اس کا نام ہندوستانی ہوگا۔ وہ ہماری تمدنی سیاسی، اور معاشی اتحاد کا نتیجہ ہوگی۔ یہ وہ زبان ہوگی جو ہمارے دلوں میں پریم کی گنگا بہائے گی۔ جس کا پوتر جل جائے دلوں کے میل کو دھو کر شیشہ کی طرح چمکا دے گا۔ ہم آج ایک دوسرے

سے ناامید ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں یہ زبان ہمارے اندر آشا کی لہر پیدا کر دے گی
ہم پھر ایک مرتبہ پریم کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ساتھ ساتھ زندگی کی تلاش میں نکل کھڑے
ہوں گے۔ اور ہمارے دل چونکہ آپس میں جڑے ہوں گے بھارت ماتا ماتا کے جوش میں
ہمیں اپنے سینہ سے لگائے گی۔ اور مسکراتے ہوئے کامیابی کا آشیرباد دے گی۔

(نوٹ، یہ مضمون مصنف نے ۱۹۲۷ء میں اس وقت لکھا تھا جب پنڈت جواہر لال
نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ اس مضمون میں صدر کانگریس کا لفظ پنڈت نہرو کے لئے
استعمال کیا گیا ہے۔)

انگلستان میں صنعتی انقلاب

۱۷۶۰ء سے دنیا کے ہر ملک میں تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ ملکوں میں تبدیلی نہایت تیزی کے ساتھ ہوئی ہے کچھ میں آہستہ آہستہ۔ لیکن کسی نہ کسی طریقہ پر ہر ملک میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی آدھی آبادی آج ایک نئے تمدن کو اختیار کر چکی ہے۔

نئے تمدن کو ترقی دینے میں چار ملکوں یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی اور امریکہ کا حصہ بہت اہم ہے اور ان چار ملکوں میں بھی برطانیہ کو رہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے اس بات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان جو کہ عہد وسطےٰ میں مینروں[1] کا ملک تھا موجودہ عہد میں کس طرح ایک طاقتور صنعتی سلطنت بن گیا۔

آج برطانیہ انجنوں اور مشینوں، ریلوں اور موٹر کاروں ٹیلیفونوں، ٹیلیگرافوں اور ریڈیو کا ملک ہے۔ آج برطانیہ کے قبضہ میں دنیا کے سب سے بڑے تجارتی اور جنگی جہاز ہیں۔ یہ دنیا کی تجارت کا مرکز ہے اور کرۂ زمین کی طاقتور سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

آج برطانیہ کے ہر پانچ آدمیوں میں چار آدمی شہروں میں رہتے ہیں اور یا تو فیکٹریوں، گوداموں، دفتروں، مدرسوں یا اسپتالوں میں کام کرتے ہیں یا ریلوں، موٹر لاریوں، کشتیوں یا سرنگوں وغیرہ میں۔ ہر دس آدمیوں میں سے صرف ایک شخص کھیتی کا کام کرتا ہے۔

آج برطانیہ کے آدمی اطمینان اور بے فکری کے ساتھ اپنے ملک میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے کاروبار یا تفریح کے سلسلہ میں کرۂ زمین کے دوسرے براعظموں کا سفر بھی کیا ہے اور جانتے ہیں کہ دوسرے تمدنوں کے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

---

[1] مینرز کا مفصل تذکرہ رسالہ جامعہ کی گذشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ مینر کا مفہوم مختصر الفاظ میں زمیندار کی ریاست ہے۔

موجودہ انگلستان اور عہد وسطیٰ کے انگلستان میں بڑا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں تقریباً ہر شخص دیہات میں رہتا تھا اور یا تو بڑا زمیندار ہوتا تھا یا خود کاشت کرنے والا چھوٹا زمیندار یا پھر زمیندار کی رعیت ہوتا تھا۔ اس زمانے میں قریب کے چھوٹے شہر کا سفر کرنا بھی ایک بڑا اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر کسان کو اپنے لئے اور اپنے زمیندار کے لئے خود ہی غذا پیدا کرنا ہوتی تھی خود ہی اپنی بھیڑ کی اون سے کپڑے تیار کرنا ہوتے تھے اور اپنے مکان کی تعمیر اور دیکھ بھال بھی خود ہی کرنا پڑتی تھی۔ شہر میں کچھ دستکار ہوتے تھے جو اجرت پر کام کرتے تھے لیکن ان کی تعداد بہت مختصر ہوتی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹے چھوٹے تھے، قصبے بھی چھوٹے تھے اور شہر صرف گنے چنے تھے۔

انگلستان میں اس حیرت انگیز تبدیلی کے پیدا ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ پھر یہ سب تبدیلیاں یکبارگی واقع نہیں ہوئیں بلکہ آہستہ آہستہ ہوئیں البتہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے تبدیلیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔

"کالی وبا" | اس تبدیلی کا ایک سبب پلیگ یا "کالی وبا" کو قرار دیا جا سکتا ہے ۱۳۴۸ء اور ۱۳۴۹ء میں یورپ میں پلیگ کی وبا پھیلی۔ شروع تو یہ ایشیا میں ہوئی تھی، لیکن بعد میں مغرب کی طرف پھیلتے پھیلتے یورپ تک پہنچ گئی۔ پھر مشرقی یورپ سے جنگل کی آگ کی طرح اس نے پھیلنا شروع کیا پہلے اٹلی کو، پھر جرمنی اور فرانس کو اور آخر میں انگلستان کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مغربی دنیا میں ایسی وبا پہلے کبھی نہیں پھیلی تھی۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد آدمی دو دن سے زیادہ نہ بچ سکتے تھے۔ کسی کو اس کا علاج معلوم نہیں تھا اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں لوگ مرتے رہے۔ اس زمانہ کے صحیح اعداد و شمار چونکہ موجود نہیں ہیں اس لئے بہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے آدمی فی الواقعی مرے لیکن جو تحریری شہادتیں موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے ایک ضلع کی نوے فی صدی اور دوسرے ضلع کی پچانوے فی صدی آبادی اس وبا کے نذر ہو گئی۔ ایک سال کے اندر اندر انگلستان کی آدھی آبادی فنا ہو گئی۔ ملیروں میں جو مزدور کام کرتے تھے ان کے پورے

خاندان نیست و نابود ہو گئے۔ زمینداروں کو اپنی زمینوں کو جتوانے کیلئے مزدوروں کو تلاش کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی اور بہت سے زمیندار ایسے تھے جن کی جائدادوں پر کوئی پٹہ دار کسان باقی نہیں رہا۔

"شاملات دہ" پر زمینداروں کا قبضہ | اس تبدیلی کا دوسرا سبب "شاملات دہ" سے متعلق ہے۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی زمانہ میں چراگاہوں ویران زمینوں اور جنگلوں میں زمیندار اور ان کی رعایا دونوں اپنے مویشی چرایا کرتے تھے چونکہ ہر شخص کو ان زمینوں کے استعمال کا حق ملا ہوا تھا اس لئے انھیں شاملات دہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان مشترکہ زمینوں کے سہارے پر ہی دودھ گھی کے واسطے رعیت کے لوگ اپنی ذاتی گائیں پال سکتے تھے اپنا کھانا پکانے اور گوشت کو جھلسانے کے لئے لکڑی اور پھوس بھی ویران زمینوں اور جنگلوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

لیکن اس وبا کے بعد ملک کی زراعت اور اس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب زمین کو جوتنے کے لئے کسانوں کی تعداد کم ہو گئی تو زمینداروں نے بھیڑیں پالنا شروع کر دیں اور اپنی زمین کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو چراگاہ کے طور پر اور کم سے کم حصہ کو فصلوں کے پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ بھیڑوں کے پالنے کے کام کو جس کے لئے برطانیہ ہمیشہ سے مشہور تھا۔ ترقی دی گئی۔ گوشت اور اون کو بیچنے سے زمینداروں کو زیادہ آمدنی حاصل ہونے لگی۔ بھیڑ پالنے کے لئے زیادہ مزدوروں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ایک ہی آدمی بہت بڑے گلے کی نگرانی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے ایک مصنف نے اس تبدیلی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے "جہاں پہلے بہت سے گھر اور ان کے رہنے والے تھے وہاں اب صرف ایک گڈریا اور اس کا کتا باقی رہ گیا ہے۔"

بہرحال بھیڑوں کو زیادہ تعداد میں پالنے کے لئے زمینداروں کو زیادہ زمین کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے مینیر کی "شاملات دہ" کے گرد باڑھ لگانا شروع کر دی۔ اور اس میں کسانوں کے مویشی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا اور ان کو لکڑی اور پھوس کاٹنے سے بھی منع کر دیا۔ باڑھ کو اس طرح کھڑا

کرنے اور کسانوں کو مداخلت سے روکنے کا اصطلاحی نام "زمین کی حد بندی" رکھا گیا ہے یہ کام ۱۲۰۰ء سے شروع ہوا اور چھ سو سال تک آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

اس حد بندی کی محرک صرف بھیڑوں کو پالنے کی خواہش ہی نہیں تھی بلکہ اور دوسرے اسباب بھی کام کر رہے تھے۔ شہروں اور قصبوں کی آبادی بڑھ رہی تھی۔ صرف زیادہ اون کی ہی ضرورت نہیں تھی بلکہ زیادہ غذا کی بھی ضرورت تھی۔ زمین میں جس قدر پیدا کرنے کی اہلیت تھی کسان اس کے صرف ایک حصہ کو پیدا کرتے تھے اس لئے ترقی پسند زمینداروں نے خیال کیا کہ اگر وہ شاملات دہ پر قبضہ کریں گے تو زیادہ نفع بخش طریقہ پر کھیتی کے کام کو چلا سکیں گے۔ وہ کم آدمیوں کو ملازم رکھنا چاہتے تھے لیکن آدمی ایسے چاہتے تھے جو زیادہ کام کریں اور جنھیں نئے طریقوں کو آزمانے کا شوق ہو۔ انھیں اپنے منصوبے میں بڑی کامیابی ہوئی کیونکہ آہستہ آہستہ ان کے کھیتی کے کام کو ترقی ہونے لگی اور پہلے زمانوں کے مقابلہ میں زمینداروں کی ریاستوں میں بہت زیادہ غذا پیدا کی جانے لگی۔

کسانوں پر زمین کی حد بندی کا اثر | لیکن جب شاملات دہ کو کسان اپنی جوت میں لانے سے محروم ہو گئے تو ان کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور پہلے سے بہت زیادہ غریب ہو گئے۔ آخر میں ان بیچاروں کے پاس صرف کھیت کے ایسے چھوٹے ٹکڑے رہ گئے جہاں یہ کچھ ترکاریاں بو سکتے تھے اور مرغی اور سوروں کو پال سکتے تھے۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ زمیندار کے یہاں اجرت پر مزدوری کر کے جیسے تیسے زندگی گذارنے لگے۔

جب زندگی میں تبدیلی کا سلسلہ بڑھتا رہا تو مزدور مجبور ہوئے کہ غذا کپڑا اور اوزار حاصل کرنے کے لئے دستکاری کو شروع کریں۔ اس طرح وہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور بنتے گئے اور اپنے روزگار کے لئے دوسروں پر انحصار کرنے لگے۔ انھیں ہفتہ وار اجرت ملنے لگی جس کے ذریعہ وہ دوکانداروں سے روٹی، آٹا، گھی اور کپڑے وغیرہ خریدنے لگے۔

غرضکہ تبدیلی کا یہ سلسلہ جب ۱۵۰۰ء اور ۱۶۰۰ء تک چلتا رہا تو مینر کی زندگی بدلنا شروع

ہو گئی لوگوں کی زیادہ تعداد نے اجرت پر کام کرنا شروع کر دیا ۔ یہ کام زمینداروں کے فارموں پر
بھی کیا جاتا تھا اور دستکاری کے کارخانوں میں بھی جن کی اہمیت بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ گاؤں کی وہ بوڑھی
عورتیں جو اپنے پڑوسیوں کے مقابلہ میں کبھی زیادہ خوش حال رہ چکی تھیں اپنے بچوں کو ان "اچھے دنوں"
کے قصے سنایا کرتی تھیں جب زمینداروں نے زمین کی حد بندی نہیں کی تھی اگرچہ اس بات کو وہ
بھلا دیتی تھیں کہ اس زمانہ میں بھی ان کے کچھ پڑوسی افلاس کی زندگی بسر کیا کرتے تھے وہ کہتی تھیں کہ
وہ زمانہ کیسا اچھا تھا جب صرف ایک موٹے سور یا گائے، کچھ بینی لوہے، ریشم کے ذرا سے ٹکڑے
یا گھر کے کتے ہوئے کپڑے کے مالک ہونے کی وجہ سے ایک آدمی اپنے آپ کو بادشاہوں کے
برابر سمجھ سکتا تھا۔ اس وقت کسی شخص کو کسی غیر دلچسپ کام پر لگے رہ کر مسلسل محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اس
زمانہ میں وقت تیزی سے گذر جاتا تھا۔ ہر روز نئی اور مختلف مصروفیت ہوتی تھی۔ کسی دن نرم مٹی کو بویا جاتا
تھا کسی دن نئے پیدا ہوئے بچھڑوں اور گھوڑے کے چھوٹے چھوٹے بچھیروں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی
کسی دن کھیت کی نرائی کی جاتی تھی۔ کبھی لمبی لمبی گھاس کے کاٹنے کا وقت ہوتا تھا، کبھی غلہ کو کاٹنے
اور سکھانے اور انگوروں اور سیبوں کے جمع کرنے کا۔ سردی کے موسم میں تھوڑی سی کتائی اور بنائی بھی کی
جاتی تھی بلکہ دھات اور لکڑی پر بھی کام کیا جاتا تھا۔ مکان کو آراستہ کرنے، باڑھوں کو ٹھیک رکھنے اور جھاڑیوں
کو کتر کر سلیقہ کے ساتھ ہموار کرنے کے لئے بھی اس زمانہ میں وقت زیادہ ملتا تھا۔

غرضکہ یہ باتیں تھیں جو بوڑھے آدمی ان نوجوانوں سے کہا کرتے تھے جو گاؤں کی زندگی کے بدل جانے
کے بعد اپنے جھونپڑوں کو چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں شہر کی طرف جانے لگے تھے۔ "کالی وبا" نے
پرانے رواجوں کو ختم کر دیا تھا۔ رعیت کی تعداد جتنی کم ہو گئی تھی اتنی ہی وہ اپنے آقاؤں کی پابندی
سے آزاد ہو گئی تھی۔ بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ ہر جاندار شخص گاؤں کو چھوڑ دیتا تھا اور گاؤں بالکل
ویران ہو جاتا تھا

شہروں کی ترقی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں شہروں کو ترقی ہونے لگی۔ جن گاؤں میں کسی خاص
دستکاری کو ترقی ہو گئی وہ پھیل کر بڑے صنعتی شہر بن گئے۔ لندن اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ ۱۳۵۰ء

میں انگلستان کی آبادی ۵۰ ہزار تھی لیکن سنہ ۱۷۰۰ء میں اس کی آبادی ۵ لاکھ ہوگئی مانچسٹر، لورپول، برمنگھم، لیڈس اور دوسرے شہروں کو بھی اس زمانے میں ترقی ہوئی

انگلستان کی آبادی کی ترقی	
سنہ ۱۵۰۹ء میں	۵۰ ہزار
سنہ ۱۵۳۲ء میں	۶۲ ہزار
سنہ ۱۵۹۳ء میں	ایک لاکھ ۲۵ ہزار
سنہ ۱۶۰۵ء میں	دو لاکھ ۲۴ ہزار
سنہ ۱۶۶۱ء میں	چار لاکھ ۶۰ ہزار
سنہ ۱۶۹۶ء میں	پانچ لاکھ

سنہ ۱۸۰۰ء سے پہلے پہلے انگلستان کی آبادی کے ایک بڑے حصہ نے شہروں میں رہنا شروع کر دیا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ خوش حال تاجر اور دستکار بن گئے تھے۔ باقی لوگ کم اجرتوں پر دوسروں کے یہاں مزدوری پر کام کرتے تھے یا سڑکوں پر کام کی تلاش میں بھوکے پیاسے پریشان حال مارے مارے پھرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بادبانی جہازوں پر جا کر معاہدہ کر لیتے تھے اور دنیا کے دور دراز علاقوں کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔

سنہ ۱۷۴۰ء میں جس انگلستان کو یورپ کا "کوردہ" سمجھا جاتا تھا اب وہ تجارت اور کامیاب دستکاریوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں جن لوگوں کا شمار دیہاتیوں میں کیا جاتا تھا سنہ ۱۸۷۱ء میں انھوں نے شہروں میں رہنا شروع کر دیا تھا اور زمیندار کی زمین کے ساتھ بندھے رہنے کی جگہ اجرت پر کام کرنے والے دستکار بن گئے تھے دنیا کے بارے میں ان کی واقفیت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں پارچہ بافی اور دوسری دستکاریوں کی انگلستان میں حالت

سنہ ۱۷۰۰ء میں انگلستان کے کسان اچھے دستکار بن گئے تھے۔ پارچہ بافی برطانیہ کی خاص گھریلو صنعت بن گئی تھی۔ کارخانے بہت کم تھے۔ کتائی اور بنائی کا زیادہ تر کام دیہات کے جھونپڑوں کے اندر ہی کیا جاتا تھا۔ جن سیاحوں نے اس زمانے میں انگلستان کا سفر کیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ انگلستان کے اکثر جھونپڑے شہد کی مکھیوں کی طرح مصروف نظر آتے تھے برطانیہ نے سنہ ۱۷۰۰ء سے ہی دنیا کے ساتھ کپڑے کی تجارت شروع کر دی تھی اور جو لوگ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کو اکٹھا کرتے تھے ان کے کاروبار کو خوب فروغ حاصل ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ صرف کپڑا ہی نہیں خریدتے تھے بلکہ کچا اون بھی خریدتے تھے جسے وہ

کاریگروں کو کپڑا بنانے کے لئے دے دیتے تھے۔ کاریگروں کے کسی گروہ کو اون کو کنگھی سے ہموار کرنے کا کام سپرد کیا جاتا تھا کسی کو کاتنے کا۔ پھر کتے ہوئے اون کو جمع کرکے وہ پارچہ بافوں کو بننے کے لئے دے دیتے تھے اور ان سب کاریگروں سے وہ اجرت پر کام کراتے تھے۔ اس طرح یہ تاجر آہستہ آہستہ "سرمایہ دار" بن گئے۔ ان کے پاس روپیہ جمع ہو گیا۔ یہ کچا مال خریدنے، کاتنے، بننے کے لئے مزدوروں سے کام لینے اور بنے ہوئے مال کو بیچنے لگے۔

اون کے کاتنے اور بننے کے علاوہ اور دوسری بھی بہت سے دستکاریاں تھیں۔ ریشم اور سوت کا کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں سن کا کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔

پارچہ بافی کے علاوہ شہروں میں اور پیشے بھی ترقی کر رہے تھے۔ مثلاً مٹی کے برتن بنانے کی صنعت۔ اسی طرح فرنیچر کی صنعت بھی ترقی کر رہی تھی۔ شیفیلڈ کی چھریاں اور دوسرے لوہے اور دھات کے سامان بھی ان کارخانوں میں بنائے جاتے تھے جہاں دھار رکھنے والے پہیے پانی کی قوت سے چلتے تھے۔ بعض شہروں میں چھپائی، جلد سازی اور دستی کاغذ کا بنانا بھی کامیاب پیشوں کی حیثیت سے اختیار کیے جاتے تھے۔

لیکن ہر چیز ہاتھ کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ چیزیں کم تعداد میں بنائی جاتی تھیں اور تعداد کی کثرت کے مقابلہ میں مال کے اچھے بنانے پر زیادہ دھیان دیا جاتا تھا۔

۱۷۰۰ء کے بعد سے صنعتی انقلاب پچھلی دو صدیوں میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں ان کے باوجود انگلستان کے لوگوں کا بیشتر کام ۱۷۰۰ء میں صرف کاشتکاری، دستکاری، جہاز رانی اور تجارت تک محدود تھا۔ آج کل کی مشینیں اس زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھیں اور انجنوں کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تمام کام ہاتھ سے کئے جاتے تھے۔ قوت متحرکہ یا تو انسانی اعصاب کی ہوتی تھی یا پن چکیوں اور ہوا چکیوں کی۔ چیزوں کو منتقل کرنے کے لئے لادنے والے گھوڑے، گاڑیاں یا نہروں میں چلنے والی کشتیاں رکھی جاتی تھیں سفر بہت کم کیا جاتا تھا۔ ریلیں، موٹر کاریں، دخانی جہاز اور ہوائی جہاز اس زمانے میں نہیں تھے پیغامات صرف پیغامبروں کے ہاتھ پہنچائے جا سکتے تھے اور ان کی تیزی گھوڑوں کے پاؤں کی تیزی تک

محدود ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں اگرچہ مینر اور بے گاری رعیت کا نظام ختم ہوگیا تھا لیکن پھر بھی ان کی حالت موجودہ زمانہ سے بہت مختلف تھی۔ اس کے بعد تبدیلیوں کا سلسلہ اس قدر تیزی سے یکے بعد دیگرے شروع ہوا کہ انگلستان سے دستکاریاں غائب ہوگئیں اور ان کی جگہ قوت متحرکہ سے چلنے والی مشینیں پیدا ہوگئیں اور انگلستان اپنی لوہے اور فولاد کی صنعتوں، عالمگیر تجارت، عالمگیر سلطنت کی وجہ سے دنیا کا ممتاز ترین ملک بن گیا۔ ۱۸۰۰ء کے ایک چھوٹے۔ کافی بالذات، ۶۰ لاکھ کسانوں اور دستکاروں کے ملک کی جگہ انگلستان ۴ کروڑ مشین چلانے والوں، مشین بنانے والوں، تاجروں اور محرروں کا ملک بن گیا جو چالیس کروڑ آدمیوں کی ایک عالمگیر سلطنت پر حکومت کرتے ہیں۔

ابتدائی پارچہ بافی کی مشینوں اور ابتدائی انجنوں کی ایجاد

صنعتی انقلاب پارچہ بافی کی مشینوں اور قابل استعمال انجنوں کی ایجاد کے ساتھ شروع ہوا۔ مختصر الفاظ میں ان ایجادوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرخہ اور ہاتھ کے کرگے کی جگہ کاتنے کی جینی یا فریم اور قوت متحرکہ سے چلنے والے کرگوں کا استعمال شروع کردیا گیا۔ اس سلسلہ میں جن خاص خاص منزلوں سے گذرنا پڑا انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے کتائی کے لئے ایجادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷۶۴ء میں ہارگریوز نے کاتنے کے لئے اپنی جینی کو ایجاد کیا اس سے تیس، اسی اور آخر میں سینکڑوں دھاگے ایک ہی مشین پر کاتے جانے لگے حالانکہ پرانے چرخہ پر صرف ایک ہی دھاگے کو کاتا جاسکتا تھا۔

اس کے بعد بنائی کے لئے ایجادیں ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۷۳۳ء میں خود بخود گردش کرنے والی نال کو ایجاد کیا گیا جس کے ذریعہ بننے والا ہاتھ سے نال کو کرگے کے اس پار اور اُس پار گذارنے کے لئے مجبور نہیں رہا بلکہ وہ زیادہ تیزی اور صحت کے ساتھ خود بخود آرپار آنے جانے لگی پھر مشینوں میں مسلسل اصلاحیں ہوئیں جن کی وجہ سے کپڑا بننے والا پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ کپڑا بننے لگا۔

تیسری چیز دخانی انجن کی اصلاح تھی۔ ۱۷۶۰ء تک مشینوں سے چیزوں کے بنانے کے کام میں کسی ایسی قوت متحرکہ کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے جو مشینوں کو چلا سکے رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ کاتنے اور

بننے کی مشینیں اس وقت تک ہاتھ اور پاؤں سے ہی چلائی جاتی تھیں۔ ۱۷۶۸ء میں آرک رائٹ نے کاتنے کی چینیوں کو چلانے کے لئے پانی کے بہاؤ کی قوت سے چلنے والے بھدّے پہیوں کو استعمال کرنا شروع کیا۔ ۱۷۸۵ء میں انھیں پہیوں سے اس نے کرگوں کو چلانا شروع کیا۔ پانی کے بہاؤ کی یہ قوت ہاتھ اور پاؤں کی قوت سے بہتر تھی۔ اس کے ذریعہ زیادہ سوت کاتا اور بنا جا سکتا تھا۔ اس طرح کچھ اصلاح تو ہو گئی۔

مگر اسی اثنا میں لوگ دخانی انجن کو مکمل کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن انجن کے ایجاد کرنے والوں کو ابتدا میں بڑی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دخانی انجن کی ایجاد کا قصہ تو بہت بہت پرانا ہے۔ سینکڑوں سال پہلے سے بھاپ کے پھیلنے سے جو زبردست قوت پیدا ہوتی ہے اس کا لوگوں کو علم تھا لیکن سنہ ۱۶۰۰ء سے پہلے کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کے ذریعہ قابل استعمال انجن کس طرح بنائے جا سکتے ہیں۔ سنہ ۱۶۷۹ء میں ڈینس پیپن نے بھاپ کو ایک نلکی میں بند کر کے اس کی پھیلنے والی قوت سے پسٹن کو دھکا دینے کا کام لیا۔ اس کے بعد دوسرے موجدوں نے خصوصاً ۱۷۰۵ء میں ٹامس نیوکومن نے اس پسٹن کے خیال کو اور ترقی دی اور سنہ ۱۷۵۰ء کے آس پاس بھدّے انجن انگلستان کے کوئلہ اور لوہے کی کانوں سے پانی کھینچ کر باہر پھینکنے کے لئے استعمال کئے جانے لگے۔

لیکن اس پورے زمانہ میں انجنوں کا کام بہت ناقص تھا اور ان سے پارچہ بافی کی مشینیں نہیں چلائی جاتی تھیں اس کے بعد سنہ ۱۷۸۲ء میں جیمس واٹ نے جو گلاسکو میں اوزار بنایا کرتا تھا نیوکومن کے انجن میں بہت سی اصلاحیں کامیابی کے ساتھ کیں اور اس کے بعد سے لوگوں کو ایک ایسا دخانی انجن مل گیا جو پہیوں کو گھما سکتا تھا اور مشینوں کو چلا سکتا تھا اور کاتنے والے اور بننے والے لوگوں کو مشینوں کے چلانے کے لئے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر زور ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب دخانی قوت سے سب کام ہونے لگے اور آدمیوں کا کام صرف مشینوں کی دیکھ بھال کرنا رہ گیا۔ سڑک کی گاڑیوں اور کشتیوں کے لئے بھی اس دخانی قوت کا استعمال کیا جانے لگا۔

اب جسم کی جگہ دماغ کے استعمال کرنے کی زیادہ ضرورت ہونے لگی انجن تو کھینچنے کا کام کرنے لگے اور انسان نے منصوبہ بنانے، رہنمائی اور فیصلہ کرنے کے اہم کاموں کو کرنا شروع کر دیا۔

غرضکہ انہی سالوں میں جب یورپ کے ایجاد پسند لوگ کاتنے اور بننے کی مشینیں ایجاد کر رہے تھے ان مشینوں کے چلانے کے لئے انجنوں کی ایجاد بھی ساتھ ہی ساتھ ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ صنعتی انقلاب ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ ابتدا میں نئی مشینوں اور انجنوں میں اصلاح آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ کپڑا بنوانے والے سرمایہ داروں نے ان مشینوں کے فائدہ کو جن کے کھڑے کرنے میں ابتدا میں بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا مشکل سے سمجھا۔ ۱۸۰۰ء تک بہت کم فیکٹریاں ایسی بنائی گئیں جن میں دخانی قوت سے کاتنے اور بننے کی مشینوں کو چلایا جاتا تھا لیکن اس کے بعد سے جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے فیکٹری کے مالکوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے انجنوں اور کرگوں کو لگانا شروع کر دیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہاتھ کے کرگوں کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا اور کوئلہ کی بادشاہت مسلّم طریقہ پر قائم ہو گئی۔
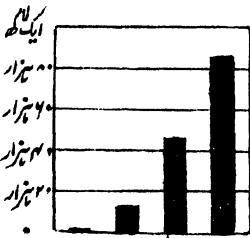
۱۸۱۳ء تا ۱۸۳۳ء میں دخانی کرگوں کی تعداد میں اضافہ

برطانیہ کے کوئلہ کے ذخائر نئے دخانی انجنوں کے لئے کوئلہ کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ برطانیہ میں کوئلہ کی بہترین کانیں موجود تھیں۔ عہد وسطےٰ میں بھی لوگ کوئلہ سے خوب واقف تھے اور امیر آدمی کبھی کبھی اپنے چولھوں میں اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔ کوئلہ کی تجارت کو آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی اور ۱۷۲۵ء میں لندن میں ۱۰ لاکھ ٹن کوئلہ صرف کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کے ایک سیاح نے دریائے ٹیمس میں پانچ سو کشتیوں کے بیڑہ کو کوئلہ لاتے ہوئے دیکھا تھا۔

پرانے زمانے میں مکانوں کو گرم کرنے اور لوہے کو پگھلانے کے لئے لکڑی اور بجھائے ہوئے کوئلہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے انگلستان کے جنگلوں کو بہت نقصان پہنچتا تھا ۱۶۱۵ء میں بھی پارلیمنٹ نے اس خطرہ کا احساس کیا تھا۔ ایک ٹن لوہے کو پگھلانے کے لئے دو ٹن بجھے ہوئے کوئلہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے پارلیمنٹ نے جہازوں کے بنانے کے لئے لکڑی کا تحفظ کرنے

بناتے تھے اس وقت بھی ان کی زندگی خاصی سخت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی ذاتی دلچسپی کے ساتھ کام کیا کرتے تھے لیکن اب ان کی دلچسپی کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ انھیں ایک خاص رفتار سے ایک مقررہ کام کو انجام دینا پڑتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تھے تو برطرف کر دیے جاتے تھے۔

ضرورت کی چیزیں مہنگی تھیں اور دیہات کے مزدوروں کے خاندان کا گذر چلانے کے لیے عورتوں اور بچوں کو بھی مجبوراً فیکٹری میں کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کے اوقات بہت طویل تھے۔ چھ بجے صبح کام شروع کر دیا جاتا تھا اور شام کو سات آٹھ بجے تک جاری رہتا تھا۔ تقریباً بارہ سے پندرہ گھنٹہ تک روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ لوگ نیند سے متوالے ہو کر اکثر مشینوں پر گر جاتے تھے۔ بچوں کو بھی پانچ یا چھ برس کی عمر سے بڑے آدمیوں کے برابر دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ کانوں میں بھی کام کرتے تھے اور ملوں اور فیکٹریوں میں بھی۔ ان کی بدنصیبی کے جن حالات کو بیان کیا جاتا ہے انھیں مشکل سے یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بعض کو چوکنا رکھنے اور کام سے لگائے رکھنے کے لیے ہنٹر کا استعمال کیا جاتا تھا وہ ہمیشہ سخت تھکے ہوئے نظر آتے تھے اور بھوکے رہتے تھے۔ بہت سے کام کی زیادتی اور غیر تندرست زندگی کی وجہ سے بیمار رہتے تھے اور بہت سے مر جاتے تھے ابتدا میں ایسے قوانین نہیں تھے جن سے بچوں کا ملازم رکھنا ممنوع قرار دیا جاتا اور ان کے والدین کو روپیہ کی اتنی زیادہ ضرورت رہتی تھی کہ وہ خود کام کرنے سے انھیں نہیں روک سکتے تھے۔

لیکن ۱۸۱۹ء سے روئی کے کارخانوں میں بچوں کے کام پر قانونی پابندیاں لگا دی گئی تھیں سولہ سال سے کم عمر کے بچوں سے ایک دن میں بارہ گھنٹہ سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور ڈیڑھ گھنٹہ دوپہر کو کھانا کھانے کے لیے انھیں ملتا تھا صنعتی انقلاب کے ابتدائی سالوں میں بہت سے مزدوروں کا یہ خیال تھا کہ مشینوں کے استعمال سے صرف پریشانی اور مصیبت پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیہات کی غریبی سے نکل کر وہ شہر کی غریبی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ دیہات میں تو انھیں تازہ ہوا دھوپ میسر تھی لیکن شہر میں انھیں نہایت غیر صحت بخش گنجان آباد علاقوں میں کام کرنا پڑتا تھا جہاں ہوا اور روشنی کا بہت کم گذر ہوتا تھا۔

۳۔ برطانیہ کی آبادی پر صنعتی انقلاب کا اثر | صنعتی انقلاب سے ایک اور خلاف توقع اثر بھی پیدا ہوا۔ مزدوروں کی غریبی کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ انھیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تھا۔ وہ تنگ اور گندے مکانوں میں جمع ہو کر رہتے تھے۔ ایسے حالات میں آبادی کے بڑھنے کی توقع قائم نہیں کی جا سکتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں انگلستان کی آبادی میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کی آبادی ایک کروڑ ۵ لاکھ تھی لیکن ۱۹۲۱ء میں آبادی بڑھ کر چار کروڑ تیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ۱۷۰۰ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان برطانیہ کی آبادی میں ترقی ہوئی۔
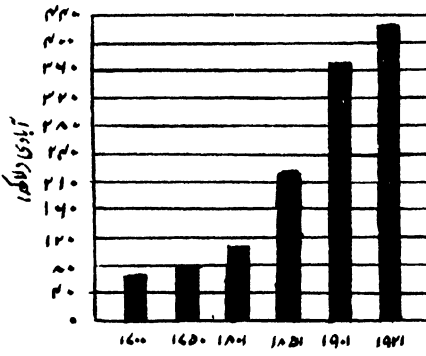
۱۷۰۰ء تا ۱۹۲۱ء میں برطانیہ کی آبادی کی ترقی

اس کے کئی اسباب تھے۔ لیکن دو اسباب کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے (۱) سائنس کے معلومات میں ترقی اور (۲) لوگوں کے معیار زندگی میں ترقی۔

صنعتی انقلاب کے ابتدائی سالوں میں مزدوروں کی حالت ضرور خراب تھی لیکن بعد میں حالت بہتر ہونا شروع ہوگئی۔ یورپ اور امریکہ کے سائنس داں امراض اور ان کے اسباب اور علاج کے بارے میں اپنی واقفیت برابر بڑھاتے رہے، انھوں نے معلوم کیا کہ بعض امراض مثلاً ٹائیفائیڈ کا تدارک سڑکوں اور مکانوں کی صفائی کو بہتر کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ چیچک کے تدارک کے لئے انھوں نے ٹیکہ لگانے کو مفید پایا۔ اس خطرناک بیماری کی وجہ سے سینکڑوں آدمی بہت سالوں سے مرتے چلے آرہے تھے لیکن اس کے بعد سے چیچک کی اموات کا سدباب ہو گیا۔ شہروں میں امراض سے مرنے والوں کا تناسب عام طور پر کم ہوتا گیا۔

فیکٹری کی حالت بھی بہتر ہوتی چلی گئی۔ قانون کے ذریعہ کام کے گھنٹے کم کر دیے گئے اور بچوں

کو کام کرنے کی اجازت بھی کم دی جانے لگی۔ جوں جوں تجارت میں ترقی ہوتی رہی اور زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہوئی۔ اجرتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ دیہات کے علاقوں سے بہت سے آدمی شہر آگئے اور یہاں کی آبادی کو بڑھانے لگے۔

دیہاتی علاقہ کے لوگوں کی حالت بھی بہتر ہونے لگی۔ جب بیٹے اور بیٹیاں شہروں کو چلی گئیں تو کھانے والوں کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ جب دیہات کی آبادی کم ہوئی تو جو باقی رہ گئے تھے ان کے لئے کام بھی زیادہ نکل آیا۔

۴۔ کچے مال، در بنے ہوئے مال کی بڑے پیمانہ پر تیاری

جب مشینوں نے ہاتھ کی محنت کی جگہ لے لی اور آدمیوں کی ایک بڑی تعداد ہر روز دیر دیر تک کام کرنے لگی تو کانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں جو مال تیار کیا جاتا تھا اس کی مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۱۳ء میں برطانیہ میں دو ہزار چار سو کرگے تھے لیکن ۱۸۳۳ء میں کرگوں کی تعداد ۸۵ ہزار ہو گئی۔ کاتنے کی مشینوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا۔ انگلستان کی پارچہ بافی کی بڑی صنعتوں یعنی سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے کی صنعتوں میں بھی تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔

۱۸۰۱ء کے بعد روئی کی درآمد میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہوا کہ ۱۸۴۵ء میں ۱۸۰۱ء کے مقابلہ میں ۵۴ گنا زیادہ روئی منگائی جانے لگی۔ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان کچے ریشم کی درآمد میں ۷ گنا اضافہ ہوا اور اسی زمانے میں اون کی درآمد میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔

برطانیہ میں روئی اور خام ریشم کی درآمد کی مقدار (پونڈ میں)		
سال	روئی	ریشم
۱۸۰۱	۵,۶۰,۰۰,۰۰۰	۹,۶۲,۰۰۰
۱۸۴۵	۷۲,۲۰,۰۰,۰۰۰	۶۳,۰۰,۰۰۰

کانوں سے کوئلہ نکالنے کا بھی یہی حال تھا۔ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان جو کوئلہ نکالا جاتا تھا اس کی مقدار بہت کم تھی لیکن ۱۸۵۰ء میں مشینوں کا استعمال بہت پھیل گیا اور ان میں سے اکثر دخانی انجنوں سے چلائی جانے لگیں۔ انجنوں کی تعداد کے اس اضافہ کی وجہ سے کوئلہ کی پیداوار میں بھی اضافہ شروع ہوا چنانچہ ۱۸۵۰ء میں ۴ کروڑ ٹنے

لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔
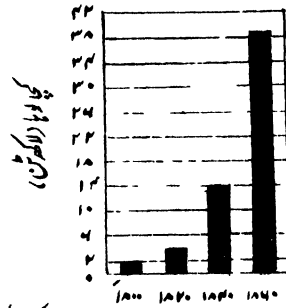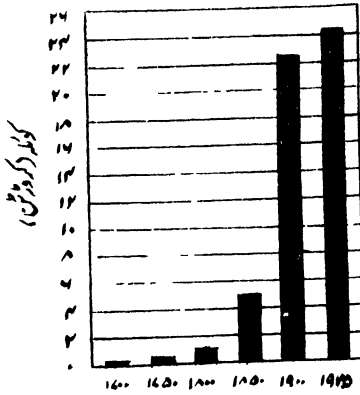
۱۷۰۰ء تا ۱۹۲۵ء میں برطانیہ میں کوئلہ کی پیدائش

۱۸۰۰ تا ۱۸۶۰ء میں برطانیہ میں خام لوہے کی پیدائش

تقریباً یہی حال لوہے کی پیداوار کا بھی تھا۔

۵۔ ۱۷۵۰ء کے بعد برطانیہ کی آبادی کا سنعتی علاقوں کے شہروں میں اجتماع

صنعتی انقلاب کے بعد لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی رہی لیکن آبادی میں ایک اور تبدیلی بھی واقع ہوئی۔ یعنی یہ ایسے علاقوں میں مجتمع ہونے لگی جہاں کام کثرت سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قصبے چھوٹے شہر بننے لگے اور چھوٹے شہر بڑھ کر بڑے شہر بن گئے۔ مانچسٹر اس تبدیلی کی ایک اچھی مثال ہے ۱۷۵۰ء میں مانچسٹر ایک چھوٹا سا شہر تھا آج یہ دنیا کے نہایت ممتاز صنعتی علاقہ کا مرکز ہے۔ اس شہر کے ۵۰ میل کے گھیرے میں تقریباً ۹۰ لاکھ آدمی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نیو یارک کو چھوڑ کر آبادی کا اس قدر کثیر اجتماع دنیا کے کسی اور دوسرے حصہ میں نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں کسی جگہ فیکٹریوں کی اتنی کثرت ریلوں کی اتنی بہتات، صنعت میں اس قدر ہما ہمی اور انجن کی قوت کی اس قدر زبردست مقدار نہیں پائی جاتی۔

مانچسٹر کی طرح اور دوسرے شہروں نے بھی مثلاً لورپول، برمنگھم، لیڈس وغیرہ نے اسی طرح

ترقی کی ہے

انگریزی شہروں کی آبادی سنہ ۱۸۰۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے درمیان			
	۱۸۰۱	۱۸۴۱	۱۹۲۱
مانچسٹر	۹۵ ہزار	۳ لاکھ ۱۱ ہزار	۹ لاکھ ۴۶ ہزار
لورپول	۸۲ ہزار	۲ لاکھ ۸۶ ہزار	۸ لاکھ ۳ ہزار
برمنگھم	۷۱ ہزار	۱ لاکھ ۸۳ ہزار	۹ لاکھ ۱۱ ہزار
لیڈس	۵۳ ہزار	۱ لاکھ ۵۳ ہزار	۴ لاکھ ۵۸ ہزار

اسی زمانہ میں ان لوگوں کی تعداد جو کھیتوں پر کام کرتے تھے برابر گھٹتی رہی۔ پچاس سال ہوئے برطانیہ میں جو لوگ زمین پر کام کرتے تھے ان کی تعداد ۲۰ لاکھ سے زائد تھی۔ اب ان کی تعداد صرف ۱۵ لاکھ رہ گئی ہے حالانکہ گذشتہ پچاس سال میں مجموعی آبادی دوگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انگریز قوم اپنی غذا کے لئے دوسری قوموں کی کس قدر محتاج ہوگئی ہے

۶۔ برطانیہ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جدید وسائل نقل وحمل کی تعمیر

سنہ ۱۷۰۰ء میں سڑکیں بہت خراب تھیں، نہریں بہت کم تھیں اور چیزوں کو منتقل کرنے کے لئے کافی دریا موجود نہیں تھے۔ جہاں تک ریلوں کا تعلق ہے ان کا کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ انجن موجود نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان میں سڑکیں عہد وسطیٰ سے پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں رومیوں نے انگلستان کو فتح کرلیا تھا اور اپنے زمانہ قیام میں انھوں نے بڑی اچھی سڑکیں تعمیر کردی تھیں۔ لیکن یہ بات صنعتی انقلاب سے پانچ سو سال پہلے کی تھی۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں ان سڑکوں کی حالت نہایت افسوس ناک تھی۔ لیکن پھر بھی کسانوں کو اپنی پیداوار کو انہی سڑکوں کے ذریعہ لے جانا پڑتا تھا اور شہر کا سفر بڑا لمبا اور تھکا دینے والا ہوا کرتا تھا۔ اسٹیفورڈ شائر کے کمہار اپنا مال گھوڑوں پر لاد کر شہروں کو لاتے اور

وہاں سے ایندھن لے جایا کرتے تھے۔ مانچسٹر کے چھوٹے تاجر بھی ٹٹوؤں کی قطار بنا کر اپنا مال منتقل کیا کرتے تھے۔ خراب سڑکوں اور نقل وحمل کی دیر طلبی کی وجہ سے تجارت اور سفر بہت مشکل سمجھے جاتے تھے سیاحوں کے بیان سے سڑکوں کی خرابی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے

ایک سیاح لکھتا ہے :۔

راستہ صرف چالیس میل تھا لیکن اس کے طے کرنے میں چودہ گھنٹے لگتے تھے اور ہر میل کے ختم ہونے پر گاڑی یا تو ضرور الٹ جاتی تھی یا دلدل میں پھنس جاتی تھی شاہی رتھ کو بھی راستہ کی ان ہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا اگر کسانوں کی ٹولیاں باری باری سے اپنی قوت بازو سے اس کو سہارا دے کر سیدھا نہ رکھتیں اور آخری نو میلوں میں کندھوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھاتیں۔ اس صبر آزما کام میں بھی پورے چھ گھنٹے لگے۔

ایک دوسرا سیاح بھی اسی قسم کا ایک عجیب واقعہ بیان کرتا ہے :۔

دیہات کے ایک ایسے گرجا گھر کو جاتے ہوئے جو لیوس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا میں نے ایک بوڑھی خاتون کو جو بے چاری نہایت شریف اور نیک نفس معلوم ہوتی تھیں دیکھا کہ چھ بیلوں کی گاڑی میں بیٹھ کر گرجا گھر جا رہی ہیں۔ یہ بات مذاق یا تفنن طبع کے سلسلہ میں نہیں کی گئی تھی بلکہ مجبوراً ایسا کرنا پڑا تھا کیونکہ راستہ اتنا گہرا اور سخت تھا کہ گھوڑے کا جانا ناممکن تھا۔

سڑکوں اور نہروں کی ترقی | ۱۷۵۰ء کے بعد سڑکوں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی اور گاڑیوں کا استعمال بھی بڑھ گیا۔ مال کی گاڑیاں مقررہ وقت پر اون اور کپڑا لندن کو لے جانے لگیں۔ لندن کے آس پاس کے خاصے بڑے علاقہ میں کسان اپنی گاڑیوں اور جوڑیوں کو شہر کے لئے غذا لے جانے کے لئے کرایہ پر دینے لگے۔ واپسی پر ان گاڑیوں میں بنا ہوا مال مثلاً کرانہ کا سامان کوئلہ شراب وغیرہ دیہات کی دوکانوں کے لئے لائی جاتی تھی۔

سترھویں صدی کے اخیر میں ناکہ بندی کرنے والی کمپنیوں نے انگلستان میں اچھی سڑکوں کا بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان نئی سڑکوں کی وجہ سے سفر سہولت اور تیزی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ خاص شہروں کے درمیان منزل بہ منزل سفر کرنے والی گاڑیاں باقاعدگی کے ساتھ چلنے لگی تھیں اور ان میں مسافر، ڈاک اور سامان خورد و نوش روزانہ کیا جاتا تھا۔ بعض بعض گاڑیاں بڑی آرام دہ اور خوب صورت ہوا کرتی تھیں۔ اندر ان پر خوب اچھی طرح کپڑا منڈھا ہوتا تھا اور گدّے دار نشستوں کی وجہ سے بیٹھنے والوں کو سخت جھٹکے نہیں لگتے تھے۔

جب گاڑی گاؤں میں بھوپوں کی آواز کے ساتھ تیزی سے داخل ہوتی تھی تو لوگوں کی کیفیت قصرِ بد حواسی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ مسافر اپنا سامان جلدی جلدی اٹھا کر اپنی جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ قصبوں کے رہنے والے ان پیغاموں اور پارسلوں کو جو کوچبان انھیں دیتا تھا نہایت شوق اور ذوق کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوچ گاڑی خبر رسانی کا بھی کام انجام دیتی تھی۔ لوہار کی دکان پر اس کی آمد کا دیر تک چرچا رہتا تھا۔ جو خبریں یہ لاتی تھی اس سے گاؤں والوں کو باہر کی دنیا کا پتہ چلتا تھا۔

امریکہ میں تو نہریں سنہ ۱۸۰۰ء تک نہیں بنائی جا سکی تھیں لیکن انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں یہ بات نہیں تھی۔ کوئلہ اور لوہے جیسی بھاری چیزوں کے منتقل کرنے میں نہروں کا حصہ بہت زبردست تھا۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں ڈیوک آف برج واٹر نے جن کا شمار اولین نہر سازوں میں کیا جاتا ہے ایک نہر کو بنایا جس کے بارے میں ایک مصنف کا بیان ہے کہ "مانچسٹر کے قریب ایک نہایت شاندار تعمیر ہے اور دنیا کی مصنوعی چیزوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ چیز ہے ملک کے تمام حصوں سے لوگوں کے انبوہ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور بڑے مرتبہ کے لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔"

اس نہر بنانے کا مقصد یہ تھا کہ کوئلہ کو کانوں سے شہر تک لے جایا جائے۔ مانچسٹر سے ۷ میل کے فاصلہ پر یہ نہر شروع ہوتی تھی اس جگہ ڈیوک آف برج واٹر نے ایک بند بنایا تھا۔ ڈیوک

نہایت ہوشیار شخص تھے انھوں نے یہ اسکیم بنائی تھی کہ پہاڑ کی کانوں سے کوئلہ بغیر دوبارہ لادے ہوئے مانچسٹر تک روانہ کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے پہاڑی کے بازوؤں میں نہر کاٹنا شروع کردیا۔ لانبی چپٹے پیندے کی کشتیاں سرنگوں میں سے گذر کر کوئلہ لاتی تھیں۔

جیسے جیسے وقت گذرتا رہا انگلستان کے صنعتی اضلاع میں اور نہریں بھی بنائی گئیں۔ ان میں سے ایک یعنی مانچسٹر کی جہازوں کی نہر بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

جب صنعت کو ترقی ہوئی خصوصاً ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان تو مانچسٹر کے کاروباری لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کا شہر اس وقت تک ایک بڑا تجارتی مرکز نہیں بن سکتا جب تک سمندر سے براہ راست آمدورفت کا سلسلہ شروع نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے عزم مصمم کرلیا کہ ایک ایسی نہر بنائی جائے جس کے ذریعہ مانچسٹر کے مال سے لدے ہوئے جہاز سمندر تک جاسکیں ۱۸۸۳ء میں انھوں نے نہر کو بنانا شروع کیا۔ اس کے بننے میں بارہ سال لگے اور آخر میں ۱۸۹۴ء کے سرد جنوری کے مہینہ میں ایک بہت بڑا اسٹیمر مانچسٹر کے بالکل وسط میں پہنچ گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تجارت بڑھنے لگی۔ مانچسٹر کا مال برطانیہ کے دوسرے حصوں اور دنیا کے دور دراز علاقوں میں پہلے کے مقابلہ میں بہت سستے داموں پر بھیجا جانے لگا۔ اس طرح سو سال سے کم مدت میں سڑکوں اور نہروں کا ایک زبردست نظام بن گیا۔ لیکن ان ترقی یافتہ سڑکوں اور بہت سی نہروں سے بھی برطانیہ کے لیے جس قدر تیز ذرائع نقل وحمل کی ضرورت تھی وہ پوری نہ ہوسکی۔

تیز تر ذریعہ نقل وحمل یعنی ریلیں

یوں تو انگلستان میں سنہ ۱۷۰۰ء میں بھی ریل کی پٹریاں استعمال کی جاتی تھیں لیکن یہ زیادہ تر کوئلہ کے علاقوں میں تھیں یہ دخانی ریلیں نہیں تھیں بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹھیلے ہوتے تھے جنھیں لکڑی یا پتھر کی پٹریوں پر گھوڑے یا مرد اور عورتیں کھینچا کرتی تھیں کان سے شہر تک یا دریا اور نہر کی کشتیوں تک کوئلہ لانے کا یہی طریقہ تھا۔ اسی طرح کی ریلوں کا استعمال سو سال تک ہوتا رہا لیکن ان کو صرف آدمی یا گھوڑے کھینچتے تھے۔

اس کے بعد جارج اسٹیفنسن نے اپنا دخانی لوکوموٹو ایجاد کیا۔ ۱۸۲۵ء میں سٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک گھوڑوں سے کھینچی جانے والی گاڑیوں کے لئے ایک ریل کی پٹڑی موجود تھی۔ یہ سڑک ۲۵ میل لانبی تھی۔ اسٹیفنسن ایک ایسا انجن بنانا چاہتا تھا جو گاڑیوں کی ایک قطار کو کھینچ سکے۔ آخر کار اس کو کامیابی ہوئی اور اس نے گھوڑوں کی لائن کے ڈائرکٹر کو راضی کر لیا کہ اس طرح کی چھ ریل گاڑیاں بنائے یہ گاڑیاں ۱۲ سے ۱۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی تھیں۔ یہ صرف بوجھ کھینچ سکتی تھیں اور اس کی مقدار بھی بہت کم ہوتی تھی۔ مسافروں کی گاڑیوں اور مال کے ایک بڑے حصہ کے کھینچنے کے لئے اب بھی گھوڑوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

مگر ترقی تیزی سے ہوتی رہی۔ ۱۸۲۹ء کے اکتوبر میں اسٹیفنسن نے ایک نئے قسم کا انجن بنایا جس کا نام اس نے راکٹ رکھا جو ۲۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۱۲½ ٹن وزن کھینچ سکتا تھا۔ پھر صرف اسٹیفنسن ہی اکیلا ایسا شخص نہیں تھا جو وزن کھینچنے والے انجنوں کو بنا رہا تھا۔ اور لوگ بھی اسی قسم کے دخانی انجن بنا کر پہیے دار گاڑیوں کے ساتھ لگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ۱۸۲۹ء میں بہت سے مختلف قسم کے انجنوں کا امتحان لیا گیا اور بہترین انجن کے لئے انعام مقرر کیا گیا۔ امتحان کی شرط یہ تھی کہ دو میل کی ہموار ریل پر دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بیس پھیرے کئے جائیں۔ ہزاروں آدمیوں نے مانچسٹر اور لور پول میں شوق اور جوش کے ساتھ اس مقابلہ کو دیکھا۔ اسٹیفنسن نے اس موقعہ کے لئے اپنا راکٹ تیار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ تین اور حوصلہ مند انجنیئر اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ ان کے انجنوں کا نام ناولٹی، سانسپیریل اور پرسیویرنس تھا۔ جب سگنل دیا گیا تو سب نے مقابلہ میں شرکت کی راکٹ کا کام سب سے اچھا رہا ناولٹی کی رفتار بعض وقت ۲۴ فی گھنٹہ تک پہنچ گئی لیکن جن دھوکنیوں سے انجن کو ہوا پہنچائی جاتی تھی ان کی ہوا نکلنے لگی اور ناولٹی کو مرمت کے لئے مقابلہ سے الگ ہو جانا پڑا۔ سانسپیریل کو بھی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے بائلر کو مرمت کی ضرورت پیش آگئی۔ پرسیویرنس کی رفتار ۶ میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔ غرضکہ اس طرح دوسرے انجن ناکام رہے اور راکٹ جیت گیا۔ لیکن یہ مقابلہ ختم نہیں ہوا یہ برابر ملتوی

ہوتا رہا تاکہ دوسرے انجنوں کو مرمت کر کے مقابلہ میں شریک کیا جا سکے۔ راکٹ ہر روز دو میل کے فاصلہ کو طے کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس نے لوگوں کی دلبستگی کے لئے یہ بھی کیا کہ تیس آدمیوں کو بٹھا کر ۳۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے سفر کیا۔ یہ دوسری مرتبہ اس نے تیرہ ٹن وزن لاد کر ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کیا۔ آخرکار ججوں نے فیصلہ کیا کہ مقابلہ کو اور زیادہ عرصہ تک جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے اور مسٹر اسٹیفنسن کو ۵۰۰ پونڈ کا انعام دے دیا گیا۔

۱۸۲۹ء میں یعنی اس سال جب کہ راکٹ کا امتحان ہو رہا تھا لورپول اینڈ مانچسٹر ریلوے کا افتتاح ہوا۔ اس لائن پر مقررہ نقشہ کے مطابق ۶ پھیرے روزانہ ہوتے تھے۔ اس کے بعد لندن سے برمنگھم اور پھر ساؤتھ امپٹن تک ریلیں بنائی گئیں۔ ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹ نے ۲۹ نئی ریل کی سڑکوں اور ایک ہزار میل کی لانبی پٹریوں کے بنانے کی اجازت دی اور ۱۸۴۲ء میں خود ملکہ نے ریل میں جسے خطرناک سمجھا جاتا تھا سفر کیا۔

آج برطانیہ میں ۲۱ ہزار میل لانبی لائنیں پائی جاتی ہیں اور برطانیہ کی ریلوں کا شمار دنیا کی بہترین ریلوں میں کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ۲ لاکھ ۵۲ ہزار میل لانبی لائنیں پائی جاتی ہیں۔ امریکہ کا رقبہ برطانیہ کے مقابلہ میں اگرچہ ۶۵ گنا ہے لیکن ریل کی لائنیں صرف ۱۲ گنا ہیں۔

خلاصہ انگلستان کس طرح زراعتی ملک سے صنعتی ملک بن گیا۔ یہ قصہ بہت لانبا ہے۔ یہ کام کئی سو سال میں ہوا۔ ایک ہزار سال تک تو انگلستان کی رعیت اپنے چھوٹے مینر کے گاؤں میں رہتی رہی اور وہاں اپنی زمین کے چھوٹے ٹکڑوں کو یورپ اور ایشیا سے بالکل الگ تھلگ رہ کر جوتتی بوتی رہی۔

لیکن ۱۳۰۰ء کے بعد سے آہستہ آہستہ ان کے طریقہ زندگی میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی ان کے کام کے اور تجارت کے طریقے بھی بدل گئے۔ آہستہ آہستہ رعیت زمینداروں سے آزاد ہو گئی اور اس نے زراعت کے پیشہ کی جگہ دستکاری کے پیشہ کو اختیار کر لیا۔ جب زراعت کو زوال ہوا تو دستکاری کو ترقی ہوئی۔ فیکٹریاں بہت کم تھیں زیادہ تر گاؤں کے لوگ اپنے گھر پر کام کیا کرتے

تھے۔ اون کو کاتا اور بنا جاتا تھا۔ گھر کے برتن، کھیتی کے اوزار اور ہتھیار گاؤں کے لوہار کی چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں تیار کئے جاتے تھے۔ انگریزی دستکار بہت عمدہ مٹی کے برتن بھی بناتے تھے۔ اور انگلستان کی شہرت کا باعث تھے۔

لیکن سنہ ۱۷۰۰ء تک تقریباً سب کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ انجن بہت کم تھے اور قوت متحرکہ سے چلنے والی مشین تقریباً بالکل نہیں تھی۔

اس کے بعد پہلے قابل استعمال انجن اور پہلی کاتنے اور بننے والی مشینوں کی ایجاد ہوئی۔ ۲۵ سال کے اندر اندر ایجاد کرنے والوں نے معلوم کر لیا کہ پٹری کی گاڑیوں دخانی کشتیوں اور مشینوں کو کس طرح چلایا جائے اور ایک صدی کے اندر اندر انگریزوں کا طرز زندگی بالکل بدل گیا۔ دستکاروں نے ہاتھ کے اوزاروں اور گھریلو دھندوں کو چھوڑ دیا اور مشین کی دیکھ بھال اور فیکٹری میں اجرت پر کام کرنے لگے۔ یہ فیکٹریاں بڑے قصبوں اور شہروں میں واقع تھیں اس لئے گاؤں ویران اور شہر آباد ہونے لگے۔

ملک کی کل حالت ہی بدل گئی۔ جہاں کوئلہ کا ذخیرہ موجود تھا وہاں کانوں سے کوئلہ نکالنے والے شہر بن گئے۔ لوہے اور فولاد کی ملوں کو ترقی ہوئی اور بیسیوں پارچہ بافی کی فیکٹریاں بنا کر کھڑی کر دی گئیں۔

نئے زمانہ کے لئے زیادہ بہتر ذرائع نقل و حمل کی ضرورت تھی۔ سڑکوں کو بہتر بنایا گیا۔ نہروں کو کھودا گیا اور برطانیہ کی آبادی کو دخانی ریلوں سے جکڑ دیا گیا۔

صنعتی انقلاب جب چل نکلا تو آبادی تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے سو سال بعد برطانیہ کے باشندوں کی تعداد تو بڑھ گئی لیکن زراعت میں مصروف آبادی کا تناسب برابر گھٹتا رہا۔ آج برطانیہ کے پانچ آدمیوں میں سے چار شہروں میں رہتے ہیں۔

غرضکہ اس طرح مبینروں کا انگلستان موجودہ صنعتی برطانیہ عظمیٰ بن گیا۔

مولانا سید محمد شرف الدین صاحب مرحوم

۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو مولانا سید محمد شرف الدین صاحب استاد جامعہ نے ۷۰ سال کی عمر میں دو دن کی مختصر علالت کے بعد قرول باغ دہلی میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نہایت خوبیوں کے بزرگ تھے شعر و شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ابھی حال میں مکتبہ جامعہ نے "تسخیر یاس" کے نام سے مولانا کے کلام کا انتخاب شایع کیا تھا۔ تحقیق زبان اور محاورہ میں مرحوم سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی تحقیق و واقفیت بھی بہت بلند پایہ کی تھی۔ معلم کی حیثیت سے نہایت کامیاب تھے۔ مرحوم کا حافظہ نہایت اچھا تھا اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات نہایت جزئی تفصیل کے ساتھ ان کو یاد تھے۔ لیکن یہ تمام خوبیاں ان کا امتیازی وصف نہیں تھیں۔

مولانائے مرحوم کی وہ خصوصیت جو صرف ان کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی وہ ان کے یقین کی پختگی اور اظہار خیال کی بے باکی تھی۔ مولانا اپنی ذات اور معلومات پر قابل رشک حد تک اعتماد رکھتے تھے۔ جس بات کو حق اور صحیح سمجھتے تھے اس کا مردانہ وار بہ بانگ دہل اعلان کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتے تھے چاہے وہ سننے والوں کے لئے کتنی ہی ناگواری اور ناپسندیدگی کا باعث کیوں نہ ہو۔

اس کے علاوہ ان کی وضع داری، خلوص اور خاطر و مدارات میں بھی ایک شانِ امتیاز اور بزرگی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی موجودگی کو ہر مجمع میں ضرور محسوس کرادیا کرتے

تھے۔ جامعہ کی برادری میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو مولٰنا کی ڈانٹ اور پھٹکار سے بچ سکا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاید ہی کوئی ایسا بھی ہو جو ان کے خلوص، محبت اور مدارات سے بہرہ ور نہ ہوا ہو۔ ان کی وفات گویا ایک ادارہ کی موت ہے اور اسی حد تک جانکاہ اور ناقابل تلافی ہے۔ ان کے رخصت ہو جانے سے پرانی وضع داری رخصت ہو گئی اور جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر کرنا ممکن نہیں ہے۔

مولٰنا سے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے جب وہ اٹاوہ کے اسکول میں تعلیم پاتے تھے استاد شفیق تھے اور جامعہ کی برادری کے اکثر افراد کو ان سے شرف تلمیذ حاصل ہے اور جنھیں یہ شرف حاصل نہیں تھا وہ بھی ان کی موجودگی میں اپنے آپ کو ان کا شاگرد ہی سمجھنے پر مجبور رہتے تھے۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور جیسے سچے، کھرے، پابند نماز باجماعت مسلمان وہ تھے ویسی ہی اعلیٰ علیین میں انھیں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

ذیل میں ہم مولوی عقیل الرحمٰن صاحب ندوی کے دو قطعات تاریخ وفات درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے اس المناک واقعہ سے متاثر ہو کر تصنیف فرمائے ہیں۔ (مدیر)

سید ذی وقار شرف الدین   اشرفِ خانداں بلند مقام

۱۲ ۸ ۷

(عہ تاریخی نام)

مبدأ فیض سے ملے تھے انھیں — علم و دانش کے بے بہا انعام
عالم باعمل تھی ان کی ذات — تابع اسوۂ رسول تھے کام
ایک مدت اٹاوہ کا اسکول — رہا ان کے فیوض سے خوش کام
جامعہ کے نصیب پھر جاگے — ہوئے سیراب فیض خاص و عام
فیض صحبت سے بن گئے اکسیر — محفلِ علم کے ثقات و کرام
ان کی رحلت سے کیوں نہ ہوں دلگیر — ہند کے صاحبان علم تمام
صبح کے وقت دار فانی سے — توڑ کر جسم عنصری کا دام
پہنچی جنت میں روح سید کی — ملی شایان شان جائے قیام

کہا رضواں نے دیکھ کر ان کو
لب کوثر ہے جناں میں مقام
۱۳ ھ ۵۸

دیگر

بزرگ و عالم و دانشور سید ذی جاہ — کہ جن کے فضل کے ہیں معترف ثقات و کرام
فیوض علم سے جن کے اٹاوہ ہے شاداب — قدم سے جن کے ہوا جامعہ بلند مقام
جسد کی قید سے آزاد ہو گئے آخر — ہے یہاں کی ہستیٔ دو روزہ کا یہی انجام
نگاہ مرد خدا میں ہے انتظار کی شب — نہ جب تلک ملے بندے کو وصل کا پیغام

پیام ادھر سے چلا اور ادھر سے روح چلی
در بہشت سے پہنچی ندا سلام سلام
۱۳ ھ ۵۸

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

دنیا میں ہر قوم کی الگ زبان ہوتی ہے اور قوموں میں بھی دیکھئے تو ہر پیشے کے لوگ اپنی الگ زبان بنا لیتے ہیں۔ جسے دوسرے پیشے والے یا عام لوگ مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس کی شکایت نہ ہونی چاہیئے کہ سیاست کا کام کرنے والے اپنی الگ زبان بولتے ہیں۔ لیکن شکایت کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ سیاست بڑی دلچسپ چیز ہے اور پھر اسے سمجھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ ابھی دیکھئے فلسطین کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ کتنا جی چاہتا تھا کہ اس کی تجویزوں اور بحثوں کا پتہ لگائیں کہ کس ڈھنگ پر ہوئیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کانفرنس کی کوئی نہ کوئی خبر اخباروں میں روز چھپتی تھی۔ مگر خاص برطانوی زبان میں اور اس لئے سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی آدمی سر کھجا کر رہ جاتا تھا۔ اس کا تو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے اس میں شریک نہ کئے جائیں گے یہ تو ہماری تقدیر کا لکھا تھا جو پورا ہوا۔ کانفرنس کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ ایک او شبہ جسے سیاست کی زبان چھپا نہ سکی یہ تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ورنہ کانفرنس کی کارروائی اور برطانیہ کے ارادوں اور تجویزوں کو راز میں رکھنے کے کیا معنی تھے۔ آخر ہندوستان کے دستور پر بحث کرنے کے لئے بھی تو ایک کانفرنس ہوئی تھی اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مختلف خیالات کے لوگ جمع کئے جائیں۔ تقریریں ہوں، مشورے ہوں اور اس طرح سارا معاملہ طے کر لیا جائے یہ تو ٹھیک ہے کہ ہندوستانی برطانیہ کے وفادار شہری تھے جھگڑنے کو نہیں گئے تھے برطانوی سیاست کی مشکل کو آسان کرنے گئے تھے۔ انھوں نے آپس میں کوئی بات طے نہیں کی برطانیہ کو خوشی سے پنچ بنا لیا۔ اور ہر طرح سے

یہ ظاہر کر دیا کہ برطانیہ پنچ نہ بنا تو وہ آپس میں قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ پھر بھی کوئی ایسی بات فلسطین کانفرنس میں تھی کہ برطانوی سیاست نے اپنے فیصلے کو آخر تک چھپائے رکھا۔

شاید اس کا سبب یہ تھا کہ عرب ابھی تک ہندوستانیوں کی طرح مہذب نہیں ہوئے ہیں۔ لندن جیسے شہر میں انھیں بے مروت اور ہٹ دھرم کہلانے کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے گول میز کانفرنس کو گول نہیں رہنے دیا۔ ایک طرف فلسطین کی موڈریٹ پارٹی کے نمایندوں کو اپنے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا اور یہ کہا کہ یہ پارٹی ناجائز طریقے پر پیدا ہوئی ہے۔ دوسری طرف یہودیوں کو ڈھکیل کر الگ کر دیا۔ اس طرح برطانیہ جو پنچ بننا چاہتا تھا۔ مدعا علیہ بن گیا اور عرب اور یہودی مدعی ٹھیرے۔ اور ایک زحمت یہ بھی تھی کہ عرب اپنی بات اپنی زبان میں کہتے تھے پھر اس کا ترجمہ ہوتا۔ پھر انگریزی میں اس کا جواب دیا جاتا۔ پھر اس جواب کا ترجمہ عربی میں کیا جاتا اور اس کا جواب عربی میں دیا جاتا۔ ایسی گفتگو میں نہ عرب اپنی عربی سے فائدہ اٹھا سکے نہ انگریز اپنی انگریزی سے۔ ہر معاملہ اس پر آکر اٹک جاتا کہ جھگڑا ختم کرنا چاہتے ہو تو ہماری بات مان لو۔ اسی وجہ سے عربوں کا پلہ بھاری رہا۔ وہ ایک موٹی سی بات صاف صاف کہتے اور بار بار کہتے۔ کہ فلسطین ہمارا ملک ہے اسے ہمارے حوالے کر دو یہودی جتنے وہاں اس وقت ہیں رہ سکتے ہیں انھیں ہم ہر وہ حق دینے کو تیار ہیں جس کی اقلیتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہم انھیں اب اس کی اجازت نہ دیں گے کہ باہر سے ہر سال ہزاروں یہودی بلا کر آباد کریں اور عربوں سے ان کی زمین ان کی روزی ان کا وطن خرید لیں۔ برطانیہ سے بھی ہم دوستانہ تعلق رکھنا چاہتے ہیں اور جیسے مصر نے معاہدہ کیا ہے ویسے ہی ہم بھی کریں گے۔ فلسطین کے پڑوسی عربوں کے جتنے نمائندے تھے وہ سب فلسطینوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ یا بہرحال ان کی عربی کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہو سکا کہ جس سے پتہ چلتا کہ ان کے اور فلسطینوں کے مطالبہ میں کیا فرق ہے۔

مدعی نمبر ۲ فلسطین کے یہودی اور ان کے یورپی اور امریکی سرپرست تھے۔ یہ سب انگریزی بہت اچھی بولتے ہیں۔ مگر افسوس جہاں گولی چل رہی ہو وہاں اچھی انگریزی کام نہیں آتی دل میں تو یہودی

یہ چاہتے ہیں کہ فلسطین میں انگریزوں کی حکومت اس وقت تک رہے جب تک یورپ اور امریکہ کے یہودی وہاں آکر آباد ہو کر یہ نہ ثابت کر دیں کہ یہ یہودیوں کا پرانا اور اصل وطن ہے برطانیہ اگر اس مدت تک حکومت کرنے کا خرچ کے خیال سے ذمہ نہ لے تو وہ اس پر بھی تیار ہو جائیں گے کہ برطانیہ جو فوج وہاں رکھے اس کا خرچ بھی ادا کریں۔ لیکن یہ تجویز منظور کرنا برطانیہ کی شان کے خلاف ہوگا۔ اس لئے یہودی کانفرنس میں اس بات پر زور دیتے رہے کہ برطانیہ نے لارڈ بیلفر کی زبانی جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرے انگریز یہ مطالبہ سن کر چاہے چپ ہو جاتے ہوں مگر عرب یہ کہتے ہیں کہ جب ہم سے پہلے سے ایک وعدہ کیا جا چکا ہے تو لارڈ بیلفر کو کوئی حق نہ تھا کہ یہودیوں سے اس کے خلاف کوئی وعدہ کریں اور ہم ان کی بات رکھنے کی خاطر اپنا دیس بیچنے کو تیار نہیں ہیں۔

عرب اور یہودی اپنے مطالبے کانفرنس سے بہت پہلے پیش کر چکے تھے اور اگر اس کانفرنس کا اجلاس حسب منشا ہوتا یعنی یہودی اور انتہا پسند اور موڈریٹ ساتھ بیٹھتے تو یہودی اپنی بات انگریزی میں کہتے فلسطینی عربوں کے سوا وہ سب کی سمجھ میں آجاتی اور سب کے دل میں بیٹھ جاتی۔ پریس میں یہودیوں کی تقریریں چھپ جاتیں اور عرب اپنی عربی کا ترجمہ کراتے رہ جاتے دنیا سمجھتی کہ عرب کسی ایک بات کا جواب نہیں دینے پاتے جاہل ہیں۔ وحشی ہیں اور ان کی تنقادت کو ٹالنا تہذیب کی ایک خدمت ہوگی لیکن عرب ایسی چال چلے کہ انگریزی نہ جاننے کے سبب سے ان کو نقصان کی جگہ فائدہ ہوا۔ ان کی تقریریں چاہے اچھی ہوں وہ باغیوں کی گولیوں سے کچھ کارآمد نہیں برطانوی سیاست حیران رہ گئی کہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ کس طرح نبا ہے۔

لیکن کانفرنس کرنے، تقریریں سننے، اور پھر ترجمہ کرا کر انھیں سمجھنے کی بھی حد ہوتی ہے اس میں بھی وقت صرف ہوتا ہے روپیہ اٹھتا ہے اگرچہ اتنا نہیں جتنا کہ باغیوں کا پیچھا کرنے اور پکڑنے میں ہم کو تو صرف اتنا بتایا گیا۔ کانفرنس میں برطانیہ کے نمائندوں کی طرف سے ایک تجویز تیار کی گئی۔ عربوں اور یہودیوں سے اس پر الگ الگ گفتگو ہوئی۔ اس ہفتے وہ برطانوی وزارت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد کانفرنس میں باضابطہ طور پر پیش ہوئی تجویز یہ ہے کہ فلسطین ایک حد تک خودمختار

ضلعوں میں تقسیم کیا جائے اور سارے ملک کی حکومت کے لئے ایک مرکزی مجلس ہو جس میں عربوں یہودیوں اور عیسائیوں کے نمائندے آبادی کی نسبت سے ہوں۔ اس مجلس کے اختیارات کیا ہوں گے برطانوی سیاست اپنا حق کس طرح محفوظ کرے گی۔ بلکہ اس تجویز پر عمل کس طرح اور کب کیا جائے گا یہ ابھی ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا۔ تجویز پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ ملک میں فساد بند ہو جائے ظاہر ہے کہ فساد کی ذمہ داری عربوں پر ڈالی جائے گی اس کا اصل سبب کچھ بھی ہو پھر جرمن سیاست بھی ایک دنیا کو بے چین کرنے پر تلی ہوئی ہے اور برطانیہ کو اس کا کھٹکا بھی لگا رہے گا۔ فلسطین کی گول میز کانفرنس نے سچ پوچھئے تو بس ایک بات طے کر دی ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا قومی وطن فلسطین کا ایک چھوٹا سا ضلع ہوگا۔ عربوں کے خوش اور مطمئن یا مایوس ہونے اور آخر میں مفتی صاحب کے رضامند ہونے کی خبریں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کی تجویز ذلیل نہ سمجھی جائے۔ عرب اور دنیا کے دوسرے مسلمان اس غلط فہمی میں نہ پڑیں کہ برطانوی سیاست کسی سے دب سکتی ہے۔

اس غلط فہمی کے پھیلنے کا آج کل خاصا اندیشہ ہے شام اور عراق میں جرمنی حکومت طرح طرح سے پروپیگنڈے کر رہی ہے ابھی چند روز ہوئے شام میں ایک کلب بند کیا گیا۔ جس کے ممبر کھلم کھلا کہتے تھے کہ انھیں جرمنی سے روپیہ ملتا ہے اور وہ اس روپے کو شام کی آزادی کے لئے استعمال کرنا برا نہیں سمجھتے۔ کلب کی تلاشی لی گئی تو ہتھیاروں کا ایک خاصا ذخیرہ نکلا اور کلب کے سکریٹری اور کلب کے کئی ممبر ہتھیاروں سمیت گرفتار کر لئے گئے شام میں آزادی کی ایک تحریک شروع ہوئی ہے جس میں نوجوان زور شور کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں اور فرانسیسی حکومت اور اس کے شامی عہدے داروں کو بہت پریشان کر رہے ہیں۔ فرانسیسی کہتے ہیں کہ ہمیں شام پر حکومت کرنے کا حق ہے شامی کہتے ہیں کہ ہمیں آزاد ہونے کا حق ہے۔ وہ حکومت کی مخالفت اپنے بل پر نہیں کر سکتے اس لئے کیا تعجب ہے اگر وہ جرمنی سیاست کا سہارا چاہیں۔ جرمن سیاست اپنی غرض سے انھیں سہارا دے گی۔ اگرچہ شام کی آزادی کی تحریک ابھی بڑھی نہیں لیکن جرمن سیاست بہت کچھ کام کر چکی ہے۔ جرمن مسافر اور سیاح جرمن اور شامی دوکاندار جرمنی بال بنانے والی عورتیں

شامی اور جرمن طوائفیں۔ بہت جاسوسی کر رہی ہیں۔ شامی حکومت کے سارے بھید جرمنی کی وزارت خارجہ کو معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور جاسوسوں کو پکڑنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ انھیں تنخواہیں نہیں دی جاتیں۔ جرمن کا بنا ہوا مال دیا جاتا ہے۔ عراق میں عراقیوں کی حکومت ہے اس لئے وہاں جاسوسی اور رعایا کو بھڑکانے کی ضرورت نہیں وہاں نازی سیاست کے کارنامے بیان کرکے ٹھیکے اور اجارے حاصل کئے جارہے ہیں۔

ایسی حالت میں یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ فلسطین کے عرب آزاد ہوگئے یا انھیں استقلال اور اختیار کا پھل ملنے والا ہے۔ یہودیوں کا سیلاب تو اب بند ہوگیا یہودی اب یہ بھی نہ جتا سکیں گے کہ وہ عربوں سے بہتر قسم کے آدمی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخالفوں کی تعداد میں کمی ہوگئی معاملہ سلجھ گیا۔ عرب اور انگریز آمنے سامنے آگئے برطانوی سیاست ابھی تک نہ جانے کب تک عربوں پر جرمنی ہونے کا۔ عربوں کی آزادی کی تحریک پر جرمن سیاست کی چال ہونے کا شبہ کرتی رہے گی یعنی فلسطین کے معاملہ کا دارومدار ہر ہٹلر پر ہے جب تک وہ برطانیہ کو اس خیال میں رکھ سکے کہ انھیں منانا اور راضی رکھنا ممکن ہے برطانوی سیاست کو فلسطینی عربوں کی دوستی اور ہمدردی کی ضرورت نہ ہوگی اور فلسطین آزاد نہ ہوگا جس دن ہٹلر کی طرف سے مایوسی ہوئی۔ سیاست پلٹا کھائے گی اور فلسطینی عرب آزاد ہوجائیں گے!

قسمت کو دیکھئے کہ اس نے فلسطین اور چکوسلواکیا دونوں کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک ہی ہفتہ رکھا ہر ہٹلر کی نسبت گمان یہ تھا کہ اول کر اُن میں کوئی کارروائی کریں گے یا اٹلی کے ساتھ مل کر نوآبادیوں کا مطالبہ کریں گے لیکن انھوں نے بدھ کی صبح کو اچانک چکوسلواکیا پر حملہ کرکے اس کے دو سب سے بڑے ضلعوں کو جو بوہیما اور مرادیا کہلاتے ہیں۔ قبضہ کرلیا۔ یہ دونوں ضلع اب چیکائی کہلائیں گے اور جرمنی کے ماتحت انھیں سوراج کے کچھ اختیارات حاصل ہوں گے۔ سلواکیا ابھی تک آزاد ہے مگر غالباً تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی جرمنی میں شامل ہوجائے گا۔ چیکوسلواکیا کے مشرقی حصہ پر جو کارپاتھو اوکرین کہلاتا تھا ہنگری نے قبضہ کرلیا ہے۔ اور ہر ہٹلر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

ہر ہٹلر کا شاید پہلے سے ارادہ نہ تھا کہ چیکوسلواکیا کا خاتمہ کردیں انھوں نے یہ ارادہ پچھلے دوشنبہ

کو کیا ہوگا جب اس کی خبر آئی تھی کہ چکوسلواکیا کے خود مختار صوبے اور چیکوسلواکیا کی مرکزی حکومت کے درمیان جو جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں منگل کی رات کو جب چکوسلواکیا کے ہمدرد ڈاکٹر ہان ان سے ملے تو ہر ہٹلر کو جو ذرا سا تامل تھا وہ بھی نہ رہا۔ چکوسلواکیا سے آزاد خود مختار حکومت کا بوجھ اٹھایا نہیں جا سکتا تھا اور ہر ہٹلر نے یہ بوجھ اپنے اوپر لے کر گویا چکوسلواکیا کے ساتھ احسان کیا۔ لیکن جیسا کہ لارڈ ہیلی فیکس نے فرمایا یہ بات ہے قابل افسوس اس پر اعتراض کرنا چاہیے کہ ہر ہٹلر نے اپنے معاہدوں کی پابندی نہیں کی۔ لارڈ ہیلی فیکس کی یہ رائے بھی صحیح ہے کہ انگلستان یا کوئی اور ریاست اس وقت کچھ نہیں کر سکتی ہر ہٹلر نے بہت برا کیا لیکن اب جو کر لیا تو کیا کیا جائے۔

مطبوعات موصولہ

مشکلات القرآن — مصنفہ مولانا انور شاہ مرحوم کشمیری بزبان عربی تقطیع ۲۶ × ۲۰ ضخامت ۲۸۰ صفحات قیمت فی نسخہ ۶ ؍ ملنے کا پتہ ناظم صاحب ادارہ شرقیہ متصل جامع مسجد دہلی

مولانا انور شاہ دیوبند کے مدرسہ کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے۔ اور جملہ علوم اسلامیہ میں کمال رکھتے تھے۔ قرآن کی تفسیر میں درس کے وقت طلبا اور بالخصوص حنفی طلبا کو جو علمی دشواریاں پیش آتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس کو چھاپ کر شائع کیا ہے۔ مولوی محمد یوسف صاحب بنوری استاد جامعہ ڈابھیل نے اس پر عربی میں ایک مقدمہ ۴۸ صفحوں کا لکھا ہے جس میں مولانا انور شاہ کی مختصر سوانح حیات اور مشکلات قرآن کے متعلق بھی بعض امور کی تفصیلات ہیں۔ ا۔ج۔

ترجمان الغیب — مصنفہ مولوی محمد احتشام الدین صاحب حقی دہلوی۔ ایم۔ اے (علیگ) تقطیع ۲۶ × ۲۰ / ۸ ضخامت ۲۳۲ صفحات قیمت فی نسخہ ؎ ملنے کا پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ نئی دہلی

مولوی احتشام الدین صاحب حقی دہلی کے ان ممتاز اہل ادب میں سے ہیں جو اردو کے مالک اور نظم و نثر دونوں کے ماہر ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کے ساتھ ان کو کم سے کم ایک قرن سے دلچسپی ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے خواجہ صاحب موصوف کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ اصل فارسی کے بحر و قافیہ اور ہم آہنگ ردیف میں کر ڈالا۔

چونکہ اردو فارسی سے قریب تر ہے اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں بہت متشابہ اور مماثل ہیں۔ اور جس طرح خواجہ حافظ کی فارسی مستند اور مسلم ہے اسی طرح مولانا احتشام الدین صاحب کی اردو خالص دہلوی اور ٹکسالی ہے۔ جو لوگ خواجہ حافظ کے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ نہایت دلکش ثابت ہوگا۔

الرق فی الاسلام حصہ اول — مصنفہ مولوی سعید احمد صاحب فاضل دیوبند ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۶ × ۲۰ / ۸ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد کتابت طباعت دیدہ زیب اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج

درج نہیں ہے۔ غالباً ۶ ار ۔ ملنے کا پتہ ناظم صاحب ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

جامعہ میں ہم ندوۃ المصنفین کے قیام کا ذکر کر چکے ہیں کہ چند اہل ہمت صاحبان علم نے جو دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں یہاں قرول باغ میں ایک مجمع علمی اس نام سے قائم کیا ہے جس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ برہان بھی شائع ہوتا ہے۔ کتاب زیرِ تبصرہ اس ندوۃ المصنفین کی پہلی تصنیف ہے جو ملک وملت کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس میں غلامی کی حقیقت اور اس کے نفسیاتی۔ اخلاقی۔ اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا۔ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت مجبوریوں کی وجہ سے باقی رکھا اور کیا کیا اصلاحات اس میں کیں۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کے بیانات درج کئے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ آئندہ شائع ہوگا۔ (ا۔ ج۔)

رسالہ نگار مصحفی نمبر "نگار" کی یہ ایک دیرینہ خصوصیت ہوگئی ہے کہ اس کا جنوری نمبر ایک خاص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں غالب، مومن ظفر وغیرہ کی شاعری پر رسالہ "نگار" میں سیر حاصل تبصرے شائع کئے جا چکے ہیں جنوری ۱۹۳۹ء کے نمبر کو مصحفی کی شاعری کے لئے وقف کیا گیا ہے اور جو توقعات نگار کے ساتھ پچھلے نمبروں کو دیکھ کر وابستہ کی جاسکتی تھیں وہ اس نمبر کی اشاعت سے اچھی طرح پوری ہوتی ہیں۔ نیاز صاحب کے مقدمہ کے علاوہ امیر احمد صاحب علوی، فراق صاحب گورکھپوری، عبدالباری صاحب آسی۔ مجنوں صاحب گورکھپوری حسرت صاحب موہانی۔ مشیر احمد صاحب علوی اور ہوش صاحب ملیح آبادی کے محققانہ مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے پاکیزہ ذوق شعر سے کام لیتے ہوئے مصحفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے انتخابات کو بھی پیش فرمایا ہے۔ رسالہ شروع سے آخر تک اس لائق ہے کہ اردو ادب و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

ترانہ شاہ سید پیر شاہ محی الدین قادری صاحب کا کلام ہے جسے جناب محمد اسمٰعیل شریف صاحب بی اے ایبو رسول سرورس نے مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے جناب اے حبیب اللہ خاں صاحب

منصف ۱۰ اڈنگرے نے تعارف لکھا ہے اور اے۔ کے سید تاج پیراں صاحب بی۔ اے قادری ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر ریاست مملکت میسور نے حالات مصنف درج کئے ہیں۔ خود محمد اسمٰعیل صاحب نے "شاہ صاحب کی یادآوری" اور ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو خوبی اور تفصیل کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مرتب و دیگر حضرات کی اس گہری عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے جو انھیں شاہ صاحب مرحوم کی ذات سے تھی اور جو ان کے وفات کے بعد ان کے کلام کو شائع کرانے کی محرک ہوئی۔ شاہ صاحب کی زبان کچھ پرانے طرز کی معلوم ہوتی ہے جو شاید جنوبی ہندوستان میں تو اب بھی بولی جاتی ہو لیکن شمالی ہندوستان میں اب اس طرح نہیں بولی جاتی۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:۔

ترا جلوہ مجھ میں عیاں ہوا تو خودی کو اپنی بھلا دیا ۔۔۔ ترا عشق مجھ میں جنم لیا تو سر انبیا زجھکادیا

اے صنم مجھ کو ترا رخ ذرا ابتلا جانا ۔۔۔ مضطرب ہوں مجھے جلوہ ذرا بتلا جانا

تلاش یار میں میں نے مرا وطن چھوڑا ۔۔۔ جہاں سے اہل جہاں سے ہوں میں تو منھ موڑا

تیرا مطلب آکے یاں تو کھو دیا ۔۔۔ اس کے بدلے ایک بکھیڑا لے چلا

محاورہ کے اس فرق کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو شاہ صاحب کا کلام تصوف اور معرفت کا ایک اچھا مرقع نظر آئے گا۔

احکام القرآن مولوی حبیب حسین صاحب صدیقی ساکن ردولی شریف ضلع بارہ بنکی نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمان قرآن پاک کا بلا ترجمہ متن پڑھنے کی وجہ سے اس کی تعلیمات کی طرف سے غافل ہیں اور محض طوطے کی طرح الفاظ ادا کر کے قرآن پاک کے معانی و مطالب سے غرض نہیں رکھتے اس مختصر کتاب میں احکام قرآن کو اردو زبان میں مختلف عنوانات کے ماتحت جمع کیا ہے تاکہ مسلمان اپنے ایمان و اسلام کا جائزہ لے سکیں اور ان کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ کلام مجید کی تلاوت کا شوق پیدا ہو۔

مرقاۃ القرآن اس میں عربی سکھانے کے لئے چالیس سبق جمع کئے گئے ہیں جو تمام تر قرآن شریف سے لئے گئے ہیں۔ اس کے مؤلف محمد عبداللہ صاحب کامل ایم۔ اے لیکچرار عربی

فارسی اردو گورنمنٹ کالج لائل پور ہیں۔ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے کلید مرقاۃ القرآن علیحدہ لکھی گئی ہے۔ دونوں کا یکجائی مطالعہ کرنے سے قرآن کی عربی سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

احسن المقال فی رویت الہلال از جناب محمد عبید اللہ قادری امجھری صاحب۔ صوبہ بہار میں ایک عرصہ سے امارت شرعیہ اور محکمہ قضا قائم ہے۔ ذی الحجہ ۵۶ھ میں رویت ہلال پھلواری شریف میں ۲۹ کو نہیں ہوئی اس لئے وہاں ۳۰ کا ہی حساب ملحوظ رکھا گیا لیکن بعد میں مختلف دیار اور امصار سے آئے ہوئے خطوط، اخبارات اور اطلاعیں پیش ہوئیں جن کے مطالعہ سے قاضی صاحب کو ۲۹ کی رویت کا ظن غالب پیدا ہوا۔ انھوں نے ۲۹ کی رویت قبول کرلی اور جمعہ کو عید اضحیٰ کا حکم دے دیا۔ لیکن مخالف لوگوں نے اس فیصلہ کو نہیں مانا۔ یہ رسالہ قضار قاضی کو حجۃ تسلیم کرانے اور قضا قاضی کو ظاہراً و باطناً نافذ منوانے کے لئے لکھا گیا ہے۔

طبقات الشعراء یہ قدرت اللہ صاحب صدیقی شوق سنبھلی کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا ایک نادر تذکرہ ہے جس کا جستہ جستہ خلاصہ جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی بی۔ اے۔ آنرز ایم۔ اے (علیگ) نے مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ طباعت و کتابت بہت اچھی ہے۔

شرارے یہ ڈاکٹر آہ سیتاپوری صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے ان افسانوں میں زندگی کے الم انگیز پہلوؤں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ افسانوں کے موضوع کو مصنف اور کتاب کے نام سے پوری مناسبت ہے۔ اس میں واقعی بہت سے دل جلانے اور آہ کا دھواں پیدا کرنے والے شرارے جمع کر دئے گئے ہیں۔

سفر حیدرآباد دکن اور سر اقبال کے تاثرات ۱۹۱۰ء میں یہ اقبال کی دو نظموں کا مجموعہ ہے جنھیں جناب تصدق حسین صاحب تاج نے بہ یادگار یوم اقبال حیدرآباد دکن منعقدہ، جنوری ۱۹۳۸ء مرتب کرکے شایع کیا تھا۔ پہلی نظم میں اقبال نے مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے اور دوسری نظم کا عنوان "گورستان شاہی" ہے۔ دونوں نظمیں اقبال کی اعلیٰ شاعری کی ترجمان ہیں۔

سالنامہ ۱۹۲۹ء ادبی دنیا ادبی دنیا لاہور کے اس سالنامہ کا شمار اپنے مضامین کے بلند معیار

اور تنوع اپنی کتابت و طباعت کی خوشنمائی اور دیدہ زیبی اور اپنی تصاویر کی خوبی اور کثرت کے لحاظ سے ہندوستان کے کامیاب ترین رسالوں میں کیا جا سکتا ہے۔ رسالہ میں مشہور اہل قلم کے اچھے افسانے اور ڈرامے، علمی و ادبی مضامین، نظمیں اور غزلیں جمع کی گئی ہیں جن کے لئے رسالہ کے مدیران مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بصائر القرآن (حصہ اوّل) از جناب نکہت شاہجہانپوری صاحب بی۔ اے۔ یہ کتاب نکہت صاحب کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو انجمن تحریک قرآنی بمبئی کے زیر اہتمام دئے گئے تھے اس میں مسلمانوں اور دیگر اقوام کی مجموعی زندگی کا (اصلاحی حیثیت سے) جائزہ لینے کے بعد چند قرآنی اصول پیش کئے گئے ہیں تاکہ ان اہم اسلامی مسائل کا بے تعصبی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکے جو خصوصیت کے ساتھ مغرب زدہ دماغوں اور موجودہ نوجوانوں کے ذہن میں الجھن اور خلجان کا باعث ہیں۔ لکچروں کے عنوانات اللہ، غفران، رحمت قبلہ اور ایمان وغیرہ کی تفسیر حاضرہ ہیں۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ "دنیا کے لئے ہدایت یعنی قرآن مبارک صرف طوطے کی طرح رٹنے اور محض زکوٰۃ و صدقہ اور یٰسین خوانی اور زینت طاق بننے کے لئے وقف نہ رہے بلکہ ہماری روح اور ہمارے تمام افعال و اعمال کی رہنمائی کرے"

نبض مصنفہ حکیم عبداللطیف صاحب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یہ حکیم صاحب کی نہایت محققانہ تصنیف ہے اور اس کے بارے میں مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ نبض شناسی کے فن پر اتنی مفصل بحث نہ صرف اردو زبان میں بلکہ کسی اور زبان میں بھی موجود نہیں ہے کتاب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان سے یونانی طب کی کتب درسیہ موجز، نفیسی، اقصرائی قانون شیخ، شرح قانون وغیرہ خالی ہیں بلکہ غیر درسی عربی کتابوں میں بھی مصنف کا یہ بیان ہے کہ یہ مسائل نہیں ملتے مصنف کے جد امجد حکیم محمد یعقوب صاحب نے "ارجوزہ شیخ الرئیس" کے قلمی نسخہ کے سرورق پر چند اشارات لکھے تھے جو مصنف کے خاندان میں سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں لیکن ان سے بھی تمام حالات کی جانب قطعی رہبری نہیں ہوتی۔ آیور ویدک کی کتاب "ناری وگیان" کو بھی مصنف نے اس کتاب میں بعینہٖ نقل کر دیا ہے اور

چینی اطبا کی اختراعات کو بھی جن پر دوسروں نے اپنے قوانین کی بنیاد رکھی ہے ڈاکٹر گو وتر کے قانون سے بعینہ نقل کیا ہے۔

ان اصول و قوانین کی صحت کے بارے میں مصنف اپنے ذاتی تجربے سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر قوت لامسہ کی تمیز صحیح تربیت یافتہ ہو تو یہ اصول بہت کچھ معین ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن محض نبض پر اعتماد کرنا اصول طب کے خلاف اور سخت خطرناک ہے۔ معائنہ مریض کے وقت کسی چھوٹی سی چھوٹی علامت اور معمولی سے معمولی حالت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ مریض کے مخصوص حالات، خصوصی خلقت، معاشی ماحول اور طبیب کے مخصوص حالات نبض کی صحیح رہنمائی میں حایل ہوتے ہیں۔ ان تمام موانع کا قطعی انسداد اور تمام مناسب حالات اور شرائط کا موجود ہونا عملی دنیا میں خارج از امکان ہے۔ اس لئے نبض کی رہنمائی اپنے حدود کے اندر بھی کامل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں جب تک مریض کی نبض بحالت صحت طبعی نہ دیکھی گئی ہو اس وقت تک اس کی اضافی کیفیت کا صحیح اور قطعی اندازہ دشوار ہے۔"

عملی تحقیق، کاوش و جستجو اور نتیجہ کی معقولیت نیز بیان کی صفائی اور خوبی کے لحاظ سے اس کتاب کا شمار اردو کی بلند پایہ کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

کانگریس یا مسلم لیگ | مصنفہ جناب حکیم انصاری صاحب ناشر ناظم دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ آفندی لاج قرول باغ نئی دہلی۔ قیمت ۲ر۔ یہ رسالہ مسلم لیگ کی تائید میں لکھا گیا ہے۔ موافق اور مخالف دلیلوں کو مکالمہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مکالمہ کا انداز نہایت سلجھا ہوا اور معقولیت پر مبنی ہے۔ جو حضرات کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ کے مخالف ہیں ان کو بھی اس رسالہ کے مطالعہ سے مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کو بہترین شکل میں سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

اسلامی حقوق اور مسلم لیگ | ناشر عبد الصمد رحمانی ملنے کا پتہ مکتبہ امارت شرعیہ۔ پھلواری شریف پٹنہ۔ قیمت مع محصول ڈاک ۴ر

اس رسالہ میں اس خط کو شائع کیا گیا ہے جو مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت

صوبہ بہار نے مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کو لکھا تھا۔ نائب امیر شریعت صاحب اس سے پہلے بھی ایک خط مسٹر جناح کو لکھ چکے تھے جس میں برطانیہ کے قائم کردہ نظام حکومت کے خلاف کلیتہً انقلاب برپا کرنے کے لئے مسٹر جناح کو حرب سلمی (پرامن سول نافرمانی) کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے پٹنہ کے اجلاس میں اس کو لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی تمام کارروائیاں دیکھ کر جن حقائق کا انکشاف ہوا' ان سے متاثر ہو کر جناب نائب امیر شریعت صاحب نے یہ دوسرا خط تحریر فرمایا تھا۔ اس میں "مسلم لیگ اور برطانوی شہنشاہیت' مسلم لیگ اور مذہبی حقوق کی حفاظت" "اسلامی کلچر اور مسلم لیگ" "پرسنل لا اور مسلم لیگ" وغیرہ کے عنوانات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ دو ضمیمے بھی اس رسالہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں تو نائب امیر شریعت صاحب کے متذکرہ بالا اول خط کو شائع کیا گیا ہے اور دوسرے ضمیمہ میں "مسودہ نظارت امور شرعیہ" درج کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے طبقہ علماء کے مطالبات اور نقطہ نگاہ کے سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

درس قرآن قاضی عبدالمجید قرشی صاحب سکریٹری سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور نے قرآن کا درس دینے کے لئے ایک نہایت مفید اور عالیشان اسکیم بنائی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ "آٹھ آنے سالانہ میں چوسٹھ چوسٹھ صفحے کے بارہ ماہوار رسائل شایع کئے جائیں ہر رسالہ میں ۳۰ درس قرآن ہوں گے ہر درس دو صفحے کا آسان تقریری شکل میں ہوگا ہر درس میں اوپر ایک آیت ہوگی اور نیچے صرف دو صفحوں میں اس کا ترجمہ اور تشریح۔ آپ گھر میں ایک وقت مقرر کریں کہ اس وقت گھر کا کوئی ممبر غیر حاضر نہ ہو۔ ایک جگہ فرش بچھا کر ہر روز ماں بچے' بہن' بھائی سب حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں اور آپ صرف چار منٹ میں انھیں روزانہ ایک درس پڑھ کر سنا دیا کریں۔ جس دن باپ نہ ہو بیٹا مسند ہدایت پر بیٹھے اور ایک درس پڑھ کر سنا دے ہر مسجد' ہر زنانہ اور مردانہ اسکول اور اسلامی گھر میں روزانہ ایک ایک آیت کا ترجمہ سکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔" اس سلسلہ کا پہلا ماہوار درس شائع کر دیا گیا ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس درس کے بارے میں مصنف نے معذرت کی ہے کہ "یہ سبق صرف قلم اٹھا کر لکھ دیے ہیں انشاء اللہ اگلے سبق بہتر ہوں گے" لیکن ہم ان سبقوں کو بھی بہت مفید پاتے ہیں۔ زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ ہر درس

اسلام کی بنیادی تعلیمات سے لبریز ہے۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے ہم سیرت کمیٹی کے اس احسان کا شکریہ ادا کر سکیں۔ سیرت کمیٹی کا یہ کارنامہ زرین حروف سے لکھے جانے کے لئے لائق ہے۔ سیرت کمیٹی اسلام کی نہایت عظیم الشان خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہم نہایت پرزور الفاظ میں اسلام سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو مشورہ دیں گے کہ وہ آٹھ آنے بھیج کر رسالہ درس قرآن اپنے نام جاری کرائیں۔ اس اسکیم کے چلانے والوں کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا ہے۔ اس اسکیم میں ۱۲ رسائل پر تین آنے سالانہ محصول ڈاک کا اور ایک آنہ سالانہ ریپر پوسٹ اور انتظام کا خرچ ہوجائے گا اور اس طرح سیرت کمیٹی ۱۲ رسائل کے عوض صرف ۱۶ پیسے خود وصول کرے گی۔ حالانکہ اس کی اپنی کم سے کم لاگت ۲۴ پیسے ہیں۔ اگر ۱۶ ہزار گھروں میں درس قرآن جاری ہوگیا تو اس اسکیم میں سیرت کمیٹی کو دوسو روپیہ ماہوار کا مستقل خسارہ ہوگا۔ لیکن اگر ۱۶ ہزار گھروں یا مسجدوں میں ۸۰ ہزار مسلمان ترجمہ قرآن شروع کر دیں تو اس فائدے کے مقابلہ میں سب نقصانات ہیچ ہیں۔

انقلابی پارے یا اشتراکی اقوال | مصنفہ کامریڈ اے۔ ایس۔ حامد صاحب ملتانی ناشر فیض بخش پاس نسیم بلڈنگ ۔ شیدی پورہ نئی دہلی۔ قیمت ۴ر

اس رسالہ میں کچھ منتشر خیالات اور عبارتوں کو جمع کیا گیا ہے جن میں سے چند کو چھوڑ کر باقی سب کامریڈ اے۔ ایس۔ حامد نے خود ہی تصنیف فرمائے ہیں۔ کامریڈ حامد اور ان کے خیالات سے جن حضرات کو دلچسپی ہے ان کے لئے یہ کتاب شاید مفید ثابت ہوگی۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عا ر	۱۲ آر	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عا ر
القول الاظہر	عہ ر	۸ ر	؍؍ ؍؍ ؍؍ دوم	۱ عا ر	عا ر
رہنمایان ہند	عا ر	۱ عہ ر	تاریخ یونان قدیم	عا ر	۰
امرائے ہنود	۱ سے ر	سے ر	نکات الشعرا	۱ عا ر	۱۲ عہ ر
القمر	عہ ر	۰	وضع اصطلاحات	۱۲ سے ر	۱ سے ر
تاریخ تمدن حصہ اول	عا ر	۱ عہ ر	بجلی کے کرشمے	۱۲ عہ ر	۱ عہ ر
؍؍ ؍؍ دوم	عا ر	۱ عہ ر	تاریخ	۱۲ عہ ر	۰
فلسفۂ جذبات	۱ عا ر	عا ر	محاسن کلام غالب	عہ ر	۱۰ ر
البیرونی	عا ر	۱ عہ ر	قواعد اردو	۱ عا ر	عا ر
دریائے لطافت	سے ر	۱ عا ر	تذکرہ شعرائے اردو	۱۲ عہ ر	۶ عہ ر
طبقات الارض	۱ عا ر	عا ر	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم ونسق	سے ر	۱ عا ر
مشاہیر یونان و روما حصہ اول	للعہ ر	سے ر	تاریخ ہند ہاشمی	۰	۱ عہ ر
؍؍ ؍؍ ؍؍ دوم	سے ر	۱ عا ر	مثنوی خواب وخیال	۱ عہ ر	عہ ر
اسباق النحو حصہ اول	۰	۶ ر	کلیات ولی	جہ ر	للعہ
؍؍ ؍؍ دوم	۰	۶ ر	چمنستان شعرا	۱ جہ ر	۱ للعہ ر
علم المعیشت	۱ جہ ر	صہ ر	ذکر میر	۰	عا ر

مضامین محمد علی

مرتبہ جناب محمد سرور صاحب بی اے (آنرز) فاضل جامعہ ملیہ

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن وملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب، ورسیاست، چندہ اور ریاده
۲۔ مسائل ملی: سنت مالویہ، در سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند
۴۔ مسلمان اور کانگریس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی۔
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں ۱۹۳۱
۹۔ مسلمان اور آزادی
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی راجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں اُن میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور اُن کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔ اُن کی قیمتیں ۲۵ فی صدی سے ۴۰ فی صدی تک کم کر دی گئی ہیں۔

اُمید ہے کہ اربابِ ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ لاہور اور لکھنؤ سے مکمل فہرست طلب کر کے ممنون فرمائیں گے

مکتبہ جامعہ

دلی، نئی دلی، لاہور، لکھنؤ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی